جنوری ۱۹۹۷ء

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- عہد حاضر میں اجتہاد کی اہمیت اور شرائط اہلیت
- روزے کی عبادت کی حکمت اور مقاصد

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

سکول و کالج کے اساتذہ کے لئے

ماہ رمضان میں دورۂ ترجمہ قرآن

سے استفادے کا بہترین موقع

سکولوں اور کالجوں میں عربی اور اسلامیات کے ایسے اساتذہ کو جو ان مضا
میں ماسٹر ڈگری یا اس کے مساوی تعلیمی استعداد کے حامل ہوں' مرکزی انجمن خد
القرآن کی جانب سے یہ پیشکش ہے کہ وہ ماہ رمضان کی راتوں میں نماز تراویح
ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام میں اگر شرکت کرنا چاہیں تو انہیں قیام و ط
کی سہولت انجمن کی جانب سے فراہم کی جائے گی۔ پاکستان کے درج ذیل چار شہر
میں مذکورہ سہولت مہیا کی گئی ہے۔

☆ لاہور : قرآن اکیڈمی' 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' فون:03-69501
☆ کراچی : قرآن اکیڈمی' DM-55 خیابان راحت' درخشاں فیز 6 ڈیفنس
فون : 5855219'5854036
☆ ملتان : قرآن اکیڈمی' 25۔آفیسرز کالونی۔ فون : 521070
☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ : الہدیٰ انٹرپرائز' سٹی پلازہ' تالاب بازار
(ٹوبہ میں یہ پروگرام پنجابی زبان میں ہو گا)

نوٹ : اس بابرکت پروگرام میں شرکت کے خواہشمند حضرات جلد از جلد مذکورہ م
میں سے کسی ایک سے رابطہ فرمائیں۔ اس پروگرام میں دلچسپی رکھنے والے دیگر حضرات
قیام و طعام کے اخراجات ادا کر کے اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

المعلن ناظم اعلیٰ' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد :

شمارہ :

رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

جنوری ۱۹۹۷ء

فی شمارہ ۱۰/-

سالانہ زرِ تعاون ۱۰۵/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 15 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

ماہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خطبہ مبارک کے الفاظ:
"یا ایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم" کے مطابق بڑی عظمتوں اور برکتوں والا مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہے۔ اس ماہ مبارک میں وہ عظیم شب بھی شامل ہے جو ہزار مہینوں پر بھاری ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے افضل ہے۔ شب قدر کے بارے میں عام خیال یہی ہے۔ جس کی تائید بعض صحیح روایات سے بھی ہوتی ہے کہ ماہ رمضان کی ستائیسویں شب ہی دراصل شب قدر ہے۔ بعض روایات میں ماہ رمضان کے آخری عشرے کی دیگر طاق راتوں کا ذکر بھی ملتا ہے' واللہ اعلم۔ بہرکیف کوئی اسے حسن اتفاق کہے یا کچھ اور' ہمارے نزدیک یہ تدبیر الٰہی کا مظہر ہے کہ پاکستان کا قیام ماہ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو عمل میں آیا تھا۔ گویا رواں ماہ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو پاکستان اپنی عمر کے اکاون برس مکمل کر لے گا۔

پاکستان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پوری دنیا میں یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔ تاہم یہ عظیم المیہ ہے کہ اسلام کے نام پر دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی یہ عظیم اسلامی ریاست نصف صدی گزرنے کے بعد بھی بے یقینی کی انتہائی کیفیت سے دوچار اور عدم استحکام کا عبرتناک نمونہ بنی ہوئی ہے۔ اس پچاس سالہ عرصے میں پاکستان کا ایک بازو کٹ کر جدا ہو چکا ہے اور بقیہ پاکستان مسلسل سیاسی اور اقتصادی بحرانوں کے نرغے میں رہا اور اگر حالات میں کوئی بڑی مثبت تبدیلی نہ آئی تو اس بچے کھچے پاکستان کی سالمیت بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا مستقل موقف یہ ہے کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کی بقا بھی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہمارے عدم استحکام کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم من حیث القوم' اللہ اور اس کے دین کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم نے گزشتہ پچاس برسوں کے دوران نفاذِ اسلام یعنی نظام خلافت کے قیام کی جانب کوئی حقیقی پیش قدمی کرنے کی بجائے اپنا پورا زور انگریز کے چھوڑے ہوئے باطل نظام کی حفاظت میں صرف کیا ہے۔ وہی جاگیرداری نظام' وہی سودی معیشت جو قیام پاکستان سے پہلے رائج تھی' آج بھی قائم و دائم ہے' بلکہ ہم نے اس طاغوتی نظام کو مزید پختہ کیا ہے اور اگر کوئی پیش رفت کی ہے تو اسی رخ پر۔ آج ساری دنیا میں سیاسی طور پر غیر مستحکم اور معاشی طور پر بدحال اور کشکول بدست قوم کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ اس پر اس سلور میڈل کا مزید اضافہ کر لیجئے جس کا "اعزاز" ہمیں اقوام عالم میں حال ہی میں کرپشن اور بددیانتی کے معاملے میں "دوسری پوزیشن" حاصل کرنے پر بخشا گیا ہے۔

گزشتہ ماہ تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ "مشرقی پاکستان" کے موضوع پر منعقدہ ایک تقریب میں ایک معروف صحافی نے جن کا شمار کوچہ صحافت کے اہل دانش میں ہوتا ہے' اپنی تقریر میں اس رائے کا اظہار کیا کہ "پاکستان اسلام کے لئے نہیں بلکہ محض مسلمانوں کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ پاکستان کا

قیام کسی اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ نہیں تھا بلکہ پاکستان کا قیام ہی ہماری آخری منزل تھا اور ۱۴/اگست [illegible] ہم نے اپنی منزل کو پالیا۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام یا پان اسلام ازم کو تحریک پاکستان کے [illegible] اپنی منزل قرار دینا غلط بحث کے مترادف ہے"۔ ہم فاضل مقرر کی صاف گوئی پر انہیں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے دل کی بات کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واضح انداز میں [illegible] کے سامنے رکھی لیکن ان سے یہ سوال کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر پاکستان بجائے خود [illegible] تو یہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اور اچھا ٹیلنٹ رکھنے کے باوجود آج ہم ہر اعتبار سے اتنے زبوں حال کیوں ہیں؟--- کیا پاکستانی قوم کو پیدائشی طور پر ذہنی مریض یا ذہنی طور پر معذور سمجھا جائے کہ ہم آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی سیاسی شعور اور معاشی خود کفالت کے میدان میں دنیا کی تمام دوسری اقوام یہاں تک کہ ہندو قوم سے بھی بہت پیچھے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آج یہ شعر صد فی صد ہم پر صادق آتا ہے کہ ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

کیا وجہ ہے کہ ملکی سطح پر ہمارا ہر ادارہ آج تباہی کے آخری دہانے تک پہنچا ہوا ہے؟ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے اور حامل قرآن ہونے کے باوجود کیا وجہ ہے کہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے ہم گراوٹ کی آخری انتہاؤں کو چھو رہے ہیں؟

امیر تنظیم اسلامی کی تشخیص بالکل صاف اور واضح ہے کہ ہم اللہ سے کئے گئے اس عہد کی خلاف ورزی کی سزا بھگت رہے ہیں جو ہم نے قیام پاکستان کے وقت اللہ سے کیا تھا کہ ہم "پاکستان کو اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا ایک مثالی نمونہ بنائیں گے" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ"۔ اس عہد شکنی کی پاداش میں اس سنت اللہ کے مطابق جس کا ذکر سورۃ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ میں وارد ہوا ہے 'نفاق عملی' کا روگ ہمارے جسد ملی کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا ہے۔ اور اس صورتحال کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم پاکستان میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام یعنی نظام خلافت کے احیاء و قیام کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور اس ضمن میں کسی حقیقی پیش رفت کا آغاز کر دیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام جب تک ایک قابل ذکر پیمانے پر نہیں ہو گا اور نمایاں دینی قوتیں جب تک جمع ہو کر اس کے لئے سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش نہیں کریں گی' بات آگے نہیں بڑھے گی۔ بہرکیف اصلاح احوال کا واحد فوری راستہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ دینی قوتیں حالات کی نزاکت اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے انتخابی سیاست کے میدان سے کنارہ کش ہو کر اور سیرت طیبہ سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے انقلابی طریق کار کو اپنا کر نظام خلافت کے قیام کے لئے بھرپور متحدہ کوشش کا آغاز کر دیں۔ بصورت دیگر قوم کی حالت سدھرنے کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

عہدِ حاضر میں اجتہاد

اہمیت اور شرائطِ اہلیت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۵/ جنوری ۹۶ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ 'سورۃ الحجرات کی پہلی آیت 'سورۃ النساء کی آیت ۵۹ اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ کی تلاوت اور دو احادیث مبارکہ کا متن بیان کرنے کے بعد فرمایا :

آج مجھے "عہدِ حاضر میں اجتہاد" کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنی ہے۔ یعنی عہدِ حاضر میں اجتہاد کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی نوعیت اور اس کی صورت کیا ہو گی اور اس کا طریق کار کیا ہو گا؟

اجتہاد کے بارے میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ ہمارے سامعین اور قارئین کی عظیم اکثریت اس سے واقف ہے کہ عربی زبان کے اکثر و بیشتر الفاظ کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے اور اس مادہ سے پھر الفاظ مختلف پیمانوں پر مختلف سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ "علم" ہی کو لیجئے 'اس سے عالِم بھی ہے' معلوم بھی ہے 'متعلّم بھی ہے 'معلّم بھی ہے 'علامت بھی ہے 'استعلام بھی ہے۔ اسی طرح اجتہاد کا مادہ "جہد" ہے۔ اس پر متعدد مرتبہ گفتگو ہو چکی ہے کہ اسی مادے سے جہاد اور مجاہدہ کا لفظ بنا ہے۔ اس وقت صرف یہ نوٹ کر لیجئے کہ جُہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ یہ گویا ایک مثبت اور یکطرفہ عمل ہے۔ آپ کسی کام کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب اس کوشش میں آپ کو کوئی مقابلہ پیش آجائے 'کوئی رکاوٹ پیش آجائے' درمیان میں کوئی ایسی مشکل آن پڑے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے جس سے نمٹنا ضروری ہو تو اب یہ جہاد بن جائے گا۔ جہد کا جہد سے مقابلہ ہو گا' تو یہ جہاد یا مجاہدہ ہے۔ اجتہاد اسی مادہ

سے باب افتعال ہے۔ گویا کہ خود جہد کرنے والے کا اپنے اوپر شدید مشقت جھیلنا۔ باب افتعال کا خاصہ یہ ہے کہ کسی کام کو اپنے اوپر لینا۔ مثلاً التزام کا مفہوم ہو گا خود کسی شے کو لازم پکڑ لینا۔ اسی طرح اپنے اوپر شدید ترین مشقت جھیلنا فقط "اجتہاد" کا مفہوم ہے۔

اجتہاد کا اصطلاحی مفہوم

اجتہاد کے اصطلاحی معنی سمجھنے کے لئے ہم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں، جسے امام ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے بھی۔ اس حدیث سے یہ بات اجاگر ہو جائے گی کہ اصطلاح میں اجتہاد کا مطلب کیا ہے۔

آپ کے علم میں ہو گا کہ حضرت معاذؓ بن جبل ان چند صحابہؓ میں سے ہیں جن کی مدح میں رسول اللہ ﷺ نے افعل التفضیل کا صیغہ (Superlative Degree) استعمال کیا ہے۔ آپ خطباتِ جمعہ میں اکثر یہ الفاظ سنتے ہیں: "ارحمُ اُمّتی بِاُمّتی ابوبکرؓ واَشدُّھم فی امرِاللّٰہ عمرؓ واَکثرھم حیاءً عثمانؓ واَقضاھُم علیؓ" (رضی اللّٰہ تعالٰی عنھم وارضاھم اجمعین)۔۔۔ یہ چاروں افعل التفضیل کے صیغے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اُمت میں سے امت پر سب سے زیادہ رحیم و شفیق ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ میری امت میں اللہ کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں۔ میری امت میں سب سے بڑھ کر باحیاء عثمانؓ ہیں۔ میری امت میں صحیح ترین فیصلے کی سب سے زیادہ صلاحیت علی میں ہے"۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اسی طریقے سے حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں حضور ﷺ کے الفاظ ملتے ہیں: "اَعلَمُھم بِالحلالِ وَالحرامِ مُعاذُ بنُ جَبل" یعنی حلال اور حرام کی معرفت اور پہچان میں سب سے بڑا ملکہ اللہ نے میرے اس صحابی معاذ بن جبل کو عطا کیا ہے۔ یعنی جس کو ہم قانونی شعور (Legal Sense) کہتے ہیں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے بڑھ کر ان میں تھی۔ یہ بڑا قانونی مسئلہ ہے کہ ایک شے حلال ہے یا حرام۔ اور بہت سی جگہوں پر جا کر ان کے مابین بڑی باریک سی سرحد آ جاتی ہے اور حلال و حرام کا

تعین بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ "الحلالُ بیّنٌ وَ الحَرامُ بیّن وبینھما مُشتَبِھاتٌ" یعنی کچھ حلال تو وہ ہیں جو بالکل واضح طور پر حلال ہیں۔ اسی طرح کچھ حرام وہ ہیں جو بالکل واضح طور پر حرام ہیں' لیکن بیچ میں کچھ مشتبہات بھی ہیں' جن کو پہچاننا اور ان کے بارے میں تعین کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا یہ حلال ہیں یا حرام۔ اور یہ معاملہ اس قدر نازک ہے کہ کسی حرام چیز کو حلال قرار دے دینا یا کسی حلال چیز کو حرام بنا دینا دونوں برابر کے جرم ہیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بڑے گہرے شعور اور فہم کی ضرورت ہے' بڑے علم کی ضرورت ہے' معلومات کی ضرورت ہے۔ تب کہیں کسی شخص کو اس معاملے میں خصوصی طور پر کوئی مقام حاصل ہو گا۔ تو حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا خاص اس پہلو سے تذکرہ فرمایا۔

یہ حدیث بھی دراصل اسی ضمن میں ہے۔ اجتہاد کا تعلق بھی اسلام کے قانونی نظام ہی سے ہے۔ اب ہم اجتہاد کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل سے مروی اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں : ((عن مُعاذِ بنِ جَبَل (رضی اللہ عنہ) انَّ رسولَ اللّٰہ ﷺ بعَث معاذاً الَی الیَمن' فقال : کیف تقضی؟ قال : اَقضِی بما فی کتابِ اللّٰہ۔ قال : فَاِن لم یَکُنْ فی کتابِ اللّٰہِ؟ قال : فبِسُنَّۃِ رسولِ اللّٰہ ﷺ ۔ قال : ان لم یکن فی سُنّۃِ رسولِ اللہ؟ قال : اَجْتَھِدُ رَأیِی ۔ قال : الحَمدُلِلّٰہِ الذی وفّق رسولَ رسولِ اللّٰہ لما یحبُّ ویرضٰی))

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود بیان کر رہے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا۔ بھیجنے سے یہاں مراد ہے والی بنا کر' عامل بنا کر' گورنر بنا کر بھیجا۔ اب روانگی سے پہلے حضور ﷺ انٹرویو لے رہے ہیں کہ میں جس شخص کو اتنی بڑی ذمہ داری دے رہا ہوں اس کے بارے میں اندازہ کر لوں کہ کوئی صحیح طریق کار اس کے علم میں ہے یا نہیں۔ چنانچہ پوچھا : "کیف تقضی؟" یعنی "تم فیصلے کیسے کرو گے؟" ظاہر ہے کہ جو شخص بھی ذمہ دار ہے' گورنر ہے' والی ہے' عامل ہے' اس کو خوب سوچ کر فیصلے کرنے ہوں گے۔ اس کے سامنے مقدمات پیش کئے جائیں گے' جھگڑے سامنے آئیں گے' ان کا

کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے' تو پوچھا کہ فیصلے کیسے کرو گے؟۔ قَالَ : اَقْضِی بِمَا فِی کِتَابِ اللّٰہِ۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں اللہ کی کتاب میں جو کچھ پاؤں گا اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ایک بالکل سیدھی سی فطری سی بات ہے۔ حضور ﷺ نے دوسرا سوال کیا کہ اگر وہ معاملہ یا وہ مسئلہ کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تو کیا کرو گے؟ قَالَ فَبِسُنَّۃِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اس کا حل اللہ کے رسولؐ کی سنت کے اندر تلاش کروں گا اور اس کے مطابق فیصلہ کر لوں گا۔ حضورؐ نے تیسرا سوال کیا کہ اگر تمہیں اللہ کے رسولؐ کی سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ اس پر حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا : اَجْتَہِدُ رَأْیِی۔ یعنی پھر میں امکانی حد تک کوشش کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ یہاں لفظ آیا ہے "اَجْتَہِدُ" جس سے مصدر "اجتہاد" ہے۔ اور ہمارے دین کا جو تشریعی اور قانونی نظام ہے اس میں اہم ترین اصطلاح کی حیثیت اس لفظ کو حاصل ہے۔ یہ لفظ وہ ہے کہ جس کو حضرت معاذؓ نے آنحضور ﷺ کے سامنے استعمال کیا کہ اگر مجھے کوئی چیز صراحت کے ساتھ اللہ کی کتاب میں ملے نہ سنتِ رسولؐ میں تو میں اپنی سی امکانی کوشش کروں گا' امکانی حد تک مشقت جھیلوں گا' پوری محنت کروں گا اور پھر مجھے اپنی کوئی رائے بنانی پڑے گی اور یہ معاملہ مجھے اپنی رائے سے طے کرنا ہو گا۔ "اَجْتَہِدُ رَأْیِی" کے الفاظ اپنے اندر یہ وضاحت لئے ہوئے ہیں کہ میری یہ رائے کوئی سرسری سی رائے نہیں ہو گی کہ جو بھی جی میں آئے میں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں' بلکہ میری یہ رائے میری انتہائی محنت و کوشش اور مشقت کا نتیجہ ہو گی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اجتہاد کے لفظی معنی یہی ہیں کہ آپ آخری امکانی حد تک محنت اور مشقت جھیل لیں' پھر زبان کھولیں۔ حضرت معاذؓ کے جواب کی حضور ﷺ نے تصویب فرمائی اور گویا شاباش دینے کے انداز میں فرمایا : ((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰہِ لِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی)) کُل حمد کُل شکر اس اللہ کا ہے جس نے اللہ کے رسول کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جس سے وہ راضی ہے اور جو اسے پسند ہے۔

یہ اس اعتبار سے بڑا پیارا مقام ہے کہ یہاں حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ کے

لئے "رَسُولُ رَسُولِ اللّٰہ" (اللہ کے رسول کا رسول) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ یہاں "رسول" کا جو لفظ آیا ہے وہ اپنے لغوی معنی میں ہے۔ اَرْسَلَ... یُرْسِلُ۔ بھیجنا' اور رَسُول۔ فرستادہ' ایلچی' پیامبر' نمائندہ۔ اللہ نے بھیجا ہے محمد ﷺ کو' تو اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں اور اب محمد ﷺ بھیج رہے ہیں اپنے ساتھی اپنے صحابی معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف' تو یہ "رسول" ہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے۔ یہی لفظ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خود اپنے بارے میں استعمال کیا تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے بڑے پیمانے پر "بیعتِ رضوان" لی تھی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جا کر مدینہ کی خواتین سے میری جانب سے' میرے نمائندے کی حیثیت سے بیعت لے لو۔ چنانچہ وہاں خواتین کا اجتماع منعقد کیا گیا۔ حضرت عمرؓ وہاں گئے تو جاتے ہی انہوں نے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے : "اَنَا رَسُولُ رَسُولِ اللّٰہِ" کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا رسول ہوں۔ یعنی میں اللہ کے رسولؐ کا نمائندہ' آپؐ کا فرستادہ' آپؐ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔

اجتہاد کے لئے ہمیشہ یہی ترتیب پیش نظر رہنی چاہئے جو حضرت معاذؓ نے بیان کی۔ یعنی سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر کوئی معاملہ اس میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے تو پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ اگر اس میں وضاحت نہیں ہے تو پھر سنتِ رسول ﷺ کی طرف دیکھنا ہوگا۔ پھر اگر سنتِ رسولؐ میں بھی تعیّن کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہیں مل رہا تو پھر اجتہاد کرنا پڑے گا۔ اپنے اوپر پوری مشقت جھیلتے ہوئے صحیح رائے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

اب یہ سمجھ لیجئے کہ یہ کوشش کس معنی میں ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ اس کوشش کے دو ہدف ہوں گے۔ مجتہد کے لئے اولاً یہ چیز پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ میں کسی مسئلہ میں کوئی رائے ایسی دے دوں' کوئی فیصلہ ایسا دے دوں جو دین کے مجموعی نظام کے خلاف ہو۔ دین کی حیثیت ایک حیاتیاتی اکائی (Organic Whole) کی ہے۔ اس کی ایک روح ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی معاملے کے اندر میں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھوں جو دین کے مجموعی نظام' اس کی روح' اس کے بنیادی تصورات' اس کے

Central Themes، اس کے مقاصد اور اس کی ترجیحات سے متصادم ہو جائے۔ دوسری کوشش اس اعتبار سے ہوگی کہ کہیں میری رائے کا کسی نصِ صریح کے ساتھ ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ یعنی یہ کہ قانونی اعتبار سے کہیں یہ رائے کتاب و سنت کی کسی بات سے متصادم نہ ہو جائے۔

اجتہاد کے ضمن میں ایک بہت اہم لفظ "قیاس" کا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے رائے اور قیاس اصل میں مترادف ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ جو بھی معاملہ آپ کے زیر غور ہے، اس سے قریب تر، ملتا جلتا کوئی معاملہ کہیں کتاب و سنت میں موجود ہو تو اس سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ اگر کتاب و سنت میں بعینہٖ وہی معاملہ موجود ہوتا پھر تو ہمیں اجتہاد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم اگر بعینہٖ وہی معاملہ تو قرآن میں ہے نہ سنت میں، لیکن کوئی اس سے مشابہت رکھنے والا، قریبی طور پر اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے والا معاملہ قرآن یا سنت میں مل جائے تو اس سے infer کرتے ہوئے، analogy کی بنیاد پر کوئی نتیجہ نکالنا قیاس کہلاتا ہے۔

اجتہاد کے ضمن میں پانچ نقطہ ہائے نظر

اجتہاد کے ضمن میں آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اِس وقت ہمارے ہاں اس اعتبار سے پانچ مکاتبِ فکر موجود ہیں کہ دین میں ابدی اور دائمی طور پر واجب الاطاعت (binding) چیزیں کون کون سی ہیں اور کن چیزوں کی حیثیت وقتی اور عارضی تھی۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جو شے ابدی طور پر واجب الاطاعت ہے وہی تو اجتہاد کا ماخذ بن سکتی ہے، اسی کی بنیاد پر تو اجتہاد کیا جائے گا۔ جو چیزیں وقتی تھیں ان کی بنیاد پر تو یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پوری صورت حال کو سمجھنے کے لئے اور ذہن میں اس کا پورا نقشہ جمانے کے لئے یہ پانچ مکاتب فکر آپ کے سامنے آجانے چاہئیں۔

اس ضمن میں سب سے انتہاپسندانہ نقطۂ نظر، جو اگرچہ آپ کو بڑا مضحکہ خیز اور گمراہ کُن معلوم ہوگا، ہمارے ہاں اس طبقے کا ہے جو یہاں کا سب سے مؤثر طبقہ ہے۔ ہمارے ہاں کا جو جدید اور مغرب زدہ ذہن ہے، جو مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے، وہ تقریباً سب کا

سب اسی نقطۂ نظر کا حامل ہے' قائل ہے' عامل ہے۔ اور وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ دائمی طور پر واجب الاطاعت ہونے کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے' بلکہ قرآن میں بھی جو اصول آئے ہیں وہ تو ابدی اور دائمی ہیں' ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت ہیں' لیکن جو معین احکام دیے گئے ہیں وہ دائمی نہیں ہیں' بلکہ وہ صرف ایک خاص دور کے لئے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن ویسے تو ابدی ہدایت نامہ ہے' لیکن چونکہ یہ ایک خاص دور میں اور خاص علاقے میں نازل ہوا ہے اور ایک خاص قوم اس کی اولین مخاطب تھی' جس کا ایک خاص تاریخی اور تمدنی پس منظر تھا' اس کی کچھ اپنی رسومات تھیں' اس کی اپنی ایک ذہنی و فکری اور علمی سطح تھی' چنانچہ (ان کے کہنے کے مطابق) قرآن نے اصول تو وہ دیے ہیں جو دائمی ہیں اور یہ دائمی و ابدی طور پر نوع انسانی کے لئے کتاب ہدایت ہے' لیکن اس میں جو معین احکام دیے گئے ہیں وہ اُس دور کے حالات کے مطابق تھے اور وہ دائمی و ابدی نہیں ہیں۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا' یہ خاص اس دور کے لئے ایک سزا تھی۔ ہاں' چوری کا انسداد ہونا چاہئے' اس کا خاتمہ ہونا چاہئے' یہ بات اپنی جگہ پر ضروری ہے۔ اسی طرح تقریباً تمام معین احکام کے معاملے میں ان کی رائے یہی ہے کہ یہ فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہیں' یہ تو صرف اپنے خاص دور کے لئے تھے۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم سے جو عمومی اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں وہ دائمی ہیں۔ اس طبقے کے بارے میں' میں ایک لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ انہیں "مسلم پروٹسٹنٹ" کہا جا سکتا ہے۔ آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے عالم عیسائیت میں یہ بحث شروع ہوئی تھی کہ بائبل کے بارے میں ہمارا رویّہ کیا ہونا چاہئے۔ آیا ہمیں اسے لفظ بہ لفظ خدا کا کلام اور واجب الاطاعت سمجھنا چاہئے یا اسے تمثیل' استعارہ اور محاورے کے سے انداز میں لینا چاہئے۔ جن عیسائیوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ بائبل کو لفظ بہ لفظ خدا کا کلام مانتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت سمجھتے ہیں ان کو طعنے کے طور پر کہا گیا کہ یہ فنڈامنٹلسٹ (Fundamentalists) ہیں۔ تو یہ "فنڈامنٹلسٹ" کا لفظ وہاں سے چلا ہے جو آج بہت وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک تو یہ اصطلاح صرف مسلمانوں کے لئے استعمال ہو رہی تھی اور مسلم فنڈامنٹلسٹ اور اسلامک فنڈامنٹلزم کے الفاظ کو گالی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا' اور

دنیا کو یہ ہوا دکھایا جا رہا تھا کہ "Islamic Fundamentalism on the march"
لیکن اب یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ فنڈا مینٹلسٹ یہودیوں میں بھی موجود ہیں، عیسائیوں میں بھی، اور ہندوؤں میں بھی موجود ہیں۔ ہر جگہ موجود ہیں۔ فنڈا مینٹلسٹ عیسائیوں کے برعکس پروٹسٹنٹ عیسائی بائبل کو لفظ بہ لفظ واجب الاطاعت نہیں مانتے۔ اسی طرح ہمارے ہاں جو جدید ذہن رکھنے والا طبقہ ہے، جو اپنے آپ کو ترقی پسند طبقہ کہتا ہے، وہ قرآن کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے کہ اس کے صرف عمومی اصول دائمی طور پر واجب الاطاعت (binding) اور ہمیشہ کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہیں، لیکن اس کے معیّن احکام ابدی نہیں ہیں۔

ان کے علاوہ ہمارے ہاں ایک دوسرا طبقہ ہے جن کے نقطۂ نظر میں پہلے طبقے کی نسبت باریک سا فرق ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن پورے کا پورا دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے، اس کا ہر ہر لفظ مِن جانب اللہ ہے، اللہ کا کلام ہے، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شے دائمی طور پر واجب الاطاعت نہیں ہے۔ سنتِ رسول ؐ صرف اپنے زمانے کے لئے واجب الاطاعت تھی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں۔ آپ ؐ ایک طرف تو اللہ کے رسول تھے اور دوسری طرف آپ ؐ اُس وقت مسلمانوں کے امیر بھی تھے۔ یعنی جب تک کوئی ریاست و حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو آپ کہہ لیجئے کہ مسلمانوں کی جماعت "حزب اللہ" کے امیر تھے اور جب کوئی حکومت قائم ہو گئی تو آپ اس کے سربراہِ ریاست تھے۔ جب آپ ؐ جنگ میں جاتے تھے تو آپ ؐ فوج کے سپہ سالار بھی تھے۔ پھر جب آپ کوئی فیصلہ کرتے تو آپ گویا چیف جسٹس بھی تھے۔ ان کے نزدیک آنحضور ﷺ کی یہ حیثیتیں دائمی نہیں ہیں، بلکہ وقتی ہیں۔ سُنّت اسی کا تو نام ہے کہ آپ ؐ نے کیا کیا، کیسے کیا، کس موقع پر کیا فیصلہ کیا، کسی کے لئے آپ ؐ نے کیا حکم دیا۔ لیکن اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دائمی نہیں، البتہ قرآن پورے کا پورا دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو "اہلِ قرآن" کہتے ہیں، جن کو مخالفین "منکرینِ حدیث" یا "منکرینِ سنت" کہتے ہیں۔ ان کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں، اور قرآن پر ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک حرف مِن جانب اللہ

ہے، صحیح ہے، محفوظ ہے اور دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے، لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز کو ہم قرآن پر حاکم ماننے کو تیار نہیں۔ قرآن سنّتِ رسولؐ کا محتاج نہیں ہے، یہ اپنی جگہ پر کتابِ کامل ہے، اس کو کسی اور شے کی ضرورت ہی نہیں۔ واضح رہے کہ یہ ان کا موقف ہے جو میں ان کے دلائل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضورؐ کی سنت دراصل اپنے دور کے لئے تھی، کیونکہ آپؐ کو اُس دور میں "مرکزِ ملّت" کی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارے ہاں یہ مکتبہ فکر ماضی قریب سے غلام احمد پرویز صاحب کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے والے اور بھی بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں، مثلاً مولانا عبداللہ چکڑالوی (چکڑالہ شمالی پنجاب کا ایک قصبہ ہے) لیکن غلام احمد پرویز کو چونکہ لکھنے کا ڈھنگ آتا تھا، بہت اچھا اندازِ نگارش تھا، تقریر کے فن سے بھی واقف تھے، پھر چونکہ گورنمنٹ آف انڈیا میں رہے تھے اور پھر پاکستان میں بھی مرکزی حکومت میں ڈپٹی سیکرٹری رہے تھے، تو ان کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا، چنانچہ ان کے حوالے سے یہ فکر ہمارے ہاں بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں آتا ہے "اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ" تو "اَطِيعُوا اللّٰهَ" سے مراد قرآن ہے اور "اَطِيعُوا الرَّسُولَ" سے مراد حضورؐ ہیں، لیکن آپؐ کی اطاعت صرف اُس دور کے لئے بحیثیتِ امیر جماعت، بحیثیت سپہ سالار، بحیثیت صدر مملکت تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک لفظ "مرکزِ ملت" وضع کیا ہے۔ ان کے نزدیک اُس وقت مرکزِ ملّت محمد [illegible] تھے، اب اگر کبھی اسلامی ریاست قائم ہو گی تو "مرکزِ ملت" کی حیثیت اس کی حکومت کو حاصل ہو گی۔ وہ حکومت جو بھی فیصلے کرے گی وہ واجب الاطاعت ہوں گے۔

یہ نقطۂ نظر اپنے اندر ایک دامِ فریب (trap) لئے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ قرآن کی تعبیرات کو سنت سے بالکل آزاد کر دیں تو آپ جدھر چاہیں الفاظ کو موڑ کر لے جائیں، اور ان کی جو چاہے تاویل کر لیں۔ قرآن مجید کی عملی تعبیر تو سنّتِ رسولؐ ہی سے سامنے آتی ہے۔ سنت رسول کے بارے میں یہ طے کر کے کہ یہ دائمی طور پر واجب الاطاعت ہی نہیں، آپ نے گویا اپنے لئے یہ حق حاصل کر لیا کہ قرآن مجید کے الفاظ کے جو

لی جا ہے معنی نکالیں۔ صلوٰۃ کے معنی معاشرہ کر دیں یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا یہ مطلب قرار دے دیں کہ اس سے مراد ایسا ماحول پیدا کرنا ہے کہ چور کو چوری کی ضرورت ہی نہ رہے۔ جیسے کوئی کہہ دے کہ تونے تو میرے ہاتھ کاٹ دیئے ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تونے میرے ہاتھ باندھ دیئے ہیں' میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک استعارے کے انداز کی بات ہے۔ اسی طرح ان کے نزدیک چوروں کے ہاتھ کاٹ دینے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں چوری کی ضرورت ہی نہ رہے۔ اب اگر ہر شخص صرف قرآن کے الفاظ لے کے بیٹھ جائے' اور اس کا تعلق سنت سے منقطع کر دے تو پھر ان الفاظ کی جو چاہے تعبیر کرلے' جو چاہے تاویل کرلے' جہاں چاہے چلا جائے' جدھر چاہے پہنچ جائے۔ اس اعتبار سے میں نے عرض کیا کہ ان دونوں میں بڑا باریک سا فرق ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں کے مابین ایک لفظی سا فرق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں مسلک تقریباً ایک ہیں۔

مذکورہ بالا اندازِ فکر نے ہمارے ہاں کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں کو بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر کیا ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ علامہ اقبال سے مجھے کس قدر تعلقِ خاطر اور ذہنی مناسبت ہے اور میرے دل میں ان کی کس قدر عظمت ہے۔ اگرچہ عمل کے معاملے میں وہ بہت پیچھے نظر آتے ہیں' لیکن فکر کے اعتبار سے وہ اس قدر بلندی پر ہیں کہ میں انہیں اسلام کے صحیح فکر کا مجدد مانتا ہوں اور انہیں چودھویں صدی کا "مجددِ فکرِ اسلامی" قرار دیتا ہوں۔ اس کے باوجود ان کے ہاں بھی کچھ مغالطے موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی کوئی نبی یا رسول نہیں تھے۔ ان کے خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں کچھ عبارات ایسی موجود ہیں جن میں ان دونوں مسلکوں کی کسی درجے میں تائید کا پہلو نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر معاف کرے۔ ۱۹۶۷ء میں میں نے "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" نامی کتابچہ تحریر کیا تھا جو ہماری پوری تحریک قرآنی کا آغاز ہے۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے ان خطبات کے بارے میں صاف لکھا تھا:

> "آج سے پینتیس چالیس سال قبل علامہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصہ تو اگرچہ بہت محل نظر ہے جو

شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علامہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عملی ڈھانچے کے سلسلے میں اور خاص طور پر اجتہاد کے ضمن میں ان کی بعض باتیں ایسی ہیں جن کو بنیاد بنا کر غلام احمد پرویز بھی اپنے آپ کو علامہ اقبال کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ بعض اعتبارات سے ان کا اپنے آپ کو اقبال سے منسوب کرنا غلط نہیں۔ لیکن علامہ اقبال بھی ہمارے لئے کوئی دلیل یا حجت نہیں ہیں۔ ہمارے لئے تو دین کے اندر حجت کتابُ اللہ اور سنّتِ رسول ﷺ ہے۔ چنانچہ جو چیز اس کے مطابق ہوگی اس کو لے لیں گے۔

البتہ میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت کا ماننا اور اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے اور ہمیں اتنا بالغ النظر ہو جانا چاہئے کہ اپنے بزرگوں کے بارے میں بھی اگر کوئی بات ایسی ہے تو ہم اس کو تسلیم کریں۔ تاہم اس سے یہ نہ ہو کہ ان کی عزت کم ہو جائے۔ اس لئے کہ ان کی خدمات کے پہلو کو سامنے رکھا جائے کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟ اس اعتبار سے کسی خاص معاملے میں ان سے اختلاف کے باوجود ان کی عقیدت' ان کی محبت اور ان کی عظمت ہمارے دلوں میں قائم رہ سکتی ہے' اور وہ ہمارے دلوں میں موجود ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ اپنے فکر کے مقابلے میں عملی اعتبار سے ان کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ کچھ لوگ اس اظہارِ حقیقت پر بڑے ناراض ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے نام کے ساتھ یا قائداعظم کے نام کے ساتھ "رحمتہ اللہ علیہ" کے الفاظ استعمال نہیں کرتا' حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم بھی ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔ لیکن رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ ہمارے ہاں ایسی شخصیتوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں جن کا کوئی دینی مقام ہو۔ وہ اولیاء اللہ میں سے ہوں یا ائمہ دین میں سے ہوں۔ مثلاً امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور امام ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ۔ ایسے حضرات جن میں دین پر عمل کے اعتبار سے کوئی کوتاہی نظر آ رہی ہو یا علمِ دین کے اعتبار سے ان کا کوئی بڑا مقام نہ ہو ان کے لئے "مرحوم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ میں اپنے والد صاحب کو بھی "والدِ مرحوم" کہتا ہوں۔ اسی طرح علامہ

اقبال اور قائداعظم کو بھی مرحوم کہتا ہوں۔ معنوی طور پر ان دونوں اصطلاحات میں کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے۔ مرحوم کے معنی بھی وہی ہیں۔ رحمت ہی سے مرحوم بنا ہے۔ "رحمتہ اللہ علیہ" کے معنی ہیں "اللہ کی رحمت ہو ان پر" اور مرحوم کے معنی بھی یہی ہیں۔ لیکن ہر لفظ کا جو ایک استعمال معیّن ہو جاتا ہے اسے ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کا استعمال صرف حضورؐ کے لئے، "علیہ السلام" صرف انبیاء کے لئے' اور "رضی اللہ عنہ" صرف صحابہ کے لئے تعاملِ اُمّت سے ثابت ہے۔ یہ ایک طرح کی نشانی بن جاتی ہے۔ باقی ائمہ دین 'علمی اعتبار سے ہوں یا صوفیائے کرام ہوں' ان کے لئے "رحمتہ اللہ علیہ" اور عام مسلمانوں کے لئے "مرحوم"۔ یہ ہمارا ایک استعمال (usage) ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہمارے یہاں بڑی بحثیں چلتی رہی ہیں۔ ایک زمانے میں اخبار میں اشفاق احمد صاحب کا بیان آیا تھا کہ "رات کا اقبال اور ہے' دِن کا اقبال اور ہے"۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اپنی شاعری میں اقبال کچھ اور ہے اور اپنی نثر میں اقبال کچھ اور نظر آتا ہے۔ یہ باتیں بالکل بے بنیاد نہیں ہیں۔ اصل میں اقبال کا فکر' ان کی سوچ اور ان کا جذبہ ان کی شاعری میں ہے۔ نثر میں جہاں انہوں نے فلسفے کے انداز میں بات کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں کچھ اونچ نیچ بھی ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ فلسفے کی اپنی حدود ہیں (limitations) فلسفہ اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ آپ جب فلسفے کا انداز اور اس کا راستہ اختیار کریں گے تو اس میں آپ کو ان حدود کا پابند ہونا پڑے گا۔

اس ضمن میں ہمارے ہاں تیسرا مکتبِ فکر یہ ہے کہ قرآن بھی بتمام و کمال 'لفظ بہ لفظ' ابدی اور دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے' سوائے اس کے کہ خود قرآن ہی سے ثابت ہو جائے کہ یہ حکم ابتدا میں تھا' اس کے بعد اس سے بہتر حکم آ گیا' (مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا) اور اسی طرح سنّتِ رسولؐ بھی دائماً واجب الاطاعت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین کو اہلِ سنّت کہا جاتا ہے' جو قرآن کے ساتھ سنتِ رسول کو بھی لازم سمجھتے ہیں۔ البتہ ان میں پھر دو بڑے بڑے مکاتب فکر موجود ہیں' جن میں سے ایک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سنّتِ رسول تو واجب الاطاعت ہے' لیکن ہمارے لئے خلفائے راشدین کے اجتہادات کی پابندی لازم نہیں ہے۔ یہ رائے ہمارے

ہاں اہل حدیث حضرات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے اپنے دور میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے جو فیصلے کئے، اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خلفائے راشدین تھے، لیکن ان کے یہ فیصلے انتظامی احکام (Executive Orders) کی حیثیت رکھتے ہیں، کتابِ قانون کا مستقل جزو نہیں بن سکتے۔

لیکن دوسرا موقف یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے بعد جو تیسری شے واجب اور لازم ہے وہ "اجماع" ہے اور اجماع بتمام و کمال دورِ خلافتِ راشدہ ہی کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں ابھی فرقے موجود تھے اور نہ ابھی ایک سے زائد حکومتیں تھیں۔ ایک ہی دار الاسلام تھا اور ایک ہی مرکزی نظام تھا۔ پھر وہاں جو خلفاء تھے وہ حضورؐ کے بہترین اور جاں نثار ترین ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ طویل ترین عرصے تک آپؐ کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم و تزکیہ سے فیض یاب ہونے والے لوگ تھے۔ لہٰذا ان کا اجتہاد، جسے اُس وقت تمام صحابہ کرام ﷢ کی تائید بھی حاصل ہو گئی، اجماعِ امت کی اعلیٰ ترین شکل کا مظہر تھا۔ لہٰذا یہ بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل "اہل سنت والجماعت" کہلاتے ہیں۔ ائمہ اربعہ کے پیرو کار، خواہ وہ حنفی ہوں، مالکی ہوں، شافعی ہوں یا حنبلی ہوں، یہ سب اہل سنت والجماعت ہیں۔ یعنی یہ قرآن کے بعد سنتِ رسولؐ اور سنت کے بعد اجماع (اور خاص طور پر خلافت راشدہ کا اجماع) کو بھی واجب سمجھتے ہیں اور اس کی پابندی تاقیامِ قیامت لازم سمجھتے ہیں۔ جبکہ اہلحدیث حضرات کا نقطۂ نظر، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس اعتبار سے مختلف ہے کہ وہ خلفائے راشدین کے اجتہاد کو، چاہے اسے لوگوں نے قبول بھی کر لیا ہو، ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ان کی حیثیت محض Executive Orders کی تھی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہر حکومت انتظامی معاملات کے لئے جو فیصلے کر دیتی ہے اس حد تک وہ بالکل صحیح ہیں، لیکن یہ مستقل طور پر واجب الاطاعت نہیں ہیں۔

نقطۂ نظر کے اس فرق کے حوالے سے میں مثال کے طور پر دو چیزوں کا فرق آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں تراویح کا جو سارا جھگڑا چلتا ہے یہ اسی بنیاد پر

ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلوم ہے کہ ایک تو آپ نے تراویح کی نماز عشاء کے ساتھ متصل پڑھی نہ کبھی پڑھائی۔ یہ تاکید فرمائی کہ انسان رمضان کی راتوں میں زیادہ سے زیادہ وقت قرآن کے ساتھ گزارے، لیکن اس کا کوئی نظام حضور نے نہیں بنایا۔ خود حضور کا معمول یہ تھا کہ عام دنوں میں آپ کی جو تہجد کی نماز ہوتی تھی، اس کو آپ رمضان میں مزید طویل کر دیتے تھے۔ گویا آپ تہجد کے وقت قیام اللیل فرماتے تھے۔ اِس وقت ہمارے ہاں تراویح کی جو خاص اصطلاح اور اس کی معین شکل موجود ہے یہ حضور کی زندگی میں ثابت ہی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ حضور نے اپنی حیاتِ طیبہ میں تہجد کے وقت بھی صرف تین دن باجماعت تراویح پڑھائی ہے۔ چوتھے دن کچھ لوگ کھنکارتے بھی رہے اور آپ کے حجرے کے باہر اشارے کرتے رہے کہ ہم منتظر ہیں لیکن آپ باہر نہیں نکلے اور آپ نے صبح کہہ دیا کہ اگر میں اس طرح پابندی سے پڑھاؤں گا تو یہ تم پر فرض ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے دل میں امت کے لئے جو شفقت اور رافت و رحمت تھی اس کے پیش نظر آپ کا طرز عمل یہ تھا۔ اس لئے کہ یہ ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے صبح سے شام تک کسّی چلائی ہو یا جن بیچاروں نے اینٹیں ڈھوئی ہوں اب وہ رات کو کیسے کھڑے رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب کے لئے فرض کر دینا تکلیف مالایطاق ہو جائے گا۔ یہ تھا حضور کا معاملہ۔ لیکن چونکہ آپ کی طرف سے اس کی تاکید تھی، لہٰذا اس تاکید کی وجہ سے مسلمان انفرادی طور پر رمضان المبارک کے دوران قیام اللیل کا خصوصی اہتمام کرتے تھے اور اس میں قرآن پڑھتے تھے، کوئی زیادہ پڑھتا تو کوئی کم۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا۔ پھر ایسا بھی ہونے لگا کہ مسجد نبوی کے ایک کونے میں چار آدمی کھڑے ہیں، کوئی ایک حافظ ان کو مل گیا ہے، وہ پڑھ رہا ہے اور وہ پیچھے کھڑے ہوئے سن رہے ہیں۔ کسی دوسرے کونے میں کچھ اور لوگ کھڑے ہو گئے۔ اسی طرح کچھ فاصلے پر ایک اور جماعت کھڑی ہو گئی۔ یہ نقشہ مسجد نبوی میں مَیں نے بھی دیکھا ہے۔ مسجدِ نبوی رمضانِ مبارک میں رات کو کھلی ہوتی ہے۔ باقی سارا سال تو عشاء کے تقریباً ایک گھنٹے بعد بند ہو جاتی ہے اور تہجد کی اذان کے ساتھ کھلتی ہے، لیکن رمضان المبارک میں رات بھر کھلی رہتی ہے۔ ۱۹۷۰ء کا

پورا رمضان میں نے مسجدِ نبویؐ کے ماحول ہی میں گزارا ہے' اور میں مدینہ منورہ میں مقیم رہا ہوں۔ ان دنوں میں نے یہ نقشے دیکھے ہیں کہ تراویح کی نماز ہو جاتی تھی لیکن اس کے بعد بھی لوگ کھڑے رہتے تھے۔ وہاں پر حفاظ بہت کثرت کے ساتھ ہیں' کچھ لوگ ایک حافظ کے پیچھے یہاں کھڑے ہیں' کچھ دوسرے کے پیچھے ادھر کھڑے ہیں' کچھ تیسرے کے پیچھے ادھر کھڑے ہیں اور قرآن سن رہے ہیں۔ تو یہ معاملہ تقریباً ساری رات چلتا رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں داخل ہوئے' اور یہ نقشہ دیکھا تو آپؓ نے کہا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ تمام مسلمان ایک امام کے پیچھے جمع ہو جائیں' باقاعدہ جماعت ہو اور عشاء کے متصلاً بعد تراویح کی بیس رکعت ادا کر لیا کریں۔ یہ حضرت عمرؓ کا اجتہاد ہے۔ اب جو تو حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو لازم مانتے ہیں وہ تو اس کے پابند ہیں۔ چنانچہ حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی چاروں مسالک تراویح کے معاملے میں حضرت عمرؓ کے اجتہاد کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے تین کے نزدیک تراویح بیس رکعت ہے اور امام مالکؒ کے ماننے والے تو بیس سے بھی زیادہ چھتیس (۳۶) کے قائل ہیں۔ اہل حدیث اس پر اَڑ کر کھڑے ہو گئے کہ جب یہ حضورؐ سے ثابت نہیں ہے اور یہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی فیصلہ ہے تو یہ واجب الاطاعت نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک وہ زیادتی یہ کرتے ہیں کہ پھر انہیں تین دن سے زیادہ باجماعت تراویح نہیں پڑھنی چاہئے اور عشاء کے ساتھ نہیں پڑھنی چاہئے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کا اتنا حصہ تو لے لیا کہ پورا مہینہ نماز تراویح باجماعت پڑھ رہے ہیں' اور اسے انہوں نے عشاء کے ساتھ متصل بھی کر دیا' لیکن اس بیس رکعت سے انہیں ایسی چڑ ہے کہ اس پر ان کی طرف سے لمبے لمبے مناظروں کے چیلنج ہوتے رہتے ہیں۔ بہرحال اس وقت میں اس مسئلہ کی تفصیل میں نہیں جا رہا' اس ضمن میں میری اپنی رائے میں نے عرض کر دی ہے۔ اصل میں یہ سمجھ لیجئے کہ یہ فرق کس وجہ سے ہے' کس بنیاد پر ہے۔

اسی طرح کا معاملہ "طلاق ثلاثہ" کا ہے' کہ کوئی شخص اگر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دے دیتا ہے تو ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ طلاق مغلظ ہو گئی' اب یہ رجعی طلاق نہیں ہے اور اس کو اسے واپس لینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ

کے زمانے تک یہ معاملہ تھا کہ آپ ؐ ایسے شخص سے پوچھ لیتے تھے کہ تمہاری نیت کیا تھی؟ آیا تم واقعتاً تین طلاقیں دینا چاہتے تھے یا تم ایسے ہی روا روی میں "طلاق' طلاق' طلاق" کہہ گئے جبکہ تمہاری نیت ایک ہی کی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ میری نیت ایک ہی کی تھی تو آپ اسے ایک ہی (رجعی) طلاق قرار دے کر رجوع کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ اگر وہ [illegible] میری نیت تو تین کی تھی لیکن اب میں رجوع کرنا چاہتا ہوں تو اسے اس کی اجازت نہ دی جاتی' بلکہ اسے بتادیا جاتا کہ اگر تمہاری نیت تین کی تھی تو اب طلاق مغلظہ واقع ہو چکی ہے اور اب تمہیں رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی یہ معاملہ ایسے ہی چلتا رہا۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا کہ لوگوں نے اس چیز کو اپنی بیویوں پر دھونس جمانے کا ذریعہ بنالیا ہے کہ جب غصہ آیا طلاق طلاق طلاق کہہ کر سارے کا سارا معاملہ ختم کر دیا' پھر یہ کہہ دیا کہ ہم نے تو ایک ہی طلاق دی تھی تین تو نہیں دی تھیں' لہٰذا ہم واپس لے لیتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک کھیل بن رہا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ دے دیا کہ اگر کوئی شخص ایک وقت میں تین طلاقیں دے گا تو وہ تین ہی شمار ہوں گی اور طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی اور ساتھ ہی اس انداز سے طلاق دینے والے کو کوڑے بھی لگیں گے کہ اس نے ایسا کام کیوں کیا۔ اس وقت ہمارے ہاں یہی کمی ہے۔ فقہ حنفی' فقہ مالکی' فقہ شافعی اور فقہ حنبلی سب میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں مغلظہ ہی شمار ہوتی ہیں' لیکن اس کے ساتھ جو کوڑوں کی سزا تھی وہ نکال دی گئی ہے۔ اگر ایک مجلس میں تین طلاق دینے والے کو کوڑوں کی سزا بھی ملتی ہو تو غصہ بہت کم لوگوں کو آئے گا۔ پھر لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ اجی میں نے غصے میں طلاق طلاق طلاق کہہ دیا تھا۔ انسان کا غصہ ایسا بے لگام نہیں ہوتا کہ بغیر سوچے سمجھے آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو طاقتور پر غصہ نہیں آتا کمزور پہ آتا ہے۔

اس طرح یہ چار نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آگئے۔ ایک یہ کہ قرآن بھی کمل طور پر binding نہیں' بلکہ اس کے صرف "General Principles" مستقل طور پر واجب الاطاعت (eternally binding) ہیں' جب کہ معین احکام اس دور کے لئے تھے۔ دوسرا موقف یہ کہ قرآن تو پورے کا پورا binding ہے' لیکن اس کی تعبیر ہم

جیسے چاہیں کریں گے' سنّتِ رسول ؐ سے اس کی تعبیر نہیں ہو گی' سنّتِ رسول ؐ صرف اپنے وقت کے لئے تھی۔ جب بھی اسلامی ریاست قائم ہو گی تو "مرکزِ ملت" کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ قرآن کی جو چاہے تعبیر کرے اور اس کی تعبیر اپنے وقت میں واجب العمل ہو گی۔ چنانچہ غلام احمد پرویز کا قول یہ تھا کہ جب تک نیا مرکزِ ملت وجود میں نہیں آتا نمازیں پانچ ہی رہیں گی۔ لیکن جب اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی اور نیا مرکزِ ملت وجود میں آ جائے گا تو اسے پورا اختیار ہو گا کہ چاہے تو پانچوں کو منسوخ کر دے' چاہے تو نماز کی ہیئت ہی بدل دے۔ اس لئے کہ نماز کی یہ ہیئت اور شکل قرآن کے اندر موجود نہیں ہے۔ یہ تو سنّتِ رسول ﷺ سے ثابت شدہ ہے۔

پھر دو موقف میں نے آپ کو ان لوگوں کے بتائے ہیں جو سنت کو لازم سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہلحدیث ہیں جو سنت کو تو لازم سمجھتے ہیں لیکن سنّتِ خلفائے راشدین کو دائمی طور پر واجب العمل نہیں سمجھتے۔ اور ایک موقف اہل سنت والجماعت کا ہے جو قرآن کے بعد سنّتِ رسول ﷺ' اس کے بعد اجماع اور خاص طور پر خلفائے راشدین کے دور کے اجماع کو بھی مستقل طور پر واجب الاطاعت اور واجب العمل مانتے ہیں۔

پانچواں مسلک ائمہ مجتہدین کا ہے' جنہوں نے قرآن' سنّتِ رسول ؐ اور اجماعِ امت کو کتابِ قانون کے مستقل اجزاء سمجھتے ہوئے' ان کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے اپنے اجتہادات کئے۔ ان ائمہ مجتہدین نے مذکورہ بالا تینوں مآخذ سے استنباط کرتے ہوئے اپنے اصول فقہ مرتب کئے کہ قرآن سے قوانین اخذ کرنے کے کیا اصول ہیں' حدیث کی درجہ بندی کیسے کی جائے گی' دو حدیثیں بظاہر ایک دوسرے سے متعارض ہوں تو پھر اس مسئلے کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث یہ ہے کہ "جب بھی تم مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ضرور پڑھو" یہ تحیۃ المسجد ہے جو مسجد کا حق ہے۔ یہ گویا مسجد کے ساتھ آپ کی greeting ہے۔ ایک اور حدیث یہ ہے کہ فجر کی نماز کے بعد سے لے کر سورج کے اچھی طرح طلوع ہو جانے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور عصر کی نماز کے بعد سے سورج کے غروب ہونے تک کوئی سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص مغرب سے نصف گھنٹہ قبل مسجد میں آتا ہے اور وہ عصر کی نماز پڑھ

چکا ہے تو دونوں احادیث میں سے کس پر عمل کرے جبکہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ آیا وہ تحیۃ المسجد ادا کرے یا نہ کرے؟ اس ضمن میں جمہور فقہاء کا اصول یہ ہے کہ نہی کی حدیث امر کی حدیث پر مقدم ہوتی ہے۔ یعنی حکم دینے والی حدیث کے مقابلے میں روکنے والی حدیث زیادہ قوی شمار کی جائے گی اور جس حدیث میں کوئی حکم دیا جا رہا ہو تو اس کی تعمیل نہی والی حدیث کی روشنی میں کی جائے گی۔ چنانچہ ایسے وقت میں تحیۃ المسجد ادا نہیں کرنی چاہئے۔ بعض علماء کی اس کے برعکس رائے بھی موجود ہے۔ بہرحال ہر فقہی رائے کی پشت پر کوئی اصول کارفرما ہوتا ہے۔

انہی اصولِ فقہ کی بناء پر ہمارے ہاں فقہی مسالک وجود میں آگئے کہ یہ فقہ حنفی ہے' یہ فقہ مالکی ہے' یہ فقہ شافعی ہے اور یہ فقہ حنبلی ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کے چار مسالک ہیں۔ ان کے مابین اجتہاد کے چاروں مآخذ مشترک ہیں۔ یعنی i) قرآن ii) سنت iii) اجماعِ امت اور iv) قیاس۔ ان میں سے چوتھے ماخذ (قیاس) کے ضمن میں ہر مسلک کے پیروکار اپنے امام کے قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔ چاروں ائمہ "مجتہدِ مطلق" کہلاتے ہیں۔ ان ائمہ اربعہ کے پیروکاروں کے نزدیک اب اجتہاد ان مسالک کے اندر اندر ہی ہو گا۔ اس کو اجتہاد فی المذہب کہتے ہیں۔ یعنی احناف کے ہاں جو بھی اجتہاد ہو گا وہ مذہبِ حنفی کے اصولوں کے مطابق ہو گا۔ اگرچہ اصولی طور پر وہ مانتے ہیں کہ ان ائمہٗ مجتہدین کے بعد بھی کوئی مجتہدِ مطلق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ بھی تو انسان ہی تھے' نحنُ رِجالٌ وھُم رِجالٌ۔ اگر وہ اجتہاد کر سکتے تھے تو ان کے پانچ سو سال بعد پیدا ہونے والے امام ابن تیمیہؒ اجتہاد کیوں نہیں کر سکتے' جنہوں نے کتاب و سنت سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اور جنہیں سب علم کا بحرِ ذخار مانتے ہیں' لیکن عملی طور پر ائمہ اربعہ کے مقلدین اجتہاد فی المذہب ہی کے قائل ہیں۔

اجتہاد کے لئے شرائطِ اہلیت

اجتہاد کے ضمن میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ اجتہاد کی شرائط کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے ہاں بڑا اختلاف رائے (controversy) پایا جاتا ہے۔ ایک

طرف جدید دانشور کہتے ہیں کہ اجتہاد کا حق سب کو حاصل ہے' آپ کون ہوتے ہیں کسی کو روکنے والے؟ اور دوسری طرف ہمارے علماء یہ کہتے ہیں کہ جب تک آپ نے چودہ علوم کی تحصیل نہ کی ہو آپ اس بارے میں زبان بھی نہیں کھول سکتے۔ اس ضمن میں میری رائے یہ ہے کہ اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے کچھ بنیادی شرائطِ اہلیت ہیں۔ اگر ہر شخص اپنے آپ کو مجتہد سمجھنے لگ جائے تو پھر تو دین بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔ اگر ایک شخص نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ کسی کو نسخہ لکھ کر دے رہا ہے تو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو گی؟ ایسا شخص تو مریض کی زندگی کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ اسی طرح اجتہاد کے لئے بھی جس بنیادی اہلیت کی ضرورت ہے اس کی چند لازمی شرائط ہیں۔ مثلاً :

۱) عربی کی گہری ممارست : اجتہاد کے لئے سب سے پہلے عربی زبان سے براہ راست واقفیت ضروری ہے' محض تراجم کی مدد سے قرآن و حدیث اور دیگر امہات الکتب تک رسائی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ترجمے کے ذریعے انسان کبھی بھی کسی شے کی اصل روح تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اجتہاد کے اصل مآخذ (sources) کتاب و سنت اور ائمہ محدثین و مجتہدین کی تمام تر کاوشیں عربی زبان میں ہیں۔ لہٰذا جب تک عربی کا بہت گہرا فہم بلکہ ذوق پیدا نہ ہو جائے اجتہاد کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ آدمی میں عربی ادب کا ذوق پیدا ہو جائے تبھی وہ یہ جان سکتا ہے کہ کہیں بظاہر عموم نظر آتا ہے لیکن اس سے مراد خصوص ہے' اور یہ کہ فلاں لفظ کس جگہ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور کہاں یہ محاورے اور استعارے کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ جب تک انسان میں عربی کا گہرا فہم نہ ہو' اسے ادب سے واقفیت نہ ہو' صَرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے شناسائی نہ ہو' غرضیکہ عربی زبان پر ہر اعتبار سے دسترس حاصل نہ ہو اسے اپنے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ قانونی طور پر کسی شخص پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی اور ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ بات کہے۔ لیکن اجتہاد کرنے والے کو خود سوچنا چاہئے کہ یہ کام اس کے کرنے کا ہے یا نہیں۔

۲) تفسیر و تاویل کا علم : قرآن کی تفسیر سے واقفیت اور اس کی تاویل کا علم بھی اجتہاد کی اہلیت کے لئے ضروری شرط ہے۔ اگر آپ نے صرف انڈیکس کی مدد سے دیکھ لیا کہ قرآن میں فلاں مضمون کہاں کہاں آیا ہے اور وہ آیتیں نکال کے دیکھ لیں تو یہ اجتہاد کے لئے کافی نہیں۔ قرآن حکیم کی آیات میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ بھی ہے اور عام و خاص کا بھی۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ کوئی لفظ کس وقت کس معنیٰ میں آ رہا ہے۔ کوئی لفظ اپنے لغوی مفہوم میں آ رہا ہے یا اس کا اپنا کوئی اصطلاحی مفہوم ہے۔ اگر آپ کو تفسیر و تاویل کا علم حاصل نہیں ہے تو آپ قرآن سے اجتہاد کیسے کریں گے؟

۳) علومِ حدیث سے واقفیت : اجتہاد کی اہلیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان حدیث کے تقریباً پورے ذخیرے سے گزر چکا ہو' جسے ہمارے ہاں دورۂ حدیث کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں حدیث کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تیزی کے ساتھ ذخیرۂ حدیث سے گزارا جاتا ہے' لیکن اس کی اپنی افادیت ہے۔ آدمی تقریباً پوری صحاح ستہ سے ایک بار تو تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ اس کے بعد جب انسان احادیث پر غور و فکر اور تدبّر کرے تو پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک ایک حدیث پر ایک ایک کتاب لکھ دے۔ پھر حدیث کا معاملہ قرآن کی نسبت کہیں زیادہ مشکل ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل تو حدیث کی نسبت بہت آسان ہے' جبکہ حدیث کا علم بہت مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ فلاں لفظ قرآن ہی کا ہے۔ اور جو کچھ قرآن میں ہے وہ سب کا سب تواتر سے ثابت ہے۔ لیکن احادیث کی تو جانچ پرکھ کرنی پڑتی ہے کہ یہ ضعیف ہے' یہ قوی ہے' یہ خبر احاد ہے۔ اس حدیث کے فلاں راوی کے اندر یہ سقم ہے اور فلاں کے اندر یہ ہے۔ پھر حدیث کی درجہ بندیاں ہیں' اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کا ایک سلسلہ ہے' روایت اور درایت کا علم ہے' سَنَد اور متن کا معاملہ ہے۔ غرضیکہ یہ بہت مشکل کام ہے' آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ مانتے ہیں کہ سنت رسول ﷺ اسلامی قانون کا مستقل اور دائمی ماخذ (source) ہے تو اس کی واقفیت کے بغیر اجتہاد کیسے کریں گے؟

۴) اصول فقہ سے آگاہی : اجتہاد کی صلاحیت کے لئے ائمہ مجتہدین کے بنائے ہوئے

اصولِ فقہ سے واقفیت بھی ازبس ضروری ہے۔ اس اعتبار سے آج کل کے علماء بھی بالکل ناکام ہیں کیونکہ وہ اپنے مسلک کے اصول فقہ سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن دوسرے مسالک کے اصول سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ مثلاً حنفی مسلک کا کوئی مدرسہ ہے تو وہاں فقہ حنفی کے اصول فقہ تو پڑھائے جاتے ہیں جبکہ دوسری تینوں فقہوں کے اصولوں سے وہاں پر کوئی آگاہی نہیں ہوتی، وہ انہیں پڑھائے ہی نہیں جاتے۔ حالانکہ مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب کے اصولوں سے واقف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ امام ابو حنیفہ نے کوئی بات کہی ہے تو ان کا مستدل کیا تھا اور کس اصول کے تحت انہوں نے فلاں حدیث کو مرجوح قرار دیتے ہوئے اپنی رائے کو اس پر راجح قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمہ کے اصول فقہ معلوم ہونا بھی ضروری ہیں۔ ائمہ مجتہدین میں سے اصول فقہ کے بانی امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ہیں اور اس ضمن میں ان کی "کتابُ الاُم" بڑی معرکتہ الآراء کتاب ہے، لیکن ہمارے علمائے کرام اس کا مطالعہ بھی نہیں کرتے۔ مجتہد کے لئے اصول فقہ سے واقفیت کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ مختلف ائمہ کرام نے کس کس مسئلے میں کیا رائے دی ہے اور سلف کے اجتہادات کیا ہیں؟

۵) <u>دورِ جدید کے مسائل سے واقفیت</u> : مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ اب میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں کہ جو طبقہ علماء میں سے کوئی بھی نہیں کہے گا اور وہ یہ کہ آپ جس دور میں اجتہاد کرنے چلے ہیں آپ کو اس دور کے ظروف و احوال اور اس دور کے مسائل سے براہ راست واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ کو پتہ ہی نہیں کہ بینکنگ کس بلا کا نام ہے، پیپر کرنسی کس شے کا نام ہے اور سٹاک مارکیٹ کیا ہے؟ تو پھر آپ کیا اجتہاد کریں گے؟ ایک شے کا آپ نے آج کے ماحول پر اطلاق کرنا ہے اور اس کے بارے میں آپ کو معلومات ہی نہیں تو آپ اجتہاد کیسے کریں گے، اگرچہ آپ کو قرآن و حدیث کا علم بھی حاصل ہو؟ چنانچہ دورِ جدید میں اجتہاد کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ اِس دور کے نظریات و افکار جو ہماری تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور اِس وقت دنیا کے نظام کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں، کم از کم ان کے اصول و مبادی سے تو واقفیت ہو اور خاص طور پر دنیا میں جو سیاسی نظام چل رہا ہے، اس کے بارے میں معلومات ہوں،

State Craft کے بارے میں آگاہی ہو۔ ریاست کے جو تین ستون شمار ہوتے ہیں' یعنی انتظامیہ (Executive)' عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) اور ان تینوں کے مابین قدغنی توازنِ اقتدار (Checks and Balances) کے نظام کا فہم حاصل ہو۔ پھر اگر کسی شخص کو یہی پتہ نہیں کہ آج کی معاشیات اور اقتصادیات کیا ہیں' تو وہ مجتہد کیسے ہو جائے گا؟ میرے نزدیک یہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کچھ لوگ تو کتاب و سنت اور فقہ کے جاننے والے ہیں' چاہے انہوں نے صرف فقہ حنفی پڑھی ہے اور امام شافعی کے اصول نہیں پڑھے' لیکن جدید علوم سے بالکل ناواقف ہیں' الا ماشاء اللہ' شاذ ہی کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں علماء میں سے اس وقت مولانا تقی عثمانی صاحب ہیں کہ انہوں نے علوم جدیدہ کا مطالعہ بھی کیا ہے' انگریزی زبان پڑھی ہے' جدید قانون پڑھا ہے اور اس میں انہیں درک حاصل ہے۔ لیکن ایسے لوگ بالکل شاذ ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے ہاں علماء پر تقلید کا جو سخت دباؤ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے دائرے سے باہر نکلنے کو تیار نہیں ہوتے' اس لئے کہ انہیں علم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ برادری سے باہر ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے حنفیوں کی عام روش سے ہٹ کر بات کہہ دی تو حنفی دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس میں انسان کو بہت سی مصلحتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ کوئی شخص اپنی برادری سے باہر ہونا آسانی سے پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف ہمارے ہاں جو جدید تعلیم یافتہ افراد ہیں وہ دینی علوم سے بے بہرہ ہیں۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے' علامہ اقبال کے بعض الفاظ اور بعض جملوں سے جو "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں آئے ہیں' ان خیالات کی بھی کچھ تائید مل جاتی ہے' یا یوں کہنا چاہئے کہ ان سے کسی نہ کسی طرح ان نظریات کی تائید حاصل کی جاسکتی ہے جو میں نے پہلے دو مسالک کے ضمن میں بیان کئے ہیں۔ یعنی (i) قرآن مجید کے بھی صرف عمومی اصول دائمی طور پر واجب العمل ہیں اور معین احکام مخصوص حالات کے لئے تھے۔ (ii) قرآن تو دائمی ہے لیکن سنت رسول' ہمیشہ کے لئے واجب العمل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے قلم سے کچھ چیزیں ایسی نکلی ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو ان سے

معنی نکال سکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کے اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل اقبال اپنی شاعری میں ہے۔ شاعری میں انسان بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے اصل تصورات اور اصل فکر کو بیان کرتا ہے۔ پھر اس میں جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جبکہ آپ نثر لکھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کو صغریٰ کبریٰ جوڑ کر بات کرنی پڑتی ہے اور آپ اس میں اپنے وجدان یا اس طرح کے کسی اور ماخذ کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ شاعر آدمی جب شعر کہہ رہا ہوتا ہے تو اپنے وجدان (intution) اور اپنے اندرونی جذبات و احساسات کے حوالے سے بہت سی باتیں کہہ دیتا ہے۔ یہ باتیں وہ ہوتی ہیں جنہیں آپ محسوس کر سکتے ہیں لیکن انہیں مدلل نہیں کر سکتے۔ اپنے اذعان (conviction) کے بارے میں آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ "I cannot prove it but I do feel it" شاعری میں انسان کے احساسات و جذبات، اس کے وجدان، اور اس کے ذاتی اذعان (personal convictions) سب کچھ آ جاتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ اقبال کو کلی طور پر دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو اپنی شاعری میں ملے گا نہ کہ نثر میں۔

تو شاعری میں اب دیکھئے اقبال اجتہاد کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؎

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر　　اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

یعنی عالمانِ کم نظر کے اجتہاد سے تو یہی بہتر ہے کہ اسلاف کی جو آراء ہیں انہی کی پیروی کی جائے۔ اس شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بہت بڑا مقلد ہے جو "اقتدا بر رفتگاں" کا درس دے رہا ہے۔ اس لئے کہ اپنے اسلاف کے بارے میں ہم خوب جانتے ہیں، ائمہ مجتہدین کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ جنس بازاری نہیں تھے جسے خریدا جا سکتا ہو۔ ان کی پوری زندگیاں درویشی میں گزریں، انہوں نے دنیا نہیں بنائی۔ ہاں یہ ماننا پڑے گا کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ کسی مجتہد کے بارے میں ہماری رائے یہ نہیں ہے کہ وہ معصوم ہے۔ اصول یہ ہے کہ "مجتہد مخطی" کو بھی اکہرا ثواب ملتا ہے، جبکہ "مجتہد مصیب" دوہرے ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ ایک شخص نے پوری طرح مشقت اٹھائی ہے، محنت کی ہے، خوب سوچا ہے، خوب کھنگالا ہے، اپنی پوری صلاحیت اور استعداد صرف کی

ہے' اس کے بعد ایک بات کہہ رہا ہے' لیکن غلط کہہ گیا تو وہ ثواب سے تو محروم نہیں رہے گا۔ اس کو بھی اکہرا ثواب ملتا ہے۔ اس کی محنت و مشقت رائیگاں نہیں جاتی۔ جبکہ مجتہد مصیب' جو صحیح رائے تک پہنچ گیا ہے' اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اس حوالے سے اقبال کہہ رہے ہیں کہ جو لوگ دنیا سے چلے گئے اور ان کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ ان کی زندگیاں اس طور سے گزریں کہ وہ دنیا کے طالب نہیں تھے' ان کا تقویٰ اور ان کی للٰہیت سے ہم باخبر ہیں' ان کی اقتدا میں لگے رہنے میں کم اندیشے اور خطرات ہیں' بہ نسبت اس کے کہ ہم عالمانِ کم نظر کے اجتہادات کے مطابق اپنی زندگی کے رخ کو ڈھال دیں۔

عالمانِ کم نظر کی وضاحت میں کر چکا ہوں۔ جس شخص میں مذکورہ بالا شرائط موجود نہیں وہ عالمِ کم نظر ہے۔ نوٹ کیجئے کہ جو شخص قرآن و سنت اور حدیث کا تو پورا ماہر ہے لیکن جدید علوم اور دورِ جدید کے مسائل سے واقف نہیں وہ بھی عالمِ کم نظر ہے۔ مجتہد کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج کا مسئلہ کیا ہے۔ اگر وہ مسئلے کی پیچیدگیوں ہی سے واقف نہیں ہے تو اسے حل کیسے کرے گا۔ اور "عالمانِ کم نظر" کا سب سے بڑا اطلاق ان دانشوروں پر ہو گا جو اگرچہ پی ایچ ڈی کر کے آئے ہوں' جدید علوم کے ماہرین شمار ہوتے ہوں' لیکن انہیں عربی زبان بھی نہیں آتی اور وہ تراجم کی مدد سے اور انڈکس کے سہارے قرآن مجید سے آیات نکال کر ان کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ اور تراجم بھی وہ اختیار کرتے ہیں جو مستشرقین کے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ان مستشرقین کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں ہی عرض کر دیا تھا' یہ ایک اصولی بات ہے۔ باقی یہ کہ اسلامی ریاست میں بات کہنے کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہو گا۔ اصل فیصلہ طلب بات یہ ہو گی کہ وہاں پر یعنی اسلامی ریاست میں کس کا اجتہاد نافذ ہو گا۔ فرض کیجئے میں بھی مجتہد بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور کوئی دوسرا شخص بھی مجتہد ہے تو سوال یہ ہے کہ کس کا اجتہاد قانون کی کتاب کا جزو بنے گا۔ اس مسئلے کا تعلق دراصل نفسِ اجتہاد سے نہیں ہے بلکہ ریاست کی نوعیت سے ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس میں طاقت اور اختیارات کا سرچشمہ کون ہے؟ اس ریاست کا دستوری ڈھانچہ کیا ہے؟ اس کا

(باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ کیجئے)

روزے کی عبادت
حکمت و مقاصد

تحریر : عمران این حسین
ترجمہ و تلخیص : ڈاکٹر احمد افضل

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اور ہر ایک سے اس کی بھیڑوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے آج شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایسے چرواہے پیدا ہو گئے ہیں جو اپنی بھیڑوں کی حفاظت کرنے کے بجائے انہیں خود بھیڑیوں کے آگے ڈال رہے ہیں۔ یہ ہمارے وہ رہنما ہیں جو اپنی بے علمی کے باوجود اجتہاد کر کے بینک کے سود کو حلال قرار دیتے ہیں۔ مسلم دنیا میں صورت حال اس سے بھی زیادہ سنگین ہے' جہاں بھیڑوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خود بھیڑیوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے! رمضان اور صوم سے متعلق یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے قائد اور رہنما اسے غور سے پڑھیں گے اور یہ ان کے لئے صحیح طرز عمل کو واضح کرنے کا باعث بنے گا۔ ان شاء اللہ۔

آج امتِ مسلمہ کی حالت زار ایک انتہائی کمزور شخص کی سی ہے جس کے بدن پر جابجا بڑے بڑے زخم ہوں اور جن سے مستقل خون رس رہا ہو۔ کشمیر' فلسطین' بوسنیا اور دوسرے خطوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہماری اجتماعی کمزوری اور بے بسی کا عکاس ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ان حالات پر کڑھتے ہیں لیکن ہمارے قائدین اور مقتدر افراد کو اپنے آرام و آسائش سے ہی فرصت نہیں ہے۔ دوسری طرف قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ "قوت" فراہم کریں تا کہ اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ اور مرعوب کیا جا سکے (الانفال ۸ : ۶۰)' تا کہ ظالموں کے خلاف

جنگ کی جا سکے (الحج ۲۲ : ۳۹-۴۱) اور تاکہ مظلوموں کی دادرسی ممکن ہو سکے (النساء ۴ : ۷۵)۔ "قوت" کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کی بدولت ہی وہ حالات پیدا ہو سکیں گے جن کی بدولت غیر مسلموں کے لئے اسلام کی سچائی مبرہن اور واضح ہو گی (الانفال ۸ : ۷-۸) سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ اپنی کمزوری اور بے بسی سے کیونکر نجات پائے؟ وہ اس "قوت" کو کس طرح دوبارہ حاصل کرے جس کے حصول کا قرآن حکیم حکم دے رہا ہے؟ غور طلب امر یہ بھی ہے کہ قرآن کی رو سے "قوت" کیا ہے اور کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ کیا مال و دولت اور اسباب و وسائل سے "قوت" کا حصول ممکن ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو قریش کی فوج بے سروسامان مهاجرین سے بدر کے معرکے میں شکست نہ کھاتی، اور نہ ایک سپرپاور کی کیل کانٹے سے لیس افواج کو ویت نام میں ذلت آمیز ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ مال و دولت، اسباب و وسائل اور اسلحے کی فراہمی فی الواقع "قوت" کے حصول کے لئے نہایت اہم ہیں، لیکن انہیں "قوت" کی اساس نہیں کہا جا سکتا۔ اصل میں "قوت" تو آزادی، علم، اخلاقی اقدار، ایمان، اتحاد، بھائی چارے، نظم، اور صالح قیادت ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

آج امت مسلمہ اپنے فیصلے خود کرنے کی آزادی سے بھی محروم ہو چکی ہے، لیکن سیاسی و معاشی آزادی کے حصول سے پہلے ایک باطنی قسم کی آزادی کا حصول لازم ہے۔ ایک مشہور حدیث قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا"۔ یہ نکتہ جتنا سادہ ہے اسی قدر اہم اور زوردار بھی ہے کہ اگر ہم خاص اللہ کے لئے روزہ رکھنا سیکھ لیں تو اس کی برکت سے صرف اللہ کے لئے جینے کی راہ بھی ہم پر کھلتی چلی جائے گی۔ فی الحقیقت وہی مسلمان صحیح معنوں میں آزاد ہے جو صرف اللہ کے لئے زندگی گزارتا ہے، جس کے اعمال و افعال کے پیچھے صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور جسے اللہ کے معاملے میں دنیا اور دنیا والوں کی تنقید یا ملامت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ رمضان کے روزے کی بدولت ایک مسلمان میں اخلاص کی یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جو اس کی باطنی آزادی کا سبب بنتی ہے، اور یہ باطنی یا حقیقی آزادی ہی آگے چل کر پوری امت کے لئے سیاسی و معاشی آزادی کی راہ کھولتی ہے جو "قوت" کی بنیادوں

میں سے ایک بنیاد ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارے درمیان ایسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو سیکولرازم کے زیر اثر رمضان کے روزوں کے ضمن میں لاتعلقی اور بے اعتنائی کی روش اختیار کرتے ہیں، اور جو اکثروبیشتر روزہ رکھنے کو ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ ایسے مسلمانوں کو جان لینا چاہئے کہ لادینیت کی بنیاد پر قائم معاشرے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اثر اور دباؤ کی وجہ سے حق و باطل، حلال و حرام، اور معروف و منکر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رفتہ رفتہ کم ہو کر بالآخر مٹ جاتی ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے اذہان سے یہ تصور بھی محو ہو جاتا ہے کہ بعض افعال "گناہ" ہیں۔ لادین معاشرے میں اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود انسان اور اس کی خواہشات مرکزی اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔ یہ وہ انجام ہے جو امریکہ میں یہودیت اور مسیحیت کو پیش آچکا ہے، اور جس کا اب اسلام اور مسلمانوں کو بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے لئے ناگزیر تھا کہ ان کے مذاہب لادینیت کے سیلاب میں بہہ جاتے، کیونکہ انہوں نے اللہ کی عطا کردہ سچائی کو مسخ کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس اس ضمن میں کوئی عذر نہیں ہے، اس لئے کہ قرآن کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، نیز اس کی بنیاد پر ایک مقدس معاشرے کی تشکیل کا پورا نمونہ بھی حضور ﷺ کی سنت میں موجود ہے۔ اگر ہم سیکولرازم کی جاہلیتِ جدیدہ میں گم ہو کر اپنا تشخص نہیں کھونا چاہتے تو لازم ہے کہ ہم ہروقت یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھیں کہ اسلام عالم انسانیت کے سامنے زندگی اور تمدن کا ایک متبادل نمونہ رکھتا ہے۔ ایک ایسا مقدس نمونہ جو سیکولر نمونے کے برعکس عالم غیب اور ماورائی حقیقتوں سے ماخوذ ہے۔ روزے کی عبادت ہمارا تعلق اس ماورائی عالم کے ساتھ استوار کرتی ہے اور اسی تعلق کی بدولت ہماری مادی اور عالم غیب کی مقدس دنیا کے مابین ہم آہنگی جنم لیتی ہے۔ مقدس زندگی وہ ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے بسر کی جائے۔ یہ وہ زندگی ہے جسے اختیار کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اور یہی راستہ "قوت" کے حصول کا راستہ ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا۔ امید ہے کہ اس سے تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو

گی"۔ (البقرہ : ۱۸۳)

یعنی روزے کی عبادت ہمیشہ سے مذہبی طرز حیات کا لازمہ رہی ہے، اور اس کا مقصد تقویٰ یا خدا ترسی کا حصول ہے۔ تقویٰ ہی وہ کسوٹی ہے جس سے ہم روزے کی افادیت کو جانچ سکتے ہیں۔ اگر روزے کی بدولت کسی شخص میں تقویٰ پیدا ہو رہا ہے تو گویا روزے کی عبادت سے اصل مقصود حاصل ہو رہا ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں سیدھے اور صحیح راستے سے انحراف کیا گیا ہے۔ اگرچہ آج دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت روزوں کی پابندی کرتی ہے، تاہم بڑی تعداد میں مسلمان ایسے بھی ہیں جو رمضان کے روزے نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ مغربی تہذیب اور مادہ پرستانہ طرز فکر کا اثر ہے، کیونکہ جدید ذہن تقویٰ یا خدا ترسی کو سرے سے کوئی اہم یا مطلوب شے سمجھتا ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ روزہ اس لئے نہیں رکھتے کہ یہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات میں خلل ڈالتا ہے، یا وہ لوگ جدید تمدن کی آسائشوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ کسی قسم کی مشقت جھیلنے کے لئے خود کو تیار نہیں پاتے۔ ایسے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کر کے "اسلام" یعنی اطاعت و فرمانبرداری کے دائرے سے تجاوز کر رہے ہیں۔

تقویٰ کی ایک جہت اخلاقی ہے اور دوسری روحانی۔ اخلاقی لحاظ سے تقویٰ کا اظہار اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اوامر ونواہی کی پابندی سے ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ "قوت" کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے۔ امت مسلمہ کی "قوت" کا اظہار سب سے پہلے غزوۂ بدر (۱۷/ رمضان) کے موقع پر ہوا، اور یہی وہ رمضان تھا جس سے متصلاً قبل روزے کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تھا۔ یہ بات روز روشن کی طرح ہم پر واضح ہو جانا چاہئے کہ رمضان کے روزوں کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں میں "قوت" پیدا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز وحی کے ۱۴ برس بعد فرضیت صوم کے احکام نازل ہوئے، یعنی عین اس موقع پر جب جنگوں کا آغاز ہونے والا تھا۔ روزے کی بدولت اخلاقی اقدار استوار ہوتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں، اور "قوت" کا دارومدار انہی اخلاقی اقدار پر ہے۔ کسی قوم کی اخلاقی صحت ہی اس کی بقا، استحکام اور نشوونما کی ضامن ہوتی ہے

چنانچہ قرآن بار بار مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ اخلاقی زوال کے نتیجے میں کس طرح اقوام ہلاک ہو جاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی عبادت قومی استحکام اور ایک صحت مند معاشرے اور تمدن کی تعمیر کے لئے بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اخلاقی اقدار صرف مذہب ہی کی بدولت پیدا ہو سکتی ہیں' لادینیت میں اخلاقی اقدار کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ جدید قومی ریاست کی بنیاد سیکولرازم اور وطنی قومیت پر رکھی گئی ہے' یہی وجہ ہے کہ ایسی ریاست میں مذہب ایک طاقتور اخلاقی داعیہ کی حیثیت سے معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا نہیں کر پاتا۔ دوسری طرف قومی ریاست کے لئے یہ امر محال ہے کہ وہ وطنیت کی تنگ نظری سے ماوراء ہو کر مطلق اخلاقی اقدار کے تصور کو قبول کرے' کیونکہ اس کے لئے اسے تمام نوع انسانی کی وحدت اور اخوت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

تقویٰ کی ایک روحانی جہت بھی ہے جس کا دارومدار ماورائے حواس حقائق پر ہے۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ قرآن کی واقعی اور نتیجہ خیز ہدایت سے وہی افراد فیضیاب ہو سکتے ہیں جنہیں تقویٰ کی دولت حاصل ہو۔ تقویٰ کے اجزائے ترکیبی میں سب سے پہلی شے غیب پر ایمان ہے' پھر اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ' قرآن مجید اور گزشتہ صحیفوں پر ایمان' اور آخر میں آخرت پر مکمل یقین! معلوم ہوا کہ تقویٰ کا انحصار بنیادی طور پر اس حقیقت کو ماننے پر ہے کہ اس مادی دنیا کے سوا جس میں ہم رہتے ہیں ایک اور عالم بھی ہے جو ہمارے حواس کی گرفت سے ماوراء ہے۔ ہماری یہ دنیا عارضی اور فانی ہے' جبکہ یہ عالم غیب یا ماورائی دنیا مستقل اور پائیدار حقیقتوں کی مظہر ہے۔ ہماری دنیا ایک روز ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ پھر ایک دوسرا عالم پیدا کرے گا' جہاں تمام انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب ہو گا اور پھر انہیں ان کی جزاء یا سزا ملے گی۔ تقویٰ کا دارومدار اس حقیقت کو سمجھنے پر بھی ہے کہ "دین" ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے' تمام آسمانی صحیفوں اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود "الحق" ہے' اور اس کی ذات واحد اور احد ہے' اس لئے سچائی بھی صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ دین کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ ہم سچائی کا احترام کریں خواہ وہ کسی بھی گروہ سے ہمیں حاصل

ہو۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ زندگی کو آخرت کی فلاح کے لئے بسر کرے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کے لئے زندگی بسر کرے! قرآن حکیم کی رو سے قربانی کے جانوروں کا گوشت اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ انسانوں کا تقویٰ اللہ تک پہنچتا ہے۔ یعنی دین کی اصل روح تقویٰ ہے' اور روزے کی بدولت ایک انسان دین کی روح تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ انسان کا تقویٰ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ سکے' نفس انسانی کو ایک ایسی راہ طے کرنا پڑتی ہے جو اسے درجہ بدرجہ جسمانی سے اخلاقی' اور اخلاقی سے روحانی منزلوں پر پہنچاتی ہے۔ پہلا مرحلہ حیوانی تقاضوں پر قابو پانے کا ہے' جسے قرآن کی اصطلاح میں "نفسِ امارہ" کہا گیا ہے۔ روزے کی عبادت اس مقصد کے لئے خاص طور پر مد ثابت ہوتی ہے۔ جب اس ضبط نفس کے نتیجے میں انسان اپنے حیوانی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسے اپنے گناہوں کا شدید احساس بھی پریشان کرنے لگتا ہے۔ اس مرحلے کو قرآن نے "نفسِ لوامہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد جب تزکیہ اور تطہیر کا عمل آگے بڑھتا ہے تو انسان کے اندر تقویٰ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہ روحانی کمال کا مرحلہ ہے جسے قرآن میں "نفسِ مطمئنۃ" کہا گیا ہے۔

مذاہب کی تاریخ گواہ ہے کہ انسان کا دنیا سے منہ موڑ کر حقیقت مطلقہ کی طرف متوجہ ہو جانا ہی تمام مذاہب کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ قرآن اس رویئے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ ہم دنیا سے بالکل کٹ کر اللہ سے لو لگالیں۔ اس کے برعکس' قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا اور اس کی ہر شے مقدس اور متبرک بن جاتی ہے بشرطیکہ ہم آخرت کی فلاح کو اپنا مقصد بنا لیں۔ ایک مومن سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں بھرپور طریقے سے زندگی گزارے اور کامیابی کے حصول کے لئے پوری کوشش کرے۔ دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے بشرطیکہ انسان دنیا کی زندگی کو آخرت کے لئے گزارنا سیکھ لے! لیکن آخرت کے لئے جینا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنی فطرت میں موجود "راہبانہ" داعیہ کو ایک حد تک پروان چڑھالے۔ یہ شے ہمیں روزے کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جس میں ہم مقررہ اوقات کے اندر حلال چیزوں سے بھی اپنے نفس کو روک لیتے ہیں۔

روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول ہے ' اور تقویٰ وہ شے ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن وہ رسی ہے جو اللہ اور بندے کے مابین تنی ہوئی ہے۔ رمضان ہی میں وہ رات یعنی لیلتہ القدر بھی ہے جس میں قرآن نازل ہوا ' اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط تقویٰ ہے۔ روزے اور قرآن کا قریبی تعلق ان حقائق پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں تلاوت قرآن اور خصوصاً قیام اللیل میں قرآن پڑھنے اور سننے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ روزہ گزشتہ انبیاء کی شریعتوں میں بھی فرض کیا گیا تھا ' اور قرآن کی رو سے گزشتہ صحیفوں میں آج بھی "نور" موجود ہے۔ تاہم یہود و نصاریٰ کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ روزے رکھ کر وحی آسمانی کی تلاوت کر سکیں ' اس لئے کہ ان کی آسمانی کتابیں اپنی اصل حالت اور اصل زبان میں موجود ہی نہیں ہیں۔ آج صرف قرآن حکیم ہی واحد آسمانی کتاب ہے جو اپنے اصل عربی متن کے ساتھ محفوظ ہے۔

مکہ سے مدینہ ہجرت کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے دو اقدامات کئے جن کا براہ راست تعلق مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے تعلقات سے تھا۔ اولاً آپ ؐ یروشلم کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے جو یہودیوں اور عیسائیوں کا قبلہ تھا ' اور ثانیاً آپ ؐ نے یہود کے ساتھ تورات کے قانون کے مطابق روزے رکھنا شروع کئے (یاد رہے کہ یہود کے ہاں سحری نہیں کھائی جاتی)۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ان اقدامات سے اہل کتاب کو اس امر کا قائل بنانا مقصود تھا کہ آپ ؐ بھی وہی تعلیم لے کر تشریف لائے ہیں جن کی انبیائے بنی اسرائیل تبلیغ فرماتے رہے تھے۔ واللہ اعلم! ہجرت کے بعد پورے ۱۷ مہینے اس حال میں گزرے یہاں تک کہ یہودیوں کے ربّی اور عالم حضرت عبد اللہ بن سلام ؓ ایمان لے آئے ' اور یہی یہود مدینہ کے لئے فیصلے کی گھڑی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ تورات کی پیش گوئیوں کے مطابق حضور ﷺ کو نبیّ موعود تسلیم کرتے ' انہوں نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ حضور ؐ کا تعلق بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ بنی اسمٰعیل سے تھا۔ اس کے بعد سے یہود کے دل کا حسد اور غصہ مسلمانوں کے خلاف ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی شکل میں کھل کر سامنے آنے لگا۔

شعبان ۲ھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور اس کے فوراً بعد رمضان کے روزے فرض کر دیئے گئے، جن کی تفصیلات شریعتِ موسویؑ کے روزوں سے مختلف تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کی راتوں میں تعلق زن و شو کو جائز قرار دیا۔ اس اجازت کی بدولت ایک خالص جسمانی اور حیوانی معاملے میں بھی روحانیت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بالعموم جنسی داعیہ کی تسکین کو اعلیٰ روحانی مقامات کے حصول میں رکاوٹ سمجھا گیا ہے، لیکن اسلام نے رمضان جیسے مہینے میں بھی اسے جائز رکھا ہے جب کہ انسان کی روحانی نشوونما پورے عروج پر ہوتی ہے۔ اسی سے اسلام کا فلسفہ ازدواج بھی ہمارے سامنے آتا ہے، جس کی رو سے جنسی خواہش اور شریعت کی حدود میں اس کی تسکین بجائے خود مقدس اور متبرک بن جاتے ہیں، اور مرد و زن کا تعلق جسمانی اور روحانی تسکین ہی نہیں بلکہ حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ارشاد "میرے لئے تین چیزیں محبوب بنائی گئی ہیں : "عورت، خوشبو، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے" کی ابن عربی نے یہی توجیہہ پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو "فصوص الحکم"۔

رمضان کے مہینے میں اللہ تعالیٰ نے مریضوں اور مسافروں کو یہ رعایت عطا فرمائی ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر شمار پورا کرلیں۔ اس رعایت کی وجہ سے احکام شریعت میں میانہ روی، آسانی، اور عملیت پسندی کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر مذہبی احکام میں انسانوں کی عملی مجبوریوں اور کمزوریوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ایسا مذہب اپنی کشش کھو دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس ضمن میں کہتا ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے، مشکل اور دشواری نہیں چاہتا۔ دوسری طرف وہ افراد جو بہت بڑھاپے یا کسی مستقل بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنے کے قابل نہ رہے ہوں ان کے لئے یہ راستہ کھولا گیا ہے کہ وہ روزے کے کفارے کے طور پر غرباء کو کھانا کھلائیں۔ اس حکم سے روزے کی معاشرتی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔ رمضان وہ مہینہ ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث کی رو سے اس مہینے میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے

ہیں، دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کردیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق حضور اکرم ﷺ بھی رمضان المبارک میں خاص شفقت اور رحمت کا اظہار فرماتے تھے۔ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ انفاق کرنا رمضان کی روح کا تقاضا ہے۔ روزہ اس وقت فرض کیا گیا جب مسلمان ہجرت کے بعد ایک منظم امت کی شکل اختیار کرچکے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ ایک فرد کا ذاتی معاملہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے معاشرے کے غریب اور کمزور طبقات کی حالت کو بہتر بنانا بھی مقصود ہے۔

قرآن کے مطابق ایک مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کے قتل خطا کا کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا، اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے تک روزے رکھنا مقرر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ غلاموں کو آزاد کرنا بھی اسی نوعیت کا روحانی عمل ہے جس طرح روزہ رکھنا، یہی وجہ ہے کہ دونوں کو برابر رکھا گیا ہے۔ غلاموں کی آزادی کی ترغیب و تشویق دے کر اور اس عمل کو بہت بڑی نیکی اور روحانی فعل قرار دے کر اسلام نے غلامی کے ادارے کو اس انداز میں ختم کیا جس کی بدولت آزاد شدہ غلاموں کا معاشرے میں جذب ہونا ممکن ہوا۔ امریکہ میں غلامی کو ختم ہوئے ایک صدی بیت چکی ہے، لیکن آزاد ہونے والے غلاموں کی اولاد آج بھی امریکی معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں غلامی کے خاتمے کا اصل جذبہ محرکہ معاشی تھا نہ کہ روحانی یا اخلاقی! اسی طرح کا معاملہ ہندوستان میں ذات پات کے نظام کی وجہ سے پایا جاتا ہے۔ عیسائیت اور ہندومت دونوں مذاہب میں روزے اور احترامِ آدمیت کے درمیان کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے پیروکاروں کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ روزے سے حاصل ہونے والی روحانی قوت کو انسانوں کی معاشرتی حالت بہتر بنانے میں استعمال کر سکیں۔ اسلام کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک مذہبی اور ذاتی فعل یعنی روزے کا تعلق خدمت خلق اور انسانی حریت و مساوات کے ساتھ قائم کر کے روحانی قوت کو وسیع معاشرتی بہبود کے لئے استعمال کیا ہے۔

۲۷/ رجب حضور اکرم ﷺ کی معراج کی تاریخ ہے، اور ۲۷/ رمضان کی رات

لیلۃ القدر ہے۔ ان دو راتوں کے درمیان کا عرصہ روحانی اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں اجتماعی روحانیت کا مسلسل ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کی انفرادی کوشش بھی اس اجتماعی روحانیت کی برکت سے اسے روحانی نشوونما کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔

رمضان کے روزے نہ صرف روح بلکہ جسم کے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ ان روزوں کی بدولت ہم جسم کی غیر ضروری چربی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ سحر اور افطار میں قسم قسم کے مرغن کھانوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کیا جائے۔ قوت کے حصول میں جسمانی صحت اور توانائی کا بھی اہم مقام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو بادشاہی عطا کرتے وقت فرمایا تھا کہ وہ اس مقام کے لئے اپنے علم اور جسمانی طاقت کی وجہ سے حقدار بنے ہیں۔ (البقرہ : ۲۴۷)

اسی طرح انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں بھی رمضان کے روزے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم روز مرہ کی زندگی میں مقررہ اوقات میں ایک جیسے کام کرتے رہنے کی وجہ سے ایک نوع کی اکتا دینے والی یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات بڑی حد تک تبدیل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ہم اس مہینے میں ایک بالکل مختلف قسم کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے نہ صرف جسم اور جسمانی نظام کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ہر انسان میں خفتہ تخلیقی صلاحتیں بھی ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر نئے خیالات اور نئے تجربات کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے۔

روزے کی بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی بدولت ہمیں غرباء کی تکلیف کا ذاتی تجربہ حاصل ہوتا ہے، ہم ان کے لئے زیادہ ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور ہمارے دلوں میں خیر کے کاموں اور انفاق کے لئے جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی طرح روزے میں ہمارے اندر خوراک کی قدر کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے، اور ہم کھانے پینے کے معاملے میں اسراف اور ضیاع کی برائی کو ذاتی تجربے کی بنا پر سمجھنے لگتے ہیں۔

آج امتِ مسلمہ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ "قوت" کو حاصل کرے۔ اسی کی

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ کیجئے)

نیکیوں کا موسم بہار

تحریر : مولانا محمد یوسف اصلاحی

"نیکیوں کا موسم بہار" قریب آرہا ہے' اور جلد ہی اس کے مبارک شب و روز آپ پر سایہ فگن ہونے والے ہیں۔ آپ دن میں روزہ رکھیں گے' شب میں خدا کے حضور قیام کریں گے اور شب و روز کی مختلف ساعتوں میں کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے۔ صدقہ و خیرات کریں گے اور نیکیوں کے اس موسم بہار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پھر مہینے بھر کی عبادت و ریاضت کے بعد عید کی مبارک صبح کو عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کریں گے۔ اور اس حال میں اپنے گھر واپس آئیں گے کہ خدا فرشتوں میں اعلان کرے گا۔۔۔ کہ "میں نے اپنے ان بندوں کو بخش دیا" اور آپ بخشے بخشائے اپنے گھروں کو واپس آئیں گے۔ مگر اس اجر و انعام کے مستحق بننے کے لئے ایک شرط ہے۔ اس شرط کا پورا کرنا ناگزیر ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ آپ کی یہ ساری عبادت و ریاضت شعور کے ساتھ ہو' آپ شعور کے ساتھ خدا کی کتاب کی تلاوت کریں' شعور کے ساتھ دن میں روزہ رکھیں' شعور کے ساتھ شب میں خدا کے حضور قیام کریں' اور شعور کے ساتھ راہ خدا میں خرچ کریں۔

شعور کے ساتھ جب آپ کتاب الٰہی کی تلاوت کریں گے تو اس سے شعوری عمل پیدا ہوگا اور جب شعور کے ساتھ آپ نیک اعمال میں سرگرم ہوں گے تو آپ اعمال صالحہ کی برکتیں اپنی زندگی میں عملاً محسوس کریں گے۔ پھر اعمال صالحہ کی برکتیں اور اچھے اثرات آپ کے قلب میں مزید اچھے جذبات پیدا کرنے میں معاون ہوں گے۔ اس طرح آپ کے لئے نیکی کی راہ آسان' کشادہ اور نہایت پرکشش بن جائے گی۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔

خدا کی کتاب پڑھتے ہوئے جب آپ اس آیت پر پہنچیں :

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ....﴾
"اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کردیا گیا..."
تو یوں سوچئے کہ آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے۔ جب وہ کہتا ہے : اے ایمان والو تو کان لگا کر سنئے، یہ آپ کے رب کی آواز ہے، اور وہ کسی دوسرے کو نہیں آپ کو پکار رہا ہے۔ آپ کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ آپ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، مومن ہونے پر فخر کرتے ہیں، ایمان والوں میں یقیناً آپ بھی شامل ہیں اور آپ کا رب آپ سے ہی بات کر رہا ہے۔ سوچئے کا یہ انداز آپ کو کسی اور ہی عالم میں پہنچادے گا۔ آپ کی روح پر وجد کی ایک کیفیت طاری ہوگی۔ آپ سوچیں گے : اللہ اکبرا میری یہ عظمت و اہمیت، کہ میرا رب مجھے میرا نام لے کر پکار رہا ہے، اور آپ ہمہ تن گوش ہو کر اگلے الفاظ دل کے کانوں سے سنیں گے۔ "تم پر روزہ فرض کردیا گیا ہے" کے الفاظ پڑھتے ہوئے آپ یوں ہی سرسری انداز میں نہیں گزر جائیں گے، بلکہ یوں سوچیں گے کہ "تم پر" کا خطاب مجھ ہی سے ہے۔ گویا آپ کا رب آپ سے یہ کہہ رہا ہے : میرے بندے! یہ روزہ میں نے تجھ ہی پر فرض کیا ہے، دن بھر روزہ سے رہ کر تو میرے ہی حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اس حکم کو بجالانے کے لئے تیرے واسطے اتنی بات کافی ہے کہ یہ اس خدا نے تجھ پر فرض کیا ہے جس پر تو ایمان لایا ہے۔ مومن کے لئے کسی حکم کی تعمیل کا یہ محرک بالکل کافی ہے کہ اس کے رب کا یہی حکم ہے اور اپنے رب کی اطاعت کے تصور کی لذت ایمان کا زبردست انعام ہے۔ اور پھر جب آیت کا اگلا فقرہ آپ پڑھیں گے تو اپنے رب کی بے پایاں رحمت و رافت اور شفقت و عنایت کا احساس کرکے آپ کا رواں رواں احساس شکر سے سرشار ہو جائے گا۔ ارشاد ہے :

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ....﴾
"جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں"۔
یعنی یہ روزہ کوئی بوجھ نہیں ہے جو خدا نے تم پر لاد دیا ہو، بلکہ یہ تمہاری شخصیت کی تعمیر، تمہاری تربیت اور تزکیہ نفوس کے لئے خدا کی ایک نعمت اور ناگزیر ذریعہ ہے... اسی لئے تو خدا نے اسے ہر دور میں، ہر نبی کی امت پر فرض رکھا ہے۔ یہ تربیت و تزکیہ کے

نظام کا ایسا ضروری جزو ہے' اس قدر زبردست مؤثر عامل ہے کہ خدا کی کوئی شریعت کبھی اس سے خالی نہیں رہی۔ تم پر روزہ فرض کر کے خدا نے تم پر اپنی رحمت و عنایت کا اہتمام کیا ہے اور تمہیں اس نعمت سے نواز کر اپنی رضا [illegible] تمہارے لئے موقع فراہم کیا ہے۔

"جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا"---- یہ الفاظ محض تاریخ بیان کرنے کے لئے نہیں ہیں' قرآن کا موضوع محض تاریخی داستانیں بیان کرنا نہیں ہے---- دراصل ان الفاظ کے ذریعے روزے کی عظمت و اہمیت اور تربیت و تزکیہ کے نظام میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرنا ہے کہ ہر نظام تربیت اور شریعت میں ہمیشہ روزہ موجود رہا ہے۔ اور پھر اگلے فقرے میں روزے کا اصل حاصل بتا کر بات پوری کر دی گئی ہے : ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (البقرہ ۲ : ۱۸۳) "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو" یعنی خدا نے روزے کا حکم خود تمہارے ہی فائدے کے لئے دیا ہے' تمہاری عبادتوں سے خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ خدا تو بے نیاز ہے۔ ساری کائنات مل کر ہمہ وقت اس کی عبادت میں لگی رہے اور کائنات کے کسی چپے میں کسی لمحے بھی اس کی نافرمانی نہ ہو تو بھی اس سے اس کی ذات اقدس کو ذرہ برابر فائدہ نہ ہو گا۔

روزہ اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ بندہ تقویٰ کا پیکر بن جائے۔ اس کے دل میں وہ غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے کہ نیکی کی راہ پر بڑھنا اور دوڑنا اس کے لئے آسان اور برائی کی راہ پر جانا اس کے لئے دشوار ہو جائے---- تقویٰ ہی دراصل زندگی کی اصل رونق اور بہار ہے۔ تقویٰ دل کی وہ روشن کیفیت ہے جس کے ذریعے آدمی پر ہدایت کی راہ کھلتی ہے' جس کی بدولت آدمی خدا کی کتاب سے فیض پانے کے لائق بنتا ہے۔ تقویٰ وہ پسندیدہ جوہر ہے جس کی بنیاد پر خدا نیک اعمال کو تقویت بخشتا ہے۔ غیر متقی انسان کا عمل بھی خدا کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔ اور روزہ رکھنے کا حاصل یہی ہے کہ آدمی کو تقویٰ کی یہ دولت حاصل ہو۔ بے شک دوسری عبادات سے بھی تقویٰ حاصل ہوتا ہے' مگر روزے کو تقویٰ سے خصوصی مناسبت ہے اور اسی لئے خدا نے تقویٰ کو روزے کا حاصل قرار دیا ہے۔

اب پوری آیت کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ رکھئے اور اپنا جائزہ لیجئے کہ جب "اے

ایمان والو!" کے الفاظ آپ پڑھتے اور سنتے ہیں تو آپ پر وجد کی کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے یا نہیں، خدا کی عظمت اور ہیبت سے آپ پر لرزہ طاری ہوتا ہے یا نہیں --- اور آپ دل کی گہرائی سے یہ احساس کرتے ہیں یا نہیں کہ خدا آپ سے مخاطب ہے اور آپ پر روزہ فرض کر رہا ہے، اور پھر یہ کہ روزہ رکھنے کے لئے یہ بات آپ کے لئے کافی ہو جاتی ہے کہ یہ آپ کے خدا کا حکم ہے یا آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں۔ اگر خدا کے حکم کے علاوہ آپ کسی اور محرک کے بھی منتظر رہتے ہیں اور کسی عمل پر آمادہ کرنے کے لئے آپ کو خدا کا حکم کافی نہیں ہوتا، تو آپ ایک خطرناک اور تباہ کن بیماری کا شکار ہیں۔ آپ کا ایمان نزع کی کش مکش میں مبتلا ہے۔ جلد از جلد فکر کیجئے اور اپنے ایمان کو اس کش مکش سے بچائیے۔ اس معاملے میں سستی اور غفلت اور لاپروائی آپ کی عبرتناک موت کا باعث بن سکتی ہے --- جسمانی موت نہیں کہ وہ تو ایک بار آتی ہی ہے ---- اور وہ کوئی حادثہ نہیں، حادثہ تو ایمانی موت ہے۔ ایمان مردہ ہو گیا تو سب کچھ لٹ گیا۔ ایمان سے محروم زندگی، زندگی نہیں موت ہے۔ ایسا چلتا پھرتا انسان دراصل ایک زندہ لاشہ ہے جو زمین کی پیٹھ پر ایک گندا بوجھ ہے۔

جس بندے کا ایمان شعوری ایمان ہے، اس کو خدا کی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے اتنی بات بالکل کافی ہے کہ اس کے خدا نے اسے یہی (عبادت) کا حکم دیا ہے۔ یہ تو ربِّ جلیل و کریم کی بے پایاں عنایت اور مزید فضل و کرم ہے کہ وہ حکم دینے کے ساتھ ساتھ اپنے حکم کے اسباب اور فرض کردہ عبادات کے فائدے بھی ذہن نشین کراتا ہے۔

روزے کے سلسلے میں فرمایا گیا "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو"۔ یہ فقرہ اس لئے بھی ہے، کہ بندۂ مومن اور زیادہ دل جمعی اور یکسوئی، اطمینان قلب اور نشاط کے ساتھ روزے کا اہتمام کرے اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ بندہ بار بار اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ اس کا روزہ واقعی اس کا روزہ بھی ہے یا نہیں۔ "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو" یہ الفاظ ایک کسوٹی بھی ہیں، تاکہ ہر روزہ رکھنے والا شخص اپنی زندگی پر نگاہ رکھے اور جائزہ لیتا رہے کہ روزہ رکھ کر اس کی زندگی تقویٰ سے آراستہ ہو رہی ہے یا نہیں۔

خدا نے تقویٰ کو روزے کا حاصل بتایا ہے اور خدا کا یہ فرمان یقیناً ہر شک و شبہ سے

پاک ہے۔ روزے سے یقیناً تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور ہونا چاہئے --- لیکن اگر کوئی روزہ رکھنے کے باوجود تقویٰ سے محروم ہے تو یقین کرلینا چاہئے کہ اس کا روزہ وہ روزہ نہیں ہے' جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔ اگر روزہ رکھ کر آپ کو تقویٰ کی دولت نہیں حاصل ہو رہی ہے تو اطمینان کر لیجئے کہ آپ روزہ سے نہیں ہیں' آپ فاقہ کی مشق کر رہے ہیں جس کا حاصل تقویٰ نہیں کمزوری ہے۔

بے چینی کے ساتھ فکر کیجئے ---- رمضان کی مبارک گھڑیاں تیزی کے ساتھ گزر جائیں گی۔ انہیں اس طرح نہ گزر جانے دیجئے کہ آپ خالی ہاتھ رہیں ---- معلوم نہیں آئندہ سال آپ کو پھر یہ مبارک گھڑیاں زندگی میں نصیب ہوتی ہیں یا نہیں؟

بقیہ : عہد حاضر میں اجتہاد

Constitutional set up کیا ہے؟ ہماری تاریخ کے چودہ سو سالوں میں اجتہاد کس طور سے ہوتا رہا ہے اور اب اگر اسلامی ریاست وجود میں آئے گی' اور اللہ کرے کہ آئے' تو پھر اس میں اجتہاد کی کیا شکل ہو گی؟ اس پر ان شاء اللہ آئندہ گفتگو ہو گی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

(مرتب : حافظ خالد محمود خضر)

بقیہ : روزے کی عبادت

بدولت دشمنوں کو مرعوب کرنا' مظلوموں کی دادرسی کرنا' اور اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے مبرہن کرنا ممکن ہو سکے گا۔ سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی دور میں "قوت" کی بنیادیں استوار کی گئیں' یعنی آزادی' علم' اخلاقی اقدار' ایمان' نظم' اخوت اور صالح قیادت' اور اس کی بدولت وہ "قوت" حاصل ہوئی جس کی برکت سے مسلمانوں نے بدر میں کفار کو شکست دی۔ آج بھی اس امر کی انتہائی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ مسلمان اس "قوت" کو دوبارہ حاصل کریں۔ رمضان کے روزے ہمیں اسی مقصد کے حصول کا راستہ دکھاتے ہیں۔ OO

عبادتِ رب

از قلم : رحمت اللہ بٹرؒ مرکزی ناظم تربیت

الحمد للہ ربِّ العالمین' وَالصلوٰۃُ والسلامُ علٰی سیدالانبیاء والمرسلین' امابعد :

اعوذباللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○﴾ (الذاریات . ۵۶)

قافلہ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے بعد یہ احساس بیدار ہوا کہ بحیثیت مسلمان ہم میں سے ہر ایک پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے تعلق سے دین کے وہ فرائض ادا کرے جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ نتیجتاً قرآن مجید کی طرف رغبت بڑھی اور اس کا مطالعہ ہونے لگا۔ بہت سی حقیقتیں تو محترمی و مربی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کے دروس سے منکشف ہوئیں لیکن بعض کی طرف قرآن مجید نے از خود رہنمائی کی۔ ان حقائق میں سے ایک حقیقت "عبادتِ رب" ہے۔ عبادت اور رب کا تعلق اور پھر بندگی کے تقاضے ایک ترتیب سے ذہن میں ایسے سمائے کہ بہت سے اشکالات خود بخود حل ہو گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ذریعے جو فرائض دینی کا تصور علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے ذریعے سامنے آیا تھا وہ ایک نئی ترتیب سے واضح ہوا کہ یہ سوال باقی ہی نہ رہے کہ آیا عبادتِ رب کے ساتھ کہ شہادتِ حق اور اقامتِ دین بھی ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہیں یا نہیں۔ جب راقم الحروف نے تربیت گاہوں میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر لیکچر دینا شروع کیا تو اسی ترتیب کے ساتھ رفقاء کے سامنے بات رکھنے کی کوشش کی۔ اب تحریر کے ذریعے کوشش کر رہا ہوں کہ اس فکر کو عام کروں۔ تحریر و تصنیف کے ضمن میں اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے' لیکن اللہ کے بھروسے پر اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔ وللّٰہ التوفیق فی

الاولیٰ و الآخرة

سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان انسانوں سے بازپرس کریں گے جنہوں نے اللہ کی عبادت پر اپنی زندگی نہ گزاری ہو گی۔

﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴾

(یٰس : ۶۰-۶۱)

"اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت مت کرو کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے، اور یہ کہ تم میری ہی بندگی کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی کوئی ایسا عہد ہے جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا جس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن مجید اس بات کا جواب اثبات میں دیتا ہے کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے :

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾

(الاعراف : ۱۷۲-۱۷۴)

"(یاد کرو) جب تیرے رب نے نسل آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکال کر ان کو خود ان کی جانوں پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا : کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اس پر) تمام انسانوں نے اقرار کیا : کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ عہد اس لئے لیا کہ) مبادا تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا ہم سے پہلے، اور ہم ان کی اولاد تھے (اس لئے ہم بھی مشرک ہو گئے) تو کیا تو ہمیں ان غلط کار لوگوں کی وجہ سے ہلاکت میں ڈالے گا؟ ہم اس طرح کھول کھول کر اپنی آیات کو بیان کر رہے ہیں تا کہ وہ ہماری

طرف رجوع کریں"۔

گویا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے دونوں بہانوں کو رد کرنے کے لئے یہ عہد لیا تھا۔ ایک یہ کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ہمارا رب کون ہے اس لئے ہم کس کی بندگی کرتے' اور دوسرے یہ کہ آباء پرستی یا تقلید یا زمانے کے چلن کا عذر بھی نہ رہے کیونکہ عہد ہر انسان سے فرداً فرداً لے لیا گیا۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہد تو اللہ کے رب ہونے کا لیا گیا لیکن باز پرس اس پر کی جارہی ہے کہ میری بندگی کیوں نہیں کی۔ اور اسی کو تمام جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی غایت بھی قرار دے دیا گیا ہے :

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾

(الذاریات : ۵۶)

"میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں"۔

دوسرا سوال جو فوراً ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں تو یہ عہد یاد ہی نہیں ہے اس لئے ہم اس کے تقاضے کیسے پورے کریں۔

پہلی بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ عہد یاد رکھنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا مظہر وہ فطرت ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے' اور یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان جس کو بھی اپنا رب مانتا ہے اس کی بندگی لازماً کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم میں فرمایا گیا :

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا' فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا' لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (الروم : ۳۰)

"پس اپنے رخ کو اللہ کی اطاعت پر یکسو کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی"۔

یہی حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ' فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ))(وفی روایہ "اَوْ يُشَرِّكَانِهٖ")

"ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی فطرت اسلام پر) پھر اس کے والدین اسے

یہودی، مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں"۔ (ایک اور روایت میں آیا ہے کہ "یا اسے مشرک بنا دیتے ہیں۔")

اب آیئے پہلے سوال کی طرف۔ یہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی کرے۔ لیکن رب کہتے کسے ہیں؟ عربی میں رب کے بنیادی معنی مالک کے ہیں۔ جیسے رَبُّ الدَّار : گھر کا مالک، رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالارضِ : آسمانوں اور زمین کا مالک۔ سورۂ قریش میں خاص طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے اور اسی بنیاد پر قریش مکہ سے بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے :

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾ (قریش : ۳، ۴)

"ان کو بندگی کرنی چاہئے اس گھر کے مالک کی جس نے انھیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور انھیں خوف سے بچا کر امن عنایت کیا"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی دو صفات یا ذمہ داریاں ہیں جو ہر مالک کی ہوتی ہیں۔ یعنی جس کا وہ مالک ہے اس کی پرورش کا سامان مہیا کرے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کرے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید انسانوں کے ذہن نشین کرواتا ہے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کو پہچانیں تاکہ وہ اس کی بندگی کریں۔ چنانچہ قرآن مجید کے شروع ہی میں انسانوں سے جو بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے وہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے :

﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَندَادًا وَّأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ (البقرہ : ۲۱-۲۲)

"اے انسانو، بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، تاکہ تم بچ جاؤ۔ (وہ مالک) جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور پھر اس نے بلندی سے پانی نازل کیا ہے اور اس کے ذریعے سے تمہارے لئے پھلوں میں سے رزق مہیا کیا

ہے۔ پس (اس کی بندگی میں) کسی کو اس کا ہمسر نہ ٹھہراؤ اور یہ حقیقت تم جانتے ہو (کہ رزق مہیا کرنے والا وہی ہے)"۔

دیکھئے کس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے :

﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ○﴾

(ھود ۶)

"اس زمین پر کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق، (اس لئے) وہ ہر مخلوق کی جائے قرار کو جانتا ہے اور اس کے لوٹنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ واضح طور پر لکھا ہوا ہے"۔

اسی طرح فرمایا :

﴿ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۔۔ ﴾

(النحل : ۷۱)

"اور اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے"۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو بار بار قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے کہ :

﴿ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ○﴾ (بنی اسرائیل : ۳۰)

"بیشک تیرا رب کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔ بے شک وہ خوب باخبر ہے اپنے بندوں سے، اور ان کو دیکھ رہا ہے"۔

اس معاملے میں انسان کو خاص طور پر مخاطب کر کے فرمایا :

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ○﴾

(بنی اسرائیل : ۳۱)

"اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے ڈر سے قتل نہ کرنا، کیونکہ ہم رزق دینے والے ہیں ان کو بھی اور تمہیں بھی"۔

تم جب آئے تھے تو کونسی ضمانت لے کر آئے تھے کہ تمہیں رزق مل جائے گا اور اب اوروں کے لئے فکر مند ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جسے بھی اپنا روزی رساں، مشکل کشا اور محافظ سمجھتا ہے اسی کی بندگی کرتا ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے انسانوں کو باور کرایا ہے کہ :

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (العنکبوت : ۱۷)

"بیشک جن کی تم بندگی کرتے ہو اللہ کے سوا وہ تمہارے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے ہاں سے ہی رزق کے خواہاں بنو، اور پھر اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔ اور یاد رکھو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (وہ پوچھ لے گا کہ اس کے دیئے ہوئے رزق کو اوروں کی طرف کیوں منسوب کیا اور پھر ان کی بندگی کیوں کی)"۔

اصل بات تو یہ ہے کہ رزق اور اجل کا معاملہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے معین کر دیا ہے اور یہی دو خطرات ہیں جن کے بارے میں انسان اپنے مالک حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کو ان کا مالک و مختار سمجھ لیتا ہے تو ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان باطل ارباب سے اپنے لیے روزی اور حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان ہی کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ :

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ﴾ (الفجر : ۱۵-۱۶)

"انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو آزماتا ہے اور اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی ہے، اور جب وہ آزمائش کے لئے اس پر رزق میں تنگی کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔"

حالانکہ دونوں کیفیتوں کا معاملہ صرف انسان کی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ اس اجل معین کو کیسے گزارتا ہے اور اس رزق کو کس طرح حاصل کرتا ہے۔ آیا اللہ کو رب مان کر جائز طریقے سے محنت کرتا ہے یا بجائے خود مالی وسائل کو رازق سمجھ کر جائز و ناجائز ہر طرح کے ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہی وہ فرق ہے جو اس کی زندگی کے بارے میں انسان کے تصور میں واقع ہوتا ہے۔ پھر وہ اسی تصور کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ رازق اور زندگی کی مہلت دینے والا صرف مالک کائنات ہے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں بنتا' اور اپنی عزت نفس کسی بھی قسم کی لالچ میں آکر نہیں بیچتا' بلکہ ہر مشکل میں اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور صابر و شاکر ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں آنحضور ﷺ نے فرمایا :

((عجبًا لامرِ المُؤمنِ ' اِنّ امرَہٗ کلَّہٗ خیر' ولیس ذٰلکَ لاحدٍ الّا لِلمؤمن ' اِنْ اصابتہُ سرّاءُ شکَرفکان خیرًا لہ' واِن اصابتہ ضرّاءُ صبرفکان خیرًا لہ)) (رواہ مسلم)

"صاحب ایمان انسان کا معاملہ بڑا عجیب ہے اور یہ صرف مومن ہی کے لئے ہے' کہ اگر اسے آسائش میسر ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے پس یہ اس کے لئے بہتر ہے' اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے' پس یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کے بارے میں اگر آگاہی ہو جائے اور پھر یہ آگاہی تازہ بھی رہے تو انسان بہت سے تفکرات اور نفس کے امانی اور بے جا خواہشات سے بچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشے سے تشبیہ دی ہے۔ آج کا انسان اسے ڈرامے یا فلم کے حوالے سے خوب سمجھ سکتا ہے' جس میں ہر شخص کو صرف تین گھنٹے کے لئے کوئی کردار ادا کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اور یہ موقع اسے صرف اس کی کارکردگی جانچنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس کی کامیابی و ناکامی کا دارومدار اس کردار کی ادائیگی پر ہے نہ کہ اس حیثیت پر جس کے ذریعے اسے جانچا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے اور کسی کو اس کا خادم' کسی کو جاگیردار اور کسی کو اس کا مزارع اور ہاری۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ

یا خادم اور جاگیردار یا نوکر حقیقتاً نہ بادشاہ ہوتا ہے نہ خادم۔ اداکاروں کو انعامات بادشاہ یا نوکر ہونے کے اعتبار سے نہیں بلکہ پرفارمنس کے لحاظ سے ملتے ہیں۔ یہی معاملہ اس دنیا کی زندگی کا ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو مختلف کردار دیئے ہیں۔ انسانوں میں یہ فرق و تفاوت حقیقی نہیں بلکہ محض امتحانی ہے۔ ہاں اصل فضیلت اور حقیقی مراتب وہ ہوں گے، جو وہ اپنے اعمال کے ذریعے کمائیں گے، از روئے الفاظ قرآنی :

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۲۱)

"دیکھئے ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے (لیکن یہ فضیلت عارضی اور صرف آزمائش کے لئے ہے) اصل درجہ بندی اور فضیلت تو آخرت کی ہے (جو ہر شخص خود محنت کر کے حاصل کرے گا)"۔

یہ حقیقت بھی سامنے رہنا چاہئے کہ اس دنیا میں اللہ نے جس شخص کو جہاں اور جن حالات میں پیدا کیا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ یہ تو وہبی ہے۔ لیکن پھر اس دنیا میں اپنے مالک کو پہچان کر اور اس زندگی کی حقیقت کو جان کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں اس کے لئے کامیابی ہے اور یہ امتحانی وقفہ غفلت اور مالک کی نافرمانی میں گزار دینے کا نتیجہ نامرادی ہے۔ جان لیجئے کہ انسان اس دنیا میں ان سے بھی یہی کچھ چاہتا ہے جن کا اسے مالک مجازی بنادیا گیا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کوئی جانور گھر میں رکھا ہوا ہو تو وہ حقیقتاً خود کو اس کا مالک گردانتا ہے۔ چنانچہ کبھی اس سے پوچھئے کہ یہ جانور کس کا ہے تو وہ فوراً کہے گا یہ میرا ہے۔ یعنی اس کا مالک میں ہوں۔ چنانچہ وہ اس جانور کے لئے خوراک مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اس ذمہ داری کو نبھاتا بھی ہے۔ لیکن اس جانور کی پرورش اور حفاظت کا سامان کرنے کے بعد وہ اس پر اپنا یہ حق بھی سمجھتا ہے کہ وہ جانور اپنا مقصد پورا کرے۔ اگر وہ جانور مالک کی مرضی پر نہ چلے تو اسے غصہ آتا ہے، اور وہ جانور کو سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسا اس لئے ہے کہ وہ اسے مالک کا حق سمجھتا ہے کہ اس کا غلام اس کا فرمانبردار ہو اور وہ حقِ بندگی ادا کرے۔ چنانچہ یہی وہ مطالبہ ہے جو مالک کائنات ہر انسان کے سامنے قرآن مجید میں رکھتا ہے اور

اسے صرف اپنی عبادت کا حکم دیتا ہے :

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ ﴾ (البقرہ : ۲۱-۲۲)

"اے انسانو' بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں' (یہ بندگی اس لئے کرو) تاکہ تم (اس کی سزا سے) بچ پاؤ۔ (تمہارا مالک وہی ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنا دیا ہے اور پھر بلندی سے پانی برساتا ہے جس کے ذریعے تمہارے لئے روزی کا سامان کر رہا ہے۔ پس اللہ کے ساتھ کسی کو (بندگی میں) ہم سر نہ بناؤ اور یہ تم جانتے ہو (کہ مالک وہی ہے)"۔

خود نبی اکرم ﷺ کے ذریعے قریش مکہ کو یاد دلایا گیا کہ تمہیں تو بس اس گھر کے مالک کی بندگی کرنی چاہئے جو تمہارا رازق ہے جبکہ تمہاری بستی ایسی بے آب و گیاہ ہے کہ یہاں کچھ بھی نہیں پیدا نہیں ہوتا' لیکن اس نے کس طرح تمہارے لئے میوہ جات کا بندوبست کر رکھا ہے۔

قرآن مجید اس کائنات کے حقائق کی شہادت کی بنیاد پر جو بات انسانوں کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کائنات کا مالک ایک ہی ہے' اور وہی تمہارا رب ہے' سورۂ عنکبوت میں فرمایا :

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ○ ﴾ (آیت ۶۳)

"اگر آپ ان سے پوچھیں بھلا آسمانوں سے بارش کون برساتا ہے جس کے ذریعے وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے' تو یہ تسلیم کریں گے کہ وہ تو اللہ ہی ہے۔ تو پھر فرما دیجئے سارا شکر اللہ ہی کے لئے ہے (جو رازق ہے) لیکن ان کی اکثریت ان باتوں پر دھیان نہیں دیتی"۔

سورۃ انعام میں فرمایا :

﴿بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ○ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡہُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ○﴾ (آیات ۱۰۲-۱۰۳)

"وہ پہلی بار وجود بخشنے والا ہے آسمانوں اور زمین کو۔ کہاں سے ہو گا اس کا بیٹا جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے۔ اس نے تخلیق کی ہر چیز، اور وہ ہر شے کا علم رکھنے والا بھی ہے۔ یہ ہے تمہارا مالک۔ کوئی نہیں ہے عبادت کے لائق مگر وہی ہے۔ وہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ پس اسی کی بندگی کرو۔ اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے"۔

اسی طرح سورۃ المومن میں فرمایا :

﴿اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَکُمۡ فَاَحۡسَنَ صُوَرَکُمۡ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚۖ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○﴾

(آیت ۶۴)

"اللہ وہ ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور آسمان کو (حفاظت کے لئے) چھت بنایا اور پھر تمہیں صورتیں دیں، پس کیسی اچھی شکلیں بنائیں تمہاری۔ اور پھر اس نے پاکیزہ چیزوں سے تمہارے لئے رزق کا بندوبست کیا۔ یہ ہے تمہارا مالک، پس کتنا برکت والا ہے مالک تمام جہانوں کا"۔

نیز فرمایا :

﴿قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ اَمَّنۡ یَّمۡلِکُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ مَنۡ یُّخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ یُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ وَ مَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ اللّٰہُ ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ○ فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الۡحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰی تُصۡرَفُوۡنَ ○﴾ (یونس : ۳۱-۳۲)

"(ان مشرکین سے) پوچھئے کون ہے جو تمہیں رزق مہیا کرتا ہے آسمان سے اور زمین سے۔ کون ہے جو دینے والا ہے کان اور آنکھیں، اور کون نکالتا ہے زندہ کو

مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے۔ اور کون ہے جو تدبیر کرتا ہے کاموں کی؟ پس یہ کہیں گے کہ یہ تو اللہ ہی ہے۔ پس فرمادیجئے تو کیا تم (اس کی نافرمانی سے) بچتے نہیں ہو؟ پس یہ ہے تمہارا مالک حقیقی۔ پس حق کے علاوہ تو گمراہی ہی ہوتی ہے' پس کہاں بھٹکتے پھرتے ہو"۔

قرآن مجید کیوں اس حقیقت کو بار بار سامنے لا رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ انسان اپنے مالک حقیقی کو پہچان لے تاکہ وہ بندگی اسی کی کرے۔ جیسے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے "اِنَّ اللّٰہَ رَبِّی وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ O" اے لوگو! بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی' پس بندگی اسی کی کرو' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔

اب آیئے اس دور کے اس مغالطے کی طرف کہ جس کی وجہ سے ہماری زندگیاں دو رنگی کا شکار ہیں کہ ہم اللہ کو رب مانتے ہوئے بھی اس کی فرمانبرداری نہیں کر رہے اور اس کی عبادت کا پورا حق ادا نہیں کر رہے۔ پہلے تو لیجئے ان انسانوں کا معاملہ جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے' لیکن ان کی زندگیوں میں اس کی شہادت نہیں ملتی کہ وہ واقعی اللہ کے بندے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں تو صد فی صد یہی بات سچی ہے کہ ان کا اللہ کے رازق اور محافظ ہونے پر بالکل یقین نہیں ہے بلکہ وہ در حقیقت وسائل و ذرائع ہی کو روزی رساں مانتے ہیں' یا اللہ کے سوا کچھ دوسری ہستیاں ہیں جن کے متعلق انہیں گمان ہے کہ ان کے قبضہ قدرت میں نفع و نقصان کا اختیار ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے ذریعہ معاش کو ہی اپنا رازق و محافظ سمجھ رکھا ہے' اور اس لئے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں بھرپور طریقے پر اس کے لئے نچھاور کرتے ہیں۔ باقی رہا کبھی کبھار نماز روزہ تو بس ایک رسم کے طور پر وہ بھی ہے' وگرنہ اللہ کے رب ہونے پر ان کو فی الواقع یقین کی کیفیت حاصل نہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ مالک کی رضا یا ناراضی کا خیال کئے بغیر اپنی روزی کے معاملے میں تو اپنا سب کچھ کھپا دیں' لیکن اللہ کی فرمانبرداری کے بارے میں انہیں کبھی خیال تک نہ آئے۔ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ مالکِ

حقیقی نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور کن کو حلال' کن برائیوں سے منع کیا ہے اور کن فرائض کا پابند کیا ہے' کن عبادات کو لازم کیا ہے اور کن لغویات سے روکا ہے۔ اگر انہیں اللہ کے رب ہونے کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی توفیق نہ ہو لیکن دکان وقت پر ضرور کھولیں' انہیں اللہ کی ناراضی کا ڈر نہ ہو لیکن اپنے دفتر کے انچارج یا فیکٹری کے مالک کے بے دام غلام ہوں' انہیں اللہ کی رضا کا خیال نہ آئے لیکن وہ جسے اپنا رازق سمجھے بیٹھے ہیں اس کی چشم وابرو کے اشاروں کو بھی پہچانیں' اور ان کی خوشنودی کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیں۔

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں جس کا بہت سے لوگوں کو تجربہ ہوا ہو گا۔ چند حضرات کہیں محفل میں بیٹھے ہوں اور اذان کی آواز آجائے اور ان میں سے کچھ مسجد جانے کے لئے اٹھیں' اور دعوت دیں کہ نماز کے لئے چلیں تو باقی حضرات کی زبان پر یہ الفاظ آجائیں گے کہ ہمارے لئے بھی دعا کرنا کہ ہم بھی نیک بن جائیں' لیکن انہیں خود نماز کے لئے جانے کی توفیق نہ ہوگی۔ دوسری طرف یہ حضرات صبح کسی کو نہیں کہتے کہ ہمارے لئے دعا کرنا کہ ہم دفتر چلے جائیں یا دکان کھول لیں' وہاں وہ خود بخوشی جائیں گے۔ محض اس لئے کہ ان کو اللہ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے' اس لئے اس کے در پر کیوں جائیں؟ جہاں سے رزق حاصل ہونے کا یقین ہے وہیں تو جائیں گے! یہ ہے اصل معاملہ کہ ان کی اپنی فطرت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے اس "رب" کی فرمانبرداری کے تقاضے پورے کریں جسے وہ اپنا رازق سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے دل میں اصل مالک اور رازق حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے در پر جانے کے لئے آمادگی نہیں ہے کیونکہ اسے وہ مالک اور رازق مانتے ہی نہیں۔

اب دوسرے لوگوں کا جائزہ لیجئے۔ یہ وہ ہیں جن کو یقین ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا بھی ایسی برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی خوشنودی حاصل کرنا اور جن کی اطاعت کرنا عبادت ہے' اس لئے کہ ان کے نزدیک ان ہستیوں کے ہاتھ میں رزق اور نفع و ضرر کا اختیار ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے ان باطل ارباب کی عبادت کا حق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے' لیکن کائنات کے اصل مالک کی انہیں ذرا بھی پروا نہیں ہے' اس لئے کہ وہ

اپنا رب ان ہی ہستیوں کو قرار دے چکے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ بزرگوں کے مزارات پر حاضری میں کبھی کوتاہی نہیں ہوگی' ان کے عرس کے مواقع پر خالص اشیاء نذرانہ کے طور پر پیش ہوں گی' لیکن باقی پورا سال اللہ کے مقرر کردہ حرام و حلال کی پروا کی جائے گی اور نہ ہی اس کے آگے سربسجود ہونے کی۔ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے' غریبوں اور مسکینوں کی بدحالی پر کبھی ان کا دل نہیں پسیجے گا' رشوت خوری یا ملاوٹ' اور ناجائز منافع خوری کی انہیں کبھی پروا نہیں ہوگی' اس لئے کہ یہ چیزیں تو اس اللہ نے حرام قرار دی ہیں جس کی نافرمانی کا انہیں کوئی خوف نہیں ہے۔

اب آیئے تیسرے طبقہ کی طرف' یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا رب مانتے ہیں لیکن ان کے ہاں عبادت کا تصور یا تو محدود ہو گیا ہے یا مسخ شدہ ہے۔ ان لوگوں نے مراسم عبودیت اور اسلام کے ارکان ہی کو پوری عبادت سمجھ لیا ہے' باقی رہے تمدن' معاشرت' معیشت اور سیاست کے معاملات تو یہ ان کی نظر میں دنیاوی معاملات ہیں' جن کا عبادت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات جو مختلف مسالک سے وابستہ ہیں اکثر و بیشتر اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ اگرچہ زبانی طور پر تو وہ کہتے ہیں کہ دین زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی دیتا ہے' لیکن عبادت کے لفظ کو انہوں نے صرف ارکان اسلام کے لئے خاص کر لیا ہے۔ اس دائرے میں وہ ذرا سی کوتاہی یا اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں' لیکن زندگی کے باقی تمام معاملات میں ہر کسی سے اتحاد کرنے پر تیار ہوتے ہیں' خواہ وہ اسلام کو بطور دین مانے یا نہ مانے۔ گویا انہوں نے اسلام کو محض ایک مذہب کا درجہ دے کر اسے ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ ان کی مساجد' طریقہ نماز' مسائل روزہ و زکوٰۃ و حج تو مختلف ہیں لیکن طرز معاشرت' کاروبار اور طریق سیاست سب ایک جیسے ہیں' اور ان معاملات میں ان کا طرز عمل بالعموم اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان کی تبلیغ اور بحث و مباحثے کی حدود بس مراسم عبودیت تک محدود ہیں۔ باقی رہا نظام معاشرت و معیشت و سیاست تو وہ خواہ مشرکانہ یا ملحدانہ ہو انہیں اس کی اتنی تشویش نہیں ہے جتنی اپنے مسالک میں اختلاف کی۔ ان کے مدرسوں اور مساجد پر حکومت کنٹرول کرنے کی کوشش کرے تو مرنے پر تیار ہوں گے لیکن طرز حکومت مغربی جمہوریت پر مبنی ہو'

معیشت سودی نظام پر مبنی ہو، معاشرے میں بے حیائی اور بے حجابی کا دور دورہ ہو تو انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جان لیجئے کہ مراسمِ عبودیت، ارکان یا ستون ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ لیکن یہ ستون بجائے خود عمارت نہیں ہیں۔ اسلام کی عمارت تو [illegible] زندگی میں اللہ کو رب مان کر اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کا نام ہے اور اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ ان تمام اشیاء کو کام میں لائے لیکن میری بندگی میں رہ کر، یعنی اس کا ایمان و عقیدہ، اس کے مراسمِ عبودیت، رسومات، طرزِ معاشرت، کاروبار و معاش اور سیاست اللہ کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کے تقاضوں کے تحت ہو، اور وہ پوری زندگی میں اسی کو رب مان کر اس کی اطاعت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نویدِ خلافت دی ہے وہاں اس خلافت کی اصل غرض و غایت بھی اس عبادت کو قرار دیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾

(النور : ۵۵)

"اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر دینے والوں سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں لازماً خلافت عطا کرے گا، جیسے اس نے خلافت عطا کی ان سے پہلوں کو۔ اور وہ ان کے اس دین (نظامِ بندگی) کو غلبہ عطا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں تو وہی نافرمان ہیں"۔

اللہ تعالیٰ اسی مقصد کے لئے اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا ہے کہ وہ اس نظامِ

عدلِ اجتماعی کو قائم کریں جس کی بدولت اللہ کی فرمانبرداری کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہ ہے وہ حق مالک ارض و سماء کا جو بحیثیت انسان ہم میں سے ہر ایک پر عائد ہوتا ہے۔ وہی مالک حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کا رزق اور اس کی زندگی کا اختیار ہے، اور یہی ہے فرمان نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہ اللہ کا بندوں پر صرف یہی حق ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اگر وہ یہ کر گزریں تو پھر بندوں کا یہ حق ہے کہ ان کا رب انہیں عذاب نہ دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین OO

اہم اطلاع

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا الیکٹرانک میل کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ رابطے کے لئے نئے پتے درج ذیل ہیں :

anjuman@brain.net.pk
afzaal@academy.edunet.sdnpk.undp.org

ضرورت رشتہ

اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی ایک دینی مزاج رکھنے والی تعلیم یافتہ، باپردہ لڑکی کے لئے جس نے بی ایس سی کے بعد ایک سال دینی تعلیم کے حصول پر بھی صرف کیا ہے، دینی تحریکی مزاج رکھنے کے حامل، مالی طور پر مستحکم گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔

برائے رابطہ : ع س۔ معرفت "میثاق" 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

تنظیم اسلامی کے رفیق عمر ۳۲ سال، سرکاری ملازم (ایئر فورس) عقد ثانی کے لئے باعمل حافظہ قرآن، کنواری، مطلقہ یا بیوہ کا رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ : صفدر علی اعوان (م۔ی) 36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 3-5869501

بحث و نظر

جہاد کشمیر کی حقیقت
جہاد فی سبیل اللہ یا جہادِ حریت؟

انجینئر نوید احمد، کراچی

لفظ جہاد کا مادہ ہے ج ہ د۔ اسی مادہ سے "جہد" بنا ہے جس کے معنی کوشش کے ہیں۔ ایک کوشش کے دوسری کوشش کے ساتھ ٹکرانے کے عمل کو جہاد کہا جاتا ہے۔ گویا جہاد سے مراد ہے کشمکش یا کشاکش۔ باطل کے خلاف ایسی کشمکش جس کا مقصد اللہ کے کلمہ کی سر بلندی یعنی اللہ کی بڑائی کا نفاذ ہو جہاد فی سبیل اللہ کہلاتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کے مراحل

جہاد فی سبیل اللہ کے تین مراحل ہیں :

(۱) باطن میں نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرنا اور اس کے نتیجہ میں اپنی ذاتی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی کلی اطاعت کا پابند کرنا۔

(۲) خارج میں باطل نظریات اور دین اسلام کے نام پر محدود و مسخ شدہ مذہبی تصورات کے خلاف دلائل اور پرسوز وعظ و نصیحت کے ذریعے قولی و تحریری یعنی زبان و قلم سے جہاد کرنا۔

(۳) مطلوبہ قوت کی فراہمی پر باطل نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر، اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے میدان میں نکل کر مسلح جدوجہد کرنا۔ اس مرحلہ پر جہاد فی سبیل اللہ، دراصل قتال فی سبیل اللہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قتال فی سبیل اللہ کے لئے شرائط

قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ

یعنی باطل نظام کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا کرنا لازمی ہے :

(۱) مسلح جدوجہد میں شریک ہونے والے افراد اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے معاشرہ میں سیرت و کردار کا لوہا منوا چکے ہوں۔

(۲) مسلح جدوجہد کے آغاز سے قبل قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں پوری ہمدردی' دلسوزی اور خلوص کے ساتھ دین اسلام کی عادلانہ اور آفاقی تعلیمات معاشرہ کے مختلف طبقات کے سامنے پیش کردی گئی ہوں۔ غلط فہمیوں' اشکالات اور اعتراضات کا مدلل جواب دے کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا گیا ہو۔

(۳) مسلح جدوجہد کا آغاز کرنے والے افراد ایک قائد کی قیادت میں پوری طرح سے متحد و منظم ہوں اور ان افراد نے نظم کے خوگر ہونے کا یعنی مستقل مزاجی سے سننے اور ماننے کی روش کا مظاہرہ کر دیا ہو۔

(۴) مسلح جدوجہد کے آغاز سے قبل اپنی قوت کا درست اندازہ کر لیا گیا' ہو یعنی اس بات کو یقینی بنا لیا گیا ہو کہ افرادی قوت' جوش و جذبہ اور جنگی وسائل و اسباب کے بل بوتے پر باطل نظام کے محافظوں کو میدان جنگ میں شکست دی جا سکتی ہے۔

اہم بات

متذکرہ بالا چار شرائط میں سے آخری شرط کے بارے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ آج کے دور میں عوام الناس کے لئے ممکن نہیں رہا کہ وہ باطل نظام کی محافظ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس افواج کا مسلح جدوجہد کے ذریعے مقابلہ کر سکیں۔ آج ہر ملک میں ایسی ہمہ وقت افواج ملک میں رائج نظام کی حفاظت پر مامور ہیں جو اعلیٰ جنگی مہارت بھی رکھتی ہیں اور بری' بحری اور فضائی جنگ کے لئے جدید ہتھیاروں سے بھی مسلح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں دنیا کے کسی خطے میں بھی کوئی ایسی کوشش کامیاب نہ ہو سکی جس میں ملکی افواج کا مقابلہ ہتھیاروں سے کرنے کی کوشش کی گئی۔

متبادل طریقہ کار یہ ہے کہ جوں ہی یہ اندازہ ہو جائے کہ ایمانی کیفیات' جوش و جذبہ'

نظم و ضبط اور افرادی قوت کے اعتبار سے باطل نظام کو چھیڑنے کی صلاحیت فراہم ہو گئی ہے، تو پر امن اور منظم احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ اس احتجاج میں سول نافرمانی اور اہم شاہراہوں اور حکومتی اداروں کا پر امن (یعنی توڑ پھوڑ اور جلاؤ سے پاک) گھیراؤ شامل ہو گا۔ ۱۹۸۰ء میں اہل تشیع نے اسی طرح کے احتجاج کے ذریعے پاکستان کی مارشل لاء حکومت سے زکوٰۃ آرڈیننس میں ترمیم کروالی تھی۔

جہاد کشمیر

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں جہاد کشمیر کے نام سے جو مسلح جدوجہد کی جارہی ہے اس میں وہ شرائط پوری نہیں کی گئیں جو ایسی جدوجہد کے لئے درکار ہیں اور اسی وجہ سے یہ جدوجہد "جہاد فی سبیل اللہ" قرار نہیں دی جاسکتی۔ جہاد کشمیر کے بارے میں ہمارے اس موقف کی بنیاد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے :

__پہلی دلیل__ : کشمیر میں ہندوستان، مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جو مکی دور میں مشرکین نے اہل ایمان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ البتہ ہم مسلمانوں نے اپنے سیرت و کردار کا وہ نقشہ پیش نہیں کیا جو مکی دور میں اہل ایمان نے مشرکین کے سامنے پیش کیا تھا۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ کی پہلی منزل یعنی نفس کے خلاف جہاد کی مثالی تصویر پیش کرنے سے ہم قاصر رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ، دھوکہ دہی، جھوٹ، ملاوٹ، بے حیائی، فحاشی وغیرہ میں ہم نے بہت سے غیر مسلموں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ ہم اپنی ذات، اپنے گھر اور اپنے دائرہ کار میں تو اللہ کی بڑائی نافذ نہ کریں جبکہ کشمیر میں اس مقصد کے لئے جہاد کرنے لگ جائیں۔

__دوسری دلیل__ : یہ بات نوع انسانی پر ظلم کے مترادف ہوگی کہ اس کے سامنے دین اسلام کا صحیح تصور پوری دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ اور تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر پیش کئے بغیر ہی اس کے خلاف ہتھیار اٹھالئے جائیں۔ ہم نے ہندوستان کے باشندوں کے سامنے دین اسلام کو اکثر و بیشتر ایک حریف دین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم کی پر حکمت اور اثر انگیز تعلیمات سے تو آج مسلمانوں کی اکثریت بھی لاعلم ہے کجا یہ کہ انہیں غیر

مسلمانوں کے سامنے پیش کیا گیا ہو۔ تبلیغ اور عمل کے ذریعے اتمام حجت کئے بغیر، غیر مسلموں کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہرگز جہاد فی سبیل اللہ کے زمرے میں نہیں آتا۔

تیسری دلیل : ہم نے آج سے تقریباً پچاس برس قبل پاکستان اور کشمیر کا کچھ علاقہ یعنی آزاد کشمیر حاصل کیا۔ ان علاقوں میں ہم نے آج تک اللہ کی بڑائی یعنی دین اسلام کا نفاذ نہیں کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہم مقبوضہ کشمیر کو بھارت سے کیوں آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ اگر وہاں اسلام کا نفاذ مقصود ہے جو کہ جہاد فی سبیل اللہ کی اصل غرض و غایت ہے تو پہلے یہ سعادت پاکستان اور آزاد کشمیر میں حاصل کرنا ہوگی، ورنہ ہمیں صاف اعتراف کرنا ہوگا کہ ہمارا جہاد نفاذ اسلام کے لئے نہیں بلکہ نسلی مسلمانوں کو ہندوستان سے آزادی دلانے کے لئے ہے۔ گویا ہم "جہاد فی سبیل" "اللہ نہیں بلکہ "جہاد حریت" کر رہے ہیں۔

چوتھی دلیل : مسلح جدوجہد اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ یہ ایک جھنڈے تلے اور ایک قائد کی قیادت میں ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہی کچھ ہونے کا اندیشہ ہے جو کچھ کہ افغانستان میں روس کے جانے کے بعد ہوا۔ افغانستان کے جہاد کی طرح، کشمیر کے جہاد میں بھی کئی جماعتیں الگ الگ برسرپیکار ہیں۔ اگر یہ جہاد رضائے الٰہی کے لئے ہو رہا ہے تو مل بیٹھ کر ایک قیادت پر متحد و متفق ہونا ہوگا، ورنہ اگر صورت حال افغانستان جیسی ہو گئی تو باہم جنگ و جدال کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ہوگی اور مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا بہنے والا خون ہماری گردن پر ہوگا۔

پانچویں دلیل : نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امکانی حد تک اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے، سیرت و کردار کے مثالی نمونے اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے باطل کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ شوق شہادت کی بنیاد پر یہ عمل درست نہیں کہ بغیر سوچے سمجھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر دشمن کے سامنے آجایا جائے اور جان دے دی جائے۔ ایسا کرنے سے تو دشمن ہی کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ سن ۱۰/نبوی میں جب طائف سے مکہ واپس آئے تو سرداران قریش آپ ؐ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آپ ؐ نے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کی پناہ میں زندہ رہ کر

دشمن کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کو اس بات پر ترجیح دی کہ مشرکین کے سامنے جا کھڑے ہوں اور وہ آپؐ کی جان لے لیں۔ (بدر کی شب آپ ﷺ نے اپنے لئے تیار کردہ جھونپڑی کے گرد پہرہ کا انتظام کروایا اور میدان احد میں ۹ صحابہؓ آپؐ کی حفاظت پر مامور تھے)۔ مکی دور میں صحابہ کرامؓ نے ہر ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کیا لیکن کوئی جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت میں ہاتھ تک نہ اٹھایا۔ اگر ظلم و ستم کا جواب اسی انداز میں دیا جاتا تو مشرکین تمام صحابہ کو شہید کر دیتے اور غلبہ اسلام کی تحریک بالکل ابتداء ہی میں دم توڑ دیتی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ابتدائی مراحل طے کئے بغیر اور دشمن کی قوت و طاقت کا اندازہ لگائے بغیر، لوگوں کے جذبات انگیخت کر کے ان کی جانیں قربان کروانا، دراصل دین کے ساتھ نادان دوست کا سا کردار ادا کرنا ہو گا۔

<u>چھٹی دلیل</u> : جہاد کشمیر کے لئے لوگوں کو تیار کرنے اور ان سے عطیات حاصل کرنے کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۷۵ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے جس میں فرمایا گیا :

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝﴾

"اور تم کو کیا ہوا ہے کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے، جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو اس بستی میں سے کہ ظالم ہیں یہاں کے رہنے والے اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی مددگار"۔

یہ آیت مدنی دور میں نازل ہوئی اور اس میں ان مظلوم اہل ایمان کا ذکر ہے جو مکہ میں مشرکین کے رحم و کرم پر تھے۔ صحابہ کرام پر زور دیا گیا کہ وہ ان مظلومین کی مدد کے لئے اللہ کی راہ میں مشرکین مکہ سے جنگ کریں۔ البتہ اس آیت میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کا اطلاق مسلمانانِ پاکستان پر دو وجوہات کی بنیاد پر نہیں ہوتا :

(i) سورۃ الانفال کی آیت ۷۲ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ دشمن کے علاقے میں

محصور مسلمانوں کی مدد تم پر لازم ہے۔ البتہ اگر دشمن سے تمہارا کوئی معاہدہ ہے تو پھر اس کی اجازت نہیں۔ اگر دشمن کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہو تو پھر اسی سورۃ کی آیت ۵۸ میں کہا گیا کہ علی الاعلان معاہدہ توڑو اور پھر کوئی کارروائی کرو۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کیا ہوا ہے۔ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی روابط بڑھانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دونوں ممالک کے مابین نہ صرف مختلف کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات بڑے بڑے ٹورنامنٹ دونوں ممالک مشترکہ طور پر منعقد کرتے ہیں۔ پھر حکومت پاکستان بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم کشمیری مجاہدین کی کوئی مدد نہیں کر رہے۔ "بغل میں چھری اور منہ پر رام رام" کا طعنہ ہم ہندو مذہب کے پیروکاروں کو دیتے ہیں لیکن عملاً یہ روش ہم نے خود اختیار کر رکھی ہے۔ ایسی روش کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ سورۃ الانفال کی آیت ۷۲ ہی کو دلیل بناتے ہوئے ۱۹۴۹ء میں مولانا مودودی مرحوم نے جہاد کشمیر کو غلط قرار دیا تھا اور یہ موقف پیش کیا تھا کہ پہلے اپنے ملک میں اسلام نافذ کیا جائے اور پھر ہندوستان سے معاہدہ توڑ کر کھلم کھلا اعلان جنگ کر کے کشمیر میں جہاد کیا جائے۔

(ii) سورۃ النساء کا حکم ان مسلمانوں کے لئے ہے جو اہل مکہ پر قول و عمل کے ذریعے اتمام حجت کر چکے تھے اور اپنے دائرۂ کار میں یعنی مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کی حد تک اس وقت تک نازل شدہ شریعت کے احکامات نافذ کر چکے تھے۔ مسلمانان پاکستان کے لئے اس حکم کا اطلاق کرنا ہرگز درست نہیں۔

بعض حضرات جہاد کشمیر کے لئے قرآن حکیم سے قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں وہ آیات بیان کرتے ہیں جو مدنی دور میں نازل ہوئیں۔ ایسے حضرات اپنے سامعین و قارئین کو مدنی دور میں لے جانا چاہتے ہیں لیکن مکی دور کے جاں گسل مرحلے سے گزارنے کے لئے تیار نہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

سا تو یں دلیل : موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم غیر شعوری طور پر جہاد کشمیر کے ذریعے امریکی عزائم کی تکمیل میں حصہ لے رہے ہیں اور نیو ورلڈ آرڈر کے نفاذ کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ مسئلہ کشمیر لگ بھگ ۵۰ سال پرانا ہے لیکن اس وقت امریکہ کی اس معاملہ میں دلچسپی معنی خیز ہے۔ امریکی عزائم میں یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں کہ کشمیر کو آزاد کروا کر وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کی جائے اور چین، ایران، ہندوستان اور وسطی ایشیا کے ممالک پر براہ راست نگاہ رکھی جائے۔ گویا ایشیا کے قلب میں ایک نیا "اسرائیل" قائم کرنا امریکہ کے پیش نظر ہے۔ اس اعتبار سے ہمیں جہاد کشمیر کے بارے میں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ یہ جہاد جاری رہے تاکہ ہندوستان کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ امریکہ کو ثالث تسلیم کرے اور پھر امریکہ اپنے منصوبہ پر عمل کر سکے۔

جہاد کشمیر کی اصل نوعیت

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں ہم جہاد کشمیر کے نام سے کی جانے والی مسلح جدوجہد کو جہاد فی سبیل اللہ تو نہیں کہہ سکتے، البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی رضا کے حصول کے لئے اس جہاد میں جانیں دیں، تکالیف اٹھائیں یا کسی بھی شکل میں قربانی دی، وہ انہیں اس کا بھرپور بدلہ عطا کرے گا۔

جہاد کشمیر کی نوعیت کا جہاں تک تعلق ہے تو اسے جہاد حریت کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے دین میں ایسے جہاد کو بھی نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ جو شخص اپنے مال یا جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید قرار پائے گا۔ اسی طرح اپنی آزادی، خود مختاری اور حقوق کے حصول یا تحفظ کے لئے جدوجہد قطعاً غیر اسلامی نہیں۔

مسئلہ کشمیر کا حل

بلاشبہ کشمیر سمیت پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اس کا

حل جہاد فی سبیل اللہ کی آخری اور بلند تر شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہم نے قتال فی سبیل اللہ کے آغاز کے لئے لازمی شرائط پوری کرنے کی طرف کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہیں کی، لہٰذا ہمیں کوئی اور حل تلاش کرنا ہو گا۔ پھر ہمارے سیرت و کردار اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ ہمارے پاس وہ ایمانی قوت نہیں ہے جس کی بنیاد پر اپنے سے کئی گنا بڑے اور کہیں زیادہ وسائل رکھنے والے دشمن کو شکست دی جا سکے۔ لہٰذا ہمیں مسئلہ کے فوری حل کے لئے صلح و مصالحت کا طریقہ کار اختیار کرنا ہو گا۔

مسئلہ کا فوری حل

مسئلہ کشمیر کے فوری حل کے لئے ہمیں دو کام کرنا ہوں گے :

(۱) رائے عامہ کو تیار کیا جائے کہ وہ حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالے کہ وہ امریکہ کو ثالث بنائے بغیر بھارت سے مسئلہ کشمیر پر براہ راست مذاکرات کرے۔ ان مذاکرات کے دوران بھارت کو اس حقیقت کا ادراک کرایا جائے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے پردے میں نہایت قلیل نسلی اقلیت یعنی یہودی پوری دنیا پر ایک نیا مالیاتی استعمار مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اس کا راستہ روکنے کے لئے ہمیں کشمیر کے مسئلہ کو تقسیم ہند کے فارمولے کے تحت حل کر لینا چاہئے۔ آزاد کشمیر، ہنزہ، گلگت، بلتستان وغیرہ کے مسلم اکثریتی علاقے پاکستان میں ضم کر دیئے جائیں اور لداخ و جموں کا ہندو اکثریتی علاقہ ہندوستان میں ضم کر دیا جائے۔ وادی کشمیر اور جموں کے مسلم اکثریتی علاقہ کو یہ آپشن دیا جائے کہ وہ چاہیں تو پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیں یا اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھیں۔

(۲) حکومت پاکستان پر رائے عامہ کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے کہ وہ پاکستان، افغانستان، ایران اور روسی ترکستان پر مشتمل ایک مسلم بلاک کی تشکیل کی کوشش کرے اور یہ بلاک نیو ورلڈ آرڈر کا راستہ روکنے کے لئے ہندوستان اور چین کے ساتھ نہایت دوستانہ اور خوشگوار تعلقات استوار کرے۔

مسئلہ کا اصل حل

مسئلہ کشمیر سمیت پوری دنیا میں امت مسلمہ کے جملہ مسائل کے حل کے لئے ہمیں درجہ ذیل طریقہ کار پر عمل پیرا ہونا ہو گا۔

(۱) مذہبی اور دینی تحریکیں اپنے کارکنان کو قرآن حکیم کے سیکھنے اور سکھانے کی اہمیت سے روشناس کریں تا کہ وہ اپنی محنتیں اور توانائیاں اس کام میں لگا کر امت مسلمہ میں قرآن حکیم کے ذریعے تجدید ایمان کی تحریک برپا کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں اور خصوصاً ہمارے پڑوسی ملک یعنی ہندوستان کے باشندوں کے سامنے قرآن حکیم کی آفاقی تعلیمات دلسوزی و ہمدردی اور تعصب سے بالاتر ہو کر پیش کی جا سکیں۔

(۲) قرآن حکیم کے سیکھنے اور سکھانے کی اس تحریک سے ہمارے دلوں میں نہ صرف نور ایمان پیدا ہو گا بلکہ یہ مسلسل ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ایک صحیح روح کے ساتھ بیدار ہو گا اور ہم اس جہاد کا آغاز سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف کریں گے۔ ذاتی طور پر سیرت و کردار کی اصلاح کے ساتھ ساتھ یہ جہاد اپنے گھر میں ہو گا اور وہاں اللہ کے دین کا نفاذ ہو گا۔ ان شاء اللہ پھر ایک منظم اور پر امن تحریک کے ذریعے ہم یہ سعادت اپنے ملک کے لئے حاصل کر لیں گے۔ اگر ہم نے قرآن حکیم کی پر تاثیر دعوت کو پھیلانے کا حق ادا کر دیا اور دنیا کے سامنے عدل و انصاف کی پیکر ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کا نقشہ پیش کر دیا تو انسانیت آپ سے آپ دین اسلام کی طرف کھنچتی چلی آئے گی اور پورے کرہ ارضی پر نظام خلافت کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ اور اس طرح اقبال کا یہ خواب ان شاء اللہ ضرور پورا ہو گا کہ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

افکار و آراء

حقانی صاحب، اپنی ذمہ داریاں ادا کریں!

نگران وفاقی وزیر اطلاعات و فروغ ابلاغیات ارشاد احمد حقانی کے نام

رفیق تنظیم اسلامی محبوب الحق عاجز کا کھلا خط

محترم ارشاد احمد حقانی صاحب وفاقی وزیر اطلاعات و فروغ ابلاغیات

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔ امید ہے کہ آپ ایمان و یقین کے بہترین حالات میں ہوں گے۔ راقم الحروف روزنامہ "جنگ" میں آپ کے کالموں کے حوالے سے آپ سے متعارف ہے۔ میرا تعلق بھی میدان صحافت سے ہے لیکن بس واجبی سا کہ کبھی کبھار معاشرتی مسائل اور سیاست حاضرہ پر کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہوں۔

حقانی صاحب! حدیث رسول ﷺ میں دین کو نصح و خیر خواہی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ خیر خواہی جہاں اللہ تعالیٰ' اس کے رسولؐ اور عام مسلمانوں کے لئے ہے' وہاں اس کے مستحق "اولوالامر" بھی ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو احکامات الٰہی پر عمل پیرا ہونے اور ان کے نافذ کرنے کی تلقین کریں۔ اسی حوالے سے اصلاح احوال کی غرض سے اس سے قبل بارہا ارباب اقتدار کو تذکیر و یاددہانی کی خواہش پیدا ہوئی لیکن کبھی کسی سے رابطہ نہیں کیا۔ کیونکہ کرسی نشین ذاتی مفادات' لوٹ کھسوٹ اور اقتدار بچانے کی فکر سے بالاتر ملک و قوم کے وسیع تر مفاد کے لئے پیش کردہ تجویز یا تجاویز کو درخور اعتناء سمجھتے ہیں اور نہ کسی آدرش اور اعلیٰ نصب العین سے انہیں کوئی دلچسپی ہے بلکہ ہمارا سیاسی کلچر ہی یہ بن چکا ہے کہ ؎

کوئی مست ہے کوئی تشنہ لب تو کسی کے ہاتھ میں جام ہے
بھلا کوئی اس کا کرے بھی کیا یہ تو میکدے کا نظام ہے

لیکن آپ کی خدمت میں میڈیا کے حوالے سے چند معروضات اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ آپ سے خیر کی توقع اور دین و ملت کی بھلائی کی امید ہے' کیونکہ اولاً: آپ روایتی سیاستدان نہیں ہیں بلکہ اس میدان صحافت سے تعلق رکھتے ہیں جو لوٹ کھسوٹ کی بجائے خبر رسانی اور عوام اور حکمرانوں دونوں کو فکری رہنمائی کا مقدس فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ ثانیاً: میدان صحافت میں بھی آپ کی سوچ و فکر اسلام کے ہمہ گیر نظریہ کی ترجمان دکھائی دیتی ہے۔

حقانی صاحب' یوں تو ہمارا پورا سیاسی نظام ہی اہل پاکستان پر ستم ڈھا رہا ہے لیکن ذرائع ابلاغ بالخصوص ٹیلی ویژن پروگرام پوری قوم کے لئے سوہان روح بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس پہلو سے چند چیزوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ آج صحافت کو مختلف مسائل درپیش ہیں۔ ان مسائل میں سرفہرست صحافت کی آزادی کا مسئلہ ہے کیونکہ حکومتیں اخبارات کی سنسر شپ' پریس ایڈوائسز' سرکاری اشتہارات کی بندش' بلوں کی عدم ادائیگی یا نیوز پرنٹ کا مسئلہ کھڑا کر کے صحافت کی آزادی کو پامال کرتی ہیں۔ صحافتی میدان سے گہرے تعلق کی بنا پر آپ بھی یقیناً اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ اخبارات' رسائل و جرائد وغیرہ کے مسائل کیا ہیں اور آزادی صحافت کو کیا خطرات درپیش ہیں۔ اس لئے اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار سے نوازا ہے آپ کے لئے ضروری ہے کہ صحافت کی آزادی اور بہتری اور صحافی برادری کو درپیش مسائل کے حل کے لئے مناسب اقدامات کریں اور حکومت اور پریس کے درمیان بہتر تعلقات کے فروغ میں فیصلہ کن کردار ادا کریں۔

دوسرے یہ کہ اخبارات میں شائع ہونے والا غیر اخلاقی مواد' کرائمز رپورٹوں کی بھرمار اور رنگین صفحات ہماری نوجوان نسل کے اخلاق و کردار پر نہایت برے اثرات مرتب کر رہے ہیں' لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اخبارات کو صحافتی ضابطہ اخلاق کا پابند بنایا جائے۔ خاص طور پر اخبارات میں فلمی اداکاراؤں پر مبنی رنگین صفحات کی اشاعت کو فی الفور ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے صحافی تنظیموں' اخبارات کے مالکان اور مدیران کی خصوصی میٹنگ بلا کر غور و فکر کیا جائے تو زیادہ بہتر لائحہ عمل اور نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ ہماری ملکی تاریخ شاہد ہے کہ یہاں جو بھی پارٹی برسراقتدار آتی ہے وہ الیکٹرانک میڈیا پر قبضہ کر کے اسے "ذاتی جاگیر" بنالیتی ہے۔ ریڈیو' ٹی وی کی ایسی پالیسی وضع کی جاتی ہے جس کے تحت برسراقتدار جماعت کے حق میں ہی پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس کے معمولی ترقیاتی کاموں اور فلاحی منصوبوں کو بھرپور نمایاں کیا جاتا ہے۔ ٹی وی خبرنامہ میں ناظرین کے سامنے ملکی و ملی اور بین الاقوامی حالات و واقعات کی صحیح تصویر کشی کی بجائے صرف صدر' وزیر اعظم' وزراء اور حکومتی ممبران اسمبلی کے اجلاس اور کارنر میٹنگز دکھائی جاتی ہیں۔ حزب اقتدار کے علاوہ دوسری سیاسی جماعتوں کو ٹی وی سے دور رکھا جاتا ہے اور ان کی کسی سیاسی سرگرمی کو کوریج نہیں دی جاتی۔ ٹی وی کی اس حکومت نواز پالیسی کا حتمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ٹی وی کے ذریعے فراہم کردہ خبروں اور اطلاعات پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور وہ بیرونی نشریات دیکھنے لگے ہیں۔ اب وقت کا اولین تقاضا ہے کہ "مقبوضہ" ٹی وی کو آزاد کیا جائے اور ایک ایسی مربوط' متوازن اور منصفانہ ٹی وی پالیسی وضع کی جائے جس کے زیر اثر تمام سیاسی جماعتوں کو ٹی وی پر یکساں کوریج دی جاسکے اور حالات و واقعات کی حقیقی تصویر عوام کے سامنے پیش کی جاسکے۔

چوتھے یہ کہ زمان و مکان کی تسخیر کی بدولت زمینی فاصلے سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ پوری دنیا نے گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ اب جغرافیائی وحدتوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور قومیں وطن' زبان' رنگ اور نسل کی تنگ داماتیوں سے نکل کر سیاسی' معاشی' اور معاشرتی افکار کی وسیع تر وحدتوں کو اپنی تعمیر نو کی اساس بنا رہی ہیں۔ اس کی نمایاں مثال یورپی یونین ہے۔ چنانچہ دوسروں کو شمشیر سے فتح کرنے کی بجائے نظریات کے میدان میں نیچا دکھانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ گویا عصر حاضر کی جنگ

شمشیر کی نہیں تہذیب کی جنگ ہے، ہتھیاروں کی نہیں نظریات کی جنگ ہے۔ نظریات اور تہذیبوں کی اس جنگ میں موثر ترین ہتھیار ٹیلی ویژن ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہایت موثر انداز میں نظریات کی تبلیغ کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف ممالک ڈش انٹینا کے ذریعے پوری دنیا میں اپنی نشریات دکھا رہے ہیں۔

نظریات کی اس جنگ میں مغربی طاقتیں زیادہ موثر کردار ادا کرتی اور غالب آتی نظر آ رہی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی نشریات بیرونی دنیا میں پیش کر رہی ہیں بلکہ انہوں نے دوسرے ملکوں میں بھی مقامی حکمرانوں کے توسط سے ٹی وی پر تسلط جما رکھا ہے، اور اسے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے ان کا خاص شکار مسلمان ممالک ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلم ممالک سے انہیں ایسے فرماں بردار "غلام" میسر آ گئے ہیں "جو آپ کا حکم سر آنکھوں پر" کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ اہل مغرب کی بھرپور کوشش ہے کہ ٹی وی کے ذریعے اپنی زوال یافتہ 'بے خدا' مادہ پرستانہ اور شرم و حیا سے عاری تہذیب کو مسلم معاشروں پر مسلط کر دیا جائے اور انہیں اپنی زندہ تہذیب اور تابندہ ثقافت سے بیگانہ کر دیا جائے، تاکہ جس طرح وہ خود اخلاقی اور معاشرتی میدانوں میں دیوالیہ ہو چکے ہیں اسی طرح مسلم ممالک میں بھی اباحیت اور جنسی بے راہ روی کو عام کر کے اہل اسلام کو اپنے دین سے بے زار اور معاشرتی و اخلاقی تباہی سے دوچار کر دیا جائے۔ ہمارا پاک وطن بھی اسی ناپاک سازش کا شکار ہو چکا ہے۔

ہمیں چاہئے تو یہ تھا کہ اپنے فلسفہ حیات اور بنیادی اصولوں اور نظریات کے مطابق انقلابی ٹی وی پالیسی تشکیل دیتے تاکہ ہم اپنی تابناک اور تابندہ تہذیب و ثقافت کو فروغ دے سکتے جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام انسانیت کے لئے باعث رحمت اور اس کے اخلاقی امراض کی شفا ہے اور تاکہ ایک ایسی اعلیٰ سوسائٹی وجود میں آتی جو امانت و دیانت، سچائی و صداقت، اخوت و بھائی چارہ اور فکر و عمل کے میدان میں پوری دنیا کے لئے نظیر بن جاتی، لیکن ہم نے ایسا کرنے کی بجائے نظریاتی جنگ میں پسپائی اختیار کر لی اور اپنے اساسی نظریہ کو بالائے طاق رکھ کر بے خدا نظریات کو سینے سے لگایا اور مغربی کلچر کی تبلیغ کی۔ ٹی وی پر ایسے پروگرام پیش کئے جن کا ہماری تہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا چنانچہ آج شرم و حیا، غیرت و حمیت اور عفت و عصمت کے تمام تقاضوں کو فراموش کر کے ٹی وی پر قوم کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو عریاں لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ صنف نازک کے حسن و جمال اور جسمانی نشیب و فراز کی بھرپور نمائش کی جا رہی ہے۔ عورت کو ماڈل گرل کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ روح فرسا ننگے ناچ، آزادانہ رقص و سرود، شرمناک گانوں اور بے ہنگم موسیقی کے پروگراموں سے نسل نو کی "تفریح" کا سامان کیا جا رہا ہے۔ ڈراموں، فلموں اور دوسرے پروگراموں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان شرم سے عاری مکالمے نشر کئے جا رہے ہیں۔

ان پروگراموں کو دیکھ کر کوئی ذی ہوش یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اسی سرزمین مقدس کی نشریات ہیں جس کی بنیادوں میں شہیدوں کا خون بہا ہے، جو اسلام کے مقدس نام پر حاصل کی گئی ہے، جس کے دستور میں خدائی حاکمیت کا اقرار و اعلان کیا گیا ہے، جس میں سیاسی مداری اپنی تمام تر منافقتوں اور خباثتوں کے

باوجود اسلام ہی کو اقتدار تک پہنچنے کا زینہ بناتے رہے ہیں بلکہ ان پروگراموں سے نمایاں تاثر یہ ملتا ہے کہ پاکستان صالح، نیک، باکردار، شریف اور غیرت مند افراد کا وطن نہیں بلکہ بھانڈوں، کنجروں، اداکاروں، جنس پرستوں، گوفروں اور لفنگوں کی سرزمین ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہم نے پاکستان کے لئے بے شمار قربانیاں اس لئے دی تھیں کہ ہم آزادی کے [illegible] مغربی نظام، مغربی فکر و فلسفہ، مغربی اخلاقیات اور مغربی کلچر کو اختیار کر لیں۔ اگر ایسا ہی مقصود تھا تو [illegible] وطن کی جدوجہد یکسر فضول اور بے معنی تھی۔ لیکن اگر ہماری جدوجہد کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہم آزاد وطن میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کر سکیں تو پھر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خدارا نظریہ پاکستان، پاکستان کے لئے دی گئی قربانیوں، خدائے رحمان کی مہربانیوں، اہل وطن کی پریشانیوں اور اعدائے اسلام کی کارستانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ٹی وی پالیسی پر نظرثانی کر کے اسلامی اقدار کے مطابق ایک متوازن اور صاف ستھری پالیسی وضع کیجئے۔ یہ آپ کی آئینی ذمہ داری ہے اور دینی و اخلاقی فریضہ بھی! یہ کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ آپ خود تہذیب حاضر سے نفرت کرتے، اسے مسلمانوں کی پریشانیوں کا اصل سبب گردانتے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کو وقت کا اولین تقاضا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ قبل ہی آپ نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے:

> "ترقی کا جو فلسفہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے عاری ہو وہ عام کے مسلمان کو بھی پریشان اور بے زار ہی رکھے گا۔ اگر آپ دور اندر تک کھوج لگانے کی کوشش کریں تو اس پریشانی اور بے رازی کی جڑیں مغربی ثقافت اور اس کی لادین آزادی میں پیوست ملیں گی..... وقت آ گیا ہے کہ مسلمان سیاسی آزادی کے حصول کے بعد ان تہذیبی، فکری اور معاشی بندھنوں کو توڑنے اور نظام جبریت سے ٹکرانے کے لئے اٹھیں"۔

(بحوالہ "عصر حاضر اور اسلام کا نظام معیشت" روزنامہ جنگ ۲ دسمبر ۹۶ء)

اگر آپ مغربی کلچر اور تہذیب کو بے خدا اور مادہ پرستانہ قرار دے کر اس کے خاتمے کی بات کرتے ہیں تو اس کے خاتمے میں نمایاں کردار آپ ہی ادا کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ نے آپ کو طاقت دی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ ٹی وی کا قبلہ درست کریں۔ اگر آپ ایسا کر لیتے ہیں تو اس پوری قوم کے مسیحا بن سکتے ہیں جو سیاسی محکومیوں، سماجی مجبوریوں اور معاشی ناانصافیوں کا شکار تو ہو ہی چکی، اب معاشرتی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہو کر دیوالیہ پن کو پہنچنے والی ہے۔ لیکن اگر آپ نے ٹی وی کی موجودہ پالیسی کو برقرار رکھا تو پھر یہی سمجھا جائے گا کہ روایتی سیاسی طالع آزماؤں کی طرح آپ بھی محض بیان بازی اور "کالم بازی" پر ہی اکتفا کرنے کے قائل ہیں۔ عملاً آپ کو اسلامی کلچر سے دلچسپی ہے اور نہ محبت، کیونکہ یہ عجیب تضاد ہو گا کہ اپنے کالموں میں تو آپ اسلامی تہذیب کے راگ الاپتے رہیں لیکن طاقت میں آ کر کچھ نہ کریں۔ بقول جگر مراد آبادی ؎

یہ جناب شیخ کا فلسفہ بھی عجب ہے سارے جہان میں
جو وہاں پیو تو حلال ہے جو یہاں پیو تو حرام ہے

امید ہے کہ میری معروضات پر ہمدردانہ غور فرما کر عملی اقدامات کریں گے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد : ۴۶

شمارہ : ۲

شوال المکرم ۱۴۱۷ھ

فروری ۱۹۹۷ء

فی شمارہ ۱۰/-

سالانہ زرتعاون ۱۰۵/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔اے، گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن۔ طابع: رشید احمد چودھری۔ مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

سعادت و برکات کا مہینہ 'ماہِ رمضان' تیزی کے ساتھ اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس ماہ مبارک کا دوسرا عشرہ جسے آنحضورﷺ نے "مغفرت" کا عنوان دیا تھا' ختم ہونے کو ہے۔ گویا اس کا نصف سے زائد حصہ ہم بتا چکے ہیں اور اب نیکیوں کی اس فصل بہار سے فائدہ اٹھانے اور سعادتوں کو سمیٹنے کے لئے بہت کم وقت ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے۔

اس ماہ مبارک کے آخری عشرہ کی نمایاں ترین شے لیلۃ القدر ہے جس کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جانا چاہئے کہ خود اللہ نے اسے ہزار مہینوں سے افضل قرار دیا (لیلۃ القدر خیر من الف شھر) اور ایک مکمل سورۃ اسی عنوان سے نازل فرما کر اس کی عظمت و فضیلت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ کرۂ ارضی پر بسنے والے ایسے اصحاب ایمان و یقین کی تعداد اگر کروڑوں میں نہیں تو لاکھوں میں ضرور ہو گی جو اس مبارک شب کی جستجو میں اس ماہ مبارک کے آخری عشرے کی طاق راتیں' بالخصوص ۲۷ ویں شب جاگ کر گزاریں گے۔ تہنیت و مبارکباد کے لائق ہیں وہ لوگ کہ جن کا یہ جاگنا محض رت جگا نہیں ہو گا بلکہ یہ وقت قرآن کے پڑھنے پڑھانے' سننے سنانے اور نوافل و مناجات میں صرف ہو گا۔ اللھم ربنا اجعلنا منھم

اس بار اسی عشرۂ اخیرہ میں الیکشن کا مرحلہ بھی درپیش ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ معتکف حضرات اپنا حق رائے دہی کیسے استعمال کر سکیں گے اور آیا ووٹ کے لئے مسجد سے باہر نکلنے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا یا باقی رہے گا' یہ بات اب تقریباً یقینی نظر آتی ہے کہ الیکشن مقررہ وقت پر ہی ہو گا۔ اس الیکشن سے ہماری دلچسپی صرف اسی قدر ہے کہ ہماری رائے میں اس ملک میں جمہوری عمل کا جاری رہنا بہت ضروری ہے۔ ملکی بقا کا معاملہ بہت کچھ اس پر موقوف ہے۔ تاہم ہم اس حقیقت کا بھی بخوبی ادراک رکھتے ہیں کہ بحالات موجودہ الیکشن کے راستے سے اس ملک میں اسلام ہرگز نہیں آ سکتا۔ گو بظاہر احوال مسلم

لیگ کی کامیابی زیادہ قرین امکان نظر آتی ہے تاہم ہماری دانست میں ان انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیابی حاصل ہو یا پیپلز پارٹی کو' حالات میں کوئی لمبا چوڑا فرق واقع نہیں ہو گا۔ ہم بدستور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی اسامی بنے رہیں گے اور ملکی سطح پر سیکولرزم ہی اپنی جڑیں مزید جمائے گا۔ اصلاح احوال کی واحد صورت وہی ہے کہ جس کی تکرار ہم گزشتہ کئی برسوں سے کئے چلے جا رہے ہیں' جس کا حاصل اقبال کے اس ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے سمٹ آیا ہے کہ ؎

با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

☆ ☆ ☆

زیر نظر شمارے میں شامل دو مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک "حقیقتِ تصوف" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کا خصوصی خطاب ہے جس کے ذریعے تصوف کے بارے میں امیر تنظیم کا موقف پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ (امیر محترم کے اس خطاب کو فوری طور پر شائع کرنے کا ایک خاص سبب بھی ہے جس کا ذکر مضمون کے شروع میں کر دیا گیا ہے) دوسرا مضمون جو خاصا مفصل ہے' پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا تحریر کردہ ہے۔ عنوان ہے : "خصوصیاتِ قرآن"۔ چشتی صاحب مرحوم علم کا بحرِ ذخار تھے اور ان کے دل پسند موضوعات میں خصوصیات قرآن حکیم بھی شامل تھا۔ ماہ رمضان کی مناسبت سے اس مضمون کی اشاعت ان شاء اللہ العزیز بہت افادیت کی حامل ہو گی۔

☆ ☆ ☆

پاکستان کے طول و عرض میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام
ایک نظر میں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' نے نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کا آغاز آج سے تیرہ برس قبل قرآن اکیڈمی لاہور سے کیا تھا۔ اس کے اگلے ہی برس امیر محترم کے علاوہ تنظیم اسلامی کے بعض رفقاء نے بھی دورۂ ترجمہ قرآن

کروایا اور بعض مقامات پر امیر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن کے ویڈیو کیسٹ کے ذریعے اس کار خیر کا آغاز کیا گیا۔ اس کے بعد ہر سال دورۂ ترجمہ قرآن کے حلقوں میں بحمد اللہ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ امسال پاکستان میں جن مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام ہو رہے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

حلقہ لاہور ڈویژن

۱۔	قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور	مدرس ڈاکٹر عارف رشید
۲۔	مسجد خدام القرآن، والٹن	مدرس جناب فتح محمد قریشی
۳۔	جامع مسجد لاریکس کالونی، کینال بنک ایکسٹینشن	جناب محمد مبشر (بذریعہ تفہیم القرآن)
۴۔	مرکزی دفتر تنظیم اسلامی، گڑھی شاہو	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۵۔	محلہ جلوٹیاں، اندرون بھاٹی گیٹ	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۶۔	لانس روڈ	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۷۔	حسن ٹاؤن، ملتان روڈ	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۸۔	دیو سماج روڈ، سنت نگر	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۹۔	کوٹ شہاب الدین، شاہدرہ	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

حلقہ پنجاب شمالی

۱۔	بر مکان عظمت ممتاز ثاقب، F/10 اسلام آباد	مدرس شمس الحق اعوان
۲۔	بر مکان جناب جاوید اقبال	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۳۔	بر مکان ڈاکٹر خالد رحیم، خیابان سرسید	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۴۔	دفتر حلقہ، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۵۔	بر مکان جناب یوسف عزیز، اسرہ محمدی کالونی	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۶۔	بر مکان جناب ظہیر احمد	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۷۔	بر مکان غلام مرتضیٰ اعوان، E-24 - G6/2	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
۸۔	بر مکان غلام رسول غازی، قائداعظم یونیورسٹی	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

حلقہ پنجاب جنوبی

۱۔	قرآن اکیڈمی ملتان	مختار حسین فاروقی
۲۔	مسجد نشتر میڈیکل کالج	ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

حلقہ پنجاب غربی

۱۔ حمید پیلس فیصل آباد	ڈاکٹر عبدالسمیع
۲۔ دفتر حلقہ، ریلوے روڈ فیصل آباد	جناب شاہد مجید
۳۔ مرکز تنظیم اسلامی، سرگودھا	جناب رشید عمر
۴۔ چک ۱۲/۷ جنوبی	محمد اقبال
۵۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ	چوہدری رحمت اللہ بٹر (بزبان پنجابی)
۶۔ سانگلہ ہل	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

حلقہ آزاد کشمیر

۱۔ بیروٹ	جناب خالد عباسی

حلقہ سرحد

۱۔ برمکان خدا بخش پشاور	بذریعہ ویڈیو کیسٹ

حلقہ کراچی

☆ تنظیم اسلامی ضلع وسطی نمبر۱

(۱) برمکان احتشام الحق صدیقی، نیو کراچی	مترجم : جناب عبدالمقتدر
(۲) برمکان جناب نجم الحسن، نارتھ ناظم آباد	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

☆ تنظیم اسلامی ضلع وسطی نمبر۲

(۱) برمکان جناب جلال الدین اکبر، گلشن اقبال	مترجم : جناب جلال الدین اکبر
(۲) برمکان جناب نوید احمد، اسحٰق آباد	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم
(۳) برمکان جناب محمد طارق، عزیز آباد	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر۱

(۱) دفتر تنظیم اسلامی	مترجم : عبدالرزاق صاحب

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر۲

(۱) دفتر تنظیم اسلامی	مترجم : جناب اعجاز لطیف
(۲) برمکان جناب اعجاز لطیف (صبح دس تا ڈیڑھ بجے)	مترجمہ : بیگم اعجاز لطیف
(۳) برمکان جناب بشیر احمد سلیمی، ملیر کینٹ	بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر۲

(۴) بر مکان جناب محمد سلیم' ماڈل کالونی — بذریعہ ویڈیو کیسٹ امیر محترم

☆ تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر۳

(۱) مسجد طیبہ' زمان ٹاؤن' کورنگی نمبر۴ — مترجم سید یونس واجد صاحب

(۲) بر مکان جناب ابوذر ہاشمی' لانڈھی نمبر۱ — تین مترجم حضرات

☆ تنظیم اسلامی ضلع جنوبی

قرآن اکیڈمی' ڈیفنس — مترجم ۔ انجینئر نوید احمد

سانحہ ارتحال

تنظیم اسلامی کی بزرگ رفیقہ محترمہ طیبہ یاسمین صاحبہ' جن کے ہلکے پھلکے' سبق آموز اور فکر انگیز مضامین ایک عرصہ "گوشہ خواتین" کے زیر عنوان "میثاق" کی زینت بنتے رہے' قضائے الٰہی سے انتقال کر گئی ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ جو امیر تنظیم کی بیعت کر کے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کرنے سے پہلے جماعت اسلامی کی فعال کارکن تھیں' ملک نصراللہ خان عزیز مرحوم کی صاحبزادی تھیں' گویا تصنیف و تالیف کا فن اور دعوتی و تحریکی جذبہ انہیں ورثے میں ملا تھا۔ مرحومہ کچھ عرصے سے سرطان کے عارضہ میں مبتلا تھیں۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کی نماز جنازہ امیر محترم پڑھائیں۔ ان کا انتقال ٹھیک اسی شب ہوا جس شب امیر محترم کی امریکہ سے واپس تشریف آوری ہوئی۔ مرحومہ کی خواہش کے احترام میں امیر محترم ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اللھم اغفر لھا وارحمھا وادخلھا فی رحمتک وحاسبھا حسابا یسیرا

اطلاع برائے قارئین : آسان عربی گرامر' حصہ سوم چھپ کر آ گئی ہے اور مکتبہ مرکزی انجمن سے حاصل کی جا سکتی ہے

فرقہ وارانہ کشیدگی

سے اصل فائدہ کس کو؟ اور شدید نقصان کس کا؟

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۲۴ جنوری کے خطاب جمعہ کا خلاصہ

پاکستان میں شیعہ سنی کشیدگی کی نئی لہر کو عالمی اور بین الاقوامی حالات کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس پوری کائنات پر اصل حکمرانی اللہ تعالیٰ کی ہے' اس نے اس سلسلہ کون و مکاں کو صرف تخلیق ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس کے تخت حکومت پر متمکن بھی ہے۔ وہ صرف کائنات کا خالق ہی نہیں بلکہ حکمران اور مدبر بھی ہے۔ بد قسمتی سے مادہ پرستانہ فکر کے زیر اثر ہم میں سے اکثر کو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی تدبیر امر کا شعور نہیں رہا' اور ہم بالعموم مادی اسباب و علل ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اس نکتے کو ذہن میں مستحضر رکھنا چاہئے کہ اگرچہ کائنات میں ارادہ اور اختیار رکھنے والی مخلوقات بھی موجود ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ ان مخلوقات کی آزادی عمل میں خلل ڈالے بغیر اپنی مشیت پوری کر لیتا ہے اور اپنی تدبیر کا راستہ نکال لیتا ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک وقت میں ایک ہزار سال کی منصوبہ بندی کر لیتا ہے' جسے تدبیر امر کہا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کی واضح خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اپنے آخری انجام یعنی قیامت کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے' تاہم قیامت سے پہلے کل روئے ارضی پر اللہ کا دین لازماً غالب ہو گا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام پوری دنیا پر قائم ہو کر رہے گا۔ لیکن اس سے پہلے سابقہ مسلمان امت یعنی یہود پر ان کی بد عملی اور بے عملی کی سزا میں عذاب استیصال آئے گا اور ساتھ ہی موجودہ مسلمان امت یعنی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کے کرتوتوں کی سزا ملے گی۔ یہود کی آخری سزا یا extermination ان کے اپنے رسول یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد معجزانہ طور پر ہو گی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا ملنا ہے وہ ان کے افضل ترین حصے یعنی عالم عرب پر یہود کے ہاتھوں آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ دین سے انحراف کی مجرم بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ ہے' تاہم سب سے بڑے مجرم عرب مسلمان ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے خاص رتبہ دیا تھا' حضور ﷺ عربوں میں سے تھے اور قرآن حکیم عربوں کی اپنی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس بلند رتبے اور فضیلت کے باوجود عربوں نے

[illegible]روانی کی ہے تو ان کی سزا بھی شدید ترین ہو گی۔ ظاہر ہے عربوں میں نیک اور باعمل مسلمان بھی موجود ہیں' لیکن ان کی حیثیت محض استثنائی ہے' جبکہ عذاب کا فیصلہ کسی قوم کے مجموعی طرزِ عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ غیر عرب مسلمانوں میں سب سے بڑے مجرم اہل پاکستان ہیں' اور یہ عین ممکن ہے کہ اگر ہم نے اپنی روش نہ بدلی تو جس طرح اہل عرب پر یہود کے ہاتھوں عذاب آنا ہے اسی طرح مسلمانوں [illegible]ہنود کے ہاتھوں سزا آ جائے۔

[illegible] حالات یہ ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو دنیا کی واحد سپرپاور کی حیثیت حاصل ہے' اور امریکی غلبے کے پردے میں یہود کے عالمی مالیاتی استعمار یعنی نیو ورلڈ آرڈر کی طاقت اور اس کا اثر و رسوخ مسلسل بڑھ رہا ہے۔ بظاہر دنیا کی باگ ڈور امریکہ' اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل وغیرہ کے ہاتھ میں ہے' لیکن پس پردہ اصل طاقت یہود کی ہے۔ اس وقت WASP یعنی White Anglo-Saxon Protestants یہود کے سب سے بڑے آلہ کار بن چکے ہیں' پہلے یہ حیثیت سلطنت برطانیہ کو حاصل تھی لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے اس کی جگہ لے لی ہے' اور دونوں پر اصل control یہود کا ہے۔ یہ واضح رہے کہ امریکی عوام اس سارے کھیل میں مجرم نہیں ہیں' کیونکہ وہ خود اس وقت یہود کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔

یہود کے اس عالمی استعمار کے خلاف مزاحمت کے چند ہی مراکز باقی رہ گئے ہیں۔ اگرچہ سوویت یونین کا قلع قمع ہو چکا ہے لیکن خطرہ ہے کہ وہ دوبارہ مقابلے پر نہ آ جائے۔ چین اس عالمی استعمار کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے جبکہ وسط ایشیا کی آزاد ریاستوں میں بھی اشتراکیت کے دوبارہ احیاء کا امکان موجود ہے۔ عالمی استعمار کی کوشش ہے کہ ملکوں کے درمیان سرحدوں کو معدوم کر کے مختلف معاشی بلاک بنا دیئے جائیں تا کہ ان سے اپنی مرضی منوانا آسان ہو جائے۔ کوئی ملک اتنا طاقتور نہ ہو کہ وہ نیو ورلڈ آرڈر کو چیلنج کر سکے' لہٰذا اسی مقصد کے لئے علیحدگی کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ عالم اسلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سارا عالم عرب اس نئے استعمار کے سامنے سجدہ ریز ہو چکا ہے۔ شمالی افریقہ کو فتح کیا جا چکا ہے۔ لیبیا اور سوڈان کی معاشی انقطاع کے ذریعے گوشمالی کی جا رہی ہے۔ خلیج کی جنگ میں عراق کا پہلے ہی بھرکس نکل چکا ہے۔ بھارت کے مشرق میں واقع تین مسلمان ممالک یعنی بنگلہ دیش' انڈونیشیا اور ملائشیا کا بقیہ عالم اسلام کے ساتھ جغرافیائی تعلق نہیں ہے۔ نیز بنگلہ دیش اور انڈونیشیا مجموعی طور پر سیکولر ہو چکے ہیں اور ملائشیا کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان ممالک میں اسلامی تحریکیں بھی کمزور ہیں۔

ان حالات میں صرف افغانستان' پاکستان' ایران' اور وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں پر مشتمل

خطہ ہی وہ واحد سرزمین ہے جو عالمی استعمار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند قائم کر سکتا ہے۔ خلیج کی جنگ کے موقع پر اس وقت کے سالار فوج جنرل مرزا اسلم بیگ نے امریکہ میں پاکستانیوں کے ایک ادارے سے ملنے والی اطلاع کی بنیاد پر بیان دیا تھا کہ عراق کے بعد ایران اور پھر پاکستان کی باری آئے گی' اور یہ اطلاع اب صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ عالمی قوتوں کا نشانہ نمبرایک اس وقت ایران ہے' جس پر فیصلہ کن حملے کے لئے تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ آخری ضرب لگانے سے پہلے ایران کو اس خطے میں پوری طرح تنہا (isolate) کرنے کے لئے ایک گہری سازش ہو رہی ہے۔ چنانچہ ایک طرف افغانستان میں کٹر سنی اور حنفی طالبان کی حکومت قائم کرائی گئی اور دوسری جانب پاکستان میں شیعہ سنی فساد کی آگ بھڑکا کر ایران اور پاکستان کے تعلقات خراب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ محاذ آرائی سے صرف عالمی یہودی استعمار کو فائدہ پہنچے گا جبکہ اس کا نقصان اسلام اور اسلامی احیائی تحریک کو ہوگا۔ پاکستان اگرچہ اس وقت بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا پوری طرح غلام بن چکا ہے' تاہم اس ملک میں احیائی تحریکوں کے اثرات بہت نمایاں ہیں' نیز فوج میں اسلامی جذبہ طاقتور ہے' جبکہ بقیہ تمام عالم اسلام میں فوج سیکولر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کا نشانہ ہمارا یہی خطہ بن رہا ہے۔

شیعہ سنی اختلاف کی تاریخ تقریباً اتنی ہی پرانی ہے جس قدر خود امت مسلمہ کی تاریخ۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے صرف ۲۵ سال بعد ایک یہودی سازش کے نتیجہ میں الفتنہ الکبریٰ برپا ہوا' حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی' اور پھر ساڑھے چار برس کی خانہ جنگی میں ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس موقع پر شیعان علیؓ اور شیعان عثمانؓ کے مابین صرف حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے معاملے میں سیاسی نوعیت کا اختلاف تھا جس نے آگے چل کر مذہبی اور عقیدے کے اختلاف کی شکل اختیار کر لی۔ فقہ جعفریہ اسی طرح کی ایک فقہ ہے جیسے فقہ حنفی یا مالکی وغیرہ۔ تاہم امامت معصومہ کا عقیدہ' صرف اہل بیتؓ سے منقول ہونے والی روایات کو قابل قبول سمجھنا اور خلافت راشدہ کی پہلی تین خلافتوں کو غاصبانہ قرار دینا' یہ سب بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ ہندوستان میں شیعیت ایران سے شہنشاہ ہمایوں کے ذریعے درآمد ہوئی۔ واضح رہے کہ شیعہ اور سنی اختلافات صدیوں سے موجود رہے ہیں' اور سنی علماء کی طرف سے اہل تشیع کے غلط عقائد پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے' لیکن کبھی بھی بحیثیت مجموعی اہل تشیع کی تکفیر نہیں کی گئی۔ ہندوستان میں بھی شیعہ اور سنی ساتھ ساتھ رہتے رہے ہیں اور محرم کے جلوسوں کے مسئلے کے سوا کبھی عمومی نوعیت کے فسادات نہیں ہوئے۔ شیعہ سنی ہم آہنگی کے مظاہر تین مواقع پر

سامنے آئے، یعنی تحریک پاکستان کے دوران، ۱۹۵۰ء میں ۲۲ دستوری نکات پر علماء کے اتفاق رائے کے موقع پر، اور ۱۹۶۲ء میں عائلی قوانین کے خلاف علماء کے متفقہ موقف کی شکل میں۔ موجودہ کشیدگی کا آغاز ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب کے بعد پاکستان کے بعض شیعہ عناصر کی طرف سے جارحانہ انداز اختیار کرنے سے ہوا جب سنیوں کے شدید رد عمل کے بعد اس معاملے میں تلخی پیدا ہونے لگی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت اہل تشیع کے جارحانہ انداز کے پیچھے ایران کا ہاتھ تھا یا نہیں، لیکن موجودہ حالات میں یہ بات صد فی صد واضح ہے کہ شیعہ سنی کشیدگی در حقیقت نیو ورلڈ آڈر کی سازش کا نتیجہ ہے جس کا مقصد ایران کو تنہا کر کے اس کے خلاف فیصلہ کن اقدام کرنا ہے۔ اس وقت یا تو مقامی مذہبی جنونیت غیر شعوری طور پر عالمی سازش کا آلہ کار بن رہی ہے، یا پھر دہشت گردی اور دونوں فرقوں کے سرکردہ افراد کے قتل کے پیچھے را یا موساد کا براہ راست ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔

۱۸/ جنوری کو لاہور کے سیشن کورٹ کا دھماکہ ہمارے لئے خطرے کا سرخ سگنل ہے۔ اگر شیعہ اور سنی آپس میں لڑ پڑے تو یہ کشیدگی اور فساد پہلے ایران کے خلاف استعمال ہو گی اور پھر خود ہمارے خلاف۔ اس مسئلے کا حل دونوں گروہوں سے متعلق افراد کی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں سے نہیں ہو گا، اور نہ کتابوں اور مناظروں سے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ملی یک جہتی کونسل بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اصل حل یہ ہے کہ ایک اعلیٰ تر نصب العین پر قوم کو جمع کیا جائے۔ اگر شیعہ اور سنی مسلمان پاکستان میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے متفق ہو کر جمع ہو جائیں تو فرقہ وارانہ اختلافات معدوم ہو جائیں گے، جس طرح یہ اختلافات تحریک پاکستان کے دوران اور پھر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۲ء میں معدوم ہو گئے تھے۔ شیعہ سنی اتحاد کے لئے واحد ٹھوس اساس یہ ہے کہ پاکستان کی شیعہ اقلیت اپنے لئے وہی دستوری اور قانونی حیثیت قبول کر لے جو ایران میں سنیوں کو دی گئی ہے۔ یعنی پاکستان میں قانون ملکی تو اہل سنت کے عقائد و نظریات کے مطابق ہو لیکن Personal Law میں اہل تشیع کو مکمل آزادی دی جائے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کے دیئے ہوئے اسلام کے انقلابی فکر کی بنیاد پر قائم ہونے والی جماعت اسلامی اس وقت چار حصوں میں بٹ چکی ہے، جس میں تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے دونوں حزب بھی شامل ہیں۔ اگر جماعت اسلامی انتخابی سیاست کی دلدل سے نکل آئے تو ان چاروں جماعتوں کا وفاق بنایا جا سکتا ہے تاکہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے مل جل کر جدوجہد کی جا سکے۔

رمضان، قرآن اور پاکستان

امیر تنظیم کے ۱۰ جنوری کے خطاب جمعہ سے ماخوذ

رمضان المبارک اور قرآن حکیم کا باہم گہرا تعلق ہے' چنانچہ یہی وہ مہینہ ہے جس میں قرآن حکیم کو لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر اتارا گیا۔ یہ عظیم واقعہ جس مبارک شب میں پیش آیا قرآن اس کو لیلتہ القدر کہتا ہے' ایک رات جو اپنی عظمت کے اعتبار سے ہزار مہینوں سے بہتر اور افضل ہے۔ اس مہینے کی برکتوں اور رحمتوں سے کماحقہ' فیضیاب ہونے کے لئے دن کے روزے کے ساتھ ساتھ قیام اللیل کا التزام بھی ضروری ہے' یعنی اس مبارک مہینے کی راتوں کا بڑا حصہ قرآن حکیم کے ساتھ بسر ہونا چاہئے۔ وطن عزیز پاکستان کا بھی ماہ رمضان کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کا قیام رمضان کی ستائیسویں شب کو ہوا۔ نزول قرآن کی طرح پاکستان کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک عظیم مظہر ہے۔ نیز مصور و مفکر پاکستان علامہ اقبال کا قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ بھی اسی تعلق کی ایک اور روشن مثال ہے۔ اقبال کی فکر بجائے خود عہد حاضر میں قرآن حکیم کی عظمت اور حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اقبال ہمارے دور کے رومی اور فکر قرآنی کے مجدد ہیں۔ ان کی شخصیت میں قرآن اور پاکستان دونوں یکجا ہو جاتے ہیں۔ میں خود کو اقبال کا ادنیٰ عقیدت مند اور خوشہ چین سمجھتا ہوں اور اقبال ہی کی فکر اور سوچ کو تین مختلف جہتوں میں عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشاں ہوں' یعنی دعوت رجوع الی القرآن' بیعت کی بنیاد پر خالص اسلامی جماعت کا قیام اور جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نعرۂ انقلاب بلند کرنا۔ علامہ اقبال بیعت و امارت کی بنیاد پر ایک انقلابی جماعت قائم کرنا چاہتے تھے جس کا نام "شبان المسلمین ہند" طے ہو گیا تھا' لیکن برطانوی سامراج کے مسلط کردہ ایجنٹوں کی وجہ سے یہ ہفت خواں طے نہ ہو سکا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ پاکستان جو اقبال کے خواب کی تعبیر ہے لازماً اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی نظام خلافت کا نقطہ آغاز بنے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ گزشتہ چار صدیوں کی تجدیدی مساعی کے اثرات اس سرزمین میں موجود ہیں' اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے منصوبے میں اس علاقے کی خاص اہمیت ہے۔ پاکستان کا باپ اسلام ہے تو اس کی ماں جمہوریت ہے' پاکستان الیکشن کے ذریعے سے وجود میں آیا ہے۔ پاکستان کی بقاء اور استحکام کے لئے اسلام اور جمہوریت دونوں لازم ہیں۔ سیاسی استحکام کے لئے ناگزیر ہے کہ یہاں انتخابات کا راستہ ہرگز نہ روکا جائے۔ ۳/ فروری کو لازماً انتخابات ہونا چاہئے اور انہیں کسی بھی صورت میں ملتوی نہ کیا جائے۔ پاکستان میں دو جماعتی نظام کا ابھرنا جمہوریت کے لئے خوش آئند ہے' لہٰذا بے نظیر بھٹو کو ہرگز انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کرنا

چاہئے۔ نگران حکومت پیپلز پارٹی کے دشمنوں کو حکومت میں شامل کر کے اور اسے منقسم کرنے کی کوشش کر کے ایک بڑی غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔ تاہم بے نظیر کو چاہئے کہ موجودہ جماعتی نظام میں اپنا کردار ادا کرے اور سندھ کارڈ کھیلنے کا بارے میں نہ سوچے۔ اس وقت ملک میں جیسی کچھ بھی جمہوریت ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے' تاہم جب تک یہاں ایک حقیقی اسلامی انقلاب نہیں آتا اس وقت تک اسے Rules of the game کے مطابق چلتے رہنا چاہئے۔

جماعت اسلامی کے امیر جناب قاضی حسین احمد صاحب نے فروری کے عام انتخابات کا بائیکاٹ کر کے درست قدم اٹھایا ہے اور وہ اس پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اب چاہئے کہ انتخابی سیاست کو مستقل طور پر خیرباد کہہ کر ان کی جماعت قوم کی اخلاقی و فکری تربیت کی طرف توجہ دے۔ الیکشن کو عوامی قوت کے ذریعے روکنے کی کوشش سے تباہ کن نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگر جماعت اسلامی یہ روش اختیار کرتی ہے تو عین ممکن ہے کہ اس کی Street power کے غبارے سے ہوا نکل جائے اور ملک میں اسلام کے مستقبل کو نقصان پہنچے۔ دوسری طرف بدامنی اور فساد کی وجہ سے مارشل لاء کا راستہ بھی ہموار ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ ہمارے اندرونی حالات کو مخدوش پا کر بھارت کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے' خصوصاً موجودہ حالات میں جب کہ وہ بنگلہ دیش اور چین سے اپنے معاملات طے کر چکا ہے۔ انتخابات میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش سے خطرہ ہے کہ ملک کی گاڑی جمہوریت کی پٹڑی سے ایک مرتبہ پھر نہ اتر جائے۔

قومی سلامتی کونسل کا قیام دراصل مارشل لاء کی پہلی قسط ہے اور اس کی بدولت ۲۵ فیصد مارشل لاء ملک میں آ گیا ہے۔ تاہم یہ صرف سیاستدانوں کی ناکامی کا شاخسانہ ہے۔

اگر جماعت اسلامی الیکشن کا راستہ ترک کر کے نظام اسلامی کے قیام کے لئے انقلابی راستہ اختیار کرنے پر تیار ہو تو تنظیم اسلامی کی طرف سے ایک متحدہ وفاق کی پیش کش موجود ہے۔ جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی مل کر افراد کو جمع اور منظم کرنے کی کوشش کریں تاکہ ایک انقلابی تحریک چلانے کے لئے افرادی قوت فراہم ہو سکے۔ احتساب کا عمل عام انتخابات کے بعد بھی جاری رہنا چاہئے۔ قادیانیوں کو "احمدی" لکھنے کا فیصلہ کر کے نگران حکومت نے ایک حساس اور طے شدہ معاملے کو چھیڑنے کی غلطی کی ہے۔ یہ فیصلہ فوراً واپس ہونا چاہئے۔ آئندہ آنے والی حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے مردم شماری کرائے۔ اور مذہب کے ساتھ مسلک کا خانہ بھی رکھا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ملک میں مختلف مسالک کے ماننے والوں کی کتنی تعداد ہے۔ یہ قدم اس لئے ضروری ہے کہ مستقبل میں اسلامی ریاست کے تحت مختلف مسالک کے پیروکاروں کو Personal Law میں آزادی دینا لازم ہوگی۔

(مرتب : ڈاکٹر احمد افضال)

حقیقتِ تصوّف

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب
جس کے بعض حصوں کو "تنظیم الاخوان" نے سیاق و سباق سے کاٹ کر
کیسٹ کے ذریعے عام کیا!

قریباً ڈیڑھ سال قبل تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کی ایک خصوصی تربیت گاہ میں امیر تنظیم اسلامی نے جہاں فلسفہ و حکمت دین سے متعلق دیگر اہم موضوعات پر اظہار خیال فرمایا وہاں "حقیقت تصوف" کے موضوع پر بھی ایک مفصل لیکچر میں اپنے خیالات و افکار کو مرتب انداز میں شرکاء کے سامنے رکھا۔ چنانچہ اس خطاب میں جہاں تصوف کے مقاصد کے حوالے سے بعض مثبت باتوں کا ذکر آیا وہاں اس کے بعض دیگر پہلوؤں کے حوالے سے کچھ منفی باتوں کا بیان بھی ہوا۔ گزشتہ سال ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ ریاض (سعودی عرب) میں تنظیم الاخوان کا حلقہ تصوف کے حوالے سے اپنے نظریات کی تائید میں محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک کیسٹ عام کر رہا ہے۔ ریاض میں مقیم تنظیم اسلامی کے رفقاء نے جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ امیر محترم کے مذکورہ بالا خطاب کے بعض حصوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ایک ایسا کیسٹ تیار کیا گیا ہے جس میں تصوف سے متعلق صرف مثبت باتوں کا تذکرہ ہے اور خطاب کے وہ تمام حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جن کے ذریعے تصویر کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طرزِ عمل دیانت و اخلاق کے ہر اصول کے صریحاً منافی تھا۔ ریاض کے رفقاء تنظیم نے جب تنظیم الاخوان کے دوستوں سے اس پر احتجاج کیا تو ان کا جواب "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مصداق تھا کہ "آپ خواہ اسے بددیانتی شمار کریں یا کوئی بھی فتویٰ لگائیں، اپنے اعتبار سے ہم اسے جائز سمجھتے ہیں"۔ ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے!

تنظیم اسلامی ریاض کے امیر جناب رضا محمد گجر نے اس پر ایک احتجاجی خط ۲۲ فروری ۹۶ء کو تنظیم الاخوان کے امیر مولانا محمد اکرم اعوان کے نام لکھا لیکن وہاں سے بھی تاحال کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر تنظیم کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ اس خطاب کو جو دو کیسٹوں پر محیط ہے، مکمل صورت میں قسط وار "میثاق" میں شائع کیا جائے اور ان حصوں کو نمایاں انداز میں شائع کیا جائے جس کو تنظیم الاخوان والوں نے اپنی کیسٹ سے حذف کر دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی قسط پیش خدمت ہے۔ محذوف کی گئی عبارات کو جلی طرز میں اور کم چوڑائی میں کمپوز کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو یہ جاننے میں سہولت ہو کہ خطاب کے کن حصوں کو ہمارے "الاخوانی" دوستوں نے محذوف کر دیا تھا۔ (ادارہ)

الحمد لله وکفی والصلوٰة والسلام علی عباده الذین اصطفی خصوصًا علٰی افضلهم وخاتم النبیین محمد الامین وعلی آله وصحبه اجمعین --- اما بعد فقد قال اللّٰه تبارک وتعالی کما ورد فی سورة المائده:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾

صدق الله العظیم --- رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقده من لسانی یفقهوا قولی - اللهم ربنا الهمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا - اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه- اللهم نور قلوبنا بالایمان واشرح صدورنا للاسلام- اللهم وفقنا لما تحب وترضی - اللهم ربنا زدنا ایمانًا وهدًی وعلمًا نافعًا وعملاً صالحًا متقبلا - اللهم ربنا اجعلنا من عبادک المخلصین وعبادک المحسنین - آمین یا رب العالمین!

مسائلِ حکمت کے ضمن میں ہمارے آج کے موضوع کا جامع عنوان "تصوف" ہے۔ اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ کہ اس کا سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور کیوں ہوا؟ چونکہ یہ موضوع بہت طویل ہے' اس لیے میں تمہید میں کوئی وقت ضائع کیے بغیر براہ راست گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں اور کوشش کروں گا کہ تکرار اور اعادے کی ضرورت کم سے کم پیش آئے۔

پہلی بات یہ کہ تصوف کا موضوع اور مقصد کیا ہے؟ اس کے ضمن میں پہلا مشاہدہ (observation) یہ ہے کہ تصوف کا موضوع اور مقصد صدفی صد درست اور خالص

اسلامی ہے۔ اگر ہم اسے معین الفاظ کا جامہ پہنائیں تو اولاً جہل سے نجات اور معرفت کا حصول۔ ثانیاً تہذیب و تزکیہ نفس (تہذیب۔ مہذب بنانا۔ ہم نے دسویں جماعت میں شعر پڑھا تھا ؎

هَذِّبوا بنیکم عَلِّمُوا فتیاتِکم

هذّبوا اولادَکم یعنی "اپنی اولاد کو مہذب بناؤ"۔ اولاد کے لئے تعلیم کے ساتھ تہذیب کا لفظ آتا ہے) ثالثاً تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح (تجلیہ۔ اللہ کی تجلی سے کوئی حصہ پانا) اس ضمن میں میرے استاد مرحوم مولانا منتخب الحق قادری رحمہ اللہ نے ابن سینا کا ایک جملہ سنایا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تجلیات ربانی سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو "فجاهِدْ فِی خَلَوَاتِکَ"۔ اپنی خلوتوں میں مجاہدے کرو، مراقبے کرو "فلعلّ شعشعةً تلمع لکَ" تو شاید کبھی کوئی شعاع تمہارے لئے بھی چمک اٹھے۔ رابعاً خالق سے خلوص و اخلاص (اور دنیا و مافیہا سے بے رغبتی) اور خامساً مخلوق کی خدمت۔ شیخ سعدیؒ کا بہت پیارا شعر ہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

یعنی طریقت تو صرف خدمت خلق کا نام ہے، سوائے خدمت خلق کے طریقت کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہاتھ میں تسبیح ہو، جائے نماز کندھے پر ہو اور دلق یعنی گدڑی اپنے اوپر اوڑھی ہوئی ہو یہ تصوف اور طریقت نہیں ہے، بلکہ طریقت تو نام ہے خدمت خلق کا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تمام مقاصد دین ہی کے مقاصد ہیں، جو مطلوب ہیں۔ لہٰذا جہاں تک تصوف کے مقاصد اور تصوف کے موضوع کا تعلق ہے وہ عین دین ہے، وہ عین مطلوب ہے۔

لیکن اس کے ضمن میں پہلی ہمالیہ جیسی غلطی (Himalayan Blunder) اس کے لئے خالص غیر قرآنی ہی نہیں بلکہ ایک مجہول النسب عنوان کا اختیار کر لیا جانا ہے۔ یہ دو الفاظ نوٹ کر لیجئے۔ ایک تو یہ

لفظ غیر قرآنی ہے۔ لفظ تصوف کا کوئی تعلق نہ قرآن سے ہے نہ سنت اور حدیث سے۔ دوسرے یہ کہ یہ لفظ مجہول النسب ہے، جس کا نسب ہی معلوم نہیں۔ یہ سب سے زیادہ ثقیل گالی ہے جو میں اس لفظ تصوف کو دے رہا ہوں۔ اس کے بارے میں پہلی بات یہ نوٹ کر لیجئے کہ یہ لفظ دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب استعمال ہونا شروع ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے تو اس کے لئے باقاعدہ سن معین کیا ہے، ۸۲۲ عیسوی۔ حضور ﷺ کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا، اور ہجرت ۶۲۲ء میں ہوئی، تو حضور ﷺ کے انتقال کے ۱۹۰ برس بعد، بلکہ قمری تقویم کے اعتبار سے ۱۹۶ برس بعد، یہ لفظ ایجاد ہوا ہے۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ اس کے ماخذ کے بارے میں جو چار آراء رہی ہیں کہ یہ لفظ عربی کے کس مادے سے اخذ کیا گیا ہے، ان میں سے تین تو بالکل غلط ہیں اور ان کا غلط ہونا صد فی صد ثابت ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ لفظ "صفا" سے بنا ہے، حالانکہ صرف و نحو کے کسی قاعدے کی رو سے "صفا" سے "صوفی" کا لفظ نہیں بن سکتا بلکہ اس سے "صفوی" بنے گا، جیسے خاندان صفوی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تصوف کا لفظ "صف" سے بنا ہے، لیکن یہ اس سے بھی ہرگز نہیں بن سکتا۔ "صف" کے ساتھ یائے نسبت کا اضافہ کریں تو "صَفّی" بنے گا نہ کہ "صوفی"۔ تیسری رائے یہ کہ یہ "صُفّہ" سے بنا ہے، وہ بھی غلط ہے، کیونکہ صُفّہ سے "صُفّی" بنتا ہے، صوفی نہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ان لوگوں میں سے ہیں جو قدیم اور جدید دونوں کے عالم ہیں۔ ان کی فلسفے میں ڈاکٹریٹ تھی اور اسلامی تصوف پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ ان کی ایک تصنیف قرآنی تصوف پر ہے جس میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ تینوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

البتہ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مصدر یا مادہ لفظ "صوف" ہے اور عام طور پر یہی بات مانی جاتی ہے کہ یہ صوف ہی سے بن سکتا ہے اور اکثر لوگوں کی رائے یہی ہے کہ یہ "صوف" ہی سے بنا ہے۔ اس ضمن میں اپنی رائے میں بعد میں بیان کروں گا' لیکن یہ بات ایک درجے میں قابل قبول ضرور ہے۔ گرائمر میں صوف سے صوفی بن جاتا ہے۔ اس اشتقاق کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ جو اللہ والے حضرات تھے' جن کی زیادہ توجہ دنیا کی بجائے اللہ کی طرف تھی' ان میں دنیا و مافیہا سے بے رغبتی تھی' اللہ کے ساتھ خلوص و اخلاص تھا اور یہ کہ وہ معرفت کے حامل تھے' جنہوں نے تہذیب نفس' تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی منزلیں طے کی تھیں' جن میں درویشی تھی' یہ حضرات اون کا لباس پہنا کرتے تھے جس کے نیچے کوئی اور لباس نہیں ہوتا تھا' تاکہ اس کے ذریعے چبھن اور بے آرامی کا احساس ہوتا رہے۔ یعنی آرام کی بجائے سختی کی عادت پڑے۔ یہی لفظ اقبال نے اس شعر میں استعمال کیا ہے :

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست

تو یہ لوگ اون کا کھردرا لباس پہنتے تاکہ اندر سے بال کانٹے رہیں تو ان کی کیفیت یہ رہے کہ نفس کو استراحت کے بجائے تکلیف اور کوفت کا احساس ہوتا رہے۔ اس رائے پر تقریباً اجماع ہے اور یہ لغت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔

اس ضمن میں میری رائے مختلف ہے اور اپنے علم کی حد تک میں اس رائے میں منفرد ہوں۔ میرے نزدیک لفظ "تصوف" کا ماخذ یونانی لفظ "Sophia" ہے جو بعض علوم کے ساتھ لاحقے کے طور پر آتا ہے۔ مثلاً Philosophy۔ یونانی میں sophia کا معنی ہے wisdom یعنی حکمت و دانائی' اور sophos حکیم و دانا (wise) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ تصوف درحقیقت Theosophy سے بنا ہے جو عرفان و

معرفتِ خداوندی کا علم ہے۔ theo کا لفظ یونانی زبان میں خدا کے لئے
استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے Theocracy کی اصطلاح ہے جو مذہبی
لوگوں کی حکومت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اور میں نے بارہا کہا ہے کہ
میں اس ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی رائے کو بالکل صحیح سمجھتا
ہوں کہ اسلامی ریاست نہ تھیوکریسی ہے اور نہ ڈیموکریسی، بلکہ یہ ایک
تھیوڈیموکریسی ہے، کیونکہ اس میں "theo" اور "demo" دونوں
عنصر جمع ہیں۔ تو theosophy کا لفظ آج بھی استعمال ہوتا ہے، اور
درحقیقت تصوف کا لفظ یہیں سے آیا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے
دوران یونانی فلسفہ اور نو افلاطونی تصوف کا ایک بہت بڑا سیلاب عالمِ
اسلام پر آچکا تھا۔ لفظ تصوف کے اشتقاق کے بارے میں یہ میری
ذاتی رائے ہے، کوئی اسے قبول کرنا چاہے تو کرے، نہ کرنا چاہے تو رد کر
دے۔ بہرحال اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مجہول النسب لفظ ہے۔

اس ہمالیہ جیسی غلطی کے جو ہولناک نتائج نکلے، ان میں سے اولین
یہ ہے کہ کتاب و سنت کی اہم اصطلاح "احسان" سے محجوبیت اور
محرومی ہو گئی اور اب ہمیں لفظ احسان کے صرف ایک ہی معنی معلوم رہ
گئے ہیں کہ کسی سے حسن سلوک کرنا، کسی سے بھلائی کرنا۔ اگرچہ اس
لفظ کے یہ معنی بھی ہیں، از روئے الفاظ قرآنی "اَحْسِنْ کَمَا
اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ" لیکن "احسان" دین کی ایک اہم اصطلاح
ہے۔ اسلام کے بعد ایمان اور ایمان کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ اس کا
مفہوم ہے کسی بھی شے میں حسن پیدا کر دینا۔ ایک ہے مارے باندھے کا
کوئی کام کیا، اس کے بنیادی تقاضے اور لوازم پورے کر دیئے، لیکن
ایک ہے پوری جان کھپا کر، دل لگا کر، پوری توجہ اور اپنی ساری
صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کام کو اچھے سے

اچھا، عمدہ سے عمدہ انداز سے کرنا۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں : اذا قتلتم فاحسنوا القتلة واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحة یعنی کسی کو قتل کرنا ہے تو بھی خوبصورتی کے ساتھ قتل کرو اور کسی جانور کو ذبح کرنا ہے تو اسے بھی خوبصورتی کے ساتھ ذبح کرو۔ کسی کو اذیتیں دے دے کر نہ مارو۔ آج کل سعودی عرب میں جو beheading ہوتی ہے یعنی جب سر قلم کیا جاتا ہے تو ایک ہی وار ہوتا ہے۔ سوائے رجم کی سزا کے جس کے لئے ایک عبرت ناک ماحول پیدا کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح ذبح کرنا مقصود ہو تو چھری تیز ہونی چاہئے تاکہ جانور کو تکلیف نہ ہو، بس ایک ہی مرتبہ آپ کی چھری اس مقصد کو پورا کر دے۔

یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ دین کی ایک اتنی بنیادی اصطلاح جو حدیث جبرائیلؑ میں آئی ہے ان الفاظ کے حوالے سے کہ فاَخبرنی عَنِ الاسلام، اَخبرنی عن الایمان، اخبرنی عن الاحسان اس سے امت محروم اور محجوب ہو گئی۔ قرآن مجید کی جو آیت میں نے ابتداء میں آپ کو سنائی اس میں ایمان کے دو مرحلے بیان ہوئے، ایک قانونی ایمان اور دوسرا حقیقی ایمان۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کی ایک مرکزی بحث ہے کہ قانونی ایمان یعنی اسلام اور حقیقی ایمان میں کیا فرق ہے۔ قانونی ایمان کے درجے میں عمل علیحدہ ہے ایمان سے، جبکہ حقیقی ایمان کے درجے میں آکر عمل جزو لاینفک بن جاتا ہے ایمان کا۔ پھر اس سے اوپر تیسرا درجہ احسان کا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت بڑی اہم ہے :

﴿ لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝﴾ (آیت ۹۳)

جو لوگ بھی ایمان اور عمل صالح پر مسلسل کاربند رہے ان پر کوئی الزام نہیں اس میں جو کچھ وہ کھا پی چکے ..... یعنی اگر کسی نے کسی شے کی حرمت قطعی کا حکم آنے سے قبل کھایا پیا ہے تو اس کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ اب وہ حرام شے گویا جسم میں رچ بس گئی ہو ---- درآنحالیکہ ان کی روش یہ رہی کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا پھر ایمان لائے، اور عمل صالح کیا، پھر اور تقویٰ بڑھا تو وہ مزید ایمان لائے، یعنی ایمان حقیقی تک پہنچ گئے۔ نوٹ کیجئے کہ اس آیت میں پہلا ایمان وہ ہے جسے قانونی ایمان کہنا چاہئے، یعنی جس کے ساتھ عمل صالح علیحدہ حیثیت سے آتا ہے، اور دوسرا ایمان وہ حقیقی ایمان ہے کہ جس میں عمل کی کیٹیگری علیحدہ نہیں رہی بلکہ وہ اس کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ کا قول ہے کہ "الایمان قولٌ وَعملٌ"۔ ایمان حقیقی کے حصول کے بعد جب تقویٰ اور بڑھا تو اب وہ احسان کے درجے پر فائز ہو گئے۔ "وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" اور اللہ تعالیٰ کے محبوب تو وہی ہیں جو محسنین ہیں۔

اس ضمن میں حدیث رسول ﷺ نوٹ کیجئے کہ "ما ابتدَع قومٌ بدعةً الانزع اللّٰه عنهم من السنةِ مثله" کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی وہاں سے کوئی نہ کوئی سنت یقیناً رخصت ہو جائے گی۔ ہر بدعت قاطعِ سُنّت ہے۔ ہر بدعت لازماً کسی سنت کا ازالہ کرے گی یعنی اسے displace کرے گی۔ لہٰذا یہاں پر تصوف کے لفظ نے احسان کی خالص دینی اصطلاح کی جگہ لے لی۔

اس کا دوسرا نتیجہ وہ نکلا جو میرے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ

خطرناک ہے۔ یعنی کتاب و سنت کے شیدائیوں میں اس سے بُعد پیدا ہو گیا۔ عنوان سے بُعد ہوا تو اس کے contents سے بھی دوری پیدا ہو گئی اور نتیجتاً نری ظاہر پرستی باقی رہ گئی۔ اگرچہ صرف عنوان ہی کی وجہ سے بُعد نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی دیگر وجوہات بھی تھیں جنہیں ہم آگے چل کر سمجھیں گے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ قلبی و ذہنی بُعد کا آغاز عنوان کی تبدیلی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ دوری کے اس عمل (phenomnon) کا نقطۂ عروج ہے محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت۔

تصوف پر اس انداز سے اعتراض کیا جائے کہ یہ دور نبویؐ کے بعد کی پیداوار ہے تو جواباً کہا جاتا ہے کہ دیگر علوم بھی تو حضورؐ کے زمانے میں نہیں تھے۔ لیکن تصوف کے سوا دیگر علوم کے عنوانات قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً "تفسیر" کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے : "اَحْسَنَ تَفْسِیْرًا" اور یہ لفظ دور صحابہؓ میں بھی مستعمل تھا۔ اسی طرح تفقہ کا لفظ قرآن میں ہے' اور حضورؐ کی حدیث ہے کہ "اللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْن"۔ یہ دوسری بات ہے کہ دین کے ایک خاص شعبہ کو فقہ کہہ دیا گیا لیکن یقیناً وہ بھی تفقہ کا جزو ہی ہے۔ اسی طرح حدیث کا لفظ بھی قرآن میں ہے : "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ"۔ یہ قرآن بھی "حدیث" ہے۔ لیکن قرآن حدیثُ اللہ ہے' اور جسے اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں وہ حدیثِ رسولؐ ہے۔ لہٰذا ہمارے جو بھی دینی علوم ہیں ان کا منبع و سرچشمہ اور ان کے عنوانات قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا میں اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا کہ جیسے اور دینی علوم ہیں ویسے ہی تصوف بھی ہے۔ نہیں! اس لئے کہ آپ نے عنوان ہی جدا کر دیا اور ایک ایسا لفظ اختیار کر لیا جس کا کتاب و سنت کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں اور مستزاد یہ کہ اس کا یہ بھی

کچھ پتہ نہیں کہ یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب و سنت سے لگاؤ اور تمسک ہے اور جس کی شخصیت میں کتاب و سنّت راسخ ہو چکے ہیں اسے یقیناً تصوف سے بُعد نہ سہی حجاب تو ضرور محسوس ہو گا۔ لہٰذا تصوف سے بُعد کی پہلی وجہ تو اس کا اجنبی عنوان ہی ہے اور اس بعد میں دیگر اسباب کی وجہ سے اضافہ ہو تا چلا گیا کیونکہ اس فکر میں جو بیرونی نظریات اور فلسفے آئے' ان سے وہ حجابات بڑھتے گئے' یہاں تک کہ انہوں نے منافرت کی شکل اختیار کر لی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تصوف سے دوری کی سب سے نمایاں مثال محمد بن عبدالوہاب ؒ ہیں۔ ویسے میں انہیں مجددین کی فہرست میں شامل کرتا ہوں کہ انہوں نے بدعات کا قلع قمع کیا' غیر اسلامی رسومات کی بیخ کنی کی' دین کی تعلیمات پر جو جھاڑ جھنکار آ گیا تھا اسے ہٹایا اور کم از کم دین کے عملی اور ظاہری پہلو کو نکھارنے کا کام سرانجام دیا۔ اس پہلو سے وہ مجددینِ اُمت میں شامل ہیں۔

لیکن اگر محمد بن عبدالوہاب نجدی ؒ کا ان کے ہم عصر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ سے تقابل کیا جائے تو محمد بن عبدالوہاب ؒ کی شاہ ولی اللہ ؒ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ شاہ صاحب ؒ کی جامعیت کبریٰ کو ذہن میں رکھئے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں کے جامع ہیں جبکہ محمد بن عبدالوہاب ؒ کی حیثیت صرف دین اور کتاب و سنت کے ظاہری پہلو کے حوالے سے ہے۔ یہاں ضمنی طور پر اس بات کو سمجھ لیجئے کہ تجدیدی اور احیائی تحریکوں میں دین کے باطنی پہلو کے مفلوج ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان تمام تحریکوں کے سامنے ایک مثال اور امام کی حیثیت سے محمد بن عبدالوہاب ؒ کی نجدی تحریک رہی ہے۔ اس لئے کہ یہی ایک تحریک تھی جس نے اسلام کا نظام حکومت دوبارہ قائم کیا' شریعت کا نفاذ کیا' شعائرِ دین کی پابندی شروع کی' اگرچہ انہوں نے یہ کام آلِ سعود کے تعاون

سے کیا لیکن بہرحال یہ تحریک تجدید و احیائے دین کی تمام تحریکوں کے لئے ایک مثال بن گئی۔ اس ضمن میں ابن تیمیہؒ کا نام بھی آتا ہے لیکن ان کی شخصیت بہت مختلف تھی۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں' یعنی تصوف کا طریق معقول و مسنون تھا کیا؟ میرے نزدیک جو طریقہ کتاب و سنت سے منصوص ہے وہی طریق محمدیؐ ہے اور وہی طریقہ درحقیقت عقل و منطق سے قریب بھی ہے۔ اس ضمن میں پہلی قابل توجہ بات وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قرارداد تاسیس کے اولین جملے میں بیان ہوئی ہے یعنی یہ کہ "دین کا اصل مخاطب فرد ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کے باغ کا ایک حسین پودا ہے' اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ پودا پروان چڑھے' اس میں جو بھی امکانات اس نے ودیعت فرمائے ہیں وہ بروئے کار آئیں' اس کی شخصیت پھول کی مانند کھلے۔ مجھے بیدل کا شعر یاد آگیا ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

یہ شعر میرے استاد مولانا منتخب الحق قادری نے ایک کلاس میں پڑھا تھا اور اگرچہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن ان کے پڑھنے کا اعجاز تھا اور میرے ذہن کی مناسبت کا مظہر تھا کہ یہ شعر مجھے اسی وقت یاد ہو گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ بڑا ہی ستم کا معاملہ ہے' بڑا ظلم ہے کہ تمہیں خواہش نفس کھینچ کر لے جاتی ہے کہ چلو باغ میں پھول دیکھیں' سرو و سمن کی بہار دیکھیں۔ حالانکہ معاملہ تو یہ ہے کہ تو خود ایک کھلا ہوا غنچہ ہے' اپنے دل کا دروازہ کھولو اور جو باطنی چمن اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر کھلا رکھا ہے کبھی اس کی سیر بھی کرو! تم جو خارج کے پھولوں کی سیر

کرتے پھرتے ہو کبھی اپنے من میں ڈوب کر بھی دیکھو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا پودا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ یہ پھلے پھولے' پھلے' پھولے' اس کی شخصیت پروان چڑھے۔ اس کے اندر کے تمام محاسن ظاہر ہوں' تمام امکانات جو اس میں potentially ودیعت کئے گئے ہیں وہ بروئے کار آئیں۔ یہاں پر سورۂ مائدہ ہی کی وہ آیت یاد کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ' لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ "یعنی ہر انسان پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ہے۔ دوسروں کے لئے دعوت' تلقین' تبلیغ' نصیحت جو بھی ممکن ہو' کرے' اس لئے کہ یہ کام فرائض کے درجے میں ہیں۔ لیکن اگر میری کوشش کے باوجود کوئی نہیں مانتا تو اپنے اعمال کا وہ خود جوابدہ ہے' میری اصل ذمہ داری میری ذات کی حد تک ہے۔ اگر میری کوتاہی ہوگی تو میں پکڑا جاؤں گا۔ لہٰذا مجھے اس حوالے سے سوچنا چاہئے کہ میں اپنے فرائض ادا کروں۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ اصول بیان فرما دیا گیا ہے کہ "لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ" آپ سے تو مواخذہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ کیوں جہنم میں چلے گئے۔

سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کا غلط مفہوم بھی لیا گیا ہے' اور یہ غلطی دورِ صحابہؓ ہی میں ہونے لگی تھی۔ لوگوں نے اس آیت کو دلیل بنایا اس بات پر کہ ہمیں دعوت و تبلیغ یا نصیحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس دور میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود تھے' منافقین بھی تھے اور اپنے فرائض سے جی چرانے والے بھی۔ لہٰذا اُس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ تم اس آیت کا غلط مفہوم لے رہے ہو' "عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ" سے یہ مراد نہیں ہے کہ تم دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے بری ہو گئے ہو۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہر شخص پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی

ذات ہی کے حوالے سے عائد ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا قول قرآن میں نقل ہوا ہے کہ : "رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ" کہ اے رب میرا اختیار تو صرف اپنے نفس پر اور اپنے بھائی (ہارونؑ) پر ہے۔ یہاں بھائی کا ذکر صرف اس لئے آگیا کہ وہ خود تیار تھے' ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے بھائی پر بھی کسی انسان کو اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فرمایا کہ : "اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ"۔

لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر انسانی شخصیت کا ارتقاء ہوتا ہے اور اس شخصیت کی تعمیر یعنی اس میں ودیعت شدہ potentialities کو بروئے کار لانا ہے تو یہ کام کس طرح ہوگا؟ یہاں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کا وجود دو اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے جو باہم متضاد ہی نہیں' ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں۔ متضاد کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ دو چیزوں میں باہم تضاد پایا جاتا ہو' اور ضروری نہیں کہ ان میں مخالفت اور کشمکش بھی ہو رہی ہو۔ جبکہ مخالفت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے مابین رسہ کشی یا کھینچ تان کی کیفیت بھی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر دو متحارب اور باہم مخالف اور متضاد عناصر اس کا نفسِ حیوانی اور اس کی روحِ ملکوتی ہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ روحانی عنصر کی تقویت و تغذیہ کا سامان کیا جائے اور دوسری طرف حیوانی عنصر کی تربیت و تزکیہ کا بندوبست کیا جائے۔ اس عمل اور جدوجہد کے دو رخ (aspects) ہوں گے۔ اس بات کو اس حدیث کے حوالے سے سمجھئے جس میں بتایا گیا ہے کہ رمضان کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی منادی ندا کرتا ہے : "یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَدْبِرْ" یعنی اے خیر کے طالب آگے بڑھ کہ یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے اور اے شر کے

طالب پیچھے ہٹ اور لوٹ جا! ہمارے اندر بھی ایک خیر کا عنصر ہے اسے تقویت دیجئے' اس کی تقویت و تغذیہ کا اہتمام کیجئے' یہ ایک رخ ہو گیا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ جو شر کی طرف کھینچنے والا عنصر ہے اس کو دبایئے' اسے contain کیجئے' اس کی تہذیب کیجئے' اس کا تزکیہ کیجئے۔

اس تہذیب و تزکیہ کا مقصد نفس کو فنا کر دینا نہیں ہے۔ ضبطِ نفس یعنی self-control اور تہذیب و تزکیہ نفس یعنی self-purification' یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔ لیکن نفس کشی یا self-annihilation کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ چیز دراصل باہر سے آئی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انسانوں کی جو اقسام بیان کی ہیں وہ انہی دو عناصر کی بنیاد پر ہیں' یعنی قوتِ ملکوتی اور قوتِ بہیمی۔ سب سے بلند درجے پر وہ لوگ ہیں جن کی ملکیت بھی بہت قوی اور بہیمیت بھی بہت قوی ہے۔ اس لئے کہ قوتِ کار اور قوتِ عمل دراصل بہیمیت ہی سے متعلق ہے۔ اور سب سے نچلے درجے پر وہ لوگ ہیں جن کی بہیمیت قوی اور ملکیت ضعیف ہے۔ بہرحال نوٹ کیجئے کہ اسلام میں نفس کُشی یا self-annihilation کا کوئی مقام نہیں ہے' البتہ ضبطِ نفس یعنی self-control کا حصول مطلوب ہے' جسے میں تہذیبِ نفس کہہ رہا ہوں' اور دوسری مطلوب شے ہے تزکیۂ نفس یعنی self-purification۔ ان دونوں کا ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کے لئے میں نے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے یعنی "تحریرُ الرُّوح"۔ میں یہاں "تحریر" کا لفظ حریت کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ تحریر الروح یعنی liberation of the soul or spirit۔ یہ نکتہ "عظمتِ صوم" نامی کتابچے میں بیان ہو چکا ہے کہ نفس حیوانی کا غلبہ جتنا شدید ہو گا اسی قدر ہماری روح ان بیڑیوں میں مقید رہے گی' اور نفس حیوانی کا غلبہ جتنا کمزور پڑے گا اسی تناسب سے روح کو آزادی ملے گی۔ تہذیب و تزکیہ نفس کا نتیجہ تحریر الروح کی شکل میں نکلتا ہے' یعنی روح درحقیقت نفس امارہ کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے۔

اب تک ہم نے یہ سمجھا ہے کہ دین کا اصل مقصود فرد کی تعمیر و ترقی ہے۔ فرد مرکب

ہے دو متخالف اور متحارب عناصر سے' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ خیر کی قوت یعنی روح کی تقویت اور تغذیہ کا بندوبست ہو اور شر کی طاقت یعنی نفسِ امارہ کی تہذیب اور تزکیہ کا سامان کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ روح کی تقویت کا کیا ذریعہ ہے؟ ایک لفظ میں اسے بیان کیا جائے تو وہ ہے ذکرِ الٰہی۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ میرا جو پہلا کتابچہ شائع ہوا تھا یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" میں اس میں اس بات کی پوری وضاحت کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ روح انسانی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہے ایک شعورِ خفتہ (dormant consciousness) کی شکل میں' اس لئے کہ ہماری روح اللہ تعالیٰ کی ذات کا جزو تو ہرگز نہیں ہے' لیکن صادر تو وہیں سے ہوئی ہے۔ یہ امرِ رب ہے۔ تو کیا یہ روح اندھی اور بہری ہو سکتی ہے؟ معاذ اللہ! البتہ سوئی ہوئی ہے' اور اللہ کا ذکر اس کو بیدار کرتا ہے۔ جناب یوسف سلیم چشتی مرحوم نے ایک مرتبہ جرمن فلسفی کانٹ کا ایک جملہ سنایا تھا :

Hume awakened me from my dogmatic slumber

انگریزی فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی کتابیں پڑھ کر کانٹ کہتا ہے کہ میں اپنے اندھے عقیدے کی دھن میں سویا ہوا تھا کہ ہیوم نے مجھے جگا دیا۔ اسی طرح حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے "جاگ سوزِ عشق جاگ"۔ میں نے اپنے ہائی سکول کے بالکل ابتدائی زمانے میں یہ گیت سنا تھا جس کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں ۔ "تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا' سوئے ہوئے ہردے کو جگایا"۔ ہندی میں "ہردہ" کہتے ہیں جی یا نفس کو۔ تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان کی روح میں سب کچھ پہلے سے موجود ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت" میں دو الفاظ استعمال کئے ہیں کہ اس روح کے اندر معرفتِ رب بھی موجود ہے اور محبتِ رب بھی۔ اس کی ہمارے صوفیاء نے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری روح کا ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج کی کرن اپنے source سے کروڑہا میل دور چلی جائے لیکن اس کا تعلق سورج سے منقطع نہیں ہوتا۔

لہٰذا ذکرِ الٰہی کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت روح بیدار ہوتی ہے' اس کا سویا

ہوا شعور متحرک (activate) ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سورۂ نور کے پانچویں رکوع کے درس میں جو بحث آئی ہے اس کو بھی یہیں جوڑ لیجئے۔ نورِ وحی اور نورِ فطرت کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے اور در حقیقت یہ سارا معاملہ ایمان ہی کا ہے۔ ایمان صرف زبانی اقرار تک ہے تو یہ "اسلام" ہے۔ جب ایمان دل کی گہرائی میں اتر کر راسخ ہو گیا اور تصدیق بالقلب حاصل ہو گئی تو یہ "ایمان" ہے۔ پھر جب اسی ایمان میں وہ شدت اور گہرائی پیدا ہو گئی کہ مومن یہ محسوس کرنے لگا کہ وہ گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم سے کم یہ استحضار حاصل ہو گیا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو یہ "احسان" کی منزل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "احسان" کے درجے کو بیان کرنے کے لئے ہماری زبان میں اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ہے کہ یہ ایمان کی اُس کیفیت کا نام ہے کہ ایک شخص غیبی حقائق کو گویا آنکھوں کے سامنے موجود پائے۔ یقین کی گہرائی کے لئے اس سے آگے کوئی استعارہ اور کوئی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ ایمان جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے کہ "كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِن لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ" کی کیفیت حاصل ہو جائے تو یہی احسان ہے اور یہی مقام ولایت ہے۔

اب یہاں میں اصل موضوع سے کسی قدر ہٹ کر ایک بات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ایک ضمیمہ سمجھ لیجئے۔ اس بات کو میں نے حقیقتِ ایمان کے موضوع پر ہونے والے محاضرات میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حصول ایمان کے تین ذرائع ہیں۔ اولاً یہ کہ صاحبِ یقین کی صحبت سے ایمان حاصل ہوتا ہے، جیسے آپ آگ کی بھٹی کے پاس بیٹھیں گے تو حرارت ملے گی۔ ثانیاً یہ کہ شریعت پر عمل پیرا ہونے سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔

> لیکن یہ دونوں قسم کے ایمان ایک نوع کے blind faith کے درجے میں ہیں۔ اس میں شعوری یا intellectual عنصر نہیں ہے، اس میں فہم و تفقّہ نہیں ہے۔ اگرچہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والے ایمان میں گہرائی تو ہو سکتی ہے لیکن اس میں گیرائی یا وسعتِ فکر و نظر نہیں ہو گی۔ وہ ایمان جس میں شدتِ یقین کے ساتھ ساتھ وسعتِ فکر و نظر بھی ہو، جس میں گہرائی کے علاوہ ایک شعوری یا intellectual عنصر بھی

ہو، ایسا علیٰ وجہ البصیرت ایمان صرف قرآن سے ملے گا۔ قرآن کے سوا کسی اور ذریعے سے اس نوعیت کا ایمان نہیں مل سکتا۔ یہاں اس نکتے کو بھی سمجھ لیجئے کہ حدیث کی رُو سے ایمان کا افضل ہونا اور شے ہے اور ایمان کا اَعجَب یا wonderful اور fascinating ہونا اور شے ہے۔ یعنی ایک ایمان کی افضلیت ہے اور دوسرے اس کی اعجبیت ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ مسلّم ہے کہ سب سے افضل ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے، یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ اور دانشور کے شعوری ایمان سے افضل مانا جائے گا۔ لیکن یہ ذہن میں رکھئے کہ مختلف صحابہؓ کے ایمان میں بھی فرق تھا۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت تو تمام صحابہؓ کو حاصل تھی لہٰذا صحبت سے حاصل ہونے والا ایمان سب میں مشترک تھا، لیکن صحابہؓ میں بہت فہیم اور باشعور یعنی intellectual افراد بھی تھے جنہوں نے قرآن حکیم سے شعوری ایمان اخذ کیا تھا۔ لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ معاذ اللہ تمام صحابہ کرام کا ایمان محض blind faith تھا، اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ صحابہؓ کا غیر شعوری ایمان بھی چونکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے حاصل ہوا تھا لہٰذا وہ قیامت تک افضل رہے گا۔ البتہ ایمان کا حسین اور اَعجب ہونا ایک بالکل مختلف بات ہے، اور یہ راستہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔ دیکھئے حضور ﷺ نے ہمارے احساسِ محرومی کے ازالے کے لئے کیسی کیسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میری امت کا معاملہ بارش کی مانند ہے، نہیں کہہ سکتے کہ اس کا اول حصہ بہتر ہوگا یا آخر۔ لہٰذا اگر ہم حضور ﷺ کے زمانے میں پیدا ہونے سے محروم رہ گئے تب بھی کوئی حرج نہیں کہ صدیقیت اور شہادت اور صالحیت کے تمام مراتب آج بھی قابلِ حصول ہیں۔

صرف نبوت کا دروازہ بند ہے' لیکن وہ صحابہؓ کے لئے بھی بند تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں' محنت کرو اور اکتساب کرو۔ دوسری وہ حدیث ہے جس میں حضورؐ نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ مخلوقات میں حسین ترین (اَعْجَب) ایمان کس کا ہے؟ انہوں نے کہا ملائکہ کا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کیسے ایمان نہ لاتے وہ تو اپنے رب کے حضور حاضر ہیں' ان پر تو حقائق منکشف ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کا کیا کمال ہوا؟ صحابہؓ نے کہا کہ پھر انبیاءؑ کا ایمان اعجب ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کیسے ایمان نہ لاتے' ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر ہم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا : اِنَّ اعجبَ الخلقِ لیَّ ایمانًا یأتُون مِن بعدِی یَجِدُون صُحُفًا فیہِ کتابُ اللّٰہ ویُؤمنون بما فیھا میرے نزدیک تو سب سے حسین ایمان ہمارے ان بھائیوں کا ہو گا جو میرے بعد آئیں گے (وہ میری صحبت نہیں پائیں گے بلکہ) انہیں تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہو گی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

اب تک ہم نے جو بات سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ اصل کام روح کو تقویت پہنچانا ہے' اس کا ذریعہ ذکرِ الٰہی ہے اور اس کا حاصل ایمان ہے۔ ذکرِ الٰہی کے ضمن میں اہم ترین شے قرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو "الذکر" کہتا ہے۔ یہاں الف لام کو اگر حصر کے لئے سمجھا جائے تو مطلب ہو گا کہ کُل کا کُل ذکر یہی ہے اور اگر جنس کے لئے فرض کیا جائے تو مطلب ہو گا کہ کُل جنسِ ذکر اس قرآن میں محصور ہو گئی

(باقی صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

خصوصیاتِ قرآن

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

مقدمہ

مضمون شروع کرنے سے پہلے بنی آدم کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مفکر یعنی علامہ اقبال کی نظر میں اس زندۂ جاوید کتاب کا کیا مرتبہ ہے؟

(۱) علامہ موصوف رموزِ بے خودی میں فرماتے ہیں ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(۲) جاوید نامہ میں فرماتے ہیں ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکرِ راہ روشن کن از اُمّ الکتاب
چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
جُز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بذکر
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ　　ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

(۳) مسافر میں فرماتے ہیں ؂

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز　　اندر آیاتش یکے خود را بسوز
برخور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
می دہد ما را پیامِ لَاتَخَفۡ　　می رساند بر مقامِ لَاتَخَفۡ

انسان جسم اور روح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ روحانی تربیت کا سامان بھی مہیا کیا۔ مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں اور مختلف قوموں میں ایسے قدسی نفوس حضرات پیدا کئے جنہوں نے اس کا پیغام بندوں کو سنایا اور روحانی ترقی کا راستہ دکھایا۔ اور جب بنی نوع آدم میں کافی استعداد ذہنی پیدا ہو گئی تو اس نے حضور سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی معرفت اپنی نعمت بتمام و کمال بندوں پر نازل فرما دی۔ اسی کا دوسرا نام قرآن مجید ہے جو اقوام اور افراد دونوں کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے اور قیامت تک ان کی ہر قسم کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

﴿ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ﴾ (المائدۃ : ۳)

"(اے لوگو!) آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور میں نے دین اسلام تمہارے لئے پسند کیا ہے۔"

چونکہ دین کامل ہو چکا، اور نعمت تمام ہو چکی اور اسلام خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن مجید خدا تعالیٰ کا آخری پیغام یعنی خاتم الکتب ہے اور آنحضرت ﷺ خدا تعالیٰ کے آخری نبی یعنی خاتم النبیین ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

﴿ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ

اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ﴾ (الاحزاب : ۴۰)

"اور نہیں ہیں محمد ﷺ تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور سلسلۂ انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔"

اسی لئے خود حضورِ انور ؐ فرماتے ہیں :

((اَنَا خاتمُ النبیّین لانبیَّ بعدی))

"(اے لوگو!) خبردار ہو جاؤ کہ میں انبیاء کے سلسلہ کا ختم کرنے والا ہوں' میرے بعد (قیامت تک) کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

واضح ہو کہ نبی یا رسول دراصل پیغام بر یا پیغام رساں ہوتا ہے' اور پیغام رساں کی ضرورت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک پیغام کا سلسلہ باقی رہے۔ جب قرآن مجید خود فرماتا ہے کہ دین کامل ہو گیا اور نعمت تمام ہو گئی تو اب خدا تعالیٰ قیامت تک کوئی پیغام یا ہدایت نہیں بھیجے گا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو دین کے کامل ہو جانے کا جو دعویٰ قرآن مجید نے کیا ہے' وہ باطل ہو جائے گا۔ پس دنیا کو قیامت تک کسی پیغام رساں کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی منطقی طور پر ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ نبی آسکتا ہے تو وہ اپنے قول سے قرآن مجید کی تردید کرتا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو سب سے پہلے اس حقیقت سے آگاہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید کامل ہدایت ہے اور اسی لئے اس نے قیامت تک نبوت کے دروازہ کو بند کر دیا ہے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ قصرِ نبوت کی آخری اینٹ ہیں۔ آپ ؐ کے بعد ہر مدعیٔ نبوت خواہ وہ ظِلی ہو یا بروزی' تشریعی ہو یا غیر تشریعی' لغوی ہو یا مجازی' امتی ہو یا غیر امتی' اصلی ہو یا نقلی' بلاشبہ اپنے دعویٰ میں کاذب اور اپنے منصب کے اعتبار سے دجال اور دائرہ اسلام سے کلیتاً خارج ہے' کیونکہ وہ اپنے دعویٰ سے دینِ اسلام کو ناقص قرار دیتا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ اب صرف قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوعِ آدم کی رہنمائی کے لئے معین ہو چکی ہے فطرت کے اصولوں پر غور کرنے سے بھی مل سکتا ہے۔ اور فطرت کی شہادت اس قدر زبردست اور تسلی بخش ہوتی ہے کہ کسی شخص کو مجالِ انکار نہیں ہے۔ چونکہ اسلام فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اسی لئے اللہ

تعالیٰ نے اسلام کو دین فطرت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ فرمایا :

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (الروم : ۳۰)

"پس تو دین حنیف کی طرف مائل ہو۔ یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت، جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اس کی طرز تخلیق میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہی قائم رہنے والا دین ہے، لیکن افسوس ہے کہ انسانوں کی اکثریت اس حقیقتِ عظمیٰ سے بے خبر ہے۔"

فطرت کی شہادت

عالم جسمانیات میں فطرت کا یہ اصول ابتدا سے کار فرما ہے کہ جو شے فائدہ رسانی کی صفت سے عاری ہو جاتی ہے فطرت اسے حیات انسانی کے نظام سے خارج کر دیتی ہے اور اس کی جگہ نئی چیز پیدا کر دیتی ہے۔ عموماً وہ ناکارہ شے صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کا ظاہری وجود باقی رہے تو بھی بنی آدم کی نظر میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یعنی اس کا عدم اور وجود دونوں برابر ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ناریل، کھجور، آم یا امرود کے درخت کے لے لیجئے۔ جب تک ان درختوں میں پھل لانے یعنی انسان کو فائدہ پہنچانے کی خاصیت باقی رہتی ہے وہ سرسبز اور قائم رہتے ہیں۔ لیکن جب ان میں یہ صفت باقی نہیں رہتی تو یا فطرت انہیں سوکھا دیتی ہے یا خود انسان انہیں کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور ان کی جگہ دوسرا درخت لگا دیتا ہے۔

پھلوں پر غور کیجئے۔ جب تک وہ کھانے کے لائق رہتے ہیں شاخوں پر لگے رہتے ہیں۔ لیکن جب ان کی پختگی پر ایک معین مدت گزر جاتی ہے تو وہ شاخ سے جدا ہو کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ ان کا گر پڑنا گویا انسانوں کو فطرت کی طرف سے آخری تنبیہ ہے کہ اگر انہیں فوراً استعمال نہ کیا گیا تو پھر وہ کھانے کے قابل نہ رہیں گے، بلکہ نفع کی جگہ نقصان پہنچائیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ گلے سڑے پھلوں کے کھانے سے متعدد بیماریاں پیدا ہو

جاتی ہیں۔

پھولوں کی طرف دیکھئے، جب تک ان میں انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی صفت یعنی خوشبو باقی ہوتی ہے وہ شاخوں پر لگے رہتے ہیں، لیکن جب خوشبو نکل جاتی ہے تو مرجھا کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اگر فوراً اٹھا لئے جائیں تو کچھ دیر لطف دے سکتے ہیں، لیکن دوسرے دن ان میں کچھ بھی نہیں رہتا۔ یعنی مردہ ہو جاتے ہیں اور فطرت ان کی جگہ دوسری کلیوں کو شگفتہ کر دیتی ہے۔

ناریل کا درخت ۷۰ یا ۷۵ سال تک متواتر پھل دیتا ہے۔ جب یہ زمانہ ختم ہو چکتا ہے تو خود بخود اس کی جڑ کھوکھلی ہو جاتی ہے، اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا تو لوگ اسے کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ اسی پر آپ فطرت کی تمام نعمتوں کو قیاس کر سکتے ہیں۔

فطرت کی جو چیزیں ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک قائم ہیں ان کے قیام کی وجہ یہی تو ہے کہ ان میں ابھی تک شان افادیت یعنی فائدہ رسانی کی صفت باقی ہے، مثلاً آفتاب کہ حرارت اور روشنی کا ذخیرہ ہنوز اس کے اندر موجود ہے، اور جس دن اس کے یہ خواص زائل ہو جائیں گے تو وہ خود بھی معدوم ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے تاریک ہو جانے کو قیامت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہی ہے کہ حیاتِ ارضی کا سارا نظام آفتاب پر مبنی ہے۔

﴿اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝﴾ (التکویر : ۱)

"جب آفتاب لپیٹ دیا جائے۔ (یعنی بے نور ہو جائے۔)"

پس فطرت کا یہی قاعدہ عالم روحانیات میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب تک توریت میں تحریف نے راہ نہ پائی، یعنی جب تک اس میں فائدہ رسانی کی خاصیت باقی رہی، لوگ اس سے ہدایت حاصل کرتے رہے۔ لیکن جب انسانوں نے اسے اپنی اصلیت سے محروم کر دیا تو جس طرح بیکار درخت کی جگہ فطرت دوسرا درخت پیدا کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے توریت کی جگہ زبور نازل فرمائی۔ ایک عرصہ تک وہ محفوظ رہی اور لوگ اس سے فائدہ حاصل کرتے رہے۔ لیکن جب زمانہ کی دستبرد سے اس کی اصلیت بھی زائل ہو گئی تو اس کی جگہ انجیل نے لے لی۔ اور جب انجیل بھی فائدہ رسانی

کی صفت سے عاری ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے قرآن مجید نازل فرمایا۔ چونکہ یہ کتاب قیامت تک کے لئے ہدایت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اٹھایا ہے۔ فرمایا :

﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴾ (الحجر : ۹)

"بلاشبہ ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل فرمایا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔"

چونکہ یہ کتاب آج بھی بجنسہٖ محفوظ ہے، اس لئے آئینِ فطرت کے مطابق اس میں نفع رسانی کی صفت بھی بدستور موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسانوں کو اسی فطری اصول کی طرف بایں الفاظ متوجہ کیا ہے :

﴿ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ﴾

(الرعد : ۱۷)

"اور جس چیز میں انسانوں کو نفع رسانی کی صفت موجود ہوتی ہے وہ زمین میں قائم رہتی ہے۔"

اب اس اصول پر تمام کتابوں کو پرکھ لیجئے۔ صرف قرآن مجید ہی اس پر پورا اتر سکتا ہے کیونکہ صرف یہی کتاب تحریف سے پاک ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں دو غیر مسلم عالموں کی شہادت پیش کرتا ہوں۔

سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"دنیا میں آسمان کے نیچے قرآن کے علاوہ اور کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں ہے جس کا متن ابتدا سے لے کر اس وقت (۱۸۵۹ء) تک تحریف سے پاک رہا ہو"۔

وان کریمر مشہور جرمن مستشرق لکھتا ہے :

"ہم قرآن کو بالکل اسی طرح محمد کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مجموعہ یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔"

یعنی فرق صرف یہ ہے کہ کریمر قرآن مجید کو کلام اللہ تسلیم نہیں کرتا، ورنہ صحتِ متن کے لحاظ سے وہ ہم سے بالکل متفق ہے۔

اب چونکہ قرآن مجید بجنسہٖ موجود ہے اور اس میں ایک شوشہ کی تبدیلی بھی نہیں

ہوئی ہے، اس لئے ثابت ہوا کہ اس کی اصلیت اور حقیقت میں بھی فرق نہیں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں فائدہ رسانی کی صفت ہنوز موجود ہے اور چونکہ یہ صفت ہنوز موجود ہے اس لئے آئین فطرت کے مطابق اس کی موجودگی میں ہمیں کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اس کی اصلیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس لئے قیامت تک قرآن کی ہدایت باقی رہے گی اور قیامت تک کوئی نیا نبی بھی نہیں آسکتا۔

فطرت کے مطالعہ سے کتب سابقہ کے منسوخ یا بیکار ہو جانے کی ایک اور دلیل بھی ہمیں ملتی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کی زبان کے علاوہ باقی تمام مذہبی کتابوں کی زبانیں مردہ ہو چکی ہیں۔ اور ان زبانوں کا مردہ ہو جانا فطرت کی طرف سے اس امر کی تنبیہ ہے کہ ان کتابوں کا پیغام بھی مردہ (بیکار) ہو چکا ہے۔

(۱) وید سنسکرت میں ہیں اور سنسکرت مردہ ہو چکی ہے۔
(۲) دھمپد پالی میں ہیں اور پالی مردہ ہو چکی ہے۔
(۳) استا ژند میں ہے اور ژند مردہ ہو چکی ہے۔
(۴) انگہ پراکرت میں ہے اور پراکرت مردہ ہو چکی ہے۔
(۵) توریت عبرانی میں ہے اور عبرانی مردہ ہو چکی ہے۔
(۶) زبور سریانی میں ہے اور سریانی مردہ ہو چکی ہے۔
(۷) صحیفہ صائبیت کلدانی میں تھا اور کلدانی مردہ ہو چکی ہے۔
(۸) صحیفہ ابراہیمی بابلی زبان میں تھا اور بابلی زبان مردہ ہو چکی ہے۔
(۹) انجیل یونانی زبان میں ہے اور آرامی زبان میں نازل ہوئی تھی اور یونانی اور آرامی دونوں مردہ ہو چکی ہیں۔
(۱۰) قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور آج بھی اسی زبان میں موجود ہے اور عربی زندہ ہے۔

الغرض دنیا کی تمام مذہبی کتابیں جن جن زبانوں میں آج اپنی محرّف و مبدّل شکل میں موجود ہیں وہ سب کی سب بلا استثنائے اَحدے مردہ اور فنا ہو چکی ہیں۔ صرف قرآن مجید

ہی زندہ زبان میں جلوہ گر ہے۔ یہ وہ فطری امتیاز ہے جو قرآن مجید کے علاوہ اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

چونکہ عربی زبان آج بھی زندہ ہے اور متعدد ممالک میں بولی' لکھی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے قرآن مجید کے کسی لفظ کے معنی متعین کرنے میں بھی کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ لیکن دیگر کتب ساویہ ایک ایسے مقفل صندوق کی طرح ہیں جس کی کنجی گم ہو چکی ہو۔ مثلاً ویدوں کے متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی آج کوئی شخص متعین نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں ایک ہی منتر کے معنی آریہ سماجی کچھ کرتے ہیں سناتن دھرمی کچھ کرتے ہیں اور یورپین محققین کچھ۔ اور آج دنیا میں کسی شخص کے پاس ان مختلف معانی میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا کوئی معیار موجود نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ سنسکرت مردہ ہو چکی ہے۔

فطرت کی شہادت کے بعد ہم اس زندہ کتاب کی بعض نمایاں خصوصیات ہدیہ ناظرین کریں گے۔

نمایاں خصوصیات

۱ ۔ پہلی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ دنیا کی کسی مذہبی یا آسمانی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں تحریف سے محفوظ رہوں گی' لیکن قرآن مجید صاف لفظوں میں اعلان فرماتا ہے کہ خدا خود میرا محافظ ہے۔ اور جس کتاب کی حفاظت کا ذمہ دار خدا ہو اس میں تحریف کی مجال کہاں؟

وعدۂ خداوندی نمبر ۱ : ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (الحجر : ۹) "تحقیق ہم نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں۔" یعنی یہ کتاب قیامت تک دنیا سے ناپید نہیں ہو سکے گی۔ جس طرح متی کی اصلی عبرانی انجیل ناپید ہو گئی۔

وعدۂ خداوندی نمبر ۲ : ﴿لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ﴾ (حٰم السجدۃ : ۴۲) یعنی "جھوٹ اس

کتاب میں کسی طرح داخل نہیں ہو سکتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے کیونکہ اس کو اس ذات نے نازل فرمایا ہے جو نہایت حکمت والی اور ستودہ صفات ہے۔"

الغرض قرآن مجید نے دو دعوے کئے ہیں۔

(۱) میرا متن دستبرد زمانہ سے محفوظ رہے گا۔ ایسا کبھی نہ ہو گا جیسا توریت یا انجیل کے ساتھ ہوا کہ اصلی نسخہ ہی دنیا سے گم ہو گیا۔

(۲) متن میں کسی قسم کی تحریف راہ نہ پا سکے گی۔ (ان دعاوی پر غیر مسلموں کی شہادت اوپر گزر چکی ہے۔)

۲ ۔ دوسری خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مذہبی کتاب دنیا میں ایسی نہیں جسے اس کے پیروؤں نے حفظ یاد کیا ہو۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے آج تک کوئی شخص وید یا بائبل کا حافظ نہیں گزرا۔ لیکن قرآن مجید کے حفاظ ابتدا سے لے کر آج تک ہر قوم' ہر ملک اور ہر زمانہ میں پائے جاتے رہے ہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ تحریف تو درکنار ایک لفظ کی کمی بیشی بھی قرآن مجید میں نہ ہو سکی۔ دوسرا فائدہ یا اعجاز یہ ہے کہ اگر آج دنیا کی تمام مذہبی کتابیں کسی حادثہ کی بنا پر دریا برد ہو جائیں تو ہندو' یہودی' مجوسی' عیسائی وغیرہم' غرضیکہ دنیا کے تمام اہل مذاہب ہمیشہ کے لئے اپنی اپنی آسمانی کتاب سے محروم ہو جائیں گے' لیکن مسلمان کو کوئی غم نہ ہو گا۔ دنیا کے ہر اس ملک میں جہاں مسلمان آباد ہیں اس کتاب کے حافظ موجود ہیں' وہ فوراً اسے سینہ سے نکال کر سفینہ پر پھیلا دیں گے۔

ڈاکٹر گرلمسباخ نے جو ایک مشہور جرمن محقق گزرا ہے' انجیل کے قلمی نسخوں کا باہم مقابلہ کر کے دیکھا تو تین لاکھ سے زیادہ لفظی اختلافات شمار کئے۔ ان کے علاوہ جملہ تراجم آپس میں مختلف ہیں۔ لیکن چین سے لے کر مراکو تک قرآن مجید کے کسی نسخہ میں کسی جگہ کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔

۳ ۔ تیسری خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس کی تلاوت دنیا کی تمام مذہبی کتابوں سے زیادہ کی جاتی ہے۔ اور اسی خصوصیت کو مدنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اس کا

ایک نام "القرآن" بھی رکھا یعنی بار بار تلاوت میں آنے والی کتاب۔ وید، اگمہ، دھمپد، اپستا، تورات، زبور اور صحف انبیاء کا تو اب نام ہی نام باقی رہ گیا ہے کیونکہ یہ کتب مردہ زبانوں میں ہیں اور دنیا ان کی تعلیمات سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس لئے یہ کتابیں تو انسانوں کی زندگی سے کم و بیش خارج ہو چکی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ایک فی صدی ہندو بھی وید کی تلاوت نہیں کرتا۔ اور لاکھوں ہندو تو ایسے ملیں گے جنہوں نے ساری عمر وید کے درشن بھی نہیں کئے اور لاکھوں گھر ایسے ہیں جہاں وید کا کبھی گزر بھی نہیں ہوا۔ اگر کسی کتاب کو قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ انجیل ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی صرف آٹھ دن میں ایک مرتبہ گرجوں میں پڑھی جاتی ہے یا کچھ لوگ اپنے گھروں میں پڑھ لیتے ہیں۔ تاہم یہ کتاب بھی تلاوت کے لحاظ سے قرآن مجید کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ قرآن مجید تو ہر روز دن میں کم از کم پانچ مرتبہ نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لکھو کھا مسلمان صبح شام اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ مساجد، مقابر، معابد، مدارس غرضیکہ کونسی جگہ ایسی ہے جہاں اس کا چرچا نہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی تلاوت اسی زبان میں کی جاتی ہے جس میں یہ نازل ہوا تھا۔ انجیل کی طرح نہیں کہ نازل ہوئی آرامی میں اور پڑھی جاتی ہے ترجموں کی صورت میں۔

اس جگہ ایک نفسیاتی نکتہ لائق غور ہے، وہ یہ کہ جب ایک مسلمان قرآن مجید پڑھتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اللہ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور انہی الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے تھے۔ لیکن جب ایک عیسائی انجیل پڑھتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں متی کی لکھی ہوئی اور کسی مجہول الاسم انسان کا ترجمہ کی ہوئی انجیل کا مطالعہ کر رہا ہوں، جس کی صحت پر کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں ہے۔

۴ — چوتھی خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ یہ نہ تو قصہ کہانی کی کتاب ہے اور نہ کسی خاص قوم کی تاریخ ہے، نہ کسی خاص شخص کی سوانح عمری ہے اور نہ محض مجموعہ اقوال و افکار ہے، بلکہ تمام انسانوں کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

• (ا) وید میں ایک خاص قوم کا ذکر ہے جو پہلے وسط ایشیا میں رہتی تھی پھر پنجاب میں آکر

آباد ہو گئی' اور کچھ عرصہ کے بعد یہاں کے اصلی باشندوں کو غلام بنا کر ان کی شاداب زمینوں پر قابض ہو گئی۔ وید میں اول سے آخر تک اسی قوم کے حالات' عبادات رسوم' توہمات' خیالات اور عجائبات کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

(ب) توریت میں بھی ایک خاص قوم کا تذکرہ ہے جو ملک شام میں رہتی تھی' پھر اس کے افراد ملک مصر میں آباد ہو گئے۔ اور ایک نبی نے ان کو غلامی سے آزاد کرایا اور حکومت عطا کی۔

(ج) انجیل ایک خاص شخص کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جس کی شخصیت آج تک محل نظر بنی ہوئی ہے۔ کوئی اسے خدا کہتا ہے تو کوئی انسان اور کوئی خدا اور انسان دونوں' اور کوئی اس کے وجود ہی سے انکاری ہے۔

(د) استا میں ایک خاص قوم کا ذکر ہے جو ایران میں رہتی تھی اور پہلے ملوک پرستی کرتی تھی۔ پھر آفتاب پرستی میں مبتلا ہو کر حقیقت سے کوسوں دور ہو گئی۔

(ہ) انگہ' روح اور مادہ کے متعلق ایک دقیق فلسفیانہ مقالہ ہے' جس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو منطق اور فلسفہ پڑھے ہوئے ہوں۔ تاجر' سپاہی' کلرک' دکاندار' پیشہ ور' صناع' آرٹسٹ' کاشت کار اور باغبان' یہ سب لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یعنی یہ کتاب صرف علماء کے لئے مخصوص ہے۔

(و) دھمپد کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انگہ میں روح کے وجود کا اقرار ہے یہاں اس کا بھی انکار ہے۔ عوام اس کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(ز) زبور چند مناجاتوں کا مجموعہ ہے جو صرف زاہدوں اور عابدوں کے کام آ سکتی ہیں۔

لیکن قرآن مجید کسی خاص قوم یا قبیلہ یا ملک سے مختص نہیں ہے' بلکہ اس نے بنی نوع آدم کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔

اس کا پیش کردہ خدا ----- ربّ العالمین ہے!

اس کا پیش کردہ رسول ----- رحمۃٌ للعالمین ہے!

اور وہ کتاب خود ----- ذکرٌ للعالمین ہے!!

خدا' رسول اور کتاب تینوں میں عالمگیریت کی شان پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب تمام دنیا

کے انسانوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مجوس' یہود ہوں یا نصاریٰ' صابی ہوں یا مشرک اور بت پرست ہوں یا ملحد' سب کو ایک مرکزی نقطہ پر جمع کرتی ہے اور وحدت نسل انسانی کا پیغام دیتی ہے۔ تمام انسانوں کو راہ ہدایت دکھاتی ہے اور انسانیت کے عروج و کمال کو اپنا نصب العین بناتی ہے۔ اس میں بعض اقوام کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں مگر ضمناً' اور مقصد ان سے یہ ہے کہ آئندہ نسلوں کو عبرت دلائی جائے۔ اس کا مقصد داستان گوئی نہیں بلکہ فرد اور جماعت دونوں کی تربیت ہے۔ الغرض قرآن مجید' بقول علامہ اقبال" ایک اخلاقی نصب العین بھی پیش کرتا ہے اور ایک مکمل معاشرتی نظام بھی!

۵ ۔ پانچویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ وہ جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیتی ہے انہیں عقلی دلائل سے مبرہن بھی کرتی ہے اور جن باتوں کا دعویٰ کرتی ہے ان کی صداقت پر دلائل بھی پیش کرتی ہے۔ آپ پورے وید کو پڑھ جائیے۔ خدا کی ہستی پر یا اس کی توحید پر' الہام کی ضرورت پر' ابطال شرک پر غرضیکہ کسی عقیدہ پر کوئی عقلی دلیل نظر نہ آئے گی۔ اور یہی حال انجیل کا ہے۔ نہ توحید پر کوئی عقلی دلیل دی گئی ہے نہ تثلیث پر' نہ تجسم والوہیت مسیح پر اور نہ کفارہ پر۔

صرف یہی نہیں کہ وید اور بائبل میں خدا کی ہستی یا اس کی توحید پر کوئی دلیل نہیں' بلکہ ان کتابوں سے تو اس کی توحید بھی ثابت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً وید میں اگر ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ " خدا ایک ہے " تو دوسری جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ " ہم ۱۱ x ۳ = ۳۳ خداؤں پر ایمان لاتے ہیں "۔ انجیل میں اگر ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ خدا ایک ہے تو دس جگہ یسوع مسیح کو خدا قرار دیا گیا ہے۔ غرضیکہ توحید کے ساتھ ساتھ شرک بھی موجود ہے۔

بودھ دھرم اور جین دھرم میں تو خدا کا ذکر سرے سے ندارد ہے۔ دھمپد میں صاف لکھا ہے کہ " اے انسان تو کیوں کسی دوست کی تلاش میں ہے۔ اس کائنات میں تیرے سوا کوئی تیرا دوست نہیں ہے "۔ لیکن قرآن مجید ذکر اور فکر دونوں کا جامع ہے۔ وہ الہام ربانی کو عقل انسانی کی روشنی میں ثابت کرتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے تو اس کی ہستی پر متعدد دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً :

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (البقرہ : ۲۸)

یعنی "(اے لوگو!) تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو، تم نیست تھے۔ اس نے تمہیں ہست کیا پھر تمہیں مارے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے"

اگر قرآن مجید توحید الٰہی کا عقیدہ پیش کرتا ہے تو اس پر بھی دلیل لاتا ہے۔ غور کیجئے کیسی مختصر مگر تسلی بخش دلیل ہے :

﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ (الانبیاء : ۲۲)

یعنی "اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ دوسرے خدا بھی ہوتے تو کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔"

اسی طرح اگر قرآن مجید کسی بات کا حکم دیتا ہے تو اس کے فوائد سے بھی آگاہ کرتا ہے۔ مثلاً روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔

۶ ۔ چھٹی خصوصیت اس پیغام کی یہ ہے کہ یہ کتاب تشریح مطالب میں کسی انسان کی محتاج ہے اور نہ کسی دوسری کتاب کی۔ نیز ہر بات کو نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کرتی ہے، جسے عالم بھی سمجھ سکتا ہے اور بچہ بھی۔ علاوہ بریں زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ دھمپد اور رانگہ اور اپنشد کی تعلیمات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جب تک کسی فلسفی سے مدد نہ لی جائے ان کے مسائل عام آدمیوں کو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

علاوہ بریں قرآن مجید جن باتوں کو نجات کے لئے ضروری قرار دیتا ہے ان کی تفصیل اور تشریح خود کرتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں لیکن ان کتابوں کا حال یہ ہے کہ مدعی سست ہے اور گواہ چست ہے۔ مثلاً ایک ہندو یہ کہتا ہے کہ ہمارے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ روح اور مادہ بھی ایشور کی طرح قدیم ہیں، اور مرنے کے بعد انسان کی روح مختلف قالبوں میں جاتی ہے اور گائے کی عزت کرنی ضروری ہے۔ لیکن رگوید میں نہ قدامت روح کا کہیں تذکرہ ملتا ہے نہ آواگون کی تفصیل ہے اور نہ گائے کی عزت کا حکم موجود ہے۔ اسی طرح ایک عیسائی کہتا ہے کہ ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ باپ، بیٹا اور روح

قدس تینوں جدا جدا ہیں، تینوں خدا ہیں اور تینوں مل کر ایک ہیں اور بیٹا باپ سے مولود ہے اور روح قدس دونوں سے مصدور ہے لیکن یہ تعلیم انجیل میں کہیں نہیں ملتی۔ یعنی ہندو اور عیسائی اپنے اپنے مذہبی اصولوں کو اپنی کتابوں سے ثابت نہیں کر سکتے۔

لیکن قرآن مجید جن باتوں پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے ان سب کی تفصیل خود بیان کرتا ہے [illegible] لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ایک مسلمان جن امور کو مدار مذاہب قرار دیتا ہے وہ ان سب کو قرآن مجید سے نکال کر دکھا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید بذات خود کافی کتاب ہے، کسی کی محتاج نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کا قول ہے "عندنا کتابُ اللّٰہِ فھو حَسْبُنا" ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ ہمارے لئے کافی ہے۔

۷۔ قرآن مجید کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مذہبی کتاب فرد اور جماعت دونوں کی زندگی پر پورے طور سے حاوی نہیں ہے۔ صرف یہی کتاب ایسی ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نیز اس کے تمام شعبوں میں یکساں طور پر رہنمائی کر سکتی ہے۔

وید، بائبل، استا، دھمپد اور رانگہ وغیرہ کا مطالعہ کر جائیے۔ ان میں چند دعاؤں، چند رسوم، چند حکایات، چند روایات، چند مواعظ اور چند معجزات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کے اندر مذہب کے علاوہ مکمل نظام معاشرت اور ضابطہ سیاست، اصول اخلاق، طریق ذکر اور قوانین اقتصاد اور آئین تمدن غرضیکہ زندگی کا پورا دستور العمل موجود ہے۔ اور اس کی تعلیمات میں اس قدر ہمہ گیریت اور جامعیت ہے کہ بادشاہ، سپہ سالار، سپاہی، مدبر، فلسفی، تاجر، زاہد و عابد، دنیادار، مجرد، متاہل، والدین، ہمسایہ، زن و فرزند، افسر، ماتحت، آزاد، اسیر، عورت، مرد، مجسٹریٹ، جج، مفتی، مقنن، منصف، وکیل، شہری، دیہاتی غرضیکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کا انسان اس کتاب سے روشنی اور ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ یہ کتاب دین اور سیاست، دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کی ضامن ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

وید میں گھوڑے کی قربانی کا طریقہ تو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ بات جو انسان کے لئے گھوڑوں کی قربانی سے بہت زیادہ ضروری ہے کہیں نہیں مل سکتی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹی کو اس کی جائیداد میں سے حصہ ملے یا نہ؟ اور ملے تو کتنا؟

انجیل میں جناب یسوع کے معجزات تو بہت سے بیان کر دیئے گئے ہیں، لیکن یہ بات جو معجزوں سے کہیں زیادہ اہم ہے کسی جگہ مذکور نہیں کہ اگر کسی عورت کا خاوند حقوق و وظائف زوجیت ادا نہ کر سکے یا ان باتوں کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو وہ بے چاری اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتی ہے یا نہیں؟ اور اگر کر سکتی ہے تو اس کی شرعی صورت کیا ہے؟۔

اصلی بات یہ ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والوں کی مذہب کے اس مفہوم تک رسائی ہی نہیں ہوئی جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کی نظر میں مذہب چند عقائد اور رسوم کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مکمل دستور العمل ہے، جو حیات انسانی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

۸ ۔ آٹھویں خصوصیت اس لاثانی کتاب کی یہ ہے کہ اس میں شروع سے اخیر تک کوئی بات تہذیب اور حیا کے معیار سے فروتر نہیں ہے، اور ہر شخص اس کتاب کو عورتوں کے مجمع میں بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔ لیکن ویدوں میں اس بات کو بالکل مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اگر میں بعض منتر نقل کر دوں تو ناظرین محو حیرت بن جائیں گے کہ یہ الہامی کتاب ہے یا .....؟

میں مثال کے طور پر صرف وید منتروں کے حوالے لکھے دیتا ہوں اور اگر آپ چاہیں تو کسی آریہ سماجی بھائی سے دریافت کر لیں کہ کیا تم اس وید منتر کا اردو ترجمہ اپنی ماں بہن یا بیٹی کو سنا سکتے ہو جو نکاح کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ وہ منتر یہ ہیں : اتھرو وید کانڈ ۱۴، سوکت ۲، منتر نمبر ۳۸۔ نیز رگوید کا یم یمی سوکت جس میں یہ اپنے بھائی یم سے..... کی خواہش کرتی ہے۔ نیز رگوید منڈل ۱۰، سوکت ۱۱۰، منتر نمبر ۵، نیز رگوید منڈل ۵، سوکت نمبر ۴۶، منتر نمبر ۷۔۸۔ نیز رگوید منڈل ۳، سوکت ۳۱ منتر پہلا، نیز رگوید منڈل ۱۰، سوکت ۱۱، منتر

نمبر ۲۔
بائبل میں یہ بات تو نہیں ہے لیکن پھر بھی کئی مقامات اس قدر تہذیب سے گرے ہوئے ہیں کہ شرم و حیا انہیں دیکھ کر اپنی آنکھیں ضرور بند کر لے گی۔ مثال کے طور پر لوطؑ کا شراب کے نشہ میں اپنی سگی بیٹیوں سے زنا کرنا' یا داؤد کا اوریا کی جورو سے زنا کرنا۔ واضح ہو کہ لوطؑ اور داؤدؑ دونوں کو خدا کا نبی بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سلیمانؑ کی غزلوں کی طرز نگارش بعض مقامات میں اس قدر عریاں اور دائرۂ تہذیب سے خارج ہے کہ کوئی شریف آدمی ان غزلوں کو اپنی عورتوں کو نہیں سنا سکتا۔

۹ ۔ نویں خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات سراسر فطرت انسانی کے مطابق ہیں۔
رگ وید میں ۳۳ دیوتاؤں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ دھمپد اور انگہ خدا کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ استا میں یزدان اور اہرمن دو خداؤں کا عقیدہ پیش کیا گیا ہے اور انجیل تین خداؤں کی تعلیم دیتی ہے' حالانکہ فطرت انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ کائنات کا حاکم صرف ایک ہونا چاہئے۔ رگوید اور انجیل دونوں میں طلاق یا خلع کی اجازت نہیں دی گئی' حالانکہ انسانی فطرت اس بات کی مقتضی ہے کہ اگر میاں بیوی میں اتحاد ناممکن ہو جائے تو انہیں علیحدہ کر دیا جائے۔ انجیل نے کفارہ کی تعلیم دی ہے اور یہ بات بھی فطرت کے خلاف ہے کہ درد زید کے سر میں ہو اور دوا بکر کے سر میں لگا دی جائے' یا جرم تو زید کرے اور سزا بکر کو ملے۔ غرض قرآن مجید کے علاوہ دنیا کی کسی اور کتاب نے اپنی تعلیمات کو فطرت انسانی پر مبنی نہیں کیا اور نہ اس کا دعویٰ ہی کیا ہے۔

۱۰ ۔ دسویں خصوصیت اس لاثانی کتاب کی یہ ہے کہ اس نے رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کے عقیدہ کو تاریخ مذاہب میں پہلی مرتبہ باطل کیا ہے۔ اپنشد جن کو ویدوں کی تعلیم کا اَنت (آخر) کہا جاتا ہے اور اسی لئے اس کی تعلیم کو ویدانت کا نام دیا گیا ہے' اور دھمپد' انگہ اور انجیل یہ سب کتابیں ترک دنیا کا سبق دیتی ہیں اور نجات کو اس بات پر منحصر کرتی ہیں کہ انسان رہبانیت اختیار کرے۔ لیکن قرآن مجید اس خلاف فطرت اور قاطع تمدن

طریق کی سخت مخالفت کرتا ہے اور آخرت کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی کا دروازہ بھی کھولتا ہے۔ دیگر مذاہب خواہشات اور تمناؤں کو فنا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں لیکن اسلام ان پر غالب آنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لئے آنحضرت فرماتے ہیں : "لا رھبانیۃ فی الاسلام" کہ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔

۱۱۔ گیارہویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے مخلوق کو براہ راست خالق سے ملا دیا ہے۔ کیونکہ خدا نے اس کائنات کو بذات خود خلعت وجود عنایت کیا ہے۔

ہندو دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ ایشور نے برہما کے واسطہ یا وسیلہ سے دنیا پیدا کی۔ مجوسیت یہ بتاتی ہے کہ خدا نے بعض ملائکہ کے وسیلہ سے کائنات کو پیدا کیا۔ یہودیت یہ سکھاتی ہے کہ خدا نے یہ دنیا ممرا کے وسیلہ سے پیدا کی۔ عیسائیت کی تلقین یہ ہے کہ خدا نے اس دنیا کو لاگاس کے وسیلہ سے پیدا کیا۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے کہ خدا نے بلاواسطہ اس کائنات کو خلق کیا ہے : "اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" اور اس طرح اس نے ہمیشہ کے لئے شرک کا سدباب کر دیا ہے۔ دیگر مذاہب میں ان وسائل کو الوہیت کا درجہ دے دیا گیا اور انسان شرک میں مبتلا ہو گیا۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ ہر شخص براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہے :

﴿"اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ......﴾ (البقرہ : ۱۸۶)

"میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔"

۱۲۔ بارہویں خصوصیت اس زندہ پیغام کی یہ ہے کہ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے ملوکیت اور ملوک پرستی کی تردید نہیں کی۔ لیکن قرآن مجید ملوکیت کو دنیا میں فتنہ و فساد کا موجب سمجھتا ہے اور اس کی جگہ شوریٰ یعنی باہمی صلاح و مشورہ کو حکمرانی کا اصول قرار دیتا ہے۔ اسی کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا آج جمہوریت کے نام سے آشنا ہے اور ملوک پرستی کا خاتمہ ہو تا جاتا ہے۔

۱۳۔ تیرہویں خصوصیت اس زندۂ جاوید کتاب کی یہ ہے کہ اس نے تاریخِ عالم

میں پہلی مرتبہ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے اور سرمایہ داروں کی مذمت کی ہے۔
اسی لئے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

اور ایسے قوانین بنائے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو دنیا اس لعنت سے پاک ہو سکتی ہے۔ سود کی ممانعت، قانون وراثت، زکوٰۃ صدقات وغیرہ یہ سب باتیں اسی لئے ہیں کہ دولت چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہ ہو سکے۔

۱۴ ۔ چودھویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے ان تمام جنگوں کو حرام قرار دیا ہے جن کا مقصود استعمار پرستی یا جوع الارض ہو۔ اسلام صرف خدا کی راہ میں جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

ایک مسلمان صرف اسی صورت میں تلوار اٹھا سکتا ہے جب اس کی جان یا اس کا ایمان خطرہ میں ہو۔ ؎

تیغ بہر عزتِ دین است و بس
مقصدِ او حفظِ آئین است و بس

محض اپنے نفس کی خوشنودی یا برتری کے لئے دوسری اقوام کو غلام بنانا یا بے گناہوں کا خون بہانا اسلام کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔

۱۵ ۔ پندرھویں خصوصیت اس کتاب لاجواب کی یہ ہے اس نے دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ عورتوں کے حقوق کی حمایت کی اور ان کو معاشرتی، علمی اور روحانی اعتبار سے مردوں کے برابر درجہ دیا۔ یہ بات بھی دنیا کی کسی اور مذہبی کتاب میں نظر نہیں آتی۔

منو سمرتی میں عورت کی فطرت کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "جھوٹ بولنا

عورتوں کا ذاتی خاصہ ہے"۔ وید نے اس کے حقوق کی حمایت تو کجا صراحت بھی نہیں کی اور اس لئے اس مذہب کے علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "خاوند کی اطاعت ہی عورت کا سب سے بڑا دھرم ہے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت بے چاری صرف مردوں کی خدمت اور "چوکا باسن" کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

جین دھرم نے بھی عورت کو روحانیت کے لحاظ سے بہت پست درجہ دیا ہے۔ یعنی مرد تو سورگ کی ۲۴ سیڑھیاں طے کر سکتے ہیں، لیکن عورت سولہویں سیڑھی سے اوپر نہیں جا سکتی۔

بودھ دھرم نے تو عورت کو روحانی ترقی میں زبردست رکاوٹ قرار دیا ہے۔ اسی لئے مہاتما گوتم بدھ اپنی پیاری بیوی کو سوتا چھوڑ کر نجات کی تلاش میں نکلے اور ساری عمر اس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔

عیسائی مذہب نے بھی اس کے حقوق کی نہ حمایت کی اور نہ صراحت کی۔ اور بانی مذہب عیسوی کا طرزِ عمل بھی عورتوں کی تحقیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ پولوس نے تجرد کو بہترین طرزِ حیات قرار دیا ہے۔ غرض دنیا کے کسی مذہب نے یا مذہبی کتاب نے اس مظلوم طبقہ کی طرف توجہ نہیں کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ :

(ا) دنیا والوں نے نجات کو رہبانیت پر منحصر کیا۔
(ب) اور رہبانیت کے لئے تجرد ضروری ہے۔
(ج) اور تجرد کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا وجود مہمل اور بے کار ہے۔

اس کے برعکس قرآن مجید نے اس معصوم اور بے گناہ طبقہ کی دادرسی کی اور اس شان کے ساتھ کی کہ اس سے بڑھ کر فہم انسانی میں نہیں آ سکتی۔ اس نے عورت اور مرد کو تمام مذہبی، علمی، مجلسی، تمدنی اور روحانی امور میں مساوات عطا کی ہے۔ عورت جائداد سے حصہ پا سکتی ہے۔ وہ خود تجارت بیع و شریٰ اور داد و ستد کر سکتی ہے، معاہدات کر سکتی ہے، علم حاصل کر سکتی ہے۔ جس طرح مرد کو طلاق کا حق ہے عورت کو خلع کا حق حاصل ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص اسے اپنے نکاح میں نہیں لا سکتا۔

۱۶ ـ سولہویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ قانون وراثت مکمل طور پر انسانوں کو عطا کیا۔ وید' پران' بھگوت' گیتا' توریت' زبور' انجیل' دھمپد' اوستا کسی کتاب نے تمدن کے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی کہ اگر کوئی شخص مرجائے تو اس کی وفات کے بعد کون کون افراد اس کی جائداد سے حصہ پاسکتے ہیں اور کس قدر؟

واضح ہو کہ اس قانون کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ بالواسطہ سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست حربہ ہے۔

۱۷ ـ سترہویں خصوصیت اس لاثانی کتاب کی یہ ہے کہ اس نے مذہبی ارکان کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی آگاہ کردیا ہے کہ اصلی چیز رسوم نہیں ہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ یعنی رسوم کا ادا کرنا بذات خود کوئی قیمتی چیز نہیں جب تک انسان کے قلب میں وہ تبدیلی پیدا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ قرآن کہتا ہے :

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾

یعنی "(اے لوگو اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ) خدا کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون' بلکہ صرف تمہارا تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو اس کی نظر میں مقبول ہو سکتا ہے۔"

قرآن مجید کے علاوہ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے اس حقیقت کو اس طرح واشگاف نہیں کیا۔

۱۸ ـ اٹھارہویں خصوصیت اس کتاب لاجواب کی یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کو اپنے اعمال کا خود ذمہ دار قرار دیا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ فرمایا : "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔" اس آیت سے دو نتیجے مرتب ہوئے' ایک تو یہ کہ کفارہ کے غلط عقیدہ کی تردید ہو گئی اور اس کے بجائے انسان میں اعتماد علی النفس کی صفت پیدا ہو گئی۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام میں پادریوں اور پنڈتوں اور پروہتوں کی طرح کسی مخصوص مذہبی طبقہ کی گنجائش نہیں ہے۔

جب تک پروہت نہ ہو ایک ہندو اپنی عبادت انجام نہیں دے سکتا اور نہ مندر میں جا کر پوجا کر سکتا ہے' اور نہ اس کا نکاح پڑھا جا سکتا ہے نہ کوئی اور سنسکار ادا کیا جا سکتا ہے۔ از ولادت تا دم وفات ایک ہندو' پنڈت اور پروہت کا محتاج ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو ہندو اپنی کوئی مذہبی رسم ادا نہیں کر سکتا۔ یہی حال دیگر اہل مذاہب کا ہے۔ پادری نہ ہو تو ایک عیسائی نہ عبادت کر سکتا ہے نہ اس کا نکاح پڑھا جا سکتا ہے' نہ "عشاء ربانی" میں ڈبل روٹی اور شراب سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ الغرض۔

ایک ہندو پنڈت یا پروہت کا محتاج ہے۔

ایک عیسائی پادری یا راہب کا محتاج ہے۔

ایک مجوسی موبد یا پیر مغاں کا محتاج ہے۔

ایک جینی گوشائیں یا پنڈت کا محتاج ہے۔

ایک بودھی بھکشو یا پروہت کا محتاج ہے۔

ایک یہودی احبار یا ربی کا محتاج ہے۔

لیکن قربان جایئے قرآن مجید کہ ایک مسلمان دنیا کے کسی پنڈت' پادری' گوشائیں' موبد یا بھکشو کا محتاج نہیں ہے۔ وہ جملہ مذہبی رسوم خود بجا لا سکتا ہے۔ گویا قرآن نے ہر قسم کی شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا الحمد للہ۔

۱۹ ۔ انیسویں خصوصیت اس مقدس پیغام کی یہ ہے کہ اس نے نسل' قوم' ذات' قبیلہ' زبان' رنگ' ملک اور وطن' جملہ عارضی اور فرضی امتیازات پستی و بلندی کو مٹا دیا اور ان کی جگہ حقیقی معیار پیش کیا۔ اور میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کے علاوہ دنیا کی کسی کتاب نے شرافت کا یہ معیار پیش نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے نسل پرستی' نسب پرستی' وطن پرستی اور قوم پرستی سب کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ معیار یہ ہے :

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ...﴾ (الحجرات : ۱۳)

یعنی "(اے لوگو!) خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

خدا کی نظر میں وہ شخص مکرم اور معزز نہیں جو برہمن ہو یا سید ہو یا سفید رنگ ہو یا بھارت نواسی ہو یا انگریزی بولتا ہو' بلکہ وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ گویا اسلام میں شرافت کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ رنگ یا ذات۔

۲۰۔ بیسویں خصوصیت اس کلام پاک کی یہ ہے اس نے قوم کی بنیاد وطن پر یا کسی ملک پر نہیں رکھی بلکہ مذہب پر رکھی۔ اور یہ وہ عجیب و غریب تعلیم ہے جو قرآن مجید کے علاوہ اور کسی مذہبی کتاب میں نظر نہیں آتی۔ قرآن مجید نے بنی نوع آدم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے' مومن اور منکر۔ تمام مومن خواہ وہ مراکو میں رہتے ہوں یا جاپان میں' یورپ میں ہوں یا ہندوستان میں' سب ایک قوم ہیں۔" اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ" (الحجرات : ۱۰)

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی' نہ ایرانی' نہ افغانی

قرآن مجید نے ایسی عالمگیر برادری کا تخیل پیش کیا جو جغرافیائی حدود سے بہت بالاتر ہے۔ ساری دنیا مسلمان کا وطن ہے۔ سارے مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

۲۱۔ اکیسویں خصوصیت اس بے نظیر کتاب کی یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے انسان کو استقرائی منطق یا طریق سے روشناس کیا اور اس طرح دنیا میں تحقیق اور تدقیق' ایجادات اور اکتشافاتِ علمیہ کا دروازہ کھول دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غور و فکر اور استدلال کے طریقے دو ہیں : اولاً استخراجی یعنی (Deductive)' ثانیاً استقرائی یعنی (Inductive)۔ استخراجی طریقہ یہ ہے کہ جو اصول دنیا میں مروج ہوں یا لوگوں کے نزدیک مسلم ہوں ان کو مدنظر رکھ کر ان کی روشنی میں جزئیات مرتب کیے جائیں' مثلاً دنیا میں یہ اصول مروج اور مسلم ہے کہ "انسان فانی ہے" جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ دنیا اس اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ میں نے خود کوئی غور و فکر نہیں کیا بلکہ دنیا سے اس اصول کو اخذ کر لیا اور اب اس پر اپنے آئندہ غور و فکر یا استدلال کی بنیاد رکھ دی۔ یعنی اگر مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت

ہوئی کہ "زید کیا ہے"۔ تو میں نے اس طرح استدلال کیا : "زید ایک انسان ہے" اور "انسان فانی ہے" "لہٰذا" زید فانی ہے" اسی کا نام طریق استخراجی ہے اور اسلام سے پہلے یہی طریق دنیا میں مروج تھا۔ اس نے اپنی منطق اسی اصول پر مرتب کی تھی۔

لیکن قرآن مجید نے ایک نیا دور قائم کیا (بلکہ میرا عقیدہ' جو غور و فکر کے بعد قائم کیا گیا ہے' تو یہ ہے کہ قرآن مجید نے نئی دنیا پیدا کر دی) نئی زمین بنائی' نیا آسمان بنایا بلکہ نیا آدم بنایا۔ یعنی انسان کو زمین و آسمان کے مظاہر میں غور و فکر کی دعوت دی! نئی دعوت! نیا پیغام! انسان جن مظاہر فطرت اور عناصر قدرت کو اپنا معبود سمجھتا تھا وہ اب اس کی فکر کا موضوع بن گئے! کیسا انقلاب! کتنا عظیم الشان! کتنا عجیب! قرآن نے حکم دیا کہ دریاؤں کی روانی پر غور کرو' ہواؤں کے چلنے پر غور کرو' بارش اور بادل پر غور کرو' اونٹ کی خلقت پر غور کرو' انسان کی بناوٹ پر غور کرو' حرکات ارضی و سماوی پر غور کرو' شمس و قمر کے نظام پر غور کرو' جہازوں کے چلنے پر غور کرو' چاند کے گھٹنے بڑھنے پر غور کرو' غرضیکہ تمام کائنات کو غور و فکر کا موضوع بناؤ۔ تحقیق کرو' تلاش کرو' چھانو' پھٹکو' جانچو' تولو' غور کرو' فکر کرو' تدبر کرو' سمجھو اور سوچو! جب انسان نے گرد و پیش کے حالات پر غور کرنا شروع کیا تو اس نے دیکھا کہ آج زید وفات پا گیا' کل ہوئی تو دیکھا کہ بکر وفات پا گیا' بعد ازیں خالد فوت ہوا' ازاں بعد عمرو اسی راہ پر چلا گیا' غرضیکہ اس نے کئی سال تک مشاہدہ کیا کہ کوئی فرد موت سے مستثنیٰ نہیں۔ پس اس کا ذہن اس اصول یا حقیقت کی طرف راغب ہوا کہ "انسان فانی ہے"۔ یہ طریق فکر جسے سب سے پہلے قرآن نے مبرہن کیا' جس کی طرف سب سے پہلے قرآن نے بلایا استقرائی طریق کہلاتا ہے۔ اور میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن کے علاوہ اور کسی مذہبی کتاب نے انسان کو اس طریق کی طرف متوجہ نہیں کیا اور دنیا میں جس قدر ترقی آج نظر آتی ہے سب اسی طریق فکر کا نتیجہ ہے۔

۲۲۔ بائیسویں خصوصیت اس عدیم المثال کتاب کی یہ ہے کہ یہ کتاب خود اپنا تعارف کراتی ہے اور اپنی پوزیشن اپنی ابتدائی آیات ہی میں اس طرح واضح کر دیتی ہے کہ طالب حق کو سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔

(ا) وید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"اگنی میلے پروہتم یجناسیادیوارتی وجم ہوتارم رتنادہاتام"۔

میں اگنی کی پرستش کرتا ہوں جو خانگی پروہت ہے اور قربانی کا ایزدی کارکن ہے اور اسے دیوتاؤں کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ ہمیں دولت عطا کرتا ہے اور خود دولت کا مالک ہے۔

اب کچھ پتہ نہیں چلتا کہ (ا) میں کون ہے (۲) یہ اگنی کون ہے (۳) خانگی پروہت کیا ہوتا ہے (۴) قربانی کس کی اور کیوں؟ (۵) دیوتا کون ہے اور کہاں؟ وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ بریں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ رگوید کیا چیز ہے؟ کیوں نازل ہوا۔؟ اس کا مقصد نزول کیا ہے؟ کن لوگوں کے لئے ہے؟ لیکن ان افتتاحیہ جملوں سے کسی سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔

(ب) استا کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

(ترجمہ) "میں نے سب سے پہلے ایران کا ملک بنایا تو میری مخالفت میں انگرامینو (اہرمن) نے دریاؤں میں سانپ پیدا کئے اور موسم سرما پیدا کیا جو شیطانی کام ہے"۔

ان فقروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتاب کیوں نازل ہوئی؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے اندر کیا ہے؟ اور کن لوگوں کے لئے ہے؟ کب تک اس کا اثر رہے گا؟ وغیرہ وغیرہ اور جو بات معلوم ہوئی ہے وہ جغرافیائی طور پر بالکل غلط ہے۔ سب سے پہلے نہ ایران کا ملک پیدا ہوا نہ ہندوستان کا' بلکہ سب سے پہلے زمین بنائی گئی اور جب بن گئی تو سب سے پہلے وادی عراق اور وادی نیل میں آبادی ہوئی۔ دوسری بات عقلاً غلط ہے۔ موسم سرما شیطانی فعل ہرگز نہیں ہے بلکہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا موسم گرما۔ علاوہ بریں یہ محض دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں دی گئی۔

(ج) توریت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"ابتدا میں خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا"۔

سوال یہ ہے کہ یہ مذہبی کتاب ہے یا جغرافیہ؟ مذہبی کتاب کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ یہ بتائے میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ میرے اندر کیا صفت ہے' نہ کہ جغرافیہ پڑھائے۔ اور

طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ الہامی جغرافیہ بھی اب کسی عقلمند کی نظر میں قابل قبول نہیں۔ یورپ کے تمام علماء اس امر پر متفق ہیں کہ توریت کی پہلی کتاب یعنی "کتاب پیدائش" علم طبقات الارض کے اعتبار سے بالکل ناقابل اعتماد ہے۔ بقول تحقیقات جدیدہ، سب سے پہلے زمین و آسمان پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایتھر (Ether) پیدا ہوا، اس کے بعد نیبولا (Nebula)۔

(د) انجیل یوں شروع ہوتی ہے :

"خداوند یسوع مسیح ابن داؤد کا نسب نامہ۔"

اب کوئی پوچھے کہ یہ الہامی کتاب ہے یا کسی شخص کا شجرہ نسب؟۔

(ہ) زبور کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"مبارک ہے وہ انسان جو بدکاروں کی صلاح پر نہیں چلتا۔"

یہ بات تو ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ کتاب کیا ہے؟ پڑھنے والے کو یہ بالکل نہیں معلوم ہو سکتا۔ الغرض ان سب کتابوں کے لئے ایک معرف کی ضرورت ہے جو ان کا تعارف دنیا سے کرائے، لیکن قرآن خود اپنا معرف ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ملاحظہ فرمائیے! منطقی طور پر اور منطقی ترتیب سے جس قدر سوالات ایک طالب حق کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں سب کا جواب موجود ہے۔

(ا) یہ کیا ہے؟ "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" یہ ایک خاص کتاب ہے۔

(ب) اس کے مضامین کیسے ہیں؟ "لَا رَيْبَ فِيْهِ" یعنی اس کے مضامین کی سچائی میں کوئی شک نہیں ہے۔

(ج) اس کتاب کا منصب کیا ہے؟ مقصد کیا ہے؟ "هُدًى" یہ ہدایت ہے' راہنما ہے۔
(د) کس کے لئے؟ "لِلْمُتَّقِينَ" ان انسانوں کے لئے جو متقی ہیں۔
(ہ) متقی کون ہوتا ہے؟ اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ..... تا يُوقِنُونَ۔
(و) ہدایت پر عمل کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ وہ لوگ جو اس پر عمل کریں گے فلاح پا جائیں گے۔

دیکھ لیجئے قرآن نے اپنی ماہیت نوعیت' کیفیت' مقصد' غرض وغایت اور مذہبی زندگی کا نقشہ اور اپنا پیش کردہ نصب العین سب کچھ ابتداء ہی میں نہایت بلاغت کے ساتھ بیان کردیا ہے دنیا کی اور کوئی کتاب اپنا تعارف اس صفائی کے ساتھ نہیں کراتی۔

۲۳۔ تئیسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے شراب' قمار اور سود تینوں کو حرام قرار دے کر دنیا کو ان تین زبردست لعنتوں سے پاک کردیا۔ اور میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ اگر دنیا اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو جائے تو بنی نوع آدم کی بہت سی مصیبتوں کا یک لخت خاتمہ ہو جائے۔ یہ عظیم الشان خدمت قرآن مجید کے علاوہ اور کسی الہامی کتاب نے مجموعی طور پر انجام نہیں دی۔ وید اور انجیل دونوں سے شراب کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح سود اور جوئے کی ممانعت کا کوئی حکم ان کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

۲۴۔ چوبیسویں خصوصیت اس مقدس کتاب کی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو تاریخ مذاہب میں پہلی مرتبہ حریت' اخوت اور مساوات کے زریں اصولوں سے مالا مال کیا۔ یہ تینوں اصول مجموعی طور پر قرآن مجید کے علاوہ اور کسی مذہبی کتاب میں آپ کو نہیں مل سکتے۔ اور آج دنیا طوعاً او کرھاً انہی اصولوں کی طرف آرہی ہے اور یہ میلان قرآن مجید کی صداقت اور برتری کا سب سے زیادہ روشن ثبوت ہے۔

۲۵۔ پچیسویں خصوصیت اس لازوال کتاب کی یہ ہے کہ اس نے انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں علم' احساس اور ارادہ کی آبیاری کی ہے۔

(ا) شعور (علم) کی آبیاری اور نشوونما کے لئے تحقیق اور غوروفکر کو انسان کے لئے لازم قرار دیا۔

(ب) احساس (جذبات) کی نشوونما کے لئے محبت الٰہی کو ایمان کی نشانی قرار دیا۔

(ج) ارادہ (عمل) کی تربیت کے لئے عمل کو نجات کے لئے ضروری قرار دیا۔ اور میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ اور کسی مذہبی کتاب نے ان تینوں قوتوں کی نشوونما کے لئے مجموعی طور پر کوئی نظام دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔

۲۶۔ چھبیسویں خصوصیت اس لاجواب کتاب کی یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کو کامل طور سے ظاہر کیا اور بتایا کہ جس طرح اس نے تمام انسانوں کی جسمانی پرورش کا انتظام کیا ہے اسی طرح روحانی تربیت بھی فرمائی ہے اور اسی لئے دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اس کی طرف سے کوئی ہادی نہ بھیجا گیا ہو۔ قرآن مجید نے ان آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :

"وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ"

یعنی "ہم نے ہر قوم میں ہدایت دینے والا بھیجا"

"وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ"

"اور کوئی امت دنیا میں ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہو"۔

اس تعلیم کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے آپ کو دوسری قوم پر اس لئے فضیلت نہیں دے سکتی کہ صرف وہی خدا کی منتخب اور برگزیدہ قوم ہے جیسا کہ یہود کو یہ زعم باطل تھا اور وہ سخت دل ہو گئے تھے۔ اور اسی غرور اور سنگدلی نے ان کو پیغام الٰہی (قرآن) کی برکات سے مستفید نہ ہونے دیا۔ قرآن مجید نے تمام اقوام عالم کو اس اعتبار سے ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا۔

۲۷۔ ستائیسویں خصوصیت اس زندہ پیغام کی یہ ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو تمام دنیا کے ہادیان مذاہب کی یکساں عزت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ" "ہم اللہ کے بھیجے ہوؤں (انبیاء) کے مابین کسی قسم کا

امتیاز روا نہیں رکھتے۔

اس پاکیزہ تعلیم کی بنا پر ہر مسلمان پر تمام مذاہب کے بزرگوں کی عزت کرنی فرض ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں رواداری، ہمدردی اور امن پسندی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور قلب میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور دنیا میں امن و امان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تامہ و کاملہ کا نقش دل و دماغ دونوں پر ثبت ہو جاتا ہے۔

وید، استا، زبور، توریت، انجیل، دھمپد، انگہ، ساری الہامی آسمانی مذہبی کتابیں دیکھ جایئے، یہ پاکیزہ تعلیم کسی کتاب میں نظر نہیں آئے گی کہ تمام مذاہب کے بانیوں کی یکساں طور پر عزت کرو اور سب کو خدا کی طرف سے سمجھو۔

۲۸۔ اٹھائیسویں خصوصیت اس لاثانی کتاب کی یہ ہے کہ اس نے تمام دنیا کے اہل کتاب کو دعوت اتحاد دی ہے۔ مقصد اس دعوت کا علی الخصوص یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان قائم ہو۔ نفرت، بغض، حسد، کینہ، عداوت، تنگ دلی، دشمنی اور حقارت کا خاتمہ ہو اور عالمگیر انسانی برادری قائم ہو جائے۔ اور میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جب کبھی دنیا میں امن و امان اور انسانوں میں اتحاد قائم ہو گا تو اسی اصول کی بنا پر ہو گا جو اس مقدس کتاب نے پیش کیا۔ وہ اصول یہ ہے :

﴿ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (آل عمران : ۶۴)

"(اے رسولؐ) فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ اس بات پر (ہم تم دونوں متفق ہو جائیں) جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے کہ ہم سوائے خدا کے اور کسی کی پرستش نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے بعض، انسانوں کو خدا کے علاوہ اپنا معبود قرار نہ دیں"۔

۲۹۔ انتیسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے اس نے اپنے پیروؤں کو یہ

ہدایت کی ہے کہ تم دنیا کے بت پرستوں اور مشرکوں کے معبودان باطلہ کو برا مت کہو۔ یعنی یہ تو سچ ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں' لیکن جو لوگ کوتاہ بینی کی وجہ سے پتھر یا مٹی کی مورتوں یا اپنے جیسے فانی انسانوں کو خدا (معبود) سمجھتے ہیں تم ان کو برا مت کہو۔ اس پاکیزہ تعلیم میں کئی نفسیاتی پہلو مضمر ہیں

اولاً' مسلمانوں کو دوسروں کی دل آزاری سے روکا ہے۔

ثانیاً' انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کو اچھا سمجھتا ہے اس کے خلاف کوئی کلمہ سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ فوراً مشتعل ہو جاتا ہے اور اشتعال کی حالت میں وہ اپنی غلط روش پر اور پختہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔

ثالثاً' وہ تعصب کی راہ سے سچے خدا کو برا بھلا کہنے لگے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ فرمایا :

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الانعام ۱۰۸)

"اور (اے مسلمانو!) تم ان غیر مسلموں کے معبودوں کو برا مت کہو' مبادا وہ لوگ حدود سے متجاوز ہو کر جہالت کی بنا پر اللہ کو برا کہنے لگیں"۔

۳۰۔ تیسویں خصوصیت اس بے نظیر کتاب کی یہ ہے کہ اس نے تمام دنیا کو چیلنج دیا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے تو اپنی ساری لیاقت صرف کر کے اس کی نظیر بنا لاؤ۔ فرمایا :

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل : ۸۸)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن دونوں جمع ہو کر اس قرآن کی نظیر پیش کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے' اگرچہ بعض بعض کی مدد ہی کیوں نہ کریں۔"

دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے اس قسم کا چیلنج انسانوں کو نہیں دیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب انسانی تصنیفات ہیں اور انسانوں میں اس چیلنج کی قوت ہی نہیں ہے۔ نزول قرآن

کے وقت عرب میں بڑے بڑے فصحاء بلغاء اور شعراء موجود تھے لیکن جب انہوں نے اس کتاب کی آیات پڑھیں تو بے اختیار پکار اٹھے : ماھٰذا قولُ بَشَرٍ "یعنی" یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے "۔ اس چیلنج کو ۱۴۰۰ برس سے زائد گزر چکے ہیں لیکن آج تک کسی انسان نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ محض اس لئے کہ کوئی قبول کر ہی نہیں سکتا۔ یہ بات طاقت بشری سے خارج ہے۔ جس کسی نے اپنی حماقت سے جواب دینے کی کوشش کی، تاریخ گواہ ہے کہ منہ کی کھائی اور انجو کہ روزگار بن گیا۔

۳۱۔ اکیسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے یہ پیشینگوئی فرمائی کہ اسلام جملہ ادیان پر غالب آئے گا۔ یعنی اس کے علاوہ تمام مذاہب کے اصول باطل ہو جائیں گے اور دنیا طوعاً او کرہاً قرآن کے اصولوں کی طرف مائل ہو گی۔ فرمایا :

﴿ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ ﴾

(الفتح : ۲۸)

یعنی "اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ اس کو جملہ ادیان پر غالب کر دے۔"

آج تمام دنیا قرآنی تعلیمات کی طرف آ رہی ہے "گو پیروانِ مذاہب عالم منہ سے نہیں کہتے، لیکن اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ قرآنی اصولوں کے اختیار کرنے ہی سے ترقی کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

توحید، وحدت نسل انسانی، حریت، اخوت، مساوات، جمہوریت، شوریٰ، طلاق، نکاح بیوگان، حقوق نسواں، مجد و شرف انسانی، انفرادی ذمہ داری، سرمایہ داری اور ملوکیت سے نفرت، رسم پرستی اور شخصیت پرستی سے نفرت، تحقیق و اجتہاد، مطالعہ فطرت، انسداد قمار و شراب وغیرہ، یہ وہ چند موٹے موٹے اصول ہیں جو قرآن مجید نے تلقین فرمائے ہیں۔ اور جو شخص حالات حاضرہ سے باخبر ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ تمام قومیں جزوی

یا کلی طور پر انہی اصولوں کو اپنی ہیئت اجتماعیہ میں داخل کرتی جا رہی ہیں۔ ہندو، مجوسی، یہودی، نصاریٰ اور مشرک سب اپنی اپنی کتابوں کی تعلیمات سے منہ موڑ کر قرآنی اصولوں کی طرف آ رہے ہیں۔ کہیں شاستروں کے خلاف نکاح بیوگان کا قانون بن رہا ہے اور کہیں کلیسا کے خلاف طلاق کے قوانین مدون ہو رہے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اسی لئے انگلستان کے نامور ادیب جارج برنارڈ شا نے اپنی ایک کتاب میں یہ پیشینگوئی کی ہے کہ :
"آج سے سو سال کے بعد یورپ یا تو مسلمان ہو جائے گا یا اسلام سے ملتا جلتا کوئی مذہب اختیار کر لے گا"۔ مسٹر شا مسلمان نہیں لیکن اسے یہ حقیقت صاف نظر آ رہی ہے کہ دنیا قرآن کے اصولوں کو اختیار کرتی جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے "ارمغان حجاز" میں اسی حقیقت کو ایک خاص انداز میں ابلیس کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ وہ اپنے وزراء سے کہتا ہے ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

۳۲۔ بتیسویں خصوصیت اس مقدس پیغام کی یہ ہے کہ اس نے مذاہب عالم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وحدت دین کا اصول پیش کیا اور یہ بات توحید یا وحدت ذات باری تعالیٰ کا منطقی نتیجہ ہے۔ جب کائنات کا خالق ایک ہے تو اس کا پیغام بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اسی لئے قرآن مجید نے پہلی بار دنیا کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ○﴾

یعنی "(اے رسولؐ!) ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا، جس کو یہ وحی نہ کی ہو کہ انسانوں سے کہہ دو کہ سوائے میرے (اللہ کے) کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کرو"۔ (الانبیاء : ۲۵)

اس کے معنی یہ نکلے کہ حضرت مسیحؑ نے بھی انسانوں کو یہی تلقین کی تھی کہ اللہ ایک

ہے اور اسی کی عبادت کرو' لیکن نصاریٰ نے اس حقیقت کو بالائے طاق رکھ دیا اور خود رسول کو خدا اور خدا کا بیٹا بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔

۳۳۔ تینتیسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس کا نام "القرآن" [illegible] کر رکھا ہوا ہے اور متن کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کو الفرقان' الذکر اور الکتاب بھی کہا گیا ہے اور یہ سارے نام الہامی ہیں۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ... "(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ کے اوپر نازل کرتے...) نیز ۲۵ : ۱'و۱۲ : ۱'و۱۷ : ۸۸۔

۳۴۔ چونتیسویں خصوصیت اس پاک کلام کی یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس کے حقیقی مقام اور مرتبہ سے آگاہ کیا۔ ہندو دھرم' جین دھرم' بودھ دھرم اور مسیحیت تمام مذاہب میں انسان کو گناہگار قرار دیا گیا ہے۔ گویا پیدا ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ انسان نے گناہ کیے تھے جو پھر قالب انسانی میں آیا' لیکن قرآن مجید نے ان تمام خیالات باطلہ کی تردید کی اور اعلان کیا کہ انسان خدا کا نائب ہے۔ فرمایا

﴿ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.... ﴾ (البقرہ : ۳۰)

یعنی "جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔"

۳۵۔ پینتیسویں خصوصیت اس بے نظیر کتاب کی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو پہلی مرتبہ اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ مادہ یا مادی دنیا یا مادی جسم ناپاک نہیں ہے۔ یہ تعلیم قدیم زمانہ میں ہندوستان اور یونان کے حکماء نے پیش کی تھی اور جملہ مذاہب عالم نے اس غلط عقیدہ کو تسلیم کر لیا تھا کہ بدی مادہ کی ذات میں داخل ہے' اس لئے انسان چونکہ مادی ہے لہذا بالذات بد ہے۔ یعنی اس کی تخلیق برائی اور بدی پر ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ فرما کر کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" ۔ (بلاشبہ ہم نے انسان کو

بہترین تقویم (طریق) پر پیدا کیا ہے) دنیا کو اس غلط فہمی سے نجات دلائی۔

۳۶۔ چھتیسویں خصوصیت اس زندہ پیغام کی یہ ہے کہ اس کتاب کو حامل کتاب نے خود مدون کر کے دنیا کو عطا کیا۔

(ا) وید رشیوں کی وفات کے ہزاروں برس بعد کتابی شکل میں مدون ہوئے۔

(ب) دھمپد جناب گوتم بدھ کی وفات سے ۶۰۰ سال کے بعد ان کے شاگردوں نے مدون کی۔

(ج) انگہ جناب مہابیر سوامی کی وفات کے بعد مدون کی گئی۔

(د) استا جناب زرتشت کی وفات کے بعد مدون ہوئی۔

(ہ) توریت جناب موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے صدیوں بعد مدون ہوئی۔

(و) زبور جناب داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد مدون کی گئی۔

(ز) انجیل جناب یسوع کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے بطور خود لکھی۔ مثلاً یوحنا کی انجیل ۱۱۰ء میں لکھی گئی۔

(ح) قرآن مجید وہ عدیم المثال کتاب ہے جسے حامل وحی سرور کائنات ﷺ نے خود اپنی زندگی میں مدون کیا اور آج ہمارے پاس وہی کتاب ہے جو آنحضرتؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔

۳۷۔ سینتیسویں خصوصیت اس کتاب لاجواب کی یہ ہے کہ اس نے خود اپنے مسلک کا نام رکھا یعنی اسلام۔ اور پھر نام ایسا رکھا کہ اس میں مسلک کی روح سمٹ کر آ گئی۔

(ا) "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" یعنی اللہ کی نظر میں صرف ایک ہی دین پسندیدہ ہے اور وہ اسلام ہے۔ (آل عمران : ۱۸)

(ب) اسلام کے معنی ہیں قوانین الٰہیہ کی کامل اطاعت کرنا یا اللہ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ یہی اسلام کی روح ہے۔

۳۸۔ اڑتیسویں خصوصیت اس زندۂ جاوید کتاب کی یہ ہے کہ اس نے متن کی

تشریح کے لئے خود ہی ایک اصول وضع فرمایا، تا کہ کوئی شخص کسی زمانہ میں بھی فہم و تفہیم میں غلطی نہ کر سکے۔ وہ اصول یہ ہے کہ قرآن میں محکمات کے علاوہ متشابہات بھی ہیں۔ محکمات میں تو کوئی بحث ممکن ہی نہیں، متشابہات میں ممکن ہے۔ لیکن اگر متشابہات کو محکمات کے تحت رکھو گے تو گمراہ نہ ہو گے مثلاً "ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" یا "يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ" کی تفسیر ہمیشہ محکمات کی روشنی میں کی جانی چاہئے اور محکمات کیا ہیں؟ یہ کہ اللہ تعالیٰ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کا مصداق ہے۔

۳۹۔ انتالیسویں خصوصیت اس عالمگیر پیغام کی یہ ہے کہ جس قدر شدت کے ساتھ اس نے توحید الٰہی کا عقیدہ پیش کیا ہے اور جس قدر عقلی دلائل توحید پر اس نے دیئے ہیں کسی الہامی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ مسٹر سی ایف اینڈریوز، راجہ رام موہن رائے، پامر سیل اور راڈویل سب نے اس حقیقت کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا۔

۴۰۔ چالیسویں خصوصیت اس مکمل دستور العمل کی یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر شرک کی مذمت کسی الہامی کتاب نے نہیں کی بلکہ اس کا فرمان تو یہ ہے : "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ" کہ اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی نہیں معاف کرے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص کسی ذات کو خدا کا شریک جانتا ہے وہ یا انسان ہو گی یا حیوان۔ اور ان دونوں صورتوں میں مشرک انسان اپنے جیسے یا اپنے سے کمتر کی پرستش کرے گا اور اس طرح خود مرتبہ انسانیت سے خارج ہو جائے گا۔

۴۱۔ اکتالیسویں خصوصیت اس ہمہ گیر پیغام کی یہ ہے کہ اس نے حامل وحی کو بطور "اسوۂ حسنہ" دنیا کے سامنے پیش کیا دنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" یعنی "اے لوگو! اللہ کے رسول کی شخصیت میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے"۔

۴۲۔ بیالیسویں خصوصیت اس مقدس کلام کی یہ ہے کہ اس نے ہر قسم کی نبوت کا

ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے انسان کو ذہنی طور پر آزاد کر دیا۔ قیامت تک کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی اتباع یا پیروی کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ حریتِ فکر کا کتنا بڑا چارٹر ہے جو قرآن نے دنیا کو عطا کیا۔

۴۳۔ تینتالیسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے حامل وحی کے انسان ہونے کا اعلان کیا تا کہ قیامت تک کوئی شخص رسول ﷺ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ بنا سکے۔ فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ....﴾

یعنی "(اے رسولؐ) کہہ دو میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں..."۔

۴۴۔ چوالیسویں خصوصیت اس کامل دستور العمل کی یہ ہے کہ اس نے قوم کی بنیاد وطن، قبیلہ، رنگ، زبان، ملک یا نسل پر نہیں رکھی بلکہ عقیدۂ توحید پر رکھی اور اس طرح ایک طرف سارے مسلمانوں کو مسلک اخوت میں منسلک کر دیا۔ چینی، جاپانی، ہندی، ایرانی سب مسلمان ایک قوم بن گئے۔ دوسری طرف دنیا کو قومیت اور وطنیت کی لعنت سے پاک کر دیا۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

جاں نہ گنجد در جہات اے ہوشمند
مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند

(جاوید نامہ)

۴۵۔ پینتالیسویں خصوصیت اس عدیم المثال کتاب کی یہ ہے کہ اس نے مذہب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیا کو اور خصوصاً اہل مذہب کو حصول علم کی طرف مائل کیا اور حصول علم کے طریق سہ گانہ سے آشنا کیا۔ یعنی مطالعہ فطرت، شعور باطنی اور تاریخ ازمنہ سابقہ۔

۴۶۔ چھیالیسویں خصوصیت اس مقدس پیغام کی یہ ہے کہ اس نے حقائق سہ گانہ یعنی خدا، فطرت یا کائنات اور انسان کے باہمی تعلقات کو نہایت عمدگی کے ساتھ واضح کیا

ہے۔ خدا کائنات اور انسان دونوں کا خالق ہے۔ انسان خدا کا نائب اور کائنات پر حکمران ہے۔ کائنات انسان کے فائدہ کے لئے ظہور میں آئی ہے۔

۴۷۔ سینتالیسویں خصوصیت اس زندہ پیغام کی یہ ہے کہ اس نے اپنی انوکھی تعلیم سے نصف صدی کے اندر اندر دنیا میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کر دیا جس کی نظیر کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ کسی کتاب نے اس قدر قلیل مدت میں اس قدر زبردست انقلاب پیدا نہیں کیا۔ اس نے توحید الٰہی کا عقیدہ اس شدت کے ساتھ دلوں میں راسخ کیا کہ مسلمانوں نے آنکھوں دیکھتے دیکھتے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر رکھ دیے۔

۴۸۔ اڑتالیسویں خصوصیت اس کلام الٰہی کی یہ ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے مذہب کا انوکھا تخیل پیش کیا۔ اسلام سے پہلے مذہب کا تخیل یہ تھا کہ وہ صرف مرنے کے بعد کام آنے والی چیز ہے۔ تمدن' معاشرت' سیاست' معیشت اور تدبیر منزل وغیرہ میں اس کو کوئی دخل نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید نے اعلان کیا کہ "مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى" لہٰذا اس مکمل دستور العمل نے انسانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے دائرہ عمل (Jurisdiction) میں لے لیا اور آخرت کے علاوہ دنیا میں کامیابی کا پروگرام (ضابطہ) بھی پیش کیا۔ علامہ فرماتے ہیں :

> "اسلام بیک وقت مذہب بھی ہے یعنی ضابطہ اخلاق بھی ہے اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے لئے ایک مکمل دستور العمل بھی ہے"۔

۴۹۔ انچاسویں خصوصیت اس کتاب لاجواب کی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو ہر قسم کی غلامی سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا اور اسی لئے ملوکیت' سرمایہ داروں' مذہبی طبقہ' امتیازات نسب اور نبوت بعد آنحضرت ﷺ' ان پانچوں امور کا خاتمہ کر دیا جن کی بنا پر ایک انسان دوسرے انسان کا غلام ہو سکتا ہے۔

۵۰۔ پچاسویں خصوصیت اس زندہ کتاب کی یہ ہے کہ اس نے فرد اور جماعت دونوں کی ترقی کو مد نظر رکھ کر قوانین بنائے اور ان میں اس طرح توازن قائم کیا کہ فرد کی

انفرادیت بھی قائم رہے اور اس میں اجتماعی رنگ بھی پیدا ہو سکے۔ ایک طرف یہ فرمایا کہ "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ "وَارْکَعُوا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ" علامہ نے ان دونوں حقائق کو بایں انداز پیش کیا ہے ؎

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

اور

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پس میں تمام انسانوں کو، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ہندو ہوں یا عیسائی مشرقی ہوں یا مغربی، اس زندہ کتاب کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں تا کہ وہ برکاتِ الٰہیہ کے وارث بن سکیں۔

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

افہام و تفہیم

صوبہ سرحد سے ایک متلاشی حق کا خط

اور امیر تنظیم اسلامی کا جواب

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان

السلام علیکم و رحمتہ اللہ

امید ہے خیریت سے ہوں گے اور اقامت دین کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف ہوں گے۔ گزشتہ دنوں ایک رفیق تنظیم نے مجھے "جماعت اسلامی کا تحقیقی مطالعہ" نامی کتاب مطالعہ کرنے کے لئے دی۔ جس کا مطالعہ میرے لئے بے حد مفید اور دلچسپ تھا۔ پہلی جلد مکمل کی اب دوسری جلد شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ دراصل میں نے آپ کی طرح جماعت اسلامی میں ۷ اسال گزارے' ۱۰ سال اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ اور باقی ۷ سال جماعت کے ساتھ۔ ۱۹۹۳ء میں جماعت کا رکن بنا ہوں لیکن دل مطمئن نہیں ہے خصوصاً اس وقت جب میں تنظیم اساتذہ ضلع..... کا صدر بھی تھا تو اس وقت سے ابھی تک انتہائی دل شکن صورت حال سے دوچار ہوں۔ تنظیم اساتذہ کو تو ابھی خیرباد کہہ چکا ہوں جبکہ جماعت کا ابھی تک رکن ہوں۔ میں تنظیم اسلامی کے راولپنڈی کے پروگرام میں شامل ہونا اور آپ سے بالمشافہ ملاقات چاہتا تھا لیکن اللہ کو منظور نہ تھا۔

تنظیم اسلامی کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہوں لیکن کچھ اشکالات ایسے ہیں جو تنظیم میں شامل ہونے سے روکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسا نہ ہو کہ میں اس میں اپنی صلاحیتوں کو جھونکنے کا فیصلہ کروں اور بعد میں تنظیم بھی جماعت کی طرح "عوام پرستی" کا نظریہ قبول کر لے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام تو فساد فی الارض کے بجائے امن و آشتی اور پرامن راستوں سے انقلاب کی بات کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے معاشرہ کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اگر انتخاب کے بجائے ہم "تصادم" کی راہ اپنالیں تو کیا معاشرہ میں

انارکی اور بدامنی پھیلنے کا اندیشہ نہ ہوگا؟ اور خون ناحق بہنے کا خطرہ نہیں ہے؟ ان دو اشکالات کی وجہ سے شرح صدر نہیں۔ ان میں پہلا نکتہ تو شاید محض وہم ہو لیکن دوسرا نکتہ وضاحت کے قابل ہے جس کے لئے میں آپ سے رجوع کرتا ہوں۔ امید ہے میرے اس اشکال کی وضاحت فرمائیں گے۔

ایک اور بات دستوری مسئلہ ہے۔ تنظیم کے دستور میں "تاحیات امیر" کی بات لکھی گئی ہے، جبکہ اسلام میں عہدہ پر قائم رہنے کے لئے "قائم بالحق" کی شرط ہے۔ یعنی جب تک کسی عہدہ پر وہ متمکن ہو اور حق پر قائم ہو تو اہل ہے ورنہ نااہل تصور کیا جائے گا۔ امید ہے پوری تفصیل کے ساتھ ان نکات کی وضاحت فرمائیں۔ واللہ یھدی من یشاء۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ والسلام

آپ کا بھائی
ایک متلاشی حق

برادرم جناب...... صاحب،
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ ملا---- آپ کے "تلاش حق" کے جذبہ سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس جذبہ صادق کی برکت سے ہدایت میں روزافزوں ترقی عطا فرمائے، آمین!

یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ دوسری جلد سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اگر اس سے مراد "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" ہے تو وہ اگر آپ کو دستیاب ہو گئی ہے تو ضرور پڑھئے!

غیر معصوم انسانوں کی کسی بھی انفرادی یا اجتماعی کوشش کے خطا---- یا زوال سے دوچار ہو جانے سے محفوظ رہنے کی ہرگز ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اگر نبی اکرم ﷺ کا قائم کردہ نظام بھی ربع صدی کے بعد ہی شکست و ریخت سے دوچار ہونا شروع ہو گیا تھا تو اور کس شے کو دوام ہو سکتا ہے---- البتہ فرق یہ ہے کہ آنحضورؐ کی مساعی کامیابی سے دوچار ہونے کے بعد اور ثلث صدی تک بالکل صحیح صحیح برقرار رہنے کے بعد زوال سے

دو چار ہوئی۔ جبکہ پچھلی صدی کی عظیم تحریک مجاہدین ---- اور موجودہ صدی کی عظیم تحریک جماعت اسلامی کسی بھی درجہ میں کامیابی سے ہمکنار ہونے سے قبل ہی زوال سے دو چار ہو گئیں!

تاہم ایک سالک حق کا کام یہ ہے کہ وہ جس قافلے کے ساتھ بھی چل رہا ہو آنکھوں اور کانوں اور دل و دماغ کو کھلا اور بیدار رکھ کر ساتھ چلے ---- اور جیسے ہی اس میں فساد کا ظہور دیکھے اب کسی عصبیت یا "مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (العنکبوت : ۲۵) کا شکار ہو کر اس سے چمٹا نہ رہے، بلکہ علیحدگی اختیار کر کے اولاً کسی دوسرے قافلے کو تلاش کرے، اور اگر کوئی بہتر قافلہ مل جائے تو اس کی ہمراہی اختیار کر لے ---- ورنہ پھر خود کھڑا ہو اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کا آغاز کر دے!

نظام اسلام کے نفاذ سے مراد اگر صرف چند تعزیری قوانین ہی کا نفاذ نہیں ہے بلکہ پورے اجتماعی نظام (سیاسی + معاشی + معاشرتی) کو اسلام کے تابع کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں سیاسی سطح پر "مستکبرین" کی صورت اختیار کئے ہوتے ہوں، یا معاشی سطح پر استحصالی طبقات میں شمار ہوتے ہوں ان کی جانب سے مقابلہ اور مقاومت ---- اور اس کے نتیجے میں تصادم ناگزیر ہے ---- تاہم اس موضوع پر خط میں مفصل بات نہیں ہو سکتی۔ آپ میری کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" کا مطالعہ کر کے پھر بھی اگر کوئی اشکال باقی رہ جائے تو مجھ سے رجوع کریں۔

"تاحیات امارت" نظام بیعت کا حصہ ہے۔ اس موضوع پر بھی میری متعدد تحریریں اور تقریریں موجود ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے کے بعد بات زیادہ نتیجہ خیز ہو گی۔ اگر آپ راولپنڈی نہیں آ سکتے تھے تو لاہور کون سا بہت دور ہے۔ خط یا فون کے ذریعے وقت طے کر کے تشریف لائیں تو خوشی ہو گی۔

فقط والسلام مع الاکرام
خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

ریاض سے ایک جواب طلب مراسلہ
اور امیر تنظیم اسلامی کی جوابی وضاحت

محترم المقام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

آپ کی نگارشات و تقاریر سے ایک عرصہ سے بہت مانوس ہوں' اور قرآن فہمی کے لئے آپ کی کوششوں کی میرے دل میں بڑی قدر بھی ہے۔ چند روز قبل سورۂ جمعہ سے متعلق آپ کے ایک کیسٹ میں آپ کی یہ رائے کہ خطبہ کے دوران اٹھ کر چلے جانے والے حضرات کے بارے میں "گمان یہ ہونا چاہئے کہ وہ منافق تھے" سن کر گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ غالباً آپ نے غور نہیں فرمایا ہو گا کہ آپ کے اس گمان محض کی زد کتنی دور تک پڑتی ہے۔

آپ کی تحریروں میں گاہے بگاہے بعض معاصرین کی ان کتابوں پر نقد دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوتی تھی جن میں صحابہ کرامؓ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا ہے' جس کی وجہ سے ان حضرات کے متعلقین میں تجریح صحابہؓ کا عام رواج پڑ گیا ہے۔ مگر سورۂ جمعہ کی آخری آیت کے سلسلہ میں آپ کی رائے سن کر میں سخت کرب میں مبتلا ہو گیا۔ تلاش حق کے لئے تفسیر و حدیث' سیرت اور تاریخ کی کتابیں دیکھیں تو واقعہ کی درج ذیل تفصیل سامنے آئی :

جمعہ کی نماز عہد مدنی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اسلامی معاشرہ اس وقت تربیت کے ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ البتہ حضرات مہاجرین کو اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کی خاص تربیت و صحبت نصیب ہو چکی تھی۔ ابتداء میں جمعہ کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا۔ جب قافلہ تجارت مدینہ منورہ پہنچا اس وقت نماز ختم ہو چکی تھی اور رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں تنگی اور اشیاء خوردنی کی قلت کا زمانہ تھا۔ لہٰذا جو صحابہ

اس وقت خطبہ میں موجود تھے ان میں تربیت یافتہ حضرات تو اپنی جگہ بیٹھے خطبہ سنتے رہے' اور وہ لوگ جن کو رسول اللہ ﷺ کی نئی نئی صحبت حاصل ہوئی تھی' ابھی خاطر خواہ تربیت کے مرحلہ سے نہیں گزرے تھے انہوں نے یہ سمجھا کہ نماز تو ختم ہو چکی' اور خطبہ نماز کا جزء نہ ہونے کی وجہ سے سننا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس اندیشہ سے کہ کہیں اس [illegible] کے زمانہ میں سارا سامان بک نہ جائے اور وہ حاصل نہ کر سکیں' یہ حضرات اٹھ کر چلے گئے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ کی آیات میں ناراضگی ظاہر فرمادی تو اس کے بعد انہی صحابہ کا یہ حال ہوا جو سورۂ نور میں ہے کہ "لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"

سورۂ جمعہ کے فوراً بعد سورۂ منافقون کے آنے سے آپ نے یہ اخذ فرمایا ہے کہ سورۂ جمعہ کی آخری آیات میں جن حضرات کا تذکرہ ہے ان کے منافق ہونے کا غالب گمان ہونا چاہئے۔

سورتوں میں باہم ربط (جس سے آپ نے ایک اتنا بڑا استنتاج کر لیا ہے) فقہ اسلامی میں نصوص سے طرق استدلال یعنی عبارۃ النص' دلالۃ النص' اشارۃ النص یا اقتضاء النص کے کس خانہ میں آتا ہے؟ آپ کے "گمان" کی حیثیت ایک تفسیری نکتہ سے زیادہ کیا ہے جس کو آپ علمی تحقیق کے رنگ میں پیش فرما رہے ہیں' خواہ وہ کتنے ہی مسلمات سے ٹکراتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب! آج کے دور میں جبکہ تاریخ خلافت راشدہ اور آیت رجم کی تحقیق کے نام پر پوری پوری جماعتوں کی تربیت قدح صحابہؓ پر ہو رہی ہے' للہ آپ اپنی تنظیم کو اس نامسعود رجحان سے دور رکھیں۔ آپ کے کیسٹ گھر گھر سنے جاتے ہیں' آپ کی معمولی چوک یا زلت لسان سے جو فکری و عقائدی نقصان پہنچ جائے گا اس کی تلافی کس کے بس میں ہو گی۔ تلخ نوائی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

والسلام

وقار عظیم ندوی

ریاض' سعودی عرب

امیر تنظیم اسلامی کی وضاحت

محترمی و مکرمی 'و علیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کے خط کا اصل اور مسئلہ زیر بحث سے براہ راست متعلق حصہ اس لئے شائع کر دیا گیا ہے کہ اگر میرے بیان سے یہ مغالطہ لاحق ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد آنحضور ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے چھوڑ کر چلے جانے والے سب کے سب لوگ منافق تھے تو اس سے میں اپنی براءت کا اعلان و اظہار کر دوں ---- باقی ایک صحیح بات کے اثبات کے لئے آپ نے قوی دلائل کے ساتھ ساتھ جن مزید ضعیف دلائل کا اضافہ کیا ہے ان کو حذف کر دیا گیا ہے' اس لئے کہ میں کسی رد و قدح کا سلسلہ شروع نہیں کرنا چاہتا ---- اس پر اگر کبھی اللہ کو منظور ہوا تو ان شاء اللہ بالمشافہ گفتگو ہو جائے گی!--- اگر آپ ہمیں مطلع فرما دیں کہ میرا وہ کیسٹ کونسی سیریز کا ہے تو ہم کوشش کریں گے کہ اگر اس میں سے اس حصے کو حذف نہ بھی کیا جا سکے تو بیان کے اختتام پر تصحیح بھی ریکارڈ کرا دی جائے۔

فقط والسلام مع الاکرام ---- خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

بقیہ : حقیقتِ تصوف

ہے۔ تبعاً ذکر میں نماز بھی شامل ہے۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ نماز میں بھی دو elements ہیں' ایک عملی ذکر ہے یعنی رکوع' سجود' قیام' اور دوسرے خود قرآن ہے۔ چنانچہ قرآن نے فجر کی نماز کو تو کہا ہی ہے "قرآن الفجر"۔ اسی طرح رات کی تہجد ہے تو وہ بھی قرآن کے ساتھ ادا کرنا مطلوب ہے۔ تیسرے درجے میں نبی اکرمؐ سے روز مرہ معمولات کے ضمن میں جو اذکار منقول ہیں ان کی پابندی کی جائے تو یہ بھی ذکرِ الٰہی کی ایک صورت ہو گی۔ (جاری ہے)

ایک درد بھرا مکتوب

گرامی قدر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"تنظیم اسلامی" سکھر کی جانب سے شائع ہونے والا اشتہار (دعوت عام) نظر سے گزرا۔ جو کچھ میرے ذہن ہے میں وہ پیش خدمت ہے :

نہی عن المنکر : مسلمانوں نے "نہی عن المنکر" عرصہ سے ترک کر رکھا ہے۔ محترم محمد احتشام الحسن صاحب نے ۱۹۳۹ء میں اپنے رسالہ "مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج" میں اس طرف توجہ دلائی تھی لیکن انہی کی جماعت نے اس کو پروگرام سے خارج کر رکھا ہے۔ یہ صورتحال آپ کے علم میں ہے کیونکہ آپ نے اپریل ۱۹۹۰ء میں میثاق میں اس طرف توجہ دلائی تھی۔ دیگر دینی جماعتوں نے بھی کم و بیش اس کو ترک کر رکھا ہے یا ایک دوسرے میں تعاون مفقود ہے۔ اپنی رقابتوں کی خاطر تو یہ جماعتیں دار پر چڑھنے کو تیار ہیں مگر "نہی عن المنکر" کے لئے نہیں۔ لہٰذا آیت ۱۱۰/۳ کے تحت تو ہم پہلے ہی سربلندی کے لئے disqualify ہو چکے ہیں۔ اب شکایت کیسی!

کفران نعمت : عام مسلمانوں کی مالی حالت گزشتہ پچاس سال میں بہتر ہوئی مگر کفران نعمت روز افزوں ہے۔ اقبال نے کہا تھا : "انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر" اور اب :

ہوئی تیل کی ہم پہ یہ مہربانی — کہ یورپ سے آتا ہے پینے کا پانی

بلند و بالا عمارات : کبھی کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ بیت اللہ کے اردگرد عمارات "مثلھا فی البلاد" کا نمونہ تو نہیں؟ الاماں الحفیظ!

حج بیت اللہ : حج بیت اللہ نے pleasure trip کی حیثیت اختیار کر لی ہے مگر یہ احساس بھی ہونے لگا ہے کہ اب حج میں وہ دشواریاں نہیں جو کچھ عرصہ قبل تک تھیں۔ کہیں قوم سبا والا معاملہ تو نہیں ہونے جا رہا! مختصراً بقول اقبال :

شبے پیش خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

یعنی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

والسلام

خیر اندیش --- سید تنظیم حسین

ناظم آباد۔ کراچی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۴۶
شمارہ : ۳
ذوالقعدہ ۱۴۱۷ھ
مارچ ۱۹۹۷ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۵/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات، قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان — 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت : 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700- فون : 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67-اے، گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110
پبلشر : ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

رفقاء تنظیم اسلامی نوٹ فرمالیں!
تربیتی و مشاورتی اجتماع برائے ملتزم رفقاء
۲۱/۲۲/۲۳ اپریل 'قرآن اکیڈمی' لاہور
میں منعقد ہوگا ان شاء اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

یہ خبر اکثر قارئین تک پہنچ چکی ہو گی کہ اتوار ۲۳/ فروری کو صبح ساڑھے نو بجے میاں محمد شریف صاحب اپنے تینوں صاحبزادوں یعنی میاں محمد نواز شریف (وزیر اعظم پاکستان)' میاں شہباز شریف (وزیر اعلیٰ پنجاب) اور میاں عباس شریف سمیت امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی تشریف لائے۔ یہ ملاقات امیر تنظیم کے دفتر میں ہوئی' قریباً نصف گھنٹہ معزز مہمان امیر تنظیم کے ساتھ رہے' اور مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ قارئین "میثاق" اور دیگر رفقاء و احباب اس ملاقات کا پس منظر اور اس کی تفصیلات جاننے کے لئے شدت کے ساتھ خواہش مند ہوں گے۔ بعض اخبارات میں اگرچہ اس ملاقات کی جزوی تفصیلات شائع ہو چکی ہیں تاہم قارئین "میثاق" کا ہم یہ حق سمجھتے ہیں کہ انہیں اس معاملے کے پورے پس منظر اور مکمل تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ رفقاء تنظیم اسلامی کی اطلاع کے لئے یہ تفصیلات "خبرنامہ خلافت" کے سابقہ شمارے میں شائع کر دی گئی تھیں۔ لیکن چونکہ مذکورہ خبرنامہ کی اشاعت محدود ہے اور ہمارے وسیع تر حلقہ احباب بالخصوص بیرون پاکستان کے رفقاء و احباب تک اس کی رسائی نہیں ہے لہٰذا ضروری خیال کیا گیا کہ اسے "میثاق" میں بھی شائع کیا جائے۔

ملاقات کا پس منظر اور تفصیلات

اس ملاقات کے پس منظر کی وضاحت میاں محمد نواز شریف صاحب کے والد محترم جناب میاں محمد شریف کے نام امیر تنظیم اسلامی کے اس خط کے ذریعے بخوبی ہو جاتی ہے جو امیر محترم نے ۱۸/ فروری کو اپنے ۱۴/ فروری کے خطاب جمعہ کے کیسٹ کے ہمراہ ارسال فرمایا تھا جس میں امیر محترم نے حالیہ انتخابات کے متعدد مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور بعض منفی پہلوؤں کا ذکر کرنے کے علاوہ "الدین النصیحہ" کے

حوالے سے وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف کو بعض مشورے بھی دیئے تھے اور احیاء اسلام اور احیاء نظام خلافت کے حوالے سے بعض معین نکات بھی پیش کیے تھے۔ (یہ مکمل خطاب جمعہ مرتب صورت میں شمارہ ہذا میں شامل ہے)

خط کا متن حسب ذیل ہے :

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور — فون : دفتر 5869501-3

۱۸/ فروری ۱۹۹۷ء — رہائش 5834249

محترمی میاں محمد شریف صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ سے ایک ملاقات تقریباً سوا سال قبل حرم شریف میں ہوئی تھی۔ میری چونکہ اس سے قبل آپ سے کوئی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی لہٰذا میں تو پہچان نہیں سکا تھا۔ البتہ آپ کا کرم تھا کہ آپ مجھے wheel chair پر بیٹھے دیکھ کر میری مزاج پرسی کے لئے خود چل کر آئے تھے ــــــ اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں لاہور میں ملاقات کے لئے آؤں گا۔ میں نے آپ کی اس کرم فرمائی کی بنا پر اپنا فرض سمجھا تھا کہ جب جدہ سے واپسی کے سفر کے دوران معلوم ہوا کہ آپ بھی اسی فلائٹ پر تشریف فرما ہیں تو اپنے اکانومی کے کیبن سے آپ کے فرسٹ کلاس کے حصے میں اپنی گھٹنوں کی شدید تکلیف کے باوجود چل کر گیا تھا تاکہ آپ کو سلام کر سکوں ــــــ کچھ خیال یہ بھی ہے کہ اس وقت بھی آپ نے دوبارہ یہ ارادہ ظاہر فرمایا تھا کہ لاہور میں ملاقات کے لئے تشریف لائیں گے۔

بعد میں تاحال آپ تو اپنی شدید مصروفیات کی بنا پر تشریف نہ لا سکے۔ ادھر میں نے بھی اس اصول کے تحت حاضر ہونا مناسب نہیں سمجھا کہ دین کے خادموں کا امراء کے گھروں پر حاضری دینا پسندیدہ بات نہیں ہے۔

اب حال ہی میں پاکستان کے حالات میں جو "انقلاب" آیا ہے' اس کے پیش نظر میں عریضہ ہذا کے ذریعے نصف ملاقات کی حاضری دے رہا ہوں۔

آپ کے صاحبزادوں کو اللہ تعالیٰ نے ملکی سیاست کے میدان میں غیر متوقع طور پر جو عظیم کامیابی عطا فرمائی ہے وہ ایک جانب اگر اللہ کے عظیم فضل و احسان کی مظہر ہے تو دوسری جانب اتنے ہی بڑے ابتلاء و امتحان کا ذریعہ بھی ہے۔ اور شدید اندیشہ ہے کہ اس میں ناکامی نہ صرف ان کے اور آپ کے پورے خاندان کے لئے بلکہ پورے پاکستان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہو۔

اس موقع کی اہمیت کے پیش نظر میں نے جمعہ ۱۴/ فروری کو مسجد دارالسلام 'باغ جناح' لاہور میں جو تقریر کی تھی' اور اس میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم : "الدین النصیحہ" کے مطابق جو کچھ عرض کیا تھا مجھے خوب اندازہ ہے کہ میاں محمد نواز صاحب یا میاں محمد شہباز صاحب کے لئے تو اس وقت یہ ممکن ہی نہیں ہو گا کہ وہ اسے سننے کے لئے وقت نکال سکیں ـــــ لہذا کچھ اسی سبب سے' اور کچھ اس بنا پر کہ مجھے خوب اندازہ ہے کہ آپ کے خاندان میں خالص مشرقی تہذیب کے اثرات بہت حد تک باقی ہیں اور آپ کے صاحبزادے آپ کے زیر اثر ہی نہیں تابع فرمان بھی ہیں' میں آپ کی خدمت میں اپنی تقریر کے آڈیو کیسٹ ارسال کر رہا ہوں تاکہ اگر آپ کے لئے ممکن ہو تو آپ وقت نکال کر ان کی سماعت فرمالیں۔

پھر اگر آپ کو کسی معاملے میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو اگر آپ تشریف لانے کی زحمت گوارا کر سکیں تو یہ میرے لئے موجب اعزاز ہو گی۔ اور اگر مجھے طلب فرمائیں تو میں اس مقصد کے لئے سر کے بل حاضر ہونا موجب سعادت سمجھوں گا۔ فقط والسلام مع الاکرام

اسرار احمد عفی عنہ

میاں محمد شریف صاحب نے امیر محترم کا اس درجے اکرام کیا کہ اپنے تینوں صاحبزادوں سمیت امیر محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ بلاشبہ یہ ان کی شرافت و مروت اور تواضع و انکساری کا بہت بڑا مظہر ہے۔ فجزاهم الله احسن الجزاء۔ قرآن اکیڈمی کے گیٹ پر معزز مہمانوں کے استقبال کے لئے تنظیم اسلامی کے نائب امیر جناب سید نسیم الدین صاحب اور ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبدالخالق کے علاوہ مرکزی انجمن کے ناظم اعلیٰ جناب قمر سعید قریشی صاحب اور قرآن اکیڈمی کے مدیر عمومی محمود عالم میاں صاحب بھی موجود تھے۔ ساڑھے نو بجے صبح کا وقت ملاقات کے لئے طے

تھا۔ معزز مہمان طے شدہ وقت سے بھی چار پانچ منٹ قبل سیکیورٹی کے مختصر عملے کے ساتھ قرآن اکیڈمی پہنچ گئے۔ امیر تنظیم کو اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے دفتر سے نکل کر معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

میاں محمد شریف صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے امیر محترم سے اپنی ان ملاقاتوں کا مختصر ذکر کیا جن کا ذکر امیر تنظیم کے مکتوب میں موجود ہے' اور اولاً اپنی ملاقات میں تاخیر کے اسباب کے ضمن میں اپنی طویل علالت کا ذکر کیا جس کی بنا پر وہ چھ ماہ کے قریب تو ملک سے باہر ہی رہے تھے' اور اس کے بعد فرمایا کہ چند روز قبل ڈاکٹر صاحب کا بہت ہی اچھا خط مجھے ملا تو میں نے خود ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

امیر محترم نے میاں شریف صاحب کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا آپ حضرات کی آمد میرے لئے باعث عزت افزائی ہے اور آپ نے میرا اور میرے خط کا جو اکرام فرمایا ہے وہ میری توقع سے بہت بڑھ کر ہے۔ حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جس نوع کی کامیابی اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اللہ نے آپ کو ملک و قوم کے مستقبل کو سنوارنے کا ایک سنہری موقع عطا کیا ہے۔ اور اس حوالے سے آپ پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کو اسمبلی میں بھاری عددی اکثریت حاصل ہے اور اب آپ کے لئے پورا موقع ہے کہ قرآن و سنت کی بالادستی کے لئے دستور میں وہ ضروری ترمیم کروا سکتے ہیں جس کا آپ نے اپنے سابقہ دور حکومت میں وعدہ کیا تھا لیکن اس پر عملدرآمد کی نوبت نہ آسکی تھی۔ امیر تنظیم نے اپنے ۱۴/ فروری کے خطاب جمعہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اس خطاب میں میں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ حقیقی اسلامی نظام اور نظام خلافت کے قیام کے لئے کون کون سے ضروری قدم آپ کو اٹھانے ہوں گے۔ امیر محترم نے فرمایا کہ حالیہ انتخابات کے نتیجے میں تحریک پاکستان کا جذبہ ایک بار پھر تازہ ہو گیا ہے اور اس مثالی اسلامی ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہوئی ہے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا اور جس کو قائم کرنے کے عزم کا اظہار قائداعظم کی جانب سے بھی بارہا ہوا۔ امیر محترم نے یہ بات زور دے کر کہی کہ پاکستان کی اولین قیادت سے جو غلطی اس باب میں ہوئی تھی اب اس کا اعادہ نہیں ہونا

چاہئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ شاید یہ آخری موقع ہو جو اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ اس موقع سے اگر ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو بدترین انجام ہمارا مقدر بن سکتا ہے۔ معزز مہمانوں کی جانب سے' جو اب تک سراپا گوش تھے' پہلی بار محترم شہباز شریف صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم آپ سے اسی ضمن میں رہنمائی لینے کے لئے حاضر ہوئے ہیں' ہم خود خلافت راشدہ کے نظام کے قیام کے خواہاں ہیں اور آپ سے سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس کے لئے کون سے اقدامات ہمیں کرنا ہوں گے۔ امیر تنظیم نے جواب میں اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا جس کا اظہار وہ پبلک پلیٹ فارم سے بارہا کر چکے ہیں کہ دستور میں قرآن و سنت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی اگر طے کر دی جائے تو دستوری سطح پر قیام خلافت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کے لئے ضروری ہو گا کہ اولاً دستور میں موجود اس ابہام کو دور کر دیا جائے جس کے باعث قرار داد مقاصد دستور کا حصہ ہوتے ہوئے بھی غیر موثر ہے اور دستور میں شامل بعض دوسری دفعات کو جو اس سے متصادم ہیں' موثر مان کر ہماری عدلیہ اب تک فیصلے صادر کرتی رہی ہے۔ ثانیاً وفاقی شرعی عدالت پر سے وہ تحدید ختم کر دی جائے جو ضیاء الحق مرحوم نے عائلی قوانین اور بعض دیگر اہم امور کے ضمن میں اس پر عائد کر دی تھی۔ اور اس کا درجہ کم از کم ہائی کورٹ کے برابر قرار دیا جائے۔

امیر تنظیم نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے اسلامائزیشن کے عمل یعنی اولاً قرار داد مقاصد کو دستور کے محض دیباچے کے درجے سے اٹھا کر باقاعدہ جزو دستور بنا دینا' اور ثانیاً وفاقی شرعی عدالت کے قیام کی بھرپور تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ صحیح سمت میں ایک قدم تھا جو اٹھایا گیا۔ لیکن عائلی قوانین' مالی معاملات' جوڈیشیل لاز اور دستور پاکستان کو اس کے دائرہ کار سے باہر رکھنا کسی طور درست نہ تھا۔ امیر محترم نے فرمایا کہ دستور میں مذکورہ بالا تبدیلی کے نتیجے میں دستوری سطح پر قیام نظام خلافت کا تقاضا تو اگرچہ پورا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے تابع کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہو گی اور یہ کام ایک تدریج کے ساتھ ہی ہو سکے گا۔ تاہم بحالات موجودہ یہی ایک قابل عمل طریقہ ہے۔

ملکی معیشت کو سود سے پاک کرنے کے عملی طریق پر گفتگو کرتے ہوئے امیر تنظیم نے میاں نواز شریف صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے اولین قدم کے طور پر آپ نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ میں جو اپیل دائر کی تھی اسے فی الفور واپس لیجئے۔ اور اس کے ساتھ ہی بینکنگ کے نظام کو سود سے پاک کرنے کے لئے آپ وفاقی شرعی عدالت سے چند سالوں کی مہلت حاصل کر لیجئے۔ پھر اسلامی نظام معیشت کے ماہرین پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیجئے جس میں پاکستان کے علاوہ پورے عالم اسلام کے نامور سکالرز کو بھی دعوت دیجئے کہ وہ اسلامی بینکنگ کے لئے قابل عمل اصول وضع کریں اور موجودہ سودی بینکاری کی جگہ بلاسود بینکاری کا نظام مدون کریں۔ میاں نواز شریف صاحب نے امیر تنظیم کی تجویز کے دوسرے حصے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کام ہم فوری طور پر کرنے کو تیار ہیں۔ ہم بہت جلد ماہرین اقتصادیات کا ایک بورڈ بنا کر یہ کام ان کے سپرد کریں گے اور پھر کسی مرحلے پر وہ اپیل بھی واپس لے لیں گے۔ امیر محترم نے ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپیل تو آپ کو فوراً واپس لینی چاہئے۔ آپ عدالت سے دو سال کی مہلت مانگ لیجئے اور عملی سطح پر بینکنگ کے نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے عمل کا آغاز کر دیجئے۔ پھر اگر آپ کو مزید وقت درکار ہوا تو عدالت سے مزید مہلت حاصل کی جا سکتی ہے۔ میاں شہباز شریف کا خیال تھا کہ ہمیں عدالت سے تین سال کی مہلت حاصل کرنی چاہئے۔ جس پر امیر تنظیم اسلامی نے فرمایا کہ تین سال نہیں زیادہ سے زیادہ دو سال کی مہلت طلب کریں لیکن محترم میاں محمد شریف صاحب نے امیر محترم کی بات سے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہوئے اور اپنی بات پر غیر معمولی زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ابتداً ایک سال کی مہلت حاصل کی جائے اور کوشش کی جائے کہ ایک سال سے بھی کم عرصے میں بلاسود بینکاری کا نظام رائج ہو جائے۔ جس پر جملہ حاضرین مجلس نے آمین کہا!

تیسرا اہم نکتہ جسے امیر تنظیم اسلامی نے زور دے کر بیان کیا وہ جاگیرداری نظام کے خاتمے اور مروجہ زمینداری نظام کی اصلاح سے متعلق تھا۔ امیر محترم نے ان معزز مہمانوں پر' جن کے ہاتھ میں اس وقت ملک و قوم کی زمام کار ہے' یہ واضح کیا کہ

جاگیرداری نظام کے خاتمے اور نئے بندوبست اراضی کے ضمن میں ہمیں شمشیر فاروقی" سے کام لینا ہوگا۔ حضرت عمرؓ کے اجتہادی فیصلے کے نتیجے میں بلاد اسلامیہ کے وہ تمام علاقے جو بزور شمشیر اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے' عشری یعنی افراد کی ملکیت نہیں بلکہ خراجی یعنی اجتماعی ملکیت قرار دیے گئے۔ اس اعتبار سے پاکستان کی اراضی بھی عشری اور ملکیتی نہیں بلکہ خراجی یعنی قومی ملکیت قرار پاتی ہیں۔ معزز مہمانوں نے اس بحث میں دلچسپی لیتے ہوئے عشری اور خراجی زمینوں کے فرق کی وضاحت چاہی تو امیر تنظیم نے فرمایا کہ عشری زمینیں ملکیتی ہوتی ہیں۔ اور ان کی پیداوار سے زکوٰۃ کی طرح عشر یا نصف عشر وصول کیا جاتا ہے۔ مزید برآں شریعت اسلامی کی رو سے کسی کی ملکیتی زمین میں سے اس کی رضامندی کے بغیر جبراً ایک انچ لینا بھی جائز نہیں ہے' اور اسی بنیاد پر سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپلیٹ بنچ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ کسی جاگیردار یا زمیندار سے اس کی زمین جبراً حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جبکہ خراجی زمینیں فی الاصل ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں اور ریاست جب چاہے نیا بندوبست اراضی کر سکتی ہے۔ امیر تنظیم نے بتایا کہ پچھلی صدی تک ہمارے علماء کرام پاک و ہند کی اراضی کو خراجی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ برصغیر کے عظیم مفسر' محدث' فقیہ اور شیخ طریقت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فقہی مسائل کے موضوع پر اپنی مشہور کتاب "لابد منہ" میں' جو اب تک ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے' صاف طور پر لکھا ہے کہ "برصغیر کی تمام اراضی چونکہ خراجی ہیں لہٰذا میں اپنی اس کتاب میں عشری اراضی کے متعلق شرعی احکام کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کر رہا کہ طالب علموں کے ذہنوں پر ناروا بوجھ آئے گا"۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے ایک جید عالم دین نے اپنی ایک تالیف میں یہ رائے دے دی کہ پاکستان کی زمینیں عشری ہیں۔

اسی طرح مروجہ نظام زمینداری پر گفتگو کرتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے بتایا کہ دور ملوکیت میں اسلام کا جو فقہی نظام مدون ہوا وہ ملوکیت کے اثرات سے پورے طور پر محفوظ نہ رہ سکا۔ اور اسی دور میں مزارعت کے جواز کا فتویٰ دیا گیا۔ حالانکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک مزارعت قطعی طور پر حرام ہے اور امام شافعیؒ بھی صرف

باغات کے تابع اراضی میں مزارعت کو جائز قرار دیتے تھے' کھلے کھیت میں مزارعت کو وہ ناجائز بھی غلط سمجھتے تھے۔ امیر تنظیم نے فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میرے کہنے پر پاکستان کو زمینوں کی خراجی اور مزارعت کو ناجائز قرار دے دیں بلکہ میری تجویز یہ ہے کہ ایسے علماء کرام کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو ان امور میں خصوصی مہارت رکھتے ہوں اور اجتہادی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہوں کہ وہ ان امور پر تبادلہ خیال کرے' غور و فکر کرے اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لے کر کسی متفقہ فیصلے تک پہنچے۔ یہ مسئلہ چونکہ فنی نوعیت کا تھا اور معزز مہمانوں کے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا میاں نواز شریف صاحب نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ ان معاملات پر تفصیلی گفتگو کے لئے امیر تنظیم سے دوبارہ ملاقات کے لئے وقت نکالیں گے۔

دوران گفتگو اسراف کے حوالے سے شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں مختلف پابندیاں عائد کرنے کا معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ ملکی معیشت کی سنگین صورت حال کے پیش نظر میاں نواز شریف صاحب اور میاں شہباز شریف صاحب دونوں اس کے حق میں تھے کہ نمود و نمائش' تبذیر اور اسراف کا سلسلہ بالکل بند ہونا چاہئے۔ اور آئندہ کم از کم دو سال تک ان تقریبات میں کھانا کھلانے پر بھی مکمل پابندی عائد ہونی چاہئے' صرف ٹھنڈا یا گرم مشروب Serve کرنے کی اجازت دی جانی چاہئے۔ امیر تنظیم نے نمود و نمائش اور تبذیر کی ممانعت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس ضمن میں اپنی اصلاحی تحریک کا مختصر تعارف کرایا اور بتایا کہ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے دعوت کا کوئی تصور آنحضورؐ کے دور میں نہیں تھا۔ اس پر پابندی تو بہت مبارک ہے۔ تاہم ولیمے کی دعوت ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق کر سکتا ہے۔ ولیمہ کرنے کی تاکید بھی احادیث میں ملتی ہے اور اس تقریب میں اپنی حیثیت کے مطابق کھانا کھلانا بھی دور نبویؐ اور دور صحابہؓ سے ثابت ہے۔ لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ ولیمہ کی دعوت کی اجازت دی جائے لیکن صرف ایک Dish کی پابندی کے ساتھ' تاہم ہنگامی حالات میں حکومت وقت ولیمہ کی دعوت پر بھی اگر کوئی عارضی پابندی عائد کرے تو میں اس کی مخالفت نہیں کروں گا۔ بہر حال حالات کے نارمل ہوتے ہی ولیمے پر سے تو یہ پابندی ہٹا دینی چاہئے۔ البتہ نکاح کے موقع پر اسے برقرار رکھا

جائے!

دس بج چکے تھے اور معزز مہمانوں کے چہروں پر بے قراری کے آثار نمایاں نظر آنے لگے تھے۔ وقت کی تنگی اور اپنی لامتناہی ذمہ داریوں کا احساس ان پر پوری طرح مسلط تھا۔ وہ کچھ کر گزرنے کے عزم سے سرشار نظر آتے تھے۔ اسی شام وزیر اعظم کی تقریر بھی ٹیلی کاسٹ ہونی تھی۔ دوران گفتگو انہوں نے کچھ نوٹس بھی لئے تھے۔ چنانچہ دس بجتے ہی معزز مہمانوں نے اپنے چائے کے کپ میز پر رکھ دیئے اور امیر تنظیم سے اجازت طلب کی۔ اور شرکاء مجلس سے مصافحے کے بعد مختصر سے سیکیورٹی عملے کے جلو میں رخصت ہوئے۔

☆ ☆ ☆

ماہ رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام

ایک تصحیح۔ ایک وضاحت

گزشتہ شمارے کے انہی صفحات میں امسال رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں میں نماز تراویح کے ساتھ منعقد ہونے والے دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگراموں کی تفصیل درج کی گئی تھی، جس کے مطابق اس ماہ مبارک میں پاکستان کے طول و عرض میں ۴۰ سے زائد مقامات پر یہ انتہائی مفید اور بابرکت پروگرام منعقد ہوئے۔ تاہم عید الفطر کے متصلاً بعد منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں یہ بات سامنے آئی کہ ان میں سے بعض مقامات پر یہ پروگرام نامکمل اور ادھورا رہا۔ یعنی روزانہ ایک مکمل پارے کا ترجمہ کرنے یا سننے کی بجائے نصف یا تہائی پارے کے ترجمے پر اکتفا کی گئی یا پوری نماز تراویح پڑھنے کے بعد آخر میں ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے بیان میں اہم مضامین کو سمونے کی کوشش کی جاتی رہی۔ چنانچہ ہم نے اسے مناسب خیال کیا کہ اس معاملے کی مکمل وضاحت زیر نظر شمارے میں شائع کر دی جائے۔ ذیل میں ان مقامات کا ذکر تو بصراحت کیا جا رہا ہے جہاں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل ہوئی، تاہم وہ مقامات جہاں پر یہ پروگرام نامکمل رہا، ان کے تفصیلی ذکر کو حذف کرتے ہوئے صرف ان کی تعداد درج کر دی گئی ہے۔ تا کہ گزشتہ

شمارے میں شائع شدہ اعداد و شمار کی تصحیح بھی ہو جائے اور بے جا تکرار بھی قارئین کے لئے کوفت کا باعث نہ بنے۔ تفصیل ملاحظہ کیجئے!

حلقہ لاہور ڈویژن میں ماہ رمضان المبارک میں بارہ مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کا اہتمام ہوا۔ درج ذیل چار مقامات پر یہ پروگرام مکمل اور بھرپور انداز میں ہوا اور پایہ تکمیل کو پہنچا:

۱۔ قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ مترجم: ڈاکٹر عارف رشید
۲۔ مسجد خدام القرآن، والٹن، لاہور کینٹ۔ مترجم: فتح محمد قریشی
۳۔ مرکزی دفتر تنظیم اسلامی، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔ ترجمہ قرآن بذریعہ ویڈیو کیسٹ
۴۔ رہائش گاہ زاہد وحید۔ جیلرز کالونی فیروز والا۔ بذریعہ ویڈیو کیسٹ

بقیہ آٹھ مقامات پر یہ پروگرام نامکمل انداز میں ہوا اور صرف منتخب سورتوں کا ترجمہ بیان کیا گیا۔

حلقہ کراچی میں بھی بارہ مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام ہوا۔ چھ مقامات پر مکمل ترجمہ قرآن ہوا، جبکہ بقیہ چھ مقامات پر نامکمل رہا۔ ان مقامات کی جہاں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل ہوئی، تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ دفتر تنظیم اسلامی، مادام اپارٹمنٹ۔ مترجم: اعجاز لطیف
۲۔ برمکان اعجاز لطیف صاحب (خواتین کے لئے) مترجم: مسز اعجاز لطیف
۳۔ برمکان شبیر احمد صاحب، بذریعہ ویڈیو کیسٹ
۴۔ مسجد طیبہ، زمان ٹاؤن
۵۔ برمکان جناب ابوذر ہاشمی
۶۔ قرآن اکیڈمی، ڈیفنس، مترجم: انجینئر نوید احمد

حلقہ پنجاب غربی میں چار مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچے۔

۱۔ حمید پیلس، فیصل آباد۔ مترجم: ڈاکٹر عبدالسمیع
۲۔ دفتر تنظیم اسلامی، سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا۔ مترجم: رشید عمر، ناظم حلقہ
۳۔ دفتر الہدیٰ سیریز، ٹوبہ ٹیک سنگھ (بزبان پنجابی) مترجم: رحمت اللہ بٹر صاحب
۴۔ دفتر حلقہ پنجاب غربی۔ مترجم: شاہد مجید، معتمد حلقہ

بقیہ دو مقامات پر دورۂ ترجمہ کا قرآن نامکمل انداز میں ہوا۔

حلقہ پنجاب جنوبی کے تحت ملتان میں دو مقامات پر بحمد اللہ مکمل دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام

ہوئے۔ قرآن اکیڈمی ملتان میں مختار حسین فاروقی صاحب نے اور مسجد نشتر میڈیکل کالج میں ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی صاحب نے یہ فریضہ سرانجام دیا۔ مزید برآں حلقے میں دیگر چار مقامات پر بھی ترجمہ قرآن کے پروگرام ہوئے، جو نامکمل رہے۔

حلقہ شمالی پنجاب میں آٹھ جگہ پروگرام ہوئے۔ ایک مقام کے علاوہ بقیہ تمام پروگرام بذریعہ ویڈیو کیسٹ ترتیب دیئے گئے تھے۔ تکمیل کرنے والوں میں ناظم حلقہ شمس الحق اعوان صاحب کا نام آتا ہے، جنہوں نے عظمت مختار ثاقب صاحب کے مکان (F/10 اسلام آباد) پر ترجمہ قرآن کے پروگرام کی تکمیل کی۔ اس کے علاوہ دو مقامات پر بذریعہ ویڈیو کیسٹ پروگرام کو تکمیل تک پہنچایا گیا۔ بقیہ پانچ مقامات پر یہ پروگرام جزوی انداز میں ہوئے۔

حلقہ گوجرانوالہ ڈویژن میں دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام دو مقامات پر ہوا۔ شاہد اسلم صاحب نے گوجرانوالہ میں اور شمس العارفین صاحب نے وزیر آباد میں ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ بحمد اللہ دونوں جگہ مکمل ترجمہ قرآن کیا گیا۔

حلقہ آزاد کشمیر میں خالد محمود عباسی صاحب نے دورۂ ترجمہ مکمل کیا۔

حلقہ سرحد میں صرف ایک مقام پر "بر مکان خدا بخش پشاور" بذریعہ ویڈیو، ترجمہ قرآن کا پروگرام ترتیب دیا گیا، جو پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

بحمد اللہ، ہر سال دورۂ ترجمہ قرآن کے حلقوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی مقبولیت بتدریج بڑھ رہی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی کم و بیش اسی نہج پر نماز تراویح کے ساتھ "بیان قرآن" کے پروگرام شروع کر دیئے ہیں۔ اگرچہ ہماری اطلاع کی حد تک مکمل دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام ابھی تک کسی اور تنظیم یا شخصیت کی جانب سے شروع نہیں کیا گیا، تاہم جزوی طور پر بیان قرآن کا سلسلہ کئی مساجد میں دیکھنے میں آیا، جو یقیناً نہایت خوش آئند بات ہے۔ حلقہ شمالی پنجاب کے ناظم شمس الحق اعوان صاحب نے راولپنڈی میں ایسے سات مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں نماز تراویح کے بعد پڑھے گئے پارے کے مضامین کا خلاصہ بیان کرنے کا اہتمام ہوا۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔ دارالعلوم فاروقیہ، قائد اعظم کالونی نزد دھمیال کیمپ، راولپنڈی ۔ قاضی عبدالرشید صاحب

۲ - غوثیہ مسجد 'النور کالونی' شکریال' راولپنڈی۔ خطیب مسجد ہذا
۳ - ایمن مسجد کریم آباد شکریال۔ خطیب مسجد ہذا
۴ - خطیب جامع مسجد جناح کیمپ پی اے ایف نزد شکریال' راولپنڈی۔
۵ - دارالعلوم تعلیم القرآن' راجہ بازار' راولپنڈی
۶ - ڈاکٹر فرحت ہاشمی الہدیٰ اکیڈمی' اسلام آباد F-8/3

یہ خواتین کے لئے پروگرام کرتی تھیں۔ اس میں سینکڑوں خواتین شریک ہوتی تھیں۔ ان کی ایک شاگردہ نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل پنڈی میں' دن کے اوقات میں ترجمہ قرآن کا پروگرام کیا۔

۷ - قاضی ظفرالحق صاحب نے واہ کینٹ میں بعد نماز تراویح مختصر تشریح کا اہتمام کیا۔

پنجاب غربی' فیصل آباد سے محمد رشید عمر صاحب نے درج ذیل پانچ مقامات گنوائے ہیں' جہاں ماہ رمضان میں اسی نوعیت کے پروگرام ترتیب دیئے گئے :

۱ - مسجد' میاں ٹرسٹ ہسپتال' بذریعہ آڈیو کیسٹ
۲ - خالد مسجد سعید کالونی میں تراویح کے بعد متعلقہ حصہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا رہا۔
۳ - شیخ کالونی مدرسہ جامعہ اسلامیہ میں ہر سال دورۂ تفسیر القرآن کا اہتمام ہوتا ہے جو یکم شعبان سے ۲۵ رمضان تک جاری رہتا ہے۔
۴ - مسجد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ گلستان کالونی میں بعد نماز تراویح متعلقہ حصہ کا درس دیا جاتا رہا۔
۵ - جامع مسجد اسحاق بہلپز کالونی میں ہر دو رکعت کے بعد متعلقہ حصہ کا مختصر مفہوم پیش کیا گیا۔

یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ "رجوع الی القرآن" کی وہ دعوت بتدریج وسعت پذیر ہو رہی ہے جو تنظیم اسلامی کے لئے محور و اساس کا درجہ رکھتی ہے اور جو تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کا طغرۂ امتیاز ہے۔ فللہ الحمد والمنہ۔

پاکستان میں مسلم لیگ کے حالیہ احیاء کے تقاضے

اور نواز شریف صاحب کو مخلصانہ مشورے

امیر تنظیم اسلامی کے ۱۴/ اور ۲۱/ فروری کے خطاباتِ جمعہ سے ماخوذ

حمد و ثناء اور درود و سلام کے بعد :

فقد قال اللّٰہ تبارک وتعالیٰ کما ورد فی سورۃ الانبیاء :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ' بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ○ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ○ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○

صدق اللّٰہ العظیم

وعن ابی رقیۃ تمیم بن اوس الداری رضی اللّٰہ عنہ عن النبیّ صلیّ اللّٰہ علیہ وسلم ۔ قال : "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" قُلْنَا لِمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰہ؟ قال : "لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ"

(رواہ الامام مسلم رحمہ اللّٰہ)

ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا :

پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کو اب گیارہ دن گزر چکے ہیں۔ غالباً آئندہ تین دنوں میں مرکزی حکومت قائم ہو جائے گی اور ہفتہ عشرہ کے اندر اندر صوبائی حکومتیں بھی بن جائیں گی۔ اس ضمن میں جو چند باتیں مجھے آپ سے عرض کرنی ہیں ان میں پہلی بات کا عنوان ہے "الحمد للہ"۔ یعنی اللہ کا شکر ہم پر بہت سے اعتبارات سے واجب ہے۔ اگر ہم اللہ کا شکر ادا نہ کریں تو مجرم ہوں گے، از روئے الفاظ قرآنی : "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ"۔ حالات خواہ ذاتی ہوں، یا اجتماعی، انفرادی ہوں یا ملی، ان کا انسان کو جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہوا ہو، خواہ وہ کسی بھی اعتبار سے ہو ــــ انفرادی ہو یا اجتماعی ــــ انسان کو اس کا شعور حاصل ہونا چاہئے اور پورے شعور کے ساتھ تہہِ دل سے اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰه

سب سے پہلی بات جس کی وجہ سے ہم پر شکر واجب ہے وہ یہ کہ ۵/ نومبر ۹۶ء کے صدارتی اقدام کے بعد سے، جس کے ذریعے مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں برطرف کی گئی تھیں، ۳/ فروری ۹۷ء کے انتخابات تک، الحمد للہ، جو کچھ بھی ہمارے ملک میں ہوا ہے وہ آئین کے عین مطابق ہوا۔ اس ضمن میں جو بھی شکوک و شبہات ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ آیا صدر کا یہ اقدام ان کے دستوری اختیارات کے اندر تھا یا اس سے تجاوز پر مبنی تھا، اس کے ضمن میں بھی آپ کو معلوم ہے کہ سپریم کورٹ، جو ہمارے ملک میں اس وقت سب سے بڑا عدالتی ادارہ ہے، اس نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ صدر کا اقدام ان کے دستوری اختیارات کے اندر ہی تھا۔ دوسری بڑی بات یہ کہ انتخابات نوے دن کے اندر ہو گئے اور اس پر مستزاد وا قعتاً انتخابات کے ضمن میں بعض نہایت خوش آئند اور مثبت باتیں ہوئی ہیں۔ اور چونکہ یہ پاکستان میں غالباً پہلی مرتبہ ہوئی ہیں، لہٰذا ہمیں ان کا بھی شعور کے ساتھ ادراک ہونا چاہئے اور اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ مثلاً یہ کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ہی دن ہو گئے۔

ہمارا یہ بہت پرانا موقف تھا اور اس سے یقیناً فائدے ہوئے ہیں' ورنہ ماضی میں یہ ہوتا تھا کہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے نتیجے میں صوبائی اسمبلیوں کی صورتحال بھی تلپٹ ہو جاتی تھی۔ پھر یہ کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات الگ الگ کرانے سے وقت اور پیسے کا ضیاع بھی ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے یقیناً بچت ہوئی ہے۔

ثانیاً انتخابی مہم پر نگران حکومت کی طرف سے غالباً پاکستان میں پہلی مرتبہ جو پابندیاں عائد کی گئیں' وہ بھی یقیناً بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ان کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ انتخابی مہم کے دوران پیسہ بھی بہت کم خرچ ہوا' وقت بھی بہت کم صرف ہوا' اور ان دونوں باتوں سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے ہاں انتخابات میں جو خرافات ہوا کرتی تھیں وہ بھی اس مرتبہ تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئیں۔ یہ خرافات ہمارے ہاں پچھلے الیکشن میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔

ثالثاً یہ کہ انتخابات صاف و شفاف ہوئے ہیں' کم سے کم پولنگ کی حد تک۔ اگرچہ آج پھر پیپلز پارٹی کی طرف سے بعض باتیں اخبارات میں آئی ہیں لیکن ان کی حیثیت یا تو after thought کی ہے یا یہ ان کی کسی نئی strategy کے لئے تمہید کی ہے' ورنہ پچھلے دس دنوں کے دوران انہوں نے یہ بات نہیں کی۔ اس ضمن میں اولاً تو پوری دنیا نے گواہی دی ہے کہ الیکشن غیر جانبدارانہ ہوئے ہیں' صاف ہوئے ہیں' شفاف ہوئے ہیں' پولنگ میں دھاندلی نہیں ہوئی۔ بے نظیر صاحبہ نے بھی پہلے جو الزام لگایا تھا وہ "engineered" الیکشن کا تھا اور اس الزام میں تو کسی نہ کسی درجے میں وزن ضرور تھا۔ میں بعد میں عرض کروں گا کہ pre-polling engineering اپنی جگہ پر ایک علیحدہ issue ہے اور انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کا ایک علیحدہ ذریعہ ہے' لیکن پولنگ کے معاملے میں بے نظیر بھٹو صاحبہ نے بھی ابتداءً کسی دھاندلی کا الزام نہیں لگایا تھا۔ دھاندلی کا الزام صرف ایک صاحب نے لگایا تھا اور وہ مولانا فضل الرحمن صاحب ہیں۔ ان کے اس الزام کے بارے میں بھی کچھ بعد میں عرض کروں گا' اس لئے کہ اس میں پاکستان کے لئے ایک خطرے کی بات مضمر ہے۔

پھر بات یہ کہ ' الحمد للہ ' جہاں تک ووٹنگ کا ٹرن آؤٹ ہے اس میں بھی بہت بڑی کمی

واقع نہیں ہوئی۔ ٹرن آؤٹ قدرے کم تو تھا' لیکن اگر دو وجوہات کو سامنے رکھ لیا جائے یعنی ایک تو شدید سردی کا موسم اور دوسرے رمضان المبارک کا مہینہ' تو میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ انتخابات اور ۳/ فروری ۹۷ء کے الیکشن میں ٹرن آؤٹ کا جو فرق ہے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے اور اس اعتبار سے یہ دونوں مساوی قرار پائیں گے۔ اس ضمن میں نمایاں بات یہ ہے کہ اگرچہ کئی جماعتوں نے انتخابات کا نہ صرف خود بائیکاٹ کیا بلکہ بائیکاٹ کی تبلیغ اور تلقین بھی کی۔ اگرچہ وہ کوئی مؤثر مہم تو نہیں چلا سکے تاہم اپنی حد تک جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے' خاموشی اور بغیر کسی جارحیت کے' وہ انہوں نے کیا' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ ہمارے رائے دہندگان نے بائیکاٹ کرنے والوں کے موقف کو نظرانداز کر دیا ہے۔

رابعاً بے نظیر صاحبہ نے بھی' خواہ دیانتاً اور ارادتاً خواہ مصلحتاً اور مجبوراً' جو موقف اختیار کیا ہے وہ کم سے کم کل کی تاریخ تک بہت ہی معتدل تھا۔ یعنی یہ کہ ہم کوئی تحریک نہیں چلائیں گے' اور یہ کہ نواز شریف صاحب کو اپنی ٹرم پوری کرنی چاہئے۔ ان کے طرزِ عمل کے ضمن میں یہ ایک بڑی positive بات تھی۔ البتہ ان کی طرف سے ابتداءً میں "engineered elections" کا جو الزام عائد کیا گیا تھا وہ میری رائے میں صحیح تھا۔ اس لئے کہ نگران حکومتوں میں جن لوگوں کو ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں ان کے انتخاب میں اصل شے پیپلز پارٹی یا صحیح تر الفاظ میں بے نظیر صاحبہ کی عداوت تھی۔ یعنی جن افراد کو پیپلز پارٹی سے کوئی دشمنی' عداوت' شکایت یا اختلاف تھا' انہی کو ذمہ داری کے عہدے دیئے گئے۔ اس ضمن میں خود ملک معراج خالد صاحب کے علاوہ پنجاب کے گورنر طارق رحیم اور سندھ کے وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پھر ممتاز بھٹو صاحب کا معاملہ تو خاندانی بھی ہے اور علاقائی بھی۔ پھر یہ کہ وہ کنفیڈریشن کے داعی ہیں اور اس دور میں بھی برملا کہتے رہے کہ میں تو اس کا قائل ہوں۔ انہوں نے سرکاری تقریبات تک کے اندر پاکستان زندہ باد کی بجائے جئے سندھ کا نعرہ لگایا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشخاص کو نگران حکومتوں میں ذمہ داریاں سونپنا بغیر کسی مقصد کے تو نہیں تھا۔ لہٰذا بے نظیر صاحبہ کے الزام میں یقیناً وزن تھا۔ البتہ اگر اس بنیاد پر بے نظیر صاحبہ الیکشن کا بائیکاٹ کر دیتیں تو

یہ بات بہت وزنی ہوتی۔ لیکن جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے دعا کی تھی کہ وہ بائیکاٹ نہ کریں، اور الحمد للہ انہوں نے بائیکاٹ نہیں کیا۔ اس میں بھی یقیناً ان کی اپنی ہی مصلحت ہو گی۔ البتہ غیر مرئی طریقے پر ہماری دعاؤں کا بھی کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اب الیکشن میں حصہ لینے کے بعد انہیں یہ الزام عائد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

خامسًا یہ کہ الیکشن کے بعد قاضی حسین احمد صاحب کا رویّہ بھی خوش آئند ہے۔ میں پھر وہی الفاظ دہرانے پر مجبور ہوں، ان کا یہ موقف خواہ ارادتاً ہے یا مجبوراً، خواہ وقتی ہے یا ان کے طریقہ کار میں کسی مستقل تبدیلی کا مظہر ہے، بہرحال اسے مثبت اور خوش آئند ہی کہا جائے گا۔ کہاں تو ان کا وہ موقف تھا کہ ہم حکومت بننے ہی نہیں دیں گے، اقتدار منتقل ہی نہیں ہونے دیں گے، جو بڑے ہی خوفناک عزائم کی غمازی کرنے والے بیانات تھے کہ فوری طور پر شاید کوئی بہت بڑی تحریک شروع کر دی جائے یا کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن پھر الیکشن کے فوراً بعد ان کا ردِّ عمل یہ تھا کہ ہم نئی حکومت کو چھ ماہ کی مہلت دے رہے ہیں۔ یہ بیان بڑا مبارک تھا۔ پھر اس کے بعد ایک اور بات آئی جو اس سے بھی مبارک تر تھی، یعنی یہ کہ اگر نواز شریف صاحب صحیح روش اختیار کریں گے تو ہم ان کے ساتھ تعاون بھی کریں گے۔ اگرچہ آج کے اخبار کے مطابق، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، ان کا رنگ بھی کچھ بدلا ہوا ہے۔

ان تمام باتوں کا اور الیکشن کے نتائج کا حاصل کیا ہے، اب ذرا اس کا جائزہ لے لیجئے۔ سب سے نمایاں بات تو یہ ہے کہ مسلم لیگ نواز شریف گروپ کو بہت بڑا (massive) مینڈیٹ مل گیا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی، نہ باہر نہ اندر، نہ خود نواز شریف صاحب کو، نہ حکمرانوں کو، نہ ان کے سرپرستوں کو۔ اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا بالفعل احیاء ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے پچاس برس بعد آج دوبارہ مسلم لیگ کا ایک جماعت کی حیثیت سے احیاء ہوا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ حقائق کو اپنے سامنے رکھ کر ہمیں تسلیم کرنا چاہئے، یہ حقائق کسی کو پسند ہوں یا ناپسند ہوں، یہ بات علیحدہ ہے، لیکن معروضی طور پر (objectively) صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ کے ساتھ "ن" کا جو لاحقہ لگتا ہے

اب ختم کر دینا چاہئے۔ اس لئے کہ اب مسلم لیگ واقعتاً صرف یہی ایک مسلم لیگ ہے'
کسی اور کو اب مسلم لیگ کا نام اختیار کرنے کا کوئی اخلاقی جواز اور حق حاصل نہیں ہے۔
دوسری بات یہ کہ مرکز اور پنجاب میں تو مسلم لیگ کی بہت ہی مضبوط حکومتیں بنیں گی۔
پنجاب تو آبادی کے لحاظ سے باقی تینوں صوبوں سے بھی بڑا صوبہ ہے' لیکن بقیہ تین صوبوں
میں سے بھی صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی بہت مؤثر پوزیشن ہو گی۔ سندھ میں بھی اس کا
عمل دخل ہے اور وہ ایک coalition حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ جیسا کہ آج
کے اخبار میں ہے کہ چونکہ پیپلز پارٹی کے آج کل اعصاب جواب دے رہے ہیں اور اس
پر ایک پژمردگی اور افسردگی کی کیفیت طاری ہے تو اگرچہ وہ سندھ اسمبلی میں اپنی عددی
حیثیت کے اعتبار سے حکومت بنانے کی سب سے بڑھ کر حق دار ہے' تاہم زیادہ امکان یہی
ہے کہ وہ سندھ میں بھی حکومت نہیں بنا پائے گی۔ بلوچستان میں بھی مسلم لیگ کا کم از کم
وجود ضرور ہے۔ اگرچہ وہاں زیادہ تر مقامی جماعتوں کو ہی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن
مسلم لیگ بھی بلوچستان اسمبلی میں بالکل صفر نہیں ہے۔

مسلم لیگ کی مضبوط حکومتوں کے قیام کا ایک بہت اچھا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے ہاں
قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان جس طرح حکومت وقت کو بلیک میل کرتے ہیں اس
خرابی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ جب ملے جلے نتائج کی وجہ سے ایک
معلق ایوان (hung parliament) وجود میں آئے جس میں کسی ایک جماعت کی فیصلہ
کن اکثریت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ محض چند ارکان کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے حکومت کو
خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جو بلیک میلنگ ہوتی تھی وہ ہمارے ہاں سیاسی رشوت
کا سب سے بڑا کھاتہ تھا۔ اگرچہ کرپشن کے دوسرے بہت سے راستے بھی ہیں لیکن سب
سے بڑا اور سب سے بڑے پیمانے پر ہونے والی کرپشن کا عنوان یہی تھا کہ ان لوگوں نے
حکومت کو بلیک میل کرنے کے ذریعے سے مفادات حاصل کئے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے
پاس قارون کا خزانہ تو نہیں ہوتا' لہٰذا حلوائی کی دکان پر ہی نانا جی کی فاتحہ دلوائی جا سکتی
ہے۔ ہر دور میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے' خواہ وہ نواز شریف صاحب تھے جنہوں نے پلاٹوں کی
تقسیم کر کے اور پاکستان کو اربوں روپے کا نقصان پہنچا کر اپنے دور میں اپنی حکومت کو قائم

رکھا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ بعد میں بے نظیر صاحبہ کے دور میں بھی ہوا ہے۔ بہرحال اب مسلم لیگ کو جو بہت بڑا مینڈیٹ ملا ہے اس کی بدولت یہ معاملہ بالکل ختم نہ بھی ہوا تو یقیناً اس میں بہت حد تک کمی واقع ہو جائے گی۔ اور اگر حکومت ارادہ کر لے کہ یہ کام ہرگز نہیں کرنا ہے تو موجودہ حالات میں اس کے لئے کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس کے بغیر اس کا کام ہی نہ چل سکے۔ دوسرے یہ کہ داخلی طور پر یقیناً تعمیر و ترقی کے راستے کھلے ہیں۔ حکومت مستحکم ہو تو وہ schemes اور منصوبے بنا سکتی ہے' ترقیاتی منصوبوں کے لئے غور و فکر کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک ہی دور استحکام کا آیا تھا اور وہ ایوب خان کا دور تھا۔ ابتداء میں مارشل لاء تھا جس کا رعب و داب بہت تھا۔ اور اسی وجہ سے کچھ عرصہ استحکام میں گزرا اور بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی ہوئی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ یہ معاملہ مضبوط حکومتوں کے دور ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ ایسی ہر حکومت چاہتی ہے کہ ملک میں ترقی اور خوشحالی ہو۔ اسی پر ان کے لئے اگلے الیکشن میں پھر کامیاب ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ دونوں ہی کی بنیاد پر پھر فیصلہ ہوتا ہے' تو اگر وہ عوام کو کوئی relief نہ دے سکے' ان کی بہتری کے لئے کام نہ کر سکے' تو پھر وہی نتیجہ نکلے گا جو اس سے پہلے نکلتا رہا ہے۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ داخلی طور پر بھی تعمیر و ترقی کا راستہ کھلا ہے۔

ساوسا یہ کہ اب بیرونی ممالک سے بھی جم کر بات کی جا سکے گی۔ اگر اندرون خانہ عدم استحکام ہو اور کوئی مضبوط حکومت قائم نہ ہو تو بیرونی حکومتیں بھی مذاق اڑاتی ہیں اور فقرے چست کرتی ہیں۔ آج تک میرے دل پر پنڈت نہرو کا وہ جملہ نقش ہے کہ پاکستان میں مَیں کس سے بات کروں؟ میں ہفتے بھر میں اتنی مرتبہ لباس نہیں بدلتا جتنی وہاں حکومتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ یہ کس قدر تلخ جملہ تھا اور بات بالکل صحیح تھی خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ پچاس کی دہائی کے وسط میں فی الواقع اسی طرح کی صورتحال تھی جس کے منطقی نتیجے کے طور پر پہلا مارشل لاء آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اب جو بھی حکومت بنے گی وہ یقیناً بیرونی حکومتوں سے جم کر بات کر سکتی ہے۔

میں اس ضمن میں ایک یاددہانی کرانا چاہتا ہوں کہ میرا جو مستقل موقف رہا ہے وہ کس طرح اس موقع پر پورے طور پر درست ثابت ہو گیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میرا

مستقل موقف یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا، لیکن انتخابات کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ بظاہر یہ متضاد سی بات تھی، جو میرے اپنے رفقاء کی سمجھ میں بھی مشکل ہی سے آتی تھی۔ ہم نے ابتداء ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ ہمیں الیکشن میں حصہ نہیں لینا اور نہ کسی کا سیاسی حلیف بننا ہے اور نہ کسی کا حریف بننا ہے، ہماری حیثیت ایک داعی جماعت کی ہے، ہم تو ہر ایک کو دعوت دے رہے ہیں۔ الیکشن میں آکر کسی کے حریف ہو جائیں گے اور کسی کے حلیف بن جائیں گے۔ جو حریف ہے وہ ہماری بات سننے سے انکار کر دے گا، ہماری نیت پر شک کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک داعی جماعت کے لئے یہ راستہ صحیح نہیں۔ لیکن ملک میں انتخابات ہوتے رہنا چاہئیں۔ یہ وہ موقف ہے جس پر میرے اپنے رفقاء بڑے طویل عرصے تک مجھ سے اختلاف کرتے رہے کہ آپ کا یہ موقف ناقابلِ فہم ہے، لیکن میں اس پر قائم رہا۔ میں آج بھی اس پر اسی طرح قائم ہوں جس طرح پہلے قائم رہا ہوں۔ میں اس سے پہلے یہ تفصیلات بھی بتا چکا ہوں کہ کس طرح میں نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں یہ کہا تھا کہ انتخابی عمل کو دیر تک روکے رکھنا پاکستان کے لئے suicidal ہے۔ یہ ۱۸ / اگست ۱۹۸۰ء کی بات ہے جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ میرے دروس میں بھی آیا کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ مجھے اس کا علم نہیں ہوتا تھا کہ تین چار سو اشخاص جو مسجد خضراء میں میرا درس سننے آیا کرتے تھے ان میں کون کون شامل ہیں۔ بہرحال میری ان سے جو پہلی ملاقات ہوئی تھی میں نے اسی میں یہ بات ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ پھر میں نے ۸۲ء میں انہیں ایک کھلا خط بھی لکھ دیا تھا۔ نیز ان کی مجلس شوریٰ میں بھی کھڑے ہو کر یہی کہا تھا کہ اگر آپ یہاں الیکشن کا راستہ روکے رکھیں گے تو پھر پاکستان میں دہشت گردی کے لئے جواز خود فراہم کریں گے۔ اسی زمانے میں پی آئی اے کے ہوائی جہاز کے اغوا اور الذوالفقار کی طرف سے اسے کابل لے جانے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ چنانچہ میں نے مجلس شوریٰ کے طور پر یہ تقریر کی تھی کہ جس طرح ہم تنظیم آزادی فلسطین یعنی PLO کی دہشت گردی کو سند جواز دیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا، اسی طرح اگر آپ نے پاکستان میں سیاسی عمل کو روک دیا تو گویا دہشت گردی کو ایک نوع کا جواز مل

جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے "تصریف الآیات" لیکن میں اسے بدل کر "تصریف الکلام" کے الفاظ اختیار کر رہا ہوں کہ ایک بات کو سمجھانے کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ میں بہت سی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے یہی موقف واضح کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ مثلاً کبھی میں نے عرض کیا کہ پاکستان کا باپ تو اسلام ہے لیکن اس کی ماں کی حیثیت انتخابات اور جمہوری عمل کو حاصل ہے۔ چونکہ یہ اسلام کے نعرے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے لہٰذا اس کا باپ اسلام ہے، لیکن یہ بالفعل وجود میں آیا ہے ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے نتیجے میں۔ اسی طرح ایک بات میں یہ کہتا رہا ہوں کہ کسی انسان کا زندہ رہنا اور شے ہے، اس کے تقاضے کچھ اور ہیں، اور اس کا مسلمان بننا کچھ اور معنی رکھتا ہے اور اس کے تقاضے بالکل مختلف ہیں، ان کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔ زندہ رہنے کے لئے ہر انسان کو غذا، پانی اور ہوا چاہئے۔ تینوں میں سے کوئی ایک چیز بھی روک لی جائے تو اس کی جلد یا بدیر موت واقع ہو جائے گی۔ غذا کے بغیر آدمی کئی دن جھیل جائے گا، ممکن ہے ایک شخص دو تین ہفتے بھی جھیل جائے۔ پانی نہ ہو تو اس سے بہت پہلے ہی آدمی کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اگر ہوا رک جائے تو چند منٹوں میں بات ختم ہو جائے گی۔ گویا زندہ رہنے کے لئے اصل تقاضے ہیں غذا، پانی اور ہوا۔ لیکن ایک شخص کا مسلمان بننا اور شے ہے ___ مسلمان بننے کے لئے پہلا تقاضا ہے ایمان۔ اللہ کی ذات پر یقین ہو، کچھ نہ کچھ تو ہو، کم از کم گمان غالب کے درجے میں تو ہو۔ پھر یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے، اللہ کے حضور میں حاضری ہے، جواب دہی ہے، حساب کتاب ہے، جنت و دوزخ ہے۔ کچھ تو خیال ہو کہ ہاں قرآن حق ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ سب نہیں ہے تو انسان مسلمان نہیں بن سکتا۔ اسی طرح پاکستان کے زندہ رہنے کے لئے میں تیسری مثال یہ دیتا رہا ہوں کہ انتخابی عمل دراصل تنفس کے عمل کی طرح ضروری ہے۔ سانس جاری رہے تو آدمی زندہ رہتا ہے۔ الیکشن کے ذریعے گویا بھڑاس نکلتی رہتی ہے۔ بھڑاس کا نکل جانا اسی طرح ضروری ہے جیسے ہمارے سانس کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اخراج ضروری ہے۔ سانس کی آمد و رفت سے ایک انسان کی زندگی ہے، لیکن اس کو اسلام کی طرف لانے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے زندہ رہنے کے

لئے سیاسی عمل اور انتخابات کا جاری رہنا ضروری ہے، لیکن ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے۔

دوسری بات میں یہ کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے اعتبار سے بھی اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے حوالے سے بھی اس ملک میں جیسی بھی لولی لنگڑی اور ٹوٹی پھوٹی جمہوریت ہے اسے بہت غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر آپ اپنے حالات کا سعودی عرب، الجزائر اور ترکی وغیرہ کے ساتھ موازنہ کریں کہ وہاں تو اسلام کے نام پر کوئی جماعت ہی نہیں بن سکتی تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہاں کے حالات کس قدر غنیمت ہیں، اربکان صاحب نے جماعت بنائی تو اس کا نام بھی رفاہ پارٹی یعنی Welfare Party رکھا، کیونکہ وہ اسلام کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ اس پر وہاں آئینی طور پر پابندی ہے۔ انہوں نے صرف ایک قدم اٹھانا چاہا تھا کہ فوج کی طرف سے بھی ڈانٹ آ گئی اور صدر صاحب کی جانب سے بھی تنبیہ آ گئی۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ مسلمان خواتین کے لئے سر ڈھانپنے پر جو پابندی عائد ہے اسے اٹھا لیا جائے، سر ڈھانپنے کو لازم نہیں کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ غور کیجئے کہ دیگر مسلم ممالک میں یہ حالات ہیں اس کے برعکس ہمیں آزادی حاصل ہے، ہم اپنی بات کہہ سکتے ہیں، ہم دوسروں کو ہم خیال بنا سکتے ہیں۔ ہم لوگوں کو جمع کر سکتے ہیں، جماعت بنا سکتے ہیں، اجتماعات کر سکتے ہیں، مظاہرے کر سکتے ہیں۔ ان آزادیوں کے باوجود ہم اقامتِ دین کے لئے جدوجہد نہ کریں تو ہم مجرم ہیں، لیکن ان کاموں پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ جب تک امن و امان میں کوئی خلل نہ ہو، توڑ پھوڑ نہ ہو، مار پٹائی نہ ہو، گھیراؤ اور جلاؤ نہ ہو، اس وقت تک ہمیں پوری آزادی ہے۔ یہ درحقیقت بہت اہم نکتہ ہے۔ عالمی حالات کے تناظر میں ہماری موجودہ جمہوریت بھی جو بہت ناقص ہے، بہت خراب ہے، لولی لنگڑی ہے، ٹوٹی پھوٹی ہے، جو چاہیں آپ اسے کہہ لیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت غنیمت ہے۔

تیسری بات جو میں نے ہمیشہ کہی ہے وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو شے مروج ہے وہ اسلامی جمہوریت تو نہیں ہے، اسے مغربی جمہوریت کا ایک نامکمل اور ادھورا چربہ کہہ لیجئے۔ اسے جو بھی کہیں، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دو مستحکم اور مضبوط پارٹیاں ہوں اور یہاں

Two Party System ہو۔ اب ذرا یاد کیجئے کہ ایک زمانے میں یہاں عوامی سطح پر صرف ایک پارٹی رہ گئی تھی اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ مغربی پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں اسے جو مینڈیٹ ملا اسے ذہن میں تازہ کیجئے۔ کافی عرصے تک میدان میں کوسِ لِمَنِ الْمُلْکُ صرف ایک جماعت بجا رہی تھی' دوسری کوئی جماعت تھی ہی نہیں۔ سب disarray میں تھے' ٹوٹے پھوٹے تھے' گروپوں میں تھے' مسلم لیگ کے ساتھ نامعلوم کتنے لاحقے لگتے تھے۔ کبھی کوئی قاسم گروپ بھی تھا' کنونشن لیگ بھی تھی' کوئی جونیجو لیگ بھی تھی' کوئی اور لیگ بھی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ لیگوں کی گنتی ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف ایک پارٹی اپنا ڈنکا بجا رہی تھی کہ "I am the monarch of all I survey!" ---- اس صورت حال کے نتیجے میں یہاں یک جماعتی آمریت کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے بارہا نواز شریف صاحب کو خراج تحسین پیش کیا ہے' اور اس میں فی الواقع کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت محنت اور بہت مشقت کی اور بڑی جان ماری ہے' بہت سختیاں جھیلی ہیں' جس کے نتیجے میں انہوں نے مسلم لیگ کے اس گروپ کو جو ان کے اپنے نام کے ساتھ مشہور ہوا' واقعتاً ایک زندہ اور فعال جماعت بنا دیا ہے۔ اس کے cadres متعین ہوئے' اس کی قیادت معین ہوئی' اس سے defection بہت کم ہوا۔ لوٹوں والا معاملہ اس دور میں بڑی حد تک ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف نے مسلم لیگ کو ایک زندہ جماعت بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن ۳/ فروری کے انتخابات کے نتائج کی وجہ سے ایک بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی اب اندیشہ یہ ہے کہ یہاں دوبارہ یک جماعتی ڈکٹیٹر شپ نہ قائم ہو جائے۔ بنابریں میری رائے یہ ہے ــــــ کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو ــــــ نیز جمہوری اصول کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پیپلز پارٹی کو از سرِ نو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے تاکہ وہ ایک مضبوط حزبِ اختلاف کا کردار ادا کر سکے۔ ورنہ یہی ہو گا جو اس مشہور مقولے میں کہا گیا ہے کہ :

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely"

مرکز اور پنجاب میں مسلم لیگ کو اتنا بڑا مینڈیٹ ملا ہے کہ دماغ کے خراب ہو جانے کا پورا

امکان موجود ہے۔ چنانچہ Checks and balances کا نظام بہت ضروری ہے۔
میں نے آج پھر دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ واقعہ یہ ہے کہ
میرے نزدیک حزب اختلاف کا رول ادا کرنے کی صلاحیت کی حامل بھی اور حق دار بھی
صرف ایک ہی جماعت ہے' اور وہ ہے پیپلز پارٹی۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہئے
کہ اب اس جماعت کی قیادت کے ضمن میں بھٹو خاندان کا دور ختم ہو گیا ہے' بالکل اسی
طرح جس طرح ہندوستان میں نہرو خاندان کا دور ختم ہوا۔ میرے نزدیک یہ حقیقت بے
نظیر بھٹو صاحبہ کو بہت جلد سمجھ لینی چاہئے۔ فوری طور پر انہیں پیپلز پارٹی کی پارلیمنٹری
گروپ کی قیادت پر برقرار رہتے ہوئے جلد از جلد پارٹی کی سربراہی کی جگہ خالی کرنے کی
فکر کرنی چاہئے۔ اس کی بجائے کیا ہو؟ میرا مشورہ یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے
پرانے ساتھیوں میں سے جو بھی آزاد امیدواروں کی حیثیت سے اسمبلیوں میں آگئے ہیں'
وہ پیپلز پارٹی کو join کریں۔ اسی طرح جو جو باہر ہیں وہ بھی پیپلز پارٹی کو join کریں اور
پارٹی کی قیادت کو اندر سے تبدیل کرنے کی کوشش کریں تاکہ یہ جماعت اپنی جگہ پر ایک
نئی قیادت کے ساتھ ابھر سکے۔ یہ نئی قیادت معراج خالد صاحب کی بھی ہو سکتی ہے اور
ڈاکٹر مبشر حسن صاحب یا چوہدری غلام حسین صاحب کی بھی ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
ذوالفقار علی بھٹو کے مزاج میں جو کجی تھی وہی بے نظیر کے مزاج میں بھی تھی' یعنی آمریت
کی طرف رجحان' دوسروں کو بے عزت کر دینے میں کوئی باک محسوس نہ کرنا' قریب ترین
ساتھیوں سے نہایت حقارت آمیز سلوک کرنا۔ اور کردار کی اس کجی کا نتیجہ ہم سب نے
دیکھ لیا ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ پیپلز پارٹی میں قیادت کے لائق
لوگ تھے ہی نہیں۔ ایسے افراد آئے تھے اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ بھی لائے تھے' خواہ وہ
اسلامی مساوات تھی یا سوشلزم' لیکن معاشی عدل و انصاف کا نعرہ تو تھا اور اس کی یقیناً
ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ایک جماعت کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کا برقرار رہنا
ضروری ہے' اور انہیں دوبارہ میدان میں آنا چاہئے' جیسا کہ معراج خالد صاحب کا بیان
مجھے بہت پسند آیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میں قاضی حسین احمد صاحب سے سو گنا
زیادہ انقلابی ہوں۔ اللہ کرے کہ واقعی ہوں۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ذوالفقار علی بھٹو کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ پاکستان کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ خود اپنی جاگیردارانہ چمڑی سے باہر آتا' جو وہ نہ کر سکا۔ ذرا سوچئے کہ وہ دنیا سے کیا لے گیا؟ کتنی زمین لے گیا؟ کتنی جاگیریں لے گیا؟ کوئی بھی شخص دنیا سے کیا لے جاتا ہے؟ لیکن بہرحال وہ پاکستان کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا' اللہ نے اسے یہ موقع دیا تھا' بالکل اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ نے جنرل ضیاء الحق کو موقع دیا تھا کہ وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا کردار ادا کر سکتا تھا' لیکن نہ کر سکا۔ وہ بھی محرومی کی حالت میں دنیا سے گیا۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کا معاملہ تھا۔ اس طرح پاکستان میں دو آدمیوں کو انقلابی کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ ضیاء الحق کو تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے جوش و خروش کی وجہ سے یہ موقع ملا تھا' یہ موقع ان کا اپنا پیدا کردہ نہیں تھا' اس لئے کہ وہ تو ایک فوجی کی حیثیت سے حکومت پر قابض ہوئے تھے' لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے درجے کو پہنچنے کا موقع یقیناً موجود تھا۔ دوسری طرف بھٹو نے یہ موقع خود create کیا تھا۔ اس نے تحریک چلائی تھی' عوام کو mobilize کیا تھا' ایک ایک دن میں چھ چھ جلسے کئے تھے۔ ایک ایک جلسے میں کئی کئی لاکھ لوگوں کو جمع کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ اس حوالے سے وہ ماؤزے تنگ بن سکتا تھا بشرطیکہ وہ خود اپنی جاگیرداری والی کھلڑی سے باہر آ سکتا۔ چونکہ ملک معراج خالد' ڈاکٹر مبشر حسن صاحب اور ڈاکٹر غلام حسین صاحب میں سے کوئی بھی فیوڈل لارڈ نہیں ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ آگے آ کر اور جمع ہو کر اس پارٹی کو مضبوط اپوزیشن پارٹی کا کردار ادا کرنے کے قابل بنائیں' اور پارٹی کے اصل نعرے یعنی "روٹی' کپڑا اور مکان" کو لے کر چلیں۔ میرے ۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کے اداریے جو اب "پاکستانی سیاست کا پہلا عوامی اور ہنگامی دور" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گئے ہیں' ان میں یہ بات موجود ہے کہ میں نے اس نعرے کو خالص اسلامی قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ کفالتِ عامہ نظامِ خلافت کا لازمی حصہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ ذمہ دار ہو گا۔ لہٰذا یہ اصول تو خلافت راشدہ کا ہے کہ شہریوں کی تمام بنیادی ضروریات (Basic Necessities) پوری ہونا چاہئیں۔ یہ ذمہ داری ریاست کی ہے۔ ایک اور واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ

حضرت عمرؓ کا گزر ایک مقام سے ہوا جہاں ایک بوڑھی عورت اپنی کٹیا میں بیٹھی ہوئی کوس رہی تھی کہ میری ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں تو عمرؓ کو کیا حق ہے حکومت کرنے کا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اماں جان! آخر عمر کو کیا پتا' وہ تو اتنی دور بیٹھا ہے۔ اس پر بڑھیا نے کہا کہ اگر اسے میری تکالیف کا علم نہیں تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق ہے؟ غور کیجئے کہ ایک بڑھیا یہ بات کہہ رہی ہے! عربوں کے اندر بنیادی ذہانت تو بہت تھی۔ اگرچہ وہ فلسفیانہ 'منطقیانہ رنگ میں نہیں تھی لیکن فطرت کی بھی ایک ذہانت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک بڑھیا ہی نے حضرت عمرؓ کو ڈانٹ دیا تھا کہ تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ ہمارے مہر پر کوئی حد لگاؤ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی حد نہیں لگائی۔ ہماری مرضی ہے' ہم اتنے مہر کے اوپر نکاح کریں گی۔ کسی کو غرض ہو تو ہم سے نکاح کرے ورنہ کوئی اور گھر دیکھے۔ تمہیں مہر کی مقدار پر حد لگانے کا کہاں سے حق مل گیا؟۔ اللہ نے اس پر کوئی پابندی لگائی' نہ حضور ﷺ نے لگائی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا کہ "آج ایک بڑھیا نے عمرؓ کو دین سکھایا!"

بہرحال میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ کفالتِ عامہ کا نعرہ غلط نہیں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پارٹی غلط ثابت ہوئی' اس کا لیڈر غلط ثابت ہوا۔ بہرحال اگر پیپلز پارٹی حزبِ اختلاف کا کردار ادا نہ کر سکی تو پھر دوسروں کو کرنا ہو گا' جیسا کہ عمران خان کا بیان آیا ہے کہ خواہ ہم اسمبلیوں میں نہیں ہیں' تاہم باہر رہ کر ایک مضبوط اپوزیشن کا کردار ادا کریں گے۔ ٹھیک ہے' وہ جو کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ لیکن اس وقت واقعہ یہ ہے کہ عمران خان کو ووٹ نہ دے کر اس قوم نے ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی شعور کے اعتبار سے یہ قوم بالغ ہو گئی ہے۔ عمران خان کا معاملہ یہ ہے کہ سیاست میں وہ ایک نووارد آدمی ہے۔ اس نے چالیس برس تک ایک کھلاڑی کے رنگ میں زندگی گزاری۔ اب اچانک اس میں انقلاب آیا ہے۔ ٹھیک ہے' اچھی بات ہے' ابھی پکنے دو (کے آمدی وکے پیر شدی) بہرحال وہ پاکستانی ہے اور اسے بھی حق حاصل ہے کہ وہ سیاست میں حصہ لے اور واقعتاً اگر وہ جاگیرداری کے خلاف مہم چلا سکے تو یہ ایک مثبت کام ہو گا' خصوصاً اس لئے کہ وہ خود جاگیردار نہیں ہے۔ لیکن اس وقت بہرحال ایک مضبوط حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے

کی صلاحیت کی حامل اور اپنا ایک ماضی رکھنے والی اور عوامی سطح پر کچھ نہ کچھ مقبولیت رکھنے والی جماعت صرف پیپلز پارٹی ہے۔

العیاذُ باللّٰہ

اب تک میں نے انتخابی نتائج کا روشن رخ جس پر میں نے "الحمدللہ" کا عنوان قائم کیا تھا' آپ کے سامنے رکھا ہے۔ لیکن اس صورت حال کا ایک تاریک رخ بھی ہے' جس کے لئے میں نے "العیاذ باللّٰہ" کا عنوان قائم کیا ہے۔ یعنی اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات کیا ہے' اسے سمجھنے کے لئے آپ کو بین السطور دیکھنا ہو گا ـــــ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کا احیاء تو ہو گیا ہے' لیکن اسلام کے نعرے کو منہا کرنے کے بعد۔ مسلم لیگ کی انتخابی مہم میں سارا زور اقتصادی خوشحالی' صنعتی ترقی' پاکستان کو ایشیاء کا ٹائیگر بنانے' موٹروے اور اسی طرح کے دوسرے وعدوں پر رہا ہے' اسلام کا سرے سے حوالہ نہیں آیا۔ یہ بہت خوفناک پہلو ہے' اور اس پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو چیز موجود ہے اسے بھی تسلیم کیجئے اور جو نہیں ہے اس کو بھی ماننا چاہئے۔ ہمارا کام یہی ہے کہ سمجھانے اور حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کریں۔ اِس وقت الیکشن کا جو نتیجہ ہمارے سامنے آیا ہے اس کی بنا پر مغرب پرست اور سیکولر عناصر کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ یہ بہت بڑا مینڈیٹ دراصل اسلام اور اسلامی نظام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ انتخابی مہم کے دوران اسلام کا کوئی نعرہ نہیں لگایا گیا' اسلام کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی گئی' لہٰذا انہیں کہنے کا حق حاصل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سیکولر لابی تو یہاں موجود ہے۔ ذرائع ابلاغ پر انہی کا قبضہ ہے' صحافت میں ان کا عمل دخل ہے' خصوصاً انگریزی صحافت پر تو ان کا بلا شرکتِ غیرے قبضہ ہے۔ لہٰذا مغربی تہذیب' مغربی ثقافت' مغربی نظریات' اور سیکولر تصورات کے کھلم کھلا داعی' مبلغ اور ان پر عامل افراد کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ انتخابات کے ذریعے عوامی سطح پر گویا اسلام کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا ہے۔

تاہم یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اس دعویٰ کی مخالفت میں بھی بعض باتیں کہی جا سکتی ہیں' جن

میں سرفہرست یہ ہے کہ عوام کے پاس کوئی حقیقی choice تھا ہی نہیں۔ یہ دراصل "اَھْوَنُ البَلِیَّتَین" کا مسئلہ تھا' یعنی چھوٹی برائی اور بڑی برائی کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ اسلام کا نعرہ لگانے والی کوئی قابل ذکر جماعت انتخابی میدان میں تھی ہی نہیں' کوئی ایسی دینی جماعت جس سے واقعتاً کوئی توقع بھی ہو سکے' اس مرتبہ سامنے تھی ہی نہیں!۔ اصل مقابلہ کن کے درمیان تھا؟ ایک طرف خالص اور کھلم کھلا سیکولرازم تھا جس میں اسلام کا استہزاء اور اسلامی تعزیرات اور حدود کو وحشیانہ قرار دینے والی بات بھی تھی۔ دوسری طرف بھی اگرچہ اسلام کا مثبت طور پر کوئی نعرہ نہیں تھا اور اسلام کے لئے کوئی عزائم ظاہر نہیں کئے گئے لیکن کم از کم سیکولرازم کا واضح اعلان بھی نہیں تھا۔ دوسری بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ عوام مذہبی جماعتوں سے مایوس ہو چکے ہیں اور اس صورت حال میں سب سے بڑا عمل دخل خود ان کی اپنی نااتفاقی اور غلط حکمت عملی کو حاصل ہے' چنانچہ اس ضمن میں عوام موردِ الزام نہیں ہیں بلکہ اصل الزام مذہبی جماعتوں اور خاص طور نیم مذہبی' نیم سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتا ہے۔ لیکن آج کے "نوائے وقت" میں ہندوستان کے انگریزی اخبارات کے جو بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہندوستان کے تمام اخبارات اس بات پر بغلیں بجا رہے ہیں کہ پاکستان میں اسلام اور مولوی ناکام ہو گئے' فنڈامنٹلزم فیل ہو گیا اور پاکستان کے عوام نے سیکولرازم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہوتی ہے کہ ع سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا! ہم چاہے اس کی کوئی تاویل کرلیں یا عذر اور بہانے تراش لیں' لیکن واضح رہنا چاہئے کہ لوگوں کے سامنے یہ حقیقت اس انداز سے آئی ہے کہ انہوں نے اس کا احساس و ادراک کیا ہے' اس کا چرچا ہوا ہے اور لوگوں نے اس پر خوشیاں منائی ہیں۔ اس لئے کہ یہ درحقیقت نظریہ پاکستان کی نفی ہے۔ ۱۹۷۱ء کے سانحہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ہندوستان کی قیادت اور وہاں کی صحافت نے یہ کہا تھا کہ "دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ بعد میں یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ فوری طور پر تو یہی صورت سامنے آئی تھی اور بنگلہ دیش کے پہلے وزیر خارجہ بننے والے ڈاکٹر کمال صاحب نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگرچہ اس وقت پوری دنیا میں سب سے زیادہ

مسلمان ہمارے ملک میں آباد ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ایک "مسلمان ملک" کہلانا پسند نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مشرقی پاکستان کا نام بدل کر بنگلہ دیش رکھ لیا۔ لیکن بعد میں، خواہ خود بھارت ہی کی تنگ نظری اور تنگ دلی اس کا باعث بنی ہو، وہاں وہ کیفیت برقرار نہیں رہی۔ اگر خدانخواستہ بنگلہ دیش بھارت میں مدغم ہو گیا ہوتا یا اگر بھارت نے اتنی وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کیا ہوتا کہ وہ بہار سے مشرقی پاکستان جانے والے بہاریوں کو واپس لینے پر تیار ہو جاتا تو شاید واقعتاً کم از کم بنگلہ دیش کی حد تک دو قومی نظریہ ختم ہو جاتا۔ لیکن وہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت بھارت میں بھی اسی طرح کی خوشی منائی جا رہی ہے کہ اس ملک میں اسلام کے سرے سے کسی بھی حوالے کے بغیر اتنا massive mandate ایک جماعت کو ملا ہے۔ پوری ملت اسلامیہ پاکستان کے لئے بالعموم اور خود جناب نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے لئے بالخصوص یہ بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے۔ اور صرف لمحہ فکریہ ہی نہیں بہت بڑی آزمائش، بہت بڑا ابتلاء اور بہت بڑا امتحان ہے۔

موجودہ صورتحال اور قرآن حکیم کی رہنمائی

اس معاملے کی خاص دینی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لئے میں نے سورۃ الانبیاء کے آخر سے آیات تلاوت کی ہیں۔ دیکھئے ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں۔ جس طرح میں نے اس الیکشن کے نتائج کے دو رخ آپ کے سامنے رکھے ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہیں، اسی طرح کا معاملہ ہے جو ان آیات سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان آیات کی طرف اس حوالے سے میرا ذہن پہلے کبھی منتقل نہیں ہوا تھا، اگرچہ اصولاً میں یہ نکتہ اپنی تقاریر میں بیان کرتا رہا ہوں کہ نبوت اگرچہ اپنی جگہ رحمت ہے لیکن ایک پہلو سے لوگوں کے لئے بہت بڑے نقصان کا ذریعہ بھی رہی ہے، یہ اس لئے کہ اگر وہ رسول کی دعوت قبول کر لیتے تو نبوت و رسالت ان کے لئے رحمت عظیمہ ثابت ہوتی، لیکن جب رد کر دیا تو "عذابِ اکبر" یعنی عذاب استیصال کا سبب ثابت ہوئی۔ جب تک رسول نہیں آیا تھا تو ان کے لئے گویا ڈھیل تھی۔ "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا" (ہم

عذاب نہیں بھیجتے رہے جب تک کہ کسی رسول کو نہ بھیجیں) لیکن جب رسول آگیا تو اب کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ لہٰذا نبوت و رسالت اپنی جگہ تو رحمت ہے کہ جو لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں وہ بچ جائیں گے' لیکن باقی لوگوں کے لئے جو نرمی یا رعایت تھی وہ رسول کے آنے کے بعد ختم ہو گئی' اگر وہ اب بھی کفر پر قائم رہیں تو عذابِ الٰہی میں کوئی تاخیر نہیں ہو گی' اب کوئی مزید مہلت نہیں ملے گی' اب کوئی مزید نرمی نہیں ہو گی۔ یہ وہ بات ہے جو یہاں کہی گئی : "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" "اے نبیؐ ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر" یہ فی نفسہٖ رسالتِ محمدیؐ کا مقام و مرتبہ ہے۔ لیکن اب دوسرا پہلو دیکھئے۔ فرمایا :

﴿ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

"اے نبیؐ کہہ دیجئے! مجھ پر یہ بات وحی کی گئی ہے کہ تمہارا اللہ (تمہارا معبود' مطاع' حاکم مطلق) صرف ایک ہی ہے (اور وہ اللہ ہے۔) تو فرمانبرداری اختیار کرتے ہو کہ نہیں؟"

اب وہ فیصلے کی گھڑی آگئی ہے۔ رسالت آگئی ہے' چاہو تو اسے اپنے لئے رحمت بنالو اور چاہو تو اپنے آپ کو آخری عذابِ استیصال کا مستحق بنالو۔ ان دونوں آیات کا باہمی ربط ایک مرتبہ پھر دیکھئے :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

مسلمان ہوتے ہو یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اسلام انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی۔ جیسا کہ فرمایا گیا : "اُدْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً" "اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔ جزوی فرمانبرداری تو اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ اللہ کو صرف خالص دین مطلوب ہے۔ اطاعت کلیتاً اسی کی ہو "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ" اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کے لئے خالص کر دو پوری طرح یکسو ہو کر۔ اگلی آیت میں فرمایا : فَاِنْ تَوَلَّوْا "پھر (اے نبیؐ) اگر یہ روگردانی کریں"۔ ان

آخری آزمائش کی گھڑی میں ناکام ہو جائیں' فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَاءٍ "تو کہہ دیجئے کہ میں نے تو ڈنکے کی چوٹ تمہیں بات سنادی ہے"۔ تمہارے کان کھول دیئے ہیں' انذار کا حق ادا کر دیا ہے۔ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کر دیا ہے۔ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ۔ اب تم نے روگردانی کی ہے تو عذابِ الٰہی آکر رہے گا۔ ہاں! یہ میں نہیں جانتا کہ آیا وہ بالکل سر پر آگیا ہے یا ابھی کچھ فاصلے پر ہے۔ مجھے اس کا علم حاصل نہیں ہے۔ "میں یہ نہیں جانتا کہ وہ (عذاب) قریب آچکا ہے جس کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے یا ابھی دور ہے"۔ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ○ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر ہمارے حالات پر منطبق ہوتی ہے۔ مکے میں جو کفار تھے وہ اپنے کفر کو چھپاتے تو نہیں تھے۔ مدینے میں تو منافق پیدا ہو گئے تھے جو اپنے کفر کو چھپاتے تھے' دلوں میں کچھ اور تھا اور ظاہر کچھ اور کرتے تھے۔ لیکن مکہ میں تو یہ صورت نہیں تھی۔ البتہ آج ہمارے ہاں یہ معاملہ بھی کسی حد تک موجود ہے کہ نام مسلمانوں کے سے ہیں لیکن نہ اللہ پر یقین ہے نہ دین پر عمل ہے۔ اللہ کی فرمانبرداری نہ ذاتی سطح پر ہے اور نہ اجتماعی سطح پر۔ اس حوالے سے اس آیت پر غور کیجئے : إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ یعنی "اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم برملا کہتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو"۔ پھر نوٹ کیجئے کہ کفارِ مکہ پر تو یہ آیت راست آتی ہی نہیں' وہ چھپاتے تو نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے وہ اپنے دل میں مانتے تھے کہ محمد (ﷺ) جھوٹے نہیں ہیں۔ وہ دلوں میں تو قائل ہو گئے تھے لیکن سرِعام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس انداز میں تو کہا جا سکتا ہے کہ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ' جیسے ولید بن مغیرہ قائل ہو گیا تھا کہ قرآن نہ کسی ساحر کا کلام ہے نہ شاعر کا اور نہ کاہن کا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ میں بہت سے کاہنوں سے واقف ہوں' ان کا کلام میں جانتا ہوں' بہت سے شعراء سے بھی میری دوستی ہے' میں جانتا ہوں کہ شعر کسے کہتے ہیں' میں شاعری کے معیار کو پرکھ سکتا ہوں' میں ساحروں کو بھی جانتا ہوں اور سحر سے بھی واقف ہوں۔ یہ قرآن نہ شاعری ہے' نہ ساحری ہے' نہ کہانت ہے۔ گویا وہ حق بات تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن پھر سیادت' قیادت' چودھراہٹ یہ چیزیں قبولِ حق میں رکاوٹ بن گئیں

"مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" - دنیا کی دوستیاں تھیں، مفادات تھے جو بیڑی بن کر پاؤں میں پڑ گئے، اور وہ اسلام لانے سے محروم رہ گیا۔

بہرحال اس کے بعد کی آیت خاص طور پر ہماری موجودہ صورت حال پر منطبق ہوتی ہے : "وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ" "اور میں نہیں جانتا، ہو سکتا ہے کہ یہ ابھی تمہارے لئے ایک مزید آزمائش ہو اور خاص وقت معین تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں مزید مہلت دے دی ہو۔ یہ آیت نواز شریف صاحب پر صد فیصد منطبق ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کے عنوان کے تحت دو تہائی اکثریت حاصل ہوئی تھی، لیکن اس دور میں انہوں نے تین عظیم ترین گناہوں کا ارتکاب کیا۔ میں نے پچھلے سال ۲۱/ اپریل کو یوم اقبال کی تقریر میں کہا تھا کہ اگر نواز شریف صاحب ان تین گناہوں پر استغفار کریں، اللہ سے اور قوم سے معافی مانگیں تو تمام مذہبی عناصر کو ان کا ساتھ دینا چاہئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہئے۔ لیکن مذہبی عناصر کی طرف سے تعاون کی شرط صرف یہی ہونی چاہئے کہ نواز شریف صاحب وعدہ کریں کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ ایک اعتبار سے اچھا ہوا ہے کہ ایک مستحکم حکومت قائم ہو گی، کام آگے چل سکے گا، صنعتی ترقی ہو گی، معیشت میں بہتری ہو گی۔ یہ سب چیزیں اپنی جگہ پر ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان اسی لئے وجود میں آیا تھا؟ کیا پاکستان کا اصل نصب العین یہی تھا؟ جان لیجئے کہ اگر اسلام کی طرف پیش رفت نہیں ہوتی تو خواہ کتنی ہی خوشحالی ہو جائے، کتنی ہی Industrialization ہو جائے، ہماری قوم ورلڈ بینک کی غلام ہی رہے گی، آئی ایم ایف کے بوٹ تلے ہی رہے گی، اور دنیا میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ جس کو واقعتاً ایک آزاد حکومت اور صحیح معنوں میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی حکومت کہتے ہیں، جو برابری کے سطح پر اقوام عالم کے ساتھ گفتگو کرنے کی پوزیشن میں ہو، وہ مقام اس طرح نہیں مل سکتا، بلکہ صرف اسلام کی بدولت حاصل ہو گا۔ آپ اسلام کے بغیر بھی جی سکتے ہیں لیکن غلامی کی حالت میں۔ آخر غلام بھی تو زندہ رہتا ہے۔ وہ مریض بھی تو بظاہر زندہ ہوتا ہے جسے آج کل مشینوں کے ذریعے مصنوعی طور پر زندہ رکھا جاتا ہے، اور اگر ان مشینوں کا پلگ نکال دیں تو وہ مر جاتا ہے۔ اگر قوم کو اس طرح کی زندگی چاہئے

تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ایسی زندگی چاہئے جو باعزت اور باوقار ہو' جس کے لئے خواب دیکھے گئے تھے' تو وہ صرف اسلام کے ذریعے مل سکتی ہے۔

نواز شریف صاحب کا پہلا گناہ یہ تھا کہ انہوں نے نفاذِ شریعت آرڈیننس میں' جو بعد میں ایکٹ بنا' سود کو جاری رکھنے کا اعلان کیا' جو گویا اللہ اور رسول ؐ کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے۔

ثانیاً یہ کہ انہوں نے دستور میں ترمیم لانے کا وعدہ کیا کہ چند دنوں کے اندر اندر کتاب و سنت کی کی مکمل بالادستی قائم کرنے کے لئے آئین میں ترمیم آجائے گی۔ لیکن یہ وعدہ شرمندۂ تعمیل نہیں ہوا۔

ثالثاً انہوں نے فیڈرل شریعت کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف جس میں بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دیا گیا تھا' اپیل نہ کرنے کے وعدے کے باوجود اپیل دائر کردی۔ اس طرح یہ معاملہ سرد خانے کی نذر ہو گیا اور آج کچھ علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔

یہ نواز شریف صاحب کے تین گناہ عظیم ہیں جو انہوں نے گزشتہ دور میں کئے۔ اب انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع دیا ہے : وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔ یہ بہت بڑا امتحان اور بہت بڑی آزمائش ہے۔ ایک بہت بڑا ابتلاء اور بہت بڑا فتنہ ہے۔ فتنہ کے معنی اردو میں کچھ اور ہوتے ہیں' لیکن عربی میں اس کا اصل مفہوم "کسوٹی" ہے۔ یعنی وہ شے جو کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کردے۔ یعنی آزمائش' امتحان' ابتلاء۔ اسی معنی میں یہ لفظ "فتنہ" اس آیت مبارکہ میں آیا ہے۔ گویا ابھی تمہیں زندہ رہنے کے لئے کچھ مہلت اور دی جارہی ہے اور مزید موقع عطا کیا جارہا ہے۔ بہرحال پہلی مرتبہ نواز شریف صاحب نے جو جرم کئے تھے' ان کا نتیجہ بھی سامنے آگیا تھا کہ "بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے!" کہاں دو تہائی اکثریت رکھنے والی آئی جے آئی (IJI) اور کہاں وہ حشر جو بالآخر ہوا۔ اور اب بھی جان لیجئے کہ پہلے سے بدتر انجام بھی سامنے آسکتا ہے۔ اس ضمن میں مجھے جگر کے دو اشعار بہت پسند ہیں۔

سکوتِ لالہ و گل پر نہ جانا
اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے

کہ انجام کا مارا ہوا دل
ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے

فی الحال تو لوگ دبک گئے ہیں' منقار زیرِ پر ہو گئے ہیں۔ خواہ وہ بے نظیر ہو یا قاضی صاحب ہوں' خواہ کوئی اور ہو۔ بہرحال آغاز ہوتا ہے تو جشن منائے جاتے ہیں۔ جیسی سلامی کبھی بے نظیر صاحبہ کو ملی تھی ایسی ہی سلامی ان کو بھی ملے گی۔ پہلے بھی ایک دفعہ مل چکی ہے۔ اقتدار کا بڑا جشن ہوتا ہے' بڑا سرور اور نشہ ہوتا ہے' اس کی اپنی کیفیات ہیں' لیکن انجام کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لیکن یاد رہنا چاہئے کہ کیا حشر ہوا تھا بھٹو کا' کیا انجام ہوا تھا جیب کا اور اب کیا حال ہو گیا ہے بے نظیر کا۔ پورے بھٹو خاندان کا کیا معاملہ ہو گیا ہے۔ مَردوں کا تو نام و نشان بھی نہ رہا' اب تو صرف بیوائیں ہیں' خواہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیوہ ہو خواہ مرتضیٰ بھٹو کی۔ انسان کو یہ باتیں اچھی طرح طرح جان لینا چاہیں اور "عشرتِ آغاز" سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نواز شریف صاحب کو اس سے اپنے امان میں رکھے' ہم صرف دعا کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک بات مزید قابلِ غور ہے۔ نواز شریف صاحب اور ان کے برادر خورد شہباز شریف صاحب' جو اَب پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیں' ان دونوں سے بعض ایسی چیزیں ثابت ہیں جن میں انہوں نے مغرب کو یا نیو ورلڈ آرڈر کو appease کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ نواز شریف صاحب کا ایک بیان آیا تھا کہ "میں فنڈا منٹلسٹ نہیں ہوں"۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ بات کس کو خوش کرنے کے لئے کہی گئی تھی۔ اسی طرح چند سال پہلے مین ہٹن (امریکہ) میں میونسپل کارپوریشن کے ہال میں تقریر کرتے ہوئے شہباز شریف صاحب نے یہ کہا تھا کہ اگر ہمیں اقتدار میں نہ آنے دیا گیا تو پاکستان میں فنڈامینٹلزم کو تقویت حاصل ہو جائے گی۔ یعنی اگر آپ پاکستان سے فنڈامینٹلزم کا جنازہ نکالنا چاہتے ہیں تو ہمیں خدمت کا موقع دیجئے۔ اس ضمن میں تیسری بات مجھے حال ہی میں پاکستان کے ایک بڑے مشہور صحافی کے ذریعے معلوم ہوئی ہے جنہوں نے نواز شریف صاحب کی انتخابی مہم میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ وہ یہ کہ اسی نوع کا ایک مضمون لکھوا کر نیویارک ٹائمز میں چھپوایا گیا' جس میں اپنے اوپر سے فنڈامینٹلزم کی تہمت اتارنے کی

بات کی گئی۔ گویا وہاں سے لائن کلیئر کا سگنل یا N.O.C حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ تین چیزیں ریکارڈ پر ہیں۔ ان صاحب نے اگرچہ نواز شریف صاحب کا بھرپور ساتھ دیا ہے لیکن الحمدللہ کہ ان میں اتنی حمیت دینی موجود تھی کہ جب ان سے اس مضمون کا اردو ترجمہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر تو یہ محض وقتی حکمت عملی کے طور پر تھا کہ ایک دفعہ اقتدار میں آ تو جائیں، پھر نمٹ لیں گے (اور اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو) تو اب انہیں واضح طور پر اس سے اعلانِ براءت کر دینا چاہئے۔ میں نے امریکہ میں اپنے ساتھیوں اور اپنے ہم خیال لوگوں سے کہا تھا کہ آپ اپنی کاروں کے بمپرز پر یہ سٹکر لگائیں کہ "We are Fundamentalists but not Terrorists" یعنی "ہم بنیاد پرست تو لازماً ہیں، لیکن دہشت گرد ہرگز نہیں"۔ ہمارے خلاف دہشت گردی کی تہمت غلط ہے۔ میرے نزدیک جو شخص مسلم فنڈامینٹلسٹ نہیں وہ مسلمان ہی نہیں۔ اگر آپ اسلام کی بنیادوں (Fundamentals of Islam) کو مضبوطی سے تھامے ہوئے نہیں ہیں تو پھر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟ فنڈامینٹلسٹ وہی ہوتا ہے جو کچھ بنیادی اصولوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اور ان اصولوں پر کسی سودے بازی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ تو ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ ہم تو فنڈامینٹلسٹ ہیں۔ تاہم یہ توفیق دنیا کے مسلمان حکمرانوں میں سے صرف ایک ہی شخص (ڈاکٹر مہاتیر محمد، وزیر اعظم ملائشیا) کو ملی تھی، جو اگرچہ فی الواقع حقیقی معنوں میں بنیاد پرست نہیں ہے، لیکن اس نے امریکہ کی ضد میں برملا یہ کہا تھا کہ "Yes, We are Fundamentalists!" حالانکہ وہ خاصا لبرل اور مغربی ذہن کا آدمی ہے۔ بہرحال میرے نزدیک اگر تو یہ محض وقتی حیلے تھے تو بھی ان سے اعلان براءت کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک قائد اعظم کا وہ جملہ بھی ایک وقتی حیلہ ہی تھا جو انہوں نے قیام پاکستان کے بعد کہا تھا کہ "اس ملک میں نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے گا اور نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا۔ یہ بات میں مذہبی اعتبار سے نہیں، بلکہ سیاسی اعتبار سے کہہ رہا ہوں، اس لئے کہ مذہب تو ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہوتا ہے"۔ گویا سیاسی اعتبار سے یہاں تمام مذاہب کے ماننے والے یکساں حیثیت کے حامل ہوں گے۔ قائد اعظم

نے سوچا ہو گا کہ اگر ہم نے پاکستان بنتے ہی ابھی سے اسلام کا او نچا ڈنکا بجا دیا تو پوری دنیا ہماری دشمن ہو جائے گی' لہٰذا اس وقت جبکہ مسلمان اکثریت کا ملک بن چکا ہے تو خواہ مخواہ دنیا کی دشمنی کیوں مول لی جائے۔ سیکولرزم کے اصول کے تحت بھی تو یہاں اکثریت کی بات ہی چلے گی۔ اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو تا تو وہاں اکثریت ہندو کی ہوتی' لہٰذا وہاں سیکولرزم کے اصول کے تحت اسلام کی کسی بات کا آنا ناممکن تھا۔ اب ایک ایسا ملک وجود میں آچکا ہے جہاں عظیم اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اگر واقعتاً مسلمان چاہیں کہ یہاں اسلام آئے تو اسے کون روک سکتا ہے؟ چنانچہ ہم خواہ مخواہ اسلام کا ڈنکا بجا کر دنیا کو ہوشیار اور خبردار کیوں کریں؟ جیسا کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد دنیا خبردار ہو گئی تھی ؎

نعرہ زن عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

بہرحال اب جبکہ نواز شریف صاحب اس ملک کے عوام کی فیصلہ کن حمایت سے برسراقتدار آگئے ہیں تو انہیں ڈنکے کی چوٹ اسلام کی طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ میں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے ملک کے عوام میں بے انتہا جذبہ ابھرے گا۔ لیکن اگر یہ ایسا نہیں کریں گے تو جو جذبہ اس وقت سامنے آیا ہے وہ تو عارضی اور وقتی سا ہے' جس کے ٹھنڈا پڑ جانے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ بے نظیر صاحبہ بھی اسی امید پر سیاسی میدان میں ڈٹی ہوئی ہیں کہ موجودہ وقتی سے جوش کے ٹھنڈے پڑتے ہی انہیں عوام کی دوبارہ حمایت حاصل ہو جائے گی۔ اسلام اور اسلام کے عدلِ اجتماعی کی طرف پیش رفت میں ایک اہم چیز جاگیرداری کا خاتمہ ہے۔ اگر آپ اس ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ نہیں کر سکتے تو ملک کے معاشی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ نواز شریف صاحب کی مسلم لیگ ایک ایسی جماعت ہے جس میں جاگیرداروں کا عمل دخل بہت کم ہے اور یہ اصلاً ایک urban support والی جماعت کی حیثیت سے سامنے آئی ہے' جس کی اصل ریڑھ کی ہڈی صنعت کار اور کاروباری حلقہ ہے۔ اس کے برعکس پیپلز پارٹی نے زیادہ اعتماد جاگیرداروں پر کیا تھا اور ایک زمانے میں یہ

polarization ہو گئی تھی کہ جاگیردار اور بڑے زمیندار پیپلز پارٹی میں تھے' جبکہ صنعت کار' کاروباری حلقہ اور شہروں میں بسنے والے لوگ نواز شریف کے حمایتی تھے۔ تو اگر جاگیرداری پر کوئی ضرب اس وقت بھی نہ لگائی گئی تو پھر کب لگے گی؟

مشورے

نئی حکومت کے لئے میرے بعض معین مشورے بھی ہیں جنہیں میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں بھی چند باتیں تمہید اً کہہ دینا چاہتا ہوں' اس لئے کہ میرے بعض ساتھی اور عام احباب بھی یہ کہتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ مشورے دیتے رہتے ہیں' ان کا کوئی فائدہ تو ہے نہیں' کوئی سنتا تو ہے نہیں۔ دیکھئے اس میں اولاً تو میرا احساس فرض ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تین کام تمہیں بہرحال کرنے ہیں۔ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کے مطابق یہ تو ہمارا فرض منصبی ہے جو ہمیں مسلسل کرتے رہنا ہے۔ یعنی بغیر کسی لالچ کے' بغیر کسی اجر اور اجرت کے بھلائی کی دعوت دینا۔ اچھے کاموں کا مشورہ دینا' جہاں اختیار ہو وہاں حکم دینا اور جہاں اختیار نہیں ہے وہاں مشورہ دینا۔ تیسرا کام ہے برائی سے روکنا۔ اگر طاقت نہیں ہے تو باللسان تو روکئے' زبان سے تو روکئے۔

ثانیاً یہ کہ ایک حدیث نبوی ؐ میں نے آپ کو شروع میں اسی مقصد کے لئے سنائی تھی۔ حضرت تمیم بن اوس الداری ؓ اس کے راوی ہیں۔ اس روایت کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں' آج اسے پھر ضرورت کے تحت دہرا رہا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" دین تو نام ہے وفاداری اور اخلاص کا۔ "قُلْنَا لِمَنْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟" ہم نے عرض کیا کس کی وفاداری؟ کس سے نصح و اخلاص؟ فرمایا: "لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ"

اربعین نووی ؒ کی اس حدیث پر کئی مرتبہ تفصیلاً گفتگو ہو چکی ہے۔ آج اشارہ یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس حدیث میں عوام یعنی عامۃ المسلمین سے پہلے ان کے قائدین یعنی ائمۃ

المسلمین کو لایا گیا ہے' یعنی جن کے ہاتھ میں کسی بھی وجہ سے ملک اور قوم کی تقدیر آگئی ہے' خواہ وہ آپ کو پسند ہوں یا ناپسند ہوں۔ ان کی چھوٹی سی غلطی پورے ملک وملت کے لئے منفی اثرات کا سبب بنتی ہے اور ان کے ہاتھوں کوئی چھوٹا سا مثبت کام بھی ہو جائے تو اس سے پورے ملک وملت کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس معاملے میں پسند یا ناپسند کا کوئی سوال آڑے نہیں آنا چاہئے۔ یہ بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارا موجود نظام باطل ہے' اس میں کوئی شک نہیں' لیکن یہ قوم قانوناً بہرحال مسلمان قوم ہے۔ اس وقت پوری امتِ مسلمہ نظامِ کفر کے تحت زندگی گزار رہی ہے۔ کسی ایک آدھ ملک میں تھوڑا بہت استثناء ہے جہاں شریعت کی جزوی تنفیذ ہو رہی ہے' ورنہ باقی تو تمام مسلم دنیا میں کھلم کھلا نظامِ کفر ہی کا غلبہ ہے۔ اس کے باوجود قانوناً تو سب مسلمان ہی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم پر ان کا حق ہے۔ حدیث کی رُو سے ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں' وہ شخص حقیقی مؤمن ہے یا نہیں ہے' شریعت پر عملاً کاربند ہے یا نہیں ہے یہ معاملہ چھوڑ دیجئے۔ اسی طرح جو بھی ائمۃ المسلمین ہوں' ہمارے لئے لازم ہے کہ ذاتی پسند یا ناپسند سے ماوراء ہو کر انہیں صحیح مشورے دیتے رہیں۔ یہ ہمارا فرض عین ہے۔

اس ضمن میں ایک حوالہ اور دینا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبال مرحوم نے جمعیت شُبّان المسلمین کے نام سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو جماعت قائم کرنے کی کوشش کی تھی اس کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ ہم الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے' لیکن مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کو بھی مشورے دیتے رہیں گے اور مسلمانوں کو بھی مشورے دیں گے۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ جب سے میں نے اپنی آزاد حیثیت میں کام کا آغاز کیا تھا اس وقت سے آج تک میں اسی موقف پر قائم ہوں۔ میں ۶۸۔۱۹۶۷ء کی بات کر رہا ہوں جب پاکستان پیپلز پارٹی ابھی تشکیل کے مرحلے میں تھی' اُس وقت ڈاکٹر مبشر حسن صاحب' حنیف رامے صاحب' عبداللہ ملک صاحب اور ایک صاحب جو پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت میں ہوتے تھے' شاید اب بھی ہیں' ان کا نام بھول رہا ہوں' ان سب نے اس خیال سے ایک حلقہ بنایا تھا کہ ایوب خان کے اقتدار اور آمریت کا دور طویل سے طویل تر ہوتا چلا جا رہا ہے' اور ملک میں شدید گھٹن کی فضا ہے' لہٰذا کچھ لوگوں کو جمع کیا

جائے اور کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اُس وقت تک ذوالفقار علی بھٹو ابھی میدان میں نہیں آیا تھا۔ اس وقت یہ لوگ سوچ رہے تھے اور انہوں نے مجھ سے بھی رابطہ کیا تھا۔ دو مرتبہ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کرشن نگر میں میرے کلینک پر آئے۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ میں نے اپنی ترجیحات طے کی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنا مضمون "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" ان کو دیا۔ انہوں نے کہا کہ تم طالب علمی کے دور میں لیڈر رہے ہو' اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم اعلیٰ رہے ہو' ہمارے پاس آجاؤ تاکہ طلبہ کے اندر اس کام کو promote کیا جاسکے۔ میں نے جواباً کہا : نہیں! ہر شخص کی ترجیحات ہوتی ہیں اور میں اپنی ترجیحات طے کرچکا ہوں' میں نے اپنے آپ کو مختص کرلیا ہے' میں اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی اطمینان حاصل ہے کہ چونکہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے' لہٰذا میں بالواسطہ ملک کی بھی خدمت کررہا ہوں۔ ہماری قومیت کی بنیاد بھی اسلام پر ہے' لہٰذا بالواسطہ میں قومی خدمت بھی کررہا ہوں۔ لیکن میری priority اور براہ راست جو کام مجھے کرنا ہے وہ اسلام کا کام ہے۔ جیسا کہ حفیظ جالندھری نے کہا تھا ؎

کیا فردوسیؒ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں اسلام کو زندہ

بہرحال جمعیت شبان المسلمین ہند کا بھی یہی موقف تھا کہ ہم سیاسی مشورے دیں گے' تبصرے کریں گے' تجزیے کریں گے' لیکن انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ میں بھی اسی پر عمل پیرا ہوں۔

اس تمہید کے بعد نئی حکومت کے لئے میرے مشوروں کو نوٹ کیجئے۔ یہ بھی تین سطحوں پر ہیں۔ سب سے پہلے خالص دینی اور اساسی و بنیادی نوعیت کے مشورے ہیں' اور جو تحریک پاکستان کا منطقی نتیجہ بھی ہیں' ان میں سرفہرست ہے دستور میں ترمیم کا معاملہ جس کے لئے ان کے پاس پوری قوت موجود ہے' یعنی دو تہائی اکثریت انہیں حاصل ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کردی ہے۔

(ا) دستور میں چار نکاتی ترمیم

اس ضمن میں اولاً یہ کہ "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً" کے مصداق ہر سطح پر

قرآن و سنت کی کامل اور بلا استثناء بالادستی کے لئے آئین میں ترمیم کی جائے۔ یعنی

No legislation can be done in Pakistan at any level, whether federal, or provincial or district or union council level, which may be repugnant to the Quran and the Sunnah

یہ پہلا کرنے کا کام ہے جس کا انہوں نے گزشتہ دور میں وعدہ بھی کیا تھا جو اس وقت تو ایفا نہ ہو سکا' لیکن اب پورا ہونا چاہئے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو گویا ہمارا اللہ کے خلاف بغاوت کا عمل جاری رہے گا۔ یہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کا بنیادی تقاضا ہے' جس میں فرمایا گیا :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

دوسری ترمیم یہ ہونی چاہئے کہ قراردادِ مقاصد کے منافی جتنی شقیں دستور میں ہیں ان سب کو یا تو دستور سے خارج کیا جائے یا قراردادِ مقاصد کے تابع کر دیا جائے۔ ورنہ ضیاء الحق صاحب دستور میں جو ابہام چھوڑ گئے تھے اس کے نتیجے میں ہمارا دستور تضادات کا مجموعہ بنا رہے گا۔ یعنی دستور پاکستان میں قرارداد مقاصد بھی شامل ہے' اور اس قرارداد مقاصد کے تقاضوں کے منافی دفعات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دستور کو پوری طرح کھنگال لیا جائے اور اس میں قرارداد مقاصد سے متصادم کوئی چیز موجود ہے تو اسے خارج کیا جائے یا قرارداد مقاصد کے تابع کیا جائے۔

تیسرا دستوری نکتہ یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ کا درجہ بلند کیا جائے' اور اس کے Judges کی شرائط ملازمت وغیرہ کو کم از کم ہائی کورٹ کے ججوں کی سطح پر لایا جائے۔ یہ صورت ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے جج کو سرکاری ملازم کی حیثیت سے جب چاہا رکھ لیا' جب چاہا نکال دیا۔ اس طرح تو یہ ایک تیسرے درجے کا ادارہ بن کر رہ جاتا ہے' جو حکومت کا ایک محکمہ بن جاتا ہے' عدالت نہیں رہتی۔

اس سلسلے کا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ ضیاء الحق صاحب نے جب فیڈرل شریعت کورٹ قائم کی تھی تو اس کو دو بیڑیاں اور دو ہتھکڑیاں بھی پہنا دی تھیں۔ ایک یہ کہ دستورِ پاکستان اس کے دائرہ اختیار سے ماوراء ہے۔ دوسرے یہ کہ عدالتی قوانین (Judicial Laws) اس سے ماوراء ہیں۔ تیسرے عائلی قوانین اور چوتھے مالی معاملات بھی اس سے ماوراء ہیں۔ یہ چوتھی ہتھکڑی دس سال کے لئے تھی جو اَب کھل چکی ہے۔ اسی لئے فیڈرل شریعت کورٹ نے بینک کے interest کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ پر عائد بقیہ پابندیاں بھی ختم کی جائیں۔ میں یہ بات ڈنکے کی چوٹ کہتا آرہا ہوں کہ ان چار پابندیوں کے بعد پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ پرسنل لاز میں سے انتہائی بنیادی اہمیت کے حامل عائلی قوانین بھی اس شریعت کورٹ کے دائرے سے باہر رکھے گئے۔ آج کے دور کا اہم ترین پہلو معاشی ہے' وہ بھی اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ سیاسی سطح پر اہم ترین دستاویز دستور ہے۔ لیکن وہ بھی اس کورٹ کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اس کے بعد عدلیہ ہے' اس کے Procedural Laws اگر شریعت سے متصادم ہیں تو ہوا کریں' شریعت کورٹ ان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تو باقی رہ کیا گیا؟ میرے نزدیک فیڈرل شریعت کورٹ کا قیام ایک مثبت قدم تھا' لیکن فی الواقع اس کی حیثیت exercise in futility کی رہ گئی تھی۔ یعنی وقت لگتا رہا' مقدمے قائم ہوتے رہے' بعض کے فیصلے بھی ہوتے رہے' لیکن ان کی ہمارے معاشرے میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ویسے عدالتی قوانین (Judicial Laws) کے بارے میں میرا گمان غالب ہے کہ یہ سب کے سب کتاب و سنت کے مطابق ہیں۔ یہ سارے اصول محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے دیئے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک فریق کی بات سن کر فیصلہ نہ کرو' یعنی جب تک کہ فریق ثانی کا موقف بھی نہ سن لو۔ اسی طرح یہ اصول کہ سو مجرم چھوٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں' لیکن ایک بھی بے گناہ کو سزا نہیں ملنی چاہئے۔ اور یہ کہ شک کا فائدہ ملزم کو پہنچنا چاہئے' نہ کہ شک کو اس کے خلاف استعمال کیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا: "اِدرَؤُا الحَدودَ عَنِ المُسلِمِین" یعنی اگر کوئی صورت مسلمان کے بری ہونے کی ہے تو

خوامخواہ حدود و تعزیرات کے نفاذ کا شوق پورا نہ کرو تو یہ سارے اصول جو آج کی عدالتی دنیا میں معروف' مسلّم اور تسلیم شدہ ہیں' یہ سب کے سب رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ ہیں۔ لیکن یہ طے کر دینا کہ عدالتی قوانین شریعت سے بالاتر رہیں گے' یہ گویا کلمۂ کفر ہے۔

اب میں سورۃ النساء کی محولہ بالا آیت (۵۹) کی وضاحت کرتا ہوں۔ اس آیت میں لفظ "اَطِیعُوا" دو مرتبہ دہرایا گیا ہے---- "اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو' اور اپنے میں سے اولی الامر کی"----نوٹ کیجئے کہ "اَطِیعُوا" کا لفظ تیسری مرتبہ نہیں آیا۔ چنانچہ دو اطاعتیں (اللہ اور رسولؐ کی اطاعت) مستقل' غیر مشروط اور مطلق ہیں۔ ان میں کوئی تحدید (limits) یا شرائط نہیں ہیں' لیکن "اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کی اطاعت ان دونوں کے تابع ہے' وہ مستقل بالذات نہیں ہے' وہ خود اپنی جگہ پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ "مِنْکُمْ" کا لفظ یہ وضاحت کر رہا ہے کہ اولی الامر "تم میں سے" ہونے چاہئیں۔ یعنی مسلمان ہونے چاہئیں۔ اگر تمہارے اولی الامر غیر مسلم ہیں تو تمہیں ان کے خلاف بغاوت کرنی ہوگی۔ اگر بغاوت نہ کر سکو تو اس کے لئے تیاری کرنی چاہئے۔ غیر مسلم حکمرانوں کو ذہناً اور قلباً تسلیم کر لینا اسلام کے منافی ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرض کیجئے کوئی خلیفہ وقت ہے یا کوئی صدر مملکت یا وزیر اعظم' یا کسی پنچایت یا یونین کونسل کا صدر' اولی الامر کی حیثیت سے کتاب و سنت کے منافی کوئی حکم دیتا ہے' یا یہ کہ وہ حکم بالفعل تو کتاب و سنت کے منافی نہیں ہے' لیکن کسی شہری کے نزدیک وہ منافی ہے تو وہ کیا کرے؟ یہ گویا ایک تنازعہ ہو گیا۔ اگر میں ایک حکم کو کتاب و سنت کے منافی سمجھتا ہوں تو ایک شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اسے کتاب و سنت کے منافی ثابت کروں۔ لیکن اس کے لئے میں کہاں جاؤں؟ فیڈرل شریعت کورٹ کا ادارہ اس مقصد کے لئے قائم ہوا تھا اور یہ صحیح ترین ادارہ تھا' جسے پوری طرح بااختیار ہونا چاہئے تھا۔ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا : "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ......" یعنی "پھر اگر تمہارا (اور اولوالامر کا) کسی شے میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف

لوٹادو"۔ لیکن کہاں لوٹائیں؟ اس کا طریق کار کیا ہو؟ یہ قرآن حکیم میں مذکور نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ ادارے اس وقت اس طرح موجود ہی نہیں تھے کہ عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ علیحدہ علیحدہ ہوں۔ البتہ اب وہ ادارے وجود میں آچکے ہیں۔ ایک مقننہ ہے جس میں اولوالامر بیٹھے ہیں' وہ جو چاہیں گے قانون بنادیں گے' جو چاہیں گے حکم دے دیں گے۔ صدارتی نظام میں صدر بالاتر ہوتا ہے اور پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ کی حیثیت بالاتر ہوتی ہے۔ دوسرے نمبر پر انتظامیہ ہے اور تیسرے نمبر پر عدلیہ علیحدہ ہے۔ اور جدید اسلامی ریاست میں یہ کام دراصل عدلیہ کا ہے کہ وہ کسی قانون کے کتاب و سنت کے مطابق یا منافی ہونے کا فیصلہ کرے۔ وہاں دلیل صرف یہ ہوگی کہ قرآن میں یہ ہے اور سنت میں یہ ہے۔ کوئی تیسری دلیل وہاں نہیں چلے گی۔ پارلیمنٹ میں تو دلیل یہ ہوتی ہے کہ چونکہ اکثریت اس کے حق میں ہے لہٰذا یہ بات منظور کی جاتی ہے۔ اکثریت کا عنصر پارلیمنٹ میں تو لامحالہ چلے گا لیکن عدالت میں نہیں۔ فیڈرل شریعت کورٹ کا مقام یہی ہے کہ وہاں اس طرح کے تنازعات زیر بحث آئیں۔ "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کے مصداق فیڈرل شریعت کورٹ میں بات صرف اللہ اور رسولؐ کے حوالے سے ہو سکتی ہے' کسی اور حوالے سے نہیں۔ باقی سارے حوالے مثلاً ائمہ دین کے فیصلے اور دنیا کے معروف اور مسلّم اصولوں کے حوالے تائید میں دیئے جا سکتے ہیں یا نظائر (precedents) کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

"فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کے حکم کے ساتھ ہی فرمادیا گیا: "اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" یعنی "اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو"۔ گویا اگر اس آیت پر عمل نہیں ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے دعویدار تو ہیں لیکن فی الواقع صاحب ایمان نہیں ہیں۔ "ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا" "یہی بہترین راستہ بھی ہے اور صحیح نتیجے تک پہنچانے والا درست لائحہ عمل بھی ہے۔"

اس ضمن میں ایک اور بات میں یہ کہوں گا کہ خواہ شریعت کورٹ ہو خواہ سپریم کورٹ کا شریعت اپیلیٹ بنچ ہو' ان دونوں کے فیصلوں کے لئے نظر ثانی کی گنجائش دیگر

عدالتوں سے بڑھ کر رکھی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں تقریباً ایک ہزار برس سے جمود چلا آرہا ہے اور اب اجتہاد کریں گے تو لازماً غلطیوں کا بھی احتمال ہو گا' لہٰذا اس میں نظرثانی (Review) کے مواقع لازماً زیادہ رکھنے چاہئیں تاکہ غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہے۔

اگر ہم ان چار چیزوں کو دستور میں شامل کر لیتے ہیں تو اسلامی ریاست یا نظام خلافت کا دستوری سطح پر کم از کم تقاضا پورا ہو جاتا ہے' اگرچہ اس پر عمل تدریجاً ہو گا' ایک دن میں تو نہیں ہو جائے گا۔ اور اس عمل میں شریعت کورٹ کا کردار اس اعتبار سے صرف منفی ہو گا' یعنی وہ یہ فیصلہ دے دے گی کہ یہ چیز واقعتاً قرآن و سنت کے منافی ہے۔ مثبت طور پر قانون سازی شریعت کورٹ نہیں کر سکتی' یہ کام پارلیمنٹ کا ہے۔ جب پارلیمنٹ کو معلوم ہو گا کہ ہم نے جو قانون بنایا تھا وہ قرآن و سنت کے منافی قرار پایا گیا ہے تو وہ اسے کتاب و سنت کے موافق بنانے کے لئے قانون سازی کرے گی۔ پھر جو پارٹی بھی حکومت میں ہو گی وہ اپنا علماء کا بورڈ پہلے سے بنا کر رکھے گی' تاکہ یہ نہ ہو کہ قانون سازی پر کی گئی ساری محنت آخر میں اکارت چلی جائے' جب یہ معلوم ہو کہ یہ قانون تو کتاب و سنت کے منافی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ سب کام تدریجاً ہو گا' لیکن اس کی ابتداء کے لئے یہ کم از کم تقاضا ہے جو میں نے بیان کیا۔ اگر یہ پورا نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً......" (اے اہل ایمان اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!) کے حکم پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ پھر تو سیکولرزم ہے کہ مسجد اور مذہبی اداروں میں اللہ اور رسولؐ کا حکم بالاتر ہے' لیکن نہ ہماری پارلیمنٹ میں اس کی بالادستی ہے نہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اور نہ ہی مارکیٹ میں' بینکنگ میں اور زمینداری میں۔ اور یہ چیز خود پاکستان کے genesis کے خلاف ہے۔

اگرچہ میں خود بھارت کے ساتھ تجارت اور آمدورفت کی کڑی پابندیوں کو نرم کئے جانے کا حامی رہا ہوں' لیکن یہ بات واضح رہے کہ اگر ہم نے پاکستان کے تشخص کو اس دستوری پیش رفت کے ذریعے سے مستحکم اور محفوظ کئے بغیر بھارت کے ساتھ تجارت اور

آمد و رفت کے دروازے کھول دیئے تو یہ پاکستان کی نفی اور خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس لئے کہ پھر آپ کے پاس اپنے تشخص کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہے گا۔ پھر تو وہی سیکولرزم اُدھر ہوگا اور وہی سیکولرزم اِدھر ہوگا۔ تو فرق کیا رہ جائے گا؟ اور یہ بات سمجھ لیجئے کہ جب ہوا کی کوئی بہت بڑی رَو چل رہی ہو تو وہ اپنے ساتھ بہت سی چیزوں کو بہا کر لے جاتی ہے۔ ایسی تیز رَو اپنے پیچھے vacuum چھوڑ رہی ہوتی ہے' جو دوسری چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور جان لیجئے کہ بھارت کا ویکیوم پاکستان کو ہڑپ کر جائے گا۔ ابھی تک تو یہاں یہ صورتحال تھی کہ علماء کا کچھ اثر موجود تھا جو اسلام کی بات کرتے تھے' کچھ الیکشن میں بھی آ جاتے تھے' حکمرانوں کے گریبانوں پر گاہے بگاہے ہاتھ بھی ڈال لیتے تھے' لیکن اب صورتحال یکسر بدل گئی ہے۔ اب اگر ہم نے یہ پیش رفت نہ کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کے نظریئے اور اس کے بنیادی مقصد سے جانتے بوجھتے انحراف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اگر کوئی شخص اختیار رکھنے کے باوجود شریعت پر عمل نہیں کرتا تو پھر اس کے پاس اللہ کے ہاں کوئی عذر نہیں۔ میرے پاس چونکہ اختیار نہیں ہے لہٰذا میں تو اللہ کے حضور یہ عذر پیش کر سکتا ہوں کہ اے اللہ میں نے تو اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن لوگوں نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا تو میں کیا کرتا؟ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے مگر لوگوں نے ساتھ نہیں دیا تو وہ کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکے۔ اس میں ان کا کیا قصور؟ لیکن جس شخص کو دو تہائی اکثریت حاصل ہو چکی ہو اور اس کے ہاتھ میں اختیار ہو اور وہ یہ کام نہیں کرتا تو اس کے پاس کوئی عذر موجود نہیں ہے۔ یہی بات میں نے نومبر ۱۹۷۷ء میں جناح ہال میں منعقدہ سالانہ قرآن کانفرنس کے ایک اجلاس میں صدر ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہی تھی' جس کے لئے انہوں نے اپنا پیغام بھجوایا تھا' کہ اب آپ تدریج کے چکر میں نہ پڑ جایئے۔ جب انسان کو اختیار حاصل ہو تو وہ پوری کی پوری شریعت پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ یہ تدریج تو اُس وقت تھی جب شریعت ابھی پوری نازل نہیں ہوئی تھی۔ مکی دور میں ابھی شراب حرام نہیں ہوئی تھی تو لوگ شراب بھی پی رہے تھے اور نمازیں بھی پڑھ رہے تھے۔ سود کی حرمت جب تک نہیں ہوئی تھی تو سودی لین دین جاری تھا۔ لیکن جب شریعت مکمل ہو گئی

تو کوئی شخص اپنے اختیار سے اس میں تدریج اختیار نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہو جائے گا' لیکن اصولی طور پر دستور میں یہ طے کر دیا جائے اور "Set the ball rolling" کے مصداق اس عمل کا آغاز کر دیا جائے۔ لیکن اس میں کوئی استثناء نہیں ہونا چاہئے۔ اگر آپ نے استثناء کر دیا تو آپ مجرم ہوں گے۔ گویا آپ پوری زندگی پر اسلام کی بالادستی نہیں چاہتے۔ اس حوالے سے میں نے ضیاء الحق صاحب سے کہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ معاشرہ آپ کو اٹھا کر پھینک دے گا۔ آپ اسے گوارا کر لیں لیکن اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے دین کے نفاذ میں کسی تدریج کو ذریعہ نہ بنائیں۔ اس کے لئے میں نے مثال دی تھی کہ اسی صدی کے ایک انگریز شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم نے' جبکہ سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا' ایک عورت کی محبت میں تخت و تاج کو لات مار دی تھی۔ یہی بات آج میں نواز شریف صاحب اور ان کے ساتھیوں سے کہہ رہا ہوں۔

اس میں ایک بات کا اضافہ کر لیجئے کہ اگر دستور میں یہ چار ترامیم کر لی جائیں تو اس کے بعد اگر اس ملک میں مخلوط انتخابات کا طریقہ اختیار کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ اقلیتوں کے نقطہ نگاہ سے اس ملک میں جداگانہ انتخابات اس اعتبار سے بھی قابل اعتراض قرار پاتے ہیں کہ ایک ہی حلقہ انتخاب (constituency) پورے ملک میں پھیلا ہوتا ہے' جس کی کوئی تک نظر نہیں آتی۔ عورتوں کے بارے میں بھی میرا موقف یہ ہے کہ وہ بھی براہ راست الیکشن لڑیں' اسمبلیوں کے ذریعے سے ان کی مخصوص نشستوں پر نامزدگی سے بہت سی خباثتوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ سینٹ میں تو آپ عورتوں کو نامزد کر سکتے ہیں لیکن میں اس کی بنیاد پر قومی اسمبلی میں عورتوں کی نشستیں مخصوص کرنے کے خلاف ہوں۔ بہرحال یہ دوسرے مسائل ثانوی ہیں۔ اگر دستوری سطح پر وہ چار کام ہو جائیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے تو میرے نزدیک اس وقت پاکستان میں مخلوط انتخابات ہم پر کوئی برے اثرات نہیں ڈال سکتے۔ اس لئے کہ پاکستان میں اقلیتوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ قانون سازی پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جہاں ایسا معاملہ ہو جیسے متحدہ پنجاب میں ہندو مسلم کی ۵۶ فیصد اور ۴۴ فیصد کی نسبت تھی یا جیسے مشرقی پاکستان

میں قریباً یہی نسبت تھی' وہاں "قلوطا اتقاب" کا معاملہ بہت خطرناک تھا!

میں یہ بات ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہا ہوں کہ اگر ہم نے یہ چار قدم اٹھالئے تو پاکستانی قوم میں وہ جوش و جذبہ پیدا ہو جائے گا جس کا اس وقت پوری دنیا میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ قوم بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ لیکن اگر ہم نے پچاس برس بعد بھی یہ کام نہ کیا تو سورۃ الحج کی آیت مبارکہ "وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ" کے مصداق ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے لئے آخری مہلت' آخری موقع' اور آخری آزمائش ہو جو اللہ نے ہمیں دی ہے' اور اس میں اگر ہم ناکام ہو گئے تو پھر شاید اللہ کے عذاب اکبر کا کوڑا ہماری پیٹھ پر برس جائے۔

(۲) انسدادِ سُود

نواز شریف صاحب کو میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ انسدادِ سود کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف ہماری جو جنگ جاری ہے اس کو بند کیا جائے۔ اس ضمن میں جو بات فوری طور پر لازماً کر لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ نواز شریف صاحب نے شریعت اپیلیٹ بنچ میں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف جو اپیل دائر کی تھی اس کو واپس لیا جائے' اور فیڈرل شریعت کورٹ ہی سے اس کے لئے مہلت مانگی جائے۔ اس کی دستور میں بھی گنجائش ہے اور قانون میں بھی۔ اور یا پھر سپریم کورٹ سے کہا جائے کہ وہ اس اپیل کو سرد خانے سے نکال کر اس کا ترجیحی بنیادوں پر جلد از جلد فیصلہ کرے۔ دونوں صورتوں میں ایک متبادل نظام بنانا ہماری ضرورت ہو گی۔ اس متبادل نظام کو تلاش کرنے اور بنانے کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر حکومت کی ہے جس کے پاس وسائل بھی ہیں اور اختیارات بھی۔ انہیں چاہئے کہ پوری دنیا سے مسلمان ماہرین معاشیات اور سکالرز کو بلائیں اور ان کے سامنے اپنا یہ مسئلہ رکھیں اور ان کی مدد سے ایسا کوئی تفصیلی نقشہ تیار کریں کہ ہم سود کی لعنت سے آزاد ہو سکیں۔ "جوئندہ یابندہ" کے مصداق اگر عزم مصمم ہو تو پھر اس راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے : "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" "جو ہماری

راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم لازماً انہیں اپنے راستے دکھاتے ہیں"۔ سود کو حرام کرنے والی ہستی وہ ہے جو ہر شے کا علم رکھنے والی ہے۔ وہ حاکمِ مطلق بھی ہے اور حکیمِ مطلق بھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سود کے بغیر انسانی زندگی کے تقاضے ہی پورے نہ ہو سکتے ہوں!

اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ بینکنگ کا متبادل نظام لایا جائے' لیکن یہ شاید ممکن نہ ہو۔ ہمیں اس کے لئے دوسرے نئے ادارے بنانے پڑیں گے۔ میرے نزدیک بینکنگ کا متبادل مانگنا تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ زنا کا متبادل بتا دیجئے۔ اسلام نے اس کا متبادل یہ رکھا ہے کہ نکاح کیجئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ زنا اور شے ہے' نکاح اور شے ہے۔ اسی طرح ہمیں سود کی لعنت سے بچنے کے لئے نئے ادارے بنانے پڑیں گے۔ یہ بینکنگ کا ادارہ تو یہودیوں کا بنایا ہوا ہے جو انہوں نے پوری دنیا کو اپنے معاشی شکنجے میں کسنے کے لئے بنایا۔ اب اس کے سارے تقاضے تو کسی ایک متبادل ادارے میں پورے نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ انسان کی اجتماعی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہم شریعت کے راستے موجود پائیں گے۔ ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں بینکنگ میں کچھ متبادل کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں کہ آپ چاہیں تو اِدھر جائیں اور چاہیں تو اُدھر چلے جائیں۔ میری ذاتی رائے میں تو اگرچہ ان میں سے اکثر سود ہی کی ڈھکی چھپی شکلیں ہیں' لیکن کم از کم ہمارے ہاں دورِ ملوکیت میں جو فقہ پروان چڑھی ہے اس کی رو سے ان میں سے بعض طریقوں کی شریعت میں گنجائش موجود ہے۔ میرا مطالبہ یہ ہے کہ جب اس متبادل نظام کے تحت تمام کاروباری معاملات چل سکتے ہیں تو دوسری کھڑکی کیوں نہ بالکل بند کر دی جائے۔ کیا مضاربہ' مشارکہ اور لیزنگ سے یہ سارے کام نہیں چل سکتے؟

یہ معاملات تو کاروباری ہیں۔ دوسری طرف انفرادی سطح پر بھی سود کا خاتمہ کیا جائے۔ انفرادی سطح سے مراد ہے کہ لوگ ڈیفنس سرٹیفکیٹ' فکسڈ ڈیپازٹ اور مختلف اقسام کے Bonds لے کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان پر سود کھا رہے ہیں۔ اس ضمن میں عمل کے لئے قرآن کی یہ آیات نہایت اہم ہیں: "فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ۔ اعلان کر دیا جائے کہ جو کچھ تم کھا چکے ہو اس کا حساب نہیں ہو گا' اب آئندہ کے لئے باز آ جاؤ' اب مزید سود نہیں ملے گا' ہاں تمہارا اصل زر

ہمارے پاس ہے۔" وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ"۔ تمہارے راس المال قوم کے پاس امانت رہیں گے بطور قرضہ حسنہ' اور ان کی ادائیگی بھی سہولت ساتھ کی جائے گی۔ انفرادی سطح پر سود کی لعنت فوری طور پر ختم ہو سکتی ہے اور اس کے لئے قوم کو تیار کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بیرونی قرضوں کا تعلق ہے تو ایک مضبوط اور مستحکم حکومت پاؤں جما کر ان سے negotiation کر سکتی ہے۔ اور مزید برآں یہ کہ سارے قرضے ایک دم چکانے کے لئے اگر قوم کے اندر جذبہ بیدار کر دیا جائے تو جس طرح بیرون ملک مقیم پاکستانیوں سے ایک ایک ہزار ڈالر مانگے گئے ہیں' اسی طرح پاکستان کے اندر بھی بہت سے وسائل و ذرائع mobilize کئے جاسکتے ہیں۔ مسلمان خواتین کے پاس زیورات کی شکل میں کتنا سونا پڑا ہوا ہے۔ ایک زیور تو وہ ہے جو عام طور پر خواتین پہنے رکھتی ہیں' اور دوسرا زیور وہ ہے جو صرف تقریبات میں استعمال ہوتا ہے اور جس کے بیگمات کے پاس انبار لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ اگر قرض حسنہ کے طور پر حکومت مانگے تو قوم یقیناً دے گی' ان شاء اللہ' بشرطیکہ اپیل اسلام کے نام پر ہو۔ اپیل یہ ہو کہ ہم سود کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں عوام کو تیار کرنے کے لئے تمام مذہبی عناصر کو محنت کرنا چاہئے۔ اندرون ملک سے بھی قرض حسنہ لیجئے۔ سرکاری زمینوں کو نیلام کیجئے۔ جتنی نج کاری سہولت کے ساتھ کر سکتے ہیں ضرور کیجئے' اور اس طرح پورے قرضے ادا کیجئے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قوم میں یہ جذبہ اگر پیدا ہو گا تو صرف اسلام کے حوالے سے ہو گا۔ اگر یہ کام ہم نے نہیں کیا تو خواہ کتنی صنعتی ترقی ہو جائے ہم نیو ورلڈ آرڈر اور اس کے سب سے بڑے مظہر یعنی آئی ایم ایف کے محکوم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ اس کے سوا ہماری کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔

سود کے ضمن میں پاکستان کے مصور' مبشر اور مفکر حکیم الامت علامہ اقبال کے یہ دو اشعار ہر مسلمان کو حفظ ہو جانے چاہئیں ؂

از ربا آخر چہ می زائد فتن
کس نداند لذّتِ قرضِ حسن

"ربا کے پیٹ سے آخر کیا چیز جنم لے سکتی ہے سوائے فتنوں کے؟ آج کی دنیا میں کوئی

محض قرض حسن کی لذت سے واقف ہی نہیں رہا"۔

اگر آپ کے پاس کوئی فاضل سرمایہ ہے اور آپ کا کوئی بھائی ایسا ہے جسے اپنی معیشت کی گاڑی چلانے کے لئے کچھ قرض حسنہ چاہئے اور وہ آپ اسے فراہم کر دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے تو اس میں بے اندازہ روحانی لذت ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سود کے انسداد کے لئے اقدامات کی خاطر ملکی سطح پر اس قدر جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ یہ قوم ریاست کو بھی قرض حسن دے گی اور اپنے بھائیوں کو بھی۔

از رِبا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

"سود کے ذریعے انسان کا باطن اور اس کی روح تاریک ہو جاتے ہیں۔ اور دل ایسا سخت ہو جاتا ہے جیسے اینٹ اور پتھر۔ اور سود خور انسان حقیقت میں بھیڑیا بن جاتا ہے اگرچہ اس کے بھیڑیوں والے دانت اور پنجے نہیں ہوتے"۔

یہ دو باتیں وہ ہیں جن کا آغاز جنرل ضیاء الحق مرحوم نے کیا تھا۔ انہوں نے قرار داد مقاصد کو دستور کا حصہ بنا دیا' جو بلاشبہ ایک مثبت قدم تھا۔ اسی طرح وفاقی شرعی عدالت کا قیام بھی یقیناً ایک مثبت قدم تھا۔ انسدادِ سود کے لئے بھی ان کے دور میں کچھ اقدامات کئے گئے۔ اگرچہ ان کے لئے ان کے یہ تمام اقدام نیم دلانہ اور ادھورے تھے' چنانچہ ان کے مثبت کی بجائے منفی نتائج زیادہ پیدا ہوئے' لیکن بہرحال وہ صحیح سمت میں ایک آغاز سفر تھا۔

اس کے حوالے سے بھی میں یہ کہتا ہوں کہ اب یہ جو قیادت برسر اقتدار آئی ہے یہ ضیاء الحق صاحب کی معنوی وارث ہے' اس لئے کہ نواز شریف صاحب کی حیثیت ضیاء الحق مرحوم کے سیاسی متبنّیٰ کی ہے اور وہ ان کے سیاسی سرپرست تھے۔ پھر ان کے ساتھ ضیاء الحق صاحب کے صُلبی بیٹے بھی موجود ہیں۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ ضیاء الحق صاحب کے وارث اور جانشین ہونے کا یہ اخلاقی تقاضا ہے کہ یہ ضیاء الحق صاحب کے شروع کردہ عمل کو آگے بڑھا کر اس کی منطقی انتہا تک پہنچائیں' اس میں جو کمی ہے اس کی تکمیل کریں' نہ یہ کہ اس بساط کو بھی خدانخواستہ کہیں لپیٹ کر رکھ دیا جائے۔

(۳) جاگیرداری اور مزارعت

تیسرا مشورہ یہ ہے کہ جاگیردارنہ نظام کو ختم کرنے اور زمینداری نظام کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے علماء اور بندوبست اراضی کے ماہرین کا ایک بورڈ بنایا جائے۔ یہ مشورہ میں نے ۱۹۸۲ء میں ضیاء الحق صاحب کی مجلس شوریٰ میں بھی دیا تھا اور یہ بات بہت زور دے کر کہی تھی' آج بھی وہی بات کہہ رہا ہوں کہ آپ ایک ہائی پاور لینڈ کمیشن بنائیں جس میں جید علماء بھی ہوں' روایتی لکیر کے فقیر علماء نہیں کہ جو بات کہیں لکھ دی گئی ہے وہ اسی پر فتویٰ دینا ضروری سمجھتے ہوں' اور ان کے ساتھ ماہرین بندوبست اراضی ہوں۔ اس کمیشن کے ذریعے یہ بات طے کی جائے' یا پھر فیڈرل شریعت کورٹ میں اس معاملے کو اٹھایا جائے اور تعین کیا جائے کہ آیا پاکستان کی زرعی اراضی عشری ہیں یا خراجی۔

دینی اور روحانی اعتبار سے پچھلی صدی کی سب سے بڑی شخصیت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی ہے' جو مفسرِ قرآن ہیں' بہت بڑے فقیہ ہیں' جن کی ایک کتاب "مَا لَا بُدَّ مِنْہُ" آج تک ہر عربی مدرسے میں پڑھائی جاتی ہے' اور مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کے خلیفہ ہیں۔ انہوں نے "مَا لَا بُدَّ مِنہ" میں لکھا ہے کہ پورے ہندوستان میں کہیں کوئی عُشری زمین ہے ہی نہیں۔ اس لئے میں یہاں عشر کے مسائل بیان ہی نہیں کر رہا۔ لیکن اس صدی میں بعض علماء نے یہ فیصلہ کر دیا کہ پاکستان کی زمینیں عشری یعنی ملکیتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ پوری کتاب مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھ دی اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ چونکہ جب کوئی شے کسی کی ملکیت ہو تو اس سے آپ جبراً نہیں لے سکتے۔ لہٰذا شریعت اپیلیٹ بنچ نے' جس میں مولانا تقی عثمانی صاحب خلف الرشید مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی تشریف فرما ہیں' یہ فیصلہ دے دیا کہ پاکستان میں کسی زمیندار کی ایک انچ زمین بھی اس سے جبراً نہیں لی جا سکتی۔ گویا آئندہ کے لئے زرعی اصلاحات کا راستہ قطعاً بند کر دیا گیا۔

اس ضمن میں ایک اور صاحب کی مثال بھی دینا چاہتا ہوں جو اسی شہر لاہور کے بہت بڑے مفتی ہیں۔ وہ دیوبندی مسلک کے ایک دار العلوم کے سب سے بڑے مفتی ہیں۔ ان کے صاحبزادے نے مجھے یہ بتایا کہ ان کی ذاتی رائے یہی ہے کہ یہ زمینیں خراجی ہیں' عشری نہیں ہیں۔ یعنی ان کی رائے مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی رائے کے خلاف ہے۔ لیکن

جب علماء کے ایک ساتھی نے ان سے تحریری طور پر فتویٰ مانگا تو انہوں نے فتویٰ یہ لکھوایا کہ یہ زمینیں عشری ہیں لیکن اس فتویٰ پر انہوں نے اپنے دستخط نہیں کئے' بلکہ اپنے کسی شاگرد سے دستخط کروائے۔ اگر یہاں کی زرعی اراضی خراجی قرار پاتی ہیں تو شریعت اپیلیٹ بنچ کا محولہ بالا فیصلہ کالعدم ہو جاتا ہے' کیونکہ خراجی زمین ملکیتی نہیں ہوتی۔ اگر عشری مانا جائے تو اس پر اس فیصلہ کا یقیناً اطلاق ہو گا۔ اگر ایک شے میری ملکیت ہے تو آپ میری مرضی کے بغیر اسے مجھ سے ہرگز نہیں لے سکتے۔ میں یا اسے فروخت کروں گا یا ہبہ کروں گا' آپ زبردستی نہیں لے سکتے۔ لیکن اگر پاکستان کی زرعی اراضی کسی کی ملکیت ہیں ہی نہیں' یعنی خراجی ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قوم کی اجتماعی ملکیت تھیں۔ آج تک یہ آپ کی تحویل میں رہیں' لیکن اب حکومت عوامی فلاح و بہبود کے لئے جو بھی نیا بندوبست اراضی کرنا چاہے' کر سکتی ہے۔ اس طرح سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے فیصلے کے ذریعے زرعی اصلاحات کا جو دروازہ بند ہو گیا تھا وہ دوبارہ کھل جائے گا۔

اس کے بعد اس کمیشن کے ذریعے یا فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعے یہ طے کر لیا جائے کہ آیا مزارعت یعنی غیر حاضر زمینداری جائز ہے یا ناجائز؟ اس معاملے میں بھی ہمیں دین کے حوالے سے آگے بڑھنا چاہئے۔ پیپلز پارٹی کا نعرہ سوشلزم کے حوالے سے تھا' لیکن ہمیں اسلام کے حوالے سے کام کرنا ہے۔ اس ضمن میں ایک جانب ہمارے سامنے امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا فتویٰ ہے کہ مزارعت حرام مطلق ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کھلے کھیت میں مزارعت حرام مطلق ہے' لیکن کھیتی اگر کسی باغ میں ہے تو اس میں جائز ہے۔ دوسری جانب صاحبین یعنی قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے فتویٰ کی رو سے مزارعت بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ اگر غیر حاضر زمینداری ختم نہیں ہو سکتی تو انہوں نے جو شرائط عائد کی ہیں کم از کم وہ پوری کی پوری نافذ کی جائیں۔ اِس وقت بھی فیصل آباد میں ایک شیخ الحدیث موجود ہیں جن کے صاحبزادے نے کل ہی بتایا کہ اس مسئلے میں میرے استفسار پر والد صاحب نے بتایا کہ مفتیٰ بہٖ قول تو یہی ہے کہ مزارعت جائز ہے' لیکن میری ذاتی رائے امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق ہے' یعنی مزارعت جائز نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنی ذاتی رائے کو پبلک میں بیان نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ

ہے کہ خود کاشت کرنے کے ضمن میں زمینداری کو انڈسٹری کا درجہ دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خود کاشت پر آپ نے ملازم رکھے ہوئے ہیں تو جس طرح صنعتی ملازمین کے بہت سے حقوق ہیں' جیسے پنشن کا حق ہے' سوشل سیکیورٹی کا معاملہ ہے تو وہ حقوق زمینداری میں بھی ہونے چاہئیں۔ یہ تین اقدامات ہیں جن کے ذریعے اس سلسلے میں ابتدائی پیش رفت کی جا سکتی ہے۔

(۴) انتظامی معاملات

اب تک میں نے جو باتیں کہی ہیں وہ خالص دینی اعتبار سے اہم ترین ہیں۔ دوسرے درجے میں کچھ انتظامی معاملات ہیں' لیکن ان کا تعلق بھی بالواسطہ دین کے ساتھ جڑتا ہے۔

(۱) ان میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مردم شماری فوراً ہونی چاہئے۔ یہ معاملہ بہت عرصے سے رکا ہوا ہے۔ مزید برآں یہ کہ مردم شماری میں بھی اور پھر شناختی کارڈ میں بھی مذہب کا خانہ ہونا چاہئے اور مسلمان کے نام کے ساتھ اس کا مسلک بھی درج ہونا چاہئے' تاکہ معلوم تو ہو کہ اس ملک میں مختلف فقہوں کے ماننے والے کتنے ہیں۔ اس لئے کہ اسلام کا نفاذ اس ملک کا مقدر ہے' یہ تقدیر مبرم ہے کہ اسلام یہاں آئے گا' اور جب آئے گا تو ظاہر ہے کہ پرسنل لا میں تمام مسالک کے پیروکاروں کو مکمل آزادی دینا ہو گی۔ لہٰذا معلوم ہونا چاہئے کہ کتنے حنفی ہیں' کتنے اہل حدیث ہیں' کتنے فقہ جعفریہ کے ماننے والے ہیں' تاکہ ہر مسلک کے علماء کے الگ بورڈ بنائے جا سکیں۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں علماء کنونشن میں تقریر کی تھی کہ اس کی عملی شکل کیا ہو گی۔ میری رائے میں ریاستی سطح پر پبلک لاء صرف قرآن و سنت [1] کا ہونا چاہئے' کسی مخصوص فقہ کا نہ ہو۔ لیکن پرسنل لا میں ہر فقہ کو مکمل آزادی دی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہو گا کہ ہر فقہ سے تعلق رکھنے والے علماء کے بورڈز ہوں' جن کو refer کیا جا سکے۔ اور وہ فیصلہ کریں کہ ہماری فقہ کی رو سے اس مسئلہ کا کیا حل ہے۔ یہ عملی شکل اختیار کرنا پڑے گی۔ آئیڈیل شکل تو یہی ہے کہ مسالک اور فرقے باقی نہ رہیں' لیکن یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔

---

[1] اگرچہ سنتِ رسولؐ کا لفظ اہل سنت کا متفق علیہ ذخیرۂ احادیث ہی ہو گا!

(ii) دوسرے یہ کہ اس ملک میں حقیقی معنوں میں صدارتی اور فیڈرل نظام قائم کیا جائے۔ لیکن اس کے لئے دستور میں واضح طور پر ترمیم ہو، اور پھر پورے ملک میں براہ راست صدارتی انتخاب کے ذریعے صدر منتخب کیا جائے۔ یہ کام ہرگز Back Door سے نہیں ہونا چاہئے۔ حکم قرآنی ہے : "وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا" یعنی گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، پچھواڑے سے نہیں۔

(iii) تیسرے یہ کہ چھوٹے صوبے بنائے جائیں جو متوازن ہوں اور ان میں جغرافیائی و انتظامی عوامل کے ساتھ ساتھ لسانی و ثقافتی عوامل کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

(iv) چوتھی بات یہ ہے کہ کونسل برائے دفاع و قومی سلامتی (CDNS) کا خاتمہ ہونا چاہئے اور فوراً ہونا چاہئے۔ ملک کے انتظامی اور اندرونی معاملات میں فوج کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔ اب پارلیمنٹ یقیناً اس پوزیشن میں ہے کہ وہ assert کر سکتی ہے کہ یہ جو CDNS کے ذریعے پچیس فیصد مارشل لاء لگ گیا ہے، ۵۸(۲)ب کے ذریعے ۲۵ فیصد صدارتی نظام ہے، اور باقی پچاس فیصد پارلیمانی نظام ہے، تو یہ ایک چوں چوں کا مربّہ بن گیا ہے اسے ختم ہونا چاہئے۔

(v) پانچویں نمبر پر نظام تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ہمارا ہدف تو یہ ہونا چاہئے کہ دینی اور دنیوی تعلیم کا فرق بالکل ختم ہو جائے اور دونوں یکجا کئے جائیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک دن میں کرنے کا کام نہیں ہے۔ البتہ ہدف معیّن ہو سکتا ہے۔ فوری طور پر یہ کام کیا جاسکتا ہے کہ پرائمری تعلیم کے دوران جیسا کہ نواز شریف صاحب نے کہا بھی ہے، ناظرہ قرآن پڑھانے کا کام مکمل ہو جائے اور ہائی سکول کی تعلیم کے دوران عربی زبان کی تعلیم لازمی کی جائے۔ اس لئے کہ ناظرہ قرآن پڑھنے سے تو بات نہیں بنتی جب تک اسے سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل نہ ہو۔ عربی کا فہم ہو جائے تو بچہ خود بعد میں قرآن سمجھ لے گا۔ ورنہ آپ ترجمہ پڑھائیں گے تو وہ طوطے کی طرح پڑھانے کا معاملہ ہو گا، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہائی سکول کے دوران اتنی عربی سکھائی جا سکتی ہے کہ اگرچہ طالب علم کہیں کہیں کسی لغت کو consult کرے گا لیکن اکثر و بیشتر خود سمجھ لے گا۔

(vi) نمبر چھ یہ کہ نائب تحصیلدار کی سطح تک عدلیہ اور انتظامیہ کی کامل علیحدگی

کی جائے۔

(vii) ساتویں بات یہ کہ حکمرانوں کے پاس جو صوابدیدی فنڈز ہیں' اور جو ملکی خزانے کو لوٹنے اور سیاسی رشوتوں کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئے ہیں' نیز قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے لئے ترقیاتی فنڈز ہیں ان سب کا خاتمہ کیا جائے۔

(viii) نمبر آٹھ یہ کہ علاقہ غیر یا آزاد قبائل کی علیحدہ حیثیت ختم کی جائے۔ صدر لغاری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک قدم اٹھایا اور بالغ رائے دہی کا اصول اس علاقے میں بھی نافذ کر دیا گیا۔ اس طرح گویا Integration کی طرف ایک قدم تو اٹھا لیا گیا۔ اب اس سلسلے میں اگلا قدم اٹھانا چاہئے اور اس معاملے کو منطقی انتہا تک پہنچانا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ کوئی علیحدہ ملک نہیں ہے۔ اگر وہ آزاد قبائل ہیں تو کیا باقی پاکستان محکوم ہے؟۔

(ix) نمبر نو یہ کہ بنکوں کے معاف شدہ قرضوں کی از سر نو بازیافت کی کوشش کی جائے۔ یہ سب اس ملک کی عوام کی دولت ہے' جس کے معاف کرنے کا حق اگر ہے تو وہ عوام کو ہے' کسی اور کو نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جبر بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی جائیدادیں قرقی یا نیلام بھی کی جا سکتی ہیں۔ حمید گل صاحب کے حوالے سے ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے قول کے مطابق ایک سو تیس ارب روپیہ ان نادہندگان کے ذمہ ہے جبکہ ہمارا کل بیرونی قرضہ ۱۲۵ ارب ہے۔ اگر یہ تمام قرضے وصول ہو جائیں تو پانچ ارب پھر بھی بچ جائیں گے۔

(x) نمبر دس یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اپنا قبلہ درست کریں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر ضیاء الحق صاحب کے دور میں جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں' نواز شریف صاحب اپنے سیاسی سرپرست کی پیروی میں کم از کم ان پابندیوں کو تو فوراً نافذ کریں۔ اس کے علاوہ ڈش انٹینا پر پابندی ہو' اور اس کے ذریعے جو اچھے بیرونی پروگرام آتے ہیں وہ خود پی ٹی وی نشر کرے۔ خاص طور پر بھارت کی نشریات کو تو کسی طرح Jam کیا جا سکتا ہو تو لازماً کیا جائے' اس لئے کہ یہ ہم پر ثقافتی یلغار ہے۔ اس سلسلے میں مانیکا گاندھی سے جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں وہ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں کہ "ہم ثقافتی سطح پر تو پاکستان کو فتح کر ہی چکے ہیں!"۔ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بسنت کے موقع پر ہوتا ہے' یہ سب ثقافتی سطح

پر پاکستان کو فتح کئے جانے کی علامت ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ اس سے بجلی کا نظام خراب ہوتا ہے، لاکھوں کروڑوں روپے ضائع کئے جاتے ہیں۔ ایک غریب اور مقروض ملک میں یہ ہو رہا ہے، اس میں کم از کم یہی پابندی لگا دی جائے کہ آبادیوں میں پتنگ بازی نہیں ہو سکتی، اور جسے بھی مقابلے کرنا ہیں کھلے میدانوں میں جا کر کرے، جہاں کم از کم بجلی کے تاروں کا معاملہ تو نہ ہو۔

(xi) آخری اور گیارھویں بات میں شادی بیاہ کی تقریبات کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ ضیاء الحق صاحب نے بھی کوششِ ناتمام کی تھی اور کچھ نہ کچھ آغاز بھی کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے بچوں کی شادیاں نہایت سادگی سے کی تھیں۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اُس وقت ان کی سیاسی ضروریات تھیں جن کے تحت وہ سخت موقف اختیار نہ کر سکے۔ لیکن اب جو پوزیشن اس قوم نے نواز شریف صاحب کو دے دی ہے اس کی بدولت وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔ مجھے بھی اس ضمن میں تحریک چلاتے ہوئے بائیس برس ہو گئے ہیں کہ نکاح مسجد میں منعقد ہو۔ حدیث نبویؐ موجود ہے: "اَعْلِنُوا هٰذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوْهُ فِي الْمَسَاجِدِ"۔ پھر دعوتِ طعام صرف ایک ہو، یعنی ولیمہ۔ اور اس کے لئے بھی ون ڈش کی پابندی عائد کی جائے۔ کم از کم خود نواز شریف صاحب اور تمام سرکاری عہدے دار بھی طے کرلیں کہ جس دعوت میں ایک سے زیادہ ڈش ہو گی اس میں وہ شرکت نہیں کریں گے۔ (واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۴/ فروری کا ہے!)

بیرونی معاملات

(i) آخر میں بیرونی معاملات کے حوالے سے میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ طالبان سے مضبوط روابط قائم کئے جائیں اور قائم رکھے جائیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا جائے۔ کابل کی حکومت کتنے عرصے سے ان کے پاس ہے، Stable بھی ہے تو ہم کیوں تسلیم نہیں کر رہے؟ یہ بہت ضروری ہے۔ اور خاص طور پر اس اعتبار سے بہت ضروری ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے جو جارحانہ انداز اختیار کیا ہے اس میں بڑا

خطرہ مضمر ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ان کے طالبان کے ساتھ تعلقات ہیں۔ اور پاکستان کی پختون بیلٹ کے ساتھ قومی' جغرافیائی اور ثقافتی affinity بھی ہے۔ بلوچستان کے کسی ہارنے والے امیدوار کا بیان آیا تھا کہ طالبان نے یہاں پر پولنگ کے دوران ان کے ووٹرز کو ہراساں کیا ہے۔ یہ بہت خطرناک علامت ہے اور اس رجحان کا سب سے بڑا توڑ یعنی "master move" یہ ہے کہ خود آگے بڑھ کر طالبان کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے اور ان سے باقاعدہ روابط قائم کئے جائیں۔ یہ ان کا حق ہے' جسے انہوں نے افغانستان کے ۵/۴ حصے پر حکومت قائم کر کے ثابت کر دیا ہے۔ طالبان کے زیر حکومت علاقوں میں امن وامان اور سکون ہے۔ انہوں نے سب سے ہتھیار بھی لے لئے ہیں اور اب کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ ایران اور طالبان کے درمیان بھی معاملات کو درست کرایا جائے۔ پاکستان اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرے۔ اس کا تعلق خود پاکستان میں شیعہ سُنّی مفاہمت سے بھی ہے جسے میں نے دو تین سال سے اٹھایا ہوا ہے۔ اگرچہ میرے اپنے کچھ ساتھی بھی اس پر ناراض ہیں۔ عید کے اجتماع میں بھی کسی صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک بہت بزرگ آدمی نے ہمارے ایک ساتھی کی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ "بیٹے! یہ شیعہ سُنّی مفاہمت نہیں ہو سکتی!" اس کے باوجود "hoping against hope" کے مصداق' چونکہ میں شیعہ سنی مفاہمت کو صحیح سمجھتا ہوں لہٰذا اس کے لئے کوشش تو کرتے رہنا ہے۔ یہ نہ صرف افغانستان کے لئے بلکہ اس پورے خطے کے لئے ضروری ہے۔ میں بار بار کہتا رہا ہوں کہ پاکستان ایران اور افغانستان کا ایک مشترکہ اسلامی بلاک بننا چاہئے جو نیو ورلڈ آرڈر کے مقابلے میں آخری چٹان بن کر رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہاں شیعہ سنی مفاہمت انتہائی ضروری ہے ورنہ ہم اسی Huntington Doctrine کا شکار ہو کر رہ جائیں گے' جس کا ذکر میں نے اس مقام پر بارہا کیا ہے!

(۳) مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ایران اور چین کا تعاون حاصل کرنے کا ابھی موقع ہے۔ بدیو گوڑا صاحب کا آج (۱۴/ فروری) جو بیان آیا ہے اسے آپ یوں سمجھئے کہ یہ ان

کی اپنی Internal Consumption کے لئے ہے' یہ ان کی ایک ضرورت ہے۔ ورنہ اسی حکومت کا ایک وزیر کہہ چکا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کی ایک شکل یہ بن سکتی ہے کہ کشمیر کو تقسیم کیا جائے اور تقریباً وہی بات جو میں دو تین سال سے کہتا رہا ہوں وہ بات اب ذرا سے فرق کے ساتھ بعض ہندوستانی زعماء بھی کہہ رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ کبھی باہر کے عوامل بھی دخل دیتے ہیں' کبھی اندرونی سیاسی مصلحتیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن ان تمام عوامل کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں پیش رفت ہو سکتی ہے اور پاکستان کو اس میں اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے ضرورت ہے کہ ایران اور چین کے Good Offices کو استعمال کیا جائے۔ بھارت کے ساتھ تجارت کے ضمن میں نواز شریف صاحب نے جو بات کی ہے میں اس بات کا پہلے سے قائل ہوں۔ انہوں نے درست کہا ہے کہ اگر پاکستان اور بھارت اپنی باہمی تجارت کو فروغ دیں تو دونوں ممالک کثیر زرِ مبادلہ بچا سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہونا چاہئے' لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس کے لئے ہمیں پہلے دستوری پیش رفت کے ذریعے پاکستان کے اسلامی تشخص کو مضبوط اور مستحکم کرنا ہو گا۔

(۴) اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ سنکیانگ میں اب جو نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے' میں اسے بھی Huntington کے ان افکار کا مظہر سمجھ رہا ہوں جو انہوں نے اپنے ایک مقالے میں پیش کئے تھے۔ انہوں نے اپنے مقالے میں تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو بھڑکایا جائے اور چین کو مسلمانوں سے دور کیا جائے۔ اسی پر عمل کرتے ہوئے چین کو Eastward looking بنایا گیا ہے' اور اسی لئے "Asia Pacific Economic Council" بنائی گئی ہے۔ لیکن اب سنکیانگ میں جو معاملہ کھڑا کیا گیا' پاکستان کو اس میں active کردار ادا کرنا چاہئے تاکہ کہیں یہ آگ مزید نہ بڑھ جائے' اور ہمارے جذباتی فنڈا منٹلسٹ عناصر کسی کے زیر اشارہ وہاں بھی مسلح کارروائیاں نہ شروع کر دیں۔ یہ شے مستقبل میں اسلام کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

احیاءِ اسلام کے ضمن میں مصوّرِ پاکستان کے افکار

اب آیئے میری گفتگو کے چوتھے حصے کی طرف۔ میری ایک تشویش تو یہ تھی کہ انتخابات کے بعد کہیں اسلام کی طرف سے انحراف کی شکل پیدا نہ ہو جائے اور تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کے احیاء کا معاملہ اسلام کو خارج از بحث کر کے نہ ہو۔ میری دوسری تشویش یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کا بحیثیت مجموعی انتخابی میدان سے تقریباً بے دخل ہو جانا ان میں کسی منفی طرزِ عمل کو جنم نہ دے دے، جس کے کچھ آثار مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے بیان کے حوالے سے سامنے آ گئے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک زیادہ اہمیت کا معاملہ جماعت اسلامی کا اور مخصوص طور پر قاضی حسین احمد صاحب کا ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ انہوں نے پہلے کہا تھا کہ ہم حکومت کو چھ مہینے دے رہے ہیں۔ پھر ایک اور اچھی بات کہی کہ چھ مہینے کے دوران ہم دیکھیں گے کہ اگر نئی حکومت صحیح رخ پر چلی تو تعاون بھی کریں گے۔ لیکن آج کے اخبار میں ان کا ذرا تیکھا سا انداز ہے کہ "اب معرکۂ حق و باطل ہو گا"۔ تو میں دعا کرتا ہوں کہ اولاً یہ معرکہ واقعتاً حق و باطل کا ہی ہو۔ اور ثانیاً یہ معرکہ صحیح اصولوں کی بنیاد پر اور واقعتاً صحیح طریق کار پر ہو۔ اگر واقعی حق و باطل کا معرکہ ہو تو ہمیں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے علاوہ اور کیا چاہئے۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ۔ تری آواز مکے اور مدینے!

لیکن اس کے ضمن میں جو اصل بات میں آج کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک تھی جو پورے ہندوستان میں مسلم لیگ کے پرچم تلے چلی تھی۔ اور دوسری جانب ہے احیاءِ اسلام کی تحریک یا "تحریکِ اسلامی"۔ ان دونوں کا نقطۂ اتّصال علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہوتی ہے کہ کسی ایک شخصیت پر جا کر اگر ذہنی و فکری کچھ اشتراک ہو جائے۔ مثلاً بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث سب کے سب شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت پر متفق ہیں، اگرچہ ان کے بعد کسی پر متفق نہیں، چاہے وہ سید احمد بریلویؒ ہوں، چاہے شاہ اسماعیل شہیدؒ ہوں۔ اسی طرح برِّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی قومی تحریک اور احیاءِ اسلام کی تحریک کا مقامِ اتّصال علامہ اقبال ہیں۔ ان

کے بارے میں پانچ باتیں نوٹ کرلیں۔ علامہ اقبال جہاں ایک بہت بڑے تصوریت پسند انسان اور Idealist ہیں' وہیں وہ عملیت پسند یا Pragmatist اور realist بھی ہیں۔ ایک طرف وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کے سب سے بڑے نقیب ہیں ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

اور

تہراں ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

(نوٹ کر لیجئے کہ عالم اسلام کا جغرافیائی اعتبار سے مرکز تہران ہی بنتا ہے۔ یعنی مشرق کی جانب نیو گینی اور اریان اور مغرب کی جانب موریطانیہ اور سینیگال کا فاصلہ تہران سے تقریباً برابر ہے!) لیکن دوسری طرف زمینی حقائق پر بھی نظر ہے اور مسلمانانِ ہند کے مسائل پر غور و فکر اور سوچ بچار بھی ہو رہی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپ کو یکجا کہیں اور نہیں ملیں گی۔ پھر یہ کہ ایک طرف وہ سترہ سال پہلے قیام پاکستان کی پیش گوئی کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر مبرم ہے۔ اس اعتبار سے وہ مفکرِ پاکستان' مصورِ پاکستان' اور مبشرِ پاکستان ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس آزاد مسلمان ریاست کا اصل نصب العین اور اصل ہدف کیا معین کر رہے ہیں؟ ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام بذاتہٖ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ خطبہ الٰہ آباد میں فرماتے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کے چہرے پر جو پردے عرب استعمار (یعنی ملوکیت) کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس کا مطلب بالکل ظاہر ہے کہ اصل اسلام تو خلافتِ راشدہ کا تھا۔ تو یہ جامعیت آپ کو اور کسی شخصیت میں نظر نہیں آئے گی۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ وہ مسلمانوں کی قومی تحریک کی قیادت کے لئے قائداعظم کو یورپ سے بلواتے ہیں۔ صاحبزادہ عبدالرسول صاحب کی کتاب "تحریک پاکستان" میں یہ تفصیل موجود ہے۔ قائداعظم شدید مایوس ہو کر اور مسلمانانِ ہند سے بالکل بددل ہو کر لندن میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کو کھینچ کر ہندوستان واپس بلانے

والا شخص اقبال ہے۔ یہ تو قومی تحریک کی قیادت کا معاملہ تھا' اور دوسری طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دکن سے پنجاب بلانے والے بھی علامہ اقبال ہی ہیں۔ مسلمانوں کی قومی تحریک اور اسلام کے احیاء کی تحریک کا یہ اجتماع آپ کو اور کہاں ملے گا؟ اقبال کو خوب معلوم تھا کہ ایک تو مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک ہے' اس کی قیادت کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ دوسرے احیاءِ اسلام کی تحریک ہے' جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ چنانچہ اقبال ایک طرف تو مسلم لیگ کے کارکن تھے۔ ۱۹۳۵ء میں جب Government of India Act پاس ہوا تھا اور اس کے تحت الیکشن ہونے والے تھے تو قائداعظم کی درخواست پر وہ مسلم لیگ کا جو پارلیمانی بورڈ بنتا تھا' اس میں سیکرٹری کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ دوسری طرف اسی زمانے میں وہ خالص اسلامی اصولوں پر بیعت و امارت کی بنیاد پر ایک خالص فدائین کی تحریک "جمعیت شبان المسلمین" کے نام سے قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ جامعیت آپ کو اور کہاں ملے گی؟ یہی وجہ ہے کہ میں نے خاص طور پر آج کے اجتماع کے لئے اس کتاب کو شائع کرایا ہے جو پہلے دو اقساط میں صرف میثاق میں چھپی تھی اور جو اصل میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی ان کے انتقال سے عین قبل چھپنے والی کتاب "مسلمانوں کا سیاسی نصب العین" سے اخذ کی گئی ہے۔ اصل کتاب میں بہت سا غیر متعلق مواد بھی تھا۔ اس میں سے اصل خلاصہ نکال کر عزیزم عاکف سعید نے اسے مرتب کر دیا ہے۔ اس کتاب کو آپ ضرور پڑھئے۔ اس کا ٹائٹل یہ ہے : "چند غیبی اشارات کے پیش نظر علامہ اقبال کی آخری خواہش جو بوجوہ شرمندۂ تعمیل نہ ہو سکی"۔ یعنی امارت اور بیعتِ سمع طاعت کی بنیاد پر استوار فدائین کی ایک جماعت۔ یہ وہی جماعت ہے جس کا یہ اصول میں بیان کر چکا ہوں کہ وہ الیکشن میں حصہ نہیں لے گی۔ غور کیجئے کہ علامہ اقبال ایک طرف مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ میں شریک ہیں' اس لئے کہ یہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کا تقاضا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس قومی تحریک سے اسلامی ریاست وجود میں نہیں آ سکتی۔ قومی تحریک کی بدولت پاکستان بن جائے گا لیکن اسے "اسلامی" بنانے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اس لئے میں نے اقبال کو موجودہ صدی میں فکر اسلامی کا مجدد قرار دیا ہے اور انقلابِ

اسلامی کا سب سے بڑا داعی بھی کہا ہے' اگرچہ اس جماعت کے قیام کی جانب ان کی زندگی میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اقبال کی انقلابی سوچ تو یہ تھی ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب!
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

انہوں نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا' لیکن اس کے لئے ایک منظم جماعت چاہئے! ایسی حیاتِ دنیوی کے آخری دور میں ان کی کوشش تھی۔ اگرچہ انہوں نے خود کہا ہے کہ ۱۹۰۷ء میں بھی' جبکہ وہ ابھی انگلستان میں تھے' انہیں اس حوالے سے کچھ غیبی اشارات یا کچھ روحانی تجربات ہوئے تھے' لیکن اُس وقت انہوں نے اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پائی۔ وہ ۱۹۳۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ چند سال قبل (یعنی پہلی واردات کے تقریباً ۲۰ برس بعد) مجھے دوبارہ اسی قسم کے اشارات پھر ملے کہ اس طرح کی ایک جماعت بنائی جائے۔ اس کے بعد پھر یہ عمل شروع ہوا۔ پہلے جماعت مجاہدین علی گڑھ قائم ہوئی اور اس کے بعد "جمعیت شبان المسلمین ہند" قائم کرنے کی کوشش ہوئی۔ یعنی ہندوستان کے نوجوانوں کی ایک جمعیت جو فدائی ہو اور امارت اور بیعت سمع و طاعت کے اصول پر کاربند ہو کر کام کرے۔

اسلامی انقلاب کا طریق

اسلامی انقلاب کے ضمن میں اب میں کچھ مثبت باتیں بھی کہنا چاہتا ہوں۔ پاکستان میں اسلامی انقلاب کے خواہش مند تمام لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ان کا مقابلہ صرف اندرون پاکستان کے مغرب پرست' مغربی تہذیب کے دلدادہ اور سیکولر لوگوں اور مراعات یافتہ طبقات سے نہیں ہے بلکہ ان کا اصل مقابلہ نیو ورلڈ آرڈر سے ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے! آپ اپنی قوت کو یہاں کی سطح پر asses کریں تو یہ بڑی بے وقوفی ہو گی۔ یاد کیجئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی اگر سلطنتِ روما اور سلطنتِ ایران کو ابتداء میں پتا چل گیا ہوتا کہ ہماری جڑیں کاٹنے کا کام کہاں ہو رہا ہے تو معاملہ

بالکل ہی مختلف ہوتا۔ غزوۂ تبوک کے بعد تو یہ ہو گیا تھا کہ ایک صحابی کعب بن مالک ؓ کو حضور ؐ نے سزا دی تو شاہِ غسان کا خط لے کر اس کا ایلچی پہنچ گیا کہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے صاحب تم پر بڑا ظلم کر رہے ہیں' تم تو بڑے قیمتی ہیرے ہو' ہمارے پاس آؤ' ہم تمہارا اعزاز و اکرام کریں گے۔ حضرت کعب ؓ نے وہ خط تندور کے اندر ڈال دیا کہ اے اللہ یہ تو میرے اوپر بہت بڑی بپتا آ گئی' میں اس امتحان کے قابل نہیں ہوں۔ غور کیجئے کہ اگر اس دور کی طاقتوں کو پہلے پتا چل گیا ہوتا تو صورت حال کیا ہوتی؟ بہرحال یہ اللہ کی مشیئت اور اللہ کی حکمت تھی۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے ہم سے زیادہ بیرونی قوتیں ہم سے واقف ہیں۔ لہذا صرف بے نظیر یا نواز شریف وغیرہ کو اپنا مدِ مقابل سمجھ کر اپنی پلاننگ نہ کریں۔ اصل میں اس صورت حال اور چیلنج کا اگر مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ قوم کو بحیثیتِ مجموعی بھوکے رہنے اور مرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے! ایران نے اس کی تھوڑی سی جھلک دکھادی تھی کہ کس طرح ایک قوم بحیثیتِ مجموعی مرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا صدام حسین سے مقابلہ تھا جس کے پیچھے اولاً پورا عالم عرب اور اس کے بعد امریکہ تھا۔ اور ایران کی طرف سے Teen agers میدان میں فوج در فوج آ گئے تھے۔ یہ جذبہ جب تک پیدا نہ ہو آپ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اب اس کے لئے عملی شکل کیا ہے؟ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا' کس طرح آئے گا' کیا Steps ہوں گے' یہ میں اپنے خطابات میں بیان کر چکا ہوں۔ آج کسی اور حوالے سے' اور برعکس ترتیب کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔

(۱) پہلا ہدف جو انقلاب کے خواہش مند تمام لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے وہ یہ ہے کہ کم از کم دو لاکھ ایسے سربکف فدائین تیار ہوں جو دو شرائط پوری کریں' یعنی اپنی معاش اور معاشرت میں اسلام کو نافذ کریں اور ایک شخص سے بیعت کر کے سربکف ہو جائیں۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے' لیکن اس کا جو دوسرا پہلو ہے وہ میں چاہتا ہوں کہ آج واضح کر دوں۔

ظاہر ہے کہ یہ دو لاکھ آدمی ایک دن میں تو پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ لیکن جب پیدا ہو جائیں گے تو ان دو لاکھ کے گرد کم از کم دو کروڑ انسان ہوں گے جو اگرچہ اتنے فعال

اور اپنے آپ کو نظم میں کس کر ٹیم اور مسلسل کام کرنے کی صلاحیت کے حامل نہیں ہوں گے' لیکن ان دو لاکھ کے ہم خیال اور بہی خواہ ضرور ہوں گے' Supporters ہوں گے' اور وقت پڑنے پر ان شاء اللہ سرکٹ ہو کر میدان میں آجائیں گے۔ تو دو لاکھ کو دو لاکھ نہ سمجھئے۔ جب دو لاکھ اس نہج کے آدمی تیار ہوں گے تو دو کروڑ آدمی ان کے ساتھ ایسے ہوں گے کہ جب بھٹی دہکے گی تو وہ شاید سرفروشی میں ان دو لاکھ سے بھی آگے نکل جائیں۔ ۱۹۵۳ء میں گاے ماجھے ہی تھے جنہوں نے ختم نبوت کے لئے اپنے سینے کھول کر گولیاں کھائیں اور جانیں دیں۔ میں چشم دید گواہ ہوں' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' اُس وقت میں میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ گوالمنڈی چوک میں کھلنے والے میو ہسپتال کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہم نے وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور کچھ لوگ گرے۔ پیچھے جو لوگ تھے وہ گریبان کھول کر آگے آئے اور انہوں نے بآوازِ بلند کہا "چلاؤ گولی!" چنانچہ پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور کچھ لوگ گرے۔ بعد میں ہمیں آپریشن تھیٹر میں جا کر معلوم ہوا کہ ان میں دو سگے بھائی تھے۔ ایک بھائی پہلی مرتبہ اور دوسرا بھائی دوسری دفعہ نشانہ بنا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کیا نمازی' روزے دار تھے؟ داڑھی والے تھے؟ تو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دو لاکھ فدائین تیار ہوں گے تو دو کروڑ ایسی قوت بھی مہیا ہو جائے گی!

(۲) دوسری بات جسے میں کتنے ہی عرصے سے آپ حضرات کے سامنے اور آپ کی وساطت سے دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں' یہ ہے کہ ان دو لاکھ افراد کے پیدا کرنے کے لئے لازم ہے کہ جو بھی انقلاب پسند قوتیں ہیں وہ اپنے resources کو pool کریں۔ اگر مدغم نہیں ہو سکتے' نہ ہوں' لیکن کم از کم ایک وفاق کی شکل میں تو آئیں' ایک پلیٹ فارم پر تو جمع ہوں۔ دعوت اور تربیت کے مراحل میں تو اپنے وسائل کو جمع کریں۔ سب اپنی قیادتوں اور امارتوں کو سلامت رکھیں لیکن وفاق تو ہو۔ صرف اس کام کے لئے کہ ہمیں وہ ٹارگٹ پورا کرنا ہے' دو لاکھ ایسے افراد تیار کرنا ہیں' اس کے لئے دعوت و تربیت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کام علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹ کر نہیں بلکہ یکجا ہو کر کیا جائے۔ یہی مقصد ہے جس کے حوالے سے میں نے جماعت

اسلامی اور تحریک اسلامی کو وفاق کی پیشکش کی تھی۔ اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انقلابی فکر کا حامل طبقہ صرف یہی ہے۔ انقلاب کا نعرہ لگانے والے اور بھی ہیں۔ میں نے ان سب کے قریب جا کر اور انہیں اپنے قریب لا کر اچھی طرح کھنگال لیا ہے، لیکن کسی اور تِل میں کوئی تیل نہیں ہے۔ لیکن ان جماعتوں میں کم از کم انقلابی فکر تو موجود ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ جب یہ قوت فراہم ہو جائے تو پھر میرے خیال میں Agitation ہو، لیکن خالص مذہبی اور دینی امور پر۔ بدقسمتی سے اس وقت مذہبی جماعت نے بھی نعرہ لگایا تو احتساب کا، دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ احتساب کون کرے گا؟ آپ اینٹی کرپشن کا محکمہ قائم کر دیں تو وہ سب سے بڑھ کر کرپٹ ہو جائے گا۔ احتساب کے لئے جو ادارہ بھی بنائیں گے اس میں کیا آسمان سے فرشتے لے آئیں گے؟ یہ بالکل اَن ہونی باتیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک حد تک احتساب تو اس وقت سیاسی عمل کے ذریعے بھی یقیناً ہوا ہے۔ بہرحال Agitation ہو تو خالص دینی issue پر، جسے عوام بھی مانیں کہ ہاں! یہ واقعی دین کا مسئلہ ہے، یہ کوئی سیاسی یا انتظامی مسئلہ نہیں ہے۔ تب ہی وہ بھوکے رہنے کے لئے تیار ہوں گے۔ تب ہی وہ دو کروڑ آدمی بھی سربکف ہو کر میدان میں آئیں گے۔ اس تحریک کا عنوان "نہی عن المنکر بِالیَد" ہو گا۔ اور یہ مظاہروں سے شروع ہو کر سول نافرمانی تک جائے گی، لیکن پوری طرح disciplined، منظم اور پُرامن انداز میں۔ یعنی مظاہرین اپنی جانیں دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن وہ نہ کسی کی جان لیں اور نہ کسی کی ملکیت کو نقصان پہنچائیں۔ خواہ وہ قومی property ہو یا کسی فرد کی property ہو۔ اسے آپ Unarmed بغاوت کہہ لیجئے جو غیر مسلح اور پرامن مظاہروں سے شروع ہو کر پرامن، منظم سول نافرمانی تک جائے۔ میرے نزدیک انقلاب کے لئے یہی راستہ موزوں ہے۔ لیکن میں نے وفاق بنانے کے لئے اپنی تجویز میں یہ بھی کہا ہے کہ کسی وقت اگر ہمیں یہ محسوس ہو کہ ہم ایک ہی الیکشن میں Sweep کر سکتے ہیں تو الیکشن میں حصہ لینا بھی حرام نہیں ہے۔ لیکن ہیم الیکشن کے process میں حصہ لیتے رہنا صحیح نہیں ہے۔ میرے اطمینان کے لئے مولانا مودودی مرحوم کا قول موجود ہے جو ان کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب کی

وساطت سے کراچی کے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو اور ان کے ذریعے مجھ تک پہنچا ہے۔ یہ ان کے زندگی کے آخری ایام کا قول ہے کہ "مجھے اپنی تین بڑی بڑی غلطیوں کا شدید احساس ہے' جن میں سے ایک مسلسل الیکشن میں حصہ لیتے رہنا ہے۔" جماعت اسلامی نے پہلی بار ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں حصہ لیا تھا اور اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ یہ طریقہ غلط ہے۔ مسلسل الیکشن میں حصہ لیتے رہنا جماعت کی ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ لیکن یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ اگر الیکشن سے کامیابی ہو بھی جائے' تو بحالات موجودہ' الجزائر والا معاملہ بھی پیش آ سکتا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کا مقابلہ کرنے کے لئے تو پھر میدان میں آنا ہی ہے۔ لہٰذا جانیں دیئے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تیاری اسی کام کی کرنی ہو گی کہ دو لاکھ سر بکف فدائین اور باعمل مسلمان ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کر کے منظم طاقت بنیں۔ یہی انقلاب کا واحد طریقہ ہے۔

اور اگر دینی جماعتوں کے وفاق کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تو بہرحال میرے اپنے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ میں تو ۶۵ء سے لے کر آج تک یہی کام کر تا رہا ہوں۔ میں نے ۳۳ برس کی عمر میں اپنی Independent تحریکی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ طالب علمی کے دور میں بھی مسلم لیگ کے ساتھ' تحریک پاکستان میں مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے کارکن کی حیثیت سے کام کیا' پھر جماعت اسلامی کے ساتھ دس برس گزارے۔ اس کے بعد جماعت سے علیحدہ ہونے والے زعماء کے گھروں اور دروں کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہو کر اپنی ذاتی حیثیت میں کام شروع کیا' اور آج تک اسی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ میرے اطمینان کے لئے یہ بہت ہے۔ میری اس جدوجہد کے دو پہلو ہیں۔ اولاً مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں جو دارالارشاد قائم کیا تھا' اور علامہ اقبال کا مجوزہ دارالاسلام جو پٹھان کوٹ میں قائم ہوا' اور مولانا مودودی کا ادارہ جو ۱۹۴۸ء میں روالپنڈی میں قائم ہوا تھا کہ گریجویٹس کو دینی تعلیم دی جائے' ہمارے ان تین اعاظم رجال نے جس کام کا آغاز کیا تھا اور جو بوجوہ چل نہیں پایا' الحمد للہ کہ میں نے اس کو انجمن خدام القرآن' قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے حوالے سے جاری کیا ہے۔ اور اب بھی اسی شمع کو روشن کئے ہوئے ہوں۔ ثانیاً غلبۂ دین کی جدوجہد ہے جس کے لئے

برِّعظیم پاک و ہند میں بیسویں صدی عیسوی میں تین عنوانات کے تحت کوشش ہوئی، مولانا ابوالکلام آزاد کی حزب اللہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک۔ پھر علامہ اقبال کی مجوزہ جمعیت شبان المسلمین ہند، جس کے لئے ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک ان کی مساعی ریکارڈ پر ہیں۔ اور پھر ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کی جماعت اسلامی، جو میرے خیال میں ابتدا میں تو علامہ اقبال ہی کے افکار کے زیرِ اثر قائم ہوئی تھی لیکن بعد میں جماعت اسلامی پاکستان نے جمعیت شبان المسلمین کے طریقے سے منحرف ہو کر ایک قومی سیاسی جماعت کی شکل اختیار کرلی۔ یہ انحراف دو طریقوں سے ہوا۔ ایک قومی قیادت کے ساتھ تصادم مول لیا گیا۔ جماعت اس کی حریف بن کر میدان سیاست میں آگئی۔ جو اقبال کے فلسفے اور ان کے طرز عمل کے بالکل منافی تھا۔ حالانکہ مولانا مودودی مرحوم کو پنجاب بلانے والے تو اقبال ہی تھے۔ دوسرے الیکشن میں حصہ لینا، یہ بھی جمعیت شُبان المسلمین کا جو نقشہ بنایا گیا تھا اس کے خلاف طرز عمل تھا۔ الغرض مولانا ابوالکلام آزاد کی "حزب اللہ" جو ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک قائم رہی، علامہ اقبال کی "جمعیت شبان المسلمین ہند" جو قائم ہی نہیں ہو سکی (۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک چار سال کی محنت تو ہوئی لیکن یہ قائم ہوتے ہوتے رہ گئی) اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کی جماعت اسلامی، یہی وہ تسلسل ہے جسے تنظیم اسلامی اور تحریکِ خلافت پاکستان کے عنوان سے ہم نے جاری رکھا ہوا ہے۔ میرے پاس جو بھی صلاحیت اور قوت ہے میں نے اسی کام میں لگائی ہے، اور ان شاء اللہ لگا تا رہوں گا۔ اسی کے لئے آپ بھی دعا کیجئے، اور میں بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آخری سانس تک اس کام میں لگائے رکھے۔ ہاں میں پکارتا رہوں گا کہ آؤ اور جمع ہو کر کام کرو۔ لیکن کوئی نہ آئے تو میں بیٹھا نہیں رہوں گا۔

اَقولُ قَولی ھٰذا واستغفر اللّٰہَ لِی وَلکم وَلسائرِ المُسلمین وَالمُسلِمات ○○

حقیقتِ تصوّف (۲)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

جس کے بعض حصوں کو "تنظیم الاخوان" نے سیاق و سباق سے کاٹ کر عام کیا!

(خطاب کے ان حصوں کو جنہیں "تنظیم الاخوان" نے اپنے تیار کردہ کیسٹ میں شامل نہیں کیا تھا، قارئین کی سہولت کے لئے جلی حروف میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا ہے)

تزکیۂ نفس، ایمان اور احسان کے حوالے سے جو بات ہم نے سمجھی ہے اسے صوفیاء کی اصطلاحات کے حوالے سے بھی سمجھ لیں۔ میں نے شروع میں "تجلیۂ روح" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ جیسے سورج کی ایک کرن ہے جو ٹھنڈی پڑ گئی ایسا ہی روح کا معاملہ ہے، ذکر الٰہی کے ذریعے گویا آپ نے اسے دوبارہ حرارت پہنچانا شروع کی۔ اس کی روشنی ماند پڑ گئی تھی آپ نے اسے دوبارہ روشن کرنا شروع کیا۔ یہ تجلیہ ہے! اور یہاں بھی میں لفظ "تحریر الروح" کو لانا چاہتا ہوں، لیکن یہاں تحریر کا لفظ حرارت سے ہے۔ روح کا تجلیہ اور روح کو حرارت بہم پہنچانا، یہی ذکر کا اصل کام ہے۔ اور ذکر کے ضمن میں اصل شے قرآن ہے، پھر نماز آتی ہے، اور اس کے بعد اذکار مسنونہ ہیں۔ اس نئی اصطلاح "تحریر الروح" کے جو دو معانی میں نے بیان کئے ہیں، ایک آزاد کرنا اور دوسرے حرارت پہنچانا، تو اس عمل کا نتیجہ وہ ہے جسے فلاطینوس (Plotinus) نے نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے، یعنی "Flight of the alone to the Alone" درحقیقت ہماری روح انتہائی تنہا ہے۔ روح کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں، روح کسی کی باپ ہے نہ کسی کا بیٹا، نہ کسی کا شوہر نہ کسی کی بیوی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جدید فلسفے میں بھی وجودیت کے حوالے سے کرب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے بلند ہونا شروع ہوتا ہے اس میں تنہائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے۔ جتنا اس کے اندر تنہائی کا احساس شدید ہو گا اسی قدر وہ حیوانی سطح سے بلند ہوتا جائے گا۔

ایک طرف انسانی روح کی individuality ہے اور دوسری طرف وہ ذات ہے جو "الاَحَد" ہے۔

روح کا اصل رجحان اللہ تعالیٰ کی جانب ہے۔ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے' اپنے مرکز اور source کی طرف رجوع کرتی ہے۔ روح کی مثال ایک پرندے کی سی ہے جو جسم اور حیوانیت کے پنجرے میں مقید ہے' یہ پرندہ پھڑپھڑاتا ہے اور قید سے آزاد ہو کر اوپر اٹھنا چاہتا ہے۔

یہاں اقبال کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے :

مرا دل سوخت بر تنہائیٔ اُو
کنم سامانِ بزمِ آرائیٔ اُو
مثالِ دانہ می کارم خودی را
برائے اُو نگہ دارم خودی را

یعنی میرا دل جلتا ہے اس صدمے اور رنج سے کہ اللہ اکیلا ہے' تنہا ہے۔ میں اس کی محفل سجانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے دانے کو پروان چڑھایا جاتا ہے تو وہ پودا بنتا ہے' کسان اسے پالتا اور پوستا ہے اسی طرح میں اپنی خودی کی پرورش کر رہا ہوں اور اسے پال رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی خودی یعنی انا یا روح کی حفاظت کر رہا ہوں۔

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ روح کی تقویت کا سامان کرنا ہے' جس کا ذریعہ ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ "ذکر" ہے۔ اس کی شرح کریں تو سب سے بڑا ذکر خود قرآن ہے' پھر نماز اور اذکار مسنونہ۔ اس سے تجلیہ روح حاصل ہو گا اور ایمان کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا' یہاں تک کہ انسان منزل احسان کو پالے گا۔

تقویت و تغذیہ روح کے ساتھ ساتھ جو دوسرا عمل درکار ہے اسے میں نے تہذیب و تزکیۂ نفس سے تعبیر کیا تھا۔

تہذیب و تزکیۂ نفس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ مخالفتِ نفس کی ریاضتیں ا ریاضت

کسے کہتے ہیں؟ مشقیں یا exercises۔ جیسے جسمانی ریاضت کو آپ کسرت کہتے ہیں جو پہلوان کرتا ہے۔ اسی طرح موسیقی سیکھنے والا ریاض کرتا ہے' اسے بھی خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے ورنہ سر ٹھیک نہیں ہوتا۔ اسی پر قیاس کر کے سمجھئے کہ نفس امارہ کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے بھی بڑی محنت کرنا پڑتی ہے' نفس کی مخالفت کرنا پڑتی ہے۔

اس ریاضت میں سب سے پہلی چیز "اقامت الصلوٰۃ" ہے۔ نماز تو ذکر الٰہی کا ذریعہ ہے اور اس اعتبار سے تقویت و تغذیہ روح کا سامان ہے' لیکن اقامت الصلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنا' کہ کوئی مصروفیت' کوئی دوستی' کوئی کاروبار دنیوی آڑے نہ آئے' یہ مخالفت نفس کی ریاضت ہے۔ طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو' مسجد میں آنا ہے۔ شدید سردی ہے اور یخ پانی ہی دستیاب ہے تو اسی سے وضو کرنا پڑے گا۔ تہجد کی نماز میں نیند کو قربان کر کے کھڑا ہونا ہے تو یہ بھی مخالفت نفس ہی کی ایک صورت ہے۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً۔ یہ تہجد نفس کو کچلنے میں نہایت معاون ہے۔ پھر روزہ ہے جس میں جسمانی تقاضوں کی مخالفت کی جاتی ہے۔ تیسری شے انفاق مال ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بھی نفس کی مخالفت ہوتی ہے کیونکہ مال و دولت انسان کو بہت محبوب ہوتا ہے۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔

نوٹ کیجئے کہ اقامت الصلوٰۃ' صوم' اور انفاق مال سے مخالفتِ نفس کا مقصد حاصل ہوتا ہے' اور یہی مقصد دو اور فرائض کی ذریعے بھی پورا ہوتا ہے۔ یہ دونوں فرائض اصل میں ان تینوں کے جامع ہیں۔ لیکن پہلی چیز ہے حج۔ اس میں انفاق مال بھی ہے' احرام کی پابندیاں بھی ہیں' ذکر بھی ہے' نہایت شدید مشقت بھی ہے۔ اور دوسری شے ہے دعوت دین اور اقامت دین کی جدوجہد۔ اس میں بھی مخالفت نفس ہوتی ہے۔ محنت اور مشقت ہے جو آرام و استراحت کے منافی ہے۔ تہمت و ملامت ہے جو تحسین و تعریف کے منافی ہے۔ یہ وہ ضرورت ہے جس

کے لئے صوفیاء کے ایک طبقے نے باقاعدہ فرقہ ملامتیہ ایجاد کیا' کیونکہ یہ بھی نفس کی مخالفت ہی کی ایک صورت ہے کہ لوگ کسی کو حقیر سمجھیں' گالیاں دیں' فاسق و فاجر کہیں۔ آپ آگے بڑھ کر حق کی دعوت دیجئے' اس راہ میں تو محمد رسول اللہ ﷺ جیسے شخص کو بھی کہا گیا کہ پاگل ہیں' مسحور ہیں' شاعر ہیں' کذّاب ہیں' ساحر ہیں۔ (نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن ذٰلِکَ) لیکن حکم ہے کہ صبر کرو۔ تو مخالفت نفس ہو گئی یا نہیں؟ آپ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مال خرچ کر رہے ہیں' یا اگر وقت صرف کر رہے ہیں تو بھی عام مقولے "Time is money" کے مطابق یہ انفاق مال ہی ہے۔ پھر آپ اپنی اور اپنی آل و اولاد کی جانوں کے لئے آفات اور مصائب کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ قتال کا مرحلہ ہے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح بنیادی حیوانی داعیات میں سے دو' یعنی بقائے نفس (Preservation of the self) اور بقائے نسل (Perservation of the species) کی مخالفت ہو رہی ہے یا نہیں؟ اب اس میں سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ خارج میں دو ہی صورتیں ہیں: اللہ کا دین غالب ہے اور اسلامی ریاست موجود ہے تو مخالفت نفس کے لئے اقامت الصلوٰۃ' صوم' انفاق' اور حج کے ذرائع اختیار کیجئے۔ اگر اللہ کا دین پامال ہے تو مخالفت نفس کی ریاضتوں کے سلسلے میں بھی دعوت دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد کو تمام نفلی عبادات پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔

دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد میں انفرادی اعتبار سے جو اصل ہدف ہے وہ ہمارے سامنے آ گیا' یعنی مخالفت نفس کی ریاضت تاکہ روح کو تجلیہ حاصل ہو جائے۔ اب اجتماعی پہلو سے دیکھئے کہ اس میں اضافی حکمت کیا ہے۔ اس جہاد کا ہدف ہے نظام عدل و قسط کا قیام'

تا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انسانوں کے لئے اس سلوک کی راہ کو اختیار کرنا ممکن ہو سکے۔ غور کیجئے کہ کس قدر خود غرضی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ شخص جو برس ہا برس جنگلوں اور ویرانوں میں مخالفت نفس کے لئے مشقتیں جھیل رہا ہے' خود کو مانجھ رہا ہے' رگڑ رہا ہے' اور دوسری طرف کروڑوں انسان مسلسل ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کو وہ موقع ہی میسر نہیں کہ کوئی اعلیٰ خیال یا اونچا آدرش ان کے حاشیہ خیال ہی میں گزر سکے۔ اگر تم اپنی روح کو نفس کی بیڑیوں سے آزاد کرا رہے ہو تو دوسروں کو بھی ظلم و استحصال سے نجات دلاؤ تا کہ وہ بھی اس راہ میں آگے بڑھ سکیں۔

یہ نکتہ میں نے "نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت" نامی کتابچے میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت تاریخ انسانی کے ایک نہایت اہم موقع پر ہوئی ہے۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد سے افراد کی ارادے اور اختیار کی آزادی محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی ہے اور اجتماعی نظام کی گرفت روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ انسان اپنے اجتماعی ماحول اور مجموعی نظام کے اثر سے آزاد ہو کر زندگی گزار سکے۔ چنانچہ آج ظالمانہ نظام کی گرفت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ سیاسی جبر' معاشی استحصال اور معاشرتی اونچ نیچ پر مبنی اجتماعی نظام سے فرد کا متاثر نہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ: "کَادَ الفقرُ اَن یکون کفرًا" یعنی فقر و فاقہ' احتیاج اور افلاس انسان کو کفر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے غافل تو کر ہی دیتے ہیں' بقول فیض ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس سلسلے میں اصل حکیمانہ قول حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غیر منصفانہ ہو گا تو وہاں ایک

جانب دولت کے انبار لگیں گے، عیاشیاں ہوں گی، بدمعاشیاں اور خرمستیاں ہوں گی، اور دوسری طرف فقر و احتیاج ہو گا۔ انسانوں کی اکثریت باربرداری کے حیوانات کی مانند زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے وہ بھی غافل اور یہ بھی غافل، وہ بھی محروم اور یہ بھی محروم۔ ان حالات میں نظام عدل اجتماعی کے قیام کے بغیر انسانوں کی عظیم اکثریت کے لئے روحانی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ خدمتِ خلق کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا۔ اور ایک داعی حق کے لئے یہ چیز نہایت ضروری ہے، ورنہ اس کی دعوت دوسروں تک نہیں پہنچ پائے گی ـــــ دوسری منزل ہے خدمتِ خلق کے حوالے سے لوگوں کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنا، اللہ کی طرف دعوت دینا۔ اس سے بڑی کوئی خدمتِ خلق نہیں ہو سکتی کہ انسان دوسروں کی ابدی زندگی کی فلاح کے لئے کوشش کرے ـــــ خدمتِ خلق کی تیسری منزل یہ ہے کہ خلق خدا کو ظالمانہ نظام کے جبر و استحصال سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ صرف پہلی قسم کی خدمت خلق کو کل سمجھ لینا دراصل دین کے محدود تصور کا شاخسانہ ہے۔

(جاری ہے)

الہام و تفہیم

"قرض اتارو' ملک سنوارو" سکیم میں زکوٰۃ کی رقم کا استعمال؟

گزشتہ دو ہفتوں کے دوران ایک سوال جو امیر تنظیم اسلامی سے متعدد مواقع پر مختلف لوگوں کی طرف سے بار بار پوچھا گیا وہ یہ تھا کہ آیا "قرض اتارو' ملک سنوارو" سکیم میں زکوٰۃ کی رقم کا استعمال جائز ہے؟ ہفتہ کی شام کو اپنے ہفتہ وار درس قرآن کی نشست کے اختتام پر امیر تنظیم نے اس کا جو مفصل جواب دیا اسے افادۂ عام کے لئے شائع کیا جا رہا ہے ——

میں نے عام حالات میں اپنے اوپر ایک پابندی لگائی ہے اور میں بالعموم اس کے خلاف نہیں کرتا کہ فقہی مسائل میں میں دخل نہیں دیا کرتا۔ لیکن موجودہ تناظر میں یہ سوال غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے' لہٰذا اس صراحت کے ساتھ کہ اسے فتویٰ نہ سمجھا جائے' اس بارے میں اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔ جن لوگوں کو میری رائے پر اعتماد ہو وہ اس پر عمل کریں۔ اور جو مزید تحقیق کرنا چاہیں وہ ان علمائے کرام سے پوچھ لیں جو علم فقہ میں گہرا درک رکھتے ہوں۔

میرے نزدیک زکوٰۃ کی رقم "قرض اتارو' ملک سنوارو" سکیم میں دی جا سکتی ہے۔ میرا جواب اثبات میں ہے۔ یعنی میرے نزدیک ایسا کرنا صحیح ہے' غلط نہیں۔ لیکن یہ چیز ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ وہ شرط میں بعد میں بیان کروں گا۔ ہو سکتا ہے بہت سے علماء اور مفتی حضرات میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں۔

دیکھئے' اس وقت ہمیں خاص حالات سے سابقہ ہے۔ ہمارا پورا ملک قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ اس سوال کے جواب کے لئے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے کیا مصارف آئے ہیں' تو بالعموم سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۶۰ ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ O﴾

اس آیت کی رو سے فقہاء اسلام نے آٹھ مدات معین کی ہیں کہ جن میں زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی

ہے۔ اور یہ آٹھ مدات خاص ترتیب سے آئی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں ایسی چیزوں کے بیان میں جو ترتیب ہوتی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

آیت زیر بحث کی رو سے زکوٰۃ کی پہلی دو اور سب سے مقدم مدات فقراء اور مساکین کی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ﴾

"بے شک صدقات فقراء اور مساکین کے لئے ہیں"۔

یاد رہے کہ صدقات سے مراد یہاں زکوٰۃ ہے۔ "فقراء" کے معنی "مفلس لوگ" کے ہیں۔ اور "مساکین" کا ترجمہ "محتاج لوگ" کیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق ہے؟ فقراء وہ لوگ ہیں جو بالفعل مفلس، قلاش اور ضرورت مند ہوں۔ اور "مسکنت" کا لفظ کم ہمتی کے لئے آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ہے جو بظاہر اچھا بھلا نظر آتا ہے لیکن کسی نفسیاتی سبب سے اس میں کام کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ یعنی وہ کسی ایسی اعصابی کمزوری کا شکار ہو گیا ہے کہ ہمت نہیں رہی ہے، تو ایسا آدمی مسکین ہے۔ زکوٰۃ میں سب سے پہلا حق انہی دونوں کا ہے۔ اس میں بھی زکوٰۃ دینے والے کا فرض اولین یہ ہے سب سے پہلے اپنے قرابت داروں اور رشتہ داروں میں دیکھے کہ کون مستحق زکوٰۃ ہے اور اسے زکوٰۃ دے۔ باقی سارے مصارف زکوٰۃ بعد میں آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہو گی اور اس میں زکوٰۃ صحیح صحیح جمع (Collect) کی جائے گی تو زکوٰۃ میں سب سے پہلا حق فقراء اور مساکین ہی کا ہو گا، بلکہ اس میں بھی یہ دیکھا جائے گا کہ جس علاقے کی زکوٰۃ ہے وہ اسی علاقے کے زکوٰۃ کے مستحق، غرباء، مساکین اور فقراء میں تقسیم کی جائے۔

اس کے بعد زکوٰۃ کی مدات کون سی ہیں؟ فرمایا:

﴿وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ﴾ یعنی زکوٰۃ وصول کرنے اور اکٹھی کرنے کے لئے جو ملازم رکھے جائیں گے ان کی تنخواہ زکوٰۃ ہی کی مد سے دی جائے گی۔ جیسے ہمارے ہاں تحصیلدار ہوتا ہے۔ اسے تحصیلدار اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لگان وصول کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں ایک محکمہ "واصل باقی نویس" ہوتا تھا۔ لگان وغیرہ کے جو کھاتے (Accounts) ہوتے تھے یہ محکمہ ان کا حساب رکھتا تھا۔ مثلاً کوئی دیہاتی شخص کسی واصل (وصول کرنے والا) کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے ذمہ دس ہزار واجب الادا ہیں۔ ان میں سے یہ ہزار تو آپ لے لیجئے۔ اب واصل ایک ہزار تو وصول کر لیتا تھا اور اسے لکھ کر دے دیتا کہ اس کے ذمہ باقی کیا رہ گیا ہے۔ واصل باقی نویس ہر تحصیل میں ہوتے تھے اور پھر صدر واصل باقی نویس ضلع میں ہوتا تھا۔ میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ زکوٰۃ کی وصولی کے لئے اب جو بھی ملازم رکھا جائے گا وہ واصل ہو گا۔ اور

اس کی تنخواہ بھی زکوٰۃ میں سے دی جائے گی۔

"وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ" یعنی ان لوگوں پر بھی جن کی دلجوئی منظور ہو' زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک ایسا دور آگیا ہے جب کہ اسلام کے غلبے کی تحریک چل رہی ہے جیسے دور نبوی ؐ میں چل رہی تھی' اور اس میں کسی کی تالیف قلب پیش نظر ہے تو ان پر خرچ بھی زکوٰۃ کی ایک مد ہے۔ فرض کیجئے' ایک شخص معاشرے میں بااثر ہے' لیکن ذرا کم ظرف ہے۔ اب اگر انسان یہ سمجھے کہ کسی ذریعے سے اس کو مال دے کر اس کے دل کو نرم کیا جا سکتا ہے اور نتیجتاً ہماری اسلامی تحریک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور عوام کے لئے آسانی اور بہتری پیدا ہو جانے کا امکان ہے' تو تالیف قلب کی مد میں اس کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس مد کے بارے میں حضرت عمرؓ نے فتویٰ دے دیا تھا کہ اب یہ مد ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ اب اسلام کا غلبہ ہے اور لوگ محض اپنی غرض کے لئے بھی اسلام کی طرف آتے ہیں۔ تاہم چونکہ قرآن مجید میں یہ موجود ہے' اور اسلام بھی آج مظلوب ہے' لہٰذا اگر اسلام کے لئے پھر کوئی تحریک اسی نہج پر چل رہی ہو لیکن کوئی شخص بہت مخالفت کر رہا ہو تو ایسے موقع پر اس کے ساتھ تالیف قلب کا کوئی معاملہ اگر اس تحریک کے لئے مفید ہو سکتا ہو تو اسے بھی زکوٰۃ میں سے دیا جا سکتا ہے۔

آیت ہذا میں اس کے بعد زکوٰۃ کی جو دو مدات آ رہی ہیں وہ ہیں :

﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ﴾

"رقاب" کے معنی "گردنوں کے چھڑانے کے" ہیں اور "رقاب" ہی میں قرض سے نجات دلانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ گردن چھڑا دینا یہ ہے کہ کسی غلام کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔ تو گویا اسے ایک شکنجے سے نکال دیا گیا۔ اب وہ غلامی سے نکل کر آزاد فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ تو اس کے لئے بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔

"غارمین" وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو کوئی تاوان پڑ گیا ہو۔ قبائلی زندگی میں خاص طور پر ایسا ہوتا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کے قبیلے کے کسی شخص نے دوسرے قبیلے کے کسی شخص کو قتل کر دیا۔ اب تاوان کی رقم پورے قبیلے کے افراد میں تقسیم ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک آدمی کے لئے اتنا بڑا تاوان دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کسی پر کوئی اور بوجھ آگیا ہے جس سے چھٹکارا پانا اس کے لئے مشکل ہے تو اس بوجھ سے نجات دلانے کے لئے بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ "رقاب" اور "غارمین" بھی جوڑا ہے۔ یہ بھی ایک دوسرے کے بالکل اسی طرح مشابہ ہیں' جیسے "فقراء" اور "مساکین" اور "وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا" اور "الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ" مشابہ ہیں۔

آگے فرمایا :

﴿وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ﴾

ان دونوں میں بھی لفظ "سبیل" کے اشتراک نے ان کو ایک جوڑا بنا دیا ہے۔ "وفی سبیل اللہ" "اور اللہ کے راستے میں" یعنی جہاد کے لئے' اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد' دعوت اسلامی کے فروغ اور دین کی حفاظت کے لئے خرچ کرنا' فی سبیل اللہ ہے۔ مثلاً کوئی ایسا دور اگر آ جائے جس میں عوامی سطح پر دین کی تعلیم کے لئے اگر انتظام نہ کیا جائے تو دین میں بگاڑ پیدا ہونے کا خطرہ نظر آ رہا ہو تو تعلیمی مقاصد کے لئے بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جا سکتی ہے۔ برصغیر میں تقسیم ہند سے قبل انگریز کی حکومت تھی۔ اور اس زمانے میں اگر دینی مدارس قائم نہ کئے جاتے اور سرکاری مدارس ہی رہتے' تو ہماری مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں' ان میں کوئی نماز پڑھانے والا نہ ہوتا' کوئی اذان دینے والا نہ ہوتا' کوئی خطبہ دینے والا نہ ہوتا' آج کوئی نکاح پڑھانے والا ہمیں نہ ملتا۔ لہٰذا اس وقت علماء نے زکوٰۃ کی رقم سے مدرسوں کے قیام اور تعلیم دین کا جو انتظام کیا' ٹھیک کیا۔ ہم بعض اوقات علماء پر تنقید کرتے ہیں تو اس حوالے سے کہ انہوں نے دنیوی تعلیم کو بالکل نظرانداز کر دیا اور یک رخی تعلیم کا بندوبست کیا' لیکن ہمیں اس کا مثبت پہلو بھی دیکھنا چاہئے۔ انہوں نے اس پرفتن دور میں روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا اور حفاظت و اشاعت دین کے لئے جابجا مدرسے بنائے۔

"وَابْنِ السَّبِیْلِ" یعنی راہ گزر' مسافر بھی زکوٰۃ کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ابتداء اسلام کے زمانے میں نہ کوئی سرائیں تھیں' نہ کہیں موجودہ دور کی طرح کے سفر کے مناسب انتظامات تھے اور نہ ہی ہوٹل تھے۔ مزید برآں یہ کہ سفر میں ڈاکے پڑتے تھے' چوریاں ہو جاتی تھیں' کوئی حفاظت نہیں تھی' لہٰذا بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی کھاتا پیتا شخص بھی اثنائے سفر میں کسی بپتا اور مصیبت کا شکار ہو جاتا تھا اور یہ صورت آج بھی پیش آ سکتی ہے۔ لہٰذا ایسے راہ گیر اور مسافروں کی بھی زکوٰۃ کے ذریعے مدد کی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ کی یہ آٹھ مدات ہیں۔ ان میں سے میں سمجھتا ہوں کہ "فی سبیل اللہ" کی مد تو ہے ہی اشاعت دین کے لئے' یوں بھی حقیقت یہ ہے کہ آج فقیر اور مسکین بھی سب سے بڑھ کر ہمارا دین ہی ہے اور سب سے بڑا یتیم بھی ہمارا دین ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ دین کا کام کرنے والوں' خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو ہمہ وقت تبلیغ و اشاعت دین میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی معاش کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتے' ان کی زکوٰۃ کی مد سے مدد کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں سورۃ البقرہ میں فرمایا : "اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" "جو اللہ کی راہ میں

گھر گئے" لیکن "لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" وہ معاشی بدحالی کے باوجود لوگوں سے مانگتے نہیں ہیں، البتہ "تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ" "تم ان کے چہروں سے انہیں پہچان لو گے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص مفلسی میں ہے تو چہرے کے اوپر اثرات تو ضرور ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمہارا فرض یہ ہے کہ تم لوگ خود ان کو تلاش کر کے انفاق فی سبیل اللہ کرو۔ یہ لوگ خاص طور پر زکوٰۃ و صدقات کے مستحق ہیں۔

بہرحال جو سوال کیا گیا ہے اس کے حوالے سے جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری پوری قوم "فِی الرِّقَابِ" کی مد میں بھی آتی ہے۔ اور ہمارا پورا ملک "غَارِمِیْنَ" میں بھی شامل ہے۔ لہذا میرے نزدیک قرض چکانے کے لئے "قرض اتارو، ملک سنوارو" سکیم بھی زکوٰۃ کا صحیح مصرف ہے۔ اور اس میں ہمیں زکوٰۃ دینا چاہئے۔ البتہ یہ چیز ـــــ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ـــــ ایک شرط کے ساتھ جائز ہو گی۔ وہ شرط کیا ہے؟ وہ شرط یہ ہے کہ یہ طے کر لیا جائے کہ اس زکوٰۃ کی رقم سے قرض کے اصل زر کی ادائیگی کی جائے گی، نہ کہ اس سے اصل قرض پر جو سود ہے، وہ ادا کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے جو تین صورتوں میں نجات قرض کے لئے مدد کی اپیل کی ہے ان تین صورتوں کو کسی صورت بھی گڈمڈ نہ کیا جائے۔ ان میں سے ایک عطیہ ہے۔ یعنی کسی نے کوئی رقم بغیر کسی شے کے دے دی تو یہ عطیہ ہو گی۔ دوسرے قرض حسنہ ہے۔ یعنی کسی نے کہا کہ میں دس سال کے لئے دس لاکھ روپے بغیر سود کے دے رہا ہوں۔ مجھے دس سال کے بعد اتنی ہی رقم واپس دے دی جائے۔ تیسری شکل Investment کی ہے۔ یعنی اتنے لمبے عرصے کے لئے رقم دی جائے تو اتنا فی صد زائد ملے گا۔ یہ تو سود ہے۔ لیکن اس سکیم میں زکوٰۃ کی ادائیگی اسی صورت میں جائز ہو گی جبکہ ان تینوں مدات سے آنے والی رقوم گڈمڈ نہ ہوں۔ اگر ان تینوں مدات کو گڈمڈ کر دیا جائے تو میرے نزدیک اس میں زکوٰۃ دینا درست نہ ہو گا۔ اس لئے اب اگر اس سکیم میں زکوٰۃ طلب کی جاتی ہے تو حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ رکھے۔ اور وصول ہونے والی زکوٰۃ کی رقم کو ہمارے ذمہ جو اصل قرض واجب الادا ہے، اس کا کھاتہ کھول کر اس میں ادا کیا جائے۔ تاکہ اس میں کمی آنا شروع ہو۔ اگر اس شرط کو پورا کر دیا جاتا ہے تو میرے نزدیک حکومت کی موجودہ قرض اتارو سکیم زکوٰۃ کی رقوم کا مصرف بن سکتی ہے۔

○ ○ ○

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۶
شمارہ :	۴
ذوالحجہ	۱۴۱۷ھ
اپریل	۱۹۹۷ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون	۱۰۵/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت : 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون : 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110

پبلشر : ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"ہمارا مطالبہ' ہماری اپیل ــــ دستور خلافت کی تکمیل!"

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ اگرچہ ملک کے سیاسی مسائل کا موزوں ترین اور پائیدار حل حقیقی صدارتی نظام کے قیام ہی میں مضمر ہے' اس لئے کہ صدارتی نظام زیادہ منطقی بھی ہے اور تمدنی ارتقاء کے بلند تر مرحلے کا مظہر بھی' تاہم موجودہ سیاسی تناظر میں صدر کے خصوصی آئینی اختیارات کے خاتمے اور حقیقی پارلیمانی نظام کی بحالی سے ملک کو سیاسی سطح پر استحکام اور حکومت وقت کو اعتماد حاصل ہو گا۔ طویل عرصہ سے ملک کا سیاسی نظام صدارتی اور پارلیمانی نظام حکومت کا ملغوبہ بن چکا تھا چنانچہ آٹھویں ترمیم کی متنازعہ دفعات کے خاتمے سے یہ دو عملی ختم ہو گئی ہے۔ البتہ آئندہ کسی مرحلے پر اس موضوع پر ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا نواز شریف کی قیادت میں ارکان اسمبلی نے پارلیمنٹ کی بالادستی کی بحالی کے لئے "کمال پھرتی اور کامل اتفاق" کا مظاہرہ کیا ہے مگر شریعت کی بالادستی کی جانب ابھی تک توجہ نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے میاں محمد نواز شریف سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی بالادستی کی بحالی کے بعد ہی سہی' اب قرآن و سنت کی بالادستی کے نفاذ کے لئے آئین میں فوری طور پر چودھویں ترمیم منظور کرائیں۔

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ میاں محمد نواز شریف آئینی ترمیم کے لئے دستور پاکستان کی دفعہ 2 میں شق ب کا اضافہ کروائیں تا کہ پورے ملک میں ہر سطح پر قرآن و سنت کی مکمل اور غیر مشروط بالادستی کی راہ ہموار ہو سکے۔ مزید برآں قرار داد مقاصد کے منافی آئینی دفعات کو دستور سے خارج کیا جائے یا انہیں قرار داد مقاصد کے تابع کیا جائے۔ انہوں نے کہا دستور کی دفعہ 203 (ب) کی ذیلی دفعہ (ج) میں ترمیم کر کے وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے دستور سمیت عدالتی اور عائلی قوانین کے استثناء کو ختم کیا جائے اور وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی شرائط ملازمت کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے مساوی کیا جائے۔ امیر تنظیم اسلامی نے مطالبہ کیا کہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف وفاقی شرعی عدالت کے سود سے متعلق فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی

اپیل فوراً واپس لینے کا اعلان کریں اور اندرون ملک سود کی ادئیگی توفی الفور بند کر کے آنے والے بجٹ سے ایک بڑے بوجھ کو کم کر دیں اور ایک سال کی مدت کے اندر اندر ملک سے سودی نظام کی لعنت کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے اللہ اور رسولؐ سے جاری جنگ بند کریں۔"

یہ ہے وہ اخباری بیان جو کہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں متفقہ طور پر منظور کی گئی تیرھویں ترمیم پر تبصرہ کرتے ہوئے جاری کیا جس کی رو سے دستور میں شامل آٹھویں ترمیم کے ان تمام متنازعہ حصوں کو دستور سے حذف کر دیا گیا جن کی رو سے صدر پاکستان کو وہ غیر معمولی اختیارات حاصل تھے جنہوں نے موجودہ پارلیمانی جمہوری نظام کو صدارتی اور پارلیمانی نظام کے بین بین لا کھڑا کیا تھا کہ موجودہ صورت میں اسے نہ پارلیمانی نظام قرار دیا جا سکتا تھا اور نہ صدارتی! نتیجتاً آئے روز اسمبلیوں کا ٹوٹنا ایک معمول بن چکا تھا اور جمہوری استحکام کا حصول قریباً ناممکن ہو کر رہ گیا تھا ـــــ بلاشبہ نواز شریف حکومت کے اس اقدام کو اگر پاکستان کی سیاسی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا' تاہم ہماری ـــــ یعنی تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کی ـــــ اصل دلچسپی اس دستوری ترمیم سے ہے جس کے بھرپور مطالبہ کی مہم کا امیر تنظیم اسلامی نے اپنے ۱۴/ مارچ کے خطاب جمعہ سے آغاز فرمایا ہے۔ اس مضمون کا حوالہ سطور بالا میں مذکور امیر تنظیم کے اخباری بیان میں بھی بصراحت موجود ہے۔

امیر تنظیم کے مذکورہ خطاب کو مکمل شکل میں زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ تاہم "مطالبہ تکمیل دستور خلافت" کی مہم کے نقطہ نظر سے ندائے خلافت کا حالیہ شمارہ' جس پر ۷/ اپریل ۹۷ء کی تاریخ درج ہے' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ "میثاق" کے تمام قارئین کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہو گا کہ وہ اس شمارے کو ضرور حاصل کریں اور اس مہم میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے اس میں نہ صرف یہ کہ ۱۲ مارچ ۴۹ء کو طے پانے والی قرارداد مقاصد کا مکمل متن شائع کر دیا گیا ہے کہ جسے بجا طور پر پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کی "خشت اول" قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے بعد اس رخ پر ہونے والی ایک اور اہم پیش رفت یعنی پاکستان میں موجود تمام

مسالک کے چوٹی کے علماء کرام کے پیش کردہ دستور اسلامی کے بائیس متفقہ نکات پر مشتمل تاریخی دستاویز بھی شامل ہے۔ اسی طرح امیر تنظیم کا مرتب کردہ ایک اہم مضمون "پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ اور اس میں اسلامی دفعات کی تدریجی شمولیت" بھی مذکورہ شمارے میں شامل ہے۔ ان مضامین کا مطالعہ' پاکستان میں بسنے والے ہر باشعور مسلمان کے لئے جو پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کا دل سے آرزومند ہو' ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی کے ۲۸/ مارچ کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ توحید کا تصور محض ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ اسلام کے فکر و عمل کی بنیاد ہے۔ نظریہ توحید پر پورے طور پر عمل کرنے سے انسان ہر قسم کے خوف اور اندیشہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں اپنے خطاب جمعہ میں انہوں نے کہا ہے کہ نظریہ توحید کا اہم ترین گوشہ کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اسی حاکمیت کو زمین پر عملاً قائم و نافذ کرنے کا ایک نام زمین میں آسمانی بادشاہت ہے جبکہ قرآن نے اسے خلافت کہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا قرارداد مقاصد میں پاکستانی قوم نے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ریاستی دستوری سطح پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرنے کے اعلان سے نظام خلافت کا تقاضا دستوری سطح پر پورا ہو جاتا ہے۔

"خلافت" تمام انسانوں کا حق ہے مگر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم نہ کرنے والے "باغی" انسان خلافت کے حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا سیاست اجتماعی معاملات کو انجام دینے کا نام ہے۔ ختم نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے انبیاء ہی یہ فریضہ ادا کرتے تھے اور ہر نبی اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ خلافت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوتا تھا مگر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کے بعد خلافت کو انسانوں کا اجتماعی حق قرار دے کر انسانیت کو بے مثال آزادی عطا کر دی گئی۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو باہمی مشورے سے خلیفہ کے انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کثرت رائے سے فیصلے کرنا اور قانون سازی کرنا غیر اسلامی نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا قرآن و سنت کے احکامات کو سو فیصد اکثریت بھی بدل نہیں سکتی۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا پچاس سال بعد مسلم لیگ کا از سر نو احیاء ہو چکا ہے چنانچہ اگر اب بھی نواز شریف نے نفاذ اسلام کے لئے فیصلہ کن قدم نہ اٹھایا تو شاید قومی سطح پر ہمارے لئے یہ سنبھلنے کا آخری موقع ثابت ہو۔ انہوں نے کہا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کرے۔ اگر اب بھی اسلامی نظام قائم نہ کیا گیا تو ملک جو پہلے ہی تباہی کے کنارے پہنچ چکا ہے مزید تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا نواز شریف ضیاء الحق کے "سیاسی وارث" ہونے کی حیثیت سے نفاذ اسلام کے کام کو آگے بڑھائیں اور دستور پاکستان میں شامل قرارداد مقاصد کے منافی دفعات کو ختم کر کے قرآن و سنت کی مکمل بالادستی قائم کریں۔

الحمد للہ کہ پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کی
خشت اول ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء ہی کو
قرار داد مقاصد

کے حسب ذیل ایمان افروز الفاظ کے ذریعے رکھ دی گئی تھی کہ :

"چونکہ کل کائنات پر حاکمیت کا مالک صرف اللہ ہے جو قادر مطلق ہے' اور پاکستان کے عوام کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جو اللہ کی معین کردہ حدود کے اندر اندر ہی استعمال ہو سکتے ہیں ـــــ اور چونکہ یہ پاکستان کے عوام کا عزم مصمم ہے کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کریں جس میں ریاست اپنے اختیارات اور اقتدار کا استعمال عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے کرے گی' جس میں جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور عدل اجتماعی کے ان اصولوں کی پوری پابندی کی جائے گی جو اسلام نے معین کئے ہیں...."

اس لئے کہ ان جامع الفاظ کے ذریعے نہ صرف یہ کہ اللہ کی حاکمیت مطلقہ کے اس دائمی اور اٹل اصول کو جو توحید الٰہی کا لازمی تقاضا ہے' صرف تکوینی ہی نہیں بلکہ تشریعی (Legislative) دائرے میں بھی تسلیم کر لیا گیا ہے' بلکہ خلافت کی اس صورت کو بھی واضح طور پر معین کر دیا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے اختتام کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے ـــــ یعنی "خلافت عوام" جسے حضرت عمرؓ نے "امر المسلمین" کے الفاظ سے تعبیر کیا تھا۔ مزید برآں نظام عدل اجتماعی کے ضمن میں بھی طے کر دیا ہے کہ وہ اسلام کے معین کردہ اصولوں پر مبنی ہو گا۔

لہٰذا اب پاکستان میں اصل مرحلہ
تکمیل دستور خلافت

کا ہے جس کے ضمن میں تنظیم اسلامی و تحریک خلافت پاکستان نے ایک عوامی مطالبہ مہم کا آغاز کیا ہے
پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کے خواہشمند حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس مہم میں
بھرپور حصہ لیں!

(امیر تنظیم اسلامی کی مرتب کردہ عبارت جو "ندائے خلافت" کے حالیہ شمارے کے سرورق پر شائع کی گئی)

تذکرہ و تبصرہ

پاکستان میں نظامِ خلافت کے کم از کم دستوری تقاضے
اور
"تکمیلِ دستورِ اسلامی" کی مطالباتی مہم

امیر تنظیم اسلامی کے ۱۴/ مارچ ۹۷ء کے خطابِ جمعہ سے ماخوذ

خطبۂ مسنونہ، تلاوتِ آیاتِ قرآنی اور ادعیہ ماثورہ کے بعد :

حضرات! آج میں اس مقام پر اپنے اس خطاب جمعہ سے اللہ کے نام کے ساتھ اور اس کی توفیق اور تائید کے بھروسے پر "مطالبۂ تکمیل دستور اسلامی" کی مہم کا آغاز کر رہا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کو اور اس کے قائد میاں نواز شریف صاحب کو توفیق دے کہ وہ پاکستان میں اقبال اور جناح کے تصورات کے مطابق اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کی صورت میں دستور کی سطح پر آخری اور فیصلہ کن قدم اٹھائیں ۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے!

اس ضمن میں چند وضاحتیں ضروری ہیں، تاکہ ہماری اس مہم کے بارے میں کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مہم جو ہم لے کر اٹھ رہے ہیں، اس میں ہمارے پیش نظر نہ تو سیاسی اعتبار سے کسی کے حریف یا حلیف بننے یا کشاکش اقتدار اور Power Politics میں دخل دینے اور شامل ہونے کا کوئی ارادہ ہے اور نہ ہی انتخابی سیاست میں آنے کا کوسوں دور تک کوئی امکان ہے۔

دوسری وضاحت یہ ہے کہ اصلاً ہماری تمام تر توجہات، خواہ وہ تحریک خلافت کے

پلیٹ فارم سے ہوں یا تنظیم اسلامی کے عنوان سے 'ہمہ گیر اسلامی انقلاب پر مرکوز ہیں' جس میں آج کی دنیا کے اعتبار سے اہم ترین پہلو اقتصادی انقلاب ہو گا۔ اس لئے کہ جب تک اقتصادی ڈھانچہ اسلام کے مطابق نہیں ہوتا اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کا جنازہ نہیں نکلتا' اس وقت تک کسی انقلاب کو اسلامی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس ہمہ گیر اور ہمہ پہلو اسلامی انقلاب کا طریق کار میں بارہا بیان کر چکا ہوں۔ اس کے لئے سب سے پہلے ذہنی و فکری تبدیلی کی ضرورت ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی ایک ایسی مضبوط جماعت عملاً تشکیل دی جائے جو سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت پر مبنی ہو۔ یہ جماعت کم از کم دو لاکھ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو پہلے اپنی معاش اور معاشرت کو منکرات سے پاک کریں اور پھر ایک مضبوط اور منظم جماعت کی شکل اختیار کریں۔ جب یہ تربیت کی بھٹیوں سے گزر جائیں تب باطل نظام کے خلاف جانیں دینے کے لئے میدان عمل میں آ جائیں۔ یہ ہے ہمارا اصل کام اور ہماری توجہات' ہمارے اوقات اور ہماری سرگرمیوں کا اصل ہدف۔ میرے نزدیک اس کے اعتبار سے اہم ترین چیز شیعہ سُنّی مفاہمت ہے۔ یعنی اس انقلاب کی جانب پیش رفت نہیں ہو سکے گی جب تک کہ اہل تشیع اور اہل سُنّت کے مابین مفاہمت کی فضا پیدا نہ ہو جائے۔

پیش نظر انقلاب کے لئے جس جماعت کے قیام اور اس کی جن شرائط کا تذکرہ میں نے کیا ہے وہ جماعت ہم نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے قائم کر رکھی ہے۔ جو شخص ہمارے ساتھ آنا چاہے وہ آج ہی اپنی معاش اور معاشرت کو پاک کرنے کا ارادہ کر کے اس کے لئے کوشش شروع کر دے اور پھر سمع و طاعت کی بیعت کر کے تن من دھن کے ساتھ قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ تاہم اس اصل کام کے ساتھ ساتھ' معاشرے میں جو بھی کام ہو رہے ہیں ان میں ﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کے اصول کے تحت ہم ہر نیکی اور بھلائی کے کام میں تعاون اور ہر غلط کام پر تنبیہ کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ اور حدیث نبوی "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" کے تحت عامۃ المسلمین اور ائمۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کے لیڈروں دونوں کو بھلائی کی بات کہہ رہے ہیں اور کہتے رہیں گے قطع نظر اس سے کہ کوئی لیڈر ہمیں

پسند ہو یا ناپسند' لیکن چونکہ ان کے ہاتھ میں عملاً زمامِ حکومت آگئی ہے اور اگر ان سے کوئی خیر وجود میں آجائے تو اس کا بڑے پیمانے پر ظہور ہو گا اور اگر وہ غلطی کرتے ہیں تو اس کے اثرات پوری ملک و قوم پر پڑیں گے' لہٰذا ہم انہیں صحیح بات بتانا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔

اس نصح و خیر خواہی کے معاملہ میں ہم ائمۃ المسلمین کو عامۃ المسلمین پر مقدم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم انہیں ایک مشورہ دیتے اور ایک اچھی نصیحت کرتے ہیں کہ ملکی دستور میں ایک بنیادی تبدیلی لائی جائے اور یہاں اسلامی ریاست کے قیام اور نظامِ خلافت کے آغاز کے لئے کم از کم دستوری لوازم کی جانب ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا جائے۔ یوں تو اسلامی نظام یعنی نظامِ خلافت ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ اس کا معاشی پہلو بھی ہے' سماجی پہلو بھی ہے' معاشرتی مسائل بھی ہیں' انفرادی معاملات بھی ہیں' لیکن آج کی دنیا میں اہم ترین دستاویز ریاست کا دستور ہوتا ہے۔ اس لئے کسی بھی نوع کی تبدیلی کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ باقی ساری چیزیں اُس کے تابع ہوتی ہیں۔ قانون سازی اور اختیارات کی تقسیم وغیرہ اسی کے تحت ہوتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں پارلیمانی نظام ہے تو وزیر اعظم کے اختیارات' صدر کے اختیارات' نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے اختیارات کا تعین دستور میں طے ہو گا۔ اس طرح اگر صدارتی نظام ہے تو صدر کی حدود کار کیا ہیں؟ اور اس پر کیا قدغنیں عائد ہو سکتی ہیں' یعنی Checks and balances کا کیا نظام ہو' یہ ساری چیزیں درحقیقت دستور میں موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا ابتداء اس سے کرنی پڑے گی کہ دستور کی سطح پر اسلامی ریاست کے کم از کم تقاضے تو پورے کر دیئے جائیں۔ اگر یہ بنیادی کام کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے ایک گیند کو حرکت دے دی ہے' اب وہ گیند چل پڑی ہے اور اب تدریجاً اس سے ان شاء اللہ بہت بڑی تبدیلی بر آمد ہو گی۔ لیکن یاد رہے کہ وہ گیند ہوا سے پوری طرح بھری ہونی چاہئے۔ اگر اس میں سے ہوا نکلی ہوئی ہو تو گیند نہیں چلے گی۔ ہمارے ہاں دستوری سطح پر اسلام کی طرف اب تک جو پیش رفت ہوئی ہے' وہ ایسے ہی ہے کہ بغیر ہوا کے گیندوں کو لڑھکانے کی کوششیں کی گئی ہیں' اس لئے ان سے وہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔

پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ
اور مرحلہ وار پیش رفت

اب ذرا اس بات کا جائزہ لے لیا جائے کہ ہمارے ہاں دستور سازی کی تاریخ کیا ہے اور اس میں کس حد تک اور کس کس مرحلے پر اسلام کی جانب پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ ایک بڑی تلخ داستان ہے، جسے یہ عنوان دیا جا سکتا ہے کہ ؂

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں، اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئینِ گلستان کیا ہوگا، دستورِ بہاراں کیا ہوگا!

اس کا ایک اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا تھا، لیکن ۵۰ء کے وسط تک تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا دستور بنے گا اور کیسے بنے گا، کسی دستور کا وجود ہی نہیں تھا اور ع "خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری!" کے مصداق دراصل بے دستوریت ہی ہمارا دستور تھا۔

قراردادِ مقاصد کی منظوری

دستور سازی کی تاریخ میں سب سے بڑی، مستحکم اور معجزانہ پیش رفت ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد کی منظوری کی صورت میں ہوئی، جس کے الفاظ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں سب سے اہم مسئلہ اور بنیادی بات تو طے ہو گئی کہ حاکمیت کی سزاوار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے (Sovereignty belongs to Allah) اور پاکستان کے عوام کے پاس شہریوں کی حیثیت سے جو بھی اختیارات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقدس امانت ہیں۔ ان اختیارات کا استعمال انہی حدود و قیود کے اندر ہوگا جو اصل حاکم یعنی اللہ تعالیٰ نے عائد کر دی ہیں۔ گویا ایک طرح سے اسلامی ریاست کا بنیادی تقاضا طے ہو گیا۔ چنانچہ میرے نزدیک قرارداد مقاصد کے ذریعے ملکی دستور کی سطح پر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کا تقاضا بھرپور طریقے سے پورا ہو چکا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ قرار دادِ مقاصد میں یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے میں مدد دی جائے گی۔ یہ ایک مثبت بات تھی، جس میں "سُنّت" کا لفظ بھی آ گیا۔ یہ ایک درجے میں objective principle بن جاتا ہے، البتہ صراحت کے ساتھ یہ بات مذکور نہیں تھی کہ اس ملک میں کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ چنانچہ قرار دادِ مقاصد میں یہ ایک خلا موجود ہے اور اسی لئے میرا موقف یہ ہے کہ اس میں "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰه" کے تقاضے کی پورے طور پر تکمیل نہیں ہوئی ہے۔

BPC رپورٹیں اور ان کا حشر

قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد "بنیادی اصولوں کی کمیٹی" (Basic Principle Committee) کی دو رپورٹیں یکے بعد دیگرے سامنے آئیں، تاکہ ان رپورٹوں اور کمیٹی کے طے کردہ بنیادی اصولوں کی روشنی میں دستور تیار کیا جا سکے۔ پہلی رپورٹ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء کو لیاقت علی خان (مرحوم) کے ذریعے سے آئی، لیکن اس میں اسلام کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا۔ گویا اس کی رو سے قرار دادِ مقاصد کی حیثیت تو محض تلاوت قرآن کی تھی جس سے کسی محفل کا آغاز کر دیا جائے اور پھر اس محفل میں دین سے مطلقاً کوئی سروکار نہ ہو---- البتہ دوسری رپورٹ جو ۲۲/ دسمبر ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین صاحب نے پیش کی، اس میں اسلام کی طرف ایک قدم اٹھایا گیا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ساتھ علماء بورڈز تشکیل دیئے جائیں گے، تاکہ وہاں جو بھی قانون سازی ہو رہی ہو، پہلے ان علماء بورڈز کے ذریعے سے دیکھ لیا جائے کہ اس میں کوئی شے کتاب و سنت کے منافی تو نہیں ہے۔ یہ یقیناً ایک مثبت پیش رفت تھی، لیکن اس رپورٹ پر مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ اس کے بعض نکات کسی ایک پہلو سے مشرقی پاکستان والوں کے لئے ناقابل قبول تھے اور بعض اعتبارات سے مغربی پاکستان والوں کے لئے۔ پھر اس میں پیش کی گئی علماء بورڈز کی تجویز پر بھی بہت لے دے ہوئی کہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ علماء بورڈز کے پاس اسمبلی سے بالاتر

اختیار ہوگا اور اس طرح ایک مذہبی حکومت (Theocracy) وجود میں آجائے گی۔ چنانچہ یہ رپورٹ بھی ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی۔

محمد علی بوگرہ فارمولا

۱۶/ اپریل ۵۳ء کو گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو برطرف کر کے محمد علی بوگرہ صاحب کو وزیراعظم نامزد کر دیا۔ محمد علی بوگرہ نے اکتوبر ۵۳ء میں ایک نیا فارمولا پیش کیا جو "محمد علی فارمولا" کہلاتا ہے۔ انہوں نے علماء بورڈز کا معاملہ ختم کر کے اس فیصلے کا اختیار کہ دستور میں کوئی شے کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں' سپریم کورٹ کے حوالے کر دیا۔ یہ فارمولا کسی حد تک مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو سیاسی اعتبار سے اور اپنے حقوق کے اعتبار سے قابل قبول لگا۔

پہلے عام انتخابات اور ان کا نتیجہ

اس فارمولا کے تحت آگے بڑھنے کا کوئی مرحلہ ابھی آیا ہی نہیں تھا کہ ۱۹۵۴ء میں پاکستان میں پہلے انتخابات منعقد ہوئے' جن میں مشرقی پاکستان میں سیاسی اعتبار سے مسلم لیگ کا جنازہ نکل گیا اور ۳۱۰ کے ایوان میں مسلم لیگ کے حصے میں صرف ۱۰ سیٹیں آئیں۔ اس مرحلے پر بنگلہ زبان کی بنیاد پر ایک عظیم تحریک اٹھ کھڑی ہوئی اور بنگلہ نیشنلزم اور بنگلہ دیش کے بیج بوئے جانے لگے۔ ادھر ذاتی سطح پر غلام محمد اور محمد علی بوگرہ کے درمیان اختیارات کی جو چپقلش پیدا ہو گئی تھی اس بنا پر بوگرہ صاحب کا بھی بوریا بستر گول ہوا اور ان کا فارمولا بھی ان کے ساتھ گیا' اور ساتھ ہی دستور ساز اسمبلی کو بھی برخاست کر کے اس کی بساط لپیٹ دی گئی---پارلیمانی نظام میں صدر اور وزیراعظم کے مابین اختیارات کی تقسیم ہمیشہ مابہ النزاع رہی ہے اور اس میں صدر بمقابلہ وزیراعظم کا یہ چکر ہمیشہ چلتا رہتا ہے' الا یہ کہ ان میں سے کوئی ایک ربڑ سٹمپ بن کر رہ جائے۔ یہ درحقیقت ثنویت ہے کہ جو قابل عمل نہیں ہے۔

پاکستان میں ایک عرصے تک دستور کے نہ بن سکنے کا ایک اہم سبب مشرقی اور مغربی پاکستان کے دونوں خطوں کے درمیان بعض اعتبارات سے بڑے تضادات کی موجودگی

تھی۔ مغربی پاکستان کو ہر اعتبار سے اولیت حاصل تھی کہ وہ عالم اسلام کے ساتھ متصل ہے' اس کا رقبہ زیادہ ہے' ترقی کے امکانات بہت ہیں' جبکہ عددی اعتبارات سے آبادی مشرقی پاکستان کی زیادہ تھی لیکن رقبہ اور ترقی کے امکانات کم تھے۔ اس کے علاوہ وہاں ہندو اقلیت ایک بڑی مؤثر تعداد میں موجود تھی۔ اس بنا پر دونوں خطوں کے درمیان اقتدار اور اختیارات میں توازن کا مسئلہ درپیش تھا' جس کی وجہ سے دونوں BPC رپورٹیں رد ہو گئیں اور دستور سازی نہ ہو سکی۔

۱۹۵۶ء کا دستور

بہرحال اس کے بعد چوہدری محمد علی صاحب بڑی محنت' مشقت' کوشش اور دن رات کی عرق ریزی کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اس دستور میں کچھ اسلامی دفعات بھی آئیں۔ اسی وقت اسلامی نظریاتی کونسل (Council of Islamic Idealogy) بھی بنائی گئی' تاکہ اس کونسل میں شیعہ' سنی' بریلوی' دیوبندی' اہلحدیث' غرضیکہ تمام مکاتیب فکر کو نمائندگی دی جا سکے اور یہ لوگ تحقیقات کریں کہ ملکی قوانین میں کیسے ردوبدل کیا جائے اور انہیں کیسے اسلامی قالب میں ڈھالا جائے۔ تو یہ ۵۶ء کا دستور تھا' جسے آج بھی بہت سے لوگ یاد کرتے ہیں کہ اگر اس دستور کے مطابق گاڑی چل رہی ہوتی تو شاید ہمارا معاملہ بہت آسانی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوتا۔ لیکن ہوا کیا؟

ایوب خان کا دورِ آمریت

۵۶ء کا دستور ۲۳/ مارچ ۵۶ء کو نافذ ہوا۔ اس کے تحت عام انتخابات کا انعقاد ۱۹۵۹ء میں ہونا تھا' لیکن انتخابات کے انعقاد سے پہلے ہی اکتوبر ۵۸ء میں جنرل ایوب خان صاحب اور سکندر مرزا صاحب نے مل کر ساری دستوری بساط پھر لپیٹ دی اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ چنانچہ ۵۶ء کا دستور بھی کالعدم قرار پا گیا اور دستور ساز اسمبلی بھی ختم ہو گئی۔

صدر ایوب خان نے ۱۷/ فروری ۱۹۶۰ء کو ایک آئین کمیشن مقرر کیا۔ یہ مکمل طور

ایک شخص واحد کا منتخب کردہ ادارہ تھا اور کسی کی طرف سے اسے کوئی نمائندگی حاصل نہ تھی۔ یہ کمیشن سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس شہاب الدین صاحب کی سربراہی میں قائم کیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۲ء کا صدارتی دستور بنایا گیا جس میں سارے اختیارات بنیادی جمہوریتوں (Basic Democracy) سے ہوتے ہوئے ایک شخص واحد محمد ایوب خان کی ذات میں مرتکز ہو گئے تھے۔ اب اس دستور کے مطابق بھی کچھ عرصہ حکومت چلتی رہی۔ لیکن پھر ۶۸، ۶۹ کا ہنگامی دور آیا، جس میں ایوب خان کے خلاف زبردست تحریک چلی۔ دراصل صدر ایوب خان نے کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کے ساتھ ساتھ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے نام سے ایک اور ادارہ قائم کر دیا تھا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اس کے چیئرمین تھے۔ انہوں نے "Islam" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں اسلام سے متعلق خاص طور پر حقیقتِ وحی کے ضمن میں ایسی باتیں موجود تھیں جن کے بارے میں یہاں کے تمام علماء کی یہ رائے قائم ہوئی کہ اس میں کفریہ کلمات موجود ہیں۔ اور یہ چونکہ ایک حکومتی ادارے کی طرف سے شائع ہوئی تھی، لہٰذا حکومت کے خلاف ایک عظیم تحریک شروع ہو گئی۔

یحییٰ خان کا مارشل لاء اور سقوط مشرقی پاکستان

اس تحریک کے نتیجے میں ۶۸ء کے آخر میں صدر ایوب خان صاحب استعفاء دے کر اقتدار کے ایوانوں سے رخصت ہو گئے، لیکن جاتے جاتے اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عنانِ حکومت نیشنل اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار خان کے سپرد کرنے کی بجائے جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر کے روانہ ہو گئے اور یوں ہمارے ملک پر دوسرا مارشل لاء مسلط ہو گیا۔ اسی اثناء میں ۷۰ء کے الیکشن ہوئے۔ ۵۴ء میں جو الیکشن ہوئے تھے ان کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں بنگلہ بھاشا اور بنگلہ نیشنلزم کی تحریک اٹھی اور اس طرح بنگلہ دیش کی بنیاد پڑی، جبکہ ۷۰ء کے الیکشن کے تحت پاکستان دولخت ہو گیا اور بنگلہ دیش معرض وجود میں آ گیا اور پاکستان صرف مغربی پاکستان تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ حکومت

۷۰ء کے الیکشن کے نتیجے میں اس "پاکستان" میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت قائم ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو بہت سے امتیازات سے ایک متنازعہ (controversial) شخصیت تھے۔ خود پاکستان کے دولخت ہونے میں ان کا کیا کردار ہے اس کے بارے میں چاہے ایک سے زائد رائیں ہوں' لیکن عام رائے یہی ہے کہ پاکستان کو توڑنے میں ان کا بھی حصہ ہے اور وہ اس کے مجرم ہیں۔ پھر وہ برسراقتدار بھی آئے تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے۔ لیکن ان منفی پہلوؤں کے ساتھ ان کا ایک مثبت کردار بھی رہا ہے۔

۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بہت بڑا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ انتہائی کوشش' محنت اور لگن سے ۱۹۷۳ء کا دستور متفقہ طور پر منظور کرایا۔ انہوں نے اس وقت قومی اسمبلی کے ۱۲۸ میں سے ۱۲۵ ارکان کے دستخط حاصل کئے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا اتفاق رائے (consensus) اور کیا ہو سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ' چاہے اس کا کریڈٹ آپ ذوالفقار علی بھٹو کو نہ دیں بلکہ ان دینی جماعتوں کو دیں جن کا مسلسل مطالبہ تھا کہ یہاں اسلامی دستور بنایا جائے اور یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے' لیکن بالفعل صورت یہ تھی کہ ۷۳ء کے دستور میں بعض ایسی چیزیں شامل ہوئیں جو اسلامی دستور اور نفاذ اسلام کے اعتبار سے بڑی محکم اور مستحکم تھیں۔ مثلاً:

☆ ہر ریاست کا ایک نام ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ نظریاتی اعتبار سے اس ریاست کی کیا حیثیت ہے۔ ۷۳ء کے دستور میں پاکستان کا نام جمہوریہ اسلامیہ پاکستان (Islamic Republic of Pakistan) رکھا گیا۔ اس سے گویا ریاست کی نوعیت معین کردی گئی۔

☆ پہلی مرتبہ دستور کی دفعہ ۲' میں ریاست کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا گیا۔

☆ پارلیمانی نظام میں دو ہی حیثیتیں چوٹی کی اہمیت کی حامل ہیں' یعنی صدر اور وزیراعظم۔ آئین کی رو سے ان دونوں کا مسلمان ہونا شرط لازم قرار دیا گیا۔

☆ ریاست پاکستان کے اغراض و مقاصد اور منزل مقصود کے حوالے سے طے کر دیا گیا کہ یہاں تمام قوانین تدریجاً اسلامی رخ پر ڈھالے جائیں گے۔ اس مقصد کے لئے دو ادارے C.I.I یعنی Council of Islamic Idealogy اور "اسلامی تحقیقاتی ادارہ" پہلے سے کام کر رہے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء

چار سال تک حکومت کرنے کے بعد مارچ ۷۷ء میں بھٹو صاحب نے جو انتخابات کرائے' ان میں بہت بڑے پیمانے پر دھاندلی ہوئی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں فوری طور پر پاکستان قومی اتحاد (PNA) کے جھنڈے تلے ایک زبردست تحریک اٹھ کھڑی ہوئی اور ہر طرف انتشار اور افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور دستور کو معطل کر کے جمہوریت کی بساط پھر لپیٹ دی گئی۔ گویا ہم پھر اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ضیاء الحق کے دور میں نفاذِ اسلام کی طرف پیش رفت

۱۹۸۵ء میں شدید دباؤ کے تحت ضیاء الحق صاحب نے جمہوریت کی بحالی کا قدم اٹھایا اور مارشل لاء اٹھا کر ۷۳ء کا دستور دوبارہ نافذ کر دیا۔ البتہ آئین میں بعض ایسی ترامیم کیں' جن کے ذریعے اسلام کی طرف کچھ پیش رفت بھی ہوئی۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پہلی پیش رفت یہ ہوئی کہ قرارداد مقاصد جو اب تک دستور میں صرف دیباچے (Preamble) میں تھی' اسے دستور کا جزوِ لاینفک بنایا دیا گیا۔ چنانچہ آئین کے آرٹیکل 2 جس کی رو سے پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہو گا' اس میں آرٹیکل A-2 کا اضافہ کر دیا گیا اور اس طرح اب قرارداد مقاصد کو دستور کے substantive part اور operative clause کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

دوسری مثبت پیش رفت یہ کی گئی کہ ابتداءً ضیاء الحق صاحب نے ہائی کورٹ کی سطح پر شریعت بینچ بنائے۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ قابل عمل نہیں ہیں' کیونکہ ہو سکتا ہے کہ

ایک ہائی کورٹ میں ایک شریعت بنچ کوئی ایک فیصلہ دے تو دوسرا کوئی اور فیصلہ دے' تو پھر کیا بنے گا؟ لہٰذا انہوں نے ایک فیڈرل شریعت کورٹ بنائی۔ اس فیڈرل شریعت کورٹ کو نظری اعتبار سے تو پورا اختیار دیا گیا۔ چنانچہ کوئی قانون خواہ وہ پہلے سے کتاب قانون کا جزو ہو' یا کوئی مسودۂ قانون ابھی اسمبلی کے اندر زیر تجویز ہو' یا ابھی کوئی نیا قانون پاس ہوا ہو' غرض کسی بھی قانون کے بارے میں' خواہ اسے کسی نے عدالت میں چیلنج کیا ہو' یا عدالت از خود اس کا جائزہ لینا چاہے' وفاقی شرعی عدالت کو غور کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے بارے میں مختلف آراء کو سن کر اور فریقین کو مناسب وقت دے کر کہ وہ اپنے دلائل اور اپنی آراء سامنے لا سکیں' عدالت طے کر سکتی ہے کہ آیا یہ قانون کُلی یا جزوی طور پر یا اس کی کوئی شق کتاب و سنت کے منافی ہے یا نہیں۔ اگر وہ یہ طے کر دے کہ کوئی قانون یا اس کی فلاں شق خلاف اسلام اور کتاب و سنت کے منافی ہے تو عدالت اس کے لئے ایک مدت متعین کر دے گی اور اگر وہ صوبائی معاملہ ہوا تو گورنر اور صوبائی اسمبلی کو' اور اگر وفاقی ہوا تو وزیر اعظم اور صدر مملکت کو مطلع کر دے گی کہ اتنی مدت کے اندر اندر اس کے متبادل قانون سازی کی جائے۔ یعنی قانون سازی عدالت نہیں کرے گی بلکہ قانون سازی تو قانون ساز ادارہ یعنی اسمبلی ہی کرے گی۔ لیکن ماہرانہ مشورہ (expert opinion) کہ آیا کوئی قانون کتاب و سنت کی حدود کے اندر ہے یا نہیں' عدالت دے گی۔

اس ماہرانہ مشورہ کی حیثیت محض "سفارش" کی نہیں ہوگی کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی کسی رپورٹ کی طرح وزارتِ مالیات یا وزارتِ قانون کی الماریوں میں دفن ہو جائے' بلکہ اس کے پاس ایک operative authority ہوگی۔ لہٰذا عدالت کی طے کردہ مدت کے اندر اندر متبادل قانون سازی کرنا مقننہ کی ذمہ داری ہوگی۔ ورنہ خلا پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس مدت کے اختتام پر وہ قانون کلی یا جزوی طور پر کالعدم ہو جائے گا۔

وفاقی شرعی عدالت کا قیام واقعتاً اسلامائزیشن کی جانب ایک مثبت قدم تھا۔ لیکن ضیاء الحق صاحب نے اس ساری مثبت پیش رفت کو اس طرح منفی بنا لیا کہ انہوں نے اس

عدالت کو دو ہتھکڑیاں پہنا کر اور دو بیڑیاں ڈال کر پوری طرح پابندِ سلاسل کر دیا۔ یعنی بعض امور کو عدالت کے دائرۂ اختیار سے بالاتر قرار دیا۔ یہ چار امور درج ذیل ہیں :

☆ وفاقی شرعی عدالت دستورِ پاکستان کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔

☆ جوڈیشل لاز یا عدالتی ٹریبونلز کے قواعد و ضوابط کو بھی اس عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

☆ عائلی قوانین کے بارے میں بھی یہ عدالت کچھ نہیں کہہ سکتی۔

☆ اور مالیاتی قوانین بھی اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں گے۔

البتہ مؤخر الذکر ہتھکڑی یعنی مالیاتی معاملات کے بارے میں رائے نہ دینے یا فیصلہ نہ کرنے کی پابندی پہلے پانچ سال کے لئے تھی، جسے بعد میں پانچ سال مزید بڑھا کر دس سال کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ پابندی محدود وقت کے لئے تھی، لہٰذا ۱۹۹۰ء میں یہ ہتھکڑی خود بخود کھل گئی اور فیڈرل شریعت کورٹ کو مالیاتی معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ چنانچہ جب اس کے سامنے بنک انٹرسٹ کا معاملہ آیا تو اس نے اس کی سماعت کی اور آخر کار بنک انٹرسٹ کو ربا قرار دیا، جو اسلام میں حرامِ مطلق ہے۔ یہ ہے وہ پوزیشن جہاں آج ہم کھڑے ہیں۔ گزشتہ پچاس برس میں نفاذِ اسلام کی جانب جو دستوری پیش رفت ہوئی ہے میں نے اس کا مثبت پہلو بھی آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور منفی پہلو بھی!

مثبت پیش رفت کے مواقع اور بارہ کا عدد

اس مثبت دستوری پیش رفت میں ایک بات بڑی عجیب ہے جس پر میں نے آج ہی غور کیا ہے کہ پہلی مثبت اور محکم پیش رفت تو قراردادِ مقاصد تھی، لیکن اس کی حیثیت بنیاد کی تھی۔ تعمیر کے ضمن میں پہلی مثبت پیش رفت ۷۳ء کے دستور میں ہوئی۔ اور دوسری اس وقت جب ٹھیک بارہ سال بعد ضیاء الحق صاحب نے ۸۵ء میں ۷۳ء کے دستور میں بعض ترامیم شامل کیں۔ اور اس کے بعد اب پھر پورے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ اب پھر ہمیں ایک موقع ملا ہے کہ ہم اس جانب مزید مثبت پیش رفت کر سکیں۔

"اِثنا عَشَر" یعنی بارہ کے عدد کی دین میں ایک عجیب حیثیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے، جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے وجود میں آئے۔ حضرت موسیٰؑ نے ان کے لئے بارہ ہی نقیب مقرر کئے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر بارہ نقیب ہی مقرر فرمائے، حالانکہ اوس اور خزرج دو ہی قبیلے تھے، ایک میں سے ۹ اور دوسرے میں ۳ نقیب بنائے گئے۔ بہرحال اب پھر وہ مرحلہ ہے کہ بارہ برس کے بعد ہماری اسمبلی پھر اس پوزیشن میں آ گئی ہے کہ اولاً پاکستان مسلم لیگ کا احیاء ہو چکا ہے اور اسے ایوان زیریں اور ایوان بالا دونوں میں دو تہائی اکثریت حاصل ہو چکی ہے۔ اس مکمل اکثریت (Absolute Majority) کے ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ نفاذ اسلام کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتی تو اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی عذر موجود نہیں ہے۔ اتنی بڑی اکثریت دراصل اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلم لیگ پر اتمامِ حجت ہے۔ اور میرے نزدیک یہ غالباً اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کا آخری موقع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر پہلی اتمامِ حجت ۱۹۴۷ء میں کی تھی کہ جب دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست عطا کی تھی۔ حالانکہ ۱۹۴۶ء میں پاکستان کا مطالبہ کرنے والی جماعت مسلم لیگ اور اس کے قائد، قائداعظم محمد علی جناح فوری طور پر ایک آزاد اور خودمختار پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے تھے جب انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اللہ کی رحمت نے یہ گوارا نہ کیا، بلکہ اس کی طرف سے یہ کہا گیا کہ تم نے تو "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے لگائے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں ایک آزاد اور کلیتاً خود مختار پاکستان دیتا ہوں اور پھر ﴿فَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ "ہم دیکھیں گے تم کرتے کیا ہو"۔ آیا تم اپنے وعدے کو پورا کرتے ہو یا نہیں، اور جس نظریہ کے لئے علیحدہ ریاست چاہتے ہو اس نظریہ کا وطن میں بول بالا کرتے ہو یا نہیں!

قیام پاکستان کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ جانتے ہیں۔ میں نے دسمبر ۹۴ء میں یوم سقوط ڈھاکہ کے موقع پر اپنے خطاب میں وضاحت کی تھی کہ اس ضمن میں کن لوگوں سے کیا غلطیاں ہوئی ہیں؟ اس معاملے میں یقیناً ہمارے اسلاف اور بزرگوں سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہمارے بعض دینی رہنماؤں سے بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ ہم نے بھی اپنے شب و

روز کے انداز' اپنے رہن سہن' اپنے معاش اور اپنی معاشرت میں کوئی تبدیلی نہیں کی' بلکہ آج مادیت' دولت پرستی' نفس پرستی اور شہوت پرستی کا جو سیلاب بہہ رہا ہے اس میں ہم بھی بہے جا رہے ہیں۔ غرض غلطیوں سے بچا ہوا کوئی نہیں' بلکہ اس میں ہر ایک شخص کا حصہ ہے اور پوری قوم نے اللہ تعالیٰ سے کئے جانے والے عہد سے بے وفائی کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قیام پاکستان کے چوبیس برس بعد اپنے عذاب کا کوڑا ہم پر دے مارا اور ۱۹۷۱ء میں ملک دولخت ہو گیا۔ اس کے بعد سے اب تک ہمارے ہاں جو افرا تفری رہی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

مسلم لیگ کی موجودہ کامیابی اور اس کی ذمہ داری

اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان مسلم لیگ کو دو تہائی کی اکثریت سے ایسی حکومت عطا کر دی ہے جس کے بارے میں سب کہتے ہیں کہ یہ جمہوری حکومت ہے۔ چنانچہ رابن رافیل نے بھی کہا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت مستحکم ہوئی ہے۔ پھر یہ بھی مانا گیا ہے کہ ان انتخابات کے اندر کوئی دھاندلی (rigging) نہیں ہوئی ہے' اگرچہ pre polling engineering کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی سب جانتے ہیں کہ مسلم لیگ کی یہ مضبوط قیادت یہیں سے ابھری ہے۔ یہ یکدم کہیں کسی "آسمان" سے نہیں ٹپک پڑی ہے' یعنی محمد علی بوگرہ صاحب کی طرح امریکہ سے درآمد شدہ نہیں ہے۔ میاں نواز شریف صاحب میدان میں آئے تو انہوں نے بڑی محنت اور مشقت کر کے مسلم لیگ کو ایک زندہ' فعال اور مضبوط جماعت بنایا ہے۔ اور اس جماعت کو مسلمانان پاکستان نے توقعات سے بڑھ کر بھاری مینڈیٹ دے دیا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے سابقہ دور حکومت میں قیادت اور اکثریت کسی ایک جماعت یا فرد واحد کو حاصل نہیں تھی بلکہ وہ مجموعی طور پر "اسلامی جمہوری اتحاد" کے پاس تھی۔ لیکن اب تو ایک جماعت اور ایک قیادت کو مطلوبہ اکثریت حاصل ہوئی ہے' للہٰذا اب کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اور مسلم لیگ کی کامیابی پر سورۃ انبیاء کی آخری آیت صد فی صد منطبق

ہو رہی ہے کہ ﴿وَاِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ﴾ "اور میں یہ نہیں کہہ سکتا، ہو سکتا کہ یہ تمہارے لئے ایک نئی آزمائش ہو، اور ایک وقت معین کے لئے ایک مہلت (اللہ نے تمہیں دے دی) ہو"۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتمام حجت کا یہ دوسرا موقع ہے۔ اگر اس واضح کامیابی اور اکثریت اور اللہ کے اس کامل اتمام حجت کا پاس نہ کرتے ہوئے ہم نے اسلام کے نظام عدل کے لئے کچھ نہ کیا تو پھر ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ اے "پاکستاں" والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

نظامِ خلافت کے کم از کم دستوری تقاضے

اس وقت ہم تکمیل دستور اسلامی کا جو مطالبہ لے کر اٹھ رہے ہیں، اس کے ضمن میں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ حکومت سے ہمارا مطالبہ فوری انقلاب کا نہیں ہے، کیونکہ ایک دم انقلاب تو کسی انقلابی جدوجہد کے بعد آیا کرتا ہے جس سے نظام فوری طور پر تبدیل ہوتا ہے اور بالکل ایک نئی طرز پر تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ پہلا قدم اٹھائیے۔ یعنی دستور میں اسلامی ریاست کے کم از کم تقاضے پورے کر لیجئے۔

اس ضمن میں صرف چار اقدامات کی ضرورت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے صرف دو اقدامات بنیادی ہیں اور دو ذیلی اقدامات ہیں۔ موجودہ دستور کے اندر چار جگہ تھوڑی سی لفظی ترمیم کر دی جائے تو نظام خلافت اور اسلامی ریاست کے دستوری تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دستور کے تحت گاڑی خود بخود چلے گی اور رفتہ رفتہ مختلف معاملات کی اصلاح ہوتی جائے گی، کیونکہ جب یہ طے ہو جائے کہ یہاں کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی تو ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ اگر وہ کسی چیز کو خلاف اسلام سمجھتا ہے تو اس کے خلاف عدالت میں جائے۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ جاگیرداری خلاف اسلام ہے اور پاکستان کی زمینیں خراجی (ریاستی ملکیت) ہیں، عُشری (یعنی کسی کی ذاتی ملکیت) نہیں ہیں، لہٰذا نیا بندوبست اراضی کیا جائے۔ اسی طرح کوئی

سمجھتا ہے کہ غیر حاضری زمینداری اسلام میں جائز نہیں ہے کیونکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے' تو اب عدالت معاملہ کی سماعت کر کے یا تو اسے خلاف اسلام قرار دے دے گی یا اگر (صاحبین کے فتویٰ کے مطابق) اس کے جواز کا فیصلہ کرے گی تو وہ شرائط بھی عائد کر دے گی جو مزارعت کے لئے قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے عائد کی تھیں۔ لیکن یہ سارا کام اسی وقت ہو سکے گا جب اس کے لئے بنیادی دستوری مشینری وجود میں آ جائے۔ اگر وہ نہیں ہے تو اس جانب کوئی قدم اٹھ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ آج کوئی ہمارے عائلی قوانین کے خلاف اپیل دائر کرے تو سپریم کورٹ بھی کہہ دے گی کہ ہمارے تو ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' یہ تو شریعت کورٹ کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ غرض نظام کی پورے طور سے اصلاح درحقیقت ایک دم سے نہیں ہو جائے گی بلکہ تدریجاً ہو گی۔

اسلام میں قانون سازی کی وسعت

اس کے ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید پورا اسلامی قانون بنا بنایا رکھا ہوا ہے اور ایک ہی دن میں لا کر نافذ کر دیا جائے گا' لہٰذا اب نئی قانون سازی کی تو گنجائش ہی نہیں ہو گی۔ حالانکہ یہ غلط فہمی ہے' ایسا ہرگز نہیں ہے۔ غیر اسلامی قوانین کو مرحلہ وار کالعدم قرار دیا جاتا رہے گا اور جو قانون بھی کالعدم کیا جائے گا' عدلیہ کہے گی کہ دستور کے تحت اس کی متبادل قانون سازی کی جائے اور مقننہ نیا قانون بنائے گی۔ اسلام میں قانون سازی کا بہت وسیع دائرہ موجود ہے۔ اس لئے کہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر شے جائز ہے سوائے اس کے جس کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ وہ ناجائز اور حرام ہے۔ اگر اصول یہ ہوتا کہ ہر شے حرام ہے اِلّا یہ کہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ جائز ہے تو قانون سازی کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا' کیونکہ جب تک ہمارے پاس کسی شے کی حلت و اباحت کے لئے کتاب و سنت سے مثبت دلائل نہ ہوتے' ہم اسے اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس اصول سے کہ ہر شے مباح ہے اِلّا یہ کہ ثابت ہو جائے کہ یہ حرام ہے' قانون سازی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ مثلاً آج کل جو بھی بجٹ سازی ہوتی ہے' اس کے متعلق سارے کے سارے معاملات مباح کے درجے میں

ہیں۔ چنانچہ سود اور جاگیرداری وغیرہ کو نکال دیا جائے تو باقی معاملات میں آپ آزاد ہیں کہ مختلف شعبوں کے لئے کتنی رقوم مختص کرنی ہیں، تعلیم کو کتنا دینا ہے، ڈیفنس کو کتنا دینا ہے، صحت کے لئے بجٹ کا کتنا حصہ رکھنا ہے، وغیرہ۔ اسی طرح دستور سازی میں یہ طے کرنا کہ مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کا تناسب کیا ہو، ریاست کی نوعیت وفاقی (Federal) ہو، وحدانی (Unitary) ہو یا نیم وفاقی (Confederal)، پھر یہ کہ طرز حکومت پارلیمانی ہونا چاہئے یا صدارتی! اس طرح کے سارے معاملات میں قرآن و سنت کی رو سے ہم پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی، بلکہ انہیں ہم اپنی مرضی سے اپنے حالات کے مطابق طے کر سکتے ہیں۔

اس کو ایک مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے فرض کریں ہمارے پاس ایک وسیع میدان ہے جس میں ہم ایک کھونٹے سے ۱۰۰ گز لمبی رسی کے ساتھ کسی گھوڑے کو باندھ دیتے ہیں۔ اب دو سو گز قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ جائے گا، جس میں گھوڑا آزاد ہے، چاہے وہ شمال میں جائے یا جنوب میں، مشرق میں جائے یا مغرب میں۔ وہ چاہے تو پچاس، ساٹھ یا ستر گز تک جائے یا سو گز تک چلا جائے، وہ آزاد ہے، لیکن مشرق، مغرب، شمال یا جنوب کسی سمت میں بھی اسے ۱۰۱واں گز نہیں آئے گا۔ اسی طرح مسلمان بھی قرآن و سنت کے دائرے کے اندر آزاد ہیں۔ اس دائرے میں وہ "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کی قرآنی تعلیم کے مطابق اپنے سارے معاملات باہمی مشورے سے طے کر سکتے ہیں جو کہ جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ گویا اس دائرے کے اندر ہم وہ تمام جمہوری اصول جو دنیا نے بنائے ہیں، اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دائرے سے باہر نہیں جا سکتے، یہاں تک کہ اگر دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی کا اصول طے کر دیا جائے تو سو فی صد ارکان اسمبلی بھی اس دائرے کی حدود پھلانگ نہیں سکتے۔ اگر وہ اس حدود سے باہر نکلیں گے، اور کوئی غیر اسلامی قانون وضع کریں گے تو عدلیہ اسے کالعدم قرار دے دے گی، کیونکہ موجودہ دور میں عدلیہ دستور کی محافظ (Custodian) ہوتی ہے۔

قانون سازی کا بنیادی اصول اور عملی تنفیذ کا طریق کار

اسلام میں قانون کا بنیادی اصول اور اس کی عملی تنفیذ کا طریقہ کار کیا ہے؟ اس کو سورۂ نساء کی آیت ۵۹ کے حوالے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرمایا :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ... ﴾

"اے اہل ایمان، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔"

نوٹ کیجئے کہ یہاں اللہ اور رسول دونوں کے ساتھ "اطاعت" کا لفظ آیا ہے لیکن "اولوا الامر" کے ساتھ لفظ "اطاعت" نہیں آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی دو اطاعتیں مستقل بِالذّات اور مطلق (absolute) ہیں جبکہ اولوا الامر کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے تابع ہے۔ پھر ان کے ضمن میں یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ اولوا الامر "تم میں سے ہوں" یعنی مسلمان ہوں۔ آج دیکھا جائے تو ملکی سطح پر ہمارے اولوا الامر کی حیثیت اسمبلی کے نمائندوں اور ان کے منتخب کردہ وزیر اعظم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم یقیناً ان لوگوں کی اطاعت کریں گے لیکن یہ اطاعت "معروف" کے دائرے میں ہو گی، مطلق نہیں ہو گی۔ مطلق، مستقل بِالذّات اور غیر مشروط اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔ چنانچہ فرض کیجئے کہ اسمبلی ایک قانون بناتی ہے اور اس کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ قانون قرآن و سنت کے ساتھ متصادم نہیں ہے، لیکن کوئی شہری کہتا ہے کہ یہ قرآن و سنت کے منافی ہے، تو گویا اب اختلاف پیدا ہو گیا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس کا جواب اسی آیت کے اگلے حصے میں یوں دیا گیا کہ :

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾

"اور اگر تم کسی معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو۔"

اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دینے سے مراد کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ لیکن یہ کون طے کرے گا کہ یہ معاملہ قرآن و سنت سے متجاوز

ہوا ہے یا نہیں؟ یہ بات عدلیہ طے کرے گی۔ جب دستور میں طے ہو گا کہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی' تو اب ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ کسی خلافِ اسلام معاملہ کے خلاف عدالت میں اپیل دائر کرے۔ اب عدالت اس کی سماعت کرے گی۔ علماء' ماہرین اور مختلف نظریات کے لوگ عدالت میں آئیں گے اور اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کریں گے اور آخر کار عدالت فیصلہ کرے گی۔ چنانچہ چند سال قبل وفاقی شرعی عدالت میں جب یہ معاملہ زیر سماعت تھا کہ آیا بینک انٹرسٹ اور تجارتی سود ربا ہے یا نہیں' تو ایس ایم ظفر صاحب اور خالد اسحٰق صاحب نے آکر اپنے دلائل پیش کئے تھے کہ یہ ربا نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کے پاس کوئی دلائل تھے ہی نہیں۔ اب اگر عدالت زیر سماعت قانون یا اس کی کسی شق کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دے تو عدالت کا فیصلہ واجب العمل (binding) ہو گا۔ چنانچہ اب عدالت مدت معین کرے گی کہ اتنے عرصے میں متبادل قانون بنایا جائے' ورنہ اس عرصہ کے بعد وہ قانون کالعدم ہو جائے گا اور خلا کی ذمہ دار حکومت ہو گی۔ البتہ کسی مجبوری کے باعث حکومت نیا قانون وضع کرنے کے لئے کچھ وقت کی مہلت مانگ سکتی ہے۔ گویا قانون سازی تو مقننہ ہی کرے گی البتہ ماہرانہ رائے (expert opinion) کا اختیار عدلیہ کو حاصل ہو گا۔ میرے نزدیک یہی بہترین طریقہ ہے۔ ضیاء الحق صاحب نے اسی طریقہ کو اختیار کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے وفاقی شرعی عدالت قائم کی تھی۔ البتہ ان کا یہ اقدام ہرگز درست نہیں تھا کہ انہوں نے بعض امور کو شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا۔

مقننہ اور عدلیہ کے دائرہ کار کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آخری فیصلہ کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہو گا اور وہ اکثریت سے طے کر دے گی کہ آیا کوئی قانون کتاب و سنت کے منافی ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ لوگ اقبال کا بھی غلط طور سے حوالہ دیتے ہیں' حالانکہ اگر ان لوگوں کے موقف کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا منطقی تقاضا تو یہ ہے کہ صرف علماء ہی انتخاب لڑیں اور وہی اسمبلی میں جائیں' کیونکہ جس طرح کسی طبی معاملے میں صحیح فیصلہ ڈاکٹر ہی کر سکتے ہیں

اسی طرح یہ بات علماء ہی طے کر سکتے ہیں کہ کوئی معاملہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ لیکن چونکہ یہ چیز روحِ عصر اور مروّجہ جمہوری اصولوں کے منافی ہے' لہٰذا بہترین راہ یہی ہے کہ ماہرانہ رائے دینے کا اختیار عدلیہ کو دیا جائے۔

وزیر اعظم کی توجہ کے لئے چند آیاتِ مبارکہ

اس کے بعد اب ہم وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف صاحب کی خدمت میں دستور میں اصلاحات کے لئے چند مطالبات کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ان کی خدمت میں اس آیت کریمہ کا ہدیہ پیش کرتے ہیں کہ :

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝ ﴾ (ابراہیم : ۷)

یعنی "(اے لوگو) اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں مزید نوازوں گا۔ (یہ "نوازوں" کا لفظ میں نواز شریف صاحب کے حوالے سے استعمال کر رہا ہوں' جیسے کہ لوگ کہتے ہیں کہ "خدا نواز رہا ہے تمہیں نواز شریف") اور اگر تم کفر کرو گے تو میرا عذاب بھی بہت سخت ہے"۔

اس آیت میں "کفر" کے معنی اگرچہ "کفرانِ نعمت" بھی لئے جا سکتے ہیں لیکن کفر اپنے اصطلاحی معنوں میں بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت ۴۴ کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ :

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ﴾

"جو اللہ کے اتارے ہوئے (قانون' ہدایت یا ضابطے) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔"

اس آیت کی رو سے ہم اس وقت اجتماعی یعنی ریاستی اور دستوری سطح پر کافر ہیں۔ اس لئے کہ ہم قرآن و سنت کے مطابق فیصلے نہیں کر رہے ہیں۔ اگلی آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے :

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ﴾

"اور جو اللہ کے اتارے ہوئے (قواعد و ضوابط اور قانون) کے مطابق فیصلے نہیں

کرتے وہی تو ظالم ہیں۔"

اور "ظالم" کا لفظ قرآن مجید کی اصطلاح میں جہاں "حق تلفی کرنا" کے معنی میں آتا ہے وہیں یہ لفظ شرک کے لئے بھی آتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (لقمان : ۱۳)

"بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔"

سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴ اور ۴۵ میں "حکم بما انزل اللّٰہ" کو تسلیم نہ کرنے والوں کو "کافر" اور "ظالم" قرار دینے کے بعد آیت ۴۷ میں فرمایا گیا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾

"اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے (قواعد و ضوابط اور شریعت) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو باغی ہیں۔"

یہاں "فسق" کا لفظ "بغاوت" کے معنی میں آیا ہے۔ جیسے سورۂ کہف میں ابلیس کے بارے میں کہا گیا:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾

"وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا' پس اس نے بغاوت کی اپنے رب کے حکم سے۔"

تو اگر ہم اپنے اوپر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے احسان کا ادراک کرکے اس کے شکر گزار بندے نہیں بنتے بلکہ اس کے برعکس کفر کی روش اختیار کرتے ہیں تو ہم اجتماعی طور پر کافر قرار پاتے ہیں۔ اگرچہ انفرادی سطح پر ہم مسلمان ہیں' چاہے باعمل ہیں یا بے عمل' لیکن اجتماعی سطح پر جب تک دستور میں یہ معاملات' جن کا ہم مطالبہ لے کر اٹھ رہے ہیں' طے نہیں پاتے تو آیاتِ قرآنی کی رو سے ہم کافر' مشرک اور فاسق ہیں۔

پھر اگلی آیت میں فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾

اس سے پہلی آیات میں تورات اور انجیل کا ذکر تھا۔ اب محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا

جا رہا ہے کہ "(اے نبیؐ) ہم نے آپ کی جانب حق کے ساتھ "الکتاب" اتار دی ہے' جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے ان کتابوں کی جو اس کے سامنے موجود ہیں (یعنی تورات' انجیل' زبور) اور یہ ان کی محافظ و نگہبان (Custodian) ہے"۔ یعنی اب اس کتاب کے حوالے سے طے کیا جائے گا کہ تورات اور انجیل میں کیا بات ٹھیک ہے اور کیا غلط اور تحریف شدہ ہے۔ ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ "تو اب آپ فیصلہ کیجئے ان کے مابین اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے۔" ﴿وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾ "اور جو حق و سچائی آپ کے پاس آچکی ہے اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجئے"۔ ہمارے ہاں بھی سیکولر ذہن کے 'مغرب پرست لوگ موجود ہیں۔ ذہنی سطح پر ارتداد بھی ہے اور عملی طور پر فسق و فجور اور اباحیت پسندی بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ لوگ تو چاہیں گے کہ یہاں اسلام کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہو۔ لیکن ہمیں اس حکم قرآنی کو پیش نظر رکھنا ہو گا اور ان کی خواہشات کی قطعاً پروا نہیں کرنی ہو گی۔ یہی حکم اگلی آیت (نمبر ۴۹) میں پھر دہرایا گیا : ﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾ "اور جو اللہ نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ کیجئے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے"۔ ﴿وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾ "اور ان سے خبردار رہئے کہ کہیں یہ لوگ آپ کو کسی ایسے حکم سے ڈگمگا نہ دیں جو اللہ نے آپ کی طرف اتارا ہے"۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اپنی مروّت و شرافت کے باعث اور آپ کی طبیعت میں جو نرم مزاجی ہے اس کی بدولت ان کی کوئی بات مان لیں اور اللہ کے نازل کردہ احکام کی تنفیذ میں کسی نرمی کا مظاہرہ کریں۔ نفاذِ شریعت کا یہ حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دیا' اور آپؐ کی وساطت سے یہ حکم ہر دَور کے مسلمان حکمرانوں کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ نواز شریف صاحب کو سمجھنا چاہئے کہ آج اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب گویا انہی کے لئے ہے کہ ان مادہ پرستوں' اباحیت پسندوں اور مغرب کے پرستاروں سے ہوشیار رہیں اور نفاذِ شریعت کی طرف پیش قدمی میں ان کے خیالات اور خواہشات کو سدِ راہ نہ بننے دیں۔

سورۃ المائدہ کی آیت ۵۰ میں انتہائی جامع بات گویا حرفِ آخر کے انداز میں

فرمائی گئی :

﴿ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾

"تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے احکام (قوانین اور شریعت) چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ (اللہ پر' آخرت پر اور رسالت پر) یقین رکھنے والے ہیں ان کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا (اور) کون ہو سکتا ہے"۔

چنانچہ اگر ہم یہ کام نہیں کرتے تو ہمارا یہ مقام (status) بنتا ہے اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد سے ہنوز اسی حالت (حکم الجاھلیۃ) پر ہم چلے آ رہے ہیں۔

ہمارا مطالبہ' ہماری اپیل

اس اعتبار سے تمام مذہبی جماعتوں سے بھی ہماری گزارش ہے کہ وہ اپنی توجہات اس مسئلے پر مرتکز کریں' اپنی قوت و طاقت یہاں لگائیں' اس جگہ کھپائیں' اس کے بعد باقی ساری چیزیں اس کے تحت خود بخود منواتے چلے جایئے۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں! یہ ایک بات منوا لیجئے جو دستور میں ثبت ہو جائے' پھر دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ پھر جو شے بھی خلاف اسلام ہے اس کے خلاف جا کر عدالت کے دروازے پر دستک دیجئے۔ فرض کیجئے کوئی یہ کہے کہ اتوار کی چھٹی خلاف اسلام ہے' تو آیئے عدالت میں دلائل دیجئے' صرف اخباری بیانات سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی کی رائے ہے کہ وڈیو پر پابندی کتاب و سُنت کے منافی ہے تو وہ عدالت میں جا کر اسے چیلنج کر سکتا ہے۔ اس طرح ہر معاملے کا جائزہ لینے کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

اپنے مطالبات پیش کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر عرض کروں گا کہ یہ وقت اِن اقدامات کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے بھی' جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مسلم لیگ کا احیاء ہوا ہے' اسے عوام کی طرف سے بہت بھاری مینڈیٹ ملا ہے اور قومی اسمبلی میں ایک جماعت کی حیثیت سے اسے دو تہائی سے زیادہ اکثریت حاصل ہے' لہٰذا اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور ایک اس اعتبار سے بھی کہ اِس وقت ہمارے

سیاسی نظام میں چوٹی کی دونوں شخصیتیں یعنی صدر مملکت اور وزیر اعظم دونوں کا تعلق ایسے شریف خاندانوں سے ہے جہاں مذہبی روایات اور اسلامی شعائر کا پاس کیا جاتا ہے۔ اگرچہ صدر مملکت ایک جاگیردار ہیں، لیکن شخصی اعتبار سے ان میں وہ برائیاں نہیں ہیں جو عام جاگیرداروں کے اندر ہوتی ہیں، بلکہ ان میں ذاتی طور پر بہت سی بھلائیاں ہیں۔ اسی طرح وزیر اعظم اگرچہ ایک سرمایہ دار ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کے سرمایہ دار بننے کی بنیاد سرمایہ کاری ہے جو سود پر مبنی ہوتی ہے، جو جاگیرداری ہی کی طرح ایک لعنت ہے، لیکن وہ بھی ذاتی طور پر شریف النفس ہیں اور ان کا خاندان بھی نیک اور مذہبی شعائر کا پابند ہے۔ اس اعتبار سے شاید اس سے بہتر موقع کوئی اور نہ مل سکے۔ لہٰذا اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جانا چاہئے اور تمام دینی عناصر کو اپنے اپنے طور پر یہ مطالبہ اٹھانا چاہئے۔ میرے نزدیک اس مقصد کے لئے کوئی متحدہ محاذ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس مطالبہ کو لے کر اٹھے ہیں، لیکن ابھی ہم حکومت کے خلاف کسی چیلنج کے موڈ میں نہیں ہیں، بلکہ ہم ان کے آگے ہاتھ جوڑیں گے، گزارش کریں گے کہ خدا کے لئے اس موقع کو غنیمت جانو، اس کی اہمیت کو سمجھو کہ اگر اس وقت اس سمت میں قدم نہ اٹھایا گیا تو پھر بعد میں حسرت و ندامت کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ بہرحال اب میں "مطالبۂ تکمیل دستورِ اسلامی" کا متن پیش کر رہا ہوں :

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْم

"اگر تم شکر کرو گے تو ہم مزید نوازیں گے اور اگر کفر کرو گے تو میرا عذاب بھی بہت سخت ہے"

(سورۂ ابراہیم : آیت نمبر ۷)

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کے ذریعے پاکستان مسلم لیگ کو جو نئی زندگی عطا فرمائی ہے جس کے ذریعے تحریک پاکستان کا سا جذبہ از سرِ نو تازہ ہوا ہے، اس کے شکرانے کے طور پر وہ جلد از جلد سلطنتِ خداداد پاکستان کے دستور میں حسب ذیل تبدیلیاں کرائیں :

۱) دستور کی دفعہ ۲ میں شق (ب) کا اضافہ کیا جائے کہ : "پاکستان میں وفاقی، صوبائی، ضلعی کسی بھی سطح پر کوئی قانون سازی کلی یا جزوی طور پر کتاب و سُنّت کے منافی نہیں کی جاسکے گی"۔

(واضح رہے کہ دستور کی دفعہ ۲ میں یہ صراحت موجود ہے کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے، اور دفعہ ۲۔ الف قرارداد مقاصد پر مشتمل ہے۔)

۲) پورے دستور میں جہاں بھی کوئی شے دستور کی دفعہ ۲۔ الف (قراردادِ مقاصد) کے منافی ہے اسے یا خارج کیا جائے یا صراحتاً قراردادِ مقاصد کے تابع کیا جائے۔

۳) دستور کی دفعہ ۲۰۳ (ب) کی ذیلی شق (ج) کے ذریعے فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار سے جو استثناء دستور پاکستان، مسلم پرسنل لاء اور جوڈیشل لاز کو دیا گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔

(یاد رہے کہ مالیاتی معاملات کو بھی فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا گیا تھا، لیکن یہ استثناء صرف دس سال کے لئے تھا جو ۱۹۹۰ء میں ختم ہو گیا اور مالیاتی معاملات شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار میں آ گئے۔)

۴) وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی شرائطِ ملازمت کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی طرح مستحکم بنایا جائے تا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہر قسم کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہوں!

ان چار مطالبات کے علاوہ ہمارا اضافی مطالبہ یہ ہے کہ :

فیڈرل شریعت کورٹ نے جو فیصلہ بینک انٹرسٹ کے "ربا" اور اس کے نتیجے کے طور پر حرامِ مطلق ہونے کے ضمن میں دیا تھا اس کے خلاف اپیل واپس لی جائے اور ایک سال کے اندر اندر پاکستان کی معیشت کو سود کی لعنت سے پاک کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف جنگ بند کر دی جائے۔ تا کہ اللہ کی نصرت و رحمت ملک اور مِلّت کے

شاملِ حال ہو سکے!

یہ مطالبہ چار چیزوں پر مشتمل ہے' جو حقیقت میں دو ہیں۔ اس لئے کہ فیڈرل شریعت کورٹ پر عائد پابندیوں کو ختم کیا جائے اور اس کے ججوں کی شرائط ملازمت اور status کو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی سطح تک لایا جائے' یہ درحقیقت ایک ہی بات ہے' دوسرے یہ کہ قراردادِ مقاصد تو پہلے سے آئین میں اس کے Sbstantive Part کے طور پر موجود ہے۔ دستور میں جو چیزیں بھی اس کے منافی ہیں' انہیں یا تو سرے سے خارج کر دیا جائے' یا قراردادِ مقاصد کے تابع کیا جائے۔ اور یہ طے کر دیا جائے کہ اس ملک میں کوئی قانون سازی کسی بھی سطح پر قرآن و سنت کے منافی نہیں ہو سکے گی۔

مسلمانانِ پاکستان کا دینی فریضہ

ہم نے "مطالبہ تکمیل دستور اسلامی" کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اس مطالبہ پر مشتمل ہینڈ بل بھی بڑی تعداد میں شائع کرا کر تقسیم کئے گئے ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ بھی تیار کیا گیا ہے۔ اس مطالباتی مہم کے لئے ہمیں آپ کا تعاون اور مدد درکار ہے۔ یہ مسلمانانِ پاکستان کا دینی فریضہ ہے' لہٰذا آگے بڑھئے اور اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیجئے۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں :

((مَنْ مَشٰی مَعَ فَاسِقٍ لِیُقَوِّیَہٗ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰی ھَدْمِ الْاِسْلَامِ))

یعنی "جو شخص کسی فاسق کی تقویت کا باعث بننے کے لئے اس کے ہمراہ چلا تو اس نے گویا اسلام کی عمارت منہدم کرنے میں مدد دی"۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص نیکی کے کام میں تعاون کرتا ہے اور کسی ایسے مطالبے کا ساتھ دیتا ہے جس سے نفاذِ شریعت اور نظامِ خلافت کے قیام کی راہ ہموار ہوتی ہے تو اس نے گویا احیاءِ اسلام میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اس مہم میں ہمارے ساتھ تعاون کی ایک عملی صورت یہ ہے کہ تکمیل دستور اسلامی کے مطالبہ پر مشتمل یہ پوسٹ کارڈ آپ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاصل کریں اور اپنے

دوست واحباب کو اس سلسلہ میں قائل کریں اور انہیں بتائیں کہ وہ یہ کارڈ اپنے نام اور پتے کے ساتھ وزیر اعظم نواز شریف کو ارسال کریں۔ اس کے لئے انہیں اس کی اہمیت سے بھی آگاہ کریں کہ ایسا کرنے سے اس ملک میں غیر اسلامی قوانین کے خاتمے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے اور ہم اجتماعی اور دستوری سطح پر مسلمان ہو سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا پوسٹ کارڈز کے علاوہ ہم نے ٹیلی گرام کے لئے بھی یہی مضمون اختصار کے ساتھ تیار کیا ہے۔ اگر یہ کارڈز اور ٹیلی گرام بہت بڑی تعداد میں نواز شریف صاحب کو پہنچیں گے تو انہیں بھی یہ معلوم ہو گا کہ اسلامائزیشن اس ملک کے لوگوں کی خواہش ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اگر نواز شریف صاحب نے اس جانب کوئی قدم اٹھایا تو پوری دنیا میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں گی اور ان پر عالمی دباؤ بڑھے گا۔ لیکن ان خطرے کی گھنٹیوں اور عالمی دباؤ کے مقابلہ کا ذریعہ بھی یہی ہے کہ عوام نواز شریف سے آئینی اصلاحات کا مطالبہ کریں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ نواز شریف صاحب نے یہ اقدامات ذاتی طور پر نہیں کئے بلکہ یہ ملک کے عوام کی خواہشات اور امنگوں کے آئینہ دار ہیں۔ ملک کے عوام یہ چاہتے ہیں۔ اور اگر عوام کی طرف سے یہ مطالبہ نہیں آتا اور وہ عوامی حمایت کے بغیر کوئی قدم اٹھا دیتے ہیں تو عالمی طاقتوں کے گماشتے اسے نواز شریف کی "شرارت" قرار دے کر ان کے درپے ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں صراحت کر چکا ہوں کہ ہماری یہ مہم نواز شریف صاحب کی مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ ہمارے پیش نظر نہ تو کوئی سیاسی تحریک اٹھانا ہے اور نہ ہی کسی حکومت کو غیر مستحکم کرنا یا گرانا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہم اس میدان کے کھلاڑی نہیں، ہم اس کھیل میں شامل ہی نہیں، لیکن جو کام اس وقت ہمارے پیش نظر ہے یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہونے کے لئے بہت ضروری ہے، تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرض کر سکیں کہ اے اللہ! ہم نے تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کام میں حصہ لیا تھا اور تیرے دین کے قیام کی راہ ہموار کرنے کے لئے ارباب اقتدار سے مطالبہ کیا تھا۔ (مرتب : محبوب الحق عاجز)

اقول قولی ہٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

حقیقتِ تصوّف (۳)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

جس کے بعض حصوں کو "تنظیم الاخوان" نے سیاق و سباق سے کاٹ کر عام کیا

تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کی ایک خصوصی تربیت گاہ میں امیر تنظیم اسلامی نے "حقیقت تصوف" کے عنوان پر جو اظہار خیال فرمایا تھا اس کی دو اقساط میثاق کے صفحات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان اقساط میں خطاب کے ان حصوں کو جلی حروف میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا جنہیں ہمارے "الاخوانی" دوستوں نے اپنے کیسٹ میں حذف کر دیا تھا۔ اس ماہ اس خطاب کی تیسری قسط ہدیہ قارئین ہے' جو اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ تصوف کے بارے میں اس نہایت اہم خطاب کا یہ پورا حصہ تنظیم الاخوان کے تیار کردہ کیسٹ میں شامل نہیں کیا گیا' اور اس کی جگہ مذکورہ بالا تربیت گاہ میں ہونے والے امیر محترم کے دیگر خطابات میں سے بعض متفرق حصے سیاق و سباق کے بغیر کیسٹ میں شامل کئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

قرآن و سُنّت کی ایک بنیادی اصطلاح "احسان" جس کے لئے بعد کے ادوار میں "تصوف" کا لفظ اختیار کر لیا گیا' اس کے مقاصد اور اس کے منصوص و مسنون اور ماثور طریقوں پر ہم گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے موضوع یہ ہے کہ اس ضمن میں حضور ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور یہ کن اسباب سے ہوا؟ اس بحث کو میں دو عنوانات کے تحت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن حکیم سے بُعد

اس ضمن میں پہلا نکتہ ہے قرآن حکیم سے بُعد کا پیدا ہونا۔ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ذکر الٰہی کے لئے مرکز و محور قرآن حکیم نہ رہا' بلکہ اس کے بجائے رفتہ

رفتہ رفتہ نت نئے اوراد و اذکار رائج ہونے لگے۔ قرآن حکیم سے دُوری کا اصل سبب تو وہ فطری اور طبعی معاملہ تھا جسے میں "قرآن اور جہاد" نامی اپنی تحریر میں بیان کر چکا ہوں (یہ تحریر اب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل کر دی گئی ہے۔) تاہم اس دوری کے بعض ثانوی اسباب بھی تھے۔ سب سے پہلے اصل اور بنیادی وجہ کو سمجھئے۔ اسلام کے اولین دور میں اہم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں، یعنی قرآن اور جہاد۔ ایک مرد مومن کی شخصیت کا جو معنوی ہیولا خود قرآن سے ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو گا اور دوسرے میں تلوار۔ قرآن سے ایمان حقیقی حاصل ہوتا ہے اور ایمان کا عملی اظہار جہاد فی سبیل اللہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن جب اسلام دعوت و تحریک کے مرحلے سے گزر کر سلطنت و ریاست کے مرحلے میں داخل ہو گیا تو اس تبدیلی کے بعض فطری، طبعی، منطقی، اور ناگزیر (inevitable) نتائج بر آمد ہوئے۔ یہ نتائج اسی طرح ناگزیر تھے جیسے جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ سلطنت اور ریاست میں اصل زور قانون پر ہوتا ہے، لہٰذا ہمارے ہاں بھی ایمان کے بجائے اسلام پر اور باطن کے بجائے ظاہر پر توجہات کا ارتکاز ہو گیا۔ قرآن پر سے توجہ کم ہونے لگی اور تعلیم و تعلم اور تدبر و تفکر کے اصل موضوعات اب حدیث و فقہ بن گئے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے تاکہ انحراف عن القرآن کے حوالے سے ہم میں اسلاف سے سوئے ظن نہ پیدا ہو جائے۔ ایمان کے بجائے اسلام اور قرآن کے بجائے فقہ و قانون پر توجہ کسی بدنیتی کی وجہ سے نہیں ہوئی، بلکہ یہ اسلام کے سلطنت و ریاست کے دور میں داخل ہو جانے کا منطقی اور Unavoidable نتیجہ تھا۔ البتہ اس میں کچھ ثانوی اسباب بھی ہوئے کہ جب ہمارے ہاں دور ملوکیت میں دولت پرستی اور جاگیرداری آئی تو مقتدر طبقات نے شعوری طور پر کوشش کی کہ عوام کے سامنے قرآن نہ رہے۔ ؏ چشم مسلم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب۔ اس لئے کہ اگر قرآن کی اصل تعلیمات لوگوں کے سامنے آئیں گی تو وہ ہمیں اسی پیمانے پر ناپیں گے اور نتیجتاً ہم پر تنقیدی نگاہیں اٹھیں گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کو "بند" رکھا جائے۔ اس موضوع پر جناب یوسف سلیم چشتی مرحوم کا ایک نہایت قیمتی مقالہ (قرآن حکیم سے بُعد و بیگانگی کے اسباب) "حکمت قرآن" (ستمبر ۹۲ء) میں شائع

ہو چکا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ہر بدعت کسی نہ کسی سنت کی جگہ لیتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صحیح اور مطلوب شے اپنی جگہ سے ہٹے گی تو لامحالہ کوئی غلط شے اس کی جگہ لے گی۔ چنانچہ جب ذکر کے حوالے سے قرآن حکیم مرکز و محور نہ رہا تو اس مقصد کے لئے مختلف اقسام کے اوراد و اذکار اختیار کئے جانے لگے۔ ان اذکار کے متعلق خود اہل تصوف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں۔ ان کا کوئی تعلق کتاب و سنت سے نہیں ہے۔ لیکن وہ دلیل یہ اختیار کرتے ہیں کہ یہ چیزیں اجتہاد کے ذریعے اختیار کی گئیں ہیں۔ میں اس دلیل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں' اس لئے کہ یہ چیزیں اجتہاد کی تعریف پر پوری نہیں اترتی ہیں' بلکہ یہ در حقیقت ایجاد و ابتداع کے دائرے میں آتی ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ معاملہ صرف قرآن کی جگہ دوسرے اذکار کے اختیار کئے جانے تک محدود نہ رہا' بلکہ ان اذکار کی شدت اور مقدار میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کی غیر معمولی تاثیر اور ان اذکار کے اثرات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ذکر کے لئے کوئی بھی طریقے اختیار کر لئے جائیں' خواہ وہ مجتہدانہ ہوں یا مبتدعانہ' ان میں قرآنِ حکیم کی سی تاثیر تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان اوراد و اذکار کی کیفیت (Quality) میں جو کمی تھی اسے مقدار (Quantity) میں غیر معمولی اضافے کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی گئی اور نہایت مشقت طلب طریقے اختیار کرنا پڑے۔ نتیجتاً قرآن پر سے توجہ مزید کم ہو گئی۔ اس طرح گویا ایک Vicious Circle وجود میں آگیا کہ اولاً تو ایک طبعی سبب سے قرآن پر توجہ میں کمی آئی' اس کے نتیجے میں روحانی پیاس کو بجھانے کے لئے نت نئے اوراد و اذکار اختیار کئے جانے لگے' اور قرآن گویا از کار رفتہ ہو تا چلا گیا۔

قرآن حکیم سے دوری کا جو سب سے خطرناک نتیجہ بر آمد ہوا وہ یہ تھا کہ قرآن کے فلسفہ و حکمت سے بھی بُعد پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن صرف ذکرِ الٰہی کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی اور عقلی اعتبار سے رہنمائی بھی کرتا ہے۔ انسان کی فلسفیانہ پیاس کو بجھانے کا سامان بھی اسی کتاب میں ہے۔ حقیقت اور معرفت کی تلاش کے جذبے کو بھی قرآن ہی سے تسکین ملتی ہے۔ عالم اسلام میں قرآن حکیم سے دوری نے ایک فکری خلا کو

جنم دیا، اور پھر یونانی فلسفہ و منطق اور نو افلاطونیت (Neo-Platonism) کے افکار کی یلغار ہوئی تو ہمارے بڑے بڑے ذہن اس سے آزاد نہ رہ سکے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی شخصیت افلاطون کے خیالات سے آزاد نہ ہو سکی تو پھر اور کس کی بات کی جائے! یہاں تک کہ ہمارے ہاں علم الاخلاق پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں ان میں بھی یونانی حکماء ہی کی پیروی نظر آتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دوری کی وجہ سے جو فکری خلاء (Intellectual Vacuum) پیدا ہوا تھا وہ انہی بیرونی فلسفوں کی مدد سے پُر کیا گیا، اور اس عمل نے ہمیں قرآن حکیم سے مزید دور کر دیا۔ یہ دوری اس معنی میں نہیں تھی کہ قرآن کو ماننا چھوڑ دیا گیا ہو، یا اسے پڑھنا ترک کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا قرآن پر ایمان بھی رہا، اس کی تلاوت بھی ہوتی رہی، لیکن قرآن حکیم کے ذریعے اپنی ذہنی و فکری پیاس کو بجھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا، قرآن مجید کے ذریعے اپنی روحانی ترقی کی کوشش کا معاملہ نہ رہا، قرآن سے ہماری نسبت ختم ہو گئی اور تعلق منقطع ہو گیا۔ بقول اقبال۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

چنانچہ وعظ و نصیحت کا سلسلہ تو برقرار رہا لیکن اس میں بھی قرآن حکیم کو مرکزی حیثیت حاصل نہ رہی۔

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے۔ اس کے الفاظ اگرچہ پرشکوہ ہیں، لفاظی انتہا کی ہے، لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے ہیں۔ ان میں کوئی مغز (essence) ہے ہی نہیں۔ اس کی ساری گفتگو خطیب

بغدادی یا امام دیلمی سے ماخوذ ہے‘ اور اس کا سارا سروکار محض ضعیف‘ شاذ اور مرسل احادیث پر رہ گیا ہے۔ گویا کچھ قصے کہانیاں ہیں‘ صوفیاء کے مبالغہ آمیز اور جھوٹے سچے واقعات ہیں جن کی بنیاد پر سارا وعظ کہا جاتا ہے۔ یہ معاملہ تو ہمارے دور میں تبلیغی جماعت تک پہنچا ہوا ہے‘ جن کے ہاں فضائل کی کتابوں میں اکثر و بیشتر ضعیف احادیث ہی کی بھرمار ہے۔ اسی طرح تزکیۂ نفس کا معاملہ ہے۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

یعنی "صوفی کی محفل میں قرآن کا ذکر ہی نہیں! اس کے ساتھ اسے سازگاری اور موافقت ہی نہیں۔ ہاں قوال کے نغمے سے وہ مدہوش ہو جاتا ہے‘ عراقی کے شعر سے اس کے دل میں آگ بھر جاتی ہے۔"

الغرض قرآن سے دوری وہ پہلا قدم تھا جس کی بدولت حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے انحراف شروع ہوا۔ ذکر تو جاری رہا لیکن اس کے ضمن میں تمام تر توجہ قرآن سے ہٹ کر دیگر اوراد و اذکار پر مرکوز ہو گئی۔ آج جو شے "ذکر" شمار ہوتی ہے اس کا کوئی سراغ اور اس کی کوئی سند قرآن و حدیث میں موجود نہیں‘ اور یہ حقیقت اہلِ تصوف بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے مرشد مولانا اللہ یار چکڑالوی نے "دلائل السلوک" نامی کتاب میں مانا ہے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں‘ بلکہ انہیں اجتہاد کے ذریعے اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ اجتہاد نہیں بلکہ ابتداع و ایجاد ہے۔

گزشتہ نشست میں ایک نکتہ میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا‘ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اسے بھی بیان کر دوں۔ میں اپنے دروس میں ہمیشہ "ذکر" کے چار ذرائع بیان کرتا رہا ہوں‘ لیکن اس مرتبہ میں نے صرف تین ہی ذرائع بیان کیے تھے‘ یعنی "الذکر" خود قرآن حکیم‘ پھر ذکر کی جامع ترین شکل نماز‘ پھر اذکارِ مسنونہ روز مرہ معمولات کے حوالے سے‘ یا

وہ تسبیحات جو حضور ﷺ نے تلقین فرمائی ہیں۔ چوتھی چیز ہے کوئی مخصوص ذکر جو کسی خاص شخص کے لئے تجویز کیا جائے۔ یہ دراصل معالجۂ نفس کے لئے ہوتا ہے۔ اس نکتے کو مخالفتِ نفس ہی کے ضمن میں شامل کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں۔ کسی پر شہوت کا غلبہ زیادہ ہے لیکن مال و دولت کی حرص نہیں' کسی کے لئے اصل شے ہی پیسہ ہے اور کسی دوسری چیز سے اسے کوئی دلچسپی نہیں' کسی کی اصل خواہش شہرت کا حصول ہے جس کے لئے وہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہے' یا کسی کو صرف وجاہت اور اقتدار کی آرزو ہے۔ لہٰذا انسانی نفسیات کا کوئی ماہر کسی خاص شخص کے محرکات و داعیاتِ نفس کا تجزیہ کر کے تشخیص کر لیتا ہے کہ اس پر کس شے کا غلبہ زیادہ ہے' اور پھر اسی تشخیص کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اس شخص کے لئے کوئی مخصوص ذکر تجویز کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی چیزوں کو تمام لوگوں کے لئے مستقل مقام دے دینا حماقت ہوگی۔ مستقل حیثیت تو انہی چیزوں کی رہے گی جو محمدِ عربی ﷺ نے بتائی ہیں۔ البتہ آپؐ نے بھی بعض افراد کو مخصوص اذکار تلقین فرمائے ہیں جو اس چوتھی قسم میں شامل سمجھے جائیں گے۔

جہاد سے دُوری

سلوکِ محمدیؐ سے انحراف کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مخالفت نفس کی ریاضتوں کے ضمن میں دعوت و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد اور جہاد فی سبیل اللہ سرے سے خارج از بحث ہو گئے۔ اس کا بھی اصل سبب تو بالکل فطری اور طبعی تھا۔ یعنی جب اسلام دعوت و تحریک کے مرحلے میں تھا تو جہاد کی حیثیت فرض عین کی تھی۔ اس لئے کہ دعوت و تبلیغ بھی جہاد ہے' نظم کی پابندی بھی جہاد ہے' اور حق و باطل کے مابین براہِ راست تصادم اور قتال کا مرحلہ آ جائے تو وہ بھی جہاد ہے۔ تاہم جب اسلام سلطنت و ریاست کے مرحلے میں داخل ہوا تو اب اس ہمہ گیر جہاد کا تصور سمٹ کر محض قتال تک محدود ہو کر رہ گیا۔ جہاد کو قتال کا ہم معنی قرار دے دیا گیا اور اس قتال کا مقصد بھی صرف مملکت کی سرحدوں کا دفاع اور اگر بس چلے تو توسیع تک محدود ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی محاذ پر ایک مخصوص تعداد میں آدمیوں کی

ضرورت تھی اور اس تعداد میں آدمی نکل آئے تو گویا باقی سب کی طرف سے یہ فرض ادا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد فرض عین کے بجائے فرض کفایہ قرار پایا۔ یہ معاملہ تو دورِ خلافت راشدہ ہی میں ہو گیا تھا اور میں نے ہمیشہ عرض کیا ہے کہ اگر دین غالب ہو تو تقرب بالنوافل کا راستہ بالکل صحیح ہے۔ آپ نفلی عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی ممکن ہو قرب حاصل کریں' یا مخالفتِ نفس کے لئے جو ایک بہت بڑی اور جامع عبادت ہے' یعنی حج' اسے اختیار کریں۔

لیکن جب خلافت راشدہ بھی ختم ہو گئی تو اب مسئلہ دہرا ہو گیا۔ اب ملوکیت اور جاگیرداری پر مبنی ظالمانہ نظام آ گیا جس کے خلاف نظری طور پر جدّوجہد ہونا چاہئے تھی' لیکن عملی طور پر دو رکاوٹوں کے باعث نہیں ہو سکی۔ پہلی رکاوٹ یہ تھی کہ بعض لوگوں کے نزدیک فاسق و فاجر مسلمان حکمرانوں کے خلاف قتال صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہ کفر کا حکم دیں۔ اس مفہوم کی بعض احادیث بھی موجود ہیں' لہٰذا ہمارے ہاں اہل حدیث مکتبہ فکر اسی موقف پر قائم ہے۔ البتہ اس معاملہ میں امام ابو حنیفہؒ نے واقعتاً مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے خروج کا دروازہ کھولا ہے' لیکن انہوں نے بھی شرط اس قدر کڑی عائد کر دی کہ عملاً یہ ناقابل حصول ہو گیا۔ یعنی خروج اسی صورت میں ہو سکے گا جب کہ تبدیلی لانے کے لئے ضروری قوت فراہم ہو چکی ہو۔ اس دور میں چونکہ شہری حقوق کا تصور خصوصاً اظہار رائے اور جماعت سازی کا حق موجود ہی نہیں تھا تو یہ مطلوبہ قوت کیسے حاصل کی جاتی؟ ایسی کسی کوشش کو تو بغاوت کی تیاری سمجھ کر ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیا جاتا۔ تو یہ اس معاملے کی دوسری رکاوٹ تھی۔

اس طرح حضور ﷺ کے طریقہ تزکیہ اور طریقہ سلوک میں جو عملی شعبہ تھا' یعنی جہاد فی سبیل اللہ' وہ عملی طور پر کالعدم ہو کر رہ گیا۔ جہاد دراصل مخالفت نفس کا نہایت اہم عملی ذریعہ ہے۔ اس میں ایک انسان مشقت جھیلتا ہے' تکالیف اٹھاتا ہے' اپنی جان و مال کے لئے سو طرح کے خطرات مول لیتا ہے' مال خرچ کرتا ہے اور اس طرح مخالفت نفس بھی ہوتی ہے اور دوسرے پہلو سے روح کی ترقی بھی۔ دورِ ملوکیت میں تزکیہ نفس کا اتنا بڑا شعبہ defunct ہو گیا۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک درخت اوپر کی طرف اٹھ رہا ہے' اگر

اس کے راستے میں چھت آجاتی ہے تو اب وہ لامحالہ ٹیڑھا ہو کر مڑ جائے گا کیونکہ اوپر کی سمت میں تو اس کے لئے رکاوٹ ہے۔ چنانچہ ملوکیت وہ رکاوٹ یا چھت بن گئی جسے خواہی نخواہی قبول کرنا پڑا۔ نتیجتاً دورِ ملوکیت میں جب مخالفت نفس کا یہ اہم شعبہ بند ہوا تو اس کے حصے کا سارا بوجھ بھی اوراد واذکار اور مراقبوں اور چلوں پر آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں وہی نت نئے چلے' نت نئی ریاضتیں' سال ہا سال کی سیاحت' جنگلوں اور ویرانوں میں برسوں گزارنے کے طریقے رواج پا گئے' یہاں تک کہ اسلام میں بعینہٖ رہبانیت والا رنگ پیدا ہو گیا۔ حالانکہ حضور ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا تھا: "لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ اِلَّا الْجِھَادُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ" اور "لَا سِیَاحَۃَ فِی الْاِسْلَامِ اِلَّا الصَّوْمُ"۔ آپ صوفیاء کے قصے پڑھ لیجئے۔ ان میں وہی چالیس چالیس سال کی ریاضتوں اور شدید قسم کی مشقتوں کا تذکرہ ملے گا۔ بہت سے صوفیوں نے تجرد کی زندگی گزاری' اس لئے کہ گھر گرہستی کا کھکھیڑ مول لے کر تزکیۂ نفس کیسے کریں گے؟

اس معاملے کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ صدرِ اول میں اہم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں۔ یعنی قرآن اور جہاد۔ اور ان دونوں کو link کرنے والا "ایمان" تھا۔ لیکن جب اسلام دعوت و تحریک کے مرحلے سے گزر کر سلطنت و ریاست کے دور میں داخل ہوا تو ایک طبعی اور فطری عمل کے طور پر توجہات میں shift پیدا ہو گیا۔ ایک طرف ذکر کے لئے قرآن پر سے توجہ ہٹ گئی اور اذکار کے مختلف طریقے رائج ہونے لگے' دوسری طرف دعوت و اقامتِ دین اور جہاد فی سبیل اللہ پر سے توجہ ہٹ گئی اور نہایت مشقت طلب اور غیر مسنون ریاضتیں رائج ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سارا زور نفلی عبادات پر آگیا' اور تقرب بالفرائض کے بجائے تقرب بالنوافل کا معاملہ بڑھتا چلا گیا۔

علاج اس کا.........!

اب آئیے اس سوال کی طرف کہ علاج کیا ہو؟ جب تشخیص ہو گئی کہ سلوکِ محمدیؐ سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور کیونکر ہوا' تو اب علاج بھی ظاہر ہے' یعنی العَودُ الی البَدء۔ اسی طریقے کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے جو ابتداء میں اختیار کیا گیا تھا۔ اسی کا

نام تجدید ہے، اور اسی کو Revival اور Renaissance کہتے ہیں۔ یہ علاج بھی انحراف ہی کی طرح دو سطحوں پر کرنا ہو گا۔ اولاً رجوع الی القرآن۔ وہ توجہ جو قرآن سے ہٹ گئی تھی اسے دوبارہ اس پر مرکوز کریں، جو معاملہ غلط رخ پر پڑ گیا تھا اسے صحیح جگہ پر لائیں۔ ایمان کی شدت یا گہرائی بھی قرآن سے حاصل ہو گی اور ایمان کی گیرائی اور اس کا Intellectual Element بھی قرآن ہی سے ملے گا۔ معرفت کی پیاس بھی اسی سے بجھے گی اور تلاش حقیقت کے جذبے کی بھی اسی سے تسکین ہو گی۔ بقول اقبال۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اور۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زاں کہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!
کشتہ ، شمشیرِ قرآنش کنی!

ان اشعار میں اقبال کے فکر کی بلندی ملاحظہ کیجئے۔ میں نے اقبال کو فکر اسلامی کا مجدد یونہی تو نہیں مان لیا ہے!

قرآن حکیم کے متعلق ایک نکتہ اور ہے جسے ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ کلامِ الٰہی کا ایک پہلو ہے اس کی تکرار، یعنی اسے پڑھتے رہو، پڑھتے رہو! اور دوسرا پہلو ہے اس کا فہم، تفقہ، غور و فکر، تدبر و تفہم۔ یہ دونوں پہلو ضروری ہیں، لیکن مقدار کے اعتبار سے ان کے مابین نسبت و تناسب کا معاملہ برعکس رہے گا۔ اگر تفہم، تعقل اور تفقہ کم ہے تو تکرارِ تلاوت اور بار بار کی repetition پر زور دینا ہو گا۔ اور اگر غور و فکر کا معاملہ بڑھ جائے تو تکرار کی کم شدت سے بھی مطلوبہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ" (حٰمٓ السجدۃ : ۵۳) "ہم انہیں عنقریب اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور ان کے نفوس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہی

(قرآن) الحق ہے۔"

دیکھئے قرآن استخراجی منطق (Deductive Logic) کے استدلال سے ذات باری تعالیٰ کو نہیں منواتا' بلکہ استقرائی منطق (Inductive Logic) کو استعمال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے چاروں طرف دیکھو' کائنات پر غور کرو' یہ تمام مظاہر فطرت اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہی تو ہیں۔ ع کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!

اس طرح آیاتِ ربانیہ کی تین اقسام ہو گئیں' قرآنی آیات' آفاقی آیات' اور انفسی آیات۔ ان تینوں کے مابین ہم آہنگی ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کے نتیجے میں انسان کے اندر کا شعورِ خفتہ (Dormant Consciousness) ابھر کر سطح پر آ جاتا ہے۔ اسی کا نام تذکر ہے' یعنی یاد دہانی حاصل کرنا۔ یہی حصول ایمان کا طریقہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ آج مظاہر فطرت کا جتنا علم اور فہم انسان کو حاصل ہو چکا ہے وہ پہلے تو نہیں تھا۔ لہٰذا سائنسی حقائق کے منکشف اور مبرہن ہونے کی وجہ سے آج فہم قرآن کے بھی نئے سے نئے راستے کھل رہے ہیں' اور تعقّل و تفہمِ قرآن کا پہلو آج بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے جو اُس دور میں اِس انداز سے موجود نہ تھا۔ چنانچہ آج تذکر بالقرآن کی شعوری اور Intellectual جہت اصل اہمیت کی حامل بن چکی ہے۔ اسی نکتے سے علامہ اقبال کے اس موقف کا تعلق جڑتا ہے جو انہوں نے اپنی "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں پیش کیا ہے کہ تزکیہ نفس کے لئے صوفیاء نے جو طریقے ایجاد اور اختیار کئے تھے' آج کے انسانوں کی طبائع ان مشقت طلب اور کٹھن ریاضتوں (Rigorous Exercises) کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے مخالفتِ نفس کی ان ریاضتوں پر اس اعتبار سے تو غور کیا تھا کہ وہ مسنون نہیں بلکہ طریق محمدیؐ سے انحراف والحاد کی مظہر ہیں' اور ان غیر مسنون طریقوں کو اس وقت اختیار کیا گیا جبکہ باطل اور نظام باطل کے خلاف جہاد کا دروازہ بند ہو گیا تھا' لیکن اس میں اضافی بات یہ بھی ہے کہ اُس دور کے صوفیاء نے جو شدید اور کٹھن ریاضتیں تجویز کی تھیں' آج کا انسان واقعتاً ان کا متحمل نہیں ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لامحالہ تذکر بالقرآن کی Intellectual Dimension پر زور دینا ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے علوم کے جو نئے دروازے انسان پر وا کئے ہیں اور جن کی بدولت قرآن مجید کے تفہم و

تعقل و محنت کا معاملہ بہت آگے بڑھ گیا ہے' اس سے ان شدید مشقتوں اور ریاضتوں کی compensation ہوتی ہے۔

علاج کے ضمن میں پہلا نکتہ رجوع القرآن ہے' اور دوسرا یہ ہے کہ مخالفتِ نفس کے لئے دوبارہ دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد کی طرف پلٹا جائے۔ عبادات میں تقرب بالفرائض پر زور ہو۔ اور صوفیاء کے دور میں نفلی عبادات پر جو over-emphasis ہو گیا تھا اس سے رجوع کیا جائے۔ اس معاملے میں بھی جو مسنون عبادات ہیں ان کی حد تک تو ہر شخص کوشش کرے' لیکن تہذیب و تزکیۂ نفس کا اصل ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ کو بنایا جائے اور ساری محنت و مشقت دعوت و اقامتِ دین کے راستے میں صرف کی جائے۔ میں آپ کو تجزیہ کر کے بتا چکا ہوں کہ مخالفتِ نفس کی ریاضتوں کے ذریعے جو مقاصد حاصل کئے جاتے تھے وہ تمام کے تمام جہاد کے راستے سے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ اس میں محنت و مشقت ہے جو نفس کی طلب استراحت و آرام کے خلاف ہے' اس میں انفاقِ وقت و مال ہے جو حُبِّ مال کے منافی ہے۔ آپ خطرات مول لیتے ہیں' اور دعوت آگے بڑھتی ہے تو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنے کا مرحلہ بھی آتا اور یہ بقائے ذات اور بقائے نسل کے داعیات کی مخالفت ہے۔

دوسرے یہ بات اس اعتبار سے بھی واضح ہو گئی کہ اب غلبۂ دین کا دَور نہیں ہے' اسلام اس وقت سلطنت و ریاست کے دور میں نہیں ہے' بلکہ حدیث نبویؐ کی رو سے تو یہ اسلام کی غربت کا زمانہ ہے۔ بَدَاَ الْاِسلامُ غریبًا وَسَیَعودُ کَمَا بَدَاَ' فَطُوبٰی لِلْغُرباءِ۔ لہٰذا منطقی طور پر بھی یہ بات درست ہے اور معقول و مطلوب ہے کہ اب دوبارہ جہاد فی سبیل اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسلام کے سلطنت و ریاست کے دور میں اس ضمن میں جو کمی پیدا ہو گئی تھی وہ بھی آج کے دور میں موجود نہیں ہے۔ جب دوبارہ غلبہ دین ہو جائے گا تو پھر یہ مسئلہ بھی دوبارہ پیدا ہو گا' لیکن یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الوقت دین غالب نہیں ہے اور دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد اس وقت فرض عین بن چکی ہے۔ پھر یہ کہ دور ملوکیت میں جو رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی وہ الحمدللہ آج کم از کم پاکستان میں اب تک تو نہیں ہے۔ آپ کو شہری حقوق حاصل ہیں۔ اظہار رائے' جماعت سازی

اور اجتماع کی آزادی موجود ہے۔ آپ پر کوئی قانونی قدغن نہیں' کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو اس کام میں رکاوٹ ڈالتا ہو۔ البتہ آپ نے بہت سی قدغنیں خود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ حُبِّ مال' حُبِّ جاہ' آسائش اور عیش کی محبت اب کسی کے لئے اس کا career ہی معبود بن چکا ہے' اسے کیسے چھوڑ دے؟ کسی کے نزدیک اس کی ملازمت ہی معبود ہے' گویا اس کے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت اسی ملازمت کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے' کسی اور ذریعے سے پوری ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سب وہ رکاوٹیں ہیں جو آپ نے خود اختیار کر رکھی ہیں۔ ان کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ خارجی طور پر تو کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ آپ جتنا ایثار کر سکتے ہیں کریں' جس قدر آگے بڑھ سکتے ہیں بڑھیں' اس جدوجہد میں آپ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔ "This depends entirely upon you" ----- آپ جتنی قربانی دیں گے اتنا ہی اپنی روحانی ترقی کا راستہ کھولیں گے۔ جتنی نفس کی مخالفت کریں گے اتنی ہی ارتقائے روحانی کی منازل طے ہوں گی۔ اب وہ معاملہ تو نہیں ہے کہ کوئی ذرا سی بات کرتا تو باغی اور گردن زدنی شمار ہو جاتا تھا۔ حضرت حسین ؓ کو اسی لئے باغی سمجھا گیا کہ اُس وقت بیعت لے کر جنگ کرنے کے سوا کوئی اور راستہ تھا ہی نہیں۔ حضور ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اس جہاد کے ضمن میں سازگار حالات پیدا فرما دیئے تھے' جنہیں میں نے حال ہی میں اپنی تقاریر میں واضح کیا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب میں ایک مرکزی حکومت کا نہ ہونا درحقیقت حضور ﷺ کے لئے بہت بڑی سہولت تھی۔ دوسرے اُس وقت کی سپرپاورز یعنی روم اور ایران کا غافل رہنا' کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ ان کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔ ان عوامل کی بدولت حضور ﷺ کو Breathing Space ملی۔ آپ کے علم میں ہے کہ حکومت نام کی کوئی شے اگر تھی تو کسی درجے میں مکہ میں تھی' اور اسی لئے حضور ﷺ کو بالآخر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اس حوالے سے پاکستان میں وہ رکاوٹیں موجود نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظامِ باطل کے پاسبانوں کے پاس ہر نوع کے وسائل ہیں' وہ آپ کی کردار کُشی (Character Assasination) کر سکتے ہیں۔ بڑے سے بڑے قلمکاروں کو اس مقصد کے لئے خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ سب تو ہوگا' لیکن قانونی و آئینی اعتبار سے آپ کے ہاتھ

بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

اب میں اس بحث کو سمیٹ رہا ہوں۔ دیکھئے تزکیۂ نفس اور تصوف کے حوالے سے بھی سارا تجزیہ اور ساری تشخیص اسی نکتے پر آگئی یعنی دعوت و اقامتِ دین کی جدّوجہد۔ اصل کام وہی ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ ع "آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی!" یہاں میں اس آیۂ مبارکہ کا حوالہ دوں گا کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ الحمدللہ کہ جہاں تک فکر اور سوچ کا تعلق ہے تو یہ سارا تانا بانا اور صغریٰ کبریٰ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں مکمل تھا۔ اس کی گواہی کے لئے میرے کتابچوں "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ" اور "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا مطالعہ کر لیجئے' یا "حقیقتِ زندگی" نامی مضمون دیکھ لیجئے جو ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا' یا "اسلام میں عقل و نقل کی کشمکش" نامی تحریر ملاحظہ کر لیجئے جو ۱۹۶۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اب میں اسی آیت کو دعا کی صورت میں تبدیل کر کے پڑھ رہا ہوں: هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا الى اللّٰه على بصيرةٍ اَنَا وَمَن اتَّبعنی' سبحان اللّٰه ومَا انا مِنَ الْمُشرِكِين وَلا من الْمُبتَدِعين۔ اللہ پاک ہے' میں نہ مشرکوں میں سے ہوں اور نہ مبتدعین میں سے۔

جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے تو اہل تصوف کے مقاصد کو میں صد فیصد دین سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا قول سنایا تھا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی ہیں۔ لہٰذا اس پہلو کو بھی ذہن میں رکھئے کہ میری سوچ میں یہ عنصر بھی ہے خواہ وہ فلسفہ وجود کے حوالے سے ہو یا حقیقت زندگی اور حقیقت انسان کے حوالے سے۔ لیکن میرا اصل مبدا اور منبع' میرا اوڑھنا بچھونا' میری سوچ کا ماخذ اور Source درحقیقت قرآن حکیم ہی ہے۔ میری سوچ میں عقل و منطق یا قیاس کے حوالے سے جو اضافے ہیں وہ الگ رہیں گے' لیکن اس کا اصل تانا بانا قرآن مجید کے محکمات پر قائم ہے۔ اس میں تصوف کا فلسفیانہ حصہ بھی شامل ہے' لیکن جہاں تک تصوف کے عملی پہلو کا تعلق ہے تو اس کے مطابق بات آپ کے سامنے آگئی کہ اس کی اساس کیا تھی' کس طرح انحراف ہوا' اور کیوں

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

پاکستان میں انسدادِ سود کی کوششوں کی تاریخ اور مستقبل کے امکانات☆

مرتب : حافظ عاطف وحید

۱۔ حرمتِ سود

مندرجہ ذیل امور پر اب نہ صرف یہ کہ علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں بلکہ اسلامک آئیڈیالوجی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ دونوں کا فیصلہ بھی اس کی تائید میں ہے کہ :

۱) سود حرام مطلق ہے چاہے وہ "مرکب" ہو یا "سادہ"۔
۲) سود حرام ہے چاہے قرضہ انفرادی ضرورتوں کے لئے ہو یا تجارتی مقاصد کے لئے۔
۳) سود صرف قرض میں ہی نہیں ہوتا بلکہ بیع میں بھی ہوتا ہے۔ قرض کے سود کو (جو کہ عام طور پر روپے پیسے میں ہوتا ہے) ربا النسیئہ اور بیع کے سود کو (جو کہ اشیاء کی خرید و فروخت یا اشیاء کے قرض میں ہوتا ہے) ربا الفضل کہتے ہیں۔
۴) اگر کوئی معاملہ سودی ہو تو اسے حرام جاننا چاہئے' چاہے اس میں "ظلم" بظاہر نظر آئے یا نہ آئے۔ مثلاً اگر صرف ایک فیصد شرح سود پر قرضہ دیا جا رہا ہو تو بھی یہ حرام ہو گا جبکہ اگر کسی بیع میں سو فیصدی منافع کمایا جا رہا ہو اور اس میں کوئی اور شرعی قباحت نہ ہو تو وہ جائز ہو گی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ انگیزوں کے اعتراض "اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" کا بس اتنا ہی جواب دیا ہے کہ "اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا"۔

☆ اس مضمون کی تیاری میں جناب اکرم خان صاحب کی کتاب "Islamic Banking in Pakistan - The Future Path" اور ڈاکٹر سید طاہر کے مضمون Riba Free Alternatives for Modern Banking سے مدد لی گئی ہے۔

۲۔ پاکستان میں انسدادِ سود کی کوششوں کی تاریخ

۱) **اسلامی آئیڈیالوجی کونسل کا فیصلہ (ruling) 1969-12-23** : اس فیصلے میں ہر نوع کے "interest" کو "ربا" قرار دیا گیا ہے چاہے قرض کا مقصد، شرح اور مدت کچھ بھی ہو اور فریقین کوئی بھی ہوں۔

۲) **کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کو 77-9-29 کا صدارتی حکم** : اس میں کونسل کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر سودی اسلامی معیشت کے خدو خال پر مبنی رپورٹ تیار کرے۔ کونسل نے اس مقصد کے لئے ماہرین کا ایک پینل تشکیل دیا جنہوں نے اپنی رپورٹ بنائی۔ کونسل نے اس رپورٹ کا جائزہ لے کر اس میں ضروری ترمیمات کر کے اپنی ایک الگ رپورٹ تیار کی اور 80-6-14 کو جاری کر دی۔ یہ ایک بہت اہم اور غیر سودی مالیات پر ابتدائی اعتبار سے نہایت مفید دستاویز ہے۔ یہ رپورٹ غیر سودی مالیات کے ضمن میں ایک مکمل خاکہ (blueprint) مہیا کرتی ہے اور اس میں تجارتی اور صنعتی مقاصد کے لئے سرمایہ کی فراہمی کے لئے بارہ متبادل صورتیں (alternative modes of financing) بھی تجویز کی گئیں ہیں۔

(نوٹ : یہ رپورٹ اواخر ۸۰ء تک وزارت خزانہ کے "سرد خانے" میں پڑی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی اشاعت عام پر بھی پابندی لگی رہی اور اس کی "رہائی" اور طباعت و اشاعت کی اجازت کا مرحلہ اس وقت طے ہو سکا جب اس وقت کے آئیڈیالوجی کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس (ر) تنزیل الرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے اس کی شکایت کی کہ جو اس وقت جنرل ضیاء الحق کی نامزد مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ چنانچہ ان کے پر زور اصرار پر جنرل صاحب موصوف نے اس کی طباعت کی اجازت مرحمت فرمائی!)

۳) **سٹیٹ بینک کا حکم نامہ برائے کمرشل بینکس 1980ء** : اس حکم نامہ (circular) میں تمام کمرشل بینکوں کو ہدایت کی گئی کہ یکم جنوری ۸۱ء سے کونسل کی رپورٹ کے مطابق اپنے operations کو اسلامی خطوط پر استوار کر لیں۔ یعنی آئندہ

سے نہ تو interest bearing deposits قبول کریں اور نہ ہی interest bearing lendingجاری کریں۔ کھاتہ داروں کے لئے پہلے سے جاری کرنٹ اکاؤنٹ کو برقرار رکھتے ہوئے saving account کی بجائے PLS اکاؤنٹ شروع کیا گیا اور تجارتی و صنعتی سرمایہ کاری (financing) کے لئے بینکوں کو مندرجہ ذیل بارہ متبادل صورتوں کا پابند کیا گیا :

(i) مضاربہ (ii) مشارکہ

(iii) اجارہ (iv) اجارہ و اکتناع

(v) equity and participation (vi) rent sharing

(vii) اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے بیع مرابحہ کی صورت میں مارک اپ فنانسنگ

(viii) جائیداد کی خرید کے لئے buy-back معاہدات

(ix) Participatory Term Certificates

(x) Trade Bills

(xi) Service Charges کی بنیاد پر غیر سودی قرضے اور

(xii) قرض حسنہ

۴) سٹیٹ بینک کا سرکلر نمبر 13 برائے کمرشل بینکس 1984ء : اس سرکلر کے مطابق بینکوں کو اجازت دی گئی کہ وہ بیع مرابحہ کی قیود سے آزاد مارک اپ فنانسنگ کی اساس پر عام قرضے بھی جاری کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بینکوں نے مضاربہ' مشارکہ' اجارہ وغیرہ کی بنیاد پر فنانسنگ ختم کر کے ان میں سے اکثر کے لئے مارک اپ کو اختیار کر لیا اور شرعی طور پر جائز modes of financing میں بھی ایسی تبدیلیاں کر لیں اور ایسی شرائط رکھ لیں کہ ان کی شکل بگڑ کر غیر شرعی یا سودی ہو گئی۔

۵) فیڈرل شریعت کورٹ کا فیصلہ 1991ء : نومبر 91ء کے اس فیصلے کے مطابق ملکی مالیاتی نظام کے جملہ معاملات میں اور قوانین میں interest پر "الربا المحرم" کا اطلاق ہوتا ہے۔ مزید برآں "مارک اپ" کے نام پر جو نام نہاد غیر سودی فنانسنگ جاری ہے وہ بھی در حقیقت "سود" ہی ہے۔ کورٹ نے وفاقی حکومت کو ہدایت دی کہ 30 جون

92ء تک تمام سودی معاملات سے سود کو ختم کر کے غیر سودی متبادلات کو جاری کیا جائے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مذکورہ تاریخ کے بعد سودی لین دین سے متعلق تمام قوانین غیر مؤثر ہو جائیں گے۔

۶) فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلہ کے خلاف حکومتی اپیل : حکومت نے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کے لئے ماہرین کے ذریعے بینکاری کا متبادل نظام تجویز کرنے کی مساعی شروع کرنے کے بجائے سپریم کورٹ کے اپیلیٹ بینچ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی اور تاحال معاملہ سپریم کورٹ کے پاس pending ہے۔ اس دوران سپریم کورٹ نے ایک سوالنامے کے ذریعے ملک کے معروف علماء، ماہرین معاشیات اور قانون دانوں سے مختلف معاملات پر ان کی آراء اور تجاویز مانگی ہیں۔ گویا سپریم کورٹ تمام معاملات کا از سرنو جائزہ لینا چاہتی ہے۔

۷) "Commission for Islamization of the Economy" :

مرکزی حکومت نے FSC کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کرنے کے ساتھ ساتھ متذکرہ بالا عنوان سے ایک کمیشن بھی قائم کیا جس کا سربراہ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر ہی کو بنایا گیا۔ اس کمیشن نے جون 92ء میں ماہرین کے ایک working group کے کام پر مبنی رپورٹ (جو طبع تو ہو گئی ہے لیکن منظر عام سے غائب کر دی گئی ہے) میں یہ رائے دی کہ مارک اپ سمیت تمام قسم کے interest اصلاً ربا ہی ہیں۔

گویا اس طرح انسداد سود کی اب تک کی جملہ مساعی کا حاصل صفر ہے۔ اور اس وقت پاکستان میں بینکوں کی FINANCING کی اکثر و بیشتر اور اہم ترمدات میں تو اعلانیہ طور پر مارک اپ کا وہ اصول کارفرما ہے جو کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی، فیڈرل شریعت کورٹ، اور کمیشن فار اسلامائزیشن سب کے نزدیک "ربا" ہے۔ مزید برآں جن چند غیر سودی مدات کا آغاز کیا گیا تھا ان میں سے بعض اگرچہ بظاہر ابھی جاری ہیں، جیسے اجارہ، مشارکہ، تعمیراتی فنانسنگ اور N.I.T، ICP کی سکیمیں، لیکن ان سب کے قواعد و ضوابط میں بھی رفتہ رفتہ جو تبدیلیاں کر دی گئی ہیں ان کی بنا پر یہ

سب بھی "ربا" ہی کی صورت اختیار کر چکی ہیں اور ۱۹۹۱ء میں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے سے جو نئی تاریخ شروع ہوئی تھی اسے اپیل کے "سرد خانے" میں "منجمد" کر دیا گیا ہے!

۳۔ موجودہ صورتحال

الف) بینکنگ

بینکوں کے operations میں فی الوقت مشکل ہی سے کوئی ایسا عمل ہو گا جس کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکے کہ وہ عین شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔ خاص طور پر بینکوں کی آمدنی والا حصہ ا تفصیل درج ذیل ہے :

۱) آمدنی کے ذرائع : بینکوں میں جمع شدہ ایک خطیر رقم مندرجہ ذیل مدات میں منقسم ہے جس سے بینکوں کو آمدن حاصل ہوتی ہے۔

۱) سرکاری تمسکات (securities) میں سرمایہ کاری سے حاصل شدہ سود۔

۲) سٹیٹ بینک کی reserve requirement جس میں بینکوں کو اپنے کھاتوں کا کچھ حصہ لازماً سٹیٹ بینک میں رکھوانا ہوتا ہے، جس پر انہیں "بینک ریٹ" پر سود ملتا ہے۔

۳) کاروباری قرضوں سے حاصل شدہ سود (جس کے لئے مارک اپ کا نام استعمال ہو رہا ہے۔)

۴) Trade Bills (ہنڈیوں) کی خرید و فروخت، جو "مارک ڈاؤن" کی بنیاد پر خریدی بیچی جاتی ہیں۔ نیز قلیل مدت کے Over Draft جاری کئے جاتے ہیں جن پر مارک اپ (سود) وصول کیا جاتا ہے۔

۵) طویل اور قلیل مدتوں کی دیگر بھی ضروریات کے لئے قرضوں پر سود!

۶) فنانشل لیزنگ سے حاصل شدہ مارک اپ۔ آمدنی کی اس مد میں بینک، لیزنگ کمپنی یا مضاربہ کمپنی مختلف اداروں یا افراد کو مشینیں، آلات، زمین، عمارت اور گاڑی

وغیرہ کی خرید کے لئے قرضہ فراہم کرتی ہے۔ خرید کردہ شے کو رقم فراہم کنندہ کی ملکیت تصور کیا جاتا ہے' اگرچہ وہ شے کی خرید' اس کی دیکھ بھال اور شکست و ریخت کے اخراجات سے بری الذمہ ہوتی ہے۔ لیزنگ کمپنی کو صرف اپنی اصل رقم اور مارک اپ سے دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے لئے اس معاہدے میں کوئی کاروباری خطرہ (Business Risk) نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا تمام فنانسنگز میں مارک اپ کا اصول اپنایا گیا ہے جو اسلامک آئیڈیالوجی کونسل' فیڈرل شریعت کورٹ اور کمیشن فار اسلامائزیشن آف اکانومی سب کے نزدیک سود ہی ہے۔

۷) Operating Lease : یہ طریقہ شرعی اصول اجارہ کے قریب ہے۔ فنانسنگ کے اس طریقے میں لیزنگ کمپنی کو شے کی خرید' اس کی دیکھ بھال اور شکست و ریخت کے وہ جملہ خطرات اور اخراجات برداشت کرنا ہوتے ہیں جو شرعی اصول اجارہ کے تحت ضروری ہیں۔ اس کا استعمال اول تو بہت کم ہے' ثانیاً اس کی تفصیلات میں بھی بعض امور شرعی نظر سے قابل اعتراض ہیں۔

۸) مشارکہ : اس اصول کے تحت بھی بہت ہی تھوڑی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ لیکن قوانین ایسے بنائے گئے ہیں کہ نہ تو بینک کو نقصان اٹھانا پڑے اور نہ ہی اس کا منافع ایک خاص شرح سے نیچے آئے۔ جس سے یہ بھی سود ہی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

۹) P.T.C (Participatery Term Certificate) : یہ سرمایہ کاری طویل میعادی نفع و نقصان کی شراکتی بنیاد پر ایجاد کی گئی ہے وہ کاروباری ادارے جو طویل مدتی قرضے حاصل کرنے کے خواہشمند ہوں وہ نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر PTC جاری کرتے ہیں۔ مختلف بینک اور DFIs' ان PTCs کے عوض خواہشمند اداروں کو پہلے سے طے شدہ شرح منافع (Profit ratio) پر قرضے جاری کرتے ہیں' جبکہ نقصان کی تقسیم اصل زر کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ اس طریقے میں بینکوں کے لئے بعض اندیشے (risk) تھے۔ لہٰذا 1989ء میں اسے ترک کر دیا گیا۔ P.T.C اگرچہ بعض جزئیات کے اعتبار سے غیر

اسلامی معاملہ تھا' تاہم غیر سودی مالیات کے ضمن میں یقیناً پیش رفت تھی۔ جسے بعد ازاں TFC (Term Finance Certificates) سے تبدیل کر دیا گیا' جو صریحاً مارک اپ اور مرکب سود کی ایک شکل ہے۔

۱۰) **تعمیراتی فنانسنگ** : 1979ء میں اس کا آغاز Rent Sharing کی بنیاد پر کیا گیا جو شرعی نقطہ نگاہ سے ایک قابل عمل تجویز تھی' لیکن اس وقت اس مد سے فنانسنگ اصل زر' مدت' اور افراط زر کی شرح دیکھ کر ایسے انداز میں کی جا رہی ہے جو سودی طریق ہی کی مختلف شکل ہے۔

۱۱) **NIT اور ICP کی سکیمیں** : ان دو اداروں نے گھریلو بچتوں کو نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر جمع کرنے کا آغاز کیا۔ لیکن بعد ازاں ان کی سرمایہ کاری P.L.S اکاؤنٹ اور T.F.C اور Financial Leasing میں بھی ہونے لگی جس سے ان میں بھی سود کی جزوی آلائش شامل ہو گئی۔

۲) <u>ادائیگیاں</u> : بینکوں کو دو اہم مدوں میں ادائیگیاں کرنی ہوتی ہیں :

۱) **کھاتے (Deposits)** : اس مد میں بینک اپنے مجموعی منافع میں سے' جو اکثر و بیشتر سود پر حاصل کیا جاتا ہے' کچھ حصہ کھاتہ داروں کو تقسیم کر دیتا ہے اور بڑا حصہ خود اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔

۲) **قرض (Borrowing of a commercial bank from other banks)** : دوسرے بینکوں سے قرض پر سود کی شکل میں ادائیگی ہوتی ہے جبکہ سٹیٹ بینک کو نفع و نقصان کی بنیاد پر ادائیگی کی جاتی ہے۔

ب) <u>حکومت کے لین دین</u>

حکومت کے اکثر لین دین قرض پر مبنی ہوتے ہیں' جو کہ سود کے ساتھ لئے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً :

۱) سٹیٹ بینک سے قرضہ مارک اپ کی بنیاد پر

۲) صوبائی حکومتوں کو مرکزی حکومت کا سودی قرضہ
۳) حکومت کا اپنے ملازمین کو سودی بنیاد پر مکان اور گاڑی وغیرہ کے لئے قرضہ
۴) سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ(Provident Fund) پر سود کی ادائیگی
۵) حکومت کی بڑے پیمانے پر مختلف بچتوں کی سکیموں اور مختلف بانڈز کے تحت عوام سے قرضے اور ان پر سود کی ادائیگی
۶) بیرونی قرضوں پر سود کی ادائیگی اور وصولی
۷) مرکزی حکومت کا نیم خود مختار اداروں کو سود پر قرضہ

۴۔ مستقبل کے امکانات

(الف) : مندرجہ ذیل بنیادوں پر غیر سودی بینکاری نظام کو مستقل طور پر استوار کیا جاسکتا ہے۔

i) شراکتی سرمایہ کاری، یعنی مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر نفع و نقصان میں شراکت۔
ii) بیع مؤجل، بیع سلم اور اجارہ(Leasing) کی بنیاد پر عقود بیع اور عقود اجارہ۔
iii) TMCL (Time Multiple Counter Loan) کی بنیاد پر قلیل اور طویل مدتی قرضے برائے صارفین، تاجرین اور حکومت۔ (تجویز کردہ شیخ محمود احمد مرحوم مصنف "سود کی متبادل اساس" انگریزی و اردو، اور ایک ضخیم کتاب "MAN AND MONEY" جو ابھی زیر طبع ہے!)
iv) قرض حسنہ برائے صارفین و حکومت

(ب) : ان بنیادوں پر بینکنگ کے نظام کا خاکہ کچھ اس طرح ہو گا کہ ایک طرف بینک نجی بچتیں کرنٹ اکاؤنٹ اور پی ایل ایس سیونگ اکاؤنٹ کی بنیاد پر اکٹھی کریں گے۔ اور دوسری طرف اوپر دیئے گئے Options کے مطابق سرمایہ کاری کی جائے گی۔

۱) اس مقصد کے لئے کرنٹ اکاؤنٹ کے علاوہ عام کھاتہ داروں سے نفع و نقصان کی بنیاد پر رقم وصول کی جائے گی، جو کہ مضاربہ اکاؤنٹ، مشارکہ اکاؤنٹ، اجارہ اکاؤنٹ کے تحت ہوں گے۔ منافع کا تناسب بینک اور کھاتہ داروں کے درمیان پہلے سے طے

کیا جائے گا۔ مثلاً [1/2 : 1/2]' [1/4 : 3/4]' [3/2 : 1/3] [1/3 : 2/3]
وغیرہ۔ متذکرہ بالا تینوں کھاتوں کو الگ الگ ایڈمنسٹر کیا جائے گا۔

۲) یہ رقم بینک سرمایہ کاروں کو انہی مدات میں مہیا کریں گے اور ان سے شرح منافع الگ طے کریں گے (شرح منافع سرمائے کی طلب و رسد کے مطابق طے ہوں گے)

۳) بچتوں کا یہ حساب سالانہ کے علاوہ روزانہ کی بنیاد پر بھی لگایا جائے گا اور ہر سال کے آغاز میں منافع کے تقسیم کی شرح طے کی جائے گی۔

۴) بعض تجارتی قرضے' ٹریڈ بلز وغیرہ TMCL کے تحت مہیا کئے جائیں گے۔

۵) ہاؤس فنانسنگ مشارکہ متناقصہ (شرکت عنان)' ٹریڈنگ اجارہ اور اجارہ واکتناع کی بنیاد پر مہیا کئے جائیں گے۔

۶) بینکوں کا سٹیٹ بینک سے مالی تعلق مضاربہ' P.T.C اور قرضہ حسنہ کی بنیاد پر استوار ہو گا۔

۵۔ انسدادِ سود کے لئے عملی اقدامات

الف) اصولی اور عمومی اقدامات

۱) دستورِ پاکستان میں وہ جملہ ترامیم فوری طور پر کر دی جائیں جن سے پاکستان کو کم از کم اصولی اور دستوری سطح پر اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کا درجہ حاصل ہو جائے! اس سے عوام میں عزمِ نو بیدار ہو گا اور ایثار اور قربانی کا قومی جذبہ پیدا ہو گا۔

۲) حکومتِ پاکستان سود سے متعلق فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلہ کے خلاف اپیل تو فوراً واپس لے لے' البتہ اس کی تنفیذ کے لئے کچھ مہلت حاصل کر لے!

۳) ربا کی حرمت اور اس کی خباثت کو آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالے سے جملہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے عام کیا جائے' تاکہ

لوگ فرمان الٰہی : "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" (البقرہ : ۲۷۸) کے مطابق سود کو چھوڑنے کے لئے نقصان برداشت کرنے کے لئے ذہناً و قلباً آمادہ ہوں۔

۴) "کمیشن فار اسلامائزیشن آف اکانومی" کو مؤثر بنانے کے لئے اس میں نسبتاً بڑے پیمانے پر ماہرین و علماء کو شامل کیا جائے اور انہیں اس کام کے لئے کُل وقتی بنیاد پر مصروف کیا جائے۔ مزید برآں انہیں وسیع تر اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ انسدادِ سود کے عمل کی نگرانی بہتر طریق پر کر سکیں۔

۵) حکومتی قرضوں کو کم کرنے کے لئے بجٹ کے خسارے کو کم کیا جائے اور اس کے لئے اخراجات میں کمی اور ٹیکسوں کے نظام کو مستعد اور حقیقت مندانہ بنایا جائے۔

۶) عدالتی نظام کو مؤثر اور مستعد بنایا جائے اور عام افراد کو سودی مقدمے ختم کرانے کے لئے عدالتوں میں جانے کی اجازت ہو۔ اس کے لئے سود کو ختم کرنے کی ضروری عدالتی ترمیمات درکار ہوں گی۔ یہ عمل سود کے خاتمے کے لئے built-in mechanism مہیا کرے گا۔

۷) نئے ادارے وجود میں لائے جائیں جن کے تحت شرعی طور پر جائز تجارتی لین دین کیا جا سکے۔

۸) چونکہ سرمایہ یا نقد پر "ربا" کی لعنت کو بالکلیہ اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک زراعت کو بھی "ربا" سے پاک نہ کر دیا جائے' لہٰذا جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری میں سے بھی غیر اسلامی عنصر کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کا آغاز کیا جائے۔

ب) فوری اور لازمی اقدامات

۱) صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے باہمی قرضوں نیز وفاقی حکومت کے سٹیٹ بینک سے قرضے پر سود فوری طور پر ختم کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اس سے آمدن اور

اخراجات پر منجملہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ کام فوری کرنا چاہئے۔

۲) نیم سرکاری اداروں اور کارپوریشنوں جیسے واپڈا' ریلوے اور PTC وغیرہ کو جو قرضے حکومت نے دیئے ہیں ان کو فوری طور پر "ایکویٹی" میں تبدیل کر دیا جائے!

۳) حکومت کی بچت سکیموں کے تحت حکومتی قرضوں پر مشتمل ہر نوع کے بانڈز' سرٹیفکیٹ اور سیکیورٹیز وغیرہ پر سود کی ادائیگی فوری طور پر بند کی جائے۔ نیز ان قرضوں کے اصل زر کی ادائیگی کے لئے مناسب لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے۔

۴) سرکاری ملازمین کو مکان' کار یا موٹر سائیکل کی خرید کے لئے دیئے جانے والے قرضوں پر سے سود لینے اور GPF پر سود دینے کو فوراً ساقط کر دیا جائے!

۵) بینک فنانسنگ کو حسب ذیل صورتوں میں از سر نو محدود کر دیا جائے' جیسے یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے کیا گیا تھا۔

۶) بین الاقوامی سودی قرضوں کی ایڈجسٹمنٹ کے لئے Debt-Equity Swap کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے (اس طریقے میں غیر ملکی حکومتوں / اداروں کو اس بات کی اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے واجب الوصول قرضوں کے عوض ملک کے اندر حقیقی سرمایہ کاری کریں جس کے لئے حکومت انہیں لوکل کرنسی میں رقم مہیا کرنے اور ان کے منافع کی ادائیگی زر مبادلہ کی صورت میں کرنے کی ضمانت دیتی ہے)۔ اس کے لئے Latin American ممالک کا تجربہ مفید ہو گا۔

۷) تجارتی بینکوں کے لئے اجازت ہو کہ وہ real investment' اور trading وغیرہ کے شعبوں میں بھی سرمایہ کاری کر سکیں۔ اس میں نہ کوئی شرعی قباحت آڑے آتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسری مشکل ہے۔

۸) سٹاک مارکیٹ میں سٹہ بازی کی صریح ممانعت ہو اور حصص کی صرف حقیقی خرید و فروخت کی اجازت دی جائے۔

۹) بینکوں کے آڈٹ کا شرعی اعتبار سے ایک اضافی محکم نظام قائم کیا جائے۔

۱۰) "قرض اتارو اور ملک سنوارو مہم" میں سے پہلی دو صورتوں کو برقرار رکھتے ہوئے تیسری یعنی "بچت اکاؤنٹ" کو فوراً ختم کیا جائے۔ اور اس کی بجائے زکوٰۃ وصول کی جائے جس کے ضمن میں یہ ضمانت دی جائے کہ یہ صرف اور صرف اور براہ راست ملکی قرضے کی ادائیگی میں صرف ہو گی!

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت)

اسلامی نظامِ عدل و انصاف —— ایک درخشاں مثال

ایک دفعہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اتفاق سے اکٹھے مسجد میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک یہودی آیا اور کہنے لگا کہ "میں علیؓ پر دعویٰ کرنے آیا ہوں"۔ یہ سن کر دونوں صحابہ کرام بے حد حیران ہوئے لیکن خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اے ابوالحسن اس شخص کے مقابل کھڑے ہو جاؤ اور دعویٰ کی جواب دہی کرو"۔ ذرا غور فرمایئے: اسلامی نظامِ عدل میں نہ کچہری، نہ عدالت، نہ وکیل، نہ درخواست، بلکہ کورٹ فیس کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن جب خلیفۂ وقت نے دونوں اطراف کے بیانات سنے تو معلوم ہوا کہ یہودی سراسر جھوٹا ہے۔ امیر المومنین نے اس کا دعویٰ خارج کر دیا۔ یہودی فیصلہ سن کر واپس چلا گیا۔

یہودی کے جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے دریافت فرمایا: "اے علی المرتضیٰ! جب میں نے آپ کو یہودی کے برابر کھڑا ہونے کے لئے کہا تو آپ کی پیشانی پر سلوٹیں کیوں نمودار ہوئی تھیں؟ کیا آپ کو اس کے برابر کھڑا ہونا ناگوار گزر رہا تھا؟"

حضرت علیؓ نے فرمایا: "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے مجھے میرے نام کی بجائے کنیت یعنی ابوالحسن کے نام سے پکارا تھا اور یہ کہ اہلِ عرب کے ہاں کسی کو کنیت سے مخاطب کرنا عزت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مجھے یہ خدشہ ہوا کہ یہودی کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ عدالت ایک فریق کو اتنے ادب و احترام سے کیوں مخاطب کر رہی ہے اور کہیں انصاف میں بھی اس کی طرفداری تو نہ ہو گی"۔ (اقتباس روزنامہ "جنگ" لاہور)

حِبِّ رسول : حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حضرت زید بن حارثہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ وہ آپ کے محبوب صحابی تھے۔ تمام صحابہ کرام ان کو حب الرسول اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ کو حب بن حب کہتے تھے۔ اصحاب رسول ﷺ میں سے یہ شرف صرف زید ہی کو حاصل ہے کہ ان کا نام صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی فضیلت کی بنا پر بعض لوگوں نے حضرت زید کو افضل الصحابہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو حضور ﷺ کے بعد خلیفہ ہوتے۔

حضرت زیدؓ قبیلہ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرجیل کے بیٹے تھے۔ ان کی ماں سعدی بنت ثعلبہ قبیلہ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ ابھی ان کی عمر آٹھ سال تھی کہ یہ اپنی والدہ کے ساتھ سفر پر جا رہے تھے کہ راستے میں قبیلہ بنی قین کے لوگوں نے حملہ کر کے لوٹ مار کی اور کچھ لوگوں کو پکڑ کر لے گئے جن میں زید بھی شامل تھے۔ زید کو عکاظ کے میلے میں حکیم بن حزام کے ہاتھ بیچ دیا گیا جو کہ حضرت خدیجہ کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے یہ غلام مکہ میں لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کے حوالے کر دیا۔ جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہوا تو زید حضرت خدیجہؓ کے ہاں موجود تھے۔ آپؐ کو زید کے عادات و اطوار اس قدر پسند آئے کہ آپؐ نے انہیں حضرت خدیجہ سے مانگ لیا۔ ادھر زید کے گھر والے اس کے فراق میں غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ بنی کلب کے چند افراد حج کے ارادے سے مکہ آئے تو زید کو دیکھ کر پہچان لیا۔ اس طرح زید کے گھر والوں کو زید کی خبر لگ گئی۔ چنانچہ زید کے والد حارثہ، چچا کعب اور بھائی بھاگے ہوئے مکہ پہنچے۔ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپؐ زید کو معاوضہ لے کر ہمارے

حوالے کر دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا : میں بچے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے یا آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ لئے بغیر اسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ کی یہ باتیں سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ زید کو بلایا گیا اور اس کے باپ اور چچا کے سامنے اس کے ساتھ بات کی گئی اور دونوں صورتیں اس کے سامنے پیش کی گئیں۔ زید نے جواب دیا کہ میں آپؐ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ میرے باپ اور چچا جو کچھ بھی ہیں آپؐ ہیں۔ حارثہ یہ سن کر نہایت مضطرب ہوئے اور کہنے لگے زید کس قدر افسوس ہے کہ تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ زید نے جواب دیا : اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں۔ زید کا یہ جواب سن کر باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان کرا دیا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ حارثہ نے یہ سنا تو اور بھی خوش ہوا۔ باپ اور چچا دونوں مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ اب وہ کبھی کبھی مکہ آتے اور زید کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے۔ چونکہ زید کو آپؐ نے آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا' اس لئے لوگ اب زید کو زید بن محمد پکارنے لگے تھے۔

چالیس سال کی عمر میں جب آپؐ نے اعلان نبوت کیا تو زید کی عمر ۳۰ سال تھی۔ اعلان نبوت کے ساتھ ہی آپ کی بیوی حضرت خدیجہ' آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ جو آپ ہی کے گھر پرورش پا رہے تھے اور آپ کے دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ ایمان لے آئے اور ان کے ساتھ ہی زید نے بھی لبیک کہا اور یوں وہ ان چار ممتاز ہستیوں میں شامل ہو گئے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

اسلام حقیقت پسندانہ رویہ کا قائل ہے۔ لہٰذا حقیقت کے مقابلے میں مصنوعیت کو قبول نہیں کرتا۔ رائج الوقت دستور کے موافق متبنیٰ کی حیثیت بالکل حقیقی بیٹے کے سی تسلیم کی جاتی تھی مگر اسلام نے اس کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۶

میں فرمایا :

﴿ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَ كُمْ اَبْنَاءَ كُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ... ﴾

"اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو مگر اللہ وہ بات کرتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے"۔

اس واضح ہدایت کے آ جانے کے بعد مسلمان زید بن محمدؐ کے بجائے زید بن حارثہ کہنے لگے۔ جیسا کہ آغاز میں بیان کیا گیا کہ حضرت زید ہی وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن حکیم میں مذکور ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

"چونکہ قرآن کے حکم موافق ان کے نام سے اس نسبت عظیمہ کا شرف جدا کر لیا گیا تھا۔ شاید اس کی تلافی کے لئے تمام صحابہ کے مجمع میں سے صرف ان کو یہ شرف بخشا گیا کہ ان کا نام قرآن میں تصریحاً وارد ہوا"۔

زید آپؐ کے لئے گھر کے دوسرے افراد ہی کی طرح تھے۔ آپ نے ان کا نکاح اپنی دودھ پلائی ام ایمن سے کر دیا جن کے بطن سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے۔ بعد ازاں آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے کر دیا جائے۔ چونکہ زینب ہاشمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں اور زید بہرحال آزاد کردہ غلام تھے' لہٰذا زینب اور اس کے بھائی عبداللہ بن جحش اس عقد پر راضی نہ ہوئے تب وحی الٰہی کے ذریعے ایک فیصلہ کن بات بتا دی گئی کہ جس بات کا حکم اللہ اور اس کا رسول دیں پھر اس کی خلاف ورزی کسی کے لئے جائز نہیں۔ فرمایا :

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ (الاحزاب : ۳۶)

"جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا"۔

اس آیت کے سنتے ہی حضرت زینب اور ان کے گھر والوں نے بلا تامل سر اطاعت خم کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ان کا نکاح پڑھایا۔ آپؐ نے خود حضرت زید کی جانب سے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر ادا کیا اور کچھ کپڑے اور سامان خوراک گھر کے خرچ کے لئے بھجوا دیئے۔

حضرت زینب حضرت زیدؓ کے ساتھ عقد نکاح میں منسلک تو ہو گئیں مگر وہ اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور ان کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں۔ وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کمتر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انہوں نے کبھی زید کو اپنے برابر کا نہ سمجھا۔ ادھر حضرت زید کو اس بات کا گہرا احساس تھا کہ وہ عرب کے معزز ترین شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے ہیں اور حضرت زینب پر ان کو قوامیت کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ یہ دو متضاد ذہنیتیں تھیں جن کے سبب میاں بیوی کے درمیان محبت اور الفت کا رشتہ استوار نہ ہو سکا اور تلخیاں بڑھنے لگیں۔ حضرت زید نے کئی بار حضور اکرمؐ سے شکایت کی مگر حضورؐ اسے سمجھاتے رہے کہ نباہ کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ حضرت زید نے حالات کو بہتر کرنے کی پوری سعی کی ہو گی مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی اور میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔

اگرچہ اس سے قبل متبنیٰ کے بارے میں حکم آ چکا تھا' تاہم اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اس پر عمل درآمد کے لئے حضور اکرمؐ کی سیرت سے نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اشارہ مل گیا کہ زید جب اپنی بیوی کو طلاق دے چکیں تو ان کی مطلقہ خاتون سے آپ کو نکاح کرنا ہو گا۔ یہ آنحضرتؐ کے لئے بہت بڑی آزمائش تھی اور برمنائے بشریت آپ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید زینب کو طلاق نہ دے تاکہ

زینب کے خاندان کی توہین بھی نہ ہو اور میں بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہ جاؤں کہ محمد نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنالیا ہے۔ اسی بنا پر آپ مسلسل زید کو طلاق دینے سے باز رکھتے رہے لیکن جب زید نے طلاق دے کر زینب کو فارغ کردیا اور عدت گزر گئی تو بحکم خداوندی حضورؐ نے حضرت زینب سے نکاح کرلیا۔

اس صورتحال کو قرآن پاک میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۷ میں بیان کیا گیا ہے :

﴿ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ۭ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ ﴾

"اور وہ وقت قابل ذکر ہے کہ جب تم اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر اور صورتحال یہ تھی کہ تم اپنے جی میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں (کے طعن و تشنیع) سے ڈرتے تھے اور اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے۔ سو جب زید اپنی حاجت پوری کرچکا (اور اس نے طلاق دے دی) تو ہم نے اس (زینب) کا نکاح تجھ سے کرا دیا تاکہ آئندہ مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح نہ کرسکیں جب کہ ان کے منہ بولے بیٹے اپنی حاجت پوری کرلیں (یعنی طلاق دے دیں) اور اللہ یہ حکم اٹل ہے"۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آکر حضرت زینب بجا طور پر امہات المومنین کو کہا کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح تو زمین پر ہوئے مگر میرا نکاح آسمان پر رب العزت نے رسول پاکؐ کے ساتھ کیا۔ اور واقعی یہ وہ شرف ہے جو حضرت زینب کے لئے حقیقتاً وجہ افتخار ہے۔ اس طرح حضرت زینب بھی خوش ہوگئیں اور متبنیٰ کی بیوی کے ساتھ نکاح کا جواز بھی ثابت ہوگیا۔ بلکہ کفار و مشرکین کی طرف سے اٹھائے گئے طوفان کا

جامع جواب بھی قرآن پاک میں نازل ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ پس زینب تو زید بن حارثہ کی بیوی تھی نہ کہ آپؐ کے بیٹے کی۔ فرمایا :

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾

"محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں"۔

رسول پاک ﷺ کو آپ کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ طبقات ابن سعد کے مطابق حضرت زید کو آپؐ نے نو دفعہ سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ آپ نے تقریباً تمام معروف معرکوں میں شرکت کی۔ غزوۃ المریسیع میں آپ شامل نہ ہوئے کیونکہ آنحضرتؐ نے آپ کو مدینہ میں اپنے جانشین کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ حضرت زید تیر اندازی میں انتہائی مہارت رکھتے تھے اور اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

رسول پاکؐ کو حضرت زید کے بیٹے اسامہ سے بھی بہت پیار تھا۔ جس طرح آپؐ اپنے نواسوں حسنؓ اور حسینؓ کو گود میں بٹھاتے اسی طرح اسامہ کو بھی بٹھاتے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر خلیفہؓ دوم نے اسامہ کا وظیفہ میرے وظیفہ سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو حضرت عمرؓ نے کہا اے بیٹے اسامہ آنحضرت ﷺ کو تجھ سے زیادہ پیارے تھے اور اس کا باپ تیرے باپ سے زیادہ آپؐ کو محبوب تھا۔

آنحضرت ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمرازدی قیصر روم کے نام آپؐ کی طرف سے نامہ مبارک لے جا رہے تھے کہ شرجیل بن عمر غسانی نے انہیں شہید کر دیا۔ آپؐ کو اس بد عہدی پر بڑا رنج ہوا۔ آپؐ نے تین ہزار مجاہدین اسلام کو حارث کا انتقام لینے کے لئے روانہ کیا۔ اور سپہ سالار حضرت زید کو مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر طیار اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کو سپہ سالار بنایا جائے۔ یہ معرکہ جمادی الاول ۸ ہجری کو موتہ کے مقام پر ہوا۔ اس جنگ میں حضرت زید نے شہادت پائی' بعد ازاں حضرت جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں یہ معرکہ سر ہوا۔ جب آپؐ نے

حضرت زید کی شہادت کی خبر سنی تو بڑے رنجیدہ ہوئے اور وفور جذبات سے آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آپ کو اپنے وفاشعار غلام کی مفارقت کا اس قدر غم تھا کہ حجتہ الوداع سے واپسی پر ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ کی سرکردگی میں ایک فوج کو انتقام کے لئے مامور فرمایا۔ اس وقت حضرت اسامہ نہایت کم عمر تھے۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض بھی کیا، مگر آپ نے فرمایا : خدا کی قسم زید امارت کے لائق اور محبوب ترین شخص تھا اور اس کے بعد اسامہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ یہ مہم ابھی روانہ نہ ہوئی تھی کہ آفتاب رسالت غروب ہو گیا لیکن خلیفہ اول نے ہجوم مصائب اور صعوبات گوناگوں کے بعد اس لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت اسامہ ؓ نے اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لے کر غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔

بقیہ: حقیقتِ تصوف

ہوا۔ اس حوالے سے میں نے آپ کے سامنے اپنا موقف رکھ دیا ہے۔ اگر اس میں کوئی خیر ہے تو منجانب اللہ ہے، یا پھر آپ لوگوں کا حسنِ نظر ہے۔ اس میں کوئی شر ہے، خطا یا غلطی ہے، تو میں خود بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا ہوں، اور آپ کے لئے بھی دعا گو ہوں کہ وہ اسے آپ کے حافظے سے محو کر دے۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!

مقاصدِ تصوف کے بعض پہلو آج کی گفتگو میں زیرِ بحث نہیں آئے، جیسے مقامِ صبر، مقامِ رضا، مقامِ توکل، لیکن یہ تمام موضوعات سورۃ تغابن کے درس میں موجود ہیں۔

اقول قَولی ھٰذا وَاستغفرُ اللّٰہَ لِی وَلکم ولسائرِ المُسلِمین وَالمُسلِمات OO

(مرتب : ڈاکٹر احمد افضال)

دعوت و تبلیغ کی اہمیت

سید محمد آزاد' میرپور (آزاد کشمیر)

قرآن مجید کی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے :

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

"اور تم میں ایک جماعت لازماً موجود ہونی چاہئے جو خیر اور بھلائی کی طرف دعوت دے اور نیکیوں کا حکم دے' اور برائیوں سے روکے۔ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔"

تبلیغ

تبلیغ کے لغوی معنی ہیں : "انتہا تک یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا"۔ محاورہ میں کہتے ہیں : بَلَّغَ مِنِّی کَلَامُکَ "تیرے کلام نے مجھے انتہائی متاثر کیا۔"

دینی اصطلاح میں تبلیغ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا پیغام وضاحت کے ساتھ انسانوں تک پہنچانا۔ قرآن حکیم میں اسے "بلاغ" بھی کہا گیا ہے۔ بعض جگہ "بلاغ مبین" کے الفاظ بھی آئے ہیں لیکن بلاغ مبین نبی سے مختص ہے کیونکہ وہی اس کا پورا حق ادا کر سکتا ہے۔ مزید بر آں تبلیغ کے لئے "ابلاغ" کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ تبلیغ جہاں غیر مسلم کو ہونی چاہئے وہاں مسلم کو بھی ہونی چاہئے۔ غیر مسلم تک اسلام کا پیغام پہنچانا ضروری ہے اور اسی طرح مسلمانوں کو بھی برائیوں سے پرہیز کرنے اور حقیقی مومن بننے کی تلقین ضروری ہے۔ اسلام صرف روحانی ہی نہیں بلکہ مادی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس لئے ہر عہد میں اسلامی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے۔ آج جبکہ دنیا روحانی تنزل اور مادی پریشانیوں کے پنجے میں

گرفتار ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اسلام کے صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ موجودہ دنیا کو جس قدر روگ لگے ہوئے ہیں اس کی شفاء قرآن حکیم میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کا شفا بخش پیغام پوری نوع انسانی تک پہنچانا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔

آج دنیا بھر کے سربراہ عالمی برادری کے طلب گار ہیں اور پکار رہے ہیں کہ جب تک عالمگیر پیمانے پر ایک اخوت قائم نہیں ہوتی ہمارے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اب یہ ثابت کرنا مسلمانوں کا کام ہے کہ اسلام نے اس برادری کو چودہ سو سال پہلے قائم کر دکھایا ہے۔ یہ وہ برادری ہے جس میں کالے اور گورے، شرقی و غربی اور امیر و غریب سب کے لئے برابر کی گنجائش ہے۔

قرآن حکیم کی ایک بہت ہی مختصر مگر نہایت اہم سورت "العصر" سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اگر نیکی کی تبلیغ رک جائے تو نوع انسانی گھاٹے میں رہتی ہے۔ نیکی محض ٹھہراؤ کا نام نہیں ہے بلکہ حرکت کا نام ہے۔ اگر اس میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا نہ کی جائے تو یہ سکڑتی ہے اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں کاملا اور حقیقتاً نیک وہ ہے جو اوروں کو بھی نیک بنانے کی تڑپ رکھتا ہو۔ جو نیکی انسان کے اپنے اندر ہی گم ہو اور اس کی روشنی اردگرد نہ پھیل رہی ہو عین ممکن ہے کہ وہ محض فریب ہو۔ اس لئے کہ لنگڑی لولی نیکی جو انسانیت کی خدمت سے قاصر ہو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

نیکی کی اشاعت سے پہلے ضروری ہے کہ اسے بدی کی یورشوں سے محفوظ کر دیا جائے۔ جب تک برائی کا سدباب نہ ہو نیکی کی اشاعت مشکل ہے۔ اس لئے اسلام میں برائی کو روکنے اور نیکی کو رائج کرنے کا ساتھ ساتھ حکم ہے۔ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تبلیغ کے دو اجزاء ہیں (۱) نیکی کی اشاعت اور (۲) برائی کا انسداد۔

ہر مسلمان اسلام کا مبلغ ہوتا ہے، چنانچہ اسے اپنی حد استطاعت تک اسلام کی تبلیغ

کرنی چاہئے۔ جب تک کسی قوم میں برائی کو روکنے والے افراد موجود رہتے ہیں اس میں ترقی کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ ملت میں تبلیغ وارشاد اور تعلیم و تزکیہ کے فرائض انجام دینے والے گروہ کا وجود ضروری ہے۔ اسی ضرورت کی اہمیت مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۰۴ میں بیان ہوئی ہے۔ ہادی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو فرمان ہے :

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تمہیں لازماً اچھائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے، ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج دے، پھر تم اسے پکارو تو تمہاری دعا قبول نہ کی جائے۔" (ترمذی)

ملت کی ذمہ داریاں اجتماعی ہیں۔ ہم فقط اپنی اصلاح کر کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، کیونکہ فرد کی ہستی ملت سے وابستہ ہے۔ وہ اس کے خیر و شر میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اخلاق میں متعدی تاثیر ہوتی ہے۔ اچھے اخلاق کو دیکھ کر دل میں نیکی کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے اور برے اخلاق والے کے ہاتھوں اور لوگ بھی برائیوں میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر برائی کا مقابلہ قوت اور استقامت سے نہ کیا جائے تو اس کا دائرۂ اثر نہایت تیزی سے پھیلنے لگتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حدیث مبارک ہے کہ بنی اسرائیل میں جب خرابی واقع ہوئی تو یوں ہوا کہ جب کوئی اسرائیلی اپنے بھائی کو گناہ کرتا دیکھتا تو اسے منع کرتا تھا۔ پھر دوسرا دن آتا اور اسے اسی کام میں مشغول پاتا تو نہ روکتا بلکہ اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ و ہم جلیس ہوتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو خلط ملط کر دیا اور ان کے بارے میں (سورۃ المائدہ کی آیات) لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ .... فَاسِقُونَ نازل ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ آیات پڑھ کر بیٹھ گئے اور صحابہؓ سے فرمایا : "تم برائی کے انسداد سے ہرگز نہ رکنا حتیٰ کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف جھکا دو۔"

سورۃ العصر میں قطعیت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ صرف خود نیک بننے سے اسلام کا تقاضا پورا نہیں ہوتا جب تک کہ دوسروں کو بھی نیک بنانے اور نیکی پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بداخلاقی کے وبائی جرائم کو گردوپیش سے فنا کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جس قدر کوشش ہو سکے صرف کرنی چاہئے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کا

ارشاد حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے طاقت سے روکے، لیکن اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل سے اس کو برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہوگا۔" کامل ترین درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اتنی قوت ہو کہ وہ زور بازو سے برائی کا سدباب کریں۔

تبلیغ اسلام کا حکم

جناب رسالت مآب ﷺ نے تبلیغ پر بہت زور دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے : "بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً" یعنی "مجھ سے پیغام سن کر آگے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی ہو۔" مزید فرمایا : "اللہ تعالیٰ اس شخص کو شادکام رکھے جو میری حدیث سن کر اشاعت کے لئے ازبر کرتا ہے۔ میرے خطبہ کا سننے والا اسے غیر موجود آدمیوں تک پہنچائے۔"

حضرت علیؓ خیبر میں یہود کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے روانہ ہوئے تو جناب ہادی برحق ﷺ سے پوچھا : "کیا میں اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ پر آ جائیں۔" آنحضورؐ نے فرمایا : "علیؓ! وقار اور سکون سے جا، جب ان کے روبرو ہو تو انہیں اسلام کی دعوت دے اور اللہ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم، شخص واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام لانا سرخ اونٹوں سے زیادہ قابل قدر ہے۔"

جناب ہادی برحق نے قرآن کی تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور اس راہ میں بڑے بڑے دکھ برداشت کئے۔ قرآن حکیم سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری اس امت کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ نوع انسانی کو خیر کی طرف بلائے، نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے لوگوں کو منع کرے اور خدا کی زمین پر خدائی فوجدار بن کر حدود الٰہی کا پاسبان بن کر رہے۔ یہی ایک مومن کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔

تبلیغ کے طریقے

تبلیغ کے دو طریقے ہیں : (۱) زبانی دعوت (۲) اخلاقی کشش۔

زبانی دعوت : زبانی تبلیغ نہایت صبر و تحمل اور حسن کلام سے ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ مخاطب فوراً ہدایت قبول کر لے۔ ہر شخص کو اپنے خیالات اور عمل سہانے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے وہ تبلیغ کو اپنے عقائد اور نظریات میں دخل اندازی سمجھ کر بھڑک اٹھے۔ لہٰذا داعی کو انتہائی سکون کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ زبان سے کوئی ایسا کلمہ ادا نہ کیا جائے جو فساد پیدا کرے۔ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت دی ہے کہ "اور تم برا نہ کہو ان کو جن کو وہ (مشرکین) اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ نادانی میں اللہ کو برا کہنے لگیں گے۔ یوں ہم نے ہر فرقہ کی نظر میں اس کے اعمال مزین کر دیے ہیں"۔

دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو ان کے معبودوں اور پیشواؤں کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال کر کے رنجیدہ کرنا جائز نہیں۔ ان کے عقائد اور تصورات پر نہایت معقول طریقہ سے گفتگو ہونی چاہیے۔ سورۂ نحل کے آخری رکوع میں ارشاد ہے :

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾

"انہیں حکمت اور دلپذیر نصیحت کے ساتھ اپنے رب کے راستہ کی دعوت دو اور بہترین انداز سے ان سے مباحثہ کرو"۔

اخلاقی کشش : اسی شخص کا کلام دل پر اثر کرتا ہے جو اپنے کہے پر عمل پیرا بھی ہو۔ نرے گفتار کے غازی کا کوئی اعتبار نہیں۔ مبلغ کتنا ہی شریں بیان ہو اگر اس کا اخلاق دلاویز نہ ہو تو اس کا وعظ اثر نہیں کرتا۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے قرآن حکیم کا جو پیغام سنایا اور جس بات کی تلقین فرمائی اس پر پورا پورا عمل بھی کر کے دکھایا۔ آپؐ مجسم قرآن تھے۔ آپؐ نے اپنی حیات مبارکہ کا ایک ایک گوشہ لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ شاید زندگی کا فلاں گوشہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے اس میں (نعوذ باللہ) کوئی خامی یا عیب ہو گا۔ بڑے بڑے دشمن بھی آپ کے اخلاقی اعجاز کے سامنے مہر بہ لب رہ جاتے تھے۔ ابو جہل ایسا کینہ پرور دشمن بھی آپ کے اخلاقی کمال کا معترف تھا۔ اشاعت اسلام کی تاریخ دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ تبلیغ کا کارنامہ زبانی پند و نصیحت سے زیادہ عملی تاثیر کا مرہون منت تھا۔ ملت اسلامیہ کا کردار رحمت الٰہی کی جھلک دکھاتا تھا۔ مسلمان

فاتح افواج جہاں جہاں پہنچیں وہاں کے باشندے ان کے حسن اخلاق سے مسحور ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ حضرت عمرؓ کی سادگی دیکھ کر ایک آتش پرست گورنر ایمان لے آیا تھا اور حضرت علیؓ کی عدل پروری نے ایک یہودی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

موجودہ صورت حال

آج پورا عالم اسلام ایک افسوس ناک صورت حال سے دوچار ہے۔ حق و صداقت کے عالمگیر اصول رکھنے والا دین حق چاروں طرف سے کفر و باطل میں گھرا ہوا ہے۔ یہود و نصاریٰ اپنے مردہ مذاہب کی تبلیغ کے لئے دنیا بھر میں کوشاں نظر آتے ہیں مگر اسلام کے علمبردار غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کا احساس ہی نہیں ہے، بلکہ وہ خود اسلام کی برکات سے محروم ہیں۔ عالم انسانیت کفر و ظلمت کے طوفانوں میں گھرا ہوا ہے مگر دین اسلام کے دعویدار خاموشی سے اپنی دنیا بنانے میں مصروف ہیں۔ کچھ ایسے نادان دوست بھی ہیں جو فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو کر امت کو پارہ پارہ کرنے کے ناپاک شغل میں مصروف کار ہیں۔ آج پوری امت مسلمہ فرقوں اور مسلکوں میں تقسیم ہے۔ مساجد اور مدارس میں اپنے اپنے فرقہ اور مسلک کی تبلیغ و اشاعت ہو رہی ہے۔ کتاب اللہ کی روشنی سے راستہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ قرآن حکیم کو صرف حصول ثواب بلکہ ایصال ثواب کے لئے تبرکاً پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کی تبلیغی مساعی

اس بیسویں صدی میں خاص طور پر برعظیم پاک و ہند میں کچھ دردمند لوگوں نے تبلیغ کا بیڑا اٹھایا اور مثبت انداز میں کچھ کام شروع ہوا، جس میں تبلیغی جماعت سب سے نمایاں ہے، مگر ان کے ہاں قرآن کریم کو ذریعہ تبلیغ نہیں بنایا گیا بلکہ صرف چند مسائل اور فضائل کی اشاعت پر ہی پوری توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ اسلام کا اصل آلہ تبلیغ صرف قرآن ہے اور حدیث قرآن کی توضیح و تشریح ہے۔ جماعت اسلامی نے اپنے آغاز میں فی الواقع قرآن حکیم کی تبلیغ سے کام شروع کیا اور اس کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے، مگر

انتخابی سیاست میں غیر معمولی مشغولیت سے قرآن حکیم کی تبلیغ کا کام تقریباً ختم ہو کر رہ گیا۔ تنظیم اسلامی پاکستان نے اپنی محدود بساط کے مطابق قرآن ہی کو اپنا مرکز و محور بنایا ہے اور اپنے تین اساسی و بنیادی فرائض (۱) عبادت رب (۲) دعوت و تبلیغ' اور (۳) اقامت دین کی جدوجہد' میں اس درمیانی فریضہ کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اس سلسلہ میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تبلیغی مساعی گزشتہ ربع صدی سے پورے کرۂ ارضی کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔ اور قرآن حکیم کی جس اعلیٰ علمی سطح پر تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ گویا یہ قرآن کی انقلابی دعوت ہے جو مشرق سے مغرب تک بحمد اللہ جاری ہے۔

امیر تنظیم اسلامی کی تبلیغی مساعی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلام اور قرآن کی تبلیغ ہے' کسی فرقہ یا مسلک کی تبلیغ نہیں ہے۔ یہ اتحاد امت کی تبلیغ ہے۔ یہ قرآن کی تبلیغ ہے جو کہ محفوظ ہے اور اسلام کی بنیاد ہے۔ یہ ہمارے دین کے مسلمات کی تبلیغ ہے۔ ایسی ہی تبلیغ سے امت مسلمہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکے گی۔ آج دین کے کچھ نادان دوست فرقہ پرستی کو ہوا دے رہے ہیں' حالانکہ قرآن کریم نے جہاں ملت اسلامیہ کو ایک تبلیغی نظام اور اصلاحی پروگرام کے اصول دیئے ہیں وہاں یہ بھی فرمایا کہ ﴿ لا تکونوا کالذین تفرقوا ﴾ یعنی "تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جنہوں نے فرقے بنائے اور گروہ در گروہ ہو گئے" سابقہ امتیں علم وہدایت پانے کے بعد افتراق کا شکار ہو گئیں۔ لہٰذا امت مسلمہ کو پہلے دن سے ہی اللہ تعالیٰ نے متنبہ کر دیا کہ تفریق و انتشار اس امت کا شیوہ نہیں۔ چنانچہ تفرقہ بازی کا بازار گرم کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عذاب عظیم کی وعید سنائی ہے۔ یہ عذاب' کفر و شرک یا بت پرستی پر نہیں بلکہ تفریق بین الامت کے جرم کی پاداش میں بیان ہوا ہے۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ! کہ امیر تنظیم اسلامی کی رہنمائی میں رفقائے تنظیم کی ایک معتد بہ تعداد نے یہ راز پا لیا ہے اور بہت سے جدید تعلیم یافتہ نوجوان قرآن کریم کا انقلاب آفریں پیغام چار دانگ عالم میں پھیلا رہے ہیں اور اس کے مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان گراں قدر مساعی میں برکت عطا فرمائے! وَمَا توفیقنا اِلَّا بِاللّٰہ!!

"مطالبۂ تکمیلِ دستورِ اسلامی"

تنظیم اسلامی کی مطالباتی مہم کا ایک تعارف

نعیم اختر عدنان

"تنظیم اسلامی معروف معنوں میں نہ سیاسی جماعت ہے اور نہ مذہبی فرقہ بلکہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر پوری دنیا میں نظام خلافت کے قیام و نفاذ کے لئے نبوی طریق کار کی روشنی میں معروف عمل ہے"۔ بیان کردہ مختصر سی عبارت تنظیم اسلامی کی دعوت' اس کے اہداف و مقاصد اور طریقہ کار کو واضح کرتی ہے۔

تنظیم اسلامی اپنے بانی امیر ڈاکٹر اسرار احمد کی قیادت میں گزشتہ بائیس سال سے دین کے انقلابی تصورات کو منفرد انداز میں ملک کے پڑھے لکھے طبقے اور عوام الناس تک پہنچا رہی ہے۔ تنظیم اسلامی کا یہ واضح اور دو ٹوک موقف ہے کہ پاکستان کا قیام مشیت خداوندی کی طویل المیعاد سکیم کا حصہ ہے۔ چنانچہ توقع ہے کہ نہ صرف پاکستان مثالی اسلامی فلاحی ریاست کی شکل اختیار کرے گا بلکہ پاکستان' افغانستان' ایران اور وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں پر مشتمل مسلمانوں کا "عظیم تر علاقائی اتحاد" اسلام کے عالمی غلبے کی راہ ہموار کرے گا۔ گزشتہ کئی سالوں سے ڈاکٹر اسرار احمد ایک ہی صدا بلند کر رہے ہیں' ایک ہی پیغام لوگوں کو سنا رہے ہیں کہ "تنظیم اسلامی کا پیغام' نظام خلافت کا قیام"۔ درس قرآن کی محفل ہو یا خطبہ جمعہ کی تقریر' جلسہ عام ہو یا پریس کانفرنس ہر جگہ ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی کے وابستگان علامہ اقبال کے اس شعر کی تصویر کامل بنے نظر آتے ہیں ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

ڈاکٹر صاحب کا استدلال ہے کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا۔ دو قومی نظریئے کی بنا پر نئی مملکت کے قیام کو وہ بیسوی صدی کا عظیم ترین معجزہ قرار دیتے ہوئے بہانگ دہل کہتے ہیں کہ مملکت خداداد پاکستان کے قیام کے دو ہی سال بعد ملک

کی دستور ساز اسمبلی نے "قرار داد مقاصد" کو منظور کر کے پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ دنیا میں رائج انسانی حاکمیت کے تصور کو رد کر کے مسلمانان پاکستان نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اقرار کا اعلان و اعتراف کر لیا۔ دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست کی قانون ساز اسمبلی نے "سیکولرازم" کے لادینی نظام کی علمبردار دنیا کے سامنے ریاست کی سطح پر کلمہ شہادت ادا کر دیا۔ انسانی حقوق کے خود ساختہ علمبردار اس نوزائیدہ ریاست کی "کڑی نگرانی" کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ مسلمانان پاکستان یہود و نصاریٰ اور کیمونسٹ و ہندو سامراج کے مکر و فریب اور دسیسہ کاریوں کی لپیٹ میں آ گئے اور مستقبل کی اسلامی ریاست کو ہر طرف سے شیطانی ٹولے نے اپنے شکنجے میں جکڑنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اہل پاکستان اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کی تصویر کامل بن گئے ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انسانی حاکمیت سے باغی اور اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری کی اقراری ملت اسلامیہ پاکستان نے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف سفر جاری رکھا جسے اگر کچھوے کی رفتار سے تشبیہ دی جائے تو چنداں غلط نہ ہو گا۔ ملکی دستور اور دیگر قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ وجود میں آیا۔ اس ادارے میں چونکہ ملک کے تمام مذہبی مکاتب فکر کے نمائندہ افراد شامل ہوتے ہیں لہٰذا اس کی سفارشات اور تجاویز کو بڑی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس ادارے نے بھی پاکستان کو مستقبل کی اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لئے ٹھوس اور قابل عمل تجاویز مرتب کیں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کو بعض وجوہات کی بنا پر قابل رشک قرار دینا ممکن نہیں، تاہم ۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو پہلی دفعہ قوم کو "متفقہ دستور" دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس متفقہ دستور میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا اور ملک کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" قرار پایا۔ صدر اور وزیر اعظم جیسے اعلیٰ ترین ریاستی مناصب کے لئے مسلمان ہونا آئینی تقاضا بنا دیا گیا۔ ۱۲ سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد

ضیاء الحق مرحوم نے ۸۵ء میں "قرار داد مقاصد" کے الفاظ کو آئین کے دیباچے سے اٹھا کر دستور کا حصہ بنا دیا۔ نفاذ اسلام کی جانب پیش رفت کے لئے ٹھوس اور قابل عمل طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے ضیاء الحق مرحوم نے وفاقی شرعی عدالت قائم کر دی۔ مگر افسوس کہ مرحوم صدر نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے پیش نظر دستور سمیت عائلی 'عدالتی اور معاشی معاملات و قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھ کر اس عدالت کو عملاً غیر موثر بنا دیا۔ مالیاتی شعبے سے متعلق وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار پر پابندی "معین مدت" کے لئے عائد کی گئی تھی 'جس کے اختتام پر وفاقی شرعی عدالت نے "بینک انٹرسٹ" کا تفصیلی جائزہ لے کر اسے ربا یعنی سود قرار دے دیا اور اس طرح سود کی حرمت کا تاریخ ساز فیصلہ صادر کر کے "عالم کفر" کو گویا مزید "خبردار" کر دیا۔ امریکہ اور اس کے حواری اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے متحرک ہو گئے۔ چنانچہ "اسلامی ریاست" کے وزیر اعظم نے امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت سود کو حرام قرار دینے کے تاریخ ساز فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل دائر کر دی۔ اس اپیل کی سماعت پانچ سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود "ہنوز دلی دور است" والا معاملہ بن چکی ہے۔

میاں نواز شریف نے اپنے گزشتہ دور حکومت میں ملک کے سب سے معزز ایوان یعنی قومی اسمبلی میں پوری قوم کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ دستور میں شریعت کو کامل بالادستی عطا کرنے والی ترمیم منظور کروائیں گے 'مگر واحسرتا کہ ؏ "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا"۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے اور شریعت کو بالادستی عطا کرنے والی مجوزہ ترمیم منظور کروانے کے وعدہ کی خلاف ورزی کی پاداش میں نواز شریف حکومت کو دو تہائی اکثریت کے باوجود اقتدار کے ایوانوں سے بے دخل کر دیا گیا۔

اس مختصر سی بے دخلی کے بعد اب نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کو ناقابل یقین 'حیران کن اور بے مثال مینڈیٹ مل چکا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے مسلم لیگ حکومت کے سربراہ کو اپنے خطبہ جمعہ میں مخلصانہ مشورے دیئے۔ اس تقریر کا کیسٹ میاں نواز شریف کے والد گرامی میاں محمد شریف صاحب کو ڈاکٹر صاحب نے ایک عدد مکتوب کے ساتھ ارسال کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب کو میاں محمد شریف صاحب نے سنا اور اپنے

لائق اور فرمان بردار فرزندوں کو ڈاکٹر اسرار احمد کے سامنے لابٹھایا۔ سیاست کو کھیل اور مذہب کو پیشہ نہ بنانے والے خادم دین نے ملک کے حکمران خاندان کو دین و ملت کی سربلندی کے لئے چند مخلصانہ مشورے دیئے۔ امیر تنظیم اسلامی نے میاں صاحبان پر واضح کیا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے لئے مسلم لیگ کے راستے میں اب کوئی دیوار حائل نہیں ہے۔ لہٰذا اگر میاں نواز شریف قرآن و سنت کو دستوری و قانونی، قومی اور صوبائی غرض ہر شعبے اور ہر سطح پر بالادستی دینے والی ترمیم منظور کروا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ میاں نواز شریف کو مزید "نوازے" گا۔ وگرنہ اندیشہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاکستان اور مسلم لیگ دونوں کے اصلاح احوال کا یہ آخری موقع ثابت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آخری اتمام حجت ہو۔

انہی تجاویز اور مشوروں کو ایک موثر اور مضبوط آواز میں بدلنے کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد کی قیادت و امارت میں تنظیم اسلامی نے تکمیل دستور اسلامی کی مہم کا آغاز کیا ہے۔ ہر پاکستانی مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کا دینی فرض ہے کہ وہ تنظیم اسلامی کی اس مہم کا ساتھ دیتے ہوئے وزیر اعظم میاں نواز شریف کے نام تنظیم اسلامی کا تیار کردہ پوسٹ کارڈ پوسٹ کرے، تاکہ موثر عوامی دباؤ کی اہمیت کے پیش نظر میاں نواز شریف پاکستان کو دنیا کی مثالی اسلامی ریاست بنانے کے لئے دستور میں شریعت کی بالادستی کی ترمیم منظور کرائیں، وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار پر عائد پابندیاں ختم کریں، اور شرعی عدالت کے سود سے متعلق فیصلے کے خلاف نظرثانی کی اپیل واپس لے کر پاکستان کو عہد حاضر کی اسلامی ریاست بنا سکیں۔

ذیل میں اس ہینڈ بل کی عبارت درج کی جارہی ہے جو تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کی "مطالبہ تکمیل دستور اسلامی" کی مہم میں بڑے پیمانے پر عام کیا جارہا ہے :

"ہمارا مطالبہ، ہماری اپیل : دستور خلافت کی تکمیل !"

ہم پاکستان مسلم لیگ کے صدر جناب میاں محمد نواز شریف صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ ان کی کوششوں اور قربانیوں سے مسلم لیگ کو نئی زندگی ملی اور تحریکِ

پاکستان کا ساجذبہ ایک بار پھر تازہ ہو گیا۔ ہم ملک و قوم کی اصلاح اور معاشی و اقتصادی بدحالی کے خاتمے کے ضمن میں وزیر اعظم پاکستان کے نیک جذبات کی بھی تہہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ تاہم یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ وطن عزیز کی بقا اور اس کے استحکام کا راز یہاں شریعت اسلامی کے صحیح معنوں میں نفاذ اور نظام خلافت کے قیام ہی میں پوشیدہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ خلافت کا قیام اور شریعت کا نفاذ ہی دراصل ملک کے استحکام اور خوشحالی کا ضامن بنے گا۔ مزید برآں پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کے مقابلے میں اللہ کی نصرت کے حصول کا یقینی ذریعہ بھی یہی ہے کہ ہم یہاں دین حق کے قیام و نفاذ کے لئے بھرپور طور پر سرگرم عمل ہو جائیں اور اس راہ کی ہر رکاوٹ کو ایمان و یقین اور عزم و ارادہ کی قوت سے دور کر دیں۔ اللہ کا یہ پختہ وعدہ ہے کہ اگر ہم خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی یعنی اس کے دین کی نصرت کریں گے تو وہ لازماً ہماری مدد کرے گا : "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ"۔ (سورۃ محمد : آیت ۷) یعنی "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا"۔ اور ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا مددگار، پشت پناہ اور سہارا بن جائے اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

ہمارا حکومت وقت بالخصوص نواز شریف صاحب سے مطالبہ ہے کہ آپ اللہ کی مدد اور اس کی تائید کے بھروسے پر پاکستان میں نظام خلافت اور شریعت اسلامی کے حقیقی نفاذ کے لئے بلاتاخیر درج ذیل اقدامات کا اعلان کیجئے اور ان پر عملدرآمد کو یقینی بنائیے۔ اس لئے کہ آپ کو اسمبلی میں اتنی عظیم اکثریت حاصل ہے کہ آپ اس سلسلے میں دستور پاکستان میں ضروری ترامیم آسانی سے منظور کروا سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا عطا کردہ سنہری موقع ہے جس سے فائدہ نہ اٹھانا اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلانے کے مترادف ہو گا۔

☆ اس ضمن میں دستور میں حسب ذیل تبدیلیاں لازمی ہوں گی :

۱) دستور کی دفعہ ۲ میں شق (ب) کا اضافہ کیا جائے کہ : "پاکستان میں وفاقی، صوبائی،

ضلعی کسی بھی سطح پر کوئی قانون سازی کلی یا جزوی طور پر کتاب وسنت کے منافی نہیں کی جاسکے گی"۔

۲) پورے دستور میں جہاں بھی کوئی شے دستور کی دفعہ ۲۔الف (قرارداد مقاصد) کے منافی ہے یا خارج کیا جائے یا اسے بالوضاحت قرارداد مقاصد کے تابع کیا جائے۔

۳) دستور کی دفعہ ۲۰۳ (ب) کی ذیلی شق (ج) کے ذریعے فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار سے جو استثناء دستور پاکستان، مسلم پرسنل لاء اور جوڈیشل لاز کو دیا گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔

۴) وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی شرائط ملازمت کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی طرح مستحکم بنایا جائے تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہر قسم کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہوں!

☆ مزید برآں فیڈرل شریعت کورٹ نے جو فیصلہ بینک انٹرسٹ کے "ربا" اور اس کے نتیجے کے طور پر حرام مطلق ہونے کے ضمن میں دیا تھا اس کے خلاف اپیل واپس لی جائے اور ایک سال کے اندر اندر پاکستان کی معیشت کو سود کی لعنت سے پاک کر کے اللہ اور رسولؐ کے خلاف جنگ بند کر دی جائے۔ تاکہ اللہ کی نصرت و رحمت ملک اور ملت کے شامل حال ہو سکے!

جناب وزیر اعظم! اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں موجود بعض طبقات جن میں مفاد پرست عناصر بھی شامل ہیں اور بعض لادینی نظریات کے حامل لوگ بھی اس راہ میں روڑے اٹکائیں گے بلکہ بیرونی طور پر عالمی مالیاتی اداروں اور نیو ورلڈ آرڈر کی جانب سے بھی آپ پر شدید دباؤ ڈالا جائے گا۔ لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر آپ نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہمت و جرات کے ساتھ یہ قدم اٹھایا تو نہ صرف یہ کہ اللہ کی نصرت و تائید ہر طرح سے آپ کو حاصل ہو گی بلکہ ملک کے تمام دینی و مذہبی عناصر آپ کی بھرپور تائید کریں گے اور پاکستان کا ہر باشعور مسلمان اس کام میں آپ کا دست و بازو بننے میں فخر محسوس کرے گا۔ اور روز قیامت بھی آپ ان شاء اللہ سرخرو ہوں گے اور آپ کا شمار امتِ محمدؐ کے

ان افراد میں ہوگا جن سے اللہ بھی راضی ہوگا اور جن پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم بھی بجا طور پر فخر کریں گے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

عزیزانِ وطن! ہم نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کو دستوری سطح پر ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کے جذبے کے تحت اپنی بساط کے مطابق اللہ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر ایک مطالباتی مہم کا آغاز کیا ہے۔ ہماری اس مہم کا عنوان ہے :

"مطالبۂ تکمیل دستورِ اسلامی"

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میاں نواز شریف اور ان کی حکومت کو یہ مبارک قدم اٹھانے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ ہم نے اس مطالباتی مہم کو موثر بنانے کے لئے ایسے پوسٹ کارڈ تیار کئے ہیں جن پر مختصر الفاظ میں اپنا موقف اور دستور میں مجوزہ ترامیم درج کر دی ہیں۔ اگر یہ کارڈ پاکستان کے باشعور مسلمانوں کی طرف سے بڑی تعداد میں وزیر اعظم تک پہنچیں گے تو میاں نواز شریف اور ان کی کابینہ کو نہ صرف اس معاملے کی اہمیت بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ اس ملک کے عوام کی ایک بڑی تعداد فی الواقع اسلامی نظام کے قیام یا یوں کہئے کہ نظام خلافت کے احیاء کی شدت کے ساتھ آرزومند ہے اور اگر وزیر اعظم پاکستان اس جانب مثبت پیش رفت کرتے ہیں تو مسلمانان پاکستان تمام فرقہ وارانہ اختلافات کو بھلا کر بھرپور طور پر ان کا ساتھ دیں گے اور یوں اگر اللہ نے چاہا تو قیام پاکستان کے پچاس برس بعد ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کا وہ خواب ایک حقیقت بن کر سامنے آجائے گا جو کبھی علامہ اقبال اور قائد اعظم نے دیکھا تھا۔

عزیزان محترم! ہماری درخواست ہے کہ آپ حضرات پورے جذبہ ایمانی کے ساتھ اس مطالباتی مہم میں ہمارا ساتھ دیں۔ اپنے نام اور پتے کے ساتھ مذکورہ پوسٹ کارڈ اور ٹیلی گرام وزیر اعظم پاکستان کے نام بھیجئے اور اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ یہ پوسٹ کارڈ اور ٹیلی گرام تنظیم اسلامی کے حلقہ جات اور مقامی دفاتر سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

المعلن : تحریک خلافت پاکستان و تنظیم اسلامی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۶
شمارہ: ۶
صفر المظفر ۱۴۱۸ھ
جون ۱۹۹۷ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۵/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03۔02۔5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

قارئین کی سہولت کے لئے E-mail اور Web page کا ایڈریس

E-mail : anjuman@brain.net.pk

URL: http://www.tanzeem.org

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

دو روز قبل کے اخبارات میں شائع ہونے والی اس اہم خبر کا کہ حکومت پاکستان نے افغانستان کی طالبان حکومت کو تسلیم کر لیا ہے مسلمانان پاکستان نے نہایت والہانہ انداز میں خیر مقدم کیا ہے اور جوش و جذبے کی ایک لہر ملت اسلامیہ پاکستان کے پورے جسد میں دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات اکثر قارئین کے علم میں ہو گی کہ اپریل میں منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی کے کل پاکستان مجلس عاملہ کے اجلاس میں اس بارے میں ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کر کے اخبارات کو بھجوائی گئی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ طالبان چونکہ افغانستان کے اکثر حصے پر نہ صرف قابض ہیں بلکہ وہ ان تمام علاقوں میں جو ان کے ماتحت ہیں امن و امان قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں لہٰذا ان کی حکومت کو فی الفور تسلیم کیا جائے۔ اس کے بعد بھی امیر تنظیم اسلامی متعدد پبلک اجتماعات میں طالبان کے بارے میں اپنے اس موقف کا اعادہ کر چکے ہیں۔ بحمد اللہ حکومت پاکستان نے اس معاملے میں دانشمندی اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے بالآخر یہ نیک قدم اٹھا لیا ہے اور اس معاملے میں پہل کرنے کا سہرا ہماری حکومت ہی کے سر بندھا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ توقع تھی، سعودی عرب نے بھی طالبان کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا ہے اور اب ہمارے وزیر خارجہ روسی ریاستوں کے دورے کے لئے پر تول رہے ہیں تاکہ انہیں بھی اس معاملے میں اپنا ہمنوا بنایا جا سکے۔ یوں افغانستان میں اسلامی نظام کے قیام اور ایک حقیقی اسلامی حکومت کی تشکیل کا وہ خواب جو گزشتہ چند برسوں کے دوران مختلف اسباب کی بنا پر دھندلا سا گیا تھا، ایک بار پھر حقیقت کا روپ دھارتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا ایک طویل شب تاریک کی ظلمت اب چھٹنے کو ہے اور خون صد ہزار انجم سے پیدا ہونے والی سحر کی چاپ اب سنائی دینے لگی ہے۔ توقع ہے کہ افغانستان میں اسلامی حکومت کا قیام پاکستان میں قیام نظام اسلام کی جدوجہد پر بھی مثبت اثرات و نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ اور کیا عجب کہ ان دو برادر ملکوں میں دین حق کا یہ غلبہ پورے کرہ ارضی پر غلبہ دین اور قیام نظام خلافت کی تمہید بن جائے کہ کتب حدیث میں قرب قیامت کے

حالات و واقعات کے حوالے سے دشمنان اسلام کے مقابلے میں آخر کار مسلمانوں کی فتح کے ضمن میں جس خراسان کا تذکرہ تحسین آمیز انداز میں ملتا ہے وہ اس خطے ہی پر تو مشتمل ہے جس میں پورے افغانستان کے علاوہ پاکستان کا بھی کچھ شمالی علاقہ شامل ہے۔

☆ ☆ ☆

حال ہی میں وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف اور ان کے والد محترم کی دوبارہ قرآن اکیڈمی آمد اور امیر تنظیم اسلامی سے ملاقات کی اطلاع تو اکثر قارئین تک پہنچ چکی ہوگی۔ قومی اخبارات میں اس ملاقات کی کسی قدر تفصیلات شائع ہو چکی ہیں، ندائے خلافت کی ۲۸ مئی کی اشاعت میں اس ملاقات کی تفصیل پر مشتمل پریس ریلیز شائع کیا جاچکا ہے۔ اس معاملے سے دلچسپی رکھنے والے احباب ندائے خلافت کا مذکورہ شمارہ ضرور حاصل کرلیں ــــــ اس ملاقات کے چند روز بعد امیر تنظیم اسلامی کے زیر قیادت تنظیم کے ایک وفد نے بھی اسلام آباد میں وزیر اعظم پاکستان سے ایک باضابطہ ملاقات بھی کی اور اپنے انہی مطالبات یعنی سودی نظام کے خاتمے اور قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے پر مشتمل ایک قرارداد تحریری شکل میں وزیر اعظم کو پیش کی۔ (اس یادداشت کا متن زیر نظر شمارے میں شائع کردیا گیا ہے) وزیر اعظم پاکستان کا امیر تنظیم اسلامی کے موقف کو سمجھنے اور اس بارے میں رہنمائی لینے کی غرض سے امیر محترم سے ملاقات کے لئے دوبار قرآن اکیڈمی آنا یقیناً ایک غیر معمولی اور نہایت خوش آئند بات ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان ملاقاتوں کو پاکستان میں دستوری سطح پر قرآن و سنت کی حتمی بالادستی کی تعیین اور نفاذ اسلام کے ضمن میں نتیجہ خیز اور مفید بنائے (آمین)

اعتذار

پچھلے ماہ یعنی مئی میں "میثاق" بوجوہ شائع نہیں کیا جاسکا۔ "میثاق" کی تاریخ میں یہ "سانحہ" ایک مدت کے بعد پیش آیا ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں کے دوران یعنی جب سے راقم اس پرچے کے ادارتی امور سے وابستہ ہوا ہے، شاید یہ دوسرا موقع ہے کہ پرچہ اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ بروقت اطلاع نہ ہونے کے باعث قارئین کو انتظار کی جو اذیت برداشت کرنا پڑی اس پر ہم تہہ دل سے معذرت خواہ ہیں۔ (مدیر)

کیا مذہبی جماعتیں ناکام ہیں؟
حقائق و واقعات کی روشنی میں
اخوت اکیڈمی' اسلام آباد میں امیر تنظیم اسلامی کا ایک فکر انگیز خطاب

اواخر مارچ میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ایک مختصر دورے پر اسلام آباد تشریف لے گئے تو دیگر مصروفیات کے علاوہ "اخوت اکیڈمی" کی دعوت پر ان کے اجتماع کارکنان میں ایک نہایت حساس موضوع پر امیر تنظیم کا خطاب بھی ہوا۔ "اخوت اکیڈمی" کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ مارچ ۹۵ء میں دینی جذبہ رکھنے والے چند نوجوانوں نے جو مسلکاً اہل تشیع میں سے ہیں' یہ علمی و تحقیقاتی ادارہ قائم کیا۔ ایران میں امام خمینی کے انقلاب کے بعد پاکستان کے جن شیعہ نوجوانوں میں دینی جذبہ بیدار ہوا اور احیاء اسلام کی تڑپ پیدا ہوئی ان میں یہ نوجوان بھی شامل تھے۔ اخوت اکیڈمی کے تعارفی پمفلٹ میں اکیڈمی کے جو مقاصد معین کئے گئے ہیں ان میں "ہر قسم کے تعصب' فرقہ واریت' کم نظری' شخصیت پرستی' جمود اور منفی مرعوبیت کا مقابلہ" کے الفاظ ہمارے نقطہ نگاہ سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۹۵ء کے "میثاق" میں شیعہ سنی مفاہمت کے موضوع پر امیر تنظیم کا خطاب شائع ہوا تو اس کی تائید میں اخوت اکیڈمی کے ایک رکن کا ایک جامع مضمون قومی اخبارات میں شائع ہوا۔ یہی مضمون ان کے ساتھ ہمارے رابطے کی تمہید بن گیا۔ پچھلے سال اکتوبر میں راولپنڈی میں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جہاں دیگر مسالک اور دینی جماعتوں کے سرکردہ افراد کو دعوت خطاب دی گئی وہاں اخوت اکیڈمی کے سربراہ کو بھی اجتماع میں مدعو کیا گیا۔ امیر تنظیم کے حالیہ دورۂ اسلام آباد کے موقع پر اخوت اکیڈمی کی طرف سے جب امیر تنظیم کو دعوت خطاب موصول ہوئی تو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکیڈمی کے کارکنان کے سامنے مذہبی جماعتوں کی ناکامی کے اسباب کے موضوع پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ ذیل میں اس خطاب کو ٹیپ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے مرتب انداز میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبہ مسنونہ و تلاوت آیات کے بعد :

محترم کارکنان اخوت اکیڈمی اور معزز حاضرین! آج کا موضوع بڑا حساس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تمام مذہبی جماعتوں کی کارکردگی کے بارے میں اظہار رائے لازمی ہے اور حاضرین و سامعین میں سے ہر فرد کا کسی نہ کسی جماعت اور کسی نہ کسی مکتبہ فکر کے ساتھ ذہنی' فکری اور عملی تعلق لازماً ہو گا۔ اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کرتے ہوئے آغاز کر رہا ہوں کہ وہ مجھے بھی محتاط الفاظ استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور سننے والوں کو بھی اس بات کی ہمت دے کہ اختلافی بات کو بھی کھلے دل کے ساتھ سن سکیں۔ پھر اگر قابل قبول نظر آئے تو قبول کریں' اور نا قابل قبول ہو تو رد کر دیں۔

یہ موضوع بڑا اہم ہے اور واقعتاً بڑے مناسب موقع پر اخوت اکیڈمی نے اس پر بحث و گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ اور غالباً تین چار حضرات اس پر اظہار خیال کر بھی چکے ہیں۔ عنوان بحث یعنی : "کیا مذہبی جماعتیں ناکام ہیں؟ حقائق و واقعات کی روشنی میں" میں ظاہر ہے کہ اصل سوال اس کا جزوِ اول ہے جزوِ ثانی تو اس کا اضافی ضمیمہ ہے! اصل اور تیکھا اور نازک سوال صرف یہ ہے کہ کیا مذہبی جماعتیں ناکام ہیں؟ مجموعی اعتبار سے تمام مذہبی جماعتوں کو ایک وحدت تصور کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ایک بہت بڑی "ہاں" میں ہے۔ یقیناً بحیثیتِ مجموعی پاکستان کی مذہبی جماعتیں ناکام بلکہ شدید ناکام ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔

قیام پاکستان : اللہ کی مشیت کا ظہور

دیکھیے' مسلم لیگ ایک قومی جماعت تھی۔ اس میں تقریباً تمام مکاتب فکر اور مکاتبِ فقہ کے مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ شیعہ اور سنی بھی تھے۔ بریلوی' دیوبندی اور اہلحدیث بھی تھے اور لبرل بھی تھے اور آرتھوڈوکس بھی! اس قومی جماعت نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ کوئی شخص اس کا کریڈٹ اس جماعت کو دے یا اس کی قیادت یعنی قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کو' میرے نزدیک دراصل یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تھا۔

اس لئے کہ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۴۶ء میں قائداعظم کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر کے آزاد پاکستان کے مطالبے سے کم از کم دس سال تک کے لئے دست بردار ہو چکے تھے۔ اس پلان میں طے تھا کہ دس سال تک ہندوستان ایک وحدت رہے گا' اس کی ایک مرکزی حکومت ہو گی جس کے تحت تین زون ہوں گے' انہیں داخلی خود مختاری (internal autonomy) حاصل ہو گی جیسے صوبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ البتہ دس سال کے بعد کوئی زون علیحدہ ہونا چاہئے تو علیحدہ ہو سکے گا۔ لیکن مشیتِ ایزدی کچھ اور تھی۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے فیصلہ ہوا کہ ہندی مسلمانو! داخلی خودمختاری کے حامل زون نہیں بلکہ آزاد اور خودمختار ملک پاکستان لو' البتہ ﴿فَنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝﴾ "پھر ہم دیکھیں گے کہ تم کرتے کیا ہو"۔ دراصل جب ہندی مسلمان قوم نے بحیثیت مجموعی نعرہ لگایا کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" تو اللہ نے مسلم لیگ کے ذریعے پاکستان عطا کر کے ان پر حجت قائم کی۔ اگرچہ پاکستان کے دو صوبے تقسیم ہو گئے لیکن پھر بھی دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست وجود میں آ گئی۔

اللہ کی سنّتِ ثابتہ

درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی سنتِ ثابتہ اور سنتِ مستقلہ ہے کہ جب کوئی قوم اللہ سے کوئی عہد کر کے کسی چیز کا مطالبہ کرے تو اللہ اس کی پکار کو لازماً سنتا اور قبول کرتا ہے۔ یہ سنت ایک حد تک تو افراد کے معاملے میں بھی ہے۔ یعنی جب ایک فرد کہے کہ اے اللہ! اگر تو میری یہ مشکل رفع کر دے تو میں یہ کروں گا۔ جسے ہم نذر ماننا کہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ عام طور پر افراد کی بات کو بھی نہیں ٹالتا اور وہ چاہتا ہے کہ پھر "يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ" وہ بھی اپنی نذر پوری کریں۔ اور جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اسے پورا کریں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔ یہ سُنّت اللہ قوموں کے معاملہ میں تو اس سے زیادہ بڑھ کر قطعی اور یقینی ہے۔ چنانچہ کوئی قوم اگر اجتماعی طور پر اللہ سے کوئی وعدہ کرے کہ اے اللہ اگر تو ہمارا یہ مطالبہ پورا کر دے تو ہم یہ کریں گے' تو میرے علم کی حد تک وہ دعا' پکار اور مطالبہ رد نہیں کیا جاتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ آیا وہ بھی اپنا وعدہ پورا کرتی ہے یا نہیں۔ جیسے

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے بارے میں آیا ہے :

﴿ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (الاعراف : ۱۲۹)

"(حضرت موسیٰؑ سے کہلوایا کہ) ہو سکتا ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن (فرعون اور اس کے لاؤ لشکر) کو ہلاک کر دے اور پھر تمہیں استخلاف فی الارض (زمین میں شان و شوکت اور قوت) عطا کرے۔ پھر وہ دیکھے کہ تم کرتے کیا ہو"۔

مسلم لیگ اور اسلام

بہر حال اللہ کی مشیت خصوصی کا ظہور یعنی پاکستان کا قیام چونکہ مسلم لیگ کے ذریعے ہوا تھا' اس لئے یہ بلاشبہ مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسلم لیگ ایک قومی جماعت تھی' مذہبی جماعت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی قیادت علماء کے پاس نہیں تھی۔ اگرچہ اس میں علماء کرام اور مشائخ عظام بھی شامل تھے' جیسے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ' مولانا ظفر احمد عثمانیؒ' پیر جماعت علی شاہؒ' پیر صاحب مانکی شریف اور پیر صاحب زکوڑی شریف وغیرہ لیکن ان سب کی حیثیت معاونین کی تھی' یہ قائدین میں سے نہیں تھے۔ اس طرح مسلم لیگ مذہبی جماعت نہیں تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ اگر مذہبی جماعت ہوتی تو قومی جماعت ہرگز نہ بن سکتی تھی۔ اس لئے کہ مذہبی جماعت کی اپنی حدود (Limitations) ہوتی ہیں۔ وہ تو پہلے یہ دیکھے گی کہ فرد کا عقیدہ و نظریہ کیا ہے؟ اس کا کردار و عمل کیسا ہے؟ وہ صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند ہے یا نہیں۔ جبکہ مسلم لیگ میں شمولیت کے لئے شرط محض یہ تھی کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" یعنی نام مسلمانوں کا سا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد کوئی شیعہ ہو یا سنی' حتیٰ کہ اگر قادیانی بھی ہو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ نام تو ان کے بھی مسلمانوں کے سے تھے۔ غلام احمد قادیانی کا نام بھی تو مسلمانوں جیسا تھا۔ چنانچہ اگر مسلم قومیت کے نام پر مسلمانوں کو اکٹھا نہ کیا جاتا تو پاکستان نہیں بن سکتا تھا۔

البتہ قومی جماعت کے ہاتھوں اس ملک کے ایک اسلامی ریاست بننے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ یہ ایک غیر منطقی بات ہوتی۔ اس لئے کہ قومی جماعت قومی ریاست ہی قائم کر سکتی ہے اسلامی ریاست نہیں۔ اسلامی ریاست تو کوئی دینی جماعت ہی قائم کر سکتی ہے۔

نفاذِ اسلام ' دینی جماعتیں اور قائد اعظم کا متنازعہ جملہ

قیام پاکستان کے بعد نفاذ اسلام کا کام مذہبی جماعتوں کا تھا۔ انہیں ایک ملک مل گیا تھا اور اب لازم تھا کہ وہ اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتیں۔ اور یہی دراصل میرے نزدیک قائد اعظم کے اس controversial جملے کی توجیہ ہے جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا۔ میں قائد اعظم کو کوئی جھوٹا اور فریبی انسان نہیں سمجھتا۔ بلاشبہ ان کے کردار کے یہ پہلو بہت روشن تھے۔ وہ وہی کہتے تھے جو دل میں ہوتا تھا اور جو کچھ بھی وہ زبان سے کہتے تھے مخاطب یقین کر سکتا تھا کہ یہی ان کے دل میں ہے۔ انہوں نے کہا تھا

> "Very soon Hindus will cease to be Hindus and Muslims will cease to be Muslims, not in the religious sense because religion is the private affair of the individual, but in the political sense"

یہ وہ جملہ ہے کہ جس کی بنا پر قائد اعظم پر بہت زیادہ تنقید ہوئی ہے۔ چنانچہ قائد اعظم کے عقیدت مندوں کو بھی دقت پیش آتی ہے کہ اس کی توجیہ کیسے کریں۔ حال ہی میں زیڈ اے سلہری صاحب نے جنگ میں اپنے ایک مضمون میں شریف المجاہد کی کتاب پر بڑی زبردست تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں شریف المجاہد نے قائد اعظم کی جو سوانح عمری لکھی ہے اس میں انہوں نے بہت بڑا سوال کھڑا کر دیا ہے کہ یہ جملہ قائد اعظم نے کیسے کہہ دیا؟ لیکن اس کا جواب نہیں دیا' جس سے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوا ہے۔

قائد اعظم کے اس جملے کی ایک توجیہ غلام احمد پرویز نے بھی کی ہے۔ چونکہ وہ منکرین سنت میں شامل ہیں' اس لئے مجھے ان سے بہت بعد ہے' لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ وہ خالص مسلم لیگی اور مخلص پاکستانی تھے۔ لیکن اس جملے کی صحیح توجیہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ ان کا کہنا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ حالات کا دباؤ کچھ ایسا تھا' اور مسائل اتنے

شدید اور گمبھیر تھے کہ قائداعظم کے اعصاب اس وقت متاثر ہو گئے' اور اعصاب کے تناؤ کے عالم میں انہوں نے یہ جملہ کہہ دیا۔ گویا یہ جملہ ان سے غیر شعوری طور پر اور بے سوچے سمجھے نکل گیا۔ میں اس بات کو کسی صورت تسلیم نہیں کرتا۔ حالات یقیناً گمبھیر تھے لیکن یہ جملہ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ اس لئے کہ ان کے اعصاب بہت مضبوط اور فولادی تھے!

میرے نزدیک بھی اس کی ایک خاص توجیہ ہے۔ وہ شاید آپ کو قبول نہ ہو' لیکن میرا دل اس پر مطمئن ہے۔ ویسے اگر قائداعظم کے اس قول کی توجیہہ یہی ہو تب بھی میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ وہ توجیہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو مسلمان اقلیت میں ہوتے' اور "One man one vote" کے اصول کے تحت اس میں کسی صورت اسلام کے نظام کے قیام اور شریعت اسلامی کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اب جب ہم نے ایک ایسا ملک حاصل کر لیا ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں تو چونکہ سیکولرازم کے اصول کے تحت بھی اکثریت کی بات چلتی ہے لہٰذا اگر اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت اسلام لانا چاہے گی تو اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔ گویا کہ انہوں نے یہ بات صرف اس لئے کی تھی کہ فوری طور پر پوری دنیا کو الرٹ کر دینا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا کہے کہ بیسویں صدی کے خالص سیکولر دور میں اہل پاکستان ایک مذہبی حکومت قائم کرنے چلے ہیں' یہ اسلام کا نام لے رہے ہیں ع

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

لہٰذا تمام عالمی قوتیں پاکستان کا گلا عہد طفولیت ہی میں گھونٹنے پر کمر کس لیتیں۔ قائداعظم نے اس حکمت عملی کے تحت یہ جملہ کہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ جب اکثریت چاہے گی تو اسلام آجائے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اکثریت کو بروئے کار لانا آخر کس کا کام تھا؟ ظاہر ہے کہ یہ مذہبی جماعتوں اور مذہبی قیادت کا کام تھا۔ لہٰذا اگر اسلام یہاں نہیں آسکا تو اس کا الزام جملہ مذہبی جماعتوں پر آتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی کا جرم زیادہ ہو اور کسی کا کم۔ کیونکہ کسی کی حیثیت زیادہ تھی' کسی کی کم۔ کچھ لوگ اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ کر

سکتے تھے لیکن انہوں نے نہیں کیا' لہٰذا زیادہ بڑے مجرم ٹھہرے۔ کچھ لوگ تھوڑا کر سکتے تھے' انہوں نے تھوڑا بھی نہیں کیا' لہٰذا وہ بھی موردِ الزام ٹھہرے۔ غرض پوری قوم ذمہ دار ہے' لیکن سب سے بڑی ذمہ داری اس کی مذہبی قیادت پر ہے۔

طریق کار کی غلطی

اس ضمن میں یہ بات اہم ترین ہے کہ اگر دینی جماعتیں صحیح طور پر نفاذِ اسلام کے لئے جدوجہد کرتیں تو برسرِاقتدار کسی بھی حکومت کے ذریعے بہت سا کام کروا سکتی تھیں۔ اس کی مثال قراردادِ مقاصد کی منظوری ہے۔ مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۴۸ء میں "مطالبہ دستورِ اسلامی" پیش کیا اور اس کے لئے ایک زبردست مہم چلائی گئی' بے شمار پوسٹ کارڈ چھاپے گئے جن پر مجوزہ دستور کے اصولوں پر مشتمل مطالبات درج تھے۔ یہ کارڈ بڑی تعداد میں لوگوں نے حکومت کو ارسال کئے۔ چنانچہ روزانہ دستور ساز اسمبلی کے سپیکر کے سامنے خطوں اور ٹیلی گرام کے انبار لگ جاتے تھے' بہت بڑی تعداد میں تار آتے تھے' ہزاروں خطوط پہنچتے تھے' بے شمار محضرنامے آتے تھے۔ اس کے نتیجے میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ تار اور خطوط صرف جماعت اسلامی کے لوگوں نے ارسال کئے تھے؟ نہیں' بلکہ یہ پوری قوم کا کام تھا۔ پوری قوم نے جماعت اسلامی کا ساتھ دیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک جماعت اسلامی مروجہ مفہوم میں سیاسی جماعت (Political Party) نہیں تھی۔ اور اگرچہ جماعت اسلامی تحریک پاکستان کی مخالف رہی تھی اور آخری دور میں اس نے مسلم لیگ پر شدید ترین تنقیدیں بھی کیں لیکن پھر بھی مسلم لیگ کے بہت سے لوگوں نے اس مطالبہ دستورِ اسلامی میں مولانا مودودیؒ کا ساتھ دے کر اتمامِ حجت کر دیا۔ بلکہ اس قرارداد کی منظوری میں فیصلہ کن کردار (decisive role) تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ادا کیا جو کہ پکے مسلم لیگی تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے لیاقت علی خان مرحوم کو دھمکی دی تھی کہ لیاقت!! اگر آج یہ قرارداد پاس نہ ہوئی تو میں ابھی استعفاء دے کر اسمبلی سے باہر جاؤں گا اور قوم سے کہوں گا کہ مسلم

لیگ نے تم سے دھوکہ کیا ہے۔ چنانچہ اس دھمکی کی بدولت قرارداد منظور ہوئی۔ حالانکہ اس وقت اسمبلی میں ایسے سیکولر ذہن کے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اس قرارداد کی منظوری پر کہا تھا کہ آج ہم اس قابل نہیں رہے کہ مہذب دنیا کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔ یعنی' اب ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے کہ آج کے سیکولر جمہوری دور میں ہم خدائی حاکمیت کا اعلان و اقرار کر رہے ہیں۔ اس سب کے باوجود یہ قرارداد پاس ہوئی۔

دستورِ اسلامی کے بنیادی اصولوں پر علماء کا اتفاق

پھر سیکولر عناصر کے پاس نفاذِ اسلام سے روگردانی کے لئے ایک بہت بڑی دلیل یہ تھی کہ کس کا اسلام نافذ کیا جائے' شیعہ کا یا سنی کا؟ دیوبندی کا یا بریلوی کا؟ چنانچہ رجالِ دین نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور اگلے سال ۱۹۵۰ء میں دوسرا بہت بڑا معجزہ رونما ہوا کہ تمام مکاتبِ فکر اور مذاہبِ فکر سے چوٹی کے ۳۱ علماء نے دستورِ اسلامی کی تشکیل کے لئے ۲۲ متفقہ اصول پیش کر دیئے۔ یہ دراصل علماء کی جانب سے حجت تھی کہ نفاذِ اسلام کے معاملے میں ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس تاریخی دستاویز پر ایک جانب شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے مفتی جعفر حسین جیسے مجتہد' حافظ کفایت حسین صاحب جیسے واعظ اور ذاکر اور دوسری جانب دیوبندی' بریلوی' اہلحدیث اور جماعتِ اسلامی کی بھی چوٹی کی قیادت کے دستخط تھے۔

لیکن ۱۹۵۱ء میں ایک ہمالیہ جیسی غلطی ہو گئی کہ سب سے مضبوط دینی جماعت یعنی جماعتِ اسلامی انتخابی راستے پر چل پڑی اور پھر ایک ایک کر کے تمام دینی و مذہبی جماعتوں نے اسی "طور" کی سیر کا راستہ اختیار کر لیا۔ جس کے نتیجے میں یہ سارے خواب پریشان ہو گئے۔ چنانچہ میرے نزدیک اس ساری ناکامی کی ذمہ داری کا اصل بوجھ مذہبی جماعتوں پر ہے۔ اور اس کے بعد اس غلطی کو سینتالیس برس ہونے کو ہیں۔ اللہ کرے کہ ہم نصف صدی کے بعد اس ٹوٹے ہوئے تار کو دوبارہ جوڑ سکیں۔ اور ۱۹۵۱ء سے پہلے کی جدوجہد کی طرز پر کام کرنے لگ جائیں۔

دینی جماعتوں کی کامیابی و ناکامی کا تجزیہ

جملہ مذہبی جماعتوں کے مجموعی رول اور ان کی مشترک ناکامی کے جائزے کے بعد اب ہم انفرادی طور پر دینی جماعتوں کی کامیابی اور ناکامی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ یہ تجزیہ دینی جماعتوں کے مقاصد کے حوالے سے ہو گا۔ یعنی ان اہداف کے حوالے سے جو مختلف جماعتوں نے اپنے قیام کی وقت متعین کئے تھے۔ چنانچہ اس تجزیہ میں ہم یہ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے اہداف تک کس قدر رسائی حاصل کی ہے۔

تبلیغی جماعت : کامیاب ترین جماعت

ہمارے نزدیک اپنے اہداف کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامیاب جماعت تبلیغی جماعت ہے۔ اس کا ہدف یہ تھا کہ افراد امت کے دلوں میں ایمان تازہ اور راسخ ہو جائے۔ انہیں یہ یقین ہو جائے کہ عامل حقیقی اشیاء نہیں' اللہ تعالیٰ ہے' مثلاً پیاس پانی سے نہیں بجھتی' اللہ کے بجھانے سے بجھتی ہے۔ بلاشبہ اسباب کی ایک تاثیر ہے لیکن اشیاء میں یہ تاثیر اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ ہے۔ مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جیسا کہ حضور نے فرمایا : "ابن آدم کے حلق سے جو لقمہ اترتا ہے اللہ سے اذن مانگتا ہے کہ میں اس کے لئے غذا کا کام دوں یا زہر بن جاؤں"۔ دوسرا ہدف یہ تھا کہ افراد کا انفرادی عمل درست ہو جائے۔ جیسے تبلیغی بھائی کہتے ہیں کہ "حضور ﷺ کے اعمال ہمارے اندر آ جائیں" اور ان اعمال میں اس کے پیش نظر محض انفرادی اعمال کی اصلاح' عبادات کی ترغیب اور وضع قطع اور رہن سہن کو مسنون بنانا تھا۔

اس مقصد میں تبلیغی جماعت کو یقیناً بہت بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے مقاصد نہایت محدود ہیں۔ اس نے کبھی انقلاب کا نعرہ نہیں لگایا' کبھی نظام اسلامی کے نفاذ کی تحریک نہیں چلائی' یہاں تک کہ وہ تو ۱۹۷۷ء کی نظام مصطفیٰ کی تحریک میں بھی شریک نہیں ہوئی۔ بلکہ اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ یہاں اسلامی نظام کے لئے دعا مانگ لیجئے تو وہ دعا بھی نہیں مانگتے' کہ خواہ مخواہ اس سے بھی سیاست کی بو آ جائے گی اور لوگ سمجھیں گے کہ تبلیغی جماعت کی جانب سے نفاذ اسلام کا

مطالبہ لے کر اٹھنے والی سیاسی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعت کی تائید ہو گئی۔ البتہ اب ان پر دباؤ بڑھا ہے کہ پون صدی ہو گئی ہے کچھ تو اسلامی نظام کی جانب پیش قدمی ہونی چاہئے' لہٰذا اب بعض اوقات ان کے بیانات میں نفاذ اسلام کی بھی کوئی بات کبھی آجاتی ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر وہ ایک قدم آگے رکھ کر دس قدم پیچھے ہو جاتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کی دوسری بہت بڑی کامیابی یہ ہے کہ اگرچہ اس کا آغاز ایک خاص مکتبہ فکر کے علماء سے ہوا تھا۔ چنانچہ بانی جماعت مولانا الیاسؒ اور ان کے ساتھی خالص سنی' حنفی' دیوبندی علماء تھے اور اب بھی جماعت کی قیادت انہی کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ اس نے کبھی فرقہ واریت کی بات نہیں کی' دعوت میں کبھی مسلک کی بنیاد پر تفریق نہیں کی' کسی اختلافی مسئلے کو نہیں چھیڑا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں موجود فرقہ وارانہ کشیدگی میں دھیلا بھر بھی حصہ تبلیغی جماعت کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

ان دو اعتبارات سے ہمارے نزدیک تبلیغی جماعت کامیاب ترین مذہبی جماعت ہے۔ وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ ان کے لاکھوں کے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ دس لاکھ سے زائد کا اجتماع تو رائے ونڈ میں بھی ہو جاتا ہے جبکہ ٹونگی (بنگلہ دیش) جو ان کا مرکز ہے' وہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲۵ لاکھ کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور یہ آج سے تقریباً پندرہ سال پرانی بات ہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغی جماعت کا مشن پوری دنیا کو محیط ہے۔ ہمارے پاس اگر کوئی ذریعہ ہوتا تو ہم دیکھ سکتے تھے کہ پورے کرۂ ارضی کے اوپر ایک ہی وقت میں تبلیغی جماعتیں حرکت میں ہیں' بالکل اسی طرح جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوتی ہیں۔ امریکہ یورپ' افریقہ' چین اور دنیا کے تمام خطوں میں تبلیغی جماعت کی دعوت پھیل رہی ہے۔ ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش تو ظاہر ہے کہ اس کے اصل مراکز ہیں ہی۔

تیسرے یہ کہ انفرادی سطح پر جو تبدیلی تبلیغی جماعت لانا چاہتی ہے' لا رہی ہے۔ اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمانوں کی داڑھیاں لمبی ہو رہی ہیں' پاجامے اور شلواریں ٹخنوں سے اوپر اٹھ رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جن کی شامیں جو کبھی

سینما میں یا ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزرتی تھیں اب مسجد میں گزرتی ہیں۔ پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے لیل و نہار میں بھی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں' اگرچہ کاروبار اور "معاملات" میں ہیر پھیر حسب سابق چل رہا ہے' اس کو چھیڑا نہیں گیا۔

تحریکِ جعفریہ : ناکام ترین جماعت

دوسری انتہا پر دیکھا جائے تو ہمارے نزدیک ناکام ترین جماعت تحریک جعفریہ ہے۔ اس لئے کہ وہ فقہ جعفریہ کے نفاذ کا ہدف لے کر اٹھی تھی۔ چنانچہ اولاً اس کا نام ہی "تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ" رکھا گیا تھا لیکن اسے اپنے اس بنیادی مقصد ہی سے پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ چنانچہ پہلے "نفاذ" اور پھر "فقہ" کے الفاظ جماعت کے نام سے حذف کرنے پڑے۔ دراصل ابتدا ہی سے تحریک جعفریہ سے مقصد اور ہدف متعین کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عام آدمی کو بھی معلوم ہے کہ پاکستان سنی اکثریت کا ملک ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی کہے کہ یہاں شیعہ کا فیصد تناسب انتہائی کم ہے' جیسے سپاہ صحابہؓ کہہ رہی ہے کہ شیعہ ڈھائی فیصد ہیں' اور کوئی دوسرا کہہ دے کہ شیعہ ۲۵ فیصد ہیں' تاہم رہتے پھر بھی وہ اقلیت ہی میں ہیں۔ لہٰذا ایک سنی اکثریت کے ملک میں فقہ جعفریہ کے نفاذ سے زیادہ غیر منطقی اور غیر معقول بات کوئی نہیں ہو سکتی۔

سوال یہ ہے کہ اتنی بڑی غلطی کیوں ہو گئی؟ اہل تشیع کو فقہ جعفریہ کے نفاذ کا خیال کیسے آ گیا؟ دراصل ایران کے انقلاب سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب یہاں بھی ایرانی انقلاب کو درآمد (import) کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوچ جن لوگوں کی بھی تھی' انتہائی مہلک' مضر اور جارحیت پر مبنی تھی۔ اس جارحیت کے ردعمل میں سپاہ صحابہؓ کا قیام عمل میں آیا۔ نیوٹن کے تیسرے قانون (third law) کی رو سے یہ ردعمل لازمی تھا۔ اور جب سپاہ صحابہؓ وجود میں آئی تو اس کے ردعمل کے طور پر سپاہ محمدؐ قائم ہو گئی۔ اور نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ اب قتل و غارت کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔ اگرچہ اس میں بیرونی ہاتھ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ظاہر ہے کہ "باہر والے" اندر کے افراد ہی کے ذریعے یہ ناپاک کام کروا سکتے ہیں' تن تنہا خود کچھ نہیں کر سکتے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل تشیع کو حقیقت پسندانہ رویہ اپنانے پر آمادہ کیا جائے اور انہیں کہا جائے کہ وہ یہاں پاکستان میں وہی حیثیت قبول کرتے ہوئے جو ایران میں سینوں کو حاصل ہے، فقہی اختلاف کے حل کے لئے کے ایرانی فارمولا کے نفاذ پر راضی ہو جائیں۔ یعنی انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ "نفاذ فقہ جعفریہ" کے حصار سے نکل سکیں۔ بحمد اللہ وہ اب نکل بھی رہے ہیں کہ "نفاذ" کا لفظ تحریک جعفریہ نے اپنے نام سے حذف کر دیا ہے۔ لیکن اس میں ہمت مردانہ اور جرات رندانہ کی ضرورت ہے کہ وہ اگلا قدم بھی اٹھائیں۔ اور اس میں انہیں خاص طور پر بین الاقوامی حالات کی سنگینی کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عالمی سطح پر نیو ورلڈ آرڈر جو اصلاً جیو ورلڈ آرڈر ہے، اس کا سیلاب آ رہا ہے۔ تقریباً پوری عرب دنیا کو فتح کیا جا چکا ہے۔ کچھ خطرہ صدام حسین (صدّام - صد + دام) سے تھا، اس کو امریکی سفیرہ گلاس پائی نے اپنی زلف گرہ گیر کے ہزار حلقی "دام" میں پھنسا لیا، چنانچہ اس کا بھرکس نکال دیا گیا اور اب وہ چوں و چراں کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ باقی سارے عرب ممالک چاہے ان کے سربراہان نام کے اعتبار سے حسن ہوں یا حسین، سر بسجود ہو چکے ہیں!

عالم عرب سے ادھر دیکھا جائے تو ایران کو فیصلہ کن ٹارگٹ قرار دیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد افغانستان ہے۔ اس میں ابھی تک خانہ جنگی چل رہی ہے۔ پاکستان میں شیعہ سنی قتل و غارت ہو رہی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتحال کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ اس سیلاب کو کیسے روکا جائے۔ اس کی واحد ممکنہ صورت یہ ہے کہ ایران، افغانستان اور پاکستان پر مشتمل ایک مضبوط بلاک بنے، جس میں جلد یا بدیر روسی ترکستان کی آزاد مسلمان ریاستیں بھی لازماً شامل ہو جائیں گی۔ یہی مسلم بلاک یہودیوں اور صیہونیوں اور امریکہ کے خواب کو بکھیر سکتا ہے ورنہ ایک ایک کر کے مسلمان ممالک کو زیر کر لیا جائے گا اور تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ آپس کی ناچاقی کی وجہ سے مسلمانوں کو ختم کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو تباہ اور غیر مستحکم کرنے کے لئے دشمنوں کے پاس ایک موثر ہتھیار شیعہ سنی فسادات اور مناقشت ہے۔ اب صورتحال یہ بن چکی ہے کہ ایران میں ۱۹۷۹ء سے اہل تشیع کی حکومت قائم ہے، اور وہاں Law of the Land (پبلک لاء) کی حیثیت فقہ

جعفریہ کو حاصل ہے۔ اور ادھر افغانستان میں طالبان کی کٹر سنی حنفی حکومت مستحکم ہو رہی ہے۔ طالبان جدید اصطلاح میں "enlightened" قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ fundamentalists نہیں ہیں۔ یہ تو مدرسوں سے نکلے ہوئے آرتھوڈوکس یعنی کٹر حنفی سنی مسلمان ہیں۔ عالمی قوتوں کا پروگرام یہ ہے کہ اب ان کی حنفیت اور ایران کی جعفریت کو ٹکرا دیا جائے۔ آج افغانستان سے ایران بھی اسی لئے خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ یہ چیز ہنٹنگٹن کے ان مشوروں کے عین مطابق ہے جو اس نے کچھ عرصہ قبل اپنے ایک مقالہ "Clash of Civilizations" میں دیئے تھے۔ فوکویاما نے کتاب لکھی تھی "End of History" یعنی تاریخ اپنے عروج کو پہنچ چکی۔ نوع انسانی جو بہترین نظام ہو سکتا تھا اس کو حاصل کر چکی اور وہ ہے ہمارا Western Secular Capitalistic Democratic Systeml۔

یہاں مجھے اگست ۱۹۸۰ء کا ایک اہم واقعہ یاد آ رہا ہے جس سے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی ایک اور "ناکامی" سامنے آتی ہے۔ یادش بخیر مرحوم جنرل ضیاء الحق نے پہلا علماء کنونشن ۲۰/ اگست کو منعقد کرنے کا اعلان کیا تو اس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے معذرت ارسال کر دی کہ میرا امریکہ کا سفر پہلے سے طے شدہ ہے۔ چنانچہ عین ۲۰/ ہی کی رات کو کراچی سے امریکہ کے لئے میری سیٹ بک ہے اور وہاں پروگرام بن چکے ہیں۔ اسی روز رات کو فون آگیا کہ ۱۸ تاریخ کو ہم ایک اور میٹنگ کر رہے ہیں جس میں اس کنونشن کو کیسے کنڈکٹ (conduct) کیا جائے اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس میں تو آ جاؤ! تو میں چلا گیا۔ اس میں سویلین صرف چار تھے، یعنی جسٹس تنزیل الرحمٰن صاحب، حافظ احمد یار صاحب، پیر کرم شاہ صاحب اور راقم الحروف۔ باقی ساری ٹاپ ملٹری براس تھی، جس میں اہل تشیع بھی تھے اور اہل تسنن بھی۔ وہاں زکوٰۃ آرڈی نینس پر بحث ہوئی تو میں نے کہا تھا خدا کے لئے آپ اپنا پورا زکوٰۃ آرڈی نینس واپس لے لیجئے لیکن شیعہ سنی کی تفریق نہ کیجئے۔ میری دلیل یہ تھی کہ زکوٰۃ صرف ٹیکس نہیں، بلکہ عبادت ہے۔ عبادت پرسنل لاء میں آئے گی۔ اس لئے یہ ہرگز درست نہیں کہ اہل تشیع زکوٰۃ نہ دیں اور اہل تسنن دیں۔ یہ تو ملت کو تقسیم کرنا ہے۔ لیکن کیا یہی مطالبہ تحریک نفاذ فقہ

جعفریہ نہیں کر سکتی تھی کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے ضمن میں امت کے تمام مکاتب فکر اور مدارس فقہ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ یہ پرسنل لاء کے ذیل میں آتی ہے۔ لیکن انہوں نے صرف اہل تشیع کے لئے استثناء حاصل کرنے پر اکتفا کیا۔ لہٰذا جو کامیابی اسے حاصل ہوئی وہ منفی نوعیت کی ہوئی کہ اس سے امت تقسیم ہو گئی۔

جماعت اسلامی ناکامیوں کی راہ پر

اب ہم ان دو انتہاؤں کے مابین جماعت اسلامی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے علاوہ اہل سنت کی "جماعت" صرف ایک ہے، اور وہ جماعت اسلامی ہے۔ باقی سب خالص فرقہ وارانہ جمعیتیں ہیں جو دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث مکاتب فکر پر مشتمل ہیں۔ (تحریک جعفریہ کا علیحدہ تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے) ہمارے نزدیک جماعت اسلامی ایک انتہائی ناکام جماعت ہے، بلکہ حقیقت واقعی کے اعتبار سے یہ مر چکی ہے۔ اور اس پر فانی کا یہ شعر صادق آرہا ہے کہ ؎

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

میرے جذبات کی شدت و حدت کی وجہ یہ ہے کہ یہ واحد جماعت ہے جس کی تاسیس خالص اصولی اسلامی انقلابی جماعت کے طور پر ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کے ساتھ یہ تین صفاتی الفاظ بہت اہم ہیں۔ یعنی :

۱ ۔ اصولی، یہ اصولی جماعت ہے، فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔
۲ ۔ انقلابی، یہ انقلابی جماعت ہے جو پورے نظام کو بدلنے کا داعیہ لے کر اٹھی تھی۔
۳ ۔ اسلامی، یہ اسلامی جماعت ہے، کسی خاص فقہ کے نفاذ کے لئے قائم نہیں ہوئی۔ یہ کسی خاص مکتبہ فکر (school of thoght) کو ترقی دینے کے لئے نہیں بنی۔

چنانچہ جماعت نے اپنے دستور میں "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے عقیدے کی جو تشریح کی ہے، ہمارے نزدیک اس کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر شاید مشکل ہو۔ جماعت اسلامی انقلابی جماعت ہونے کی وجہ سے ہی تحریک مسلم لیگ سے علیحدہ ہوئی۔

ورنہ ایک زمانے میں مسلم قومیت (Muslim Nationhood) پر سب سے زیادہ زور مولانا مودودی ہی دیا کرتے تھے۔ مسئلہ قومیت پر ان کی معرکتہ الاراء کتاب کے علاوہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ اول و دوم)" کا اکثر مسلم لیگی حضرات اپنے مسلم قومیت کے تصور کے حق میں حوالہ دیتے تھے۔ البتہ حصہ سوم میں انہوں نے مسلم قومیت کے تصور پر ضرب لگائی۔ انہوں نے کہا مسلمان اصلاً ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک "حزب" اور "امت" ہیں، کیونکہ قوم نسل یا زبان کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں "قوم" کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: ﴿یقوم اعبدوا اللہ﴾ "اے میری قوم اپنے رب کی عبادت کرو"

اسی طرح مسلمانوں کے لئے قرآن مجید میں "امت" اور "حزب" کے الفاظ آئے ہیں، نہ کہ "قوم" کے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿کنتم خیر امۃ اخرجت للناس﴾ (آل عمران: ۱۱۰) اور ﴿اولئک حزب اللہ، الا ان حزب اللہ ھم المفلحون○﴾ (المجادلہ: ۲۲) اور "فان حزب اللہ ھم الغلبون○﴾ (المائدہ: ۵۶)

نظری و فکری اہداف و مقاصد کے اعتبار سے ہماری حالیہ تاریخ میں جماعت اسلامی سے اونچی کوئی تحریک نہیں اٹھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی غلط موڑ مڑ گئی۔ اور مولانا مودودی سے ہمالیہ جیسی غلطی سرزد ہوئی کہ انہوں نے ۵۱ء میں انتخابات پنجاب میں حصہ لے کر اسلام کو پارٹی ایشو بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام پارٹی ایشو بن گیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے لوگوں کے علاوہ باقی جماعتوں کے حلقہ بگوش عوام جماعت اسلامی کی حمایت نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ان انتخابات میں جماعت اسلامی نے ۴۰ سیٹوں پر کامیابی کی توقعات وابستہ کیں لیکن ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ گویا قوم نے چاروں شانے چت نیچے گرا دیا۔ اگر اسلام کو جماعتی مسئلہ نہ بنایا جاتا اور انتخابات کی بجائے مطالباتی، احتجاجی اور انقلابی راستے سے جدوجہد جاری رکھی جاتی تو عوام یقیناً جماعت کا ساتھ دیتے جیسا کہ مطالبہ دستور اسلامی کی جدوجہد میں انہوں نے جماعت کی حمایت کی تھی، اور اس عوامی حمایت کی بدولت قرارداد مقاصد منظور ہوئی تھی۔

انتخابات پنجاب میں ناکامی کے بعد اپنی سیاسی پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت تھی، لیکن اس ضرورت کا احساس نہیں کیا گیا اور رفتہ رفتہ جماعت کا معیار گرتا چلا گیا' تا آنکہ آج جہاں تک پہنچا ہے اس کا الزام صرف قاضی حسین احمد صاحب کی قیادت کو نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ جماعتی معیار تدریجاً گرا ہے۔ ایک مسلسل پراسس سے ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۱ء میں اس موقف کے ساتھ الیکشن لڑا گیا تھا کہ امیدواری حرام اور پارٹی ٹکٹ لعنت ہے۔ لیکن بعد میں امیدواری بھی "حلال" ہو گئی اور پارٹی ٹکٹ کی لعنت بھی "رحمت" بن گئی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ قاضی حسین احمد صاحب نے اس معیار کو بہت زیادہ گرا دیا ہے۔ اور یہ تو ہونا ہی تھا' اس لئے کہ اگر کہیں کسی ایک بات سے انحراف (deviation) ہو اور اس کو روکا نہ جائے تو لازماً دوسرے امور سے بھی انحراف ہو گا۔

پیشہ ورانہ مذہبی جمعیتیں

جماعت اسلامی کے انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں داخل ہونے اور ناکام ہونے کے بعد رہی سہی کسر دیگر دینی جماعتوں نے پوری کر دی۔ ان کے ارباب حل و عقد نے سوچا کہ جماعت اسلامی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیداوار ہے۔ وہ تو ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی۔ اب (۱۹۵۱ء) تک اسے صرف گیارہ برس ہوئے ہیں' اس لئے یہ ناکام ہو گئی ہے۔ لیکن ہم بریلویوں اور دیوبندیوں کی تو سو سو برس کی تاریخ ہے۔ اس لئے ہمیں الیکشن میں حصہ لے کر زور آزمائی کرنی چاہئے کیونکہ ؂

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

چنانچہ اب بریلوی' دیوبندی اور اہلحدیث بھی "کوہ طور کی سیر" کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اور انہوں نے بھی انتخابی سیاست کے میدان میں چھلانگ لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسلام ایک نہیں رہا بلکہ چار ہو گئے۔ چنانچہ اب دیوبندیت اور بریلویت اور اہلحدیثیت کے نام پر ووٹ مانگے گئے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے کے لئے ہر

فرقہ کو یہ کہنا پڑا کہ صرف ہمارا اسلام حقیقی ہے باقی سب نقلی ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کی موجودہ شدت وحدت انتخابی سیاست میں حصہ لینے کا منطقی نتیجہ ہے۔ ورنہ ہندوستان میں بھی مختلف مکاتب فکر کے مسلمان اور فرقے موجود ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی بھی ہیں اور شیعہ اور سنی بھی، لیکن ان میں اس قدر کشیدگی اور تلخی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ بلیاں تب ہی لڑیں گی جب انہیں چھیچھڑے دکھائی دیں گے۔ انڈیا میں مسلمانوں کو اقتدار کے چھیچھڑے نظر ہی نہیں آتے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارے لئے روڈ "بلاک" ہے۔ یہاں اقتدار کے "چھیچھڑے" ہیں۔ یہاں سب کو نظر آتا ہے کہ ہم سینیٹر بن سکتے ہیں، وزیر بن سکتے ہیں، ایم این اے اور ایم پی اے بن سکتے ہیں۔ اس چیز نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا۔

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے علاوہ باقی سب جمعیتیں ہیں۔ یعنی اولاً میں انہیں جماعتیں ہی نہیں مانتا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کے اکابرین نے بھی انہیں "جمعیت" ہی کہا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں انہیں صرف مولویوں کی ٹریڈ یونینز سمجھتا ہوں۔ یہ سوائے پروفیشنلزم کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ بدقسمتی سے ہم نے مذہب کو پیشہ (profession) بنا لیا ہے۔ دین کے بعض سماجی معاملات کی ادائیگی کو علماء کے ساتھ مختص کر دیا ہے حالانکہ اسلام میں اسی طرح کے کسی "مذہبی پروفیشن" کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ نماز پڑھا سکے، اپنی بچی کا نکاح خود پڑھائے، اپنے باپ کا جنازہ خود پڑھائے۔ اگر مذہب کو پیشہ بنایا جائے گا تو لازماً یہی ہو گا جو آج ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ مسجدوں کے اوپر بریلوی، دیوبندی، وہابی کے تجارتی نشان (trade mark) لگیں گے کہ یہ فلاں کی مسجد ہے، یہ فلاں کی ہے۔ یہ مسجد غوثیہ ہے، اس کے قریب کوئی وہابی نہ پھٹکے۔ اور اسی طرح اذان میں اضافہ ہو گا تاکہ کوئی وہابی مسجد میں داخل ہی نہ ہو اور جھگڑے کی بنیاد ہی نہ پڑے۔ ان "ٹریڈ یونینوں" نے انتخابات میں حصہ لیا تو بری طرح ناکام ہو گئیں۔ اور یوں اس غلطی کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا، جس کی بنیاد جماعت اسلامی نے انتخابات پنجاب ۵۱ء میں حصہ لے کر رکھی تھی۔ دراصل قیام پاکستان سے قبل ان جمعیتوں کی سیاسی اعتبار سے کوئی حیثیت تھی

ہی نہیں۔ اس لئے کہ تحریک پاکستان اور جہاد آزادی کے زمانے میں یہ تمام جمعیتیں محض کانگریس یا مسلم لیگ کی حلیف تھیں۔ جمعیت علمائے ہند کانگریس کی حلیف تھی اور جمعیت علماء اسلام مسلم لیگ کی ضمیمے کی حیثیت رکھتی تھی۔

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ان جمعیتوں نے اپنے آپ کو منظم کیا اور اپنے اپنے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنے شروع کئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک ہی حلقے میں مختلف جمعیتوں کے امیدوار آمنے سامنے آئے تو اسلامی ذہن رکھنے والا ووٹ بینک تقسیم ہو گیا۔ یہ "جمعیتیں" ناکام اور سیکولر قوتیں کامیاب ہوتی رہیں۔ یہ بڑی تلخ داستان ہے ؎

یہ گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو صنم بھی بولے ہری ہری

دینی جماعتیں 'کامیابی کے دو پہلو

یہ تجزیہ بھی کیا جانا ضروری ہے کہ دینی جماعتوں اور جمعیتوں کی مجموعی مساعی کے دو کامیابی کے پہلو بھی ہیں۔ ان کا' خاص طور پر جماعت اسلامی کا' یہ دعویٰ بجا ہے کہ ہم چاہے اس ملک میں اسلام نہیں لا سکے لیکن ہم نے کھلم کھلا سیکولرازم کو بھی جڑیں مستحکم کرنے نہیں دیا۔ اگر ہم انتخابی میدان میں مقابلہ نہ کرتے تو میدان خالی ہونے کی صورت میں یہاں کبھی کا عریاں سیکولرازم آ چکا ہوتا۔ میرے نزدیک یہ چاہے منفی کامیابی ہے' لیکن میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ آج سے چند سال پہلے تک یہ دعویٰ صحیح تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ "چند سال پہلے" پھر بھی ان جماعتوں کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور تھی' لیکن اب تو ان کا مجموعی اثر و رسوخ بھی اس معاشرے کے اندر بہت کم ہو چکا ہے۔

دینی قوتوں کا تدریجی زوال توقع کے عین مطابق ہے۔ اس لئے کہ جب آپ نہ ادھر چلیں نہ ادھر چلیں' یعنی نہ تو اسلام کی طرف کوئی پیش رفت ہو رہی ہو اور نہ سیکولرازم کی طرف' تو یہ کیفیت جمود کی ہے اور جمود ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ آپ خواہ کفر کی طرف چلیں' چلیں تو سہی۔ متحرک رہنے میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ "حرکت میں برکت

ہے "۔ حضرت علیؓ کا قول ہے : "الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم "یعنی "کفر پر مبنی حکومت تو باقی رہ سکتی ہے لیکن ظلم پر مبنی حکومت باقی نہیں رہ سکتی "۔ چنانچہ آج کفر پر بھی آخر پوری دنیا چل ہی رہی ہے۔ اور دنیوی ترقی کر رہی ہے۔ اور اگر حرکت اسلام کی طرف ہو جائے تو کیا کہنے! یہ تو "نور علی نور" والا معاملہ ہو جائے۔ لیکن نہ ادھر جانا نہ ادھر جانا' یہ معاملہ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ مذہبی جماعتوں کے طرز عمل سے جو جمود اور ٹھہراؤ پیدا ہوا خواہ اسے یہ اپنی کامیابی سمجھتی رہیں' لیکن حقیقت میں اس چیز نے پاکستان کی نظریاتی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اب وہ بریک بھی کھل چکا ہے جسے یہ حضرات اب تک اپنی کامیابی قرار دیتے رہے ہیں۔

دینی جماعتوں کی بظاہر دوسری بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے ہر تخریبی تحریک کو تقویت پہنچا کر کامیاب کرایا ہے۔ تخریب سے ہماری مراد تخریب کاری نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کرسی اقتدار پر بیٹھے ہوئے شخص کی ٹانگ کھینچنے یعنی حکومت کو گرانے میں موثر کردار علماء کرام اور دینی تحریکوں نے ادا کیا ہے۔ چنانچہ ایوب خان کے خلاف "بحالی جمہوریت" کی تحریک اور PNA کی اینٹی بھٹو تحریک میں بھی اگرچہ سیکولرز اور مذہبی دونوں قسم کی جماعتیں شامل تھیں' لیکن ان کی کامیابی میں فیصلہ کن اور موثر رول علماء اور مذہبی جماعتوں ہی کا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے خلاف عوامی رائے کو منظم کرنے کے لئے دینی جماعتوں اور علمائے کرام کے پاس "مسجد" کا موثر پلیٹ فارم ہے۔ مسجد کے منبر سے اگر وہ کسی حکمران کے خلاف آواز اٹھائیں تو وہ چاہے ایوب خان جیسا آمر ہی کیوں نہ ہو' اس کا توڑ نہیں کر سکتا' خواہ وہ تمام ذرائع اور وسائل استعمال کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلتی ہے تو اس میں دینی جماعتوں کی شمولیت کو لازمی خیال کیا جاتا ہے' کہ ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

صاف ظاہر ہے کہ کسی احتجاجی تحریک میں محض "جمہوریت شریف" کے لئے کوئی جان دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس میں لازمی طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لینا پڑتا ہے۔

پس چہ باید کرد

حالیہ انتخابات کے نتیجے میں ہمارے ملک میں پیدا شدہ صورتحال سے واضح ہو گیا ہے کہ موجودہ انتخابی سیاست کے میدان میں دینی جماعتیں تقریباً ایل بی ڈبلیو ہو چکی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی گود میں بیٹھ کر عبدالستار نیازی صاحب کی جمعیت علماء پاکستان' پروفیسر ساجد میر صاحب کی جمعیت اہلحدیث یا علامہ ساجد نقوی کی تحریک جعفریہ کوئی جزوی فائدہ اٹھالیں لیکن اپنی ذاتی حیثیت میں وہ زیرو ہو چکی ہیں۔ اور جن لوگوں نے حالیہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا یعنی جمعیت علماء پاکستان (نورانی گروپ) اور جماعت اسلامی' وہ تو ویسے ہی ایوان ہائے اقتدار سے بالکل منقطع ہو چکی ہیں۔

اس صورتحال میں یہ امید بھی پیدا ہوتی ہے کہ اس تنزل پر پہنچ کر ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں اور ع "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" والا معاملہ بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ "میرا کلام نرم و نازک" ان پر اثر کر دے۔ اور میری تلخ نوائی انہیں اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اب انہیں لازماً سوچنا ہی ہو گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان کی خدمت میں تجویز کے طور پر دو باتیں عرض کرنا ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ دینی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن حکیم کی یہ آیت ہے کہ:

﴿ ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون ٥ ﴾

"تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آنی چاہئے (یا تم میں ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی ہونی چاہئے) جو نیکی کی دعوت دے خیر (اور بھلائی کے کاموں) کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔

گویا خیر و بھلائی کی دعوت اور برائی اور منکرات سے روکنا تمام مسلمانوں کی اور خاص طور پر علماء کرام کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ بنی اسرائیل کے علماء کے بارے میں قرآن حکیم میں سرزنش کے انداز میں فرمایا گیا:

﴿ لولا ینھاھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت.... ﴾ (المائدہ : ۶۳)

"کیوں نہیں روکا ان کو ان کے مشائخ اور علماء نے جھوٹ بات کہنے اور حرام خوری سے"۔

اس ذمہ داری کی ادائیگی کیسے کی جائے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے نہی عن المنکر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش ہوتی رہنی چاہئے کہ فدائین کی ایک جماعت تیار ہو جو پہلے اپنی ذات اور اپنے خاندان پر اللہ کا دین نافذ کر چکے ہوں اور پھر سر پر کفن باندھ کر احیائے خلافت اور اسلامی انقلاب کے لئے جانیں دینے کو تیار ہوں۔ جب مناسب جمعیت ہاتھ آ جائے تو یہ لوگ بنیان مرصوص بن کر برائی کو روکنے کے لئے گھروں سے نکل کر میدان میں آ جائیں اور باطل اور غیر اسلامی حکومت کو للکاریں کہ "اب ہم یہ حرام کام نہیں ہونے دیں گے"۔ لیکن حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک میں جلاؤ اور توڑ پھوڑ نہیں ہونا چاہئے۔ کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ بلکہ یہ گھیراؤ مکمل طور پر پرامن ہونا چاہئے جیسا کہ ماضی میں اہل تشیع کے ۱۵۰,۰۰۰ افراد نے زکوٰۃ سے استثناء حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ کا گھیراؤ کیا تھا۔ غرض یہ احتجاج گاندھی کے عدم تعاون سے شروع ہو اور خمینی کی غیر مسلح بغاوت پر منتج ہو۔

یہ ہے اسلامی انقلاب کا صحیح راستہ۔ آج کے دور میں اسلامی انقلاب اسی طریقہ سے برپا کیا جائے گا۔

دوسرا کام' جو فوری نوعیت کے کرنے کا ہے' یہ ہے کہ ہمیں سفر وہیں سے شروع کرنا چاہئے جہاں یہ سلسلہ رک گیا تھا' یعنی ۴۸ء سے ۵۰ء کے زمانے سے۔ اسی متفق علیہ اسلامی دستور سے جس کے بنیادی اصول ۱۹۵۰ء میں مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء نے وضع کئے تھے' اسی کی تشکیل کے لئے جدوجہد کی جائے' اس کے لئے منظم تحریک چلائی جائے۔ شیعہ سنی مسئلہ کے حل کے لئے اکثریتی فقہ کے نفاذ کے ایرانی فارمولا پر عمل کیا جائے۔ تمام رجال دین کندھے سے کندھا ملا کر اٹھ کھڑے ہوں اور برملا آواز اٹھائیں کہ ہم سیکولرازم کو ہرگز نہیں مانیں گے۔ ہمیں امریکہ اور IMF کی غلامی نہیں چاہئے۔ ہمیں

صرف اور صرف اسلام چاہئے۔ اس لئے دستور میں قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کی ترمیم کی جائے۔

دستور میں ترامیم کا یہی مطالبہ لے کر ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ اصولی طور پر ہمارا مطالبہ کسی خاص جماعت کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا مطالبہ ہے۔ چنانچہ ہم نے مجوزہ دستوری ترامیم کے مطالبے پر مشتمل جو پوسٹ کارڈ اور ٹیلی گرام میاں نواز شریف کو بھیجنے کے لئے شائع کئے ہیں، ان پر کسی تنظیم کا نام بھی نہیں لکھا۔ دراصل اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں چند چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے قرارداد مقاصد کو عملاً کالعدم کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا حکومت سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ

اولاً : قرارداد مقاصد سے متصادم چیزوں کو یا تو دستور سے خارج کر دیا جائے یا یہ طے کر دیا جائے کہ ترجیح اول اور بالادستی قرارداد مقاصد کو حاصل رہے گی۔

ثانیاً : دستور کی دفعہ ۲ میں شق (ب) کا اضافہ کیا جائے کہ پاکستان میں وفاقی، صوبائی کسی بھی سطح پر کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکے گی۔ اگرچہ دستور میں آرٹیکل ۲۲۷ موجود ہے جس کی رو سے یہاں کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی، لیکن کسی قانون کو کتاب و سنت کے منافی قرار دلوانے کے لئے جو ادارہ (اسلامی نظریاتی کونسل) قائم کیا گیا ہے وہ ایک غیر موثر اور بے اختیار ادارہ ہے، جس کی سفارشات اور رپورٹوں سے الماریوں کی الماریاں بھر چکی ہیں، لیکن ان پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کے بجائے دستور کی دفعہ ۲ میں شق (ب) کا مجوزہ اضافہ کر دیا جائے تو یہ معاملہ موثر انداز میں طے ہو سکتا ہے۔

ثالثاً : فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار سے جو استثناء دستور پاکستان، مسلم پرسنل لاء اور پروسیجرل لاز کو دیا گیا ہے اسے ختم کیا جائے۔ ضیاء الحق صاحب نے جو فیڈرل شریعت کورٹ قائم کی تھی وہ صحیح سمت میں ایک درست قدم تھا۔ اس لئے کہ قانون سازی اگرچہ اسمبلی ہی کا کام ہے لیکن یہ طے کرنا کہ کہیں کسی معاملے میں کتاب و سنت سے تجاوز تو نہیں ہو گیا، یہ اسمبلی کا کام نہیں۔ کیونکہ وہاں عالم تو بیٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ چنانچہ ایسے معاملات فیڈرل شریعت کورٹ کے سپرد ہونے چاہئیں جہاں علماء اور

ماہرین قانون آ کر اپنے دلائل دیں۔ یہ مسئلہ ٹیکنیکل بھی ہے اور اکیڈمک بھی۔ اگر فیڈرل شریعت کورٹ یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ فلاں قانون یا اس کی فلاں شق کتاب و سنت کے منافی ہے تو اب متبادل قانون سازی پارلیمنٹ کرے گی' نہ کہ فیڈرل شریعت کورٹ۔ میرے نزدیک یہ بالکل درست طریق کار ہے۔

یہ طریق کار تب ہی مفید ہو سکتا ہے جب فیڈرل شریعت کورٹ پر کوئی بندشیں عائد نہ ہوں۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں فیڈرل شریعت کورٹ کے اوپر ابھی تک تین بندشیں لگی ہوئی ہیں۔ آغاز میں یہ چار تھیں' جن میں سے ایک یعنی مالیاتی معاملات کی بندش معینہ مدت کے بعد کھل گئی تو فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے فیصلے میں بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دے دیا۔ لیکن ابھی تک دستور پاکستان' پروسیجرل قوانین اور مسلم پرسنل لاز یعنی عائلی قوانین اس عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب خان کے نافذ کردہ عائلی قوانین جن کی بعض دفعات کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا اتفاق ہے کہ یہ قرآن و سنت کے منافی ہیں' ان کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کوئی بات نہیں کر سکتی' حالانکہ یہ عائلی قوانین بہت بڑی خرابی اور پیچیدگی کا سبب بن رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے جو خود حنفی ہے' اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیں تو فقہ حنفی کی رو سے تو طلاق مغلظ ہو گئی جس سے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس موجودہ عائلی قوانین کی رو سے ۹۰ دن گزرنے کے بعد طلاق موثر ہوتی ہے اور اس مدت کے اندر اندر طلاق واپس لی جا سکتی ہے۔ اب طلاق یافتہ عورت یہ سمجھ کر کہ اسے طلاق مغلظ ہو گئی ہے' اپنی عدت پوری کر کے کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کر لیتی ہے تو ملکی قانون کی رو سے اس پر حدود کا مقدمہ دائر کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ملکی قانون کا تقاضا ہے کہ پہلے وہ عورت تو ۹۰ دن تک طلاق کے موثر ہونے کا انتظار کرے اور پھر اس کے بعد عدت کی مدت گزارے' تب کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔ تو یہ عائلی قوانین اتنی بڑی خرابی کا موجب بن رہے ہیں۔ میں نے تجویز کیا تھا کہ نکاح کے وقت نکاح نامہ میں یہ تعین ہو جانا چاہئے کہ یہ شادی کس فقہ کے تابع ہو رہی ہے۔ بالفرض اگر ایک سنی لڑکے کی شادی شیعہ لڑکی سے ہو رہی ہے تو نکاح نامہ میں طے کر دیا جائے کہ اس شادی کا معاملہ فقہ جعفریہ کے

مطابق ہو گا یا فقہ حنفی کے مطابق۔ یعنی اگر لڑکے اور لڑکی کے مسلک مختلف ہیں تو ان میں سے ایک کو قربانی دینی ہو گی۔

رابعاً : ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی شرائط ملازمت' جو اس وقت کم تر سطح پر رکھی گئی ہیں' انہیں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کے مساوی مستحکم بنایا جائے' تاکہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہر قسم کے دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہوں۔

خامساً : فیڈرل شریعت کورٹ نے جو فیصلہ بینک انٹرسٹ کے "ربا" ہونے کے ضمن میں دیا تھا اس کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کردہ اپیل واپس لی جائے اور متبادل معاشی نظام کی تیاری کے لئے شریعت کورٹ سے ایک سال کی مہلت مانگ کر جلد از جلد غیر سودی معاشی نظام نافذ کیا جائے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ☆☆

اُمّتِ مسلمہ کی عمر
اور
مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبہ دعوت و ثقافت' دعوت اسلامی کالج' جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الاسلام و قرب ظہور المہدی"

کا اردو ترجمہ

مترجم : پروفیسر خورشید عالم' قرآن کالج لاہور

مقدّمہ

- اس کتاب میں خون ریز جنگوں کی قربت اور ان آخری فتنوں کا بیان ہے جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی ختم ہونے کو ہے اور قیامت آنے ہی والی ہے۔
- اس کتاب میں کتاب و سنت کے صحیح دلائل' ٹھوس اور واضح آثار کو بطور سند پیش کیا گیا ہے۔
- یہ کتاب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے کلام کو مانوس بنا کر اس کو بطور دلیل پیش کرتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان سے روایت کی اجازت دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے روایت کرو' اس میں کوئی حرج نہیں : "حدِّثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج"[1]
- موجودہ واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور ان میں عجیب یکانگت پائی جاتی ہے۔
- مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ بہت سے لوگ اس موضوع سے ناآشنا ہیں حالانکہ اہل کتاب

کے عوام بھی اس کا علم رکھتے ہیں۔ وہ تو ایک گانا گاتے رہتے ہیں جس کا عنوان ہے "O 'Jesus Come" (اے مسیح آجاؤ!) یعنی وہ مسیح کے منتظر ہیں بلکہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جلدی آجاؤ! مگر ہم بے خبر ہیں۔ چنانچہ میں نے کتاب لکھنے کا ارادہ باندھا۔ پیش نظر یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو مختصر لکھا جائے تاکہ اسے سمجھنے میں بھی آسانی ہو اور اس کی اشاعت بھی آسانی سے ہو جائے۔ تمنا یہی تھی کہ اس کا نفع عام ہو جائے۔ کتاب کا ہے کو ہے بے خبروں کو خبردار کرنے کے لئے' سوئے ہوؤں کو جگانے کے لئے اور بے راہروؤں کو راہ پر لانے کے لئے ایک پیغام ہے۔ لوگ خواہ دنیادار ہوں یا دین دار' اللہ ان پر رحم کرے' سب غافل ہیں۔ دنیادار تو اپنی گمراہی میں بھٹک رہے ہیں اور باطل پر قائم ہیں۔ دین داروں میں اکثریت (کا حال یہ ہے کہ) بری طرح غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ فروعی اختلافات میں الجھے ہوئے ہیں' حالانکہ یہ اختلافات مدت ہوئی ختم ہو چکے ہیں۔ کاش وہ سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے اور اختلاف رائے ان کی باہمی محبت پر کوئی آنچ نہ آنے دیتا۔ کاش وہ نہ ایک دوسرے سے جھگڑتے' نہ ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے' نہ ایک دوسرے کے دشمن بنتے اور نہ ایک دوسرے سے الجھتے' بلکہ ایک دوسرے سے محبت کرتے'۔ ایک دوسرے کے قریب آتے اور اختلاف کے لئے ان کے سینے کھلے ہوتے۔

علمی اور اجتماعی اعتبار سے یہ کتاب انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ سب کو خبردار کرے گی اور ان کو بتائے گی کہ آخری زمانوں میں ہونے والی خونریز جنگیں قریب ہیں' وہ ہمارے سر پر کھڑی ہیں' ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہیں۔ وہ اپنے سینے سے سب کو کچل کر رکھ دیں گی اور اپنے ظلم سے سب کو پارہ پارہ کر دیں گی' اس لئے یہ کتاب سب اہل دانش سے مخاطب ہے اور ان کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

اے دنیا والو! عصیاں کاری سے باز آجاؤ' اپنے آپ کو نفسانی شہوات سے چھڑالو' اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ' اس کی شریعت سے وابستہ ہو جاؤ' کیونکہ اس امت کے آخری زمانہ میں وہ قوم زمین میں دھنس جائے گی' اس کی صورت مسخ ہو جائے گی جو اپنے شب و روز لہو و لعب' مے نوشی اور راگ و رنگ میں گزار رہی ہو گی۔ اس دن اللہ کی

رحمت کے سوا قضائے الٰہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔

اے دین دارو! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اختلافات کو دور پھینک دو، شیر و شکر ہو جاؤ اور محض اللہ کی رضا کی خاطر آپس میں محبت کے رشتوں کو استوار کرو۔ آپس میں مت الجھو، وگرنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، تاکہ تم آنے والی بڑی بڑی جنگوں میں صفِ واحد بن جاؤ۔ یہ جنگیں قریب تر ہیں۔ گنے چنے کم کوش لوگوں کو اس بات کی اجازت ہرگز نہ دو کہ وہ مل جل کر تمہاری جمعیت کو پراگندہ اور تمہاری کاوشوں کو منتشر کر کے تمہیں اجتہادی فرعی اختلافات کے بھنور میں بہا لے جائیں، وہ اختلافات جو امت میں تفرقہ ڈال کر اسے کمزور کر رہے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

"سیکون فی آخر امتی اناس یحدثونکم مالم تسمعوا انتم ولا اباؤکم، فایاکم وایاھم"{۲}

"میری امت کے آخری زمانے میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو تمہارے سامنے ایسی باتیں کریں گے (روایات بیان کریں گے) جن کی اجازت نہ تم نے دی نہ تمہارے باپ دادا نے دی۔ ان سے بچنا۔"

اے اللہ کے بندو! بڑی باتوں کی فکر کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس قدر مشغول نہ ہو جاؤ کہ ذمہ داری کے اونچے معیار تک پہنچ نہ پاؤ ــــــ اور ان دشمنوں کا سامنا نہ کر پاؤ جو ہر طرف سے تمہیں گھیرے ہوئے ہیں۔

مسلمان اہل علم کو حکم ہے کہ وہ ہر چیز کو صحیح مقام پر رکھیں۔ سب سے مقدم اس چیز کو سمجھیں جو زیادہ ضروری ہو، پھر اس چیز کو جو نسبتاً کم ضروری ہو۔ شریعت کے احکام میں، اس کے مقررہ قوانین میں ــــــ مثلاً فرض عین، فرض کفایہ، واجبات، نوافل اور مستحبات ــــــ شریعت الٰہی کا یہ معروف قاعدہ ہے جو کسی اہل علم پر مخفی نہیں کہ ان سب احکام کا شریعت میں لگا بندھا مقام ہے اور اہمیت اور اولیت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ جب ہم دیکھیں کہ ایک آدمی ان لگے بندھے قواعد میں رخنہ ڈال کر ان کو آپس میں گڈمڈ کر رہا ہے اور جن کاموں کو پہلے کرنا ہے ان کو بعد میں کر رہا ہے یا جن کاموں

کو بعد میں کرنا ہے ان کو پہلے کر رہا ہے تو اسے نصیحت کرنا اور تنبیہ کرنا لازم ہو جاتا ہے اور اس پر واجب ہے کہ وہ نصیحت پر عمل کرے اور کہا مانے' کیونکہ دین تو نام ہی نصیحت و خیر خواہی کا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ کسی بزرگ کا قول ہے : "جو فرض میں مشغول ہو کر نفل سے غافل ہو جاتا ہے وہ معذور ہوتا ہے اور جو نفل میں مشغول ہو کر فرض سے غافل ہو جاتا ہے وہ مغرور (فریب خوردہ) ہوتا ہے۔"{۳}

اے سیاستدانو! لکھاریو اور مفکرو! ایک قطعی معرکہ (پیش آنے والا) ہے جسے اہل کتاب اپنی مقدس کتابوں میں "ہرمجدون"{۴} کا نام دیتے ہیں۔

ہمارے رسول کریم ﷺ نے بھی اس معرکے کی خبر دی ہے۔ آپ نے فرمایا :
"عنقریب رومی{۵} تمہارے ساتھ قابل اعتماد صلح کریں گے' پھر تم مل کر ان سے پیچھے ایک دشمن پر چڑھائی کرو گے' تمہیں کامیابی ہو گی' مال غنیمت ملے گا اور تم محفوظ ہو جاؤ گے{۶}
یہ معرکہ فیصلہ کن ہو گا' جلد ہو گا' عالمی سطح پر ہو گا اور تباہ کن ہو گا۔ انہی دنوں اس معرکہ کا تانا بانا بنا جائے گا اور اس کی تیاری مکمل ہو جائے گی (یقینی طور پر جنگی حکمت عملی پر مبنی ایک بڑے مقابلہ کا سٹیج حال ہی میں مشرق وسطیٰ میں تیار کیا جا رہا ہے جس میں ٹھیک طرح سے یہ واضح نہیں کہ وہ دشمن کون ہوں گے جن کو لازمی طور پر خسارہ اٹھانا پڑے گا){۷}

ڈاکٹر مصطفیٰ محمود کہتے ہیں "اپنی گھڑیوں کو درست کر لو' اسرائیل تیزی سے اپنے عروج کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے بعد انجام تک پہنچنے کے لئے نیچے کی طرف گنتی شروع ہو جائے گی۔ آنے والے چار سال ہی اس کی عمر کا بقیہ حصہ ہیں۔ یہ مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔"{۸}

بے شک ہمارے رسول امین ﷺ نے' جو خود بھی سچے ہیں اور لوگ بھی ان کو سچا سمجھتے ہیں' صحیح احادیث (آثار) کے ذریعے ہمیں بتایا ہے کہ جنگی حکمت عملی والا ایک بہت بڑا معرکہ جلد ہو گا۔ یہ اتحاد کی شکل میں عالمی سطح پر ہو گا جس میں ہم اور رومی (امریکا اور یورپ) ایک کیمپ میں ہوں گے۔ کامیابی ہمارا ساتھ دے گی۔ مال غنیمت ہمیں حصہ میں ملے گا۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ فریق ثانی کون ہو گا جس کو لازمی طور پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔ آیا وہ کمیونسٹ کیمپ (چین' روس اور ان کے چیلے) ہو گا یا کوئی اور......؟ خدا بہتر

جانتا ہے کہ کیا ہو گا۔

ہمارے نبی ﷺ نے ایک واقعہ کی اطلاع دی ہے جو اس بہت بڑے قریب الوقوع مقابلہ کے بعد رونما ہو گا۔ یہ واقعہ اکثر لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کا اضافہ اس کتاب نے ان اہل دانش کے علمی اور ثقافتی سرمائے میں کیا ہے جو سیاسی اور عسکری تجزیوں میں ہمہ تن معروف رہتے ہیں اور جن کی نظر دور حاضر کے واقعات پر ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اس بڑے مقابلے سے لوٹتے وقت رومی ہم سے بے وفائی کریں گے۔ ہماری باہمی مڈبھیڑ ایک خوفناک، قاتل اور بے رحم جنگ میں ہو گی ——— ایک ایسی جنگ جس میں آنکھیں انگارہ بن جائیں گی، تلواریں آبدار ہوں گی، گھمسان کا رن پڑے گا، گھوڑے مقتولین کے خون سے تربتر ہو کر اونچی آواز سے ہنہنائیں گے اور یہ الملحمۃ الکبریٰ (بڑی خونریز جنگ) ہو گا۔

اللہ نے چاہا تو اس کتاب کے تیسرے باب میں اس جنگ کی وہ تفصیل بیان ہو گی جس کی خبر اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں دی ہے۔ ہم اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ظاہری اور باطنی فتنوں سے بچائے رکھے۔

فصل اول

لفظ "علامات" کے معنی و مراد اور خاص تنبیہ

قیامت کی چھوٹی علامتوں سے مراد وہ واقعات اور حادثات ہیں جن سے متعلق نبی اکرم ﷺ نے بتایا کہ وہ آخری زمانہ میں رونما ہوں گے اور وہ بمنزلہ ان علامتوں کے ہوں گے جو قیامت کی بڑی نشانیوں کے ظہور پر دلالت کریں گی، بلکہ یوں کہئے کہ ان کا راستہ ہموار کریں گی۔

"قیامت کی علامات" کا لفظ قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا﴾

"اب تو یہ لوگ قیامت ہی کو دیکھ رہے ہیں کہ ناگہاں ان پر آن واقع ہو۔ اس کی نشانیاں تو آچکی ہیں۔" (محمد ۴۷ : ۱۸)

سُنّت میں نبی ﷺ کا وہ قول موجود ہے جو آپ ؐ نے قیامِ قیامت کے سوال کے جواب میں جبرائیل سے کہا۔ آپ ؐ نے فرمایا : "جس سے پوچھا جارہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا"۔ جبرائیل نے کہا : "مجھے اس کی نشانیاں بتایئے"۔ آپ ؐ نے فرمایا : "یہ کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی اور یہ کہ تو دیکھے گا کہ برہنہ پا ننگ دھڑنگ، محتاج بکریاں چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے"{۹}

قیامت کی چھوٹی علامات سے مراد یہ ہے کہ وہ نشانیاں آ چکی ہیں اور وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ قیامت کی بڑی علامتیں تاخیر سے نمودار ہوں۔ اگر ان کے آنے سے یہ بات ثابت نہ ہو کہ ان کے فوراً بعد بڑی علامتیں ظہور پذیر ہوں گی تو ان کو علامات کے نام سے پکارنا بے معنی ہو جائے گا۔ بعض علماء نے ان چھوٹی علامتوں کا شمار کیا ہے، وہ نوے سے کچھ اوپر ہیں۔ وہ احادیث جو ان علامات کا ماخذ ہیں صحت اور ضعف کے اعتبار سے تعداد میں مختلف ہیں، اس لئے گننے والوں کی گنتی میں بھی فرق ہے۔ جو علماء حدیث میں تساہل سے کام لیتے ہیں انہوں نے تعداد زیادہ بتائی ہے، مگر جو علماء حدیث میں زیادہ احتیاط برتتے ہیں انہوں نے تعداد کم بتائی ہے۔ لیکن قیامت جلد آنے والی ہے۔

ان علامات کا شمار کرنے سے پہلے ہم لوگوں کو چند اہم چیزوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ ہم اس باب کی فصل دوم میں دیکھ لیں گے چھوٹی علامتیں سب کی سب تمام اسی طرح ظاہر اور وقوع پذیر ہو چکی ہیں جیسا کہ ہمیں نبی معصوم ﷺ نے بتایا ہے۔

۲۔ چھوٹی علامتوں کے ظہور اور نبی ﷺ کی حدیث کے مطابق ان کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے مناسب یہی ہے کہ ہر مسلمان کے اپنی نبی ﷺ پر ایمان اور ان کی رسالت کی تصدیق میں اضافہ ہو، کیونکہ انہوں نے ان غیبی امور کی اطلاع دی جو آخری زمانہ میں ہونے والے تھے اور وہ ایسے ہی ہو کر رہے جیسے آپ ﷺ نے بتایا تھا--- ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ "نہ وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں" (النجم ۵۳ : ۳)

۳۔ بعض اہل علم غلط طور پر ان واقعات کو بھی علاماتِ صغریٰ میں خلط ملط کر دیتے ہیں جو

علاماتِ کبریٰ کے ظہور کے بعد واقع ہونے والے ہیں۔ مثلاً :

۱۔ یہودیوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل۔ یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپ جائے گا اور وہ پتھر یا درخت پکار اٹھے گا "اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے ہے' آؤ! اسے قتل کرو" {۱۰}۔ یہ قتل مہدی کے ظہور اور مسیح دجال کے خروج کے بعد ہو گا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا' وہ دجال کو قتل کریں گے اور اس کے پیروکار یہودیوں کو شکست دیں گے۔ خدا نے چاہا تو ہم چوتھے باب میں اس واقعہ کو بیان کریں گے۔ اس مقام پر یہودی پتھروں اور درختوں کے پیچھے چھپ جائیں گے تو وہ اللہ کے حکم سے مسلمانوں کے مددگار بن کر ان کمینوں کو قتل کرنے کے لئے بول پڑیں گے۔ آخری زمانہ تو عجیب و غریب خلاف عادت واقعات کا زمانہ ہو گا۔ اس زمانہ میں یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں ہو گی۔

۲۔ مسلمانوں کی ترکوں سے لڑائی۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اُس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک تم ان ترکوں سے جنگ نہ کرلو گے جن کی آنکھیں چھوٹی' چہرے سرخ' ناک چپٹی ہو گی۔ ان کے چہرے یوں دکھائی دیں گے جیسے کسی سخت چیز کو ہتھوڑے سے کوٹا ہو' یعنی چہرے چوڑے اور گول ہوں گے" {۱۱}

۳۔ دریائے فرات کے پانی کا نیچے اترنا اور سونے کے ایک پہاڑ کا ظہور' جس پر لوگ ایک دوسرے سے لڑیں گے۔ یہ واقعہ مہدی کے زمانے میں ہو گا۔ اسی لئے امام بخاریؒ نے اس حدیث کو "خروج النار" کے باب میں بیان کیا ہے اور ابن ماجہ نے اسی قسم کی حدیث کا تذکرہ "المہدی" کے باب میں کیا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ ظہور مہدی کے وقت میں ہو گا" {۱۲}

۴۔ درندوں کی لوگوں سے ہمکلامی۔ آدمی کی اپنے کوڑے کے ڈنڈے کے ساتھ ہمکلامی۔ یہ واقعہ علامات کبریٰ کے ظہور کے بعد کا ہے۔

۵۔ دو چھوٹی چھوٹی پنڈلیوں والے حبشی کے ہاتھوں کعبہ شریف کی بربادی۔ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کی موت کے بعد کا ہے' کیونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بیت اللہ کا حج کریں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ

میں میری جان ہے، عیسیٰ حج یا عمرہ کی غرض سے یا دونوں کو ایک ساتھ ادا کرنے کی غرض سے روحاء کی گھاٹی میں ضرور داخل ہوں گے"۔ {۱۳}

اس کے علاوہ بھی بہت سی علامتیں ایسی ہیں جن کو شمار کرنے والوں نے علامات صغریٰ میں شمار کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ جزیرۃ العرب کی سرزمین چراگاہوں اور نہروں میں بدل جائے گی۔ یہ سب عیسیٰ کے نزول کے بعد ہو گا۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

دوسری فصل

قیامت کی اہم چھوٹی علامتیں

اس فصل میں ہم نے قیامت کی اہم چھوٹی چھوٹی علامتوں کو جمع کر دیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ان علامات کے مجرد تذکرہ پر اکتفا کیا ہے۔ حاشیہ آرائی صرف وہاں کی گئی ہے جہاں اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہر علامت کے ساتھ اس دلیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو نبی ﷺ کی صحیح سنت پاک میں موجود ہے۔ اہم علامات آپ کے پیش خاطر ہیں :

۱۔ یہ کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی{۱۴} یہ اسلامی فتوحات کی کثرت کے لئے کنایہ ہے۔ ان فتوحات میں کثرت سے لونڈیاں جنگی قیدی کے طور پر ہاتھ لگیں گی۔ لونڈی بچے کو جنم دے گی جو اس کا مالک ہو گا کیونکہ وہ اس کے مالک کا بچہ ہو گا۔ یا یہ والدین کی نافرمانی کے لئے کنایہ ہے، یعنی بچہ اپنی ماں سے ایسے سختی سے پیش آئے گا جیسے وہ اس کا آقا ہو۔ دونوں باتیں وجود میں آچکی ہیں۔

۲۔ یہ کہ برہنہ پا، ننگ دھڑنگ اور محتاج، بکریوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے{۱۵} [جیسا کہ جزیرۃ العرب (سعودی عرب) والے کر رہے ہیں۔]

۳۔ معاملات کو نااہل لوگوں کے سپرد کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے : "جب معاملات نااہل لوگوں کے حوالے ہونے لگیں تو قیامت کا انتظار کرو"۔ {۱۶}

۴۔ کم علمی اور جہالت کا ظہور۔

۵۔ قتل و غارت کی کثرت۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "بے شک قیامت سے پہلے وہ زمانہ بھی آئے گا جب جہالت ڈیرے ڈال دے گی، علم اٹھ جائے گا۔ جب حرج (اضطراب) کثرت سے ہو گا۔ اور حرج سے مراد قتل ہے۔ {۱۷}

۶۔ مے نوشی اور اس کے لئے دوسرے نام استعمال کرنا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "میری امت کے لوگ شراب پئیں گے مگر اس کا نام بدل دیں گے۔" {۱۸}

۷۔ زنا اور بدزبانی (بدعہدی) کی کثرت۔

۸۔ آدمی ریشم پہنیں گے۔

۹۔ گانے بجانے کو جائز سمجھنا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو ریشم، مے نوشی اور گانے بجانے کو حلال سمجھیں گے۔" {۱۹}

۱۰۔ گانے والیوں کا ساتھ۔

۱۱۔ فحش کاری اور فحش گوئی کا ظہور۔

۱۲۔ قطع تعلق۔

۱۳۔ امین کو خائن سمجھ کر اس پر تہمت لگانا۔

۱۴۔ خائن کو امین سمجھ کر مقرب بنانا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "قیامت کی نشانیوں میں فحش کاری، فحش گوئی، قطع تعلق، امین کو خائن اور خائن کو امین سمجھنا ہے۔" {۲۰}

۱۵۔ لوگوں میں مرگ ناگہانی کا ظہور

۱۶۔ مسجدوں کو بطور راستہ استعمال کرنا۔ یعنی آدمی مسجد میں سے گزر جائے اور نماز نہ پڑھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ کہ مسجدوں کو راستے کے طور پر استعمال کیا جائے اور مرگ ناگہانی عام ہو جائے۔" {۲۱}

۱۷۔ ایک ہی دعوت دینے والی دو بڑی مسلمان جماعتوں کی باہم جنگ۔ یہ وہ مشہور جنگ ہے جو علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان ہوئی۔

۱۸۔ زمانوں کا تقارب۔ یعنی وقت سے برکت کا اٹھ جانا۔

۱۹۔ زلزلوں کی کثرت۔ مصر کے موسمی تحقیقات کے کسی کارکن کا قول ہے کہ زمین تو اب مستقل طور پر لرزتی رہتی ہے۔

۲۰۔ فتنوں کا ظہور اور ان کے شر کا عام ہونا۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت اس وقت آئے گی جب علم سمیٹ لیا جائے گا' زلزلے کثرت سے آنے لگیں گے' فتنوں کا ظہور ہو گا اور ہرج (اضطراب) یعنی قتل بڑھ جائے گا۔" {۲۲}

۲۱۔ جب تمام قومیں متفقہ طور پر امت مسلمہ پر پل پڑیں گی جیسے کھانے والے ایک پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں {۲۳}

۲۲۔ علم کو کم عمر لوگوں کے پاس تلاش کرنا۔ اس سے مراد وہ طالبان علم ہیں جن کو علم پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور جن کا علم پختہ نہیں ہوتا۔ ان سے مسائل دریافت کئے جائیں گے اور وہ فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت کی علامتوں میں کم عمر لوگوں کے یہاں علم کی تلاش ہے۔" {۲۴}

۲۳۔ ایسی عورتوں کا ظہور جو لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی۔ انہوں نے جسم کے کچھ حصوں کو ڈھانپ رکھا ہو گا اور کچھ کو کھول رکھا ہو گا۔ ایسی عورتیں جو اپنے آپ کو تنگ اور شفاف لباس سے ڈھانپتی ہیں حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں ڈھانپتیں۔

۲۴۔ احمقوں کا مجلس میں سینہ تان کر بیٹھنا (صدر مجلس ہونا) اور عام لوگوں کے معاملات کے بارے میں گفتگو کرنا۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت سے پہلے مکرو فریب کے سال گزریں گے جن میں امین لوگوں پر تہمت لگائی جائے گی اور تہمت زدہ لوگوں کو امین سمجھا جائے گا۔ ان سالوں میں رویبضہ گفتگو کریں گے۔ پوچھا گیا : یہ رویبضہ کیا ہے؟ جواب دیا : "وہ احمق جو عام لوگوں کے معاملات پر گفتگو کرتا ہے۔" {۲۵}

۲۵۔ سلام روشناسی کے لئے ہو گا۔ آدمی اسی کو سلام کرے گا جس سے اس کی جان پہچان ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو صرف جان پہچان کی بناء پر سلام کرے گا۔" {۲۶}

۲۶۔ رزق حلال کی عدم جستجو۔ آپؐ نے فرمایا : "لوگوں پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ آدمی اس کی پرواہ نہیں کرے گا کہ آیا وہ حلال مال لے رہا ہے یا حرام۔" {۲۷}

۲۷۔ جھوٹ کثرت سے بولا جائے گا اور عام ہو گا۔

۲۸۔ بازار قریب ہوں گے جس سے تجارت کی کثرت اور اس کی وسعت کا پتہ چلے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جھوٹ کثرت سے بولا جائے گا۔ وقت تیزی سے گزرے گا اور بازار ساتھ ہوں گے۔" {۲۸}

۲۹۔ شیطانوں کے لئے اونٹ بھی ہوں گے اور گھر بھی۔ وہ اس طرح کہ ایک آدمی اونٹنی پر سوار ہو گا اور ایک اور اونٹنی ساتھ لے جائے گا۔ وہ نہ تو اس اونٹنی پر خود سوار ہو گا اور نہ کسی ضرورت مند کی اس اونٹنی سے مدد کرے گا بلکہ شیطان اس پر سواری کریں گے۔ اسی طرح ایک آدمی گھر خریدے گا' اس لئے نہیں کہ اس میں خود رہائش اختیار کرلے بلکہ اسے کئی برس تک بچائے رکھے گا تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "شیطانوں کے لئے سواری بھی ہوگی اور گھر بھی۔" {۲۹}

۳۰۔ مسجدوں کے بارے میں ان کے سازو سامان اور ان کی ٹیپ ٹاپ کے بارے میں لوگ ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "قیامت اس وقت قائم ہوگی جب لوگ مسجدوں کے بارے میں ایک دوسرے پر فخر کرنے لگیں گے" {۳۰}

۳۱۔ لوگ اپنے سروں کو سیاہ خضاب لگائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "آخری زمانے میں لوگ کبوتر کے پوٹے کی طرح سیاہ خضاب لگائیں گے۔ وہ جنت کی خوشبو نہ سونگھ سکیں گے۔" {۳۱}

۳۲۔ نبی ﷺ کے دیدار کی تمنا۔ یہ اس وقت ہوگی جب فتنے عام ہو جائیں گے' جب دین غریب الدیار ہو جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کسی پر ایسا وقت آکر رہے گا جب وہ مجھے میرے اپنے مال و عیال سے بڑھ کر چاہے گا۔" {۳۲}

۳۳۔ طاعت گزاری اور آخرت کے لئے عمل پر لوگوں کی توجہ کم ہو جائے گی۔

۳۴۔ بخل کو دلوں میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ لوگوں کے درمیان پھیل جائے گا۔ جس کے پاس جو کچھ ہے اس میں بخل کرے گا۔ مال والا مال میں بخل کرے گا' علم والا علم میں بخل کرے گا اور کاریگر اپنی کاریگری اور مہارت میں بخل سے کام لے گا۔ آپؐ نے فرمایا: "عمل کم ہو جائے گا اور بخل کو لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا جائے گا۔" {۳۳}

۳۵۔ لوگ ایک دوسرے کو بغیر کسی مقصد کے قتل کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' لوگوں پر وہ وقت آکر رہے گا جب نہ قاتل کو پتہ ہو گا کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور نہ مقتول کو علم ہو گا کہ اسے کیوں قتل کیا گیا۔" {۳۴}

۳۶۔ سب لوگ مال عام کی لوٹ کھسوٹ کریں گے۔ وہ اسے لوٹنے اور اس میں دھوکہ و فریب سے پرہیز نہیں کریں گے۔

۳۷۔ امانت نایاب ہو جائے گی۔

۳۸۔ احکام شریعت نفس پر گراں گزریں گے۔

۳۹۔ آدمی اپنی بیوی کا کہا مانے گا اور ماں کی نافرمانی کرے گا۔

۴۰۔ آدمی اپنے باپ سے بدسلوکی سے پیش آئے گا اور اپنے دوست کو اپنے نزدیک کرے گا۔

۴۱۔ مسجدوں میں شور بلند ہو گا۔

۴۲۔ سب سے کمینہ قوم کا لیڈر اور فاسق قبیلے کا سردار بن جائے گا۔

۴۳۔ آدمی کا احترام اس کی برائی کے ڈر سے نہ کہ فضل و کرم کی بنا پر کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جب مال غنیمت گردش کرنے لگے گا' جب امانت کو مال غنیمت سمجھا جائے گا اور زکوٰۃ کو تاوان' جب آدمی اپنی بیوی کا کہا مانے گا' اور ماں کی نافرمانی کرے گا' جب اپنے دوست سے حسن سلوک کرے گا اور باپ سے بدسلوکی' جب مسجد میں شور بلند ہو گا' جب قوم کا لیڈر ذلیل ترین آدمی ہو گا اور بدکار قبیلے کا سردار بن جائے گا' انسان کی عزت اس کے شر کے ڈر سے ہو گی' جب شراب پی جائے گی' ریشم پہنا جائے گا' جب گانے والیوں اور آلات موسیقی کو اپنایا جائے گا' جب اس امت کے آخری لوگ پہلوں پر لعنت بھیجیں گے ---- تو اس وقت سرخ آندھی یا زمین میں دھنسنے کا یا شکلوں کے مسخ ہونے کا انتظار کرنا۔ علامات کا پے بہ پے اس طرح ظہور ہو گا جیسے کہ موتیوں کی پرانی لڑی کا دھاگا ٹوٹ چکا ہو اور موتی پے بہ پے گر رہے ہوں۔" {۳۵}

۴۴۔ فتنہ و فساد کی زیادتی کے باعث پولیس کی نفری بڑھ جائے گی۔

۴۵۔ لوگ امامت کے لئے ایسے آدمی کو آگے کریں گے جس کی آواز زیادہ خوبصورت ہو خواہ فقہ اور فضیلت میں سب سے کم ہو۔

۴۶۔ حکومت کی خریداری۔ یعنی رشوت دے کر منصب حاصل کئے جائیں گے۔

۴۷۔ خون کی ارزانی۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "چھ باتوں سے پہلے پہلے نیک عمل کر لو۔ (۱) احمقوں کی حکومت (۲) پولیس کی کثرت (۳) حکومت کی خریداری (۴) خون کی ارزانی (۵) قطع تعلق (۶) قرآن کو گیت سمجھ کر کسی کو امامت کے لئے آگے کھڑا کرنا تا کہ وہ ان کو گا کر سنائے خواہ وہ فقہ احکام میں سب سے کم تر ہو۔" {۳۶}

۴۸۔ یہ کہ عورت کام اور تجارت میں مرد کا ہاتھ بٹائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "قیامت سے پہلے خاص لوگ سپر ڈال دیں گے' تجارت پھیل جائے گی یہاں تک کہ عورت تجارت میں اپنے خاوند کی مدد کرے گی۔" {۳۷}

۴۹۔ قلم میں وسعت اور تصنیف و تالیف کا کام زیادہ ہو جائے گا۔

۵۰۔ یہ کہ لڑکا غضبناک ہو گا۔

۵۱۔ بارش گرمی میں ہو گی۔

۵۲۔ دین کو چھوڑ کر منصب یا نوکری یا مال کے حصول کے لئے علم حاصل کیا جائے گا۔

۵۳۔ موٹر گاڑی کا ظہور۔ یہ نبی ﷺ کی عجیب پیشنگوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "آخری زمانہ میں میری امت کے کچھ لوگ پالانوں سے ملتی جلتی زینوں پر سوار ہو کر مسجدوں کے دروازوں پر اتریں گے۔ ان کی عورتیں لباس پہننے کے باوجود ننگی ہوں گی۔" {۳۸}

۵۴۔ امت مسلمہ میں خوشحالی اور آسائش کی زندگی کا ظہور۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "جب میری امت کے لوگ مغرورانہ چال چلیں گے اور فارس و روم کے شہزادے ان کے خدمت گزار ہوں گے ان کے بدکار نیکوکاروں پر مسلط ہو جائیں گے۔" {۳۹}

۵۵۔ کمینوں کو اونچا کیا جائے گا اور شریفوں کو پست۔ یعنی فاسقوں کی عزت ہو گی اور باعزت لوگوں کی اہانت۔

۵۶۔ ایک آدمی کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ کتنا دلیر ہے' وہ کتنا دانا ہے' وہ کتنا عقلمند ہے' حالانکہ اس کے دل میں رتی بھر ایمان نہ ہو گا۔ {۴۰}

۵۷۔ فتنوں کی کثرت کی وجہ سے موت کی تمنا کی جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
"قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی جب تک ایک آدمی دوسرے کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ نہ کہے گا کہ کاش میں اس کی جگہ ہوتا۔" {۴۱}

۵۸۔ عراق کا محاصرہ ہو گا اس سے کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری امداد روک دی جائے گی۔

۵۹۔ پھر شام (سوریا' لبنان' اردن اور فلسطین) کا محاصرہ ہو گا۔ اس سے بھی کھانے پینے کی چیزیں اور دوسری امداد روک دی جائے گی۔ اور یہ علامتیں آپ کی پیشینگوئیوں میں سے سب سے بڑھ کر حیران کن ہیں جن کو نبی ﷺ نے ہمیں بتایا۔ پچھلے دنوں ایسا ہوا ہے۔ پہلے عراق کا محاصرہ ہوا پھر فلسطین کا' اور ہمارے معصوم نبی ﷺ کا قول صحیح ثابت ہو چکا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "قریب ہے کہ اہل عراق کی طرف نہ قفیر (اہل عراق کا پیمانہ) بھیجی جائے اور نہ ہی درہم۔ ہم نے پوچھا کون ایسا کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ عجمی ان چیزوں کو روک لیں گے۔ پھر فرمایا: "قریب ہے کہ اہل شام کی طرف نہ دینار بھیجا جائے اور نہ مدی (اہل شام کا پیمانہ)۔" {۴۲}

۶۰۔ اللہ کے رسول ﷺ کی وفات۔

۶۱۔ بیت المقدس کی فتح۔ یہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے زمانے میں ہوئی۔

۶۲۔ وباؤں اور طاعون کی وجہ سے اجتماعی موت' جیسے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں طاعون عمواس اور عالمی جنگیں۔

۶۳۔ مہنگائی کا ظہور اور قیمتوں کا بڑھنا' حتیٰ کہ کسی کو سو یا تین سو دینار دیے جائیں گے اور وہ پھر بھی ناراض ہو گا۔

۶۴۔ ٹیلی ویژن اور گانوں کا فتنہ جو عربوں کے گھر گھر میں داخل ہو گا۔ یہ دونوں فتنے ہر گھر میں گھس گئے ہیں۔

۶۵۔ صلح صفائی ہمارے اور اہل روم (یورپ اور امریکا) کے درمیان ہو گی۔

یہ علامات صغریٰ میں سے آخری نشانی ہے کیونکہ اس کے بعد آخری خونریز معرکہ (الملحمۃ الکبریٰ) بپا ہو گا۔ یہ صلح ہو چکی ہے اور اس آخری علامت کے خدوخال نظر آنے لگے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: قیامت سے پہلے چھ نشانیوں کو گن لو: میری وفات' بیت المقدس کی فتح' پھر جانوروں جیسی موت جو تم پر ایسے اثر انداز ہو گی جیسے قعاص کی گردن توڑ بیماری اثر انداز ہوتی ہے' مال کا پھیلاؤ یہاں تک کہ ایک آدمی کو سو دینار دیئے جائیں گے پھر بھی وہ ناراض ہو گا' پھر ایک فتنہ کھڑا ہو گا جو عربوں کے گھر گھر میں داخل ہو گا' پھر تمہارے اور بنو اصفر (اہل روم) کے درمیان صلح ہو گی' پھر وہ بے وفائی کریں گے' پھر وہ اسی (۸۰) جھنڈے لے کر تم پر چڑھائی کریں گے' ہر جھنڈے کے نیچے بارہ ہزار کا لشکر ہو گا۔ {۴۳}

وہ صلح جو ہمارے اور اہل روم یا بنو الاصفر یا امریکہ اور یورپ کے مابین ہو گی وہ قیامت کی علامات صغریٰ کی آخری علامت ہے۔ کتاب کے موضوع میں اس علامت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو چولہے کے دو پتھروں کے مقابلہ میں تیسرے پتھر کو حاصل ہوتی ہے {۴۴} بالفاظ دیگر اسے کونے کا پتھر کہا جا سکتا ہے' کیونکہ بڑی خونریز جنگ "الملحمۃ الکبریٰ" جس میں مہدی مسلمانوں کی قیادت کریں گے آنے والی اس اتحادی عالمی جنگ (ہرمجدون) کے بعد ہی ہو گی۔ اس جنگ کے خاتمہ پر اہل روم غداری کریں گے اور بڑی خونریز جنگ (الملحمۃ الکبریٰ) کے لئے ہماری طرف آئیں گے۔ آنے والی جنگ کا سٹیج اتحادات اور معاہدات کی صورت میں تیار کیا جا رہا ہے۔ اسے سب جانتے ہیں' اس کے منتظر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ آ کر رہے گی۔ مسلمان اور اہل کتاب تجزیہ نگاروں کے درمیان فراہم شدہ معلومات کے مطابق اس جنگ کے قریبی وقت کی حد بندی کے سلسلہ میں معمولی سا فرق ہے۔ ہم بالتحدید یہ تو نہیں کہ سکتے کہ یہ جنگ کب ہو گی مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ جنگ بہت قریب ہے' جلد ہی آپ کو اس کی خبر مل جائے گی۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو جہانوں کا پالنہار ہے۔

تیسری فصل

ہرمجدون (ARMAGEDDON)

آپ کو خبر ہے کہ ہرمجدون کیا ہے؟

یہ بہت بڑی دھکم پیل اور تباہ کن جنگ ہے۔

یہ عنقریب ہونے والی بہت بڑی strategic لڑائی ہے۔

یہ ایک اتحادی عالمی ہونے والی لڑائی ہے جس کا انتظار صفحہ ہستی کے سب لوگ کر رہے ہیں۔

یہ ایک دینی اور سیاسی جنگ ہے۔

یہ مختلف سروں والے اژدہا (Dragon War) کی مانند ایک لڑائی ہے۔

یہ تاریخ کی سب سے بڑی بدترین لڑائی ہے۔

یہ انجام کا آغاز ہے۔

یہ ایسی جنگ ہے جس سے پہلے غیر یقینی امن قائم ہوگا۔ لوگ کہتے پھریں گے سلامتی آگئی' امن قائم ہو گیا۔

یہ ہرمجدون کا معرکہ ہے۔

"ہرمجدون" عبرانی لفظ ہے جو دو مقطعوں سے مل کر بنا ہے۔ عبرانی زبان میں "ہر" کا معنی پہاڑ ہے اور "مجیدو" فلسطین کی ایک وادی {۴۵} کا نام ہے۔ آنے والی جنگ کا یہی میدان ہو گا جو شمال میں "مجیدو" سے لے کر جنوب میں ایدوم تک ۲۰۰ میل کے فاصلے پر پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں یہ میدان بحرابیض متوسط سے اور مشرق میں موحاب کے ٹیلوں تک ۱۰۰ میل کے فاصلہ تک چلا گیا ہے {۴۶}۔ فوجی ماہرین خاص طور پر پرانے حملہ آور اس علاقے کو اسٹریٹیجیکل موقعہ محل کے لحاظ سے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جو کمانڈر اس پر قبضہ کر لیتا ہے وہ کسی بھی حملہ آور کو روک سکتا ہے {۴۷}۔ ہرمجدون کے لفظ سے اہل کتاب متعارف ہیں کیونکہ یہ لفظ ان کی مقدس کتابوں میں اور علماء اور محققین کی بحثوں میں ملتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

اہل کتاب سے ہماری مراد صرف یہود و نصاریٰ ہیں۔ اہل کتاب کے اقوال کو نقل کر کے ہم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی کیونکہ رسول کریم ﷺ نے ہمیں اس بات کی اجازت دی ہے کہ ہم ان سے روایت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: "میری طرف سے لوگوں کو بات پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو اور بنی اسرائیل سے روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں"{۴۸} شرط یہ ہے کہ ہم پوری احتیاط سے ان کی بات سنیں اور صرف وہی بات قبول کریں جو ہماری شریعت کے مطابق ہو اور ہماری شریعت اس کی شہادت دے۔ اگر ان کی بات اس سے ٹکراتی ہو تو رد کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "جب اہل کتاب تمہیں کوئی روایت بتائیں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب"{۴۹}

"ہرمجدون"۔۔۔ مسلمانوں اور اہل کتاب کے مابین

۱: اہل کتاب کے اقوال

۱۔ سفر الرؤیا (۱۶:۱۶) میں بیان ہوا ہے: "سب شیطانی روحیں اور دنیا جہان کی فوج سب کی سب ہرمجدون نامی جگہ میں جمع ہوں گی"۔ (انجیل ص ۳۸۸ مطبعہ دار الثقافہ)

۲۔ "البعد الدینی فی السیاسۃ الامریکیۃ" نامی کتاب میں ہے کہ سات امریکی صدر ہرمجدون کے معرکہ پر یقین رکھتے تھے۔{۵۰}

۳۔ امریکہ کے سابق صدر رونلڈ ریگن کا قول ہے کہ موجودہ نسل بالتحدید ہرمجدون کا معرکہ دیکھے گی۔{۵۱}

۴۔ .... کچھ ہی سالوں میں ہر چیز اپنے انجام تک پہنچ جائے گی۔ عنقریب بہت بڑا عالمی معرکہ ہو گا یعنی ہرمجدون یا مجیدو کے میدان کا معرکہ ہو گا۔{۵۲}

۵۔ جی سو اگرٹ کہتا ہے "میں چاہتا تھا کہ یہ کہوں کہ سکون ہماری صلح ہونے والی ہے مگر میں آنے والے ہرمجدون کے معرکہ پر ایمان رکھتا ہوں، بے شک ہرمجدون آ کر رہے گا۔ وادی مجیدو میں گھمسان کا رن پڑے گا۔ وہ آ کر رہے گا۔ صلح کے جس معاہدہ پر وہ دستخط کرنا چاہتے ہیں کر لیں، معاہدہ کبھی بھی پورا نہیں ہو گا۔ تاریک دن آنے

والے ہیں۔"{۵۳}

۶۔ اصول پرست عیسائیوں کے لیڈر جیری فلویل کا قول ہے "بے شک ہرمجدون ایک حقیقت ہے اور حقیقت بھی اصلی 'مگر اللہ کا شکر ہے کہ زمانہ کے خاتمہ پر واقع ہوگی"{۵۴}

۷۔ سکوفیلڈ کا قول ہے "مخلص عیسائیوں پر واجب ہے کہ وہ اس واقعہ کو خوش آمدید کہیں کیونکہ ہرمجدون کے آخری معرکہ کے شروع ہوتے ہی مسیحؑ ان کو اٹھا کر بادلوں میں لے جائیں گے (اس طرح) وہ بچ جائیں گے اور ان کو ان تکالیف کا ہرگز سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو روئے ارضی پر جاری ہوں گی"۔{۵۵}

۸۔ امریکہ کی ادیب گریس ہالسل کا کہنا ہے "عیسائیوں کی طرح ہمارا ایمان ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد تاریخ انسانی ہرمجدون نامی معرکہ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ اس معرکہ کے سر پر حضرت مسیحؑ کی واپسی کا تاج ہوگا۔ حضرت مسیحؑ واپس آکر زندوں اور مردوں پر ایک ساتھ حکومت کریں گے۔"{۵۶}

یہ ہیں اہل کتاب کے کچھ اقوال۔ مزید معلومات کے لئے مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کیجئے۔

ب : مسلمان اور ہرمجدون

عجیب بات ہے ہرمجدون کے ثبوت کے لئے اہل کتاب کے اقوال تو تواتر کے ساتھ کثرت سے وارد ہوئے ہیں مگر بہت سے مسلمان تو جانتے ہی نہیں کہ یہ ہرمجدون کیا ہے اور اس خطرناک لفظ کے اہل کتاب کی ڈکشنری میں کیا معنی ہیں۔ ہرمجدون بطور لفظ اتنا اہم نہیں بلکہ بطور مدلول اور رمز اس میں بہت سے معانی چھپے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے بعض لکھاریوں نے اس معرکہ کی طرف توجہ دینی شروع کی ہے اور ان کے قلم سے ایسے اہم مقالات نکلے ہیں جو تجزیاتی فراست' تاریخی حس اور سیاسی سوجھ بوجھ کے زور پر لکھے گئے ہیں۔ ان مقالات نے طے کیا ہے کہ

یہ فیصلہ کن معرکہ جلد ہونے والا ہے' اب اس کا سٹیج تیار کیا جا رہا ہے۔

یہ حکمت عملی کی جنگ ہو گی۔ ایٹمی اور عالمی ہو گی۔

یہودیوں کو اس میں نقصان اٹھانا پڑے گا اور ان کا زور ٹوٹ جائے گا۔ {۵۷}

ہم ان تمام سابقہ اقوال سے متفق ہیں۔ ہاں اس معرکہ کی تفصیل اور نتائج سے اختلاف ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ یہ معرکہ اتحادی ہو گا اور عالمی سطح پر ہو گا۔ مسلمان اور اہل روم (یورپ اور امریکا) اس معرکہ کے لازماً ایک فریق ہوں گے۔ وہ مل کر ایک مشترکہ دشمن سے لڑیں گے۔ اس دشمن کو ہم نہیں جانتے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے "ایک دشمن سے جو ان کے ورے ہو گا"......... کامیابی ہمارے کیمپ کا ساتھ دے گی۔

رہے یہودی تو ہمارے مصادر میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو اس عالمی جنگ میں ان کے کردار کا پتہ دے، لیکن وہ اس جنگ میں الجھیں گے ضرور بلکہ اہل کتاب کے قول کے مطابق ان کی دو تہائی تعداد تباہ ہو جائے گی {۵۸}۔ باقی ایک تہائی یہودیوں کے خاتمہ کا کام عیسیٰؑ کے نزول اور دجال کے قتل کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ کے رسول ﷺ کی جس حدیث میں اس معرکہ کا تذکرہ ہے اس کی عبارت پیش خدمت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> "عنقریب اہل روم امن کی خاطر صلح کر لیں گے، پھر تم ان کے ساتھ مل کر ایسے دشمن سے لڑو گے جو ان کے ورے ہے۔ تم سلامت رہو گے، مال غنیمت حاصل کرو گے۔ پھر تم ایک ٹیلوں والی چراگاہ میں قیام کرو گے، پھر رومیوں کا ایک آدمی کھڑا ہو کر صلیب بلند کرے گا اور کہے گا صلیب غالب آ گئی۔ اس کے بعد ایک مسلمان کھڑا ہو کر اسے قتل کر دے گا۔ رومی عہد توڑ دیں گے۔ پھر خونریز جنگیں ہوں گی۔ وہ تمہارے خلاف اسی (۸۰) جھنڈوں تلے اکٹھے ہوں گے اور ہر جھنڈے تلے ۱۲ ہزار کا لشکر ہو گا"۔ {۵۹}

حدیث کی عبارت سے واضح ہے کہ دو جنگیں ہوں گی۔ پہلی ہرمجدون کی عالمی جنگ ہے۔ یہ وہی جنگ جسے سب جانتے ہیں اور سب اس کے منتظر ہیں۔ دوسرے معرکہ کو "الملاحم" اور بعض روایات میں "الملحمۃ الکبریٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یہ وہی معرکہ ہے جو مسلمانوں اور اہل روم (یورپ

اور امریکا) کے درمیان ہو گا۔ یہ ہر مجھڑون کے بعد اس وقت ہو گا جب اہل روم عہد شکنی کریں گے۔

حواشی

{۱} بخاری نے صحیح میں روایت کیا ہے (۶:۳۶۱) یہ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کی روایت ہے۔ اس کے آغاز میں ہے : "بَلِّغُوا عنّی ولو آیۃً" یعنی میری بات اوروں تک پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

{۲} یہ صحیح حدیث ہے جس کو مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ ص ۷۸، المطبعہ المصریہ

{۳} فتح الباری جلد ۱۱ کتاب الرقاق، باب التواضع، ص ۳۴۳۔ مطبعہ دار الفکر

{۴} اس معرکہ سے متعلق تفصیلی حدیث ان شاءاللہ اپنے مقام پر پیش ہوگی۔

{۵} الروم، یعنی زرد رنگ والے یا عیسائی۔ ہمارے دور میں ان سے مراد امریکا اور یورپ ہے۔

{۶} احمد اور ابوداؤد نے اس روایت کو ذومخمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اسے ابن ماجہ اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے سیوطی نے صحیح قرار دیا ہے اور ناصر الدین البانی نے بھی اسے صحیح الجامع میں صحیح قرار دیا ہے۔

{۷} یہ عبارت ایک مقالہ سے لی گئی ہے جس کا عنوان ہے "واشنگٹن، انقرہ اور اسرائیل"۔ یہ مقالہ استاد محمد عبدالمنعم نے اخبار الاہرام، مورخہ 96-5-12 میں لکھا۔

{۸} ایک مقالہ جس کا عنوان ہے "الولد المطیع" جسے ڈاکٹر مصطفیٰ محمود نے اخبار الاہرام مورخہ 96-5-25 میں لکھا۔

{۹} اس صحیح حدیث کا ایک حصہ ہے جسے مسلم نے حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے۔ احمد نے ابن عباس سے اسے روایت کیا ہے اور البانی نے صحیح میں ۱۳۴۵ کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔

{۱۰} یہ صحیح اور متفق علیہ حدیث کا مضمون ہے جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے۔

{۱۱} حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی صحیح اور متفق علیہ حدیث ہے۔ الترک سے چینی اور روسی اور اڑوس پڑوس کے لوگ مراد ہیں۔ زلف الانوف : چپٹی ناک والے۔ المجان

المطرقہ یعنی چوڑے اور گول چہروں والے۔

{۱۲} دیکھئے فتح الباری، جلد ۱۳، کتاب الفتن، باب خروج النار

{۱۳} احمد اور مسلم نے اسے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ الصحیحہ للالبانی میں نمبر ۲۴۵۷ کے تحت موجود ہے۔

{۱۴} حدیث کا ٹکڑا جس کی تخریج فصل اول کے آغاز میں گزر چکی ہے۔

{۱۵} حدیث کا ٹکڑا جس کی تخریج فصل اول کے آغاز میں گزر چکی ہے۔

{۱۶} اسے بخاری نے اپنی صحیح کے کتاب العلم میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

{۱۷} ابن مسعودؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے متفق علیہ حدیث ہے۔

{۱۸} احمد اور نسائی نے صحیح سند سے بیان کیا ہے، الصحیحہ میں نمبر ا / ۱۳۸ کے تحت موجود ہے۔

{۱۹} بخاری نے صحیح میں بطور معلق ابی عامر اور ابی مالک اشعری سے روایت کیا ہے۔ الصحیحہ میں نمبر ۹۱ کے تحت موجود ہے۔

{۲۰} صحیح حدیث ہے جس کو احمد اور بزار نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ البانی نے الاحادیث الصحیحہ کے سلسلہ میں نمبر ۲۳۹۰ کے تحت درج کیا ہے۔

{۲۱} طیالسی کے نزدیک حضرت انسؓ سے مروی صحیح حدیث ہے، البانی نے الصحیحہ میں نمبر ۲۲۹۲ کے تحت درج کیا ہے۔

{۲۲} بخاری نے اسے صحیح میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ احمد اور ابن ماجہ نے سنن میں روایت کیا ہے۔

{۲۳} اس حدیث جس کا مضمون ہے جس کو ابو نعیم نے حلیہ میں رسول اللہ ﷺ کے غلام ثوبانؓ سے روایت کیا ہے۔

{۲۴} صحیح ہے جسے طبرانی نے ابو امیہ جمحی سے روایت کیا ہے۔ ابن مبارک نے بھی روایت کیا ہے اور البانی نے الصحیحہ میں اسے نمبر ۶۹۵ کے تحت درج کیا ہے۔

{۲۵} صحیح حدیث ہے جسے احمد اور طبرانی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، البانی نے الصحیحہ نمبر ۱۸۸۸ میں اسے درج کیا ہے۔

{۲۶} احمد نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے

{۲۷} اسے بخاری اور نسائی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے

{۲۸} صحیح ہے جسے ابن حبان نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے

{۲۹} صحیح ہے جسے ابوداؤد نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ الصحیحہ میں نمبر ۹۳ کے تحت درج ہے۔

{۳۰} صحیح ہے جسے احمد' نسائی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے انسؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳۱} صحیح ہے جسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

{۳۲} بخاری نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ مسلم اور احمد نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

{۳۳} بخاری' مسلم اور ابوداؤد نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے

{۳۴} مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے۔

{۳۵} ترمذی نے اسے حضرت علیؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

{۳۶} صحیح حدیث ہے جسے طبرانی نے عابس الغفاری سے روایت کیا ہے' البانی نے الصحیحہ نمبر ۹۷۹ کے تحت درج کیا ہے۔

{۳۷} احمد اور طیالسی نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

{۳۸} ابن حبان اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

{۳۹} ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے اور البانی نے الصحیحہ نمبر ۹۵۶ میں درج کیا ہے۔

{۴۰} متفق علیہ حدیث ہے۔ بخاری' مسلم' احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے حذیفہؓ سے روایت کیا ہے۔

{۴۱} بخاری نے اپنی صحیح کے باب الفتن میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور مسلم نے کتاب الفتن میں۔

{۴۲} مسلم نے کتاب الفتن میں جابر سے روایت کیا ہے اور احمد نے مسند میں۔ قفیز اہل عراق کا پیمانہ ہے اور مدی اہل شام کا۔

{۴۳} بخاری نے صحیح میں عوف بن مالکؓ کی روایت سے اور احمد اور طبرانی نے معاذؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ البانی نے الصحیحہ نمبر ۱۸۸۳ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

{۴۴} یعنی ان تین پتھروں میں سے تیسرا پتھر جس پر چولہا رکھا جاتا ہے جس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

{۴۵} دیکھئے مقالہ "دیستورس کے سفر دانیال پر ایک نظر" اور دیکھئے "الوعد الحق والوعد المفتری" ڈاکٹر سفر الحوالی صفحہ ۲۸۔ اور دیکھئے کتاب "النبوءة والسیاسه" کے باب "الانجیلیون العسکریون فی الطریق الی الحرب النوویه" (انجیل کے ماننے والے فوجی ایٹمی جنگ کے راستہ پر) تالیف جریس حالک ترجمہ محمد السماک ص ۴۰۔

{۴۶} النبوءة والسیاسة ص ۵۲۔

{۴۷} مصدر سابق، ص ۴۰۔

{۴۸} بخاری نے صحیح (۶:۳۶۱) میں عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

{۴۹} بخاری نے صحیح کی فصل "الاعتصام بالکتاب والسنة" میں ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔

{۵۰} الوعد الحق والوعد المفتری، صفحہ ۳۱۔

{۵۱} النبوءة والسیاسة، ص ۶۶۔ اس کتاب کے لکھنے والی نے ایک پوری فصل باندھی ہے جس کا عنوان ہے "ریگن اور ہرمجدون کے حقیقی معرکہ کے لئے ہتھیار بندی" اس میں ریگن کے ایسے بے شمار اقوال نقل کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہرمجدون کے قریب الوقوع معرکہ پر یقین رکھتا ہے۔

{۵۲} اورل رابرٹسن کی کتاب "دراما نهایة الزمن" اور حال لینڈز کی کتاب "نهایة اعظم کرة ارضیة"۔ امریکہ کے ان دو مشہور کتابوں کے مصنفین کا مفروضہ یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء یا اس کے قریب قریب کرۂ ارض کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

{۵۳} "الوعد الحق والوعد المفتری" ص ۶۲۔ "النبوءة والسیاسة" ص ۳۷۔

{۵۴} "النبوءة والسیاسة" ص ۵۲۔

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

مسئلۂ ایمان و کفر

قرآن و حدیث کی روشنی میں

مولانا محمد طاسین

ایمان' اسلام اور کفر کا مسئلہ ان مسائل میں نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے جو بدقسمتی سے مسلمان علماء کے درمیان الجھے ہوئے اور امت مسلمہ کے اندر شدید انتشار و افتراق کا باعث بنے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت و یگانگت کو سخت اور ناقابل تلافی ضرر و نقصان پہنچ رہا ہے۔

ایمان' اسلام اور کفر کا مسئلہ جہاں اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے نہایت اہم و نازک مسئلہ ہے وہاں واضح طور پر ایک اختلافی اور نزاعی مسئلہ بھی ہے۔ اس کا بیّن ثبوت کفر کے وہ فتوے ہیں جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے مولویوں اور مفتیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر لگا رکھے ہیں' حالانکہ ہر ایک اپنی جگہ خود کو مومن و مسلم باور کرتا اور دوسرے کے فتوئ کفر کو غلط قرار دیتا اور نہایت نفرت کے ساتھ اس کو رد کرتا اور ٹھکراتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس افسوسناک صورتحال کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان مولوی اور مفتی حضرات کے ذہنوں میں ایمان' اسلام اور کفر کا جو تصور ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف اور جدا ہے۔ لہٰذا یہی کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر ان کے ذہنوں میں مذکورہ الفاظ کا جو مفہوم و مطلب ہے' منتشر اور الجھا ہوا ہے۔ اور پھر چونکہ اس سے مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ علمی بحث و تحقیق کے ذریعے اس انتشار اور الجھاؤ کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔

مسئلہ ایمان و کفر کے متعلق مسلم اہل علم کے ذہنوں میں جو انتشار اور الجھاؤ ہے اس

کے یوں تو بہت سے وجوہ و اسباب ہیں، لیکن میرے نزدیک ان میں سب سے بنیادی اور اہم وجہ اور سبب یہ ہے کہ ایمان اور کفر کی حقیقت جو قرآن و حدیث میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی اس کو پوری توجہ اور کامل غور و فکر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ اس کی بجائے بعض متکلمین اور فقہاء کی تجویز کردہ تعریفوں پر اعتماد کیا گیا جو انہوں نے ایمان، اسلام اور کفر کے متعلق اپنی کتابوں میں تحریر فرمائیں اور جن کے مابین خود بھی کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بنا بریں میرے نزدیک مذکورہ صورتحال کی اصلاح کا صحیح طریقہ اور علاج یہ ہے کہ کفر، ایمان اور اسلام کی شرعی حقیقت کے تعین کے لئے صرف قرآن و حدیث کو معیار بنایا جائے اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جائے کہ ایمان و اسلام اور کفر کا وہ مفہوم و مطلب کیا ہے جس کی بنا پر کوئی شخص مومن و مسلم اور کافر کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے، اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہؓ میں کسی شخص کو کس اعتقاد و عمل کی بنا پر مومن و مسلم اور کس اعتقاد و عمل کی بنا پر کافر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ قرآن و سنت کی کسی ہدایت اور تعلیم کا صحیح مطلب وہی ہو سکتا ہے جو عہد مذکور میں عملی طور پر سامنے آیا۔

ایمان اور کفر کی شرعی حقیقت کے تعین کے لئے قرآن و حدیث کو اصل معیار بنانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ تقریباً سب مسلمان اہل علم اس بات پر متفق و متحد ہیں کہ دینی حقائق اور شرعی امور کا اصل ماخذ و سرچشمہ قرآن و سنتِ رسول ﷺ ہیں، جبکہ باقی ماخذوں کے متعلق ان کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء ان کو شرعی ماخذ مانتے اور بعض دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں۔

اس مضمون میں میرا جو اصل مقصد ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کی تکفیر یعنی ایک دوسرے کو کافر کہنے اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینے کی جو افسوسناک صورتحال ہے اور جس نے ان کے درمیان باہمی نفرت اور عداوت کی فضا قائم کر رکھی ہے اس کو مٹانے اور ختم کرنے کی عملی طور پر کوشش کی جائے تاکہ مسلمانوں کے مابین وحدت و یکجہتی اور اخوت و بھائی چارے کی وہ خوشگوار حالت اور اطمینان بخش فضا پیدا ہو جو ان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے اور جس کا بعض قرآنی آیات میں

تقاضا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے :

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا... الخ ﴾

"(مسلمانو) تم سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو"۔

اس قرآنی آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر سے وہ تمام مادی اور معنوی اسباب مٹانے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے جو ان کے درمیان تشتّت و تفرقہ کا موجب اور باعث بنتے اور باہمی نزاع و جدال کو جنم دیتے ہیں۔ نیز ضروری ہے کہ ان کے درمیان دین اور قرآنی نظام ہدایت کی بنیاد پر محکم اتحاد و یگانگت کی پائیدار فضا قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

اور پھر چونکہ یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تشتّت و افتراق کے پائے جانے والے اسباب میں ایک بڑا اور نمایاں سبب تکفیر کا فتنہ یعنی مختلف فرقوں کا آپس میں ایک دوسرے کو کافر کہنا اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دینا ہے اور باہمی تکفیر کا یہ فتنہ ایک ایسا وبائی فتنہ ہے جس کی زد اور گرفت سے آج کوئی مسلمان محفوظ نہیں ——— کیونکہ ہر مسلمان کا کسی نہ کسی فرقہ سے ضرور تعلق ہوتا ہے جو دوسرے فرقہ کے نزدیک نہ صرف یہ کہ کافر بلکہ مباح الدم اور واجب القتل ہوتا ہے' بلکہ بعض مفتیوں کے ایسے فتوے بھی موجود ہیں جن میں یہ کہا اور لکھا گیا ہے کہ جو شخص فلاں فرقہ اور اس کے فلاں فلاں اشخاص کو کافر نہ سمجھے اور کافر نہ کہے وہ بھی کافر ہے۔ بعض مفتیوں کا یہ بھی دعویٰ اور فتویٰ ہے کہ چونکہ کفر کی وجہ سے فلاں فرقہ کے افراد کے اپنی مسلمان بیویوں سے نکاح فسخ ہو چکے ہیں لہٰذا وہ بدکاری کے مرتکب ہیں' اور ان کی اولاد ناجائز اور حرامی ہے وغیرہ وغیرہ ——— بنابریں نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے درمیان سے فتنہ تکفیر کو مٹانے اور دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ میری یہ تحریر بھی اسی طرح کی ایک اپنی سی علمی کوشش ہے جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا میری سوچ کے مطابق ایمان اور کفر کی شرعی حقیقت' جس کی بنا پر کوئی انسان مومن اور کافر قرار پاتا ہے' کو جاننے اور متعین کرنے کا صحیح طریقہ

یہ ہے کہ صرف قرآن و حدیث کی طرف رجوع کیا جائے اور پورے غور و فکر کے ساتھ یہ پتہ چلایا اور معلوم کیا جائے کہ ان کے اندر اس اہم ترین مسئلہ کے متعلق جو ہدایت و رہنمائی ہے وہ کیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ قرآن و حدیث میں ایمان' اسلام اور کفر کے الفاظ جہاں شرعی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں وہاں بہت سی آیات و احادیث میں لغوی معنوں میں بھی استعمال ہوئے ہیں' جو شرعی معنوں کے ساتھ ضرور کچھ نہ کچھ تعلق اور مناسبت رکھتے ہیں' لہٰذا شرعی معنوں کے بیان سے پہلے ضروری اور مفید ہے کہ ان الفاظ کے لغوی معنوں کی قدرے اختصار کے ساتھ توضیح و تشریح کی جائے۔

عربی لغت کی مستند کتابوں میں لفظ "ایمان" کے متعلق جو لکھا ہے مختصر طور پر وہ یہ ہے کہ ایمان باب اِفعال کا مصدر ہے جس کا مادہ مجرد "امن" ہے جس کی ضد خوف ہے۔ باب افعال کی بعض خاصیات کے پیش نظر' جو کتب صرف میں بیان ہوئی ہیں' ایمان کے معنی بنتے ہیں : دوسرے کو صاحب امن بنا دینا' یا خود صاحب امن ہو جانا' لیکن عربی ادب میں یہ لفظ تصدیق و توثیق کے معنوں میں استعمال ہوا ہے' یعنی کسی کو سچا و صادق سمجھتے ہوئے اس کی بات کو مان لینا یا قابل اعتماد و وثوق باور کرتے ہوئے کسی کے کہے پر چلنا اور اس کی اتباع و پیروی کرنا۔ جب یہ حرف باء کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی اول الذکر اور جب حرف لام کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی ثانی الذکر ہوتے ہیں۔ اور پھر غور سے دیکھا جائے تو جس کی تصدیق و توثیق کی جاتی ہے اسے تکذیب اور بے اعتمادی سے امن دیا جاتا ہے جو ایمان کا اصل بنیادی معنی و مطلب ہے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں لفظ ایمان لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں :

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ...الآیہ ﴾ (النساء : ۵۱)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب الٰہی کا کچھ حصہ دیا گیا' وہ جبت اور طاغوت کی تصدیق کرتے (درست سمجھ کر مانتے) ہیں۔"

جِبت سے مراد بت' جادوگر اور کاہن' جبکہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔

﴿ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ هُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ ۝ ﴾
(النحل : ۷۲)

"کیا پس وہ باطل کو سچ سمجھ کر مانتے اور اللہ کی نعمت کو جھٹلاتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں؟"

﴿ فَبِاَیِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ۝ ﴾ (المرسلات : ۵۰)

"پس اس بات کے بعد وہ کس بات کی تصدیق کریں گے اور سچ سمجھ کر مانیں گے؟"

﴿ قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَـكُمۡ قَدۡ نَـبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ.... الایہ ﴾ (التوبہ : ۹۴)

"کہہ دیجئے تم اپنی صفائی میں کوئی عذر پیش نہ کرو، ہم ہرگز تمہارے عذر کو صحیح نہیں مانیں گے۔ تمہاری بعض خبروں سے اللہ نے ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔"

﴿ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَـكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ يَنۡۢبُوۡعًا ﴾
(الاسراء : ۹۰)

"ہم کبھی آپ کی تصدیق نہیں کریں گے اور آپ کی بات نہیں مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری کر دیں۔"

﴿ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ ﴾ (یوسف : ۱۷)

("حضرت یوسف کے بھائیوں نے اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا) آپ ہماری بات کو سچ ماننے والے نہیں، اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں۔"

مذکورہ بالا قرآنی آیات میں لفظ ایمان لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے جو بعض علماء لغت کے نزدیک مجازی ہیں۔ حقیقی معنی ایمان کے وہ ہیں جو شروع میں بیان کئے گئے ہیں یعنی دوسرے کو امن سے ہمکنار کرنا اور خود امن سے ہمکنار ہونا۔

لفظ اسلام کے لغوی معنوں کے متعلق کتب لغت میں جو کچھ لکھا ہے یہ ہے کہ اسلام باب افعال کا مصدر ہے جس کا مادۂ مجرد سلام و سلامتی ہے۔ اور اس باب افعال کی بعض خاصیات کے پیش نظر اس کے معنی بنتے ہیں : دوسرے کو سلامتی سے ہمکنار کرنا یا خود سلامتی سے ہمکنار ہونا، لیکن کلام عرب میں یہ عام طور پر جس معنی اور مطلب میں استعمال ہوتا ہے وہ ہے خود کو دوسرے کے سپرد کر دینا، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم اور بے چون و

چرا اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرلینا۔

قرآن مجید کی جن آیات میں لفظ اسلام مذکورہ معنوں میں استعمال ہوا اور بولا گیا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہے :

﴿ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ....الآیة ﴾ (البقرہ : ۱۱۲)

"ہاں، جو اپنا چہرہ اللہ کے لئے جھکا دے (اور اپنا سر تسلیم خم کردے) درانحالیکہ وہ نیکوکار ہو تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس بڑا اجر ہے۔"

﴿ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا....الایہ ﴾ (آل عمران : ۸۳)

"پس کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ اللہ کے مطیع و فرمانبردار ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوشی سے یا ناخوشی سے۔"

یعنی ہر چیز فرامین الٰہی اور قوانین فطرت کی پابندی میں مصروف ہے۔

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ ﴾

(البقرہ : ۱۳۱)

"جب اس کو اس کے رب نے کہا کہ مطیع و فرمانبردار بن جا (یا سر تسلیم خم کردے) تو اس نے جواب میں کہا میں مطیع و فرمانبردار ہو چکا اللہ رب العالمین کے لئے (یعنی اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیا)۔"

ان مذکورہ آیات کے نفس ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر لفظ اسلام غیر مشروط فرمانبرداری اور تابعداری کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور چونکہ جو کسی کی بے چون و چرا اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے وہ اس کو اپنی مخالفت اور نافرمانی سے بچاتا اور سلامتی دیتا ہے اور خود بھی اس کی گرفت و ناراضی سے سلامتی حاصل کرلیتا ہے لہٰذا اسلام بمعنی فرمانبرداری کے اندر دوسرے کو سلامتی دینے اور خود سلامتی پانے کے حقیقی معنی بطور لازم پائے جاتے اور موجود ہوتے ہیں۔

ایمان اور اسلام کے لغوی معنوں کی مختصر توضیح کے بعد اب لفظ "کفر" کے لغوی

معنوں کی وضاحت کے متعلق مختصر طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ عربی لغت کی متعدد مفصل کتابوں میں لفظ کفر کے متعلق جو لکھا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کفر کے اصل معنی کسی چیز کو چھپانے اور پردہ وغیرہ سے ڈھانپ دینے کے ہیں' مثلاً جب کوئی آدمی اپنی کسی شے کو کسی ظرف اور برتن وغیرہ میں بند کر کے چھپا دے تو کہا جاتا ہے : "قَدْ كَفَرَ الرَّجُلُ مَتَاعَهُ" آدمی نے اپنی متاع یعنی فائدہ اٹھانے کی چیز کو چھپا دیا۔ اسی طرح کلامِ عرب میں بہت سی ایسی چیزوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے جن میں چھپا دینے کا وصف پایا جاتا ہے' جیسے ظلمت و تاریکی' اندھیری رات' دریا' کالے بادل' زمین کی مٹی' کاشتکار' وہ زرہ پوش سپاہی جس نے دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے اپنی زرہ پر کپڑا لپیٹ رکھا ہو۔ ان سب کے لئے لفظ "کافر" استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی اور اندھیری رات بے شمار چیزوں کو دیکھنے والوں کی نگاہ سے چھپا دیتی ہے' دریا اپنے پانی میں مچھلیوں وغیرہ اور بکثرت اشیاء کو چھپائے ہوتا ہے' زمین کے اندر مختلف قسم کی لاتعداد چیزیں مدفون و مستور ہوتی ہیں' کاشتکار بیج و تخم کو بونے کے لئے زمین میں چھپا دیتا ہے' اور کالے بادل سورج چاند ستاروں کو چھپا دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی بعض آیات میں بھی کفر کے لئے ظلمت و تاریکی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' جیسے سورۃ البقرہ کی یہ آیت :

﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوٓا أَوۡلِيَآءُ هُمُ ٱلطَّـٰغُوتُ يُخۡرِجُونَهُم مِّنَ ٱلنُّورِ إِلَى ٱلظُّلُمَـٰتِ ﴾ (آیت : ۲۵۷)

"اور جن لوگوں کے دوست طاغوت یعنی شیطان وغیرہ ہیں وہ ان کو نور سے نکالتے اور اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں"۔ (یعنی کفر میں مبتلا کر دیتے ہیں)

یا جیسے سورۂ ابراہیم کی یہ آیت :

﴿ كِتَـٰبٌ أَنزَلۡنَـٰهُ إِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ ٱلنَّاسَ مِنَ ٱلظُّلُمَـٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ ﴾ (آیت : ۱)

"یہ قرآن مجید ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالو۔" (یعنی کفر سے ایمان کی طرف)

عربی کلام میں "کفر" کے مادے "ک ف ر" پر مشتمل دوسرا لفظ "کفران" بھی کافی استعمال

ہوا ہے جس کے معنی احسان اور نعمت کی ناشکری و ناقدری کے ہیں۔ اس میں بھی غور سے دیکھا جائے تو چھپانے کا وصف پایا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جو شخص کسی کے احسان اور اس کی دی گئی نعمت کی ناشکری کرتا ہے وہ دراصل اس کو چھپاتا اور اس پر پردہ ڈالتا ہے اور جو شکر کرتا ہے وہ اس احسان و انعام کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں لفظ کفران اور اس سے مشتق الفاظ اور صیغے ناشکری کے لئے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ ان میں سے چند آیات ملاحظہ فرمایئے :

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝ ﴾ (ابراہیم : ۷)

"اگر تم ہماری نعمتوں کا شکر کرو گے تو ہم ضرور بالضرور ان کو زیادہ کر دیں گے، اور اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو (ناشکروں کے لئے) میرا عذاب بہت ہی سخت ہے"۔

﴿ قَالَ هَٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۝ ﴾ (النمل : ۴۰)

"(حضرت سلیمان علیہ السلام نے) کہا یہ میرے رب کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور پھر جو (نعمت ملنے پر) شکر کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کے لئے ہوتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے اس کو جاننا چاہئے کہ (وہ اللہ کا کچھ نہیں صرف اپنا بگاڑتا ہے، کیونکہ) میرا رب (بندے کے شکر سے) غنی و بے نیاز اور بڑا کریم ہے۔"

سورۃ البقرہ کی آیت ہے :

﴿ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝ ﴾ (آیت : ۱۵۲)

"اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری سے بچو۔"

ان مذکورہ تین آیات میں کفر بمعنی نعمت کی ناشکری کے لئے استعمال ہوا ہے جسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے، اور جو منعم کی نعمت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کے اخفاء پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح لفظ کفر عربی زبان میں انکار اور جحود کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جو شخص دوسرے کے حق کو دینے سے انکار کرتا ہے کہا جاتا ہے کہ "کـافـره حـقّـه" قرآن حکیم کی جن آیات میں لفظ کفر انکار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ان میں سے ایک سورۃ القصص کی یہ آیت ہے: "قَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○" فرعونیوں نے کہا ہم ان سب باتوں کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور پھر غور سے دیکھا جائے تو کفر بمعنی انکار میں بھی ستر اور چھپانے کے معنی موجود ہوتے ہیں' کیونکہ جو شخص کسی موجود حقیقت اور واقعی شے کا انکار کرتا ہے وہ اس کو چھپانے کا مرتکب ہوتا ہے۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ کاف فاء راء (ک ف ر) کے حروف جتنے الفاظ میں پائے جاتے ہیں ان سب میں ستر اور چھپانے کا مفہوم قدر مشترک کے طور پر موجود ہوتا اور پایا جاتا ہے گو بطور لزوم ہو۔

لفظ ایمان' لفظ اسلام اور لفظ "کفر" کے لغوی معنوں کی توضیح کے بعد اب میں ان الفاظ کے شرعی اور اصطلاحی معنی و مطلب کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جو اس تحریر کا اصل مقصد ہے' اور چونکہ ان الفاظ کا شرعی طور پر صحیح مفہوم و مطلب صرف وہ ہو سکتا ہے جو شریعت کے حقیقی ماخذ قرآن و حدیث میں مذکور ہو' لہٰذا میری یہ کوشش ہو گی کہ ان الفاظ کی شرعی حقیقت کے متعلق جو کچھ عرض کیا جائے قرآن و حدیث سے عرض کیا جائے۔

ایمان' اسلام اور کفر کی شرعی حقیقت کو جاننے اور معلوم کرنے کے لئے جب قرآن مجید اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے تو چند باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ ایمان کی اصل حقیقت اور جوہری ماہیت چند مخصوص عقائد ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب اور دل سے ہے نہ کہ زبان کے کچھ اقوال سے اور نہ جسم و بدن کے خاص اعمال سے۔ چنانچہ جس کے قلب و دل میں وہ مخصوص عقائد یا اعتقادات موجود نہ ہوں وہ عند اللہ اور حقیقی طور پر مومن نہیں ہوتا خواہ وہ زبان سے کتنا ہی ایمان کا دعویٰ کرے اور کتنے ہی زیادہ لوگ اس کو مومن سمجھتے اور کہتے ہوں۔

قرآن مجید کی جن آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقتِ ایمان کا تعلق نہ زبان کے

الفاظ سے ہے اور نہ بدن کے اعمال سے بلکہ صرف قلبی عقائد سے ہے ان میں سے بطور مثال چند آیات ملاحظہ فرمائیں :

۱۔ ﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ....الآیۃ ﴾ (الحجرات : ۱۴)

"دیہاتی گنوار قسم کے لوگوں نے کہا ہم ایمان لے آئے۔ آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے، کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"

۲۔ ﴿ وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (المائدہ : ۴۱)

"اور آپ کو رنجیدہ نہ کریں وہ لوگ جو جلدی کرتے ہیں کفر اختیار کرنے میں، ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے مونہوں اور زبانوں سے کہا ہم ایمان لائے حالانکہ ان کے قلوب اور دل ایمان نہیں لائے۔"

۳۔ ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ (الحجرات : ۷)

"اور لیکن اللہ نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب شے بنایا اور تمہارے قلوب کو اس سے مزین و آراستہ فرمایا۔"

۴۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ ﴾ (المجادلہ : ۲۲)

"یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو نقش کر دیا۔"

۴۔ ﴿ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ ﴾ (النحل : ۱۰۶)

"مگر وہ شخص جس کو زبردستی کلمہ کفر کہنے پر مجبور کر دیا گیا لیکن اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن رہا۔"

قرآنی آیات کے بعد اب اس بارے میں کچھ احادیث نبویہ ملاحظہ فرمائیں : ایک صحیح حدیث جو صحاح ستہ میں ہے، کے الفاظ یہ ہیں :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : یَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْاِیْمَانِ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جہنم سے ضرور نکالا جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان تھا۔"

مسند احمد میں ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

الاسلامُ عَلانیۃٌ والایمانُ فِی القَلبِ

"اسلام علانیہ اور ظاہری چیز ہے (جو دیکھنے میں آتی ہے) اور ایمان دل میں پوشیدہ ہوتا ہے (جو باطنی حقیقت ہے)۔"

صحاحِ ستّہ میں حضرت اسامہ بن زید؄ کے حوالے سے جو حدیث ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا محل و مستقر انسان کا قلب اور دل ہے۔ اس حدیث کا مضمون کچھ اس طرح ہے۔ ایک موقع پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو' جس نے زبان سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا تھا' اس شبہ میں قتل کر دیا کہ اس نے دل سے نہیں بلکہ اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا ہے اور ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ؐ نے حضرت اسامہ؄ کو مخاطب کر کے سختی کے ساتھ فرمایا: "ھَل شَقَقْتَ قَلْبَہٗ" کیا تم نے اس کا قلب چیر کر دیکھ لیا تھا کہ اس کے اندر ایمان نہیں' اور وہ دعویٔ ایمان میں جھوٹا ہے۔

اس بارے میں قرآن حکیم کی وہ آیات بھی پیش کی جا سکتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے زبانی دعویٔ ایمان کے باوجود ان کے مومن ہونے کی قطعی طور پر نفی کی ہے۔ اس وجہ سے کہ ان کے دلوں اور قلوب کے اندر ایمان نہ تھا۔ ایسی آیات قرآن مجید کے اندر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ بطور مثال سورۃ البقرہ کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیں:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (آیت: ۸)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے' حالانکہ وہ وہ بالکل ایمان لانے والے (مومن) نہیں۔"

گویا اللہ کے ہاں بندے کے جس ایمان کا اعتبار اور اخروی نجات و فلاح کا جس ایمان پر دارومدار ہے وہ صرف قلبی ایمان ہے' جس کا قطعی علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ علیمٌ بذات الصدور ہی کو ہو سکتا ہے' دوسرے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ دوسرے انسانوں

کو کسی انسان کے ایمان کا علم ہو سکتا ہے تو صرف اس انسان کے قول و عمل سے ہو سکتا ہے جس میں صدق و کذب اور سچ و جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا وہ علم قطعی نہیں محض ظنی ہوتا ہے جس کی بنا پر کسی کو قطعی طور پر مومن نہیں کہا جا سکتا۔

حقیقت ایمان کے متعلق جو دوسری چیز قرآن و حدیث کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان جن قلبی عقائد کے مجموعہ کا نام ہے وہ پانچ ایسے مابعد الطبیعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ظاہری حواس خمسہ سے ادراک نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ ماورائے محسوسات اور غیبی حقائق ہیں جن کا علم انسان کو صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک خاص انسان کو براہ راست وحی کے ذریعے اور باقی عام انسانوں کو اس خاص انسان کے بیان سے بالواسطہ طور پر حاصل ہوتا ہے جس کے صادق اور سچا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

جن مابعد الطبیعی اور ماوراءِ محسوسات غیبی حقائق کے اعتقادِ قلبی اور ایقانِ ذہنی کا نام ایمان ہے ان میں سے پہلی حقیقت جس کو بنیادی اور اساسی حقیقت کہا جا سکتا ہے اللہ کی ذات ہے ایسی جو تمام جمالی و جلالی صفات سے کامل اور دائمی طور پر متصف ہے، جن کے تصور اور شعور سے انسان کے اندر محبت و چاہت کا جذبہ نیز رعب و خوف کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اور یہ جذبہ اس کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس صاحب جمال و جلال کی رضا و خوشنودی کی خاطر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ قرآن و حدیث میں اللہ کے جمالی اور جلالی صفات کا ہر ہر آیت میں بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جس کا انسانی ذہن متحمل ہو سکتا تھا۔ اس مختصر مضمون میں ظاہر ہے کہ وہ تفصیل تو پیش نہیں کی جا سکتی البتہ سورۃ الفاتحہ کی روشنی میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کائنات جس میں انسان بھی ایک جزء کی حیثیت سے شامل ہے، اس کو عدم سے وجود میں لانے اور پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔ وہی کائنات کی ہر شے اور ہر جاندار کی حیات و بقا اور نشو و نما کے لئے سامان مہیا کرنے اور انتظام فرمانے والا رب اور پروردگار ہے۔ انسانوں کو جو بے شمار اور گوناگوں نعمتیں حاصل ہیں وہ اس کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کا نتیجہ اور اس کے فضل و کرم کا کرشمہ ہیں۔ انسانی اعمال و افعال کے لئے جزاء و سزا کا جو بے لاگ اور محکم نظام ہے وہ اس کی

صفتِ عدل کا نتیجہ ہے۔ عالم کون و مکاں اور دنیائے انسانیت میں جو تغیرات و تبدلات ہوتے ہیں اور مختلف قسم کے حالات و کوائف وجود میں آتے ہیں وہ اس اللہ تعالیٰ کی مشیت اور عالمگیر اجتماعی منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتا، دیکھتا اور ہر شے پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ بنی نوع انسان کی دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کے لئے جس مادی و روحانی سرو سامان کی ضرورت تھی اس کی صفت رحمت اور صفتِ ربوبیت نے وہ سب مادی و روحانی سرو سامان انسان کے لئے دنیا میں بڑی فراوانی کے ساتھ مہیا کر رکھا ہے۔ اسی کے ہاتھ اور اختیار میں انسان کا فائدہ و ضرر اور نفع و نقصان ہے، لہٰذا انسانوں کی ہر عبادت و بندگی کا تنہا وہی مستحق ہے۔ اس کے سوا اور کوئی بندوں کی کسی عبادت و بندگی کا اہل و حقدار نہیں۔ بہر حال اللہ پر ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سب صفات پر ایمان ہو جو قرآن حکیم کے اندر بیان ہوئے ہیں اور جن پر ننانوے اسماءِ حسنیٰ دلالت کرتے ہیں۔

دوسرا عقیدہ جو ایمان کی شرعی حقیقت کے لئے ضروری ہے وہ ملائکہ کے وجود کا عقیدہ ہے، یعنی اللہ کی ایک ایسی مخلوق کے وجود کا عقیدہ رکھنا جس کے مشاہدہ سے ہماری نگاہیں قاصر ہیں۔ قرآن مجید میں ملائکہ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ سراپا خیر و بھلائی ہیں، شر و بدی کی ان کے اندر سرے سے صلاحیت ہی نہیں۔ وہ ہمہ وقت اللہ کی حمد و ثناء کرتے اور اس کی تقدیس اور تہلیل میں مصروف رہتے اور زمین والوں کے لئے استغفار کرتے اور مغفرت مانگتے اور چاہتے ہیں۔ کائنات کے نظام کو قائم رکھنے اور چلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جو مختلف قسم کے اعمال و امور سونپ رکھے اور جو ذمہ داریاں ان کے لئے مقرر فرمائی ہیں ان کو بے چون و چرا انجام دینے میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، اور کبھی اس میں سستی و کاہلی نہیں برتتے۔ انسانوں اور جنوں کی طرح ان کے اندر ذکور و اناث کی تقسیم نہیں۔ وہ سب یکساں و برابر ہیں۔ غیر مادی اور روحانی مخلوق ہونے کی وجہ سے ان کے اندر کسی طرح کی کوئی مادی خواہشات نہیں۔ ان کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے نبیوں و رسولوں کے درمیان واسطہ بن کر اللہ کے پیغامات و رسالات نبیوں اور پیغمبروں تک پہنچاتے اور ان سے مخاطب ہو کر کلام کرتے ہیں، وغیرہ

وغیرہ۔

تیسرا عقیدہ جو قرآن و حدیث کے مطابق ایمان کی شرعی حقیقت کا لازمی جزء ہے آسمانی کتابوں کا عقیدہ ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے رسولوں پر جو کتابیں نازل فرمائیں وہ سب صحیح اور برحق تھیں اور یہ کہ ان میں کی آخری کتاب جو ان پہلی سابقہ کتابوں کے جملہ بنیادی مضامین اور مشمولات پر مشتمل اور جامع کتاب ہے وہ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید تمام سابقہ کتب سماویہ کے لئے مُصَدِّق و مُھَیْمِن کی حیثیت رکھتا اور ان کی تصدیق و نگہبانی کرتا ہے۔ اس کے اندر ہدایت کا وہ سب سامان یکجا موجود ہے جو سابقہ کتب میں متفرق طور پر موجود تھا' لہٰذا قرآن مجید پر ایمان رکھنا گویا سابقہ تمام کتب پر ایمان رکھنا' اور قرآن مجید کا انکار اور اس سے کفر کرنا جملہ سابقہ کتب سماویہ کا انکار اور ان سے کفر کرنا ہے۔ اور پھر یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ سوائے قرآن مجید کے باقی کوئی آسمانی کتاب آج اپنی اصل شکل میں محفوظ اور موجود نہیں۔ قرآن حکیم کی حفاظت کے لئے اللہ رب العزت نے اسباب کے ذریعے جو عجیب و غریب انتظام فرمایا ہے ان میں سے اہم ترین سبب حفاظ کے سینوں اور حافظوں میں اس کا مِن و عَن اور حرف بحرف محفوظ ہو جانا ہے۔ نزول قرآن کے بعد ہر زمانے میں مسلمانوں کے اندر بے شمار ایسے حفاظ کرام موجود رہے ہیں جن کو قرآن مجید از اول تا آخر زیر زبر کے ساتھ لفظ بلفظ ازبر اور یاد رہا۔ قرآن مجید اگر محض کتاب کی شکل میں ہوتا تو مرور زمان کے ساتھ اس کے اندر کچھ تغیر و تبدل رونما ہو جانا غیر ممکن نہ تھا۔ بہرحال یہ ایک امرواقعہ ہے کہ کتب سماویہ میں سے قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا' لہٰذا وہ پوری طرح محفوظ ہے۔

چوتھا قلبی اعتقاد جو ایمان کی شرعی حقیقت کے لئے لازمی اور حقیقی جزء کی حیثیت رکھتا ہے رسولوں کے متعلق اعتقاد ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے خود ان ہی میں سے بعض انسانوں کو نبوت و رسالت کی روحانی صفت سے نوازا اور وحی کے ذریعے ان کو ایسے صحیح اور اچھے عقائد و اعمال سے بھی آگاہ

کیا جو انسان کی دنیوی اور اخروی نجات و سعادت اور فوز و فلاح کے لئے ضروری تھے اور ان غلط اور برے عقائد و اعمال سے بھی باخبر و مطلع کیا جو انسان کی دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کے منافی تھے' اور ان پر لازم و فرض ٹھہرایا کہ وہ اپنی اپنی قوم میں تبلیغ کریں اور لوگوں کو مبشر اور منذر کی حیثیت سے یہ بتلائیں کہ صحیح و صالح عقائد و اعمال کی دنیا و آخرت میں جزاء کیا اور غلط و فاسد عقائد و اعمال کا انجام بد کیا ہے۔ چنانچہ ہر نبی و رسول نے اپنے اس مقدس فریضہ کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا' نیز کتاب اللہ میں حیات انسانی کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں سے متعلق جو ہدایات و تعلیمات تھیں اپنے قول و عمل سے یہ بتلایا اور واضح کیا کہ نظری اور عملی طور پر ان کا مدعا اور مطلب کیا ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق نبیوں اور رسولوں کا یہ مقدس سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور بالآخر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل اور ختم ہوا۔ بعض احادیث نبویہ کے مطابق ان انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے اندر مبعوث اور جلوہ افروز ہوئے۔ قرآن مجید میں صرف ستائیس انبیاء کے ناموں کا ذکر ہے باقی کے اسماء گرامی کا ذکر نہیں' البتہ قرآن مجید میں مسلمانوں کے لئے یہ تعلیم اور تاکید ہے کہ وہ قلبی اعتقاد کے ساتھ زبان سے اس کا اظہار کریں کہ ہم بلا کسی تفریق و تمیز سب نبیوں اور رسولوں کو برحق سمجھتے اور مانتے ہیں جو دنیائے انسانیت کی کسی قوم میں کسی ملک اور کسی وقت میں مبعوث ہوئے۔ اس میں اجمال ہی ممکن اور کافی ہے' تفصیل ضروری نہیں۔

آخری نبی و رسول حضرت محمد ﷺ کے متعلق قرآن مجید میں واضح طور پر فرمان الٰہی ہے کہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ فرمایا: "وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ "۔ لہٰذا ایمان کی شرعی حقیقت کے متحقق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قلب و دل میں حضرت محمد ﷺ کے رسول اللہ اور خاتم النبیین ہونے کا پختہ اعتقاد و یقین ہو' جس کا عملی اور معروضی طور پر مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب قرآن مجید کو اللہ کی کتاب تسلیم کیا جائے اور اس کی ہدایات پر چلا اور عمل کیا جائے۔ نیز حضرت محمد ﷺ نے اپنے قول و عمل سے قرآن مجید کی ہدایات و تعلیمات کا

جو مطلب بیان کیا اور ظاہر فرمایا ہے اس کو دین کا لازمی جزء سمجھتے اور ناقابلِ تنسیخ باور کرتے ہوئے اتباعِ سُنّتِ رسول کے جذبہ سے اس پر عمل پیرا ہوں اور پوری طرح اس کی پابندی کرنا' بالفاظِ دیگر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے جو شریعت پیش فرمائی اس کو کامل اور آخری شریعت سمجھ کر اس کی پیروی و پابندی کرنا اور دوسرے کسی کو اس کے اندر کسی ردّ و بدل اور ترمیم و تنسیخ کرنے کا اہل اور مستحق نہ سمجھنا' دراصل آپ کو خاتم النبیین ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ اس کا لازمی مطلب یہ کہ جو شخص شریعتِ محمدیہ کو حق اور آخری طور پر کامل شریعت نہ مانتا اور اس پر عمل نہ کرتا ہو اور ساتھ ہی کسی دوسرے انسان کے متعلق یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ اس کو شریعتِ محمدیہ میں ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کا حق اور اختیار ہے ایسا شخص حقیقت میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کو نہیں مانتا۔ اگرچہ زبان سے وہ اس کا کتنا ہی اقرار اور اظہار کرتا ہو۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص زبان سے تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار و اظہار کرتا ہو لیکن عملی طور پر اس کی ہر عبادت صرف اللہ کے لئے نہ ہو بلکہ اس میں غیر اللہ کو بھی شریک کرتا ہو' جو صفات اللہ کی ذات سے مختص ہیں مخلوق میں سے کسی کے لئے ان میں سے کوئی صفت مانتا ہو ایسے شخص کا زبان سے توحید کا اقرار بے معنی اور غیر معتبر ہوتا ہے کیونکہ حقیقتِ واقعہ کے لحاظ سے وہ موحد نہیں ہوتا۔ مختصر الفاظ میں مطلب یہ کہ ہر قلبی اعتقاد اور لسانی اقرار کا خارج میں ایک معروضی اور واقعی مفہوم و مطلب ہوتا ہے' اگر وہ موجود ہو تو اعتقاد و اقرار کی تصدیق ورنہ تکذیب ہو جاتی ہے۔

ایمان کی شرعی حقیقت کے تحقق کے لئے جس پانچویں قلبی اعتقاد کا وجود ضروری ہے وہ حیات بعد الممات اور حشر و نشر اور اخروی جزاء و سزا اور ثواب و عقاب کا اعتقاد ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اخروی زندگی میں اپنے اچھے برے اعمال کی پوری جزاء و سزا پانے کا اعتقاد نہ رکھتا اور جنت دوزخ کا منکر ہو وہ شرعی طور پر مومن نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں تقریباً ایک سو چالیس مرتبہ مختلف سیاق و سباق میں اس انداز سے ذکر ہے کہ اس پر ضرور ایمان ہونا چاہئے۔ کثیر التعداد آیات میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ بعض آیات میں ایمان باللہ کے ساتھ

ایمان بالرسول کا اور بعض آیات میں ایمان باللہ کے ساتھ ملائکہ' کتب' رسل اور یوم الآخر کا یکجا ذکر ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ میں ہے :

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ.....الآية ﴾

"لیکن نیکی اس کی نیکی ہے جو اللہ کے متعلق ایمان رکھتا اور یوم آخر' ملائکہ' کتاب اور نبیوں کے متعلق بھی ایمان رکھتا ہو۔"

اور چونکہ ایمان باللہ میں اللہ کی بعض صفات پر ایمان لازم آتا ہے کہ ملائکہ' کتابوں' رسولوں اور آخرت پر ایمان ہو۔ مطلب یہ کہ اللہ کی صفتِ رحمت' صفتِ ربوبیت' صفتِ ہدایت اور صفتِ عدالت کا تقاضا ہے کہ جس طرح یہاں دنیا میں بنی نوع انسان کی خیر و بھلائی اور فلاح و بہبود کے لئے اس کی مادی اور جسمانی ضرورتوں کا عجیب و غریب نظام اور سامان موجود ہے اسی طرح اس کی روحانی اور اخروی ضرورتوں کا سامان اور انتظام بھی ضرور موجود ہو جس پر اس کی حقیقی اور دائمی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے۔ روحانی ضرورتوں کا سامان موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ان روحانی امور و اعمال کا علم ہو جن کو قبول و اختیار کرنے سے اس کو روحانی اور اخروی فوز و فلاح اور سعادت و کامرانی نصیب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت' ربوبیت اور ہدایت سے بذریعہ ملائکہ' کتب سماویہ اور رسولوں و نبیوں کے وہ روحانی سامان مہیا فرمایا۔ بنا بریں ملائکہ' کتابوں اور رسولوں پر ایمان گویا اللہ تعالیٰ کی مذکورہ صفات پر ایمان ہے۔ اسی طرح ان کے انکار سے مذکورہ صفاتِ الٰہیہ کا انکار لازم آتا ہے اور ایمان باللہ کی نفی ہو جاتی ہے' علیٰ ہذا القیاس۔ اخروی زندگی اور اس میں کامل جزاء و سزا ہونے پر ایمان در اصل اللہ کی صفت عدالت پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور آخرت کا انکار۔ اللہ کی صفت عدالت کے انکار کو مستلزم ہے جس کا "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" اور "اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْن" میں بیان ہے۔

سطور بالا میں جو عرض کیا گیا اس سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ ایمان کی شرعی حقیقت جن مذکورہ پانچ ایمانی عقائد سے متحقق ہوتی ہے معنوی طور پر وہ آپس میں لازم و ملزوم کی طرح مربوط ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار حقیقتِ ایمان کی نفی کر دیتا ہے۔ (جاری ہے)

یادداشت بنام وزیر اعظم پاکستان

یہ یادداشت ۲۴ مئی کو تنظیم اسلامی کے وفد کی جانب سے جس کی قیادت امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کر رہے تھے' وزیر اعظم سیکرٹریٹ اسلام آباد میں وزیر اعظم سے ملاقات کے موقع پر پیش کی گئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بخدمت گرامی میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم پاکستان

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

محترم میاں صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس وقت جو حیثیت عطا فرمائی ہے وہ ایک جانب بہت بڑا اعزاز و اکرام ہے تو دوسری طرف اتنی ہی بڑی آزمائش اور امتحان بھی ہے۔

محترم میاں صاحب! اس حقیقت کا آپ کو تو خود ایک بار تجربہ ہو چکا ہے کہ حکومت و اقتدار ہرگز کوئی مستقل اور دائمی چیزیں نہیں ہیں۔ بقول اقبال : "جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہو گا' یہی ہے ایک حرف محرمانہ"۔ لہٰذا! اس مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی ریاست یا بالفاظ دیگر نظام خلافت کے لئے دستور سازی کا جو عمل قرارداد مقاصد سے شروع ہوا تھا' اسے جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچا کر برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے اس عمل کو "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل" کے مصداق صحیح رخ پر ڈال دیجئے' جو حضرت مجدد الف ثانی سے علامہ اقبال تک کے چار سو سالہ عمل تجدید و احیاءِ دین پر مستزاد مسلمانانِ ہند کی نوے سالہ قومی مساعی جن کو بالآخر قائداعظم محمد علی

جناح کی زیرک اور ولولہ انگیز رہنمائی اور لاکھوں مسلمانوں کی جانوں اور ہزارہا خواتین کی عصمتوں کی قربانیوں نے قیام پاکستان کی منزل تک پہنچایا تھا۔ تاکہ ایک جانب آپ اللہ اور رسول ﷺ کے محبوب بن جائیں اور دوسری جانب مسلمانان پاکستان ہی نہیں اسلامیان عالم کی آنکھوں کا تارا بن جائیں!

محترم میاں صاحب! پاکستان کے دستور میں اگرچہ ایک جانب اسلامی ریاست اور نظام خلافت کے جملہ دستوری تقاضے بتمام وکمال موجود ہیں لیکن دوسری جانب انہیں بالکل غیر موثر اور پابند سلاسل کرنے والی دفعات بھی موجود ہیں۔ اب اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر اور ایک جرات مومنانہ کے ساتھ صرف چند لفظی ترامیم سے سلطنت خداداد پاکستان کو کم از کم دستوری سطح پر اس عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نقطہ آغاز بنایا جا سکتا ہے جس کے عالمی سطح پر قیام کی نوید جاں فزا نبی اکرم ﷺ کی صحیح احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اور وہ لفظی ترامیم حسب ذیل ہیں :-

۱۔ الحمدللہ کہ ہمارے دستور میں "قرارداد مقاصد" دفعہ ۲۔ الف کی حیثیت سے موجود ہے جو اصولی اعتبار سے اسلامی ریاست یا نظام خلافت کے پورے اساسی فلسفے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس کے ضمن میں صرف اس چند لفظی صراحت کی مزید ضرورت ہے کہ "یہ قرارداد پورے دستور پر کلی طور پر حاوی ہو گی"۔

۲۔ دفعہ ۲۲۷ الف کو اس تشریح کے اضافے کے ساتھ کہ "قرآن اور سنت رسولؐ کو پاکستان کے اعلیٰ ترین قانون کی حیثیت حاصل ہو گی" دفعہ ۲ ب کی حیثیت سے قرارداد مقاصد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔

۳۔ دفعہ ۴۵ میں یہ صراحت کی جائے کہ صدر مملکت اس دفعہ کے تحت حاصل شدہ اختیار کو شرعی حدود کے ضمن میں شریعت اپیلٹ بنچ آف سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلوں میں کسی کمی یا تبدیلی کے لئے استعمال نہیں کر سکیں گے۔

۴۔ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلٹ بنچ کے سلسلے میں ضروری ہے کہ :-

(ا) ان کے جج صاحبان کی شرائط ملازمت کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج

صاحبان کے مساوی بنایا جائے۔

اور

(ii) ان میں مستند اور جید علماء کی معتدبہ تعداد کی شمولیت لازمی بنائی جائے۔ (اس سلسلے میں خالص فنی اصطلاحات اور دستوری دفعات کے حوالوں کے ساتھ مطلوبہ ترامیم اس عریضے کے ساتھ منسلک ہیں)۔

۵۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل ایک غیر ضروری ادارہ ہے۔ اسے ختم کرکے اخراجات کی بچت کی جائے۔ گویا دستور کی دفعہ ۲۲۷ کی شق (i) اور (iii) کے علاوہ دستور کے پورے حصہ نہم کو ختم کردیا جائے۔

جہاں تک ملکی معیشت کو سود کی لعنت سے پاک کرکے اللہ اور رسولؐ سے جنگ بند کرنے کا سوال ہے جس کا اعلان بحمد اللہ خود آپ بھی اپنے نشری خطاب میں علی رؤس الاشہاد کر چکے ہیں' درج ذیل دو صورتوں میں سے ایک کو فوری طور پر اختیار کرلیا جائے :-

(i) فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر شدہ اپیل واپس لے کر فیڈرل شریعت کورٹ ہی سے اس کے فیصلے کی تعمیل کے لئے ایک سال کی مزید مہلت کی درخواست کی جائے۔

(ii) سپریم کورٹ میں دائر شدہ اپیل کی فوری سماعت کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لئے اپیلیٹ بنچ فی الفور تشکیل دیا جائے۔ اور اس کی سماعت کے دوران متبادل نظام کی تدوین کی مساعی جاری رکھی جائیں تاکہ اپیل کے فیصلے کے بعد تعمیل کے لئے کسی مزید مہلت کی ضرورت نہ ہو۔

برائے مرکزی مجلس عاملہ تنظیم اسلامی پاکستان

(ڈاکٹر اسرار احمد)

امیر تنظیم اسلامی

۲۴/ مئی ۱۹۹۷ء

انا للہ وانا الیہ راجعون

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق استاد نامور محقق و معروف عالم دین جناب حافظ احمد یار قضائے الٰہی سے ۱۵/ مئی رات گیارہ بجے انتقال فرما گئے ہیں۔ مرحوم اسلامی علوم و فنون کے ایک ماہر کے طور پر نمایاں مقام کے حامل تھے۔ آپ "لغات و اعراب قرآن" کے نام سے ایک گراں قدر تحقیقی کام میں اپنی وفات تک مشغول رہے جو انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ "حکمت قرآن" میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے ساتھ ان کی وابستگی بہت پرانی اور نہایت گہری تھی۔ مرحوم ایک طویل عرصہ قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج لاہور میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ حافظ احمد یار مرحوم کی نماز جنازہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ کے بعد پڑھائی جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مرحوم کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق قرآن اکیڈمی کے قریب ماڈل ٹاؤن (مڑھیاں) کے قبرستان میں کی گئی۔ امیر تنظیم اسلامی نے مرحوم کی اسلام اور خصوصاً قرآنی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا اور مرحوم کے پس ماندگان سے تعزیت کا اظہار کیا۔

ضرورت رشتہ

اے اسلام !
تو عورتوں کا سب سے بڑا محسن ہے

پروفیسر ثریا بتول علوی

اے اسلام تیرا نام و لقب کتنا پیارا، دلکش اور کیسا حسین و جمیل ہے۔ سراپا تسلیم و نیاز، ہمہ تن اطاعت و انقیاد، سرتاپا رضا جوئی و خدا ترسی، تو ایک لازوال حقیقت ہے۔ تو سرمدی صداقتوں کا گنجینہ، انوار الٰہی کا خزینہ، رحمت الٰہی کا محرم، رحمان شناس، خدا ترسی کا زینہ اور کائنات کی وسیع و عریض پہنائیوں کا امین ہے۔

اے اسلام! تو اپنے نام لیواؤں پر اتنی برکات نازل کرتا ہے، اپنے قائلین کو بے بہا انعامات سے نوازتا ہے، اپنے معتقدین کو دین و دنیا کی فوز و فلاح کی ضمانت دیتا ہے، ان کی دنیوی زندگی میں حسن و رعنائی پیدا کرتا ہے اور ان کی عاقبت کو نکھارتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں جولانیاں دکھانے کے بعد، جستجوئے حقیقت میں سرگرداں رہنے کے بعد دریائے حقیقت میں غرق ہو کر میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ اے اسلام، جو بہار میں نے تیرے گلستان میں دیکھی، جو عروج مجھے تیرے سائے میں حاصل ہوا، جن صداقتوں کو میں نے تیری پناہ میں آنے کے بعد پایا، جو احسانات تو نے مجھ پر نازل کئے، وہ مجھے دنیا کے کسی نظام حیات، کسی طرز فکر، کسی تمدن اور کسی دین و مذہب کے سائے میں حاصل نہ ہوئے تھے۔

(۱) میں ایک گم کردہ راہ مسافر تھی، جسے اپنی منزل مقصود کا علم نہ تھا، میں شجر و حجر کی پرستار تھی میں توہم پرستی اور جہالت کی زنجیروں میں اسیر تھی۔ میں دیوتاؤں اور جنوں کو معبود سمجھتی تھی۔ بتوں کی نذر نیاز کرتی تھی۔ ہزاروں آستانوں پر حاضری دیتی تھی۔ قبروں اور ڈھیریوں کو قبولیت دعا کا منبع سمجھتی تھی ــــــ مگر اسلام تیرے سائے میں آنے

کے بعد ان تمام بے جان ڈھیروں اور پتھروں، بے بس شجر و حجر، بے کس دیوتاؤں و جنوں کے ٹھاکر دوارے سے منہ موڑا۔ تو نے میری پیشانی کو اس خدائے لم یزل ولایزال کے آگے سجدہ ریز کر دیا اور میری پیشانی کو صرف اسی در کے لئے وقف کر دیا۔ میری وفاؤں کا مرکز، میری دعاؤں اور استعانت کا مرجع تو نے اللہ تعالیٰ کو بنا دیا۔ اس طرح بھولی بھٹکی مخلوق کا رشتہ اس کے خالق سے ملا کر اسے منزل مقصود سے آگاہ کر دیا۔

(۲) اے اسلام! ڈارون نے تو میرا رشتہ نباتات و حیوانات کے ساتھ جوڑا تھا۔ اور اس طرح مجھے صرف ایک معاشرتی حیوان (Social Animal) بنا چھوڑا تھا، مگر تو نے مجھے اس حقیقت سے متعارف کرایا کہ میں انسان ہوں، حیوان نہیں ہوں۔ اور انسان بھی وہ جسے خدا نے اشرف المخلوقات کے لقب سے نوازا ہے۔ جو تخلیق خداوندی کا شاہکار ہے، جسے خود خالق کائنات نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس میں اپنی روح پھونکی۔ اے اسلام میں کتنی حقیر تھی، تو نے مجھے کتنا عظیم بنا دیا۔

(۳) مجھے راہب بھکشو اور یوگی یہی بتاتے تھے کہ اگر تو راہ حقیقت پر گامزن ہونا چاہتی ہے تو تمام دنیا سے کنارہ کش ہو جا، کیونکہ یہ چیزیں تمہاری دشمن ہیں اور تمہارے دامن کو غلاظت سے آلودہ کر دیں گی۔ ان کو برتنے میں ہلاکت آفرینی کا سامان ہے۔ اس لئے اس کی لذات و دلچسپیوں سے، اس کے حسن و رعنائی سے، اس کے فواکہ و ثمرات سے کنارہ کش ہو جا۔ مگر اے اسلام، تیرے سائے میں آنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ چیزیں تو میری خادم ہیں، میرے لئے مسخر ہیں، میرے آقا کی خوشی اسی میں ہے کہ ان کو استعمال کر کے، ان سے لطف اندوز ہو کر اور اس دنیا کو برت کر ان دنیوی لذائذ پر شکر الٰہی ادا کروں۔ کیونکہ میں زمین میں اللہ کا خلیفہ ہوں۔ اس نے مجھے خلافت ارضی کا خلعت پہنایا ہے۔ اس خلعت کو زیب تن کرنے کے بعد خدا کے اطاعت کیش بندے کی حیثیت سے ان اشیاء میں تصرف کرنے میں ہی میری دنیوی و اخروی سعادت ہے۔ اور جو لوگ اس دنیا کو نہیں برتتے، اس کے لذائذ و ثمرات سے لطف اندوز نہیں ہوتے، خدا انہیں سرزنش فرماتا ہے :

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ..... ﴾ (الاعراف : ۳۲)

"(اے پیغمبر) ان لوگوں سے پوچھئے کہ اللہ نے جو زینت (کے ساز و سامان) اور کھانے (پینے) کی ستھری چیزیں پیدا کی ہیں' ان کو کس نے حرام کیا ہے"۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا.....﴾

"وہی ہے جس نے ہر وہ چیز جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کی"۔

سورۂ نحل میں فرمایا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ.....﴾ (النحل: ۱۲)

"رات دن' شمس و قمر وغیرہ سب اللہ نے تمہارے لئے مطیع و منقاد بنائے اور ستارے بھی اس کے حکم سے تمہارے لئے مسخر ہیں"

اس طرح اے اسلام تو نے مجھے دنیا کی ہر نعمت سے متمتع ہونے پر ابھارا۔ بارش' سمندر' سورج' ہوا' پہاڑ' پانی غرضیکہ ہر چیز کو میرے فائدے کے لئے مامور فرمایا۔ اگر میں اللہ کی فرمانبردار رہوں تو یہ سب چیزیں میری فرمانبردار اور خادم ہیں۔ اللہ اللہ قربان جایئے اس عظمت انسانی پہ جو اسے اسلام نے عنایت فرمائی ہے۔

(۴) اے اسلام تو نے مجھے خاتم الانبیاء کی امت سے گردانا جو کہ سید المرسلین ہیں' سرور دو عالم ہیں' دانائے سبل ہیں۔ جن کے ہاتھوں تمام انبیاء کا دین مکمل ہوا' وہ نبی جن کی ذات میں کاملیت اور جامعیت بیک وقت جمع ہیں کہ انہوں نے ہماری زندگی کے ہر گوشے میں اپنا عملی اسوہ چھوڑا' اور زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ تکمیل نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ایک یتیم کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا اور بے مثال شوہر' رحیم و شفیق باپ' امانت دار تاجر' ایثار کیش انسان' صلہ رحمی کرنے والے رشتہ دار اور عربوں کے سردار بن کر ابھرے' راہ حق میں تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ محنت' ہمت' پامردی' جان کیشی کے ساتھ مصائب سے' اور بالآخر دین کے سب سے بڑے لیڈر کی حیثیت سے بے بصر انسانوں کے لئے اپنا مبارک اسوہ حسنہ چھوڑ گئے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ۔

(۵) مذہب کے اجارہ دار پادری' برہمن' کاہن وغیرہ مجھے سکھاتے تھے کہ ہمارے

توسط کے بغیر تو اپنے آقا تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اتنی عظیم الشان ہے کہ اس سے رابطہ کے لئے تو واسطہ در واسطہ کی ضرورت ہے جس طرح کسی دنیاوی بادشاہ تک پہنچنے کے لئے درمیان میں کئی وسائط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اے اسلام' تو نے مجھے ایک نیا ہی درس دیا کہ میرا اللہ' میرا معبود میرا آقا تو میری شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر وقت میری فریاد سننے کو اور میری دعا و نیاز قبول کرنے کو چشم براہ رہتا ہے۔ میں جب بھی اس کے دروازے پر دستک دوں' وہ مجھے اپنا محرم راز بنا لیتا ہے۔ میں اس کی اطاعت میں ذرا سی سرگرمی دکھاؤں تو وہ مجھے اپنے مقربین کی صف میں اور اپنے اولیاء کے زمرے میں سے گردانے لگتا ہے۔

(۶) کچھ مغربی محقق (مارکس و اینجلز) مجھے معاشی حیوان قرار دے چکے تھے۔ گویا میں صرف معاشی عوامل کے رحم و کرم پر تھی' یہی معیشت ہی میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت قرار پا چکی تھی' مگر اے اسلام' تیری پناہ میں آنے کے بعد میں اس حقیقت سے آشنا ہوئی کہ ہر کیڑے مکوڑے اور ہر شجر و حجر کا رزق تو اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اس نے انسان کے رزق کا سامان تو بدرجہ اولیٰ کر رکھا ہے۔ اے اسلام' تو نے معیشت کے بجائے اطاعت الٰہی کو' خدا کے قانون کے آگے سر تسلیم خم کر لینے کو میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت قرار دیا۔

(۷) مجھے ایک نظام حیات عطا کیا۔ یہ نظام حیات اور یہ قانون خداوندی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ پہلے میں اپنا فلسفہ و تہذیب یونان سے اخذ کرتی تھی' قانون روما سے' معیشت مارکس سے اور معیار زندگی کی افزونی کو قبلہ مقصود ٹھہراتی تھی' مگر اے اسلام' تو نے مجھے سکھایا کہ اگر میں قرآنی نظام حیات قبول کر لوں تو میری زندگی کے سب گوشے نکھر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قرآن نے مجھے اطاعت الٰہی کے تحت اخلاقی اقدار کی معراج تک پہنچایا' میری تہذیب نفس کی' مجھے معاشرے کے ایٹی کیٹ بتائے۔ اپنے آداب معاشرت سکھا کر مجھے معیشت سکھائی' مجھے معاشرت سکھائی۔ اور ہر گوشہ کا رابطہ براہ راست اعلیٰ اخلاقی اقدار کے تابع قرار دیا۔ اس طرح اسلامی معاشرت دنیا کی بہترین معاشرت' اسلامی سیاست دنیا کی بہترین سیاست اور اسلامی معیشت دنیا کی بہترین معیشت قرار پائی۔

(۸) اے اسلام، تیری جس خوبی سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ تیرا اعتدال و توازن ہے۔ تو نے ہر گوشہ حیات میں افراط و تفریط سے منہ موڑ کر اعتدال کی راہ اختیار کی۔ نہ تو فرد کو معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا کہ وہ معاشرہ کے مفاد کے لئے اپنا ذاتی مفاد قربان کر دے۔ اور نہ ہی اجتماع و معاشرہ کی حقیقت کو نظرانداز کیا، بلکہ یہ اجازت دی کہ انسان اپنے اغراض و مقاصد پر چلتا رہے بشرطیکہ اس سے اجتماعی مفاد و مقاصد کو ضرر نہ پہنچے۔ اسی طرح نہ ہی مجرد دنیاداری کو مستحسن قرار دیا، نہ ہی مجرد ریاضت و عبادت کو۔ بلکہ دنیا کے دھندوں اور دنیاوی کاروبار میں پھنس کر دین پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔ اس طرح کہ دنیوی دھندے اللہ کے حکم کے مطابق بجالاؤ، تو یہ سب تمہاری عبادت ہے، ریاضت ہے اور مجاہدہ ہے۔

(۹) میں ایک جاہل و گم کردہ راہ ضلالت کے گہرے غاروں میں سرگرداں تھی۔ اے اسلام، تو نے علم کو میری زندگی میں ایک نمایاں مقام عطا کیا اور علم کی روشنی میں میری تاریک زندگی کو منور کیا۔ دیگر تمام معاشرے علم کو صرف چند طبقوں تک محدود رکھتے تھے مگر اے اسلام، تو نے ہر طبقہ کے لئے بلا امتیاز رنگ و نسل علم کا دروازہ وا کر دیا۔ وہ علم جس نے حضرت انسان کو مسجود الملائکہ کا منصب عطا کیا تھا، اسی علم الٰہی سے ہر شخص کسی بھی امتیاز کے بغیر متمتع ہو سکتا ہے، صرف عمل شرط ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی محنت، کوشش اور جستجو کے ساتھ علم حاصل کرے اور اس پر عمل پیرا ہو، وہ انبیاء کا وارث، امت کا چراغ اور قوم کا راہبر اور لیڈر ہے۔ تو نے سوت کاتنے والوں (امام غزالیؒ کے والد) ہنڈیا بیچنے والوں (امام قدوریؒ) تیل تیار کرنے اور بیچنے والوں (زیاتؒ) غرضیکہ ہر ایک کو جب علم کی مسند پر بٹھایا تو پھر انہیں امت مسلمہ کا عظیم الشان اور باعث صد افتخار لیڈر بنا دیا۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے۔

(۱۰) میں سوچا کرتی تھی کہ میں کیوں پیدا ہوئی، مجھے کس نے پیدا کیا۔ میری تخلیق کی غرض و غایت کیا ہے؟ میرا مرنے کے بعد کیا انجام ہو گا، کیا یہ دنیا فنا ہو گی یا نہیں، یہ دنیا خود بخود وجود میں آئی یا اس کے وجود میں آنے کی کوئی غرض و غایت ہے۔ کیا یہ فنا ہو گی یا نہیں۔ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں سوال مجھے ہر وقت پریشان کرتے رہتے تھے اور ان سوالوں نے

میری زندگی اجیرن کر ڈالی تھی' مگر اے اسلام' تیرا دامن تھام لینے کے بعد مجھے ان تمام سوالوں کے جواب مل گئے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے پیدا کرنے والی ایک عظیم الشان ہستی ہے جس کا اسم ذات "اللہ" ہے۔ اللہ نے ہی ہر چیز تخلیق کی ہے۔ یہ دنیا' یہ زمین' یہ بے ستون نیلگوں آسمان' یہ وسیع و عریض فضا کی پہنائیاں' یہ رات دن کے انقلاب' یہ شمس و قمر اور کواکب کا نظام' یہ موسموں کے تغیر و تبدل سبھی اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ اس نے ہر چیز کو ایک منظم منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے اور ہر چیز سے اس کا کام لے رہا ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا' اسے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا' اپنی اطاعت اس پر لازم قرار دی۔ برائیوں سے روکنا اور نیکی کا حکم کرنا' دنیا میں نیکی کو فروغ دینا' خود نیکی پر عمل پیرا ہونا اور دوسرے انسانوں کو برائیوں سے روکنا اس کا منصب اولین ہے جو انسان اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے' اسے خدا اپنی عظیم نوازشات سے سرخرو کرے گا۔ اور جو اس میں کوتاہی کرتا ہے اس کے حکموں کے مقابلے میں سرتابی کرتا ہے اور اس کا سرکش اور باغی بن کر رہتا ہے' اسے اللہ اپنے زبردست عذاب کی وعید سناتا ہے۔ اسی جزا و سزا کے معاملہ کے لئے وہ ایک دوسرا عالم پیدا کرے گا۔ دنیا میں جتنے لوگ مر چکے ہیں' اسی عالم میں ان سب کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ ان کے اعمال کو اپنی میزان میں تولے گا' پھر اس میزان کے مطابق انسان کو جزا و سزا دے گا۔

(۱۱) اے اسلام' میں عورت تھی اور عورت ہونے کی حیثیت سے کسی معاشرے' کسی دین یا کسی تہذیب نے مجھے نمایاں مقام عطا نہ کیا۔ میری پیدائش منحوس سمجھی جاتی تھی۔ مجھے ہمیشہ مرد کا غلام تصور کیا جاتا تھا۔ میں وراثت سے محروم تھی' زندگی کے حقوق سے محروم تھی۔ میری تخلیق کا مقصد ہی صرف مرد کی محکومی سمجھا جاتا تھا۔ مرد مجھے اپنی خواہشات کا کھلونا سمجھتا' مجھے دلفریب برائی' غارت گر دلربائی' خانگی آفت' پیدائشی فتنہ' سراپا معصیت اور بنی نوع انسان میں فساد و گناہ کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا۔ میں مظلوم تھی۔ کسی کو مجھ پر ترس نہ آیا۔ میری عزت و ناموس لٹ چکی تھی' مگر کسی کو میری ناموس کی پروا نہ تھی' کسی کو میرے حقوق یاد نہ تھے ــــــ مگر اے اسلام' تو نے مجھ جیسی بے کس' بے نوا اور مظلوم عورت پر کیا کیا احسانات کئے۔ مجھے مرد کی مساوی جنس قرار دے کر مرد

کے ہم پلہ بنا دیا۔ تو نے مرد کی مانند میرے حقوق بھی مقرر کئے اور ان کی ادائیگی مرد پر لازمی قرار دی۔ مجھے وراثت سے حصہ دلایا۔ مجھے مہر' نفقہ اور حسن سلوک کے حق عطا فرما کر مجھے گھر کی باوقار مالکہ بنایا۔ میری پرورش کو باعث رحمت الٰہی اور جنت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا' مجھے تعلیم و تربیت کے حقوق عطا فرمائے' میری عزت و ناموس کی حفاظت کی' مجھے ذمہ داریوں سے دست کش قرار دیا اور پیار سے گھر کو میری جدوجہد کا مرکز قرار دے کر مجھے ہر قسم کی آوارگی اور افراط و تفریط سے محفوظ کر دیا۔ مجھے مرد کے ظلم و ستم کے مقابلے میں اپنا حق خلع استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس طرح مجھ پر ایک عورت کی حیثیت سے اے اسلام تو نے جو احسانات کئے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۴) میں غلام تھی اور معاشرہ کے رحم و کرم پر تھی۔ میرے مالک مجھ سے بیگار لیتے تھے اور تن و جان کا رشتہ قائم کرنے کے لئے قوت لایموت مہیا نہ کرتے تھے۔ میں یتیم و بے آسرا تھی' اس لئے مجھ پر ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھا جاتا تھا۔ اور کوئی میرے سر پر دست شفقت پھیرنے والا نہ تھا۔ میں کالی اور بدشکل تھی اور معاشرہ صرف گوروں اور خوش شکل لوگوں کو معزز سمجھتا تھا۔ میں غریب تھی اور معاشرہ میں صرف اس شخص کی عزت تھی جو مال و دولت والا ہو' اس کے پاس نوکروں چاکروں کے جھرمٹ ہوں' خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا ہجوم ہو' اس کا بینک بیلنس ہو' اس کے پاس بے اندازہ کوٹھیاں و کاریں ہوں۔ میرا پیشہ معمولی تھا' اس لئے مجھے موچی' قصاب' حجام وغیرہ ہونے کی بنا پر معاشرہ میں نظر حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نیچ ذات کی تھی' اس لئے اعلیٰ ذات والے مجھ سے چھو جانا بھی بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ مگر اے اسلام' تیری پناہ میں آنے کے بعد مجھے سکون کا وہ دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آیا کہ میں اس میں مکمل طور پر غرق ہو گئی۔ یہاں کوئی لونی و لسانی' نسلی و قومی' امیری و غریبی کے امتیازات نہ تھے۔ اے اسلام تیری نگاہ میں ساری مخلوق یکساں تھی' اور اسلام کا تمام نام لیوا مساوی حیثیت کے مالک اور آپس میں بھائی بھائی تھے۔ تیرا قانون صرف غریبوں' یتیموں' بے کسوں اور بے نواؤں کے لئے نہ تھا' بلکہ امیر و غریب پر اور آقا و غلام پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ تیرے احسانات طبقہ امراء تک محدود نہ تھے' بلکہ ہر امیر و غریب' آقا و غلام' مرد و عورت' بے کس حقیر و معزز' ہر کوئی کسی قسم کے امتیاز کے بغیر

ان احسانات سے یکساں لطف اندوز ہوتا تھا ہر ایک کو یکساں نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی امتیاز یہاں تھا تو تقویٰ اور جہاد کا تھا۔ یعنی جو شخص اپنے آقا کا جتنا زیادہ فرمانبردار، اطاعت کیش، خدا ترس اور راہِ حق میں اپنا سر و سامان اور اپنا تن من دھن قربان کرنے والا ہو گا، وہ اتنا ہی معزز ہو گا۔ یہ امتیاز در حقیقت کوئی نہ تھا، کیونکہ ہر کلمہ گو تقویٰ اور جہاد کی اعلیٰ منازل طے کر سکنے کے قابل تھا۔ ہر شخص جو ان منازل تک پہنچنا چاہے، اس کے لئے کوئی مخالفت و مزاحمت نہیں۔ وہ اپنی ذاتی جدوجہد، سعی و کاوش اور پیہم کوشش سے ان منازل کو چھو سکتا ہے۔ اللہ اللہ اے اسلام، تیرے احسانات کا کیا شمار!

اے اسلام، شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ کے ہاں بحیثیت دین صرف تجھے ہی شرفِ قبولیت حاصل ہے۔ اور جو تیرے علاوہ کوئی اور راہ ڈھونڈے گا وہ دین و دنیا کی تباہی و نقصان کا مصداق ٹھہرے گا۔

"اے اللہ ہمیں اسلام پر استقامت عطا فرما اور اسی پر موت عطا فرمانا" (آمین)

(بشکریہ : خواتین میگزین لاہور)

بقیہ : امتِ مسلمہ کی عمر......

{۵۵} "النبوۃ والسیاسہ" ص ۲۵

{۵۶} "النبوۃ والسیاسہ" ص ۱۹۔

{۵۷} اس کتاب کے مقدمہ میں ہم نے استاد محمد عبدالمنعم اور ڈاکٹر مصطفیٰ محمود کے اقوال بیان کئے ہیں، ان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

{۵۸} سفر زکریا (۸۹ : ۱۳) اور سفر حزقیال (۳۹:۱۲) میں اس کا تذکرہ ہے۔ عبارت یوں ہے :
"سات ماہ گزرنے کے بعد زمین صاف کرنے سے پہلے بنو اسرائیل ان کو دفن کر سکیں گے۔"

{۵۹} یہ صحیح حدیث ہے جسے احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ اور ابن حبان نے ذو مخمرؓ سے روایت کیا ہے۔ البانی نے مشکوۃ کی احادیث پر تحقیق کے سلسلہ میں نمبر ۵۴۲۴ کے تحت اسے صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح الجامع میں بھی یہ حدیث مختلف روایات سے آئی ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد :	۴۶
شمارہ :	۷
ربیع الاول	۱۴۱۸ھ
جولائی	۱۹۹۷ء
فی شمارہ	۱۰/-
سالانہ زر تعاون	۱۰۵/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03۔02۔5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

قرآن کالج کے داخلوں کے بارے میں اہم اعلان صفحہ ۱۰ پر دیکھئے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ملک خداداد پاکستان میں فرقہ وارانہ دہشت گردی اور تخریب کاری کا گراف ایک بار پھر خطرناک حدوں کو چھونے لگا ہے۔ تقریباً روزانہ ہی اخبار کے فرنٹ پیج کا بڑا حصہ دہشت گردی کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت کی خبروں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ کراچی میں ایم کیو ایم اور اس کی متحارب قوتوں کی محاذ آرائی نے ایک بار پھر شہر کی فضا پر خوف و ہراس اور بدامنی و بے اطمینانی کی دبیز چادر اوڑھا دی ہے۔ پاکستان کے دیگر علاقوں بالخصوص پنجاب میں فرقہ وارانہ محاذ آرائی کی آڑ میں بدترین دہشت گردی عروج پر ہے اور انتظامیہ اپنے تمام تر دعوؤں اور اپنی پشت پر "بھاری مینڈیٹ" کی قوت رکھنے کے باوجود بے بس اور لاچار نظر آتی ہے ـــــ لیکن ہمارا حال یہ ہے (اس میں ہماری حکومت' حزب اختلاف اور عوام سب شامل ہیں) کہ اس خرابی اور روگ کے اصل سبب کے تدارک یعنی نفاذ نظام اسلام کی بجائے کچھ سطحی نوعیت کے اقدامات اور ظاہری لیپا پوتی سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہیں اور اپنے پچاس سالہ شرمناک ماضی کی تلخ یادوں سے بھی کوئی سبق سیکھنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ اور اگر اس ملک و ملت کا کوئی حقیقی بہی خواہ اور صاحب بصیرت ہمارے ارباب اقتدار کو صحیح راہ سجھانے اور انہیں ملک و قوم کا قبلہ سیدھا کرنے کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی بات بھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی جاتی ہے۔ اول تو ہمارے ارباب اقتدار کا یہ مستقل وطیرہ رہا ہے کہ وہ دین و مذہب کے ساتھ وفاداری بلکہ صحیح تر الفاظ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خلوص و وفاداری کے مقابلے میں اپنی کرسی اور اقتدار کے ساتھ وفاداری کو ترجیح دیتے رہے ہیں' لیکن اگر کبھی ان میں سے کوئی نفاذ اسلام کی جانب پیش رفت کے ضمن میں کسی درویش کی "فغان" پر کان دھرنے پر آمادہ ہو تا بھی ہے تو اس کے مصاحبین اسے اس کار خیر سے برگشتہ کرنے کے لئے اپنی دانست میں "حق خیر خواہی" ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ علامہ اقبال نے تو یہ بات "محکوم طبقات" اور "غریب عوام" کے حوالے سے کہی تھی کہ ؎

پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ اگر کوئی حکمران خواب غفلت سے بیدار ہونے لگتا ہے تو ہر چہار طرف سے اسے لوریاں دے دے کر سلانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ اور بدقسمتی سے محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران خود بھی خواب غفلت سے بیدار ہونے کی کچھ زیادہ خواہش نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بگاڑ اور انتشار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ آئینی طور پر انتہائی مستحکم حکومت بھی حالات کے ریلے کے سامنے "خضر بھی بے دست و پا' الیاس بھی بے دست و پا" کی تصویر بنی نظر آتی ہے اور ملک دشمن عناصر اور شیطانی قوتیں "میرے طوفاں یم بہ یم' دریا بہ دریا' جو بجو" کا راگ الاپ رہی ہیں۔

بہرکیف تنظیم اسلامی اپنی بساط کے مطابق تکمیل دستور خلافت کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے گزشتہ ماہ اس مہم کو تیز کرنے کی خاطر اور اس اہم دینی کام میں جس سے کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کو اختلاف نہیں ہو سکتا' دیگر علماء کرام بالخصوص مختلف مکاتب فکر میں نمایاں مقام کے حامل ارباب دین کا تعاون حاصل کرنے کے لئے علماء کرام سے ذاتی رابطے کے کام کو ایک مہم کے انداز میں چلایا۔ چنانچہ انہوں نے ایک جانب دارالعلوم حزب الاحناف کے علامہ محمود احمد رضوی صاحب سے ان کے مرکز میں ملاقات کی تو دوسری جانب جمعیت اہل حدیث کے سربراہ سینیٹر ساجد میر صاحب سے بھی مفصل ملاقات کی جو امیر تنظیم کی دعوت پر قرآن اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ قبل ازیں اسی ضمن میں امیر محترم جے یو آئی کے ایک اہم قائد مولانا اجمل خاں صاحب سے بھی ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کر چکے تھے ــــــ اس کے ساتھ ساتھ امیر تنظیم نے شیعہ سنی مفاہمت کے لئے بھی رابطہ مہم جاری رکھی اور بالخصوص سپاہ محمد کے بعض رہنماؤں سے ملاقات کر کے انہیں مفاہمت کے فارمولا پر غور و فکر کی دعوت دی اور مفاہمت باہمی کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ــــــ اللہ تعالیٰ موصوف کی ان کوششوں کو شرف قبول عطا فرمائے!

امیر تنظیم اسلامی کی انہی مساعی کا یہ مظہر ہے کہ ان شاء اللہ ۴ جولائی کو بعد نماز مغرب قرآن آڈیٹوریم لاہور میں شیعہ سنی مفاہمت پر ایک سیمینار منعقد ہو رہا ہے جس میں

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

حالات حاضرہ

امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز

○

پاکستان اور افغانستان کے درمیان کنفیڈریشن وقت کی اہم ضرورت ہے
بھارت سے تعلقات استوار کرنے سے پہلے نظریاتی تشخص کو مضبوط بنایا جائے

لاہور' 6 جون 97ء : امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ موجودہ حکومت کی افغان پالیسی قابل ستائش ہے' مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ موجودہ پالیسی کو مزید ایک قدم آگے بڑھایا جائے اور پاکستان اور افغانستان کے مابین کنفیڈریشن تشکیل دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں طالبان حکومت کی صورت میں مستحکم اسلامی ریاست وجود میں آچکی ہے اور افغانستان میں نفاذ اسلام کے بعد امید ہے کہ پورے ایشیاء میں احیائے اسلام کی تحریک کا راستہ کھل جائے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ۱۹۷۱ء میں ملک کے دولخت ہونے کے بعد سے پوری قوم شکست خوردہ ذہنیت سے دوچار ہے۔ چنانچہ قومی سطح پر اس نفسیاتی شکست کا علاج اور بھارت کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ بھی افغانستان کے ساتھ مضبوط اور مستحکم کنفیڈریشن کے ذریعے کیا جا سکتا ہے' اسی سے بھارت کی میزائل ٹیکنالوجی کا توڑ بھی ہو سکے گا۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان کی سرزمین سے پہلے بھی محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی جیسے فاتحین نے ہندوستان کو فتح کیا تھا اور اب بھی پاکستان افغانستان کی اسلامی حکومت کے ساتھ مل کر ہندوستان کا جرات مندانہ طریقے سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور افغانستان کے اتحاد سے عالم اسلام کی وحدت کی جانب پیش رفت کے نئے دور کا آغاز ہو جائے گا اور ایشیاء کے قلب میں ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی۔

امیر تنظیم اسلامی نے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف سے مطالبہ کیا کہ وہ قرآن و سنت کی بالادستی کے نفاذ کے ذریعے ملک کو دستوری سطح پر اسلامی ریاست بنانے کا تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دیں۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ متنازعہ "احتساب بل" کی وجہ سے مسلم لیگ حکومت کی اخلاقی ساکھ کو زبردست دھچکا لگا ہے۔ چنانچہ میاں محمد نواز شریف نے موجودہ مہلت سے

اگر قائدہ نہ اٹھایا اور ماضی کے حکمرانوں کی طرح ملک کے نظریاتی تشخص کو حقیقی معنوں میں مضبوط بنانے کی طرف پیش رفت نہ کی اور اب بھی اگر ملک کا قبلہ اسلام کی طرف سیدھا نہ کیا گیا تو یہ چیز وزیر اعظم اور ملک و قوم کے لئے بدشگونی کا مظہر ہو گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وزیر اعظم نے تنظیم اسلامی کے وفد سے ۲۴ مئی کی ملاقات کے دوران بہت جلد شریعت کو سپریم لاء بنانے کے لئے آئین میں ترامیم کا بل لانے کا عندیہ دیا تھا مگر اس حوالے سے ابھی تک کسی قسم کی پیش رفت کا نہ ہونا حیرت اور تشویش کا موجب ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ سندھ اسمبلی میں نماز جمعہ کے لئے وقفہ نہ کرنا تشویش ناک رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بینکوں اور کئی نجی اداروں میں جمعہ کی نصف تعطیل کے خاتمے سے جمعہ کی حرمت پامال ہو رہی ہے۔ نماز جمعہ دین کے شعائر میں سے ہے جس کا احترام ملحوظ نہ رکھنے سے حرام کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مسجد دار السلام میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک قرارداد بھی منظور کرائی جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ جمعہ کی نصف تعطیل نماز جمعہ کے بعد کرنے کی بجائے نماز جمعہ سے پہلے کی جائے' تاکہ جمعہ کا تقدس ملحوظ رکھا جا سکے!

پاکستان عملی طور پر ایک سیکولر ریاست بن چکا ہے

خواتین کی کرکٹ ٹیم بیرون ملک بھیجنا دین سے صریح انحراف ہے

لاہور' 13 جون 97ء : ملک کو اسلام کا گہوارہ نہ بنایا گیا تو امریکہ پاکستان کو مکمل طور پر مفلوج کر کے بھارت کا غلام بنا دے گا۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ روس چین مفاہمت ایشیا میں نیو ورلڈ آرڈر کے لئے "درد سر" اور "وبال جان" بن چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امریکی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھارت کو انتہائی اہم حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ چنانچہ امریکہ بھارت کو علاقائی سپر پاور بنا کر نیو ورلڈ آرڈر کے لئے خطرہ بننے والے ممالک کے گھیراؤ کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے سودی قرضوں کی لعنت سے جکڑا ہوا پاکستان امریکہ کا "بے دام" غلام نہیں "با دام غلام" بن چکا ہے جو ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے قرضوں کے ذریعے اپنے دام وصول کر چکا ہے اور اب امریکی پالیسی کی مزاحمت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ یکطرفہ طور پر بھارت سے تعلقات کی

بحالی کے ضمن میں نواز شریف کسی اور کی بولی بول رہے ہیں۔ میزائلوں کی تنصیب اور پاکستان کے حساس ترین علاقوں پر بھارتی جاسوس طیارے کی پرواز پاکستانی قوم کی بے بسی کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مسلم لیگ حکومت نے عوام کی غیر معمولی تائید حاصل ہوتے ہوئے بھی ملک کا قبلہ اسلام کی طرف درست نہ کیا تو یہ ملک و ملت کی تباہی کو خود دعوت دینے کے مترادف ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو بچانے کی خاطر ملک کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرنے کے لئے شریعت کو سپریم لاء بنا کر دستور میں موجود غیر اسلامی دفعات کو کالعدم قرار دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان نام کا اسلامی ملک ہے جبکہ نافذ العمل نظام کی رو سے پاکستان کو سیکولر ریاست کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ افغانستان میں طالبان نے اسلامی حکومت قائم کر دی ہے۔ ان حالات میں اگر پاکستان میں نظام خلافت رائج نہ کیا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ ملک کی "پختون بیلٹ" افغانستان کے ساتھ مل جائے گی۔ انہوں نے حکومت سے کہا کہ وہ پیش قدمی کرتے ہوئے پاک افغان کنفیڈریشن قائم کرے۔ اس طرح بھارت کے مقابلے میں پاکستان ایک ناقابل تسخیر قوت بن جائے گا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ملک کے اسلامی تشخص کو دستوری سطح پر مضبوط بنائے بغیر بھارت سے دوستانہ تعلقات کا قیام قومی سطح پر خود کشی کے مترادف ہو گا' جس سے ملک کے قیام کا جواز ہی ختم ہو جائے گا اور بھارتی ثقافت کی یلغار ملک کے نظریاتی تشخص کو ختم کر دے گی۔ انہوں نے نوائے وقت کے بھارتی بالادستی کے مزاحمتی کردار کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارت کا مقابلہ کرنے کے لئے پاکستان کو چاہئے کہ وہ روس اور چین کی مفاہمت سے فائدہ اٹھا کر افغانستان' ایران اور ایشیائی ریاستوں پر مشتمل مضبوط مسلم بلاک کے قیام کے لئے کوشش کرے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ دین کا دستوری سطح پر نفاذ موجودہ حکومت کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ کا نظام لانے کے دعووں کے برعکس حکومت نے عربی خطبہ اور نماز جمعہ سے قبل عوام کی دینی و اخلاقی تربیت کے لئے کی جانے والی اردو تقاریر میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی عائد کر کے مداخلت فی الدین کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح خواتین کی کرکٹ ٹیم کو بیرون ملک دورے کی اجازت دینا اسلامی تعلیمات سے صریح انحراف کے مترادف ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ خواتین ٹیموں کے بیرونی دوروں پر مکمل طور پر پابندی عائد کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ بینک انٹرسٹ کو سود نہ سمجھنے والے خالد اسحٰق جیسے دانشور کو سودی نظام کے خاتمے کے لئے قائم کمیٹی میں شامل کرنا حکومت کی نیت میں "فتور" کا مظہر ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ تمام عرب ممالک اسرائیل کے سامنے سجدہ ریز ہو چکے ہیں اور اب

پاکستان کی وہ مذہبی جماعتیں بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کے راگ الاپ رہی ہیں جنہیں اسرائیل نواز عرب ممالک کی "سرپرستی" حاصل ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اسرائیل کا توڑ ہے چنانچہ اسرائیل کے قیام سے ایک سال قبل ہی اللہ تعالیٰ نے پاکستان قائم فرمادیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر تمام مسلم ممالک بھی اسرائیل کو تسلیم کرلیں تو پاکستان کو پھر بھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ وقت دور نہیں جب افغانستان اور پاکستان کی اسلامی افواج بیت المقدس کو یہودی قبضے سے آزادی دلا کر یہودیوں کا قلع قمع کریں گی۔

☆ ☆ ☆

اسلامی ریاست کے قیام کے لئے اجتماعی جدّوجہد ناگزیر دینی فریضہ ہے
بھارت کے جارحانہ عزائم کے مقابلے میں ہمارا رویّہ قومی وقار کے منافی ہے

لاہور' 20 جون 97ء : امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ امتِ مسلمہ اصولی طور پر بہترین امت ہونے کے باوجود اپنے فرائض سے غفلت کی وجہ سے بدترین امت کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ چنانچہ بے پناہ افرادی قوت و مادی وسائل سے مالامال اور دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہونے کے باوجود بین الاقوامی سطح پر امت مسلمہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ عرب ممالک مغضوب ترین یہودی قوم کے آگے سرنگوں ہوچکے ہیں جبکہ مسلمانانِ پاکستان بت پرست ہندو قوم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بھارت امریکی آشیرباد اور اپنی جارحانہ فوجی قوت کے نشے میں علاقائی امن کے لئے زبردست خطرہ بن چکا ہے۔ بھارت کے جارحانہ اور توسیع پسندانہ عزائم کا مقابلہ کرنے کی بجائے پاکستان نے اپنے اسلامی اور قومی وقار کے منافی بزدلانہ اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بھارتی وزیراعظم آئی کے گجرال کی طرف سے کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دینے اور پرتھوی میزائلوں کی تنصیب کے اشتعال انگیز عزائم کا اظہار کیا جارہا ہے مگر حکومت پاکستان ہاٹ لائن پر بھارتی وزیر اعظم سے چند لمحوں کی گفتگو کو اپنی اہم کامیابی قرار دے رہی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بھارت میں متعین ایرانی سفیر کی طرف سے افغانستان میں طالبان حکومت کی مخالفت اور بھارت کو افغانستان پر جارحیت کی کھلی دعوت دینا افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ دنیا کے تمام انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے نظامِ

خلافت کا قیام امتِ مسلمہ کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ ہے مگر مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اپنے اس فرض سے انحراف اور پہلوتہی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان حقیقی اسلام کا عملی نمونہ پیش کرنے کی بجائے اپنے منافقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے لئے انقلابی جماعت میں شمولیت بھی ناگزیر فریضہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ نظام خلافت کے قیام یا اس کی جدوجہد میں حصہ لئے بغیر رضائے الٰہی کا حصول ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا پر مبنی زندگی گزارنے کی بجائے زندہ رہنے سے مرجانا بہتر ہے۔

نظامِ خلافت کا قیام ملّتِ اسلامیہ کا اجتماعی دینی فرض ہے
اسلامی انقلاب غیر مسلح عوامی تحریک کے ذریعے ہی ممکن ہے

لاہور، 27 جون 97ء : امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ملک بڑی تیزی سے ایک بہت بڑے بحران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں منافقت پر مبنی نظام رائج ہے۔ پاکستان مثالی اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ بننے کی بجائے بدترین استحصالی نظام کا مرقع بن چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نظام خلافت کا قیام ملت اسلامیہ کا اجتماعی دینی فرض ہے جسے پورا نہ کرنے کی وجہ سے امت مسلمہ ہر سطح پر بدترین ذلت اور رسوائی سے دوچار ہو چکی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ ایمل کانسی کی ڈرامائی گرفتاری سے ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر امریکہ کی ایک "باجگزار" ریاست بن چکا ہے اور ملک کی آزادی و خودمختاری کا جنازہ نکل چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے حکمران طبقات نے ہمیشہ قوم سے حقائق کو چھپا کر جھوٹ بولنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ حکمرانوں کے اسی منافقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے قوم بدترین مصائب سے دوچار ہے۔

انہوں نے کہا کہ اسلام کے انقلابی فکر اور فوجی ڈسپلن کی حامل اسلامی انقلابی جماعت کے ذریعے کی جانے والی جدوجہد ہی سے نظام خلافت قائم ہو گا مگر طویل عرصہ سے غلبۂ دین کی جدوجہد کے لئے جماعتی نظم اختیار کرنے کے نبوی ؐ حکم کو مسلسل نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ عبادات کو "ذکر الٰہی" کے ذرائع و وسائل کی حیثیت حاصل ہے جبکہ نفاذ اسلام کے لئے اجتماعی جدوجہد میں حصہ لینا دیگر اسلامی احکامات کی طرح فرض عین ہے۔ انہوں نے کہا کہ دین کی

سربلندی کے لئے اپنا گھربار چھوڑ کر جان کا نذرانہ پیش کرنا افضل ترین عمل ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مسلمان ممالک میں سے افغانستان اور ایران کے مسلمانوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر بے مثال اور تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے' اگرچہ افغانستان میں برسرپیکار جہادی تنظیموں کے باہمی انتشار کی وجہ سے افغانستان ابھی تک خانہ جنگی سے دوچار ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان حکومت نے طویل عرصہ سے جاری خانہ جنگی سے بے زار افغان عوام کو نجات دلا کر ملک کے بڑے حصے میں امن و سکون بحال کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اہل ایران نے پرامن اور غیر مسلح جدوجہد کے ذریعے امریکہ کے پولیس مین شاہ ایران کی بادشاہت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان میں بھی اسلامی انقلاب کا قیام پرامن اور غیر مسلح عوامی تحریک کے ذریعے ممکن ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ قاضی حسین احمد حکومت مخالف "فائنل شوڈاؤن" کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں مگر پہلے کی طرح ان کی تحریک کے "ثمرات" سے کوئی اور ہی مستفید ہوگا۔

فرائضِ دینی اور مسلمان خواتین

امیر تنظیم اسلامی کا حلقہ خواتین کے اجتماع سے ایک خطاب

خطبۂ مسنونہ ' سورۃ النساء کی پہلی آیت ' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ ' سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ کی تلاوت اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

خواتین کی دینی ذمہ داریوں کے موضوع پر اگرچہ اس سے قبل میرے کئی خطابات ہوئے ہیں جن کے کیسٹ بھی موجود ہیں اور "مسلمان خواتین کے دینی فرائض" کے عنوان سے ایک چھوٹا سا کتابچہ اور اسلام میں خواتین کے مقام کے اعتبار سے بعض اصولی مباحث بھی "اسلام میں عورت کا مقام" نامی کتاب میں موجود ہیں ' لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر نئے خطاب میں موضوع کے بعض گوشے بہتر طور پر اجاگر ہو جاتے ہیں ' مزید یہ کہ ہر نئے خطاب میں ترتیب چونکہ نئی ہوتی ہے اس لئے سننے والوں کو بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی ' مقرر کو بھی انشراح زیادہ ہوتا ہے اور ترتیب کے بدلنے سے بعض نئے مضامین اور نئے مفہوم بھی سامنے آتے ہیں۔

یہ جو عالمِ دنیا ہے جس میں ہم آباد ہیں ' اس میں اگرچہ حیوانات کی بہت سی قسمیں ہیں۔ پرند ' چرند ' وحوش ' مچھلیاں اور حشرات الارض بھی اسی دنیا میں آباد ہیں ' لیکن اس میں ہمارا تعلق جس عالم سے ہے وہ عالمِ انسانیت ہے۔ اس عالمِ انسانیت کے بھی بالکل نمایاں طور پر دو حصے ہیں ' یعنی ایک خواتین اور دوسرے مرد۔ اور یہ تقسیم صرف عالمِ انسانیت ہی میں موجود نہیں بلکہ یہ عالمِ تخلیق سے متعلق اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک اصول اور ضابطہ ہے ' جسے قرآن حکیم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا : ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (الذاریات : ۴۹) یعنی "ہم نے ہر شے میں زوجین (جوڑے) پیدا کئے ہیں تاکہ تم نصیحت حاصل کرو"۔ چنانچہ اب یہ ایک معلوم حقیقت ہے

کہ انسانوں اور حیوانات کے علاوہ نباتات میں بھی زوجین ہوتے ہیں۔ پھول میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں اور درخت بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جوں جوں ہم علم و تحقیق میں آگے بڑھ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز میں اس طرح کی تقسیم موجود ہے۔ عالمِ انسانیت میں نر اور مادہ کی جو تقسیم ہے یوں سمجھے کہ یہ انسان کے سب سے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ اس لئے کہ اجتماعیت کا نقطہ آغاز یہی ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد کے مابین رشتہ ازدواج قائم ہوتا ہے' اس سے اولاد پیدا ہوتی ہے اور ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ پھر ایک خاندان کی مزید تقسیم در تقسیم سے کئی خاندان بنتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرد اور ایک عورت سے یہ پورا عالم انسانیت وجود میں آیا ہے' جس میں مختلف تقسیمیں موجود ہیں۔ اس کی بنیادی اکائی فرد ہے' پھر خاندان ہے' قبیلہ ہے' معاشرہ ہے' قوم ہے اور نوعِ انسانی ہے۔ یہ سب اس کے درجے ہیں۔

دینی فرائض کی بنیادی سطح

اس ضمن میں اگر ہم سب سے بنیادی سطح کے کچھ حقائق ذہن نشین کر لیں اور کچھ اہم باتیں سب سے اوپر کی سطح کی سمجھ لیں تو درمیانی مراحل کا فہم کچھ مشکل نہیں رہتا' انہیں انسان اپنی سمجھ اور اپنی عقل سے کسی حد تک خود بھی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ ہم پہلے تین آیات قرآنی کی روشنی میں اس مسئلے کے بنیادی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

سورۃ النساء اور سورۃ الحجرات کی آیات سے راہنمائی

سورۃ النساء کی پہلی آیت اور سورۃ الحجرات کی تیرہویں آیت قریباً ہم مضمون آیات ہیں اور یہ بات میں نے اپنے دروس میں بارہا بیان کی ہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں' ترتیب قدرے مختلف ہو جاتی ہے۔ ان دونوں آیات کا آغاز "یٰاَیُّهَا النَّاسُ" کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں فرمایا:

﴿ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ﴾

"اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے اس رب کا جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔"

اس آیت میں ربوبیت کو تخلیق پر مقدم کیا گیا ہے حالانکہ ترتیب زمانی کے اعتبار سے پیدائش پہلے ہوتی ہے اور ربوبیت بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن سے ہمارا جو ذہنی ارتقاء ہوتا ہے اس میں تخلیق کے بارے میں سوالات بہت بعد میں پیدا ہوتے ہیں کہ ہماری تخلیق کیسے ہوئی' کہاں سے ہوئی اور کس نے کی؟ لیکن اپنی ضروریات کا احساس پہلے ہوتا ہے۔ بچے کے ذہن میں والدین کی اصل اہمیت اور افادیت اسی اعتبار سے ہوتی ہے کہ وہ اس کی پرورش اور نگہداشت کرتے ہیں اور اس کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں ﴿كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ کے الفاظ میں بیان کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر ترتیب زمانی کے برخلاف' ربوبیت کو خلق پر مقدم کیا گیا ہے۔

آگے فرمایا :

﴿الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾

"جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔"

آیت کے اس حصے میں "ایک جان" کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ اس میں کئی احتمالات ہیں جن پر تفصیلی گفتگو اِس وقت ممکن نہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ "ایک جان" سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں اور بعض روایات کی رُو سے حضرت حوّا سلامٌ علیہا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ "ایک جان سے بنایا" کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اس کی جنسیں تو دو ہیں لیکن نوع ایک ہے۔ انسان ہونے کے ناطے عورت اور مرد ایک ہی نوع سے متعلق ہیں۔ جیسے بکری اور بکرا دو جنسیں تو ہیں لیکن ان کی نوع ایک ہی ہے' اسی طرح گائے اور بیل جنسیں تو دو ہیں لیکن ان کی نوع ایک ہے۔ گائے بھینس سے مختلف ہے' اس کی نوع علیحدہ ہے۔ مرد و عورت کی تخلیق میں سوائے اس ایک حصے کے جس کا تعلق زوجیت اور افزائشِ نسل سے ہے' باقی ان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ مرد و عورت کی جنس اگرچہ مختلف ہے لیکن ان کی نوع ایک ہی ہے۔ یہ ایک مفہوم ہے جو زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ سائنٹیفک ہے۔

آگے فرمایا:

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً﴾

"اور ان دونوں سے کثیر تعداد میں مردوں اور عورتوں کو (زمین میں) پھیلا دیا"۔

اب یہاں "دونوں" سے مراد معین طور پر آدم اور حوا ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو بھی انسان ہیں، خواہ مرد ہوں یا عورت، وہ آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو"۔

یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ آیت کے شروع میں بھی کہا گیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور یہاں دوسری بار پھر یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو"۔ تقویٰ کی اس قدر تاکید سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ اس پر ہم ابھی گفتگو کریں گے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے :

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ...﴾

"اور اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو، اور رحمی رشتوں کا لحاظ کرو۔"

ایک انسان جب دوسرے انسانوں سے کچھ طلب کرتا ہے تو دلیل سے بات کرتا ہے کہ اس دلیل کی بنیاد پر یہ میرا حق ہے۔ لیکن ایک آخری درجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ "اللہ کے نام پر"۔ اب اس میں دلیل ختم ہو گئی۔ یہ اپیل کا آخری درجہ ہے۔ بھکاری خیرات مانگتا ہے تو اللہ کے نام پر مانگتا ہے کہ میرا کوئی استحقاق نہیں ہے، آپ کے اوپر میرا کوئی حق نہیں ہے، لیکن اللہ کے نام پر مجھے کچھ دے دیا جائے۔ انسانی معاملات میں بھی اکثر و بیشتر ایسے مقامات آ جاتے ہیں جہاں دلیل ختم ہو جاتی ہے اور پھر اللہ کے نام کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ اِس حوالے سے لوگوں کو دعوت فکر دی جا رہی ہے کہ جس اللہ کا تم انسانی معاملات میں واسطہ دیتے ہو اس کا تقویٰ بھی تو اختیار کرو۔ ساتھ ہی فرمایا گیا: "اور رحمی رشتوں کی پاسداری کرو"۔ اس سے قبل یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ پوری نوع انسانی ایک انسانی جوڑے سے پیدا کی گئی ہے۔ ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے بہن بھائی آپس میں رحمی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ ایک دادا دادی کی نسل سے چچا تایا کی اولاد باہم جڑی ہوتی

ہے۔ اسی طرح پردادا کی اولاد کا معاملہ ہے۔ یہ رحمی رشتے ہیں۔ پوری نوع انسانی کی اجتماعیت کی جڑ بنیاد گویا یہی رحمی رشتہ ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ ان رحمی رشتوں کا لحاظ کرو، کچھ خیال کرو، قطع رحمی نہ کرو، صلہ رحمی کرو، آپس میں جڑو، کٹو نہیں : ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے"۔

تقویٰ کا مفہوم اور اس کے تین درجے

اب میں چاہتا ہوں کہ یہاں تقویٰ کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ تقویٰ کے لغوی معنیٰ "بچنا" کے ہیں۔ اس کا سہ حرفی مادہ "و ق ی" ہے۔ اس مادہ سے وَقٰی۔یَقِی کے معنی ہیں کسی دوسرے کو بچانا۔ جیسے ہم دعا مانگتے ہیں : ﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (اے اللہ) "ہمیں آگ کے عذاب سے بچا"۔ اس دعا میں وَقٰی۔یَقِی سے فعل امر "قِ" استعمال ہوا ہے۔ باب افتعال میں "اِتَّقٰی۔یَتَّقِی" کے معنی خود "بچنا" کے ہیں۔ اب اس بچنے (یعنی تقویٰ) کے تین درجے یا تین پہلو ہیں جنہیں ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک اخلاقی حس رکھی ہوئی ہے جو اندر سے یہ بتلا دیتی ہے کہ یہ شے بری ہے۔ انسان کو اللہ نے اندھا، بہرہ پیدا نہیں کیا۔ جیسے اسے آنکھوں کی بصارت دی ہے ایسے ہی اس کے باطن میں نیکی اور بدی کی پہچان بھی ودیعت کی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم میں بایں الفاظ میں بیان کیا گیا ہے : ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا﴾۔ چنانچہ انسان کے اندر جو یہ تمیز ودیعت شدہ ہے کہ یہ شے اچھی ہے اور یہ شے بری ہے، یہ معروف ہے اور یہ منکر ہے، یہ درست ہے اور یہ غلط ہے اسے بروئے کار لاتے ہوئے تمام اخلاقی برائیوں سے اجتناب تقویٰ کی بنیادی سطح ہے۔ انسان کا ضمیر اسے اخلاقی برائیوں پر متنبہ کرتا ہے کہ جھوٹ بولنا اچھا نہیں ہے، وعدہ خلافی کرنا اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ ضمیر کی پکار پر ان برائیوں سے بچنا تقویٰ کی جڑ اور بنیاد ہے۔

۲۔ تقویٰ کی اس سے بلند تر سطح یہ ہے کہ جب ایک شخص اللہ کو پہچان کر اس پر ایمان لے آیا اور اس نے اللہ کے رسول کو رسولِ برحق جان کر مان لیا تو اب اس کے لئے تقویٰ کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اب تقویٰ کا دائرہ صرف اخلاقی معاملات پر محیط نہیں ہو گا

بلکہ اس کے معاش اور معاشرت سمیت تمام انسانی معاملات اس دائرے کے اندر آئیں گے۔ اب اس کے لئے تقویٰ کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کو توڑنے سے بچے۔ جس شے کو اللہ اور رسول ﷺ نے "حرام" کہہ دیا ادھر رخ بھی نہ کرے اور جسے "فرض" قرار دے دیا اس کی پابندی کو اپنے اوپر لازم سمجھے۔ اگر اس نے کسی حرام کا ارتکاب کیا تو بھی ان کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اگر کسی فرض پر عمل نہیں کیا تب بھی ان کے حکم کو توڑ دیا۔ اور یہ طرز عمل تقویٰ کے منافی ہے۔

واضح رہے کہ حرام کے علاوہ مکروہِ تحریمی سے بچنا بھی ضروری ہے۔ مزید برآں مکروہِ تنزیہی سے بچنے کی کوشش بھی کی جائے اور اپنے آپ کو اس دائرے کے اندر محدود رکھا جائے جو واضح طور پر بلاشک وشبہ حلال ہے۔ یہ تقویٰ کی دوسری منزل ہے۔

۳۔ تیسرا تقویٰ آخرت کا تقویٰ ہے جو دراصل مذکورہ بالا تقویٰ کا نتیجہ ہے۔ یعنی دنیا میں تقویٰ اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے اور جہنم کی سزا سے بچ جاؤ گے۔ سورۃ التحریم میں الفاظ وارد ہوئے ہیں : ﴿قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ یعنی "بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے"۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا : "اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ" آگ سے بچنے کی کوشش کرو چاہے وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی ہو۔ یعنی اگر کوئی شخص خراب اور مخدوش حالات میں گرفتار ہے' فرض کیجئے کہ قحط کا عالم ہے اور کسی شخص کے پاس اور کچھ نہیں ہے' بس ایک کھجور ہے اور اس وقت کوئی سائل آگیا ہے اور اس نے اس کھجور کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھی اس کو دے دی اور آدھی خود استعمال کر لی تو شاید یہ کھجور کا ایک نصف ٹکڑا ہی اس کی نجات کے لئے کافی ہو جائے' حالانکہ یہ حقیر سی شے ہے۔ دوسری طرف اگر کسی شخص کے پاس ایک کلو کھجوریں ہوں اور وہ ان میں سے آٹھ دس بھی خیرات کر دے تو بھی وہ اس مقام کو تو نہیں پہنچ سکتا۔

اس اعتبار سے تقویٰ کی تین اقسام ہو گئیں۔ ایک تقویٰ اخلاقی اعتبار سے' جو انسان کا اپنے اندر موجود اخلاقی حس یا ضمیر کی راہنمائی میں بدی کو پہچان کر اس سے بچنا اور اجتناب کرنا ہے' خواہ اس تک وحی کی روشنی ابھی پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ قرآن کے نزول

اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی دنیا میں ایسے اشخاص موجود تھے جو تقویٰ کے اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ تقویٰ کے اس معنی میں قرآن اپنے آپ کو "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کہتا ہے۔ یعنی یہ قرآن ایسے متقیوں کے لئے ہدایت ہے جو اپنی اخلاقی حس کی پیروی تو پہلے ہی سے کر رہے ہیں۔ ان کا دل اور ان کا ضمیر بتاتا ہے کہ یہ شے اچھی نہیں ہے تو وہ اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ گویا ان میں قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے بنیادی اہلیت موجود ہے اور اب ان کے لئے مزید تعلیم و ہدایت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مزید تعلیم و ہدایت کے لئے اللہ نے کتاب اتار دی ہے، اپنا نبی بھیج دیا ہے۔ اب ان کے لئے تقویٰ کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ جو کچھ اس کتاب میں حلال ٹھہرایا گیا ہے وہ اب اسی تک محدود رہیں گے اور جس شے کو حرام قرار دیا گیا ہے اسے ترک کر دیں گے۔ اور اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ آخرت میں اللہ کے عذاب سے اور جہنم کی سزا سے بچ جائیں گے۔ تقویٰ کے یہ تین مفہوم ذہن میں رکھ کر اب پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے جس کا آغاز "یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ" (اے لوگو!) کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ ابھی یہاں "یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے خطاب نہیں ہے بلکہ پوری نوع انسانی، تمام انسان بحیثیت انسان اس کے مخاطب ہیں۔ نوع انسانی کا ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت "یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ" میں شامل ہے۔

یہی مضمون سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ میں بھی وارد ہوا ہے اور وہاں بھی آیت کا آغاز "یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا ہے۔ سورۃ الحجرات کی کل اٹھارہ آیات ہیں، جن میں سے پانچ آیات "یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ نسبت قرآن حکیم کی کسی اور سورت میں موجود نہیں ہے) لیکن آیت ۱۳ اس اعتبار سے منفرد مقام کی حامل ہے کہ اس کا آغاز "یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ" کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ آیت سورۃ النساء کی پہلی آیت کی ہم وزن آیت ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی﴾ "اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا" یعنی نوع انسانی کا آغاز آدم و حوا سے ہوا۔ یہاں "نفس واحدۃ" کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ﴿وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ﴾

"اور ہم نے تمہاری برادریاں اور قبیلے بنا دیئے"۔ یعنی پہلے خاندان اور برادریاں وجود میں آئیں، ان سے قبیلے بنے، قبیلوں سے قومیں تشکیل پائیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں قوم میں اتنے قبیلے اور اتنے خاندان ہیں، مثلاً وٹو قبیلے میں "مانیکے" اور "لالیکے" وغیرہ کی تقسیم ہے۔

قوموں اور قبیلوں وغیرہ کی تقسیم کی غرض وغایت یہ بیان کی گئی کہ ﴿لِتَعَارَفُوا﴾ "تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو" ـــــ ایک دوسرے سے اس بنیاد پر تعارف ہو سکے کہ اس شخص کا تعلق فلاں قبیلے سے ہے جس کی یہ روایات ہیں، اس کا یہ تاریخی پس منظر ہے، ان لوگوں کی ایسی عادات ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ قرآن حکیم میں سورۃ الروم میں "اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ" (تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف) کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔ اگر ساری دنیا میں ایک ہی جیسے انسان ہوتے، ان میں رنگ و زبان کا کوئی فرق نہ ہو تا تو ان کی شناخت کیسے ممکن ہوتی۔ اب ہم صرف رنگ یا زبان سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص فلاں قبیلے یا فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم کسی شخص کی صرف شکل و صورت سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ چین کا رہنے والا ہے، اور ان لوگوں کی فلاں فلاں خصلتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہم کسی شخص کے صرف لہجے سے معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ سرائیکی علاقے کا ہے۔

عزت کا قرآنی معیار

اب آگے عزت و فضیلت کا معیار بتایا جا رہا ہے۔ فرمایا: یہ رنگ و نسل اور قبیلوں اور قوموں کی تقسیم عزت کی بنیاد نہیں ہے۔ بلکہ ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ یقیناً تم میں زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے"۔ انفرادی سطح پر انسان کے لئے سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ معاشرے میں اسے باعزت سمجھا جائے۔ اس اعتبار سے مختلف معیارات کو عزت کی بنیاد سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور یہ مرض مَردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے کہ وہ لباس، زیور، دولت، مکان اور خاندان وغیرہ کو عزت کا معیار بنا لیتی ہیں۔ مَردوں کی آمد و رفت چونکہ زندگی کے زیادہ وسیع حلقے کے اندر ہوتی ہے اور انہیں زیادہ وسیع النوع قسم کے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے، لہٰذا

ایک طرح سے ان کا ذہنی افق وسیع ہوتا چلا جاتا ہے' اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

چنانچہ بہت سے مرد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ذہنیت عورتوں والی ہوتی ہے اور بہت سی عورتیں مردوں کی طرح کا مزاج رکھتی ہیں۔ لیکن عام قاعدہ یہی ہے کہ عورتوں کا دائرہ چونکہ محدود ہوتا ہے لہٰذا ان کے ہاں یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اور وہ ان کی بناء پر اونچ نیچ کے معیارات قائم کر لیتی ہیں کہ ہم معزز خاندان سے ہیں' خان ہیں یا چودھری ہیں اور فلاں تو کمی کاری ہیں۔ ہماری تو کوٹھی اتنی بڑی ہے اور ان کی ہمارے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو انفرادی سطح پر ہماری ساری بھاگ دوڑ اور جدوجہد کوشش ان معیارات کو حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ ہماری سوچ یہ ہوتی ہے کہ ہم زیادہ نمایاں اور زیادہ باحیثیت ہو جائیں' ہمیں زیادہ لوگ پہچانیں' ہماری زیادہ عزت اور زیادہ آؤ بھگت کی جائے' ہمارا اعزاز و اکرام زیادہ ہو۔ مَردوں میں اس سے بڑھ کر یہ سوچ پروان چڑھتی ہے کہ ہمارے پاس اقتدار ہو ایک شخص سوچتا ہے کہ گلی کی چودھراہٹ میرے پاس ہو' محلے کی چودھراہٹ میرے پاس ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ شہر کی چودھراہٹ اور پھر ملک کے اقتدار کی خواہش رکھتا ہے۔ انفرادی اور ملکی سطح پر انسانوں کے اندر بغض و عناد' دشمنی' نفرتیں' کدورتیں اور منافستیں انہی بنیادوں پر پیدا ہوتی ہیں کہ کون اونچا ہے کون نیچا' کون اعلیٰ ہے کون ادنیٰ' کون برتر ہے اور کون کم تر۔ اس آیت میں ان تمام معیارات کی نفی کرتے ہوئے عزت کا معیار "تقویٰ" کو بنایا گیا ہے۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں تقویٰ کا ذکر آغاز میں آیا تھا' جبکہ سورۃ الحجرات کی تیرھویں آیت میں تقویٰ کا ذکر بعد میں آیا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ "اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ذہنوں سے ان مروّجہ معیارات کو نکال دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بڑے تزکیۂ نفس کی ضرورت ہے۔ کوئی شے عزت کی بنیاد نہ ہو' نہ رنگ و نسل اور خون' نہ شکل و صورت' نہ مال و دولت۔ یہ کڑوی گولی آسانی کے ساتھ

حلق سے نیچے اترنے والی نہیں۔ یوں سمجھیں جیسے کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا تو آسان ہے لیکن بالفعل سارے "الٰہوں" کا انکار کرنا تو بہت مشکل ہے۔ کہیں ہمارا نفس ہمارا "اِلٰہ" بنا ہوا ہوتا ہے' جیسے قرآن حکیم میں کہا گیا : اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ ھَوٰىهُ "کیا آپ ؐ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟"۔ کہیں دولت کو معبود بنایا جاتا ہے' حدیثِ نبوی ہے تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ "ہلاک ہو جائے دینار و درہم کا بندہ"۔ ایسے شخص کا نام اگرچہ عبدالرحمٰن ہو لیکن حقیقت میں وہ عبدالدینار ہے۔ اس کے ایمان کا معاملہ ہی درہم و دینار کے ساتھ متعلق ہے۔ چنانچہ "لا الٰہ الا اللہ" زبان سے کہنا تو آسان ہے لیکن اس کے تقاضے پورا کرنا بہت مشکل ہے۔ بقول اقبال ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

تو جس قدر توحیدِ الوہیت پر حقیقی اعتبار سے کاربند ہونا مشکل ہے اتنا ہی مشکل یہ کام ہے کہ انفرادی سطح پر انسان اپنے اندر سے برتری اور اونچ نیچ کے معیارات کو بالکل نکال کر صرف تقویٰ کے اوپر قائم ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا : ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝﴾ یعنی "اللہ جاننے والا باخبر ہے"۔ سورۃ النساء کی آیت کا آخری ٹکڑا تھا : اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا "اللہ تم پر نگران ہے"۔ تم ہر وقت اس کی نگاہ میں ہو' کبھی اس سے اوجھل اور غائب نہیں ہو سکتے۔ عربی کی ایک نظم کا ایک بڑا پیارا مصرع ہے : "اَغِیبُ وَ ذُوا للّطائفِ لَا یَغِیبُ" یعنی "میں غائب ہو جاتا ہوں (یا ہو جاتی ہوں) اللہ تعالیٰ تو غائب نہیں ہوتا۔" انسان خود محجوب ہو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ تو محجوب نہیں ہوتا۔ یہاں فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ"۔ اور یہاں خاص طور پر "خبیر" کا یہ پہلو ذہن میں رکھئے کہ وہ خوب باخبر ہے کہ کس میں تقویٰ ہے کس میں نہیں ہے۔ کس میں کم ہے اور کس میں زیادہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا علم صرف ظاہر پر موقوف نہیں ہے' اس کا علم تو باطن کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ علیمٌ بذاتِ الصدور ہے۔ وہ خوب جانتا ہے جو کچھ سینوں کے اندر مخفی ہے۔ ""

ہماری نیتوں اور ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ بسا اوقات انسان خود اپنے ارادے کو نہیں پہچان سکتا اور وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے کہ میں یہ کام نیکی کے لئے کر رہا ہوں' جبکہ اس کے پیچھے کوئی اور جذبۂ محرکہ کارفرما ہوتا ہے۔ مثلاً تعلّی یا تکبر جیسے جذبات کی تسکین مقصود ہوتی ہے' لیکن وہ کہتا ہے کہ میں تو بھلائی کے لئے کر رہا ہوں۔ بہرحال اللہ خوب جانتا ہے کہ کس کی حقیقی نیت کیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلا مرحلہ یہی ہے کہ انفرادی سطح پر تقویٰ کی زندگی گزاری جائے۔

دوسرے نمبر پر یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' مختلف داعیات اور جذبات کے ساتھ ساتھ ایک جذبہ مسابقت کا بھی رکھا ہے۔ انسان کے اندر ایک جذبہ بھوک کا ہے۔ اسے بھوک لگتی ہے لہٰذا غذا اس کی ضرورت ہے۔ اگر انسان کو بھوک ہی نہ لگے تو وہ کاہے کو معاشی جدّوجہد کرے؟ ایسے ہی ایک جنسی جذبہ ہے جو مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے۔ اگر انسان میں یہ جذبہ موجود نہ ہو تو وہ کاہے کو شادی کرے' کاہے کو بچوں کا بوجھ اٹھائے اور اپنے لئے مشقت مول لے۔ اسی طرح انسان کے اندر ایک جذبہ مسابقت کا ہے کہ وہ دوسروں سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ اسلام اس جذبہ مسابقت کو divert کرتا ہے' اسے صحیح سمت میں ڈالتا ہے کہ وہ دولت میں آگے نکلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ تقویٰ میں آگے نکلے۔ اس لئے کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"۔ ایک مسلمان بندہ دنیا کی نگاہوں میں آگے نکلنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اللہ کی نگاہ میں آگے نکلنے کی کوشش کرے۔ اب اللہ کی نگاہ میں ہے کہ کون زیادہ متقی ہے' زیادہ پرہیزگار ہے' کون زیادہ بھلائی کر رہا ہے' کون زیادہ وقت اور زیادہ صلاحیت اللہ کی رضاجوئی میں لگا رہا ہے۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تم دنیا کے معاملے میں ان کو دیکھو جو تم سے پیچھے ہیں اور دین کے معاملے میں انہیں دیکھو جو تم سے آگے ہیں۔" اگر آپ انہیں دیکھیں گے جو دین اور تقویٰ میں آپ سے آگے ہیں تو جذبۂ مسابقت ابھرے گا اور آپ بھی اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ پھر آپ کے لئے دین پر چلنا آسان ہو گا۔ پھر آپ کا اندازِ فکر یہ ہو گا کہ اگر ہم نے اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ کر دیا ہے تو کونسی قیامت آگئی ہے' اس سے کوئی موت تو واقع نہیں ہو

گئی۔ یہی ہوا ہے تا کہ کچھ تھوڑی بہت شکر رنجیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کوئی یہی کہہ دے گا تا کہ انہیں دین کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ دین کی خاطر آپ ان مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں گے جو دین پر عمل کرنے میں پیش آئیں گی۔ ہمارے لئے اس سے بڑی بات کیا ہے کہ ہمارے آئیڈیل تو محمد ﷺ ہیں۔ خواتین کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہماری آئیڈیل حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ہمارے لئے اسوۂ حسنہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں جنہوں نے اپنی ساری دولت حضور کے قدموں میں ڈال دی۔ تو اس حوالے سے دین اور تقویٰ میں ہمیشہ ان پر نگاہ رہے جو ہم سے آگے ہیں اور دنیا کے اعتبار سے انہیں دیکھا جائے جو ہم سے پیچھے ہیں۔ یہ دیکھا جائے کہ مجھے تو دو وقت کی روٹی مل رہی ہے' فلاں کے گھر ایک وقت چولہا جلتا ہے' لہٰذا اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ سفرِ حج سے پیدل واپس آرہے تھے اور ان کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اللہ نے دنیا والوں کو اتنا زیادہ دے رکھا ہے اور میرے پاؤں میں جوتی بھی نہیں ہے۔ کسی گاؤں میں پہنچے اور مسجد میں گئے تو وہاں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے دونوں پاؤں ہی نہیں تھے۔ اس پر آپ فوراً سجدے میں گر گئے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے پاؤں تو صحیح سالم رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جو شے انسان کے پاس نہ ہو وہ اس پر افسوس نہ کرے' بلکہ جو شے اس کے پاس موجود ہو' اس پر شکر کرے۔ اگر ہم دین اور تقویٰ میں انہیں دیکھیں جو ہم سے آگے ہیں تا کہ ان کی پیروی کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ وہ مسابقت ہے جو مطلوب ہے۔ اور واضح رہے کہ یہاں "اَتْقٰی" افعل التفضیل کا صیغہ Comparative ڈگری کے مفہوم میں نہیں بلکہ Superlative ڈگری کے معنوں میں آیا ہے۔ ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ "تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہے۔"

مسلمان مرد و عورت کے مطلوب اوصاف

اب تک جو میں نے گفتگو کی ہے اس سطح پر مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق

نہیں۔ اس سطح پر ہمیں بھرپور راہنمائی سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ سے ملتی ہے جو قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دس اوصاف گنوائے ہیں جو مَردوں اور عورتوں دونوں میں مطلوب ہیں۔ عام طور پر قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ان صفات کا ذکر مذکر کے صیغوں میں کر دیتا ہے جو مسلمان مرد و عورت سے مطلوب ہیں۔ اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ بر سبیلِ تغلیب ایک بات جب مَردوں کے بارے میں بیان کر دی جائے تو وہ عورتوں کے بارے میں از خود بیان ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک مجمع میں اگر مرد بھی ہوں اور خواتین بھی موجود ہوں تو ہر جملے میں ان دونوں سے تخاطب کا لحاظ کرنا گفتگو میں طوالت کا باعث بھی بنتا ہے اور دِقت کا بھی۔ لہٰذا روئے سخن مَردوں کی طرف ہو گا اور عورتیں اس میں خود بخود شامل سمجھی جائیں گی۔ قرآن مجید کے اس اسلوب سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام میں شاید عورت کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے کہ بالعموم ان سے براہ راست خطاب نہیں کیا جاتا۔ یہ دراصل اس قاعدے کو نہ جاننے کی وجہ سے ہے کہ مَردوں سے خطاب بر سبیلِ تغلیب ہے اور عورتیں اس میں از خود شامل ہیں۔ لیکن قرآن حکیم میں کہیں کہیں مَردوں کے ساتھ خاص طور پر عورتوں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تاکہ کہیں مغالطہ نہ ہو جائے۔

اس مقام پر بھی دس اوصاف اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ ایک ایک وصف کو خاص طور پر دہرا دہرا کر مَردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ ان اوصاف اور خصوصیات کے اعتبار سے مَردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ......﴾ "یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں" ـــــ "مُسلِم" کے قانونی معنیٰ میں ہم سب مسلمان ہیں۔ تمام مسلمان عورتیں "مُسلِمات" ہیں۔ لیکن "مسلم" کے لفظی معنی ہیں "سرِ تسلیم خم کر دینے والا"۔ یعنی اطاعت گزار، حکم بردار اور فرماں بردار۔

﴿وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ "اور تمام مومن مرد اور مومن عورتیں"۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ سب تقویٰ کی صفات بیان ہو رہی ہیں اور

تقویٰ کی جڑ ایمان ہے۔ اگر اللہ پر ایمان ہے تب ہی آپ اس کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے بچیں گے۔ اگر قرآن پر ایمان ہے تب ہی آپ اس کے بتائے ہوئے فرائض پر کاربند ہوں گے۔ لیکن "ایمان" صرف زبانی اقرار والا نہیں بلکہ یقین اور تصدیق قلبی والا ایمان مطلوب ہے۔ "الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَات" میں ہمارا ظاہری رویہ بیان ہوا ہے کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں اور قانونی طور پر ہم اللہ، رسول اور آخرت کو مانتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل جڑ بنیاد اور باطنی پہلو کو "وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَات" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ ﴾ "اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں"۔ قنوت کہتے ہیں کھڑے رہنے کو، لیکن اس سے مراد فرمانبرداری کے انداز میں مؤدب کھڑے ہونا ہے۔ جیسے بادشاہوں کے دربار میں ان کے خَدَم و حَشَم فرمانبردارانہ دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ اسی لئے وہ دعا دعائے قنوت کہلاتی ہے جو نماز میں کھڑے ہو کر مانگی جاتی ہے۔ چنانچہ اس صفت سے مراد یہ ہے کہ ہروقت ادب کے ساتھ تیار رہنا کہ جو حکم ملے گا اسے بجالائیں گے۔

﴿ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ ﴾ "اور راست گو اور راست باز مرد اور راست گو اور راست باز عورتیں"۔ "صِدق" سچائی کو کہتے ہیں، لیکن اس کا مفہوم محض "سچ بولنا" نہیں بلکہ قول کے علاوہ رویئے میں بھی راست بازی ضروری ہے۔ بعض اوقات آپ زبان سے تو سچ بول رہے ہوتے ہیں لیکن آپ کا انداز اور آپ کا رویہ آپ کے باطن میں پوشیدہ کدورتوں کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "الصَّادقینَ والصَّادقات" کا ترجمہ محض "سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں" نہیں کیا بلکہ "راست گو اور راست باز مرد اور راست گو اور راست باز عورتیں" کیا ہے۔

﴿ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ ﴾ "اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں"۔ صبر کا مفہوم بھی بہت جامع ہے۔ عربی میں "صَبِر" ایلوا کو کہتے ہیں جو بہت

کڑوا ہوتا ہے۔ بعض طبیب اسے دوائی کے طور پلواتے ہیں اور مریض کو اس کے کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ گویا صبر کا بنیادی مفہوم برداشت کرنا ہے۔ چنانچہ صبر معصیت پر بھی ہے کہ خود کو گناہوں سے روکا جائے چاہے اس کی کتنی ہی خواہش ہو۔ اس لئے کہ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ صبر آزمائش پر بھی ہے' کہ دین پر چلنے میں جو آزمائشیں اور تکالیف آئیں ان کو برداشت کیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا" یعنی "یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے..." اگر استقامت اختیار نہ کی تو اللہ کی طرف سے ڈانٹ آ جائے گی : "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ" "کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ محض یہ کہنے سے چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہیں جائے گا؟" اسی طرح صبر اطاعت پر بھی ہے کہ جو حکم بھی ملے اسے بجالایا جائے' خواہ طبیعت آمادہ ہو یا اس پر جبر کرنا پڑے۔ مثلاً شدید سردی میں گرم پانی میسر نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ وضو نماز کی شرط ہے۔

﴿وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ﴾ "اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں"۔ "خشع" جھک جانے کو کہتے ہیں۔ "قنوت" یہ کیفیت ہے کہ ادب کے ساتھ مستعد ہو کر کھڑے رہنا کہ جو حکم آئے گا اسے بجالائیں گے' لیکن خشوع یہ ہے کہ کسی کی عظمت' کسی کے رعب اور دبدبے اور کسی کے جلال کے خیال سے دل اندر سے جھکا ہوا ہو۔ چنانچہ یہاں جلالِ خداوندی کے خیال سے دل میں جھکاؤ پیدا ہونا مراد ہے۔

﴿وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ﴾ "اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں"۔ عورتیں عام طور پر یہ کہہ دیتی ہیں کہ مال تو مردوں کے پاس ہوتا ہے' حالانکہ ہر عورت نے کچھ نہ کچھ رقم ضرور پس انداز کی ہوتی ہے اور اس میں سے خرچ کرنا اس پر شاق گزرتا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی ضروریات' اپنی خواہشات اور اپنی پسندیدگیوں کو ترک کر کے اللہ کی رضا کی خاطر ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا بہت

زیادہ اجر و ثواب ہے۔ اس میں اصل سوال مقدار اور کمیت کا نہیں ہے بلکہ اصل اعتبار کیفیت اور نوعیت کا ہے کہ آدمی کس حال میں کیا خرچ کر رہا ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت سامال و دولت دیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ موجود تھا وہ سب کچھ لے آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے تمام اثاث البیت کا نصف لے آئے، ایک انصاری صحابیؓ نے ایک یہودی کے باغ میں رات بھر مزدوری کی اور کنویں سے کھینچ کھینچ کر پانی بھرتے رہے۔ پوری رات مشقت کرنے کے بعد انہیں معاوضے میں جو کھجوریں ملیں ان میں سے آدھی وہ اپنے گھر والوں کو راشن کے طور پر دے آئے اور آدھی لا کر حضور کی خدمت میں پیش کر دیں۔ منافقین نے فقرے چست کئے کہ ان کھجوروں کے بغیر تو یہ لشکر جا ہی نہیں سکتا۔ لیکن حضورؐ نے ان کا یہ اعزاز کیا کہ ان کھجوروں کو سارے سامان پر پھیلانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ کھجوریں اللہ کی نگاہ میں اس پورے ڈھیر سے زیادہ افضل ہیں۔ تو اللہ کے ہاں ناپ تول کے پیمانے ہمارے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ واضح رہے کہ صدقہ و خیرات میں زکوٰۃ بھی شامل ہے جو ہر صاحب نصاب پر واجب ہے اور دیگر نفلی صدقات بھی!

﴿ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ ﴾ "روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں"۔ صوم کا خاص تعلق تقویٰ کے ساتھ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صوم کے بارے میں قرآن حکیم میں یہ آیت بھی آئی ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ گویا کہ صوم کی غرض و غایت ہی تقویٰ ہے۔

﴿ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ ﴾ "اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرنے والی عورتیں"۔ اور عفت و عصمت کی حفاظت یہی نہیں ہے کہ صرف بدکاری اور زناکاری سے بچا جائے، بلکہ وہ احادیث ذہن میں رہنی چاہئیں جن میں بغیر کسی ضرورت کے کسی نامحرم عورت کی جانب دیکھنے کو آنکھوں کا زنا، اور بغیر کسی ضرورت کے کسی نامحرم عورت کی آواز دلچسپی کے ساتھ سننے کو کانوں کا زنا قرار دیا گیا ہے۔ یہ فتنہ بہت وسیع ہے اور آج کی دنیا میں سب

سے بڑا فتنہ یہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ "میں نے اپنی امت پر عورت سے بڑا فتنہ کوئی نہیں چھوڑا"۔ آج اسلام دشمن عالمی قوتیں اس عورت ہی کے فتنے کو ہوا دینے کے درپے ہیں۔ قاہرہ کانفرنس ہو یا بیجنگ کانفرنس' ان کا مقصد یہی ہے کہ ایشیائی ممالک میں یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں ابھی کسی نہ کسی درجے میں جو خاندانی نظام برقرار ہے اس پر کاری وار کیا جائے۔ لہٰذا عورت کی آزادی اور مساواتِ مرد و زن کے نعرے کی آڑ میں یہ قوتیں اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ عورت کے پردہ اور حجاب کو فرسودگی کی علامت قرار دیا جارہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ مرد و زن کو شانہ بشانہ کام کرنا چاہئے' یہ ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ نہ ان کے حقوق میں کوئی فرق ہے اور نہ نکاح و طلاق کے اختیارات میں کوئی فرق ہے۔ دو عورتیں اگر باہم شادی کرنا چاہیں اور شوہر بیوی کے طور پر رہنا چاہیں تو انہیں اس کا حق حاصل ہے اور اگر دو مرد آپس میں شادی کرلیں اور شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو ان کا بھی یہ قانونی حق ہے۔

انسدادِ فتنہ کے لئے اسلام کے اقدامات

یہ فتنہ آج کا سب سے بڑا فتنہ ہے اور اسلام نے اس فتنے کے سدِباب کے لئے تین درجوں میں اقدامات کئے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کے دائرۂ کار علیحدہ ہیں۔ مرد و زن کے اختلاط اور ان کے مخلوط اجتماعات کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کے تعلیمی ادارے الگ ہوں اور لڑکوں کے الگ ہوں۔ لڑکیوں کو خواتین اساتذہ تعلیم دیں اور لڑکوں کو مرد اساتذہ اسی طرح مردوں کے ہسپتال علیحدہ ہوں اور عورتوں کے علیحدہ۔ خواتین کے ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹرز اور خواتین نرسیں ہوں جبکہ مَردوں کے ہسپتال میں مرد ڈاکٹر اور میل نرسز ہوں۔ کیا مَردوں کے ہسپتالوں میں خواتین نرسوں کا ہونا ضروری ہے؟ کیا مرد یہ کام نہیں کرسکتے؟ خواتین کا علاج خواتین کو کرنا چاہئے۔ تاہم اگر کسی جگہ لیڈی ڈاکٹر نہ ہو تو پردے اور ستر کے احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرد ڈاکٹر سے بھی علاج کرایا جاسکتا ہے۔ بہرحال اسلام میں اختلاط مرد و زن کی اجازت قطعاً نہیں ہے اور اسلام ان دونوں کے الگ الگ دائرۂ کار متعین کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کے معاشرتی نظام میں فرائض کی تقسیم یہ ہے کہ مرد کے ذمے حال ہے' جبکہ عورت کے ذمے مستقبل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مستقبل کی اہمیت حال سے زیادہ ہوتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں ہی کی گود میں اس کی پرورش ہوگی' جو گویا اس کا پہلا مدرسہ ہے اور ماں کے دودھ کے ساتھ ہی بچے میں اچھے جذبات و احساسات منتقل ہوں گے۔ اگر ماں کے اندر تقویٰ موجود ہو گا تو ماں کے دودھ میں بھی اس کے اثرات ہوں گے جو بچے میں منتقل ہوں گے۔ تو یہ مستقبل کی انتہائی اہم ذمہ داری عورت پر ڈالی گئی ہے' جبکہ مرد کے ذمے حال یعنی معاشی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری ہے۔ فرائض کی اس تقسیم کے باوجود اسلام نے عورت کو گھر میں مقید نہیں کیا' بلکہ وہ ضرورت کے تحت گھر سے باہر جا سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں اسلام نے اسے حجاب کا تحفظ فراہم کیا ہے۔ سوائے ایک محدود تعداد کے رشتہ داروں کے (جن کی تفصیل سورۃ النور میں موجود ہے) عورت کسی کے سامنے بغیر پردے کے نہ آئے۔ وہ باہر نکلے گی تو پورے حجاب میں ہو گی' جس کا حکم سورۃ الاحزاب میں موجود ہے۔ حجاب کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لمبی سی بڑی چادر اوڑھ کر اس کا ایک حصہ چہرے کے سامنے لٹکا لیا جائے یا برقع پہن کر اس کا نقاب سامنے لٹکا لیا جائے۔ اب جو محرم رشتہ دار ہیں' مثلاً بیٹا' بھائی یا باپ' تو ان سے حجاب نہیں ہے' البتہ ستر کی پابندی وہاں بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے بھی سوائے چہرے کی ٹکیہ' ہاتھ اور ٹخنوں کے نیچے پاؤں کے جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا نہیں ہونا چاہئے۔ اس سے آگے کی اجازت صرف شوہر کے لئے ہے۔

کسی اشد ضرورت کے تحت عورت معاشی جدّوجہد میں بھی شریک ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی بڑی قوم سے مقابلہ ہو جس کے مرد اور عورت معاشی میدان میں بھرپور کام کر رہے ہوں اور اس کے مقابلے میں اپنی قوم کی معاشی حالت بہت ابتر ہو' یا کسی خاتون کو کوئی ذاتی مجبوری درپیش ہو تو اسلام عورت کو معاشی میدان میں آنے سے نہیں روکتا۔ لیکن اس صورت میں بھی نہ تو ستر و حجاب کی پابندی میں کوئی نرمی ہو گی اور نہ ہی اختلاطِ مرد و زن کی اجازت ہو گی۔ چنانچہ ایسے کارخانے قائم کئے جا سکتے ہیں جہاں صرف عورتیں کام کریں اور ان کی نگرانی کرنے والی بھی عورتیں ہوں۔ عورتوں کو کاٹیج انڈسٹری دے دی جائے

کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر کام کریں۔ سوئٹزرلینڈ میں گھڑیوں کے پرزے گھروں پر ہی تیار ہوتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ پرائمری کی سطح تک سکولوں میں کسی مرد استاد کو ملازم نہ رکھا جائے۔ پرائمری تک کے بچوں میں ابھی جنسی شعور نہیں ہوتا اور چھوٹے بچوں کو تدریس کے دوران نرمی اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ وصف اللہ تعالیٰ نے مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ رکھا ہے۔ لہٰذا پرائمری کی سطح تک کی تعلیم بالکلیہ خواتین کے سپرد کر دی جائے۔

بہرحال یہ تین درجے ہیں جن میں اسلام نے اس فتنے سے بچنے کے لئے مرد و عورت پر پابندیاں عائد کی ہیں --- (i) مرد و زن کا عدم اختلاط (ii) فرائض کی جداگانہ تقسیم (iii) ستر و حجاب کی پابندی۔ ان سے مقصود کیا ہے؟ یہی جو ان الفاظ میں بیان کیا گیا۔ "وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ" --- یعنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنا ہے کہ کہیں جنسی طور پر شہوت کا کسی اعتبار سے غلط استعمال نہ ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ خاندان تباہ ہو جائے گا اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

اب آخری شے یہ بیان کی گئی: ﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾ "اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں"۔ ذکر سے مراد یاد دہانی اور اللہ کو یاد کرنا ہے۔ دین کے محدود تصور کی بنا پر ہم نے ذکر کے مفہوم کو بھی تسبیح کرنے اور اللہ اللہ کرنے تک محدود کر دیا ہے، حالانکہ سب سے بڑا ذکر مجید قرآن ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت زیرِ مطالعہ سے پہلی آیت (۳۴) کے الفاظ ہیں:
﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ یعنی "(اے نبی کی بیویو!) اور یاد کرتی رہا کرو ان چیزوں کو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت میں سے تلاوت کی جاتی ہیں۔" چنانچہ سب سے بڑا ذکر تو قرآن ہے۔ پھر نماز بھی ذکر ہے۔ فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"۔ پھر مسنون دعائیں بھی ذکر کی بہترین صورتیں ہیں کہ انسان دنیا کا جو کام بھی کر رہا ہو (یا کر رہی ہو) اس میں اس کے ساتھ ایک مسنون دعا اس کے لبوں پر ہو۔ اس سے دو نسبتیں قائم ہو جاتی ہیں، ایک اللہ کے ساتھ اور ایک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ۔ چونکہ وہ اللہ سے دعا کر

رہا ہے لہٰذا اللہ سے نسبت قائم ہو گئی اور چونکہ یہ مسنون دعا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہے' آپ ہی کی سکھائی ہوئی ہے لہٰذا حضور ﷺ سے نسبت قائم ہو گئی۔ بہرحال سورۃ الاحزاب کی اس آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بالکل متوازی اور ہم وزن دس اوصاف مردوں اور عورتوں کے لئے بیان فرمائے ہیں :

آخر میں فرمایا : ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ "اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے"۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان میں شامل کرے' عورتوں کو بھی اور مردوں کو بھی! آمین یا ربّ العالمین!!

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ :

((اِنَّ الرَّجُلَ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِهٖ مِنَ الْقُرْآنِ شَیْءٌ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ))

رواہ احمد والترمذی' وقال: حسن صحیح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :
"جس شخص کے سینے میں قرآن میں سے کچھ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے"۔

مسئلۂ ایمان و کُفر (۲)
قرآن و حدیث کی روشنی میں

مولانا محمد طاسین

ایمان کی شرعی حقیقت کے بارے میں جب ہم احادیث رسول ﷺ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمارے سامنے صحاحِ ستہ کی ایک متفقہ اور مسلّمہ طور پر صحیح ترین حدیث جلوہ افروز ہوتی ہے جسے حدیثِ جبریل کہا جاتا ہے اور جو ایمان اور اسلام کی شرعی حقیقت کے بیان میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہتر ہو گا کہ یہاں اس حدیث کو عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ رقم کر دیا جائے:

عن ابن عمرؓ قال حدثنی ابی عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہما) قال بینما نحن عند رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یومٍ اذ طلع رجلٌ شدیدُ بیاضِ الثیابِ شدیدُ سوادِ الشعرِ لایُرٰی علیہ اثر السفرِ ولا یعرفہٗ منا احدٌ حتیٰ جلس الی النبیِّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاَسْنَدَ رُکبتَیہ الٰی رکبتَیہ ووَضَع کَفّیہ علٰی فَخِذیہ و قال : یامحمد اَخبِرنی عن الاسلام! فقال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : الاسلامُ ان تشھدَ ان لا الٰہ الا اللّٰہ وانَّ محمدًا رسولُ اللہ، وتُقیمَ الصلٰوۃَ، وتُوتی الزکٰوۃَ، وتصومَ رمَضان، وتحجَّ البیتِ اِن استطعتَ الیہ سبیلا، قال : صدقتَ، قال : فعجبنا لہ یسألہ و یصدّقہ، قال : فاَخبرنی عن الایمان! قال : ان تومن باللّٰہ وملائکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والیومِ الاخرِ وتؤمنَ بالقدرِ خیرہٖ وشرہٖ،

قال صدقتَ ' قال : فأخبرني عن الإحسان! قال : ان تعبدَ اللّٰهَ كأنّكَ تراه ' فإن لم تكن تراه فانّه يراكَ....

(الحدیث ' کتاب الایمان ' صحیح مسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کیا کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک ایک شخص سامنے سے نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اجلے اور بال بہت زیادہ سیاہ تھے اور اس شخص پر سفر کا کچھ اثر دکھائی نہ دیتا تھا (گویا وہ اجنبی مسافر نہ لگتا تھا) لیکن ہم میں سے کوئی اسے جانتا پہچانتا نہ تھا (گویا اجنبی تھا)۔ یہ شخص (مجمع میں بیٹھے ہوئے صحابہ کرام کے حلقہ سے گزرتا ہوا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب پہنچ کر اس طرح دو زانو ہو کر بیٹھ گیا کہ اس کے زانو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو مبارک سے ملے ہوئے اور اس کے ہاتھ رسول اللہ ﷺ کی رانوں پر رکھے ہوئے تھے۔ (اس حالت میں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف آپ کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے) کہا: اے محمد (ﷺ) مجھے بتلایئے اسلام کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: اسلام کی حقیت یہ ہے کہ تم زبان سے یہ شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں ' اور نماز قائم کرو ' اور زکوٰۃ ادا کرو ' اور ماہ رمضان کے روزے رکھو ' اور حج بیت اللہ کی استطاعت رکھتے ہو تو حج کرو۔ یہ جواب سن کر اس شخص نے کہا صدقتَ (آپ نے سچ و درست جواب دیا)۔ راوی حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ یہ شخص پوچھتا بھی ہے اور پھر خود اس کی تصدیق بھی کرتا ہے (کیونکہ پوچھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ نہیں جانتا اور تصدیق کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے)۔ اس کے بعد اس شخص نے پوچھا کہ مجھے خبر دیجئے اور بتلایئے کہ ایمان کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تیرے دل میں تصدیق کے ساتھ اللہ ' اس کے ملائکہ ' اس کی کتابوں ' اس کے رسولوں اور یوم آخرت کا پختہ اعتقاد ہو اور یہ کہ خیر و شر سب اللہ کی تقدیر کے تحت ہے۔ (یہ دوسرا جواب سن کر بھی) اس شخص نے کہا (آپ کا جواب ٹھیک اور درست ہے) آپ نے سچ کہا۔ پھر اس نے تیسری بات جو

پوچھی وہ یہ کہ احسان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو' کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے"۔

میں نے اوپر حدیث کا صرف وہ حصہ نقل کیا اور اس کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ایمان' اسلام اور احسان سے متعلق تھا۔ اس کے بعد اس حدیث میں قیامت اور علاماتِ قیامت کے متعلق سوال و جواب ہے جس کو میں نے بغرضِ اختصار چھوڑ دیا ہے۔

میں یہاں یہ عرض کر دینا مناسب و مفید سمجھتا ہوں کہ حدیث مذکور صرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی سے مروی نہیں بلکہ دوسرے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے لیکن متن حدیث کے الفاظ سب کے ہاں یکساں نہیں' اجمال و تفصیل وغیرہ کے لحاظ سے ان کے درمیان اختلاف ہے مثلاً امام مسلم نے مذکورہ حدیث کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے جو دوسری حدیث بیان کی ہے اس میں اسلام کے متعلق سوال کا جو جواب ہے اس میں اللہ کی توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کی بجائے یہ ہے کہ تُو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے' اور حج بیت اللہ کا ذکر نہیں۔ اسی طرح اس میں ایمان کے متعلق سوال کے جواب میں اللہ' اس کے ملائکہ' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور آخرت کا ذکر تو ہے لیکن تقدیر پر ایمان کا ذکر نہیں' اگرچہ کتاب اللہ پر ایمان میں تقدیر پر ایمان بھی آ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایمان شرعی کی جو تفصیل ہے وہ صرف پانچ ایمانی عقائد تک محدود ہے' عقیدۂ تقدیر اس میں مذکور نہیں۔

بہرحال حدیث جبریل سے متعلق مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی جو متعدد روایات ہیں ان کے مجموعے سے نیز دوسری بہت سی ایسی احادیث سے جو ایمان اور اسلام کی حقیقت کے بیان سے تعلق رکھتی ہیں اور جو کتب حدیث میں خصوصاً کتاب الایمان میں مذکور ہیں' صاف واضح ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت پانچ مذکورہ ایمانی عقائد سے متحقق ہوتی ہے جن کا قرآن مجید کی بعض آیات میں واضح طور پر ذکر ہے۔ چنانچہ جس انسان کے قلب میں وہ پانچ ایمانی عقائد موجود اور جاگزیں ہوں وہ قرآن و حدیث کی رو

سے مومن کا مصداق ہوتا ہے۔

پھر چونکہ ایمان کا تعلق انسان کے قلب سے ہے جو باطنی چیز ہے لہذا اس کا براہ راست اور قطعی علم سوائے اللہ علیمؒ بذات الصدور کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ایمان کا علم اس کے قول و عمل سے ہی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ انسان کے قول و عمل میں صدق و کذب اور سچ و جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے لہذا قول و عمل سے ایک انسان کو دوسرے انسان کے ایمان کا جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی نہیں' ظنی ہوتا ہے۔ یعنی اس کی کیفیت یقین کی نہیں ظن غالب کی ہوتی ہے' اور یہ ظنی علم ان احکام پر عمل کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے جو قرآن و حدیث میں ایک مومن کے متعلق بیان ہوئے ہیں۔

اسی طرح قرآن و حدیث میں مومن اور ایمان کی جو مخصوص صفات اور علامات بیان ہوئی ہیں ان سے بھی کسی انسان کے ایمان کا جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی ظن غالب کے درجہ کا ہوتا ہے یقین کے درجہ کا نہیں ہوتا' اور دراصل یہ غالب ظن والا علم ہی وہ علم ہے جس کی بناء پر ایک بندۂ مومن کو ان امور و احکام کا مکلف اور ان حقوق و فرائض کا پابند بنایا گیا ہے جو ہر دوسرے مومن کے لئے اس کے ذمہ عائد کئے گئے ہیں' البتہ اس ظنی علم کی بناء پر کوئی شخص قسم کھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص حقیقی طور پر یقیناً مومن ہے کیونکہ اس کا دارومدار قطعی و یقینی علم پر ہے جو کسی شخص کو دوسرے شخص کے قلبی ایمان کے متعلق حاصل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کسی شخص کے مسلم ہونے کے لئے حدیث جبریل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عملی زندگی میں پانچ بنیادی ارکان موجود ہوں۔ وہ زبان سے کلمہ شہادت پڑھتا' نمازیں قائم کرتا' زکوٰۃ دیتا' ماہ رمضان کے روزے رکھتا اور بصورت استطاعت حج بیت اللہ کو فرض اور ضروری سمجھتا ہو۔ اور پھر اگرچہ ان مذکورہ پانچ ارکان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا' اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو ماننے اور ان پر عمل کرنے والے شخص کے دل میں ایمانی عقائد موجود ہیں جن کی بناء پر کوئی شخص مومن قرار پاتا ہے لیکن چونکہ یہ دلالت بھی جس قول و عمل کے ذریعے ہوتی ہے اس میں بھی صدق و کذب کا احتمال پایا

جاتا ہے لہٰذا یہ دلالت قطعی نہیں ظنی ہوتی ہے۔ چنانچہ قطعیت اور یقین کے ساتھ ایسے شخص کے متعلق مومن ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس کے مومن ہونے کی کوئی انسان نفی بھی نہیں کر سکتا کیونکہ دل کے اندر ایمان ہونے نہ ہونے کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ جو شخص دوسرے کے متعلق ایسا دعویٰ کرے وہ کاذب و جھوٹا قرار پاتا ہے۔ بہرحال ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان پر جو حقوق وواجبات عائد ہوتے ہیں وہ مذکورہ پانچ بنیادی ارکان کی بناء پر عائد ہوتے ہیں جو کسی انسان کی زندگی میں عملی طور پر پائے جاتے ہوں۔ غرضیکہ جو شخص مذکورہ پانچ ارکان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا ہو وہ شرعی طور پر مسلم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے جملہ حقوق اور مراعات کا مستحق قرار پاتا ہے جو قرآن و حدیث میں ایک مسلمان کے لئے مقرر ہیں۔ ایسا شخص سوائے شرک جلی کے دوسرے کسی کبیرہ گناہ کی وجہ سے نہ دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے اور نہ ہی ان حقوق و واجبات سے محروم ٹھہرتا ہے جو ایک مسلم کے لئے مخصوص ہیں۔ شرک جلی، جیسے بت وغیرہ کی عبادت و پرستش، ایک ایسی چیز ہے جس سے دعویٰ ایمان و اسلام کی نفی ہو جاتی ہے اور ایسا شخص ان حقوق وواجبات سے محروم ہو جاتا ہے جو ایک مومن اور مسلم کے لئے شریعت اسلامی میں مقرر ہیں۔ اس کی کچھ مزید وضاحت یہ ہے کہ دائرہ ایمان واسلام میں داخل ہونے کے لئے جس کلمہ کا پڑھنا شرط اور ضروری ہے وہ کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللّٰہ محمدٌ رسولُ اللّٰہ ہے۔ اس میں واضح اظہار اور صاف اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی اس کا اہل و مستحق نہیں کہ اس کی عبادت و پرستش کی جائے۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی بندوں کی ہر عبادت و بندگی کا حقدار ہے۔ کوئی کافر جب یہ کلمہ توحید پڑھتا ہے تو وہ پڑھتے ہی مشرف بہ اسلام ہو جاتا ہے لیکن پھر جب وہ کفار و مشرکین کی طرح سے کسی بت وغیرہ کی عبادت و پرستش کرتا ہے تو کلمہ توحید کے معنیٰ و مفہوم کا اپنے عمل سے انکار کر دیتا اور حلقہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔ شرک کو قرآن مجید میں ایک ایسا گناہ بتلایا گیا ہے جو ناقابل مغفرت ہے اور جس کے مرتکب پر جنت حرام قرار دی گئی ہے، جبکہ دوسرا ہر گناہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور کبیرہ کیوں نہ ہو قابل مغفرت بتلایا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ

يَّشَاءُ..... ﴾ (النساء : ۴۸)

"یقین جانو کہ اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا دوسرے ہر گناہ کو جس کے لئے چاہے بخشتا اور معاف کرتا ہے"۔

سورۃ المائدہ کی آیت ہے :

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ.... ﴾ (آیت ۷۲)

"حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو اس پر اللہ نے جنت حرام ٹھہرائی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے"۔

ایمان اور اسلام کی شرعی حقیقت کے بیان کے بعد اب وقت آیا ہے کہ کفر کی شرعی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے اور اس کو واضح کیا جائے۔ کفر کی شرعی حقیقت کے متعلق قرآن و حدیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کفر' ایمان کی ضد اور نقیض ہے۔ دونوں ایک ساتھ کسی انسان کے اندر جمع اور موجود نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات یہ کہ حقیقتِ کفر کا تعلق بھی انسان کے قلب و دل سے ہے اور وہ ایک باطنی چیز ہے جس کا قطعی اور یقینی علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کے کفر کا علم ہو سکتا ہے تو صرف اس کے قول و عمل سے ہو سکتا ہے' اور قول و عمل میں چونکہ صدق و کذب اور سچ و جھوٹ دونوں کا احتمال ہوتا ہے لہٰذا ایک شخص کو دوسرے شخص کے کفر کا جو علم ہوتا ہے وہ قطعی نہیں ظنی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ظن غالب کی ہوتی ہے' جیسا کہ پہلے ایمان کے متعلق عرض کیا گیا۔ تیسری بات یہ کہ جس طرح ایمان پانچ مابعد الطبیعی غیبی حقیقتوں کی قلبی تصدیق اور ان کے پختہ اعتقاد کا نام ہے اسی طرح اس کے برعکس کفر ان حقیقتوں کی قلبی تکذیب اور دلی انکار کا نام ہے۔ کفر کا تعلق بھی انہی غیبی حقیقتوں سے ہے جن سے ایمان کا تعلق ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ (النساء : ۱۳۶)

"اور جس نے (دل سے) انکار کیا (اللہ کی ذات وصفات) کا، اللہ کے ملائکہ کا، اللہ کی کتابوں کا، اللہ کے رسولوں کا اور یوم آخر کا، پس وہ گمراہ ہوا بہت دور کی گمراہی میں"۔ (یعنی راہ حق سے انتہائی طور پر دور ہو گیا)

بالفاظ دیگر مطلب یہ کہ جن پانچ غیبی امور کو دل سے ماننے کا نام ایمان ہے ان کو دل سے نہ ماننے اور ان کا انکار کرنے کا نام کفر ہے۔ یا یوں کہئے کہ ایمان میں جن مابعد الطبیعی غیبی حقیقتوں کا اثبات ہے کفر میں ان کی نفی ہے۔ ایمان کا معنی و مفہوم ایجابی اور کفر کا مفہوم و مطلب سلبی نوعیت کا ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعے سے یہ بھی معلوم اور واضح ہوتا ہے کہ جس انسان کے دل میں ایمانی عقائد حقیقی اور صحیح طور پر موجود اور متمکن ہوں اس کی عملی زندگی میں خاص طرح کے اوصاف اور اعمال کا ظہور میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ اللہ کی ذات اور اس کے جمالی و جلالی صفات کا عقیدہ بندہ مومن کو مجبور اور بے بس کر دیتا ہے کہ وہ ایسے اعمال اور طور طریقے عمل میں لائے جن سے اس کی بندگی، عاجزی، درماندگی اور نیاز مندی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا اظہار ہوتا ہو، جس کا دوسرا نام عبادت و بندگی ہے۔ گویا اللہ کی ذات وصفات کے عقیدے کا اللہ کی عبادت و پرستش اور اس کی اطاعت و بندگی سے نہایت گہرا اور مضبوط تعلق ہے جیسا لازم و ملزوم کے مابین ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بندے کے دل میں اللہ وحدہٗ لاشریک کا سچا اور پکا اعتقاد ہو اور وہ اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے جان و مال سے خالصتاً اس کی عبادت و بندگی نہ کرے۔ لہٰذا یہ ایک بالکل لازمی اور یقینی امر ہے کہ بندۂ مومن کی زندگی عبادتِ الٰہی سے مزین و آراستہ ہو۔ مسلم ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی میں قولی، عملی اور بدنی و مالی ہر طرح کی عبادت و پرستش کا نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور شہادتین کی شکل میں پایا جانا لازمی و ضروری ہے۔ اسی طرح جس بندۂ مومن کے قلب میں یہ عقیدہ ہو کہ اللہ کی نازل فرمودہ کتابوں میں سے قرآن مجید آخری، جامع اور مکمل کتاب ہدایت ہے اس کے اندر عملی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق جو ہدایات اور جو احکام و فرامین ہیں ان میں انسان کی دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کی ضمانت پائی جاتی اور ان کے ذریعے

انسان کو مادی اور روحانی اعتبار سے پائیدار اور دائمی امن و اطمینان کی حیاتِ طیبہ اور خوشگوار زندگی حاصل اور نصیب ہو سکتی ہے اور وہ دنیا و آخرت کی سعادت و کامرانی سے ضرور بالضرور ہمکنار ہو سکتا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ایسا بندۂ مومن قرآنی ہدایات و تعلیمات پر عمل نہ کرے اور ان سے فائدہ نہ اٹھائے' بلکہ وہ تو اپنی اندرونی تحریک سے مجبور ہوتا ہے کہ عدل و احسان اور صلاح و تقویٰ کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنائے جس کو اختیار کرنے کی قرآن مجید میں واضح تعلیم اور شدید تاکید ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جس بندۂ مومن کے دل میں یہ عقیدہ ہو کہ اللہ نے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نبیوں اور رسولوں کا جو مقدس سلسلہ قائم فرمایا اس کے آخری اور کامل ترین نبی و رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' آپؐ نے بحیثیت نبی و رسول اپنے قول و عمل سے احکام الٰہیہ کی جو تعبیر' تشریح اور تفصیل فرمائی وہ سو فیصد صحیح اور مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع اور واجب العمل ہے اور اس کی حیثیت ناقابل تنسیخ شریعت کی ہے' ایسا بندۂ مومن اپنے لئے ازبس ضروری سمجھتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی سنتِ مطہرہ کی اتباع اور آپ کی پیش کردہ شریعت کی پوری طرح پیروی و پابندی کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ اور اعلیٰ آئیڈیل قرار دے کر اپنی زندگی کو اس کے زیادہ سے زیادہ مطابق بنانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لائے۔

اسی طور جب بندۂ مومن کے دل میں یہ عقیدہ ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور آخرت میں اس کو اس دنیا میں کئے گئے اعمال کی پوری جزاء و سزا ملنی ہے تو وہ ایسے اعمال صالحہ کے بجالانے میں کبھی ہمت نہیں ہارتا اور شکستہ خاطر نہیں ہوتا جن کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے کہ ان کی جزاء اس کو اس دنیا کی زندگی میں نہیں مل سکتی حالانکہ ان اعمال کا بجالانا' انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

غرضیکہ ایمان جن قلبی عقائد کے مجموعے کا نام ہے وہ اپنے اندر ایک خاص طرح کی عملی زندگی کی اقتضاء رکھتے ہیں۔ چنانچہ جس انسان کے اندر وہ اپنی صحیح حقیقی شکل میں موجود ہوں اس کی عملی زندگی اعمال و اوصاف کے لحاظ سے ایک خاص شکل و صورت اختیار کرتی اور سامنے آتی ہے جو ایک کافر اور مشرک کی عملی زندگی سے بالکل مختلف اور

متفاوت ہوتی ہے۔ مومن کی عملی زندگی میں اسلامی عبادات 'صلوٰۃ' صوم' زکوٰۃ' حج اور قربانی وغیرہ لازمی طور پر موجود ہوتی ہیں جبکہ کافر کی زندگی میں وہ بالکل موجود نہیں ہوتیں۔ اگر مشرک ہو تو غیراللہ کی عبادت جیسے بتوں وغیرہ کی پرستش اس کی عملی زندگی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ مومن کی معاشرتی اور عائلی زندگی کے جو شرعی طور طریقے روبعمل ہوتے ہیں وہ ایک کافر کی معاشرتی اور عائلی زندگی کے طور طریقوں سے نمایاں طور پر مختلف اور جدا ہوتے ہیں۔ مومن اپنی معاشی زندگی میں حلال و حرام اور پاک و ناپاک کے شرعی ضابطوں کا پابند ہوتا ہے' وہ حلال و پاک رزق و مال کماتا کھاتا ہے اور حرام و خبیث رزق سے پرہیز و اجتناب کرتا ہے' جبکہ اس کے برخلاف کافر کی معاشی زندگی حلال و حرام کے ان ضابطوں کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ اپنے معاشی امور و معاملات کو اپنی آزاد مرضی سے طے کرتا اور اپنی خواہشات پر چلتا ہے۔ غرضیکہ جس پہلو اور جس گوشہ سے بھی دیکھا جائے ایک ٹھیٹھ مومن اور ایک ٹھیٹھ کافر کی عملی زندگی ایک دوسرے سے مختلف اور جدا نظر آتی ہے اور اس کی اصل وجہ یہ کہ ایک انسان کی عملی زندگی جن ذہنی افکار و نظریات اور جن اخلاقی احساسات و جذبات کی تحریک سے عمل میں آتی ہے وہ ایک مومن اور ایک کافر کے ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہوتے ہیں۔ زندگی اور اس کی کامیابی و ناکامی کے متعلق دونوں کا منتہائے نظر اور مطمع نگاہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوتا ہے۔ مومن کا منتہائے نظر اور مطمع نگاہ بنی نوع انسان کا ہمہ جہت اور عالمگیر مفاد ہوتا ہے' جو مادی اور دنیوی بھی ہوتا ہے اور روحانی و اخروی بھی' جبکہ ایک کافر کا منتہائے نظر و مطمع نگاہ اپنا اور اپنے سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کا محدود مادی اور دنیوی مفاد ہوتا ہے لہٰذا دونوں کی عملی زندگیوں کے درمیان کھلا اور نمایاں اختلاف پایا جانا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔

بنابریں کسی انسان کے متعلق یہ جاننے کا کہ وہ مومن ہے یا کافر' محسوس اور معروضی معیار اس کی عملی زندگی ہی ہوتی ہے۔ مومن کی عملی زندگی اس کے مومن ہونے پر اور کافر کی عملی زندگی اس کے کافر ہونے پر دلالت کرتی ہے' لہٰذا لازمی اور ضروری ہے کہ جب کسی انسان کے متعلق یہ فیصلہ کیا جائے کہ وہ مومن ہے یا کافر' تو یہ

فیصلہ اس کی عملی زندگی کے معیار پر ہونا چاہئے کیونکہ جہاں تک قلبی اور حقیقی ایمان اور کفر کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا اس کا قطعی اور یقینی علم سوائے اللہ علیمٌ بذات الصدور اور علام الغیوب کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعہ بعض اشخاص کے متعلق انبیاء علیہم السلام کو ان کے کفر و ایمان کا جو علم ہوتا ہے وہ بذریعہ وحی یعنی اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے بالواسطہ طور پر ہوتا ہے براہِ راست نہیں ہوتا۔ نیز جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کسی انسان کے قول و عمل سے دوسرے کو اس کے مومن یا کافر ہونے کا جو علم حاصل ہوتا ہے وہ یقین کے درجہ کا نہیں ہوتا بلکہ ظنِ غالب کے درجہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی بنا پر کوئی شخص قسم کھا کر نہیں کہہ سکتا کہ وہ مومن ہے یا کافر ہے کیونکہ اس کے لئے قطعی اور یقینی علم کا ہونا ضروری ہے۔ البتہ ایک مومن یا کافر کے متعلق دنیا میں جو شرعی احکام ہیں ان پر عمل کرنے کے لئے غالب ظن پر مبنی یہ ظنی علم کافی ہوتا ہے۔

(جاری ہے)

علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم

ڈاکٹر ابو معاذ

صاحب مضمون میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ادبیات فارسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی رکھتے ہیں۔ فکر اقبال اور انقلاب ایران سے خصوصی شغف ہے۔ اپریل ۷۹ء میں امیر تنظیم اسلامی کی دعوت پر لاہور تشریف لا کر ایک سیمینار میں خطاب فرما چکے ہیں' اب ہماری فرمائش پر انہی افکار کو تحریری شکل دی ہے جس کی پہلی قسط ہدیہ قارئین ہے۔ (ادارہ)

قابل صد احترام ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات میرے لئے کئی لحاظ سے اہم ہے۔ نہ صرف کچھ عرصہ پہلے (تقریباً بیس برس) مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل رہا ہے اور چند مرتبہ آپ کی محفل میں بیٹھنے اور آپ کے افکار سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے بلکہ آپ کا سلسلہ 'مضامین باقاعدگی سے میرے زیر مطالعہ رہا ہے اور میں نے مقدور بھر آپ کے رشحات قلم سے گہراندوزی کی ہے۔ سرزمین عجم اور اصحاب ایران کے شعر و ادب کا شغف ناچیز کو تاریخ علوم کی وادی پر خار میں مائل بہ سفر کرتا رہا ہے۔ اقبالیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے حضرت علامہ اقبال کے تفکرات کو اسی آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں علامہ اقبال کی ذات کا پرتو واضح نظر آنے لگتا ہے۔ غزالی' رازی' رومی' عطار' سنائی' غزنوی' نظیری نیشاپوری' عرفی شیرازی' ابو طالب کلیم' صائب تبریزی' میرزا غالب اور گرامی جالندھری' کے اشعار و افکار کا عکس ہرچند حضرت علامہ اقبال کے کلام پر واضح ہے' مگر ہر لحاظ سے آپ کا اسلوب منفرد ہے اور آپ کا شعر برائے شعر نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے اور آپ نے خود فرمایا ہے ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری ست
شاعری ہم وارثِ پیغمبری ست

(شعر کا مقصد اگر انسانیت کی تعمیر ہے تو شاعری پیغمبری کی وراثت ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی جانب سے مجھے حکم ملا ہے کہ میں اپنے خیالات کو قلمبند کروں اور حضرت علامہ اقبال کے افکار کے وہ پہلو قارئین کو اجاگر کروں جو فارسی علوم

اور حالات عجم سے طویل چشم پوشی کے نتیجہ میں قارئین کی اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہیں۔ میں نے چونکہ اقبالیات کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے اس لئے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے مضامین کے ایک سلسلے کا آغاز کر رہا ہوں جو ممکن ہے غبار خاطر کو دور کر سکے اور قارئین تک حقائق کو پہنچا سکے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ ناچیز کو اس کی توفیق عطا کرے، ورنہ بقول عرفانی ؎

در دلِ تنگم قیامتہا بپاست
گفت من را طاقتِ گفتن کجاست

(میرے دل کی تنگ وادی میں قیامتیں برپا ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہا۔)

جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار اس لئے مشکل ہے کہ شاید عوام الناس کے لئے ایسے خیالات سے سمجھوتہ کرنا آسان نہ ہو کیونکہ ہمارے متداول نظریات ان سے کسی قدر ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اور یہ بات ایسی ہے جو کہ ؏

بدار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

(تختہ دار پہ تو کہی جا سکتی ہے مگر منبر پہ نہیں کہی جا سکتی)

اس تمہید کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔

ایران یا عجم سے کیا مراد ہے؟

ایران کا لفظ "آریان" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "آریاؤں کا وطن۔" پامیر کی بلند چوٹیوں اور ملحقہ وادیوں میں پھیلے ہوئے آریائی باشندے آج سے پانچ چھ ہزار برس پہلے شکار کھیلتے اور تھوڑے بہت گھریلو جانور پالتے ہوئے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ جب ان کی بڑھتی ہوئی آبادی پر یہ وادیاں اور پہاڑ تنگ ہونے لگے تو وہ جنوب کی سمت بڑھے اور آہستہ آہستہ موجودہ ایران کے صحراؤں، سطح مرتفع اور مرغزاروں میں سکونت پذیر ہونے لگے۔ پھر وہ پانیوں کی تلاش میں دجلہ و فرات کی وادیوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے اس سرزمین میں اپنی سکونت اختیار کرتے ہوئے کاشتکاری اور دستکاری کو اپنایا اور آہستہ آہستہ دیہات، قصبات اور شہروں میں مقیم ہوتے چلے گئے۔ اس طرح

معاشی استحکام پیدا ہوا اور نظم و ضبط کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دجلہ کے کنارے مدائن کی تہذیب کا آغاز ہوا۔ مرکز ایران میں سپاہان (یعنی افواج کا مرکز) آباد ہوا، جو صفاہان اور بعد میں اصفہان کے نام سے مشہور ہوا۔ شہر رے (جہاں اب ماڈرن تہران آباد ہے)، پاسار گاد یا تخت جمشید (جہاں سے کچھ فاصلہ پر فارس کا دارالحکومت شیراز آباد ہے)، طوس (جس کے پاس مشہد شہر ہے) اور تبریز کے مراکز وجود میں آئے۔ تہذیب و تمدن کے اس گہوارے میں زرتشت نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ زرتشت (یا زردشت) کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کے قریب تر تھا اور حضرت ابراہیمؑ بھی بابل کے شہر (جو فارس یا ایران کے مرکزی شہروں کے قریب ترین تھا) سے ہی ہجرت فرما کر مصر سے ہوتے ہوئے سر زمین فلسطین میں آباد ہوئے تھے اور وہاں سے عربستان کے ریگزاروں سے گزرتے ہوئے مکہ میں خانہ کعبہ کو آباد کر کے واپس چلے گئے تھے۔ بعد میں آپؑ کے مکہ کے سفر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

زرتشت کے مذہب میں سچائی کی تعلیم دی گئی تھی۔ رفتار نیک، پندار نیک اور گفتار نیک (نیک چال چلن، اچھی سوچ اور اچھی بات) پہ مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔ اس مذہب میں خدائے بزرگ و برتر یعنی اھورامزدا کا واضح تصور تھا۔ نیکی کی قوتوں کے خالق و مالک (یعنی خدائے خیر) کا نام "یزدان" تھا اور اسے "ایزد" بھی کہا جاتا تھا۔ بدی کی قوتوں کے سردار کو "اہرمن" یا "ہریمن" کہا جاتا تھا۔ نیکی اور برائی کی قوتوں کو ہمیشہ بر سرپیکار سمجھا جاتا تھا اور زرتشتیوں کے لئے حکم تھا کہ وہ یزدان کی پرستش کریں اور اہرمن کے لشکر (یعنی شیاطین) سے نفرت کریں اور ایسی طاغوتی قوتوں سے جنگ لڑیں۔ روشنی کو یزدان کی صفت سمجھا جاتا اور تاریکی یا ظلمت کو برائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خدا یعنی یزدان کو نور مجسم اور برائی کو ظلمت مجسم تصور کیا جاتا تھا۔ بت پرستی کسی بھی صورت میں قدیم ایرانی مذہب میں مروج و متداول نہیں تھی۔

مذہبی کتاب اوستا کے نام سے موجود تھی، جو اس قدر ضخیم تھی کہ ۱۲ ہزار گائیوں کی کھالوں پر تحریر کی گئی تھی اور روایات کے مطابق سکندر اعظم نے ۳۲۹ ق م میں اصطخر کے مقام پر اس کو جلایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زرتشتی مذہب میں شروع

شروع میں آتش پرستی یا مظاہر پرستی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس میں تحریف کی گئی اور آگ اور سورج کو نور کا منبع اور سرچشمہ سمجھ کر ان کا احترام کیا جانے لگا اور پھر آتش مقدس کی پرستش شروع کردی گئی۔ اس طرح آتش مقدس کے محافظ "مغ" کہلائے اور مغوں کے منظم سلسلوں نے مذہبی پروہتوں کا مقام سنبھال لیا۔ انہی مغوں کو مغس اور پھر مجس کہا گیا اور عربی زبان میں مجوس کی اصطلاح عام ہوئی۔ خدا کو نور قرآن میں بھی کہا گیا ہے : اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اسی طرح ہدایت کو نور کہا گیا ہے۔ شیاطین اور طاغوتی طاقتوں کے ذکر میں بھی مماثلت ملتی ہے۔ اور پھر نیکی اور بدی کی مسلسل جنگ کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؂

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی
موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
از حیات ایں ہر دو می آید پدید

بعد میں طاغوتی طاقتوں کو خدائے بدی کا لشکر سمجھ لیا گیا اور اہرمن کو خدا کا درجہ دے دیا گیا۔ پھر یہ سمجھ لیا گیا کہ زلزلے اور آفات کا خالق خدائے بدی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد آتش پرستی کے ساتھ ساتھ توحید کی بجائے ثنویت کا تصور مستحکم ہوتا گیا اور خدائے نیکی اور خدائے بدی (یعنی یزدان و اہرمن) کی خلاقی اور قدرت پہ یقین کیا جانے لگا اور پھر ان دونوں قوتوں کا اتصال ایک ذات یعنی "اھورا مزدا" کی شکل میں کیا گیا۔ مرزا غالب نے اس امر کی نفی ان الفاظ میں کی ؂

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

مختصراً یہ کہ یہ مذہب اس علاقے میں خوب پھلا پھولا اور پھر ایرانی افواج کے ساتھ مفتوح علاقوں کا مذہب بن گیا۔ حتیٰ کہ ٹیکسلا کے مقام پر قبل مسیح کے زمانہ کے کھنڈرات میں آتش کدوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ اس مذہب کی دو عیدیں نوروز (بہار کے آغاز پر) اور مہرگان (دسمبر کے آخر میں) بھی تمام مفتوحہ علاقوں میں رائج ہوئیں۔ مدینہ

منورہ میں حضور اکرم ﷺ کی آمد تک یہ عیدیں منائی جاتی رہیں۔ عیسائیت کی ایسٹر کا دن نوروز کے قریب تر ہے اور مہرگان کرسمس کا ہی موقع ہے۔ یہی نوروز بیساکھی اور بسنت کی شکل میں کسی نہ کسی طرح رائج رہی ہے اور برصغیر میں عملاً اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں اسے ختم کر کے عید الفطر کے جشن کو تقدس بخشا گیا۔ اس سے قبل نوروز کو ہی ترجیح دی جاتی رہی ہے اور اس کا ثبوت شعروادب میں ہر جگہ ملتا ہے۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ مذہب بھی تحریف کی زد میں آگیا۔ کچھ کہا تو نہیں جاسکتا مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ مذہب الہامی مذہب ہی ہو مگر تحریف کی وجہ سے اس قدر بدل گیا ہو کہ اس کی صورت بگڑ گئی ہو۔

ایک مستحکم و مضبوط معیشت' ایک نسبتاً منظم مذہب اور ایک مہذب تمدن نے آہستہ آہستہ ایک بادشاہت کی صورت اختیار کرلی' مگر یہ بادشاہت کسی اصول اور آئین پر ہی قائم تھی۔ اس میں بادشاہت کے تحفظ کے کے لئے شاہی خاندان کو تقدس کا درجہ دیا گیا اور شہنشاہ سے وفاداری کو اس ملک کے عوام کے رگ و ریشے میں سمو دیا گیا اور پھر اس کے تحفظ کے لئے ایک فوج کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر ایک مربوط و منظم مواصلات کا نظام وجود میں آیا۔ شعروادب اور آئین جہانبانی وجود میں آئے۔ اس طرح وہ بادشاہت وجود میں آئی جس کی مثال پہلے زمانے میں کبھی نہیں ملی تھی۔ ہخامنشی دور کی تاریخ کسی حد تک وضاحت کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ اس عہد کا سب سے مشہور بادشاہ سائرس یا کوروش اعظم گزرا ہے۔ اس بادشاہ نے عدل و انصاف پہ مبنی ایک نظام قائم کیا اور اپنی سلطنت کو مشرق و مغرب تک وسعت دی۔ اس بادشاہ کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ بائبل یعنی انجیل میں آیا ہے۔

یہ وہی زمانہ تھا جب یہودیوں کو فلسطین میں شکست دینے کے بعد بیت المقدس کو تباہ و برباد کرتے ہوئے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے غلام بنا کر بابل میں مقید کر رکھا تھا۔ کوروش اعظم نے بابل کو زیر تصرف لاتے ہوئے یہودیوں کو ۵۳۶ ق م میں آزاد کر دیا تھا' اور پھر اپنے خرچ پر بیت المقدس اور اس کے تمام تر معبدوں کو از سرنو تعمیر کروایا تھا۔ اپنے زیر انتظام یہودی سلطنت کا احیاء کیا تھا اور پھر عرب کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے بحیرۂ

روم تک رسائی حاصل کر لی تھی' جہاں پر سورج کو اس نے سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا۔ راستے میں اسے وحشی قوموں سے پالا بھی پڑا تھا۔ پرانی تصاویر میں کوروش کے سر پر جو آہنی خود نظر آتا ہے' اس پر دو سینگ بنے ہوئے ہیں۔ عدل و انصاف اور سچائی کے اس پیکر کو تمام مورخین نے اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی نے سورۂ کہف کی تفسیر لکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہی ہے وہ ذوالقرنین (یعنی دو سینگوں والا) ہے جس کی تعریف قرآن پاک میں کی گئی ہے کیونکہ قرآن میں بیان کردہ صفات سے یہی بادشاہ متصف نظر آتا ہے اور اس کے نام سے یہود و نصاری پوری طرح باخبر تھے۔

کوروش کے بعد اس سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہوں میں داریوش اعظم یا دارا کا ذکر ملتا ہے جس نے یورپ کی وادیوں میں سے گزرتے ہوئے اس وقت کی سب سے بڑی فوج کے ہمراہ یونان میں ایتھنز تک فوج کشی کی تھی اور اس کی یلغار سے یورپ میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سکندر اعظم کی بڑھتی ہوئی افواج نے شیراز کے قریب نقش رستم کے مقام پر دارا کو شکست سے دوچار کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

اس دور کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں :

ا) ایک عظیم تہذیب و تمدن کا ظہور

ب) مستحکم بادشاہت کا قیام

ج) آئین جہانبانی و جہانداری کی تشکیل اور قانون سازی

د) کورش اعظم اور داریوش جیسے اہم تاریخی حکمران

ر) زرتشتی مذہب' مذہبی کتاب اور منظم مذہبی رہنمائی کا وسیع نظام

س) بادشاہت میں وسعت کے باعث عرب و فلسطین اور یورپ سے آگاہی

ص) مربوط جنگی نظام اور مسلح افواج کا قیام

ط) زبان' ادب' شعر' فلسفہ اور فنون لطیفہ

ع) بادشاہت کے مرکزی نقطہ کے طور پر شہنشاہ کی مقدس شخصیت کا تسلیم کیا جانا۔

خاندانی اور موروثی بادشاہت کا قیام، خاندان کی وفاداری اور نظام وراثت

ف) اشرافیہ کا طبقہ وارانہ نظام اور مختلف پیشوں کا آغاز

ک) زبان و نسل اور بادشاہت سے وفاداری کی بنیاد پر وطن کا تصور

مندرجہ بالا نکات اس لئے اہمیت کے حامل ہیں کہ آگے چل کر انہی کے اثرات کی روشنی میں ہمیں ایرانی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مثلاً ہمیں عظیم ایرانی تہذیب و تمدن کی برتری کی بنیاد پر عرب و عجم کی چپقلش ایران کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں اہل عجم کے احساس برتری میں نظر آتی ہے۔ مستحکم بادشاہت، شاہ کی ذات کا تقدس اور اس کے لئے وفاداری کا جذبہ بعد کے ہر ملوکانہ نظام میں نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ ایران میں مرکزی اسلامی سلطنت سے باہر رہ کر اپنی آزادانہ بادشاہت کا نہ صرف جذبہ نظر آتا ہے بلکہ اس کی وسعت کی خواہش بھی موجزن دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح لسانی اور وطنی تصورات بھی نسبتاً مستحکم نظر آتے ہیں۔ زرتشتی نظریات، ثنویت اور منظم مذہبی قیادت کے اثرات بھی بعد کے تمام ازمنہ میں دیکھے جاسکتے ہیں اور جنگی یا دفاعی تزویراتی نظام کا تصور ہمیشہ نظر آتا ہے۔ بعد میں ایک وقت آتا ہے جب ہادی برحق رسول اللہ ﷺ بھی جنگ خندق سے قبل حضرت سلمان فارسی ؓ سے مدینہ منورہ کے دفاع کے لئے قدیم ایرانی تزویری نظام کی روشنی میں مشورہ طلب فرماتے ہیں۔

اسی طرح تفسیر قرآن کے لئے بھی ایران کی اس قدیم تاریخ کا مطالعہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے، خصوصاً ذوالقرنین کے ذکر میں اور سورۂ روم کو سمجھنے میں۔ ایک خاندان کے افراد سے موروثی وفاداری سلطنت سے نکل کر مذہبی حدود میں آجاتی ہے اور بعد کے زمانوں میں امامت کے تصور کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اسی طرح زبان و شعرو ادب میں ایک خوبصورت عجمی رنگ قائم و دائم رہتا ہے۔ اور جب یہی ادب اسلامی صورت اختیار کرلیتا ہے تو پھر رومی و سعدی و عطار و سنائی و اقبال کی شعری رفعت فلسفہ و فرہنگ اسلام کو سمجھنے میں مددگار ہو جاتی ہے۔

ایران کو عجم اس لئے کہا جاتا ہے کہ عرب قبائل ہرچند کہ زیادہ تر متحرک اور خانہ بدوش تھے اور ان میں تہذیب و تمدن کا وہ رنگ دکھائی نہیں دیتا تھا جو ایران کی وادیوں

میں نظر آتا تھا مگر ان میں کئی مخصوص خوبیاں رچی بسی تھیں۔ امتداد زمانہ سے دنیا کی ایک مربوط اور فصیح و بلیغ ترین زبان ان کے ہاں موجود تھی، جسے بعد کے فارسی شعراء نے بھی دبے لفظوں میں برتری تسلیم کیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

فارسی گو گرچہ تازی خوشتر است عشق را خود صد زبانِ دیگر است

بوی آں دلبر چوں پرّاں می شود ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

(فارسی میں بات کرو اگرچہ عربی اس سے زیادہ اچھی ہے۔ عشق کی امنگوں کے اظہار کے لئے سینکڑوں اور زبانیں بھی ہیں۔ جب خدا یا محبوب حقیقی کی خوشبو پھیل جاتی ہے یہ تمام زبانیں گنگ ہو کے رہ جاتی ہیں)

عرب کی زبان، قبائلی خصوصیات کا تحفظ، تحرک، مہمان نوازی، علم الرجال اور خاندانی عصبیت نے ہر چند ایک مربوط معاشرہ کا قیام عملاً ناممکن بنا دیا تھا مگر وہ ایک زبان بولتے ہوئے بھی ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق (یا کنفیڈریشن) کی صورت میں زندگی گزار رہے تھے۔ آپس کا جدل و قتال بھی ان کے ہاں عام تھا اور وہ کسی بھی خاص سلطنت کا حصہ نہیں تھے، لیکن پھر بھی کبھی کبھار اہل ایران ان کے علاقوں میں آن وارد ہوتے تھے اور ان پر سلطنت کا نظام اور آئین مسلط کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر آزاد منش عرب پھر بغاوت کر دیتے تھے۔ اس طرح کوئی بھی مستحکم سلطنت عرب میں نہ تو قائم ہو سکی اور نہ ہی ان کی کنفیڈریشن ایک فیڈریشن میں ڈھل سکی۔ ایرانی عربوں کو تازی کہتے تھے اور تازی کا لفظ تاختن یعنی لوٹنے سے مشتق ہے۔ اس طرح عربوں کو لٹیرے سمجھا جاتا تھا۔ عرب بھی اہل ایران کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور یہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ عرب جنہیں اپنی زبان اور شعر پر فخر تھا وہ ایرانیوں کی زبان سمجھ نہ پانے کے باعث انہیں عجمی (گونگے) کہتے تھے۔ شبلی نعمانی کی ضخیم کتاب (جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے) بھی "شعر العجم" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ فارسی شعر و ادب کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ لسانی اختلاف کے باعث عربوں کی نظر میں یہ لوگ عجمی کہلائے اور انہوں نے عجم کے لفظ کو ایک حد تک اپنے لئے قبول کرنے میں عار محسوس نہیں کی۔ آخری حج کے موقع پر آنحضور ﷺ نے خصوصاً عرب و عجم کے امتیازات کے خاتمے کا اعلان فرمایا تھا اور یہ برتری ختم کر دی تھی۔

احساس برتری اور احساس کمتری اس خطبے کے بعد مسلمانوں میں ممنوع قرار پایا۔
ایران کے مرکزی علاقے یعنی شیراز و اصفہان کا خطہ اور ملحقہ سطح مرتفع "فارس" یا "پارس" (جسے پرشیا Persia بھی کہا جاتا ہے) اپنی ثقافت' زبان اور سیاسی اثر و رسوخ کے باعث سب سے اہم خطہ تھا اور اسی کی زبان یعنی فارسی (Persian) تمام ایرانی مقبوضات یا زیر اثر لوگوں میں مروج تھی۔ یہ دراصل ہند و اروپائی زبانوں کی ایک شاخ تھی جو قدیم پہلوی (آریائی زبان) سے وجود میں آئی تھی اور قدیم سنسکرت سے قریب تر تھی۔ اس کا اپنا قدیم رسم الخط بھی تھا اور سرکاری قوانین اور مذہبی تحریروں میں استعمال ہوتی تھی۔ ایران کے دوسرے صوبے خراسان' گیلان' آذر آبادگان (جس کا معرب آذر بائیجان ہے اور یہ اصطلاح زیادہ معادل ہو چکی ہے)' خوزستان' سیستان' بلوچستان' تاجکستان اور مازندران تھے۔ خراسان کا خطہ افغان علاقوں ہرات و غزنی' بلخ و مزار شریف' بدخشاں' زنجیانگ کے ختا و ختن اور مالاکنڈ ڈویژن کے علاوہ موجودہ ایران کے خراسان پر مشتمل تھا۔ یہ ایران کا مشرقی صوبہ تھا اور سورج کے طلوع ہونے کی سرزمین سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقہ سے مولانا روم' حکیم سنائی' فردوسی' طوسی' امام مسلم' جامی' عطار اور عمر خیام جیسی ہستیاں پیدا ہوئی تھیں۔ یہیں پر امام رازی اور غزالی بھی مدفون ہیں۔ یہی خطہ البیرونی اور امام ابو حامد غزالی کا مولد بھی ہے۔ یہ خطہ فکری تحریکوں اور فلسفہ و الہیات کا مرکز بھی رہا ہے۔ اس کے ایک علاقہ پر بدھ مذہب کے پرستار چھائے رہے ہیں۔ بعد میں عباسی خلافت کے خلاف قیام و بغاوت میں ابو مسلم خراسانی کا نام آتا ہے۔ وہ بھی اسی خطے کا فرزند تھا۔ مامون الرشید عباسی سے ٹکر لیتے ہوئے اثنا عشری فرقہ کے آٹھویں امام حضرت امام علی رضا بھی اسی علاقے میں آ گئے تھے اور طوس کے قریب شہید ہوئے تھے۔ وہ جگہ اب مشہد کہلاتی ہے اور ایرانی خراسان کا مرکزی شہر ہے۔ خراسان کے وہ خطے جو افغانستان' تاجکستان اور چین میں شامل ہیں ان کے لوگوں کی بھی اپنی پہچان ہے۔ پاکستان میں ریاست سوات وہ آخری خطہ تھا جہاں ۱۹۶۸ء تک ریاست کے خاتمے تک فارسی سرکاری زبان تھی۔

فارس کی سرزمین کا بھی اپنا مزاج ہے۔ تہذیب و تمدن کے گہوارے کی حیثیت سے

نزاکت، خوش بیانی اور شعر و ادب میں اس کا اپنا مقام ہے۔ جہاں ہمیں حافظ شیرازی جیسے غزل گو نظر آتے ہیں وہاں سعدی شیرازی جیسے معلم اخلاق و کردار بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں کے ہزاروں سال قدیم کھنڈرات ہمیں ہری پولیس (یا پاسارگاد) کے تخت جمشید اور خورداریوش کے دخمہ یعنی نقش رستم کی صورت میں نظر آتے ہیں وہاں ہمیں تہذیب و تمدن خود بولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بقول عرفانی ؎

شعر و نغمہ می تراود ہر زماں
از فراز عرش بر شیرازیاں

(ہر لمحہ عرش کی بلندیوں سے شعر اور نغمے شیراز کے لوگوں پہ بارش کے قطرات کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔)

علاوہ بریں اس سرزمین کے لوگوں میں ہمیشہ سے سلطنت کی وسعت کا جذبہ رہا ہے اور اپنے قدیم تمدن پہ فخر و مباہات کے علاوہ اپنی روایات سے وابستگی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ تحقیق و تفحص کا یہ عالم ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میرا کوئی قول چاند کی بلندیوں پہ بھی پہنچ جائے تو اہل فارس میں سے ایک شخص اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ لائے گا۔ فارس کا خطہ زمانہ قدیم میں دجلہ کے کناروں تک پھیلا ہوا تھا۔ حیرہ کے قدیم قصبہ کے قریب کوفہ کی جو بستی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں افواج کے قیام کے لئے بنائی گئی تھی وہ بھی فارس کے آخری کونہ میں تھی۔ یہ جگہ بعد میں فقہ کی تدوین کا مرکز بن گئی۔ ایران کے آئین و قانون سے دلچسپی کا ذکر ہو چکا ہے اس لئے قانون سازی کے لئے یہ جگہ عرب و فارس کا سنگم بن گئی اور امام ابو حنیفہ جیسے عظیم ایرانی فرزند نے اسے نئی جہت عطا کی۔

سکندر اعظم کا حملہ اور ھخامنشی سلطنت کا انقراض

ھخامنشی دور میں ایرانی بادشاہت عراق، شام، فلسطین، ایشیائے کوچک، عرب کے کچھ دیگر حصوں، قفقاز، وسطی ایشیا، موجودہ پاکستان، کشمیر اور شمالی ہندوستان تک پھیل چکی تھی۔ بحیرۂ روم کے پانیوں سے لے کر کیسپین کی لہروں تک، خلیج فارس سے بحیرۂ احمر

تک اور وادی سندھ تک ایک وسیع ایرانی بادشاہت کے پھریرے اڑ رہے تھے۔ اسی دوران آریاؤں کے تازہ لشکر ہامیر کی چوٹیوں سے اتر کر درۂ خیبر کے راستے سرزمین پاک و ہند میں داخل ہو رہے تھے اور ان کا رخ شمالی اور وسطی ہند کی جانب تھا۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ مقامی آبادی کو پامال کرتے ہوئے یا جنوب اور مشرق کی سمت دھکیلتے ہوئے آباد ہوتے چلے گئے۔ آریائی باشندوں نے یہاں پر برہمنیت کا مقدس لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ قدیم فارسی سے ملتی جلتی زبان سنسکرت' مظاہر پرستی' خاص قسم کے ساز اور نسلی تفوق کی خصوصیات یہاں پر لائے تھے۔ اپنی نسل کو مقامی امتزاج سے بچانے کے لئے انہوں نے خود کو ازدواجی' سماجی اور تمدنی اعتبار سے بالکل الگ تھلگ کئے رکھا۔

وسیع ایرانی سلطنت کی وسعت اس کے لئے بجائے خود ایک مسئلہ بن گئی۔ اہل فارس کے لشکر ملک کے طول و عرض میں بکھر کر رہ گئے۔ مرکزیت کا استحکام کمزور ہو تا گیا۔ اسی دوران یونان کی ریاست مقدونیہ کا جواں سال حکمران سکندر اعظم اس سلطنت پہ چڑھ دوڑا اور پھر آناً فاناً ۳۳۴ ق م سے ۳۲۷ ق م تک اس وسیع مملکت پر قابض ہو گیا۔ فارس کے مرکز میں دراویش کی شکست وہ عبرت کا نشان تھی جسے ایرانی قوم فراموش کرنے کی کوشش میں صدیوں تک مگن رہی' بقول حافظ شیرازی ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کی کہانی نہیں پڑھی ہے۔ ہم سے محبت اور وفاداری کی حکایت کے علاوہ کچھ نہ پوچھئے۔)

تھوڑے ہی عرصہ میں ایک عظیم قوت کا سرنگوں ہو جانا ایک عظیم المیہ تھا جس سے مشرق اس زمانے میں دوچار ہوا۔ سکندر اپنی واپسی پہ بابل میں جوانی کے عالم میں عالم بالا کا راہی ہوا اور اس کے لشکری مفتوحہ علاقوں پر اپنی اپنی حکومت قائم کر کے بیٹھ گئے اور مختلف صوبے یونانی حکمرانوں (سلوکیوں) میں بٹ کے رہ گئے' اور ایران کی مرکزیت کا نام و نشان مٹ گیا۔

ایک اہم نکتہ جو یہاں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ یونانی عقائد' توہمات اور دیومالائی

مذہب اس خطے میں کبھی بھی رائج نہ ہو سکا۔ زرتشتی مذہب اس وجہ سے یہاں قائم ودائم رہا کہ مذہبی پروہتوں کا مربوط نظام جو پہلے سے موجود تھا وہ قائم ودائم رہا۔ یہ نظام اس قدر منظم اور درجہ بدرجہ قائم تھا کہ عوام سے لے کر اعلیٰ مذہبی قیادت تک ہر ایک زنجیر کی طرح آپس میں منسلک تھا۔ ہرچند کہ مذہب اور حکومت کے ادارے جدا جدا ہو گئے تھے مگر عوام الناس نے اپنی مذہبی وفاداری قائم رکھی۔ اسی مذہبی نظام نے وطنیت اور قومیت کے ایرانی اثرات کو زائل نہیں ہونے دیا۔ ان کی زبان، ثقافت، تمدن اور معاشرتی حالات یونانی اثرات سے محفوظ رہے۔

اس پس منظر میں غیر ملکی تسلط سے آزادی، مرکزیت کی آرزو اور اپنی بادشاہت کا قیام نسل در نسل ایرانیوں کے دلوں میں موجزن رہا۔ غلامی کے اس دور میں ایرانیت کا شعور کمزور ہونے کی بجائے اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ قدیم شاہی خاندان کے افراد زیر زمین تو چلے گئے مگر ان سے وفاداریاں عوام کے دلوں سے محو نہ ہو سکیں۔ ایران کے اس طرح مٹ جانے کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

آ دبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

لیکن جس طرح ایرانیت کا جذبہ زیر زمین زندہ رہا اس کی جانب اس طرح اشارہ فرمایا ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

یہ وہی زمانہ تھا جب ہندوستان کا برہمن بدھ مذہب کے افکار سے برسرپیکار تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب بدھ مت کے اثرات اس قدر غالب آ چکے تھے کہ ہندومت کا خاتمہ ہوا چاہتا تھا مگر برہمن کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور بدھ مذہب ہندوستان سے نکال باہر کیا گیا۔ اس مذہب کے آثار خراسان میں گہرے ہو گئے اور بلخ نوبہار کا بدھ مذہب کا معبد طلوع اسلام کے بعد تک قائم رہا۔ یہیں کے پروہت برامکہ کہلاتے تھے اور ان کے گہرے اثرات ہارون الرشید عباسی کے عہد حکومت میں مرتب ہوئے۔ بدھ مت کے افکار نے خراسان کے خطے میں ترک دنیا اور رہبانیت کو فروغ بخشا۔ یہی اثرات بعد

میں مسلمانوں کے تصوف میں بھی پائے گئے۔ برامکہ کے اقتدار سے عباسی خلافت میں گہرے عجمی غیر اسلامی عقائد اسلام میں در آئے۔ کچھ مخلص مسلمان دانشوروں کی کوششوں سے برامکہ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ الغرض بدھ مت خراسان اور وسطی ایشیاء کے راستے چین اور تبت میں وارد ہوا' اور ہندوستان کی سرزمین کے گردا گرد چین' مشرق بعید اور ہندوستان کے جنوب میں سری لنکا تک جا پہنچا مگر اپنے مولد و منشاء یعنی برصغیر سے ختم ہو گیا۔ خراسان کے اثرات کے باعث وادی سوات کے کھنڈرات میں آج بھی بدھ مت کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے خطے سے بدھ مذہب مٹ گیا مگر مالاکنڈ ڈویژن کے علاقہ میں یہ مذہب کافی عرصہ قائم و دائم رہا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اہل ایران کے ہاتھوں قائم شدہ فلسطینی یہودی ریاست رومیوں کے تطاول کا شکار ہو چکی تھی۔ رومیوں نے بحیرۂ روم کے ارد گرد کے تمام علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا اور ابراہیمی ادیان تحریف کا شکار ہو کر' رومیوں کے دباؤ میں آ کر اور علماء بنی اسرائیل کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرزمین فلسطین سے حضرت عیسیٰؑ کا ظہور ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کو سچائی اور نیکی کی تلقین کرتے تھے۔ آپ بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کو گلے سے ملاتے رہے اور رومیوں کو خبردار کرتے رہے کہ ظلم و ستم اور شرک و بت پرستی ان کی تباہی کا باعث بننے والی ہے۔ بہت کم لوگ ان کی تبلیغ سے متاثر ہوئے اور آپ حق بات کہتے ہوئے ملعون زمانہ ٹھہرے اور حق کہنے کی پاداش میں ان کے لئے صلیب تیار کر لی گئی۔ اسی کشمکش میں آپ کا مشن پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور عیسائیت کا خدائی پیغام ایک صدی کے لئے دب کر رہ گیا۔ اس دوران عیسائی راہبوں اور علماء نے دین مبین کے اصولوں کو سیکھنا شروع کر دیا اور غار و کوہ میں چھپ کر اپنی تربیت کا اہتمام کیا اور انہی غاروں اور تنگ وادیوں سے نکل کر یہ لوگ دنیا کے طول و عرض میں پھیل گئے اور عیسائیت کی تبلیغ کے مشن کے لئے خود کو وقف کر لیا۔ مولانا روم نے فرمایا ہے ۔

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ
مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

(عیسوی دین کی مصلحت غاروں اور پہاڑوں کی خلوت گزینی تھی لیکن ہمارے دین اسلام کی مصلحت جنگیں لڑ کر شان و شوکت حاصل کرنا ہے)

قرائن سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ایران کے صفحہ ہستی سے نابود ہونے کے باعث دوسری تہذیبوں' مذاہب اور فلسفہ ہائے اخلاق کو پنپنے کا موقع مل گیا اور انسانیت کی تعمیر و ترقی کے لئے اس زمانے میں جو فکری احتیاج تھی اس کی تکمیل ہو گئی۔ آنے والے ایام میں عیسائیت اور بدھ مت کے اثرات دنیا کی غالب آبادی پر مرتب ہوتے رہے۔

آمدم بر سر مطلب اسکندر اعظم کی وفات سے سو برس بعد ایران کے علاقوں میں یونانیوں (سلوکی حکمرانوں) کے اثرات کم ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ ایک خانہ بدوش ایرانی قوم جس کا تعلق کیسپین سمندر کے کناروں پہ آباد سیتھین قوم سے تھا۔ یہ لوگ روس اور چین کی سرحدوں کے قریب گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ماسا گیتے انہی کے ایک قبیلے کا نام تھا۔ یونانی ان لوگوں کو ساکا کہتے تھے۔ ہرچند کہ وہ ہخامنشی ایرانیوں کی نسل سے تھے مگر وہ اصلاً خانہ بدوش ہی تھے۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ صوبہ فارسی (پرسو' پہلو) میں آباد ہو گئے اور یہ لوگ پہلوی کہلانے لگے۔ چین کے صوبہ سنکیانگ سے ترکی النسل قبائل (جنہیں اشکانی کہا جاتا ہے) بھی آن وارد ہوئے اور ایران پر ترکی اثرات مرتب ہونے لگے۔ اسی (۸۰) برس تک خانہ بدوش سیتھیس قبائل سلوکیوں (یونانیوں) سے آزادی حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ یہی پہلوی (پارتھین) دوسری صدی قبل مسیح میں متری دات اول کی قیادت میں فارس اور اس کے نواحی خطوں باختر' بابل' سوسا' میڈیا اور ساحلی علاقوں کو اکٹھا کر کے ایک سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں اسی صدی میں متری دات دوم نے آرمینیا سے سیستان اور خراسان تک حکومت قائم کر لی اور برصغیر کے کچھ علاقے بھی ہتھیا لئے۔ ان لوگوں کے چین سے قریبی روابط استوار ہوئے اور شاہراہ ریشم تعمیر ہوئی۔ تجارتی قافلے چین سے اسی شاہراہ پر یورپ آنے

(باقی صفحہ ۶۷)

امت مسلمہ کی عمر(۲)
اور
مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین
شعبہ دعوت و ثقافت، دعوت اسلامی کالج، جامعۃ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الاسلام و قرب ظہور المہدی" کا

دوسرا باب

مترجم: پروفیسر خورشید عالم، قرآن کالج لاہور

فصل اول

تشریحات

امت مسلمہ کی عمر کا حساب محمدﷺ کی بعثت سے لے کر قیام قیامت تک لگایا جائے گا۔ اگر وقت کا تعین کیا جائے تو قیامت اس وقت آئے گی جب یمن کی طرف سے نرم ہوا چلے گی اور ہر مومن کی جان قبض کر لے گی۔ یہ واقعہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم کی وفات کے بعد ظہور پذیر ہوگا۔ روئے ہستی پر کوئی مومن نہیں بچے گا۔ چنانچہ امت مسلمہ کی عمر ختم ہو جائے گی۔ روئے زمین پر صرف بدکار لوگ رہ جائیں گے اور ان ہی پر قیامت آئے گی۔

ہر امت کی عمر اس کے نبی کی بعثت سے شروع ہو کر بعد میں آنے والے نبی کی بعثت تک چلے گی۔ جو بھی بعد میں آنے والے نبی پر ایمان لائے گا وہ اس کی امت میں شمار ہوگا اور اسے دہرا بدلہ ملے گا[1] اور جو اس نبی کا انکار کرے گا اور کوتاہی کا مرتکب ہوگا اس

کی حیثیت اس آدمی کی طرح ہوگی جو سب نبیوں کا منکر ہوتا ہے۔ پس یہودیوں کی عمر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے لے کر حضرت عیسیٰؑ کی بعثت تک شمار ہوگی اور عیسائیوں کی عمر حضرت عیسیٰؑ کی بعثت سے لے کر محمد ﷺ کی بعثت تک چلے گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا شرع حنیف میں کوئی ایسی دلیل ہے جو ان امتوں کی عمر کا تعین کر سکے؟ جواب ہے ہاں! قبل اس کے کہ ہم اس جواب کی تفصیل بیان کریں جو ان امتوں کی متعین عمر اور اس کے بدیہی نتیجہ کے طور پر علامات کبریٰ کی طرف رہنمائی کرے' ہم کچھ باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم جلدی سے دنیوی زندگی کا پہیہ روک کر سارے عالم کو برباد کر دیں۔ بالکل نہیں! ہم نے تو اپنے دین سے یہ سیکھ رکھا ہے کہ ہم دنیا کے لئے ایسے کوشاں رہیں گویا کہ ہمیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور یہ کہ جب تک دنیا کی زندگی کا پہیہ از خود نہ رکے ہم بھی نہ رکیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: اگر قیامت آنے کے وقت کسی کے ہاتھ میں درخت کا قلم ہو اور اسے کھڑا ہو کر اسے لگانے کی مہلت ملے تو وہ ضرور لگا دے {۲}۔ عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے: اپنی دنیا کے لئے یوں کام کرو گویا کہ تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور اپنی آخرت کے لئے یوں کام کرو گویا کہ تم کل ہی مرنے والے ہو {۳}۔ قرب قیامت کے موضوع سے ہماری مراد یہ ہرگز نہیں کہ لوگ ہاتھ توڑ کر بیٹھ جائیں اور کام کاج' طلب علم اور دعوت الی اللہ کو چھوڑ دیں بلکہ اس کے برعکس ہماری مراد یہ ہے کہ لوگ آخری زمانے کے فتنوں اور جنگوں کے لئے پوری طرح لیس ہو کر مستعد ہو جائیں اور اپنے ساتھ علم' عمل اور تقویٰ کی زاد راہ لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مقصد لوگوں کو خوف زدہ کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد غفلت شعاروں کو آگاہ کرنا اور سونے والوں کو گہری نیند سے جگانا ہے' تاکہ وہ تیار ہو جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ جلد آنے والی یقینی جنگیں ناگہانی طور پر ان کو آلیں۔ یہ جنگیں تو ان کے آنگن میں داخل ہو چکی ہیں' ان پر دھاوا بول چکی ہیں اور ان کے گھر میں نازل ہو چکی ہیں اور وہ غفلت میں پڑے پہلو تہی کر رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم اس کتاب میں کوئی ایسا نقطہ بھی بیان نہیں کریں گے جو ظن پر

مبنی ہو یا الکل پچو ہو۔ کیونکہ حق بیان کرنے میں ظن بے فائدہ ہوتا ہے (ظن حق کا بدل نہیں ہو سکتا)۔ ہم نے کتاب و سنت کی طرف رجوع کیا ہے' پھر ائمہ کے ان اقوال کو پیش کیا ہے جو کتاب و سنت سے اخذ کئے گئے ہیں' پھر ہم نے ان اہل کتاب کی باتوں کی طرف کان دھرا ہے جن کی روایت بیان کرنے کی ہمیں اجازت ہے۔

چوتھی بات بہت ضروری ہے اور ہم اسے زور دے کر کہتے ہیں کہ ہم امت مسلمہ کی عمر کی تاریخ اور سن کا تعین نہیں کر سکتے اور کسی کے بس میں نہیں کہ وہ ایسا کر سکے۔ ہم نے تو صحیح آثار پر اعتماد کرتے ہوئے اندازے لگائے ہیں اور اس سلسلہ میں ان باتوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن کی تصدیق بڑے بڑے علماء نے ان آثار کی شرح کرتے وقت کی ہے۔ پھر ہم نے تو خونریز جنگوں کے آغاز کی بات کی ہے' اس دنیا کی عمر کب ختم ہو گی' یہ علم تو اللہ کے پاس ہے' اسے نہ اس کا رسول ؐ جانتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ۔

یہ بات طے کرنے کے بعد اب ہم امتوں کی عمر کے بارے میں کھل کر بات کریں گے۔ اللہ حق اور صواب کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

دوسری فصل

امتوں کی عمر کے بارے میں احادیث اور ان کے آسان معانی

ا۔ احادیث

۱۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ گزشتہ امتوں کے مقابلے میں تمہاری زندگی کا عرصہ اتنا ہے جتنا نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک۔ اہل تورات کو تورات دی گئی انہوں نے اس پر عمل کیا یہاں تک کہ عین دوپہر کے وقت وہ عاجز آ گئے۔ ان کو ایک ایک قیراط (دینار کا ۲۴/۱ یا کسی چیز کا چوبیسواں حصہ) دیا گیا۔ پھر اہل انجیل کو انجیل دی

گی۔ انہوں نے نماز عصر تک اس پر عمل کیا پھر عاجز آ گئے۔ انہیں بھی ایک ایک قیراط عطا کیا گیا۔ پھر ہمیں قرآن عطا ہوا تو ہم نے غروب آفتاب تک اس پر عمل کیا۔ ہمیں دو دو قیراط ملے۔ اہل کتاب کہیں گے "اے ہمارے رب ان کو تو نے دو دو قیراط دیئے مگر ہمیں ایک ایک' حالانکہ ہم نے ان سے بڑھ کر عمل کیا ہے۔ راوی کا قول ہے: اللہ عزوجل کہے گا کہ کیا میں نے تمہاری اجرت میں تم پر کوئی ظلم کیا ہے؟ وہ کہیں گے کہ نہیں۔ اللہ فرمائے گا یہ تو میرا فضل ہے میں اسے جسے چاہوں عنایت کرتا ہوں"۔ {۴}

۲۔ بخاری نے صحیح میں ابو موسیٰؓ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کی مثال اس آدمی کی سی ہے جس نے کچھ لوگوں کو اجرت پر اس لئے رکھا کہ وہ رات تک اس کا کام کریں۔ انہوں نے نصف النہار (دوپہر) تک کام کیا' پھر کہنے لگے: ہمیں تمہاری اجرت کی ضرورت نہیں۔ اس نے کچھ اور لوگ اجرت پر رکھ لئے۔ اس نے کہا: دن کے بقیہ حصہ تک کام کرو' جو مزدوری مقرر ہوئی ہے وہ آپ کو مل جائے گی۔ وہ کام کرتے رہے یہاں تک عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو انہوں نے کہا: جو کام ہم نے کیا اس کی اجرت ہم نے چھوڑ دی۔ پھر اس نے کچھ اور لوگوں کو اجرت پر رکھا۔ دن کا بقیہ حصہ انہوں نے کام کیا' یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا تو انہوں نے دونوں پہلے گروہوں کی پوری اجرت لے لی۔ {۵}

ان دو حدیثوں میں نبی ﷺ نے قریبی مدت کو مثالیں دے کر واضح کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ اسی دنیوی زندگی میں امت مسلمہ کی پہلے گزرنے والی یہود و نصاریٰ کی امتوں کے مقابلہ میں کتنی عمر ہو گی۔ مسلمانوں کی مدت زمانی وہ وقفہ ہے جو نماز عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کا ہے تو یہودیوں کی مدت وہ وقفہ ہے جو فجر سے لے کر نماز ظہر تک کا ہے اور نصاریٰ کی زمانی مدت وہ وقفہ ہے جو نماز ظہر سے نماز عصر تک پھیلا ہوا ہے۔ یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کی مدت مل کر یہودیوں کی مدت کے برابر ہوتی ہے کیونکہ یہودیوں نے آدھے دن تک کام کیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں نے دن کے باقی نصف میں

کام کیا۔ یہ حدیث یہ بھی بتلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین محمد ﷺ کی آخری امت کو فضیلت بخشی ہے' مگر سابقہ امتوں کی اجرت میں نہ تو کمی کی ہے اور نہ ان پر ظلم کیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ظلم اور عیب سے پاک ہے۔ اس نے انہیں بغیر کسی کمی کے پوری اجرت دی ہے۔

حدیث میں جس قیراط کا ذکر ہے اس سے مراد جنت میں اس کا حصہ اور ملکیت ہے۔ جنت میں سب سے کم درجہ اور ملکیت والے شخص کو بھی اس کی خواہش سے دس گنا بڑھ کر اجر ملے گا۔ اس صورت میں قیراط سے مراد کامل و مکمل بہت بڑی اجرت ہے۔

اہل کتاب کو غصہ اس لئے نہیں آیا کہ ان کی حق تلفی ہوئی یا ان کو اجرت کم ملی بلکہ اس کا سبب وہ حسد تھا جو امت مسلمہ کی فضیلت کی وجہ سے ان کے دل میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ کہیں گے اے ہمارے رب تو نے ان کو ہم پر فضیلت کیوں دی؟ ان کو دو گنا اجر کیوں دیا؟ ان پر اتنی زیادہ عنایات کیوں کیں؟ حالانکہ ہم نے ان سے بڑھ کر عمل کئے۔ اس جملے کے کہ "ہم نے زیادہ عمل کئے" دو معنی ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ہم نے دنیوی زندگی میں لمبا عرصہ اور لمبی عمر پائی نتیجتاً ہم نے اعمال بھی زیادہ کئے۔

۲۔ کثرت عمل سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم ان سے بڑھ کر فرمانبردار تھے۔

پہلے معنی کے مطابق اس جملہ کے کہنے والے خاص طور پر یہودی تھے اور اس کی تائید اس حدیث کے الفاظ سے ہوتی ہے جو بخاری نے کتاب التوحید میں روایت کی ہے۔ الفاظ یوں ہیں : "فقال اهل التوارة" (تورات والوں نے یہ بات کہی) کیونکہ اس بات میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ یہودیوں کا زمانہ مسلمانوں کی نسبت طویل تر تھا۔ چنانچہ "کنا اکثر عملا" کا قول ان پر صادق آتا ہے۔ عیسائیوں کا قول کنا اکثر عملا (ہمارے اعمال زیادہ ہیں) دوسرے معنوں کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ہم زیادہ فرمانبردار ہیں۔ چونکہ وہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ دونوں پر ایمان لائے' اس لئے یہ قول ان پر صادق آتا ہے {۲}

جب اہل کتاب نے غصے میں آکر جو کہنا تھا کہہ دیا' تو اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح کر دیا کہ اس نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا اور بغیر کسی کمی کے ان کو پورا پورا اجر دیا۔ زیادہ سے زیادہ

یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد ﷺ کی امت کو فضیلت دے کر ان کو مزید فضل و کرم سے نوازا اور یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔ اللہ اپنے فعل کے لئے کسی کو جوابدہ نہیں جبکہ وہ جوابدہ ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا وہ لوگ جنہوں نے ایک گونگے بچھڑے کے متعلق کہا : "یہ تمہارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی" ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟" کیا وہ لوگ جنہوں نے یہ کہا کہ "عزیر اللہ کے بیٹے ہیں" یا وہ لوگ جنہوں نے کہا "عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں" ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا "اللہ ایک ہے' وہ بے نیاز ہے" اس نے نہ جنا' نہ جنا گیا' اس کا کوئی ہمسر نہیں"؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا "اللہ تنگ دست ہے اور ہم غنی" یا جنہوں نے کہا "کیا تمہارا رب ہمارے لئے آسمان سے دسترخوان نازل کر سکتا ہے؟" ان لوگوں کی برابری کر سکتے ہیں جنہوں نے کہا "تو غنی ہے اور ہم تیرے محتاج ہیں"۔ کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا "ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی" ان لوگوں کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا "ہم نے سن لیا اور اطاعت کی"۔ کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا "جاؤ تم اور تمہارا رب لڑو' ہم تو یہاں بیٹھیں گے" ان جیسے ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا "آپ ہمیں جس جگہ حکم دیں گے ہم وہاں جا کر لڑیں گے"۔ کیا یہ لوگ آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔ سب تعریفیں اللہ کو سزاوار ہیں جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔

<u>تیسری فصل</u>

امتوں کی عمر کا حساب

یہ فصل اس کتاب کی اہم ترین فصل ہے۔ یہ ایک نفیس بحث ہے۔ بہت سے لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کی' ہم نے تو محض اس خزانے کو بڑی بڑی کتابوں سے نکال کر' جھاڑ پونچھ کر اسے اصلی اور صاف و شفاف شکل میں پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں ان مشاہیر علماء پر جنہوں نے سنت نبی ﷺ کی سوجھ بوجھ

کے سلسلہ میں ایک بہت بڑا ورثہ چھوڑا ہے۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں محمد ﷺ پر جنہوں نے ارض و سماء کی ہر چیز کو علمی سطح پر وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

حافظ ابن حجر نے اپنی قیمتی کتاب فتح الباری میں امتوں کی عمر کے بارے میں احادیث پر ان الفاظ میں حاشیہ آرائی کی ہے: "حدیث مذکور سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ امت مسلمہ کی عمر ایک ہزار برس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کے مطابق عیسائیوں اور مسلمانوں کی عمر ملا کر یہودیوں کی عمر کے برابر بنتی ہے اور اہل روایت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت تک یہودیوں کی عمر دو ہزار برس سے زیادہ ہے اور نصاریٰ کی عمر اس وقت تک چھ سو برس بنتی ہے "{۷} اور انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث میں ضمنی طور پر اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ دنیا کی عمر تھوڑی رہ گئی ہے{۸}۔ ابن حجر کے متذکرہ قول میں اجمالی طور پر مندرجہ ذیل مضمون شامل ہے :

۱۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کی عمر کو اگر باہم ملایا جائے تو یہ عمر یہودیوں کی عمر کے برابر ہے
یعنی یہودیوں کی عمر = مسلمانوں کی عمر + عیسائیوں کی عمر

۲۔ نصاریٰ کی عمر چھ سو برس ہے۔ اس کی تائید میں بخاری نے صحیح میں سلمان فارسیؓ سے ایک اثر روایت کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ عیسیٰ اور محمد ﷺ کے درمیان چھ سو برس کا عرصہ ہے{۹}

مذکورہ تصریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ

مسلمانوں کی عمر کی مدت = یہودیوں کی عمر ـ عیسائیوں کی عمر

چونکہ یہود و نصاریٰ کی مجموعی عمر ۲۰۰۰ برس سے زائد ہے اور نصاریٰ کی عمر چھ سو برس ہے تو تفریق سے نتیجہ نکلے گا کہ :

یہودیوں کی عمر = ۲۰۰۰ ـ ۶۰۰ = ۱۴۰۰ سال سے کچھ اوپر

اہل روایت اور تاریخ دانوں نے بتایا ہے کہ یہ بڑھوتری ۱۰۰ سال سے کچھ زیادہ ہے۔

اس صورت میں یہودیوں کی عمر = ۱۵۰۰ برس اور کچھ اوپر

چونکہ مسلمانوں کی عمر = یہودیوں کی عمر ـ عیسائیوں کی عمر

لہٰذا اس صورت میں امت مسلمہ کی عمر = ۱۵۰۰ ـ ۶۰۰ = ۹۰۰ برس سے کچھ اوپر

[illegible] برس {۱۰}

چنانچہ امت مسلمہ کی عمر – ۱۴۰۰ برس سے کچھ اوپر

امام سیوطی نے اپنے کتابچے "الکشف فی بیان خروج المہدی"[۱۰] میں کہا ہے: "آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اس امت کی عمر ایک ہزار برس سے کچھ اوپر ہوگی اور یہ بڑھوتری ۵۰۰ برس سے قطعی طور پر زیادہ نہیں ہوگی {۱۱} اس بڑھوتری میں سے تیس برس تو گزر چکے' اب ۱۴۱۷ ہے۔ اس میں نبی ﷺ کی بعثت سے لے کر ہجرت تک (ہجری سال کے آغاز سے پہلے) کے تیرہ برس بھی شامل کرلیں۔ اب سن ہجری تو ۱۴۱۷ ہے مگر سن بعثت ۱۴۳۰ ہے۔ صحیح آثار پر مبنی مشاہیر علماء کے کلام کی روشنی میں جو حساب اب تک لگایا گیا ہے' اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس دور سے گزر رہے ہیں جو قرب قیامت کا دور ہے۔ یہ ان آخری فتنوں اور جنگوں کی تیاری کا مرحلہ ہے جو قیامت کی بڑی نشانیوں سے پہلے ظہور پذیر ہونے والی ہیں۔

موضوع کی تکمیل کے لئے ہم آئندہ فصل میں اہل کتاب کے وہ اقوال پیش کریں گے جو ہماری پیش کردہ گزارشات سے ہم آہنگ ہیں اور جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ (دنیا کا) خاتمہ قریب ہے۔

چوتھی فصل

قرب قیامت سے متعلق اہل کتاب کے اقوال

ہوسکتا ہے کہ کتاب کی یہ فصل معتدل اہل کتاب کو اس بات کی ہدایت دے دے کہ وہ محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئیں اور ان کی تکذیب ترک کردیں۔ کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ ان کی مقدس کتابوں کی عبارات اور نبی محمد ﷺ کی احادیث میں عجیب و غریب مطابقت پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہماری تو خواہش ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ لوگ ایمان لے آئیں کیونکہ احادیث نبویہ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے اہل روم آخری زمانہ میں مسلمان ہوجائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ایک گروہ کے ہاتھوں قسطنطنیہ فتح ہوگا۔

حدیث تو ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ۷۰ ہزار بنی اسحاق (اہل روم) قسطنطنیہ پر چڑھائی کریں گے اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) اور تکبیر (اللہ اکبر) پڑھتے ہوئے اسے فتح کرلیں گے۔ {۱۲}

۱۔ انجیل متی (۲۰ : ۱۔۱۶) صفحہ ۳۱ پر لکھا ہے {۱۳}

(انگور کے باغ میں مزدوروں کی مثال)

"آسمانوں کی بادشاہت بالکل ایسے ہے جیسے کسی گھر کا مالک صبح سویرے نکل کر کچھ مزدور اپنے باغ کے لئے اجرت پر رکھ لے اور مزدوروں سے یہ طے کرلے کہ وہ ہر ایک کو ایک دن کا ایک دینار دے گا۔ پھر ان کو باغ میں بھیج دے۔ صبح نو بجے وہ پھر نکلے اور شہر کے ایک کھلے میدان میں کچھ اور بیکار مزدوروں کو دیکھ کر ان سے کہے: تم بھی جاؤ اور میرے باغ میں کام کرو' تمہیں تمہارا حق دے دوں گا۔ پس وہ بھی چلے جائیں۔ بارہ بجے دوپہر وہ ایک بار پھر میدان کی طرف جائے۔ پھر تین بجے دوپہر کو بھی نکلے اور کچھ مزید مزدور باغ میں بھیج دے۔ ایک بار پھر وہ پانچ بجے بعد از دوپہر نکلے تو کچھ اور بیکار مزدور اسے ملیں تو وہ ان سے پوچھے: یہاں دن بھر بیکار کھڑے کیا کر رہے ہو؟ وہ جواب دیں کہ کسی نے ہمیں اجرت پر نہیں رکھا۔ وہ کہے تم بھی میرے باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہو تو باغ کا مالک اپنے نائب وکیل سے کہے مزدوروں کو بلاؤ اور سب سے پہلے ان کو مزدوری دو جو سب سے بعد آئے ہیں' سب سے بعد ان کو دو جو سب سے پہلے آئے ہیں۔ پھر پانچ بجے آنے والے مزدور آئیں اور ہر ایک' ایک ایک دینار لے لے۔

جب پہلے آنے والے آئے' وہ سمجھے کہ ان کو زیادہ اجرت ملے گی لیکن ہر ایک کو ایک ایک دینار ملا۔ جب وہ دینار لے رہے تھے تو گھر کے مالک کے خلاف ناگواری کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ان لوگوں نے صرف گھنٹہ بھر کام کیا' ہم نے تو دن بھر دھوپ کی تپش میں کام کیا مگر مزدوری آپ نے ایک جیسی دیدی۔ مالک نے ان میں سے ایک کو جواب دیا: اے دوست! کیا میں نے تم پر ظلم کیا ہے؟ کیا تو نے ایک دینار لینے پر اتفاق نہیں کیا تھا؟ یہ پکڑو اور اپنی راہ لو۔ میں چاہتا ہوں کہ آخر میں آنے والے کو بھی اتنی ہی اجرت دوں۔ کیا مجھے اتنا حق نہیں کہ اپنے مال میں اپنی مرضی سے تصرف کروں؟ یا میری شرافت کی وجہ سے تیری آنکھوں میں شرارت آ گئی ہے۔ اس طرح پچھلے پہلے اور پہلے پچھلے بن جائیں گے۔" {۱۴}

۲۔ انجیل میں سالونیکی کے مومنین کے لئے پہلا پیغام ص ۵ پر ہے۔ اس کی عبارت یوں ہے:

"جہاں تک زمانے اور وقت مقررہ کے مسئلے کا سوال ہے، آپ کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے بارے میں آپ کو لکھا جائے کیونکہ آپ تو یقیناً جانتے ہیں کہ یوم الرب (رب کا دن) آکر رہے گا، بالکل اسی طرح جیسے رات کو چور آتا ہے۔ جب لوگ یہ کہتے پھریں گے کہ امن و سلامتی کا زمانہ آگیا ہے اچانک ہلاکت و بربادی ان پر نازل ہو گی، بالکل اسی طرح جیسے درد زہ حاملہ عورت کو اچانک آلیتا ہے۔ چنانچہ وہ اس (ہلاکت) سے کبھی بھی چھٹکارا نہیں پا سکتے۔"

۳۔ امریکہ کا سابق صدر نکسن اپنی کتاب "1999:Victory without War" میں لکھتا ہے:

"1999ء میں ہمیں پوری دنیا پر مکمل بالاتری حاصل ہو جائے گی اور اس کے بعد عیسیٰ کا کام شروع ہو جائے گا۔ {۱۵}"

یعنی وہ اس بات کا تعین کر رہے ہیں کہ 2000ء سے پہلے پہلے وہ مسیح کی واپسی کے لئے فضا ہموار کر دیں گے۔

۴۔ انجیل کے اصول پرستوں کا سردار بٹ روبرٹسن کہتا ہے:

"اسرائیل کا دوبارہ جنم صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا کے خاتمہ کی پیچھے سے گنتی شروع ہو چکی ہے۔ اسی طرح اسرائیل کے جنم سے باقی بشارتیں بھی تیزی سے پوری ہو رہی ہیں۔" {۱۶}

۵۔ انجیل کے پادریوں کے سابق رئیس بلی گراہم نے ۱۹۷۰ء میں تنبیہہ کے انداز میں کہا تھا:

"دنیا بڑی تیزی کے ساتھ ہر مجدون کی جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ نوجوانوں کی موجودہ نسل تاریخ کی آخری نسل ہو گی۔" {۱۷}

۶۔ ہال لینڈ زاپنی کتاب "سب سے بڑا اور آخری کرۂ ارضی" میں کہتا ہے:

"وہ نسل جو ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئی وہ عیسیٰ کی دوبارہ واپسی کا مشاہدہ کرے گی۔" {۱۸}

۷۔ مسیحی اصول پرستوں کے لیڈر جیری فولویل کا کہنا ہے:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم آخری زمانہ میں رب کی آمد[۱۹] سے پہلے تک زندہ رہیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بچے پوری زندگی پا سکیں گے۔"[۲۰]

۸۔ مینا جر جس اپنی کتاب "رب کی آمد کی علامات" میں لکھتا ہے:

"وہ علامات جن کا ذکر رب نے انجیل مقدس میں کیا ہے وہ ان دنوں پوری طرح واضح ہونے لگی ہیں اور ہم انہیں اپنی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔ رب نے جن علامات کا ذکر انجیل میں کیا ہے وہ ہم ان دنوں صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ یہ گویا اس بات کی دعوت ہے کہ بادلوں پر چل کر آنے والے رب کے استقبال کے لئے ہم پوری طرح تیار ہو جائیں۔"[۲۱]

۹۔ بشپ (دیستورس) اپنی کتاب "سفر دانیال پر ایک نظر" میں کہتے ہیں کہ مسیح دجال کا ظہور ۱۹۹۸ء میں ہو گا اور عیسیٰ کا دوبارہ نزول ۲۰۰۰ء موسم خزاں میں ہو گا۔ یہ حساب اس نے اپنی تحقیق میں پیش کیا ہے۔ (اس تحقیق کے کچھ صفحوں کا عکس اس کتاب میں بطور ضمیمہ شامل ہے) دیستورس موسم خزاں ۱۹۹۸ء میں مسیح دجال کے ظہور کی تاریخ پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ مذاہب ثلاثہ کی تین عیدیں جن کا تعلق قربانی سے ہے وہ اپریل کے پہلے پندرھواڑے میں منعقد ہوں گی۔ اور اسی زمانہ میں مسیح دجال کا خروج ہو گا اور وہ بڑے پادری کے ساتھ ہیکل کے قریب قربانی ذبح کرے گا۔ وہ یہ گمان کرے گا کہ اللہ آسمان سے آگ نازل کر کے قربانی کو جلا دے گا جو اس قربانی کی قبولیت کی علامت ہو گی مگر اللہ تو اس قربانی کی طرف دھیان تک نہ دے گا اور وہ اللہ کے یہاں مردود ہو گی۔"[۲۲]

ہم نے تو اہل کتاب کے اقوال کی طرف محض اشارہ کیا ہے ورنہ وہ لاتعداد ہیں، ان سب اقوال سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ان کا پکا عقیدہ ہے کہ دنیا ان دنوں اپنے آخری ایام گزار رہی ہے۔ یہ بات ان کو ان مقدس کتابوں نے بتائی ہے جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

حواشی

{۱} مثلاً سلمان فارسی، صہیب رومی، عبداللہ بن سلام اور نجاشی رضی اللہ عنہم۔

{۲} احمد نے اپنی مسند (۳ : ۱۸۳) میں 'بخاری نے الادب المفرد (نمبر۴۷۹) میں اور البانی نے الصحیحہ (رقم۹) میں روایت کیا ہے اور یہ حدیث صحیح ہے۔

{۳} مرفوعاً اس کی کوئی اصل نہیں' ابن تیمیہ اور ابن مبارک نے ابن عمرؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے مگر الفاظ دوسرے ہیں۔ دیکھئے البانی کی "سلسلہ الاحادیث الضعیفہ" نمبر۱۸' ص ۳۰

{۴} بخاری نے صحیح کے متعدد مقامات پر سے روایت کیا ہے مثلاً کتاب مواقیت الصلاۃ۔ فتح الباری ج ۱' ص ۳۸' مطبعہ دارالفکر' کتاب الاجارۃ ج ۴' ص ۴۴۵۔ کتاب احادیث الانبیاء' ج ۶ ص ۴۶۵ و کتاب فضائل القرآن ج ۹' ص ۶۶۔ کتاب التوحید ج ۱۳' ص ۴۶ سب مقامات کی اسناد مختلف ہیں۔

{۵} بخاری نے اسے بھی صحیح کے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے 'کتاب مواقیت الصلاۃ ج ۲' ص ۳۸ و کتاب الاجارۃ ج ۴' ص ۴۴۷۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ عبارت متی کی انجیل میں وارد ہوئی ہے' ہم اسے چوتھی فصل میں بیان کریں گے۔ یہ بالکل بخاری کی حدیث کے مطابق ہے۔

{۶} دیکھئے فتح الباری' ج ۴ 'کتاب الاجارہ' ص ۴۴۶

{۷} فتح الباری' ج ۴ 'کتاب الاجارۃ' ص ۴۴۹

{۸} فتح الباری ج ۴ 'کتاب الاجارۃ' ص ۴۴۸

{۹} صحیح بخاری 'کتاب مناقب الانصار

{۱۰} سعد بن ابی وقاصؓ کی مرفوع روایت میں ہے "مجھے امید ہے کہ میری امت اپنے رب کے سامنے اتنی عاجز نہیں ہوگی کہ وہ اسے آدھے دن کی مہلت دے دے۔ سعدؓ سے پوچھا گیا یہ آدھا دن کتنا ہوگا؟ آپ نے فرمایا ۵۰۰ برس۔ یہ صحیح حدیث ہے جسے احمد' ابو داؤد' حاکم اور ابو نعیم نے الحلیہ میں روایت کیا ہے۔ علامہ البانی نے الصحیحہ میں اسے صحیح قرار دیا ہے (نمبر۱۶۴۳) اور صحیح الجامع میں بھی متعدد مقامات پر اسے صحیح قرار دیا ہے۔

{۱۱} رسالۃ الکشف عن مجاوزۃ ھذہ الامۃ الالف (ص ۲۰۶)

{۱۲} دیکھئے' حافظ ابن کثیر کی الفتن والملاحم (باب ذکر الملحمہ مع الروم' ص ۵۱)

{۱۳} یہ عبارت امتوں کی عمر کے بارے میں بخاری کی سابقہ حدیث سے کافی مشابہت رکھتی ہے۔ اہل کتاب اس طرف متوجہ ہوں اور انصاف کی نگاہ سے محمد ﷺ کے اس پیغام کو دیکھیں جس پر ایمان لانا سب پر لازم ہے۔

{۱۴} یہ بات رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے مطابق ہے کہ ہم قیامت کے دن ترتیب کے لحاظ سے سب سے آخر میں ہوں گے مگر مرتبہ کے لحاظ سے سب سے آگے۔ بخاری اور مسلم نے اسے ابوہریرہؓ اور حذیفہؓ کی سند سے روایت کیا ہے۔

{۱۵} "الوعد الحق والوعد المفتری" ص ۲۹۔

{۱۶} "الوعد الحق والوعد المفتری" ص ۳۵۔ اللہ عزّوجلّ نے اپنی کتاب عزیز میں بتایا ہے کہ یہودیوں کا اجتماع ان کی ہلاکت کا آغاز ہوگا۔ "اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس ملک میں رہو سہو۔ پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو جمع کر کے لے آئیں گے"۔ (الاسراء : ۱۰۴)

{۱۷} النبوة والسیاسة' ص ۴۹

{۱۸} النبوة والسیاسة' ص ۵

{۱۹} عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ مسیحؑ بن مریم ہی رب ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ اللہ ان باتوں سے جو وہ کہتے ہیں بلند تر ہے۔

{۲۰} النبوة والسیاسة' ص ۵۶

{۲۱} علامات مجیء الرب' ص ۶-۷

{۲۲} نظرات فی سفر دانیال' ص ۳۲

بقیہ : علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم

جانے لگے۔ ساڑھے چار سو برس تک یہ حکمران ایران پر غالب رہے مگر یہ جاہل' اجڈ اور خانہ بدوش لوگ کوئی نمایاں کام سرانجام نہ دے سکے۔ لیکن اس دوران ایران کے ارد گرد تہذیب و تمدن' مذہب و فلسفہ اور علم و ادب کا ارتقا ہوتا رہا۔ پھر آریائی تہذیب و تمدن کے نام لیوا منظم ہو کر اپنے اقتدار کی جدوجہد کرنے لگے تاکہ خانہ بدوش تورانیوں سے نجات حاصل کر سکیں اور ہخامنشی دور کی عظمت بحال کر سکیں ؎

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

(جاری ہے)

امام شاملؒ

امام شاملؒ کے حالات زندگی پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کرنل محمد حامد کی کتاب کا ترجمہ و تلخیص

ترتیب و ترجمہ : اظہار احمد قریشی

امام شامل کی شخصیت اور کارناموں پر مشتمل ایک سلسلہ مضمون جو لیسلے برانچ کی ایک کتاب "The Sabers of Paradise" پر Based تھا' قبل ازیں "ندائے خلافت" کے ماہانہ ایڈیشن میں چار اقساط میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ سلسلہ ابھی نامکمل تھا کہ ندائے خلافت کے ماہانہ ایڈیشن کی اشاعت میں انقطاع کے باعث بند ہو گیا۔ لیسلے برانچ کی اس کتاب کا ترجمہ محترم اظہار احمد قریشی صاحب اپنی تمام تر معروفیات کے باوصف ذاتی دلچسپی لے کر نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کر رہے تھے۔ تاہم دوران ترجمہ ان کے سامنے بعض ایسے حقائق آئے جن کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذکورہ کتاب کو معتبر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مستشرقین کا طریق واردات یہ ہے کہ وہ ہمارے مشاہیر کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ڈنک مارنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیسلے برانچ بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی دوران محترم قریشی صاحب کی ملاقات کرنل محمد حامد سے ہوئی جو امام شامل پر ایک مبسوط کتاب انگریزی زبان میں تصنیف کر چکے ہیں۔ کرنل حامد صاحب نے قریشی صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ لیسلے برانچ نے اپنی کتاب میں کچھ من گھڑت باتیں اور واقعات امام صاحب کی طرف منسوب کی ہیں جن سے ان کا امیج مجروح ہوتا ہے۔ محترم قریشی صاحب کی امام شاملؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے دلچسپی کا یہ ایک نمایاں مظہر ہے کہ انہوں نے لیسلے برانچ کی کتاب سے اعلان براءت کرنے کے ساتھ ہی کرنل حامد کی کتاب کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ابتدائی ابواب کی تلخیص ہمیں ارسال کی۔ اس کتاب کے ذریعے چونکہ امام

صاحب کے مجاہدانہ کردار کی تفصیلات سامنے آتی ہیں اور امام صاحب کی زندگی کا یہی وہ پہلو ہے جس سے ہمیں زیادہ دلچسپی ہے، لہٰذا ہم جناب اظہار احمد قریشی کے شکریئے کے ساتھ اسے ہدیہ قارئین میثاق کر رہے ہیں (ادارہ)

علاقہ اور علاقہ کے لوگ

جس علاقے میں جہاد کیا گیا وہ سخت درجہ کا پہاڑی اور جنگلاتی علاقہ تھا اور وہاں کے سوشل حالات ہمارے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے اس وقت کے حالات جیسے تھے جب حضرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ یہاں آئے تھے۔ قبیلوں، دیہات اور گھروں کی آپس میں دشمنیاں تھیں۔ وہاں کے رسوم و رواج میں خونی دشمنیوں اور انتقام کے نہ صرف قاعدے مقرر تھے، بلکہ ان پر وہ لوگ سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ اس معاملے میں مندرجہ ذیل مثالوں سے پوزیشن واضح ہو جائے گی۔

امام شامل مرحوم نے ایک دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ تین سو سال قبل ایک گاؤں کے باشندے نے اپنے پڑوسی کی مرغی چرالی۔ پڑوسی نے انتقاماً ایک بھیڑ چرالی، جس پر دوسرے شخص نے بدلہ میں دو بھیڑیں چرالیں۔ اس پر پہلے نے ایک گائے چرالی۔ اب دوسرے نے پڑوسی کا گھوڑا چرالیا۔ اس چوری پر پہلا شخص اس قدر سٹ پٹایا کہ جب اسے کوئی اور چیز اتنی قیمت کی نظر نہیں آئی تو اس نے پڑوسی کو قتل کر دیا اور فرار ہو گیا۔ خون کا بدلہ خون ہونا تھا لیکن قاتل غائب تھا۔ چنانچہ مقتول کے ورثاء نے مقامی رواج کے مطابق قاتل کے ایک نزدیکی رشتہ دار کو قتل کر دیا۔ لہٰذا خون کے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور تین صدیوں تک جلتی رہی۔ اس دوران بیسیوں بلکہ بعض کے مطابق سینکڑوں معصوم لوگ قتل ہوئے تاکہ قبائلی عزت برقرار رہے۔ یہ سارا کچھ ایک مرغی کے سبب ہوا۔

ایک اور گاؤں میں ۱۸۲۶ء میں ایک کمرے میں چودہ آدمیوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور سارے مارے گئے، صرف ایک آدمی بچا۔ اس موقع پر لڑائی کا سبب خون کا انتقام تھا جس پر پہلے بھی کئی قتل ہو چکے تھے۔ اسلام کا قانون اس کے برخلاف تھا۔ ان

لوگوں نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن عمل اکثر اپنے پرانے جاہلیت کے رسوم و رواج اور قوانین پر کرتے تھے۔

ان لوگوں کے تمام مرد پیدائشی گھڑسوار تھے۔ وہ تلوار کی لڑائی کے ماہر اور زبردست نشانچی تھے۔ ان لوگوں کو اپنا اسلحہ ہر دوسری چیز کے مقابلے میں عزیز تھا' جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا تھا اور اسلحہ کے بعد یہ لوگ اپنے گھوڑے کو سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ لمبے قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ ان میں سے اکثر بڑے خوبصورت' حاضر دماغ' بہادر' عقلمند اور مہمان نوازی کو ایک مقدس فرض سمجھنے والے تھے۔

تحریکِ جہاد

چیچنیا اور داغستان کے علاقے میں مریدیت کے تحریک چل رہی تھی جس کے بانی جناب مُلّا محمد صاحب تھے جو یاراغل کے رہنے والے تھے۔ اندر اندر جہاد کی خواہش ابھر رہی تھی۔ تاہم اس تحریک کے پہلے امام غمری کے قاضی ملا صاحب تھے۔ دوسرے ہمزاد بیگ صاحب تھے۔ تیسرے امام جناب حضرت امام شامل تھے' جن کی قسمت میں انتہائی عروج لکھا تھا۔ پہلے دو اماموں کی مدتِ جہاد مجموعی طور پر پانچ سال تھی اور حضرت امام شامل نے ان کے بعد ۲۵ سال تک جہاد کیا۔ تاہم حضرت امام شامل کا زمانہ جہاد ۳۰ سال شمار کیا جاتا ہے' کیونکہ پہلے دو اماموں کے دست راست بھی حضرت امام شامل ہی تھے۔ یہ ۳۰ سال ۱۸۵۹ء میں ختم ہوئے۔

امام قاضی ملا صاحب ۱۷۹۳ء میں غمری میں پیدا ہوئے اور اچھی تعلیم حاصل کی۔ یہ زبردست مقرر تھے اور اپنے علم اور ذہانت کے سبب ان کا اپنے لوگوں پر بڑا اثر تھا۔ ان کی بات اور تقریر کا دلوں پر بہت اثر ہوتا تھا۔ وہ اکثر وقت خاموش رہتے تھے۔ جناب شامل جو امام قاضی ملا صاحب سے تین سال چھوٹے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ امام قاضی ملا پتھر کی مانند خاموش ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑے بہادر اور دھن کے پکے تھے۔

شامل صاحب بھی غمری میں پیدا ہوئے اور بچپن میں قاضی ملا صاحب کے بہت

نزدیکی پڑوسی تھے۔ یہ دونوں لڑکے جنہوں نے غمری کو شہرت دوام بخشی آپس میں گہرے دوست تھے۔ کم عمری میں ہی جناب شامل اپنی غیر معمولی طاقت اور قوت کے سبب مشہور ہوگئے۔ یہ رتبہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ہر ممکن طریقہ استعمال کیا۔ انہوں نے تلوار چلانے' دوڑنے' چھلانگیں لگانے اور دیگر جمناسٹک میں خوب خوب مشق کی۔ ۲۰ سال کی عمر میں ان کاموں میں کوئی بھی دوسرا ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ ۲۷ فٹ چوڑی نہر کو پھلانگ کر پار کرسکتے تھے' اسی طرح آدمیوں کے سروں کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزر سکتے تھے۔ یہ ننگے پیر رہتے تھے اور سردی یا گرمی ہر موسم میں سینہ کھلا رکھتے تھے اور اس پہاڑی علاقے کے سخت جان اور بہادر لوگوں کے درمیان وہ سب سے زیادہ جراتمند اور طاقتور شخص تھے۔ وہ بڑے پھرتیلے' زور آور' علم کے پیاسے اور خود پر فخر کرنے والے تھے۔ البتہ کچھ فکر مند اور بہت زیادہ حساس تھے۔

شامل صاحب کے پہلے استاد ان کے ساتھی قاضی ملا تھے۔ امام صاحب کہا کرتے تھے کہ میں نے قاضی ملا سے جتنا سیکھا ہے اتنا کسی اور سے نہیں سیکھا۔ ان دونوں نے اپنے علاقے کے متعدد بڑے عالموں سے علم حاصل کیا۔ پھر یہ یاراغل گئے جہاں انہوں نے تحریک مریدیت کے اصول سیکھے۔ سب سے پہلے انہوں نے شراب کی لعنت کی مخالفت کی۔ جب قاضی ملا صاحب نے اس کی تبلیغ شروع کی تو انہوں نے شامل صاحب سے کہا کہ مجھے چالیس کوڑے عوام کے سامنے مارو کیونکہ میں نے شراب چکھ لی تھی اور مجھے اس کے بڑا گناہ ہونے کا علم نہیں تھا۔ شامل صاحب نے بھی ایسی ہی سزا کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ شراب کے خلاف یہ مہم اس عجیب طریقے سے شروع ہوئی اور بہت ہی کامیاب ہوئی اور اس کا اثر بہت دیرپا رہا۔ غمری کے لوگ گڑگڑا کر خدا سے معافی کی درخواست کرنے لگے۔ بہت سوں نے قاضی ملا صاحب کے کپڑوں کو چوما اور اپنی سینہ کوبی کی کہ ہم کیوں ماضی میں گناہ کے کام کرتے رہے ہیں۔

۱۸۲۲ء میں یاراغل کے ملا محمد صاحب کو مرشد بنالیا گیا اور اس کے بعد سے وہ شریعت کا پرچار یاراغل کی مسجد میں کرتے رہے۔ دوسری جانب قاضی ملا صاحب غمری میں ۱۸۲۷ء میں کھلم کھلا تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ ان کے طریقت کے استاد جمال الدین صاحب تھے

جو ملا محمد صاحب کے شاگرد تھے۔ جمال الدین صاحب نے اپنی بیٹی زیدت شامل صاحب سے بیاہ دی تھی اور اس کے بعد جمال الدین صاحب شامل صاحب کے بہترین دوست اور نہایت عقلمند مشیر بن گئے۔ جمال الدین صاحب یہ نہیں مانتے تھے کہ جہاد کا صحیح وقت آگیا ہے اور وہ قاضی ملا صاحب کو بھی جہاد سے روکتے تھے۔ اس پر قاضی ملا صاحب یاراغل گئے اور ملا محمد صاحب کو مخاطب کرکے کہا : "خدا تعالیٰ اور اس کی کتاب ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم کافروں سے لڑیں اور دہریوں سے لڑیں لیکن جمال الدین صاحب ہمیں اجازت نہیں دیتے۔ اب ہم کس کا حکم مانیں؟" ان کو یہ جواب ملا کہ ہمیں خدا کے احکام پر عمل کرنا چاہئے' انسانوں کے احکام پر نہیں اس طرح فیصلہ ہوگیا۔

غمری واپسی کے بعد قاضی ملا صاحب زور و شور سے تبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ ان کا سب سے زیادہ زور شریعت کی بحالی اور رسوم و رواج ترک کرنے پر تھا اور انہوں نے روسیوں کی غلامی قبول کرنے کی پرزور مخالفت کی۔ قاضی ملا صاحب نہ صرف ایک شعلہ بیان مقرر تھے بلکہ ایک بڑے عالم بھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی ۴۰۰ سے زیادہ احادیث زبانی یاد تھیں' جن کو وہ اپنی تقریروں میں اکثر بیان کرتے تھے۔

تلوار کا جہاد

قاضی ملا صاحب کی پہلی عوامی کال برائے جہاد ۱۸۲۹ء میں لکھی گئی۔ غمری میں ایک جلسہ عام کے بعد' جس میں دور دور سے دینی رہنما شریک تھے' سب نے یک زبان ہو کر قاضی ملا صاحب کو امام تسلیم کیا اور ان کی جہاد کی دعوت پر لبیک کہا۔ چنانچہ جہاد کا فیصلہ ہوگیا۔

پہلا پروگرام پکو بھیکی پر حملہ کا تھا۔ یہ مقام ایک نواب کی بیوہ کے نام سے معنون تھا جس نے روسیوں کی اطاعت قبول کرلی تھی اور اب وہی یہاں کی حاکم تھی۔ ۴ فروری ۱۸۳۰ء کو قاضی ملا صاحب تین ہزار آدمیوں کے ساتھ چلے۔ راستے میں انہیں اتنے ہی آدمی اور مل گئے۔ راستے میں ان کے مخالفوں نے ان پر حملے بھی کئے لیکن انہیں شکست دیدی گئی۔ ان جھڑپوں میں ۲۷ آدمی شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ غمری سے

سارا راستہ امام قاضی ملا صاحب پیدل آئے کیونکہ انہوں نے جہاد کا جھنڈا نہیں لہرایا تھا۔ اور وہ اپنے عجز و انکسار کے سبب گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ کئی دفعہ وہ چلتے چلتے رک جاتے اور آگے کی طرف جھک جاتے اور ہاتھ کان کے پاس لے جاتے جیسے وہ کچھ سن رہے ہوں' اگرچہ پہاڑوں میں ہر طرف سناٹا ہوتا تھا۔ جب ان کے ساتھی ان سے سوال کرتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو وہ ان سے الٹا سوال کرتے تھے کہ کیا تم لوگ نہیں سن رہے ہو۔ میں تو ان زنجیروں کی آواز سن رہا ہوں جن میں بندھے روسی قیدی میرے پاس لائے جائیں گے۔

پھر ایک پتھر پر بیٹھ کر وہ اپنے خیالات میں کھو جاتے اور اپنے تصور میں چیچنیا کا سارا علاقہ لے کر پھر ماسکو پر قبضہ کرتے اور پھر استنبول جاتے اور وہ سوچتے کہ اگر ترک خلیفہ دیندار ہو اور شریعت پر عمل کرتا ہو تو ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے ورنہ ہم اسے گرفتار کرلیں گے اور اس کی سلطنت کسی اچھے مسلمان کو دے دیں گے۔ جب قاضی ملا صاحب اینڈی کے قریب پہنچے تو سب لوگوں نے ان کا استقبال کیا اور وہاں کے مسلمانوں نے ان کے لئے چادریں بچھائیں۔

ان واقعات کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا۔ پکو بھیکی کے علاقے کے لوگ بھی بہت متاثر ہوئے لیکن پکو بھیکی کے صدر مقام میں بالآخر امام قاضی ملا صاحب کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ۱۴ فروری ۱۸۳۰ء کو مجاہدین نے دو طرف سے حملہ کیا۔ ایک طرف امام قاضی ملا کمان کر رہے تھے اور دوسری طرف جناب شامل کمان کر رہے تھے۔ ان کے نعرے تھے : "اللّٰہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللّٰہ"

وہاں کے لوگوں نے نہ کبھی ایسا منظر دیکھا تھا اور نہ ایسے نعرے سنے تھے۔ ان کے ہتھیار خود بخود ان کے ہاتھوں سے گر گئے اور بندوقیں اور گولے جو وہ چلا رہے تھے وہ خاموش ہو گئے۔ اس پر پکو بھیکی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے محافظ ہتھیار ڈالنے ہی والے ہیں' اس نے اپنی نسوانیت کا فائدہ اٹھایا اور تلوار ہاتھ میں لے کر باہر نکلی۔ اس نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کہا کہ تم لوگ ہتھیاروں کے قابل نہیں ہو۔ تم یہ ہمیں دے دو اور تم ہماری حفاظت میں آ جاؤ۔ اس طرح غیرت میں آکر پکو بھیکی کے لوگ مجتمع ہو گئے اور

مجاہدین پر پل پڑے۔ مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا' ۲۰۰ آدمی شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

جناب شامل کی جان کو سخت خطرہ ہو گیا تھا' لیکن یہاں سے وہ بال بال بچے۔ شامل صاحب کئی مرتبہ بال بال بچے ہیں اور یہ اس طرح کا پہلا واقعہ تھا۔ ان کے نصیب میں ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔

حضرت امام قاضی ملا صاحب غمری واپس ہو گئے اور وہ کہتے تھے کہ یہ شکست فاش خدا کی جانب سے ایک سزا تھی' جو ہمیں ایمان کی کمزوری کی بدولت ملی ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنے اعتقادات اور اپنے اعمال کو درست کرنا چاہئے۔

روس سے ٹکر[1]

امام صاحب نے روسیوں کے ایک قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اسے بچانے کے لئے روسی فوج بڑی تعداد میں پہنچ گئی اور وہاں کافی بڑے علاقے نے جس میں غمری شامل نہیں تھا روسیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے بعد روسی فوج وہاں سے چلی گئی کیونکہ مجاہدین پہاڑوں اور جنگلوں کے دشوار گزار علاقے میں چلے گئے تھے جہاں روسیوں نے ان کا تعاقب نہیں کیا' صرف ناکام کوشش کے بعد چلے گئے۔ اس سے امام قاضی ملا صاحب کی عزت اور ہمت بڑھ گئی اور انہوں نے مجاہدین کی بڑی تعداد کے ساتھ ایک علاقے پر حملہ کر دیا اور وہاں کے روسی کمانڈر کو شکست دے دی۔ دو ایک مزید کامیابیوں کے بعد امام صاحب نے ایک روسی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ فتح ہونے ہی والا تھا کہ عین وقت پر روسی کمک پہنچ گئی۔ امام صاحب کو بہت نقصان ہوا' شکست ہو گئی اور انہیں پہاڑوں اور جنگلات میں پناہ لینی پڑی۔ یہ واقعہ مئی ۱۸۳۱ء کا ہے۔

---

[1] میں یہاں جناب کرنل حامد کی کتاب کا ترجمہ اور تلخیص پیش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد کرنل حامد صاحب لکھتے ہیں کہ جناب امام قاضی صاحب پکو بیکی کے علاقے پر قبضہ کے بعد ترچھنیا کے دوسرے علاقے پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ پکو بیکی سے شکست فاش کے بعد اس کے علاقہ پر قبضہ کیسے ہوا' یہ نہیں معلوم۔ کرنل صاحب کی کتاب اس معاملے میں خاموش ہے۔ (عرض مترجم)

صرف دس دن آرام کے بعد امام صاحب نے ایک دوسری جگہ روسی قلعہ کا محاصرہ کرلیا، یہاں بھی روسی کمک پہنچ گئی۔ امام صاحب پچھلے تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بروقت پیچھے ہٹ گئے اور ساتھ کے جنگلات میں چلے گئے۔ جب روسی فوج نے ان کا جنگل میں تعاقب کیا تو وہاں امام صاحب نے روسیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے، ان کی ایک توپ پر قبضہ کرلیا اور خود جرنیل کو بھی زخمی کر دیا۔

جناب ہمزاد

پہاڑوں کے دوسری جانب جناب ہمزاد صاحب جو بعد میں دوسرے امام بنے، وہ بھی آزادی کی تحریک شروع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس تحریک کو دبانے کی کوشش میں روسیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے ۳۹۸ سپاہی اور ۱۰ افسر مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ ان کی کل طاقت تین بٹالین سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ان کی چار توپیں چھین لی گئیں۔ سب سے بڑا نقصان، جس کو ان کے جرنیلوں نے بلکہ خود شہنشاہ روس نے بہت محسوس کیا وہ یہ تھا کہ روسیوں کی دو بٹالین فوج مجاہدین کو دیکھتے ہی گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی اور سخت افراتفری مچی۔

جناب امام قاضی ملا صاحب پھر پہاڑوں میں چلے گئے۔ یہاں اگست میں انہیں ایک علاقہ کے لوگوں کا وفد ملا جنہوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے علاقے میں آئیں اور روسیوں کے خلاف جہاد میں ہماری رہنمائی کریں۔ اس پر امام صاحب فوراً چل پڑے اور دربند کے روسی قلعہ کا محاصرہ کرلیا جو آٹھ دن جاری رہا لیکن یہاں انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر انہوں نے کزلیر کے شہر پر دلیرانہ اور کامیاب حملہ کیا۔ اس شہر کو امام صاحب قبل ازیں جانتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں قاضی ملا صاحب اور شامل صاحب یہاں کا دورہ کر چکے تھے۔ وہ یہاں چند بڑے جید علماء سے ملنے آئے تھے۔ یہ شہر فتح ہو گیا اور قاضی ملا اپنے گھر کو دو سو قیدیوں اور دیگر مال غنیمت کے ساتھ لوٹے۔ اس مال کی قیمت چالیس لاکھ روبل کے لگ بھگ تھی۔

روسی جنرل نے تہیہ کرلیا کہ وہ مجاہدین کی پہاڑی پناہ گاہ، جو کہ بڑی مضبوط تھی کو ہر

قیمت پر تباہ کرے گا۔ ۲۶ نومبر کو ایک ناکام کوشش کے بعد یکم دسمبر کو روسی فوج نے بھرپور حملہ کردیا۔ قدرتی اور مصنوعی روکاوٹوں کے باوجود یہ حملہ کامیاب رہا۔ روسیوں کے ۴۰۰ آدمی کام آئے۔ ایک لکڑی کے ٹاور پر، جس کی حفاظت ۲۰۰ مجاہدین کررہے تھے قبضہ کے لئے آٹھ روسی افسر مارے گئے۔ روسیوں نے پچھلی جنگ میں ہاری ہوئی توپ پر قبضہ کرلیا، لیکن اس پر ان کے ۸۰ آدمی مارے گئے جبکہ ۱۵۰ مجاہدین نے شہادت پائی۔

اس دوران حضرت امام قاضی صاحب نے کوشش کی کہ ایک وسیع علاقے کے لوگ متحد ہو جائیں اور ایک بڑی ریاست وجود میں آجائے۔ انہوں نے اسلام کا پیغام پھیلانے کے لئے بہت سے آدمی بھیجے۔ یہ کاروائی ان مذہب سے بیگانہ لوگوں اور قبیلوں میں بہت کامیاب ہوئی۔ ان نومسلم قبائلیوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے روسی افسر اور سٹاف کو قتل کردیا اور اس طرح اسلام اور آزادی کے لئے اپنا خلوص ثابت کیا۔

بدلہ لینے کے لئے روسی فوج حرکت میں آگئی۔ یہ لوگ تعداد میں بھی کم تھے اور غریب بھی تھے، باقاعدہ مقابلہ نہیں کرسکتے تھے لیکن انہیں اپنے پہاڑی مورچوں پر اعتماد تھا اور ان کا خیال تھا کہ روسی ان تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ چنانچہ جب روسیوں کی جانب سے مطالبہ آیا کہ ہتھیار ڈالو اور ہمارے آدمیوں کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کرو تو انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر روسیوں نے فوجی دستہ جمع کیا جس میں ۳۰۰ باقاعدہ سپاہی، چار پہاڑی توپیں اور ۵۰۰ ملیشیا کے لوگ تھے۔ چونکہ راستہ میں سڑک نہیں تھی اس لئے جوانوں نے بہت تھوڑا سامان ساتھ لیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد راستے کے دونوں جانب بہت گہرائیاں تھیں اور راستہ بہت تنگ ہوگیا تھا جس پر ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ چنانچہ جانے والوں کو ایک ایک کرکے گزرنا پڑا اور توپوں کو خچروں پر لادنا پڑا۔ اس طرح اس چھوٹی سے فوج کے دستہ کی لمبائی بہت زیادہ ہوگئی جو پانچ میل سے کم نہیں تھی۔

آغاز سے پانچویں دن پہلی بار کچھ گولیاں چلائی گئیں۔ اس ساری مہم کے دوران کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوئی۔ روسی فوج نے گاؤں کے گاؤں تباہ کردیئے۔ ان کے ٹاور

اڑا دیئے اور فصلیں کاٹ ڈالی گئیں۔ مجاہدین کو خوب معلوم تھا کہ روسیوں کی اتنی فوج کا مقابلہ کب کیا جائے اور وہ بس اکا دکا بچھڑا ہوا روسی سپاہی اٹھاتے رہے یا پھر چند مناسب جگہوں پر وہ روسی فوج پر پتھر برساتے تھے۔

روسی فوج کا مقصد تھا کہ اس علاقے کے آخری گاؤں کو بھی تباہ کر دیا جائے' اس لئے ساری فوج اس جانب مارچ کرتی رہی۔ راستہ کی تنگی کی وجہ سے ایک ایک آدمی گزرتا تھا۔ اگر ایک آدمی رکتا تو اس کے پیچھے ساری فوج رک جاتی۔ اس سفر میں روسی فوج کے ساتھ ایک مذاق ہو گیا۔ راستہ میں ایک بڑا مضبوط ٹاور تھا جس پر سے فوج کی حرکت کنٹرول ہو سکتی تھی' کیونکہ صاف نظر آتا تھا کہ پر عزم مجاہدین اس ٹاور کی حفاظت پر تھے اور اس کی وجہ سے روسی فوج پورے تین دن رکی رہی۔ فوج نے بڑی مشکل سے ایک چھپا ہوا راستہ سخت پہاڑی چٹان کاٹ کر ٹاور کی بنیاد تک بنایا اور ایک بارودی سرنگ لگائی' صرف اس کے بعد ہی مجاہدین نے ہتھیار ڈالے۔ روسیوں کو سخت حیرت ہوئی کہ ان کی چار ہزار نفری کو تین دن تک روکے رکھنے والے صرف دو مجاہدین تھے۔

کرنل محمد حامد صاحب کی کتاب سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ۸۰۰ آدمی جو چلے تھے "۲۰۰۰" کیسے ہو گئے کوئی تاریخ نگار اگر اس پر روشنی ڈال سکے تو یہ مفید کام ہو گا۔ یہاں کرنل محمد حامد صاحب کی انگریزی کتاب "امام شامل" کے ابتدائی دو ابواب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کے کل نو (۹) ابواب ہیں اور کتاب کے کل صفحات ۱۵۶ ہیں۔

بقیہ : عرض احوال

اگر اللہ نے چاہا تو سپاہ صحابہ اور سپاہ محمد کے اہم قائدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے گا۔ اسی طرح تکمیل دستور خلافت مہم کے ایک اہم سنگ میل کے طور پر ۶ جولائی کو صبح ۹ بجے الحمرا ہال لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا پروگرام ہے جس میں توقع ہے کہ پاکستان کے تمام دینی مکاتب فکر کے اہم نمائندے شرکت کریں گے اور دستور پاکستان کو موجودہ منافقت سے پاک کرنے اور صحیح اسلامی خطوط پر استوار کرنے کی اس مہم کے لئے مشترکہ لائحہ عمل پر غور ہو گا۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔

قصوروار کون — لڑکی یا والدین؟

سید مظہر علی ادیب، لاہور

نوجوان لڑکیاں گھروں سے بھاگ رہی ہیں۔ محبت کی شادیوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان آشنائیاں روز بروز عام ہوتی جا رہی ہیں۔ والدین معاشرے میں رسوا ہو رہے ہیں اور خودکشی تک کر رہے ہیں۔ وہ خود اپنی بچیوں کو "آشناؤں سمیت" قتل کر رہے ہیں۔ اس قسم کی لڑکیوں سے "دار الامان" بھرے پڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس شرمناک اور کربناک صورتحال کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ لڑکیاں یا ان کے والدین؟ لڑکیاں جب اپنے آشناؤں کے ساتھ گھروں سے بھاگتی ہیں تو وہ یکایک اچانک بھاگنے کا منصوبہ نہیں بنا سکتیں۔ جب لو میرج عدالت میں ہوتی ہے تو وہ بھی کئی مراحل سے گزر کر ممکن ہوتی ہے۔ کوئی فوری اقدام نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ لڑکی کے کسی لڑکے سے "گہرے تعلقات" پیدا ہونے کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔

اب اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ اس حد تک "گہرے تعلقات" استوار کر رہی ہوتی ہے، اس کے والدین کہاں سوئے رہتے ہیں؟ وہ اپنی بچیوں کو شرعی پردہ کیوں نہیں کراتے؟ وہ ان کو گھریلو مرد ملازموں، باورچیوں، ڈرائیوروں، دفتر کے نوجوان ساتھیوں اور دوستوں کے سامنے کیوں کرتے ہیں؟ وہ اپنی نوجوان لڑکیوں کو خاندان کے نوجوان لڑکوں (کزن وغیرہ) سے فری کیوں ہونے دیتے ہیں؟ انہیں تنہائی کیوں دیتے ہیں؟ وہ ان کو اکیلے سفر کرنے یا بھرے بازاروں میں تماشاپنگ کرنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں؟ الغرض آج کے والدین اپنی بچیوں کی حفاظت کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری صحیح طور پر نہیں نبھا رہے ہیں۔ اس سنگین مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ والدین شروع ہی سے اپنی نوجوان بچیوں کے لئے گھروں سے باہر مکمل ستر پوشی (برقع یا لمبی نقاب دار چادر کے ذریعے) اور گھر کے اندر نامحرموں سے مکمل پردہ کا اہتمام کریں۔ خاندان کے نوجوان

لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھیں۔ تنہائی اور ہنسی مذاق کی آزادی نہ دیں۔
بے شک اس کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کی اصلاح بھی بے حد ضروری ہے' جو گزشتہ تیس سال سے ڈراموں اور کھیل تماشوں کے ذریعے مسلسل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں عشق کرنے کی باقاعدہ تربیت دے رہے ہیں۔ خفیہ ملاقاتوں کے طریقے سکھائے جا رہے ہیں' لومیرج کی ایک منظم طریقے سے ترغیب دی جا رہی ہے' والدین کو نظرانداز کر کے ہر صورت میں "اپنی پسند کی شادی" کو رواج دیا جا رہا ہے۔ دفتروں اور گھروں میں مردوں اور عورتوں کے درمیان حد درجہ آزادی اور ملنا جلنا دکھایا جا رہا ہے۔
اسلام نے عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت کی خاطر جو چند معاشرتی پابندیاں اس پر لگائی ہیں ان کو توڑا جا رہا ہے اور فرسودہ قرار دیا جا رہا ہے۔ الغرض' والدین کی مثبت کوششوں کے ساتھ ساتھ ٹی وی کے موجودہ منفی رویئے کو بدلنا بے حد ضروری ہے۔

ہماری زبوں حالی اور اس کا علاج

وسیم احمد

اس وقت ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ تاریخ کا نازک ترین دور ہے۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد سوا ارب سے زائد ہے۔ اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود آج دنیا میں ہمارا کوئی مقام نہیں۔ آج ہم اپنا مقام امامت اپنے ہاتھوں خود کھو چکے ہیں۔ آج بجائے اس کے کہ اقوام عالم ہم سے رہنمائی حاصل کرتی اور ہماری تابع فرمان ہوتی ہم خود دوسروں کے خوشہ چین ہو گئے ہیں اور دشمنان اسلام کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔
کلام ربانی سے راہنمائی حاصل کی جائے تو صورت واقعہ کچھ اس آیت کے مطابق ہے کہ "وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" گویا ہم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہر دردمند دل رکھنے والے پاکستانی کے لبوں پر یہ آواز ہے کہ امام خمینی کی طرز کا کوئی حاکم آئے جو ہمیں پیغام مسیحائی دے سکے۔ بالفاظ قرآنی :

"اور کہو اے میرے رب مجھے جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا' اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال' اور اپنی طرف سے ایک سلطان کو میرا مددگار بنا"۔ (بنی اسرائیل : ۸۰)

اس دعا کی قبولیت اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی ریاست قائم کردی تھی۔ یہ دعا اب بھی قبول و منظور ہو سکتی ہے بشرطیکہ مندرجہ بالا نیک خواہشات رکھنے والے لوگ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالکل اسی انداز میں اپنا جان و مال اللہ کی راہ میں کھپانے کا مصمم عہد کرلیں۔ بقول شاعر ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

یعنی دعوت حق کو شعوری طور پر قبول کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوں۔ پھر اس دعوت کو دوسروں تک پہنچائیں اور پھر اس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں جمع ہونے والے لوگ ایک امیر کے ہاتھ پر اقامت دین کی جدوجہد کرنے کے لئے بیعت کریں اور جب جماعتی نظم و ضبط کی بھٹیوں سے گزر کر کندن بن جائیں اور مطلوبہ تعداد حاصل ہو جائے تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجائیں۔ گویا ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

پھر اس معرکے کے دو ہی انجام ہیں۔ یا تو راہ حق میں شہادت کا رتبہ نصیب ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کا خلافت عطا کرنے کا وعدہ ہمارے ہاتھوں پورا ہو جائے۔ ارشاد ربانی ہے :

"وعدہ کرلیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائیں اور عمل صالح کا حق ادا کریں کہ انہیں لازماً زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ خلافت عطا کی تھی ان کو جو ان سے پہلے تھے۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو تمکن عطا فرمادے گا جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کے لئے خوف کے بعد امن کی حالت پیدا کر دے گا۔ پھر ایسے لوگ میری ہی بندگی کریں گے اور کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ پھر اس کے بعد بھی جو لوگ روگردانی کریں تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔ (النور : ۵۵)

★ ★

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد کرو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد :	۴۶
شمارہ :	۸
ربیع الثانی	۱۴۱۸ھ
اگست	۱۹۹۷ء
فی شمارہ	-/۱۰
سالانہ زر تعاون	-/۱۰۰

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔اے، گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض احوال

ملک میں آئینی و دستوری سطح پر نفاذ شریعت کی جانب پیش رفت کا معاملہ بدستور کھٹائی میں ہے۔ اسمبلی میں دو تہائی اکثریت رکھنے والی "مسلم لیگ" نے اپنی "بروٹ میجارٹی" کے بل پر آئین میں ان تمام ترامیم کو منظور کرانے میں غیر معمولی پھرتی اور مستعدی کا مظاہرہ کیا جن سے ان کے اقتدار کو لاحق خطرات کا ازالہ مقصود تھا۔ اللہ کی حاکمیت پر مبنی نظام کی تنفیذ اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے جاری جنگ کو بند کرنا شاید ایک غیر اہم اور غیر سنجیدہ معاملہ ہے جس کے لئے ترمیمی بل لانے کا ہمارے حکمران طبقہ کے پاس وقت نہیں ہے!! ــــــ پچھلے دنوں اخبارات میں بطرز جلی شائع ہونے والی ایک خبر نے امید کی جوت جگائی تھی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ وفاقی حکومت نے سود کے ضمن میں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر شدہ اپیل واپس لے لی ہے۔ اس امید افزا خبر پر ہر جانب سے مبارک سلامت کا شور اٹھا' لیکن جب اس خبر کی تفصیلات اور حکومتی "وضاحت" سامنے آئی تو حقیقت کھلی کہ قدم آگے نہیں بڑھایا گیا' پیچھے ہٹایا گیا ہے۔ گویا ع "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا' جو سنا افسانہ تھا!" ظاہر بات ہے کہ اندرونی دباؤ کے ساتھ ساتھ ان عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کو جھیلنا بھی حکومت وقت کے لئے آسان نہیں ہے جن سے مزید سودی قرضے لئے بغیر چارہ نہیں۔ اللہ پر ایمان و یقین کی وہ کیفیت تو ہمیں حاصل ہے نہیں کہ اس کی رزاقیت پر اعتماد کرتے ہوئے فی الفور اندرون ملک سود کے خاتمے کا اعلان کر سکیں۔ اس صورت میں اللہ کی نصرت و حمایت کے حصول کے ساتھ ساتھ ۱۵۳ بلین روپے کی وہ خطیر رقم بھی بچ رہتی جو حالیہ بجٹ میں اندرون ملک قرضوں پر سود کی ادائیگی کے لئے مختص کی گئی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے.... "وہی دیرینہ بیماری' وہی نامحکمی دل کی"!!

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف دائر کردہ اپیل واپس لینے کا حکومتی ڈرامہ بلاشبہ نہایت افسوسناک ہے' جس پر چیف جسٹس آف پاکستان جناب سجاد علی شاہ نے بھی نہایت بروقت اور نہایت مناسب گرفت کی ہے۔ اس صورت حال پر امیر تنظیم اسلامی کے تاثرات و جذبات کی بخوبی عکاسی ۴ جولائی کے خطاب جمعہ کے پریس ریلیز سے ہوتی ہے جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے سطور ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

> امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حکومت کی جانب سے سود سے متعلق شرعی عدالت کے فیصلے کے ضمن میں وفاقی حکومت کی جانب سے سپریم کورٹ میں اپیل کی

واپسی پر مبنی اجمالی خبر پر میں نے حکومت کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا تھا مگر اب پوری صورت حال سامنے آنے پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ وفاقی حکومت کی جانب سے سود کے فیصلے کے خلاف دائر کردہ اپیل کی واپسی کا انتظار کئے بغیر وفاقی شرعی عدالت سے بینک انٹرسٹ کی حرمت کے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کرنا بہت بڑا فراڈ اور دھوکہ بازی کا مظہر ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حکومت سپریم کورٹ اور شرعی عدالت میں دائر کردہ درخواستیں فوراً واپس لے اور شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل کو سپریم کورٹ کے شریعت اپلیٹ بنچ میں فوری سماعت کا اہتمام کرے۔ انہوں نے کہا کہ چیف جسٹس کی جانب سے حکومتی طرز عمل پر مبنی بر حقیقت تبصرہ میرے خیالات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔ ہماری قومی زندگی پر تہہ در تہہ کئی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ پاکستانی قوم اجتماعی سطح پر منافقانہ طرز عمل کا نمونہ بن چکی ہے۔ اور جھوٹ' وعدہ خلافی اور بدعنوانی ہمارا قومی کلچر بن چکا ہے۔ انہوں نے میاں نواز شریف سے مطالبہ کیا کہ خدارا دین کے نام پر دین سے مذاق اور شریعت سے دھوکہ بازی کا سلسلہ بند کیا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حکومت کے کچھ "خیر خواہ" سودی معیشت کے بغیر قوم کے بھوکا مرنے کا گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ درحقیقت نواز شریف کے یہ حواری' آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے پجاری ہیں جو نواز شریف کی عاقبت تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سودی نظام کی وجہ سے مکمل تباہی ملک کے سر پر منڈلا رہی ہے اور ملک مکمل طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے اعداد و شمار کے حوالے سے بتایا کہ روزانہ 48 کروڑ کی خطیر قومی آمدنی سود کی ادائیگی کی نذر ہو جاتی ہے' ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ توبہ اور اصلاح احوال کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ لہٰذا حکومت اندرون ملک سودی معیشت کو فوراً ختم کر کے اللہ اور رسول ؐ سے جاری جنگ فوراً بند کرے اور آئندہ کے لئے یہ طے کیا جائے کہ کوئی سودی قرض بیرونی امداد کے طور پر نہیں لیا جائے گا خواہ ہمیں فاقے کرنے پڑیں' غیر سودی قرضوں کے حصول کے لئے اسلامی ممالک سے رجوع کیا جا سکتا ہے' البتہ بیرونی ممالک اور عالمی اداروں سے کئے گئے سابقہ معاہدوں کی پابندی کی جائے۔ انہوں نے کہا اندرون ملک سودی نظام کے خاتمے سے قومی آمدنی میں اس قدر اضافہ ہو جائے گا کہ اس سے ہر قسم کے بیرونی قرضوں کی ادائیگی ممکن ہو جائے گی۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حکومت کو چاہئے کہ وہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے پوری قوم کو سودی نظام کی تباہ کاریوں اور خباثتوں سے آگاہ کرے تاکہ سودی نظام کے خاتمے کے لئے عوام بھرپور تعاون کریں۔ انہوں نے کہا اسلامی اصولوں کی روشنی میں نظام بینکاری کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی پیش کردہ سفارشات پر مبنی گورنر سٹیٹ بینک کی طرف سے جاری کردہ سرکلر میں بیان کردہ دس سفارشات فوراً نافذ کر کے غیر سودی

معیشت کو رائج کرے۔ انہوں نے بتایا کہ ملک کی قومی آمدنی کا تین چوتھائی حصہ ملکی سرمایہ داروں کی تجوریاں میں چلا جاتا ہے جبکہ 1/4 حصہ بیرونی ممالک اور عالمی اداروں کی نذر ہو جاتا ہے۔

افغانستان کی طالبان حکومت کی طرف سے اپنے تمام مخالفین کو معافی کے اعلان کی تائید کرتے ہوئے امیر تنظیم نے کہا کہ طالبان حکومت کی جانب سے اپنے مخالفین کے خلاف کارروائی نہ کرنے کا غیر معمولی اعلان درحقیقت اسوہ رسول ؐ کی پیروی کا مظہر ہے۔ انہوں نے سعودی عرب کی ایران سے دوستی کی خواہش کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایران کے ساتھ تعلقات کی بحالی کے ضمن میں سعودی حکومت کا فیصلہ انتہائی دانشمندانہ اور امت مسلمہ کے مفاد کے لئے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ مجھے امید ہے کہ ایرانی حکومت بھی افغانستان کی طالبان حکومت کے بارے میں اپنی موجودہ پالیسی پر نظرثانی اور طالبان سے خوشگوار تعلقات قائم کر کے اسلامی اخوت کا مظاہرہ کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ دستوری ترامیم کے ذریعے قرآن و سنت کی حاکمیت کے نفاذ سے ملک میں "سافٹ انقلاب" برپا ہو سکتا ہے مگر یہ انقلاب ہنوز دلی دور است کے مصداق ہے۔ انہوں نے کہا کہ مضبوط ڈسپلن کی حامل منظم انقلابی جماعت کے ذریعے ہی اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے جبکہ چار آنے کی ممبر سازی کی بنیاد پر بننے والی والی کاغذی جماعتوں کے ذریعے فساد تو برپا کیا جا سکتا مگر کوئی تعمیری کارنامہ سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ افراد کی تحریک کے نتیجے میں ملک میں انارکی بھی پیدا ہو سکتی ہے اور بدترین قسم کا مارشل لاء بھی مسلط ہو سکتا ہے جو ترکی اور الجزائر کی طرز کا بھی ہو سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

٦ جولائی کو تحریک خلافت پاکستان کے زیر اہتمام "دستور خلافت کی تکمیل" کے موضوع پر الحمرا ہال میں ایک بھرپور سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی مفصل اور مصور رپورٹ ہفت روزہ "ندائے خلافت" میں شائع ہو چکی ہے۔ تاہم اس سیمینار کے حوالے سے دستور خلافت کی تکمیل کے لئے چلائی گئی مہم کی کامیابی یا ناکامی کے امکانات کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی نے ۱۱ جولائی کے خطبہ جمعہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا وہ ہمارے نزدیک نہایت اہم ہیں۔ ذیل میں مذکورہ خطاب کا خلاصہ ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے:

دستور میں ترامیم کے ذریعے قرآن و سنت کو سپریم لاء بنا کر ملک میں "سافٹ انقلاب" برپا کیا جا سکتا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ دو تہائی اکثریت کی حامل مسلم لیگی حکومت دستوری سطح پر شریعت کی بالادستی اور سودی نظام کے

خاتمے کے لئے درکار عملی پیش رفت نہ کر کے ملک کو "خونی انقلاب" کی طرف لے جا رہی ہے جس کے نتیجے میں شدید خونریزی کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک پر پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کی حکومت ہے جس کی قیادت ملک کے ایک شریف اور مذہبی مزاج خاندان کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اب بھی ملک میں اسلامی نظام نافذ کر کے قیام پاکستان کے مقاصد کی تکمیل نہ کی گئی تو قومی سطح پر اصلاح احوال کا آخری موقع بھی ضائع ہو جائے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وزیراعظم نواز شریف نے میرے ساتھ ملاقاتوں میں شریعت کی بالادستی کے لئے ناگزیر دستوری ترامیم اور سودی نظام کے خاتمے کا دو ٹوک وعدہ کیا اور راجہ ظفرالحق کو مجوزہ دستوری ترامیم کابل بھی تیار کرنے کا حکم دیا مگر "پس پردہ ہاتھ" کی وجہ سے شریعت کی بالادستی کا قومی خواب پورا نہیں ہو رہا۔ انہوں نے کہا کہ سودی نظام کے خاتمے کے لئے "حالیہ حکومتی اقدامات" پوری قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور دھوکہ دہی کے مترادف ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ماضی کے حکمرانوں کی طرح ملک کو اسلامی ریاست بنانے کے عمل میں روائتی غفلت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء بنانے اور سودی نظام کے خاتمے کے لئے فوری پیش رفت کرے ورنہ ملک میں خونی یعنی سخت انقلاب کا راستہ از خود ہموار ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ سودی نظام معیشت کی وجہ سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ بدترین تباہی اور بربادی سے دوچار ہو چکا ہے۔ اگر قوم نے اجتماعی سطح پر اللہ تعالی اور رسول ؐ کے احکامات پر عمل کر کے قوم یونس ؑ کی طرح اجتماعی توبہ نہ کی تو ملک عنقریب خوفناک تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ جب تک انقلاب کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے کے لئے مطلوبہ افرادی قوت مہیا نہیں ہو جاتی اس وقت تک انفرادی سطح پر دین کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے غلبہ دین کے لئے قائم کسی بھی اسلامی انقلابی جماعت میں شامل ہونا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی انقلابی جماعت کا "نظم" مغرب کے سیکولر جمہوری اصولوں کی بجائے سنت سے اخذ کردہ طریق بیعت پر استوار کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ایران میں منظم اور غیر مسلح احتجاجی تحریک کے ذریعے انقلاب برپا کر کے انقلاب کے آخری مرحلہ کے لئے لائحہ عمل کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ پاکستان میں بھی دین کی پابندی اختیار کرنے والے لوگوں پر مشتمل ایسی اسلامی انقلابی جماعت انقلاب برپا کر سکتی ہے جو تربیت اور تنظیم کے مراحل سے گزر کر انقلاب کے آخری مرحلے کے لئے درکار افرادی قوت کے حاصل کرنے کے بعد موجودہ باطل اور استحصالی نظام کے خاتمے کے لئے پرامن اور غیر مسلح احتجاجی تحریک برپا کر سکے۔

فرائضِ دینی اور مسلمان خواتین (۲)

امیر تنظیم کا حلقہ خواتین کے اجتماع سے ایک خطاب

○

دینی فرائض کی بلند تر منزلیں

دینی فرائض کے اعتبار سے بنیادی سطح پر گفتگو کے بعد اب ہم بلند تر منزلوں کی بات کرتے ہیں۔ سب سے اونچی منزل اور بلند ترین سطح پر وہ نظام ہوتا ہے جو کسی ملک میں قائم ہوتا ہے اور اس سطح پر تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نظام تقویٰ پر مبنی ہو۔ اس لئے کہ تقویٰ انفرادی سطح پر بھی مطلوب ہے اور قومی و اجتماعی سطح پر بھی۔ اگر اجتماعی سطح پر اللہ کا حکم نافذ ہی نہ ہو تو پورا ماحول غیر متقی ہو جاتا ہے اور اس ماحول میں کسی شخص کے انفرادی تقویٰ کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ یہ تقویٰ وہ ثمرات و نتائج پیدا نہیں کرتا جو اس سے ہونے چاہئیں۔ ہمارے ایک ساتھی کا ایک بڑا سادہ سا لیکن بڑا معنی خیز شعر ہے کہ ؎

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو؟
کتنا حسیں فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم!

یعنی اوپر تو کفر کا اقتدار قائم ہے لیکن نیچے ایک شخص متقی بنا بیٹھا ہے تو اس کا یہ تقویٰ تو بہت ہی محدود ہو گیا۔ وہ اِس معاشرے کا ایک فرد ہے' اِس ملک کا ایک شہری ہے اور اِس اجتماعیت میں شریک ہے۔ لہٰذا جب تک پوری اجتماعیت تقویٰ پر قائم نہ ہو اس کا یہ تقویٰ کیسے مکمل ہو گا؟ اصل تقویٰ تو یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر اخلاقی حدود کی پابندی بھی ہو' معروف کا حکم دیا جائے اور بدی سے روکا بھی جائے۔

میں تقویٰ کی پہلی منزل کے ضمن میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ فطرتِ انسانی میں جو چیزیں ودیعت شدہ ہیں ان کی بنا پر ایک انسان بدی سے اجتناب کرتا ہے۔ اسی طرح ایک

معاشرے میں اجتماعی طور پر اس کا انتظام ہونا چاہئے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور بدی سے روکا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک وحدت کی صورت میں دس جگہ خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص انفرادی طور پر نماز پڑھ لیتا ہے جبکہ ایک محلے کے لوگ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انفرادی طور پر نماز پڑھنے والا باجماعت نماز کی فضیلت سے محروم رہتا ہے۔ لیکن اصل مطلوب یہ ہے کہ پورے ملک میں نماز کا نظام قائم کیا جائے۔ ایسے ہی زکوٰۃ کا معاملہ ہے کہ آپ نے اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر کسی مستحق کو دے دی اور مطمئن ہو گئے' لیکن پورے ملک میں زکوٰۃ کا نظام قائم ہونا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے کسی غریب رشتہ دار کو تو زکوٰۃ دے دی ہو لیکن اس سے اگلا پڑوسی بھوکا مر رہا ہو اور آپ کو اس کی خبر ہی نہ ہو۔ یہ تو ایک نظام کے تحت ہی ممکن ہے کہ سب شہریوں کے اندراجات ہوں اور حکومت کو معلوم ہو کہ ہمارے اس معاشرے میں کون لوگ خود کفیل اور صاحب نصاب ہیں اور کون لوگ نصاب سے نیچے ہیں۔ ان سب کی کفالت کی ذمہ داری اس نظام پر ہو گی۔ اسی نظام کے تحت ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی جن پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور ان لوگوں تک پہنچائی جائے گی جو اس کے حقدار ہیں۔ اسی صورت میں پورے ملک میں زکوٰۃ کی صحیح تقسیم ممکن ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں زکوٰۃ کی تقسیم انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہو گی۔ اس طرح احکام و قوانین خود ساختہ نہیں بلکہ اللہ کے عطا کردہ نافذ کئے جائیں۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ زانی مرد یا عورت اگر غیر شادی شدہ ہو تو اس کو برسرعام سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر زانی یا زانیہ شادی شدہ ہے تو اس کے بارے میں حکم واضح طور پر حدیث نبویؐ میں موجود ہے کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ اگر ہم یہ سب کچھ نہیں کرتے تو اگرچہ ہم نماز روزہ وغیرہ کی حد تک انفرادی تقویٰ پر تو عمل پیرا ہوں لیکن ہمارا اجتماعی تقویٰ تو نہ ہوا! اجتماعی تقویٰ کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ تمام احکام اور قوانین نافذ کئے جائیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیئے ہیں۔

'صدق' کے دو ناگزیر تقاضے

اب سمجھ لیجئے کہ انفرادی سے اجتماعی تقویٰ کی طرف سفر کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے : ایک یقینِ قلبی والا ایمان اور دوسرے جہاد۔ یہ دو چیزیں ہوں گی تو "صدق" کے تقاضے پورے ہوں گے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ کے حوالے سے ہم نے جن دس اوصاف کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے ایک اہم وصف "اَلصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَات" بھی ہے۔ "جہاد" درحقیقت نظام باطل کو تبدیل کرنے کی جدّوجہد اور کوشش ہے اور "ایمان" یہ ہے کہ دل میں اللہ کا' آخرت کا' جنت و دوزخ کا' فرشتوں کا' بعث بعد الموت کا' حساب کتاب کا' وحی کا' تمام انبیاء و رُسُل کا بالعموم اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا بالخصوص یقین ہو۔ یہ یقین قلبی والا ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ دونوں چیزیں جمع ہوتی ہیں تو "صدق" وجود میں آتا ہے۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں دوٹوک انداز میں فرمایا گیا ہے :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

"(راست باز' سچے اور حقیقی) مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک میں نہیں پڑتے (یعنی یقین کی کیفیت حاصل کرلیتے ہیں) اور جہاد کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ صرف یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں"۔

اب نوٹ کیجئے کہ الفاظ قرآنی "وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ" کی رو سے سچا اور راست باز ہونا مَرد کے لئے بھی مطلوب ہے اور عورت کے لئے بھی —— اس حوالے سے ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ مرد اور عورت دونوں کے لئے ضروری ہے۔ میں یہ بات جس اسلوب اور انداز میں بیان کر رہا ہوں اس کو ذہن نشین کر لیجئے۔ ہم یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ چکے ہیں کہ انفرادی تقویٰ مرد و عورت دونوں کے لئے ضروری ہے' جس کے ضمن میں سورۃ الاحزاب میں دس اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ اب

میں اس سے اگلی بات بیان کر رہا ہوں کہ اجتماعی تقویٰ کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ یقینِ قلبی والا ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ ہے' اور یہ دونوں چیزیں بھی مرد و عورت دونوں کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ "اَلصَّادِقُوْن" صرف وہی مرد قرار پائیں گے جن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں اور "اَلصَّادِقَات" کا مصداق بھی صرف وہی عورتیں قرار پائیں گی جو ان دونوں اوصاف کی حامل ہوں۔ لہٰذا جہاں تک "جہاد" پر کاربند ہونے کا تعلق ہے اس ضمن میں مرد و عورت کے مابین کوئی فرق نہیں۔

سہ منزلہ عمارت کی تشبیہ

فرائض دینی کے جامع تصور کو ذہن نشین کرنے کے لئے آپ ایک سہ منزلہ عمارت کی تشبیہ سامنے رکھیں۔ آپ ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کا نقشہ ذہن میں لائیں جس کی ایک مضبوط بنیاد (Foundation) ہے جو نظر آتا ہے' اس بنیاد کے اوپر وہ کرسی (plinth) ہے جو اگرچہ بنیاد ہی کا حصہ ہے لیکن نظر آتا ہے۔ یہ بنیاد دراصل "ایمان" ہے جس کا غیر مرئی حصہ "تَصدِیقٌ بِالقَلب" اور نظر آنے والا plinth "اِقرارٌ بِاللِّسان" ہے' یعنی ایمان کا اظہار و اعلان یا کلمۂ شہادت۔ اس بنیاد کے اوپر چار ستون (نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج) کھڑے ہیں جن کے اوپر ایک چھت ہے' جس سے اس عمارت کی پہلی منزل مکمل ہوتی ہے۔ انہی ستونوں پر اس عمارت کی دوسری منزل قائم ہے' لیکن دیواریں تعمیر ہو جانے کی وجہ سے ستون نظر نہیں آ رہے۔ اسی طرح اس کے اوپر تیسری منزل ہے جس کی چھت بھی انہی ستونوں پر قائم ہے۔ اس طرح یہ عمارت ایک بنیاد' تین منزلوں اور چار ستونوں پر مشتمل ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت ہمارے تصورِ فرائضِ دینی کی وضاحت کرتی ہے' جو مَردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے۔ اس عمارت کے بیچوں بیچ ایک بل کھاتا ہوا زینہ ہے جو پہلی منزل کے فرش سے شروع ہو کر تیسری منزل کی چھت تک جاتا ہے۔ یہ زینہ "جہاد" ہے۔ ظاہر ہے کہ اونچائی پر چڑھنے کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جہنم میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص عذاب چڑھائی چڑھنے کا رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ المدّثر میں یہ الفاظ آئے ہیں : "سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا" یعنی

"میں عنقریب اسے چڑھائی چڑھاؤں گا"۔ اس چڑھائی کی تفصیل ہمیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے شبِ معراج کا یہ مشاہدہ بیان فرمایا کہ جہنم میں بعض لوگوں کو یہ سزا دی جا رہی تھی کہ وہ بڑی محنت و مشقت سے 'ہانپتے کانپتے' پسینے سے شرابور' اونچائی پر چڑھ رہے تھے۔ جب وہ بلندی پر پہنچتے تو ایک فرشتہ دھکا دے کر انہیں نیچے گرا دیتا۔ اب پھر وہ اوپر چڑھنا شروع کر دیتے۔ اس طرح وہ چڑھائی چڑھنے کے عذاب میں گرفتار تھے۔ اس پر کسی کہنے والے نے بڑی اچھی بات کہی کہ "یا تو اس دنیا میں چڑھائی چڑھ لو' یا پھر آخرت میں چڑھنی پڑے گی"۔ دنیا کی چڑھائی یہ ہے کہ محنت و کوشش اور جدّوجہد کرتے ہوئے ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری منزل پر پہنچو۔ اگر یہاں پر یہ چڑھائی چڑھ لوگے تو آخرت کی چڑھائی سے بچ جاؤ گے۔

فرائض دینی کے حوالے سے ان تین منزلوں کا تصور ذہن میں رکھئے۔ بنیادی طور پر یہ منزلیں مَردوں کے لئے بھی ہیں اور عورتوں کے لئے بھی' لیکن جوں جوں ہم نیچے سے اوپر چڑھیں گے عورتوں کا دائرہ کم ہوتا جائے گا۔ آپ نے ایک خاص طرز تعمیر کی وہ عمارتیں دیکھی ہوں گی جو نیچے سے اوپر جاتے ہوئے دونوں طرف سے ترچھی (slant) ہوتی جاتی ہیں اور اوپر جا کر ان کا رقبہ کم ہو جاتا ہے۔ مرد و عورت کے فرائض کا فرق بھی اسی نوعیت کا ہے۔ گویا مردوں کے معاملے میں یہ سہ منزلہ عمارت نیچے سے اوپر بالکل سیدھی جاتی ہے' جبکہ عورتوں کے لئے یہ عمارت دائیں اور بائیں سے ترچھی ہوتی جاتی ہے جس کی بنا پر اوپر جاتے ہوئے ہر منزل پر اس کا رقبہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اب ہم اس فرق کو ذرا تفصیل سے سمجھتے ہیں۔

مسلمان مرد و عورت کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز ایمان کی تحصیل ہے۔ سورۃ الاحزاب میں بیان کردہ دس مطلوبہ اوصاف میں سے اولین وصف "اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ" کا مصداق تو ہم آسانی سے بن جاتے ہیں۔ چونکہ ہم مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں لہٰذا "مسلمان" کہلاتے ہیں' لیکن دوسرے وصف "وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ" کے مصداق اُس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک کہ ایمان حاصل نہ کیا جائے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا : یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا

بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ "اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر"۔ گویا ابھی تمہارا ایمان صرف تمہاری زبان کی نوک پر ہے' اس سے بڑھ کر نہیں ہے' جبکہ مطلوب یہ ہے کہ تم حقیقی ایمان لاؤ' یقین قلبی والا ایمان لاؤ۔ اور اس کے لئے محنت کرنی پڑے گی' اس کے لئے جہاد درکار ہے ـــــ اور وہ ہے "قرآن حکیم میں غوطہ زنی"۔ اس لئے کہ ایمان کا منبع و سرچشمہ تو قرآن ہی ہے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

قرآن کی تلاوت' اس میں غور و تدبّر اور علامہ اقبال کے الفاظ میں قرآن حکیم میں غوطہ زنی سے وہ یقین والا ایمان حاصل ہو گا جس کی تحصیل ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کا پہلا فرض ہے۔ اگلی ساری منزلوں کی تعمیر اور ان کے استحکام کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اگر یقین قلبی والا ایمان حاصل ہو جائے تو تقویٰ کی ساری منزلیں اور جہاد کی ساری منزلیں طے ہوتی چلی جائیں گی۔

اس یقین قلبی والے ایمان اور کلمہ شہادت پر جو چار ستون (نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج) استوار ہوتے ہیں' مَردوں کے معاملے میں یہ چاروں سیدھے کھڑے ہیں اور عورتوں کے لئے پہلا اور آخری ستون (نماز اور حج) ذرا ترچھے (slant) ہو جاتے ہیں جن سے چھت کا رقبہ ذرا کم ہو جاتا ہے جبکہ عمارت کی اونچائی وہی رہتی ہے۔ نماز اور حج کے معاملے میں فرق اس اعتبار سے واقع ہوتا ہے کہ نماز اگرچہ مرد و عورت دونوں پر فرض ہے' لیکن مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے بغیر عذر گھر میں ادا نہ کرے بلکہ مسجد میں جا کر باجماعت ادا کرے' جبکہ عورت کے لئے اپنے گھر میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ اسی طرح حج ہر اس مسلمان مرد پر فرض ہو جائے گا جس کے پاس پیسہ بھی ہے اور وہ صحت مند بھی ہے' لیکن عورت پر حج اس وقت تک فرض نہیں ہو گا جب تک ان دو چیزوں کے علاوہ اس کے ساتھ جانے کے لئے محرم بھی موجود نہ ہو۔ درمیانی دو ستون (روزہ اور زکوٰۃ) میں مرد و عورت کے مابین کوئی فرق نہیں۔ اگر عورت کے پاس مال و دولت یا زیور موجود ہے تو اس پر اس کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس کی ادائیگی

میرے شوہر کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح روزے کا معاملہ ہے۔ اگر کسی وقت روزے قضا ہو جائیں تو ان کی تعداد پوری کرنا عورت پر بھی ایسے ہی فرض ہے جیسے مرد پر فرض ہے۔

یاد رہے کہ نماز کے معاملے میں مرد و عورت کے مابین فرق ایک اور اعتبار سے بھی ہے کہ حیض و نفاس کے ایّام میں عورت کو نماز کی چھوٹ مل جاتی ہے اور ان نمازوں کی قضا عورت کے ذمے نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے امام ابو حنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ کا ایک قصّہ بہت مشہور ہے۔ امام ابو حنیفہؒ عمر میں چھوٹے تھے اور وہ امام جعفر صادقؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے علم میں یہ بات آئی کہ جعفر صادقؒ ان سے ناراض ہیں۔ چنانچہ حاضر ہو کر اس کی وجہ دریافت کی۔ امام جعفر صادقؒ نے ان سے کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ہمارے نانا (رسول اللہ ﷺ) کی حدیث کے مقابلے میں اپنے قیاس اور رائے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس الزام کی تردید کی کہ "یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی!" اور اس انداز سے وضاحت کی کہ اگر میں اپنے قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتا تو میں حائضہ عورت کو نمازوں کے بجائے روزوں کے معاملے میں رخصت دیتا اور اس کے لئے نماز کی قضا ضروری قرار دیتا۔ اس لئے کہ دین میں نماز کی اہمیت روزے سے زیادہ ہے۔

چنانچہ اس سہ منزلہ عمارت میں نماز اور حج کے معاملے میں عورتوں کو مَردوں کے مقابلے میں کچھ رخصت حاصل ہے، جبکہ روزہ اور زکوٰۃ کے معاملے میں ان کے مابین ذرہ برابر اور سرِ مُو فرق نہیں ہے۔ نماز کے ضمن میں عورت پر مسجد جانے اور باجماعت نماز ادا کرنے کو جو لازم قرار نہیں دیا گیا وہ دین کے اس فلسفے کے مطابق ہے کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط پسندیدہ نہیں ہے۔ عورت حجاب میں بھی ہو تو اس کا قد و قامت تو بہرحال نظر آتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم!

چنانچہ اسلام اختلاطِ مرد و زن کے اس فتنے کے تمام راستے مسدود کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے

بکہ عورت کے لئے گھر میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں عیدین اور جمعہ کے اجتماعات میں عورتوں کو شرکت کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ اُس دور میں تعلیم اور تلقین کا کوئی اور ذریعہ تھا ہی نہیں' نہ کتابیں اور رسالے تھے اور نہ ہی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود تھے۔ لہٰذا ایسے اجتماعات میں جہاں حضور ﷺ کا خطبہ ہوتا تھا' عورتوں کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ عام نمازوں کے اجتماعات میں بھی انہیں شرکت کی اجازت تھی اور ان کی صفیں سب سے آخر میں ہوتی تھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے اپنے دور میں جب یہ دیکھا کہ اس سے فتنے کا دروازہ زیادہ کھلنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے تو آپؓ نے خواتین کو مسجد میں آنے سے روک دیا۔ اسی طرح چونکہ محرم کے بغیر سفر میں فتنے کے امکانات ہیں لہٰذا ایسی عورت سے حج ساقط ہو جاتا ہے جس کے ہمراہ جانے کے لئے محرم موجود نہ ہو۔ سورۃ الاحزاب میں بیان شدہ دس اوصاف کا تعلق اسی پہلی منزل سے ہے' جو مَردوں اور عورتوں دونوں سے مطلوب ہیں۔

عورت کے لئے "دعوت و تبلیغ" کا دائرہ کار

اس عمارت کی دوسری منزل "دعوت و تبلیغ" یا "شہادت علی الناس" ہے۔ یعنی جو خیر آپ تک پہنچا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ' اسے عام کرو! اگر آپ یہ ذمہ داری ادا نہیں کر رہے تو آپ مجرم ٹھہرے' کہ پھر لوگ کیسے جمع ہوں گے اور یہ نظام کیسے بدلے گا؟ اس کے بغیر وہ طاقت کیسے وجود میں آئے گی جو نظام کو تقویٰ پر استوار کر سکے۔ لیکن عورت کے لئے دعوت و تبلیغ کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ گویا اس دوسری چھت کا رقبہ اس کے لئے مزید کم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ عورت پر حجاب کی پابندی ہے۔ چنانچہ عورت اول تو عورتوں ہی کو دعوت و تبلیغ کا ہدف بنائے۔ اور مَردوں میں سے صرف اپنے محرم مردوں یعنی والد' چچا' ماموں' بھائی اور بیٹوں وغیرہ کو دعوت دے۔ اور کیا معلوم کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سینکڑوں کے مقابلے میں قوی ثابت ہو جائے۔ اگر ایک بہن فاطمہؓ بنتِ خطاب نے اپنے ایک بھائی عمرؓ بن خطاب کو لا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت

میں پیش کر دیا تو کیا یہ ایک مرد دوسرے سینکڑوں پر بھاری نہیں تھا؟ تو دعوت و تبلیغ کے معاملے میں یوں سمجھئے کہ اس دوسری منزل کی چھت عورتوں کے لئے مردوں کے مقابلے میں تین چوتھائی رہ جائے گی۔ پہلی چھت تو 8 / 1 کم ہوئی تھی اور 8 / 7 رقبہ باقی تھا۔ یہاں رقبہ مزید کم ہو گیا۔ اس لئے کہ نامحرم مردوں کو دعوت و تبلیغ کی کوئی ذمہ داری عورتوں پر سرے سے عائد نہیں ہوتی۔ انہیں صرف خواتین میں اور محرم مردوں میں کام کرنا چاہئے۔

خواتین کے لئے اجتماعات کا انعقاد بھی ہونا چاہئے اور انہیں اپنی دعوت پھیلانے کے لئے آڈیو ویڈیو کیسٹس وغیرہ سے بھی کام لینا چاہئے۔ اس دور میں دعوت و تبلیغ کے جو بھی مؤثر ذرائع موجود ہیں ہمیں ان سب کو بروئے کار لانا چاہئے۔ اس ضمن میں یہ اہتمام ضروری ہے کہ جن خواتین پر گھریلو ذمہ داریاں زیادہ ہیں وہ اس کام کے لئے کم وقت نکال لیں اور جو خواتین گھریلو ذمہ داریوں سے کچھ فارغ ہو چکی ہوں وہ زیادہ وقت نکالیں۔ نوجوان لڑکیوں کے گھروں سے نکلنے میں چونکہ زیادہ خطرات ہوتے ہیں اس لئے اس بات کا پورا اہتمام ہونا چاہئے کہ ان کے ساتھ محرم لازماً موجود ہوں۔ لیکن ادھیڑ عمر کی عورتوں پر پابندیاں نرم ہو جاتی ہیں۔ جیسے سورۃ النور میں فرمایا گیا: "فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ " کہ اس میں کوئی حرج نہیں اگر وہ اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس معاملے میں بھی 'منشائے شریعت کے برعکس' سختی کی جاتی ہے' حالانکہ ہمارا طرزِ عمل تو یہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ کرنا ہے اس لئے کرنا ہے کہ شریعت نے اس کا حکم دیا ہے اور جو کچھ چھوڑنا ہے وہ اس لئے چھوڑنا ہے کہ شریعت نے اس سے روکا ہے۔

"اقامتِ دین" کی جدّوجہد میں خواتین کا حصہ

فرائض دینی کی تیسری منزل "اقامتِ دین" ہے۔ یعنی دین کو قائم کرنے کے لئے باطل سے کشاکش اور مقابلہ' جس کے بغیر باطل کی بیخ کنی ممکن ہی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ چھوٹے سے پودے کو بھی جڑ سے اکھاڑنے کے لئے کتنا زور لگانا پڑتا ہے اور اسے کس

طرح ہلا ہلا کر کھینچا جاتا ہے۔ باطل کے ساتھ کشاکش اور تصادم کے بھی دو مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے پر خواتین کی شرکت (جب تک دُوبدُو مقابلے کی نوبت نہ آئے) ہرگز کسی فتنے کے زمرے میں نہیں آتی۔ یہ جہاد کا وہ مرحلہ ہے جس میں خواتین کی شرکت بھی ضروری ہے۔ البتہ جہاں دُوبدُو مقابلے کی نوبت آجائے وہاں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ جنگ و قتال "جہاد" کا وہ مرحلہ ہے جہاں دُوبدُو مقابلہ ہوتا ہے اور اس مرحلے سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خواتین کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ تاہم اس میں خواتین کی شرکت بالواسطہ ہو گی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو اس کے لئے تیار کریں، جیسے حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے اپنے سات بیٹے اللہ کی راہ میں شہید کرائے تھے۔ اپنے شوہروں کو بھی خوش دلی کے ساتھ میدان جنگ میں بھیجیں۔ یہ نہ ہو کہ شوہر قتال کے لئے روانہ ہو رہا ہو اور گھر میں بین ہو رہا ہو، چیخ و پکار ہو رہی ہو، جس سے شوہر کے جذبات بھی افسردہ ہو رہے ہوں۔ پھر وہ اپنے بھائیوں کو بھی اس کی ترغیب و تشویق دلائیں۔ اس طرح جنگ و قتال میں خواتین کا حصہ بالواسطہ (Indirect) ہو گا۔

موجودہ دور میں قتال کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے، جو دو طرفہ جنگ کے بجائے یک طرفہ جنگ کی ہے۔ یہ صورت سول نافرمانی اور دھرنے کی ہے جس میں نہتے مظاہرین کی طرف سے کوئی پُر تشدد کارروائی نہیں ہوتی بلکہ انہیں تشدّد کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اگر اپنے کسی مطالبے کے حق میں دھرنا مار کر بیٹھا جائے کہ ہم اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک (مثلاً) سودی نظام کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا جاتا، تو اس صورت میں کیا ہو گا؟ اگر اس مرحلے پر خواتین بھی ان مظاہروں میں شریک ہوتی ہیں تو انہیں بھی پولیس کی لاٹھیوں اور گولیوں کا نشانہ بننا پڑے گا، نامحرم مردان کی بے حرمتی کریں گے اور انہیں اٹھا اٹھا کر ٹرکوں میں پھینکیں گے۔ یا پھر ۱۹۷۷ء کی تحریک کی طرح آبرو باختہ عورتوں کی "نتھ فورس" بلائی جائے گی، تاکہ ظاہر یہی ہو کہ عورتوں سے کھینچا تانی عورتیں ہی کر رہی ہیں۔ تو جان لیجئے کہ قتال خواہ دو طرفہ ہو خواہ یک طرفہ ہو، یہ خواتین کی ذمہ داری نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بری قرار دیا ہے ـــــ اِلّا یہ کہ کبھی کوئی ایسی صورت درپیش ہو کہ دار الاسلام پر حملہ ہو جائے اور بھیڑیئے مسلمانوں کے گھروں پر

ٹوٹ پڑیں۔ ایسے وقت کے لئے خواتین کو تیار رہنا چاہئے کہ اس وقت ان کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی نہ ہو جائے کہ درندے انہیں بلامزاحمت اٹھا کر لے جائیں' بلکہ وہ ان سے دُوبدُو مقابلہ کریں اور انہیں ماریں اور خود جامِ شہادت نوش کریں۔ لیکن خود گھر سے نکل کر قتال عورت کے لئے جائز نہیں' خواہ وہ یک طرفہ ہو یا دو طرفہ۔ اس میں ان کی شرکت' جیسا کہ عرض کیا جا چکا' بالواسطہ ہو گی کہ وہ شوہروں' بیٹوں' بھائیوں اور محرم مَردوں کو اس کام کے لئے تیار کریں۔ جن خواتین کے شوہر اقامتِ دین کی جدّوجہد میں مصروف ہوں وہ ان پر سے اپنی ذمہ داریاں کم کریں۔ انہیں اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے زیادہ سے زیادہ سبکدوش رکھیں اور اپنی فرمائشیں اور ڈیمانڈز حتی الامکان کم کریں تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ دین کے اس کام میں لگے رہیں۔ ان سے ایسے شکوے شکایات نہ کریں کہ آپ ہمیں تو وقت دیتے ہی نہیں' آپ کا وقت یا تو دفتر میں گزرتا ہے یا تنظیمی سرگرمیوں میں! ـــــ بلکہ وہ خوش دلی کے ساتھ اپنے حقوق کو اس لئے چھوڑ دیں کہ ہمیں اس کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا۔ اس طرح اس جدّوجہد میں بالواسطہ وہ بھی شریک ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کی مستحق ہوں گی۔

ہمارے حلقے کی وہ خواتین جن کے شوہر تنظیم میں نہیں آئے' انہیں سب سے زیادہ زور اپنے شوہروں کو اس راستے پر لانے کے لئے دینا چاہئے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کا فکر صحیح کیا جائے۔ اگر آپ نے ان کے فکر کو سمجھا ہی نہیں کہ اس میں کہاں کجی ہے' ان کا فرائضِ دینی کا تصور ہی درست نہ ہو اور وہ آپ کے بارے میں یہ سمجھتے ہوں کہ میری بیوی کو تو خواہ مخواہ نیکی کا ہیضہ ہو گیا ہے اور اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے' تو جب تک ان کے اور آپ کے مابین فکری ہم آہنگی نہیں ہوتی آپ کی دعوت و تبلیغ نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔ اور اس مقصد کی خاطر محنت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود آپ کا فکر اور آپ کی سوچ پختہ ہو اور آپ قرآن و حدیث کے حوالوں اور عقلی دلائل سے اپنا فکر پیش کر سکیں اور انہیں قائل کر سکیں کہ ہمارا دین واقعتاً دین ہے' صرف مذہب نہیں ہے' اور دین اپنا غلبہ چاہتا ہے ـــــ اور یہ کہ غلبہ خود بخود حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے اہل ایمان کو جہاد اور قتال کرنا ہوتا ہے۔ پھر آپ

انہیں یہ بتائیں کہ جہاد خواتین کے لئے بھی ضروری ہے اور مَردوں کے لئے بھی' البتہ قتال خواتین کی ذمہ داری نہیں' یہ آپ مَردوں کا فرض ہے۔ اگر آپ کا اپنا فکر آپ کے ذہنوں میں اس کے صغریٰ کبریٰ اور دلائل کے ساتھ پوری طرح راسخ ہو تو پھر آپ اپنے مَردوں کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کر سکیں گی۔ اگر آپ کے شوہر اس کے لئے تیار نہیں ہو رہے تو بھائی تیار ہو جائیں گے' اور اگر بالفرض بھائی بھی اس راستے پر نہیں آ رہے تو اس فکر کو اپنی اولاد کے ذہنوں میں تو ٹھونک ٹھونک کر اتار دیا جائے۔

البتہ میرے نزدیک آج کے زمانے میں خواتین کے حوالے سے جس طرح کا فتنہ مغرب اٹھا رہا ہے اس میں ہماری خواتین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ اس حوالے سے مغرب نے 'ایشیا' بلکہ عالمِ اسلام کو اپنا خصوصی ٹارگٹ بنایا ہے۔ ہندوستان میں تو شرم و حیا نام کی کوئی شے پہلے موجود تھی نہ آج موجود ہے۔ اسی طرح مشرق بعید کے ممالک فلپائن وغیرہ بھی اس معاملے میں بہت آگے ہیں۔ اگر کہیں شرم و حیا کسی درجے میں باقی ہے تو وہ صرف عالمِ اسلام ہے' اور مغرب کا اٹھایا ہوا یہ سارا فتنہ اسی کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ اب اس کے مقابلے کے لئے ہمیں اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے کہ باپردہ' برقع پوش خواتین باہر نکل کر دنیا کے سامنے یہ نقشہ پیش کریں کہ یہاں خواتین صرف بے پردہ ہی نہیں رہتیں' باپردہ بھی رہتی ہیں۔ لیکن اس میں انداز چیلنج کا نہیں بلکہ خاموش مظاہروں کا ہو گا۔ جیسے ہم اب تک خاموش مظاہرے کرتے آئے ہیں کہ بینرز اور ٹی بورڈز لے کر اخبارات وغیرہ کے دفاتر کے باہر کھڑے ہو گئے کہ اخبارات میں بے حیائی اور فحاشی پر مبنی تصاویر مت شائع کرو! اسی طرح اگر برقعوں میں ملبوس خواتین بینرز لے کر کھڑی ہوں اور ان کے محرم مردان کی حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ موجود ہوں تو میرے نزدیک یہ وقت کی ایک ضرورت ہے' جو پوری ہونی چاہئے۔ لیکن جب یہی معاملات اس سطح پر آ جائیں گے کہ "اب ہم اس اخبار کو شائع نہیں ہونے دیں گے" یا یہ کہ "ہم اس بینک کو نہیں چلنے دیں گے" تو اس دھرنے' گھیراؤ یا picketing میں خواتین شریک نہیں ہوں گی' کیونکہ اب اس میں دُوبدُو مقابلے اور ہاتھاپائی کی نوبت آ سکتی ہے۔

ہمارے بعض ساتھیوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو اس سے کمتر درجے کے مظاہروں کے لئے بھی گھروں سے باہر نہیں آنا چاہئے' لیکن میرے نزدیک احتیاط کے پہلو کو اس قدر زیادہ ملحوظ رکھنا شریعت کے دائرے سے بھی تجاوز کرتا ہے۔ اسلام نے عورت کو ضرورت کے پیش نظر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ اس اجازت کو ہم دنیا کے لئے تو استعمال کرتے ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ دین کے لئے استعمال کرنے کو تیار نہیں؟ ہماری بعض خواتین برقعے میں گاڑیاں چلاتی ہیں' بعض خواتین سودا سلف خود خریدتی ہیں' تو کیا آپ اسے حرام کہیں گے؟ انفرادی کاموں کے لئے تو ہم خواتین پر عائد پابندیوں سے استثناء حاصل کر لیتے ہیں لیکن دین کے کام میں آ کر ہم اضافی پابندیاں عائد کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک عورتیں اگر پردے کی پابندی کرتے ہوئے احتیاط کے ساتھ خاموش مظاہروں میں شریک ہوں' جبکہ ان کے محرم بھی ان کے ہمراہ ہوں' تو نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں' بلکہ ان کا یہ اقدام قابل ستائش ہو گا۔ تو یہ ہے فرائض دینی کے اعتبار سے خواتین کا معاملہ ـــــ یعنی جب انفرادی تقویٰ سے شروع ہو کر نظام کو بدلنے کے لئے آخری اجتماعی تقویٰ تک بات پہنچے گی' تو درجہ بدرجہ مَردوں اور خواتین کے فرائض اور ذمہ داریوں میں کیا فرق ہو گا!

خواتین کے لئے اجتماعیت سے وابستگی کی ضرورت و اہمیت

اس ضمن میں ایک آخری بات کا اضافہ کر لیجئے کہ انفرادی تقویٰ سے اجتماعی تقویٰ تک کا یہ درجہ بدرجہ سفر کسی اجتماعیت کے بغیر' انفرادی طور پر طے نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کے لئے ایک منظم جماعت درکار ہے ـــــ اور جماعت کی مسنون' ماثور اور منصوص بنیاد صرف بیعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بھی بیعت لی' حالانکہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ جب مَردوں سے بیعت ہو گئی تو عورتیں خود بخود اس میں شامل ہو گئیں' اس لئے کہ وہ مَردوں کے تابع ہیں' کیونکہ وہ تو گویا اپنے شوہروں سے بیعت ہیں۔ بیوی کو اپنے شوہر کا حکم اسی طرح ماننا ہوتا ہے جس طرح مامور کو امیر کا۔ وہ شریعت کے حکم کے خلاف اپنے شوہر کا کوئی حکم نہیں مانے گی' لیکن شریعت کے دائرے کے اندر اندر

اسے ہر حکم ماننا ہوتا ہے۔ لیکن اگر عورتوں کو مردوں کے تابع جانتے ہوئے مردوں کی بیعت ہی میں شامل سمجھ لیا جاتا تو ان میں یہ احساس کیسے پیدا ہوتا کہ وہ بھی کسی اجتماعیت کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے ذمے اس اجتماعیت کے کچھ حقوق ہیں۔

بیعت "بیع" سے ہے اور بیع بیچنے کو کہتے ہیں۔ اللہ کے ہاتھ پر اپنی جان اور مال کو بیچ دینا ہر مسلمان مرد و عورت سے مطلوب ہے۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾

"یقیناً اللہ نے خرید لئے ہیں اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔"

چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزلیں بھی مرد و عورت دونوں کے لئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں تین چار آیتوں پر مشتمل ایک نہایت عمدہ دعا وارد ہوئی ہے۔ اس کے بعد پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَا اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ﴾

"پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم ایک دوسرے میں سے ہی ہو۔"

(یہاں ایک بار پھر سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۵ ذہن میں تازہ کر لیجئے' جس میں مردوں اور عورتوں کے لئے مطلوب اوصاف "اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ" سے لے کر "وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ" تک گنوائے گئے ہیں۔)

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِيْلِیْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾ (آیت ۱۹۵)

"پس جن لوگوں (مَردوں اور عورتوں) نے میری خاطر ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور وہ میری راہ میں ستائے گئے اور انہوں نے جنگ کی اور مارے گئے' ان سب کے قصور میں معاف کردوں گا اور انہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں نہریں رواں ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں۔ اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے"۔

نوٹ کیجئے کہ سورۂ آل عمران کی اس آیت میں بیان کردہ اوصاف بھی مَردوں اور عورتوں کے لئے مشترک ہیں' سوائے لفظ "قتال" کے۔ اس لئے کہ سورۂ آل عمران غزوۂ احد کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس میں اس غزوے کا تذکرہ ہے۔ غزوۂ احد میں خواتین بھی میدانِ جنگ میں پہنچی تھیں اگرچہ بالکل آخری وقت میں جب کہ اہل ایمان کی شکست اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر مدینہ میں پہنچی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب نازل ہوگئیں اور پردے کے احکام آگئے تو عورتیں قتال سے مستثنیٰ قرار پاگئیں۔ چنانچہ غزوۂ خیبر کے لئے کچھ خواتین نے نکلنا بھی چاہا تو حضورؐ نے منع فرمادیا اور وہ واپس چلی گئیں۔ باقی تمام معاملات میں مرد و عورت سب برابر ہیں۔

مَردوں اور عورتوں کی بیعت کا فرق

البتہ جہاں تک ایک نظم سے وابستہ رہنے کے لئے بیعت کا تعلق ہے' مَردوں کی بیعت اور خواتین کی بیعت کا الگ الگ نظام ہے۔ ہم نے بھی تنظیم اسلامی میں مَردوں اور عورتوں کے لئے بیعت کے الفاظ مختلف رکھے ہیں۔ اس میں جہاں تک اللہ کے ساتھ معاہدہ ہے' اس میں مَردوں اور عورتوں کو برابر شریک کیا ہے' اور عورتوں کے لئے بھی وہی الفاظ رکھے ہیں جو مردوں کے لئے ہیں :

((اِنّی اُعَاھِدُ اللّٰہَ عَلٰی اَنْ اَھْجُرَ کُلَّ مَا یَکْرَھُہٗ' وَاُجَاھِدَ فِی سَبِیلِہٖ جُھْدَ اِسْتِطَاعَتِی' وَاُنْفِقَ مَالِی وَاَبْذُلَ نَفْسِی لِاِقَامَۃِ دِینِہٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِہٖ))

"میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتی ہوں کہ :

ان تمام چیزوں کو ترک کردوں گی جو اسے ناپسند ہیں' اور اس کی راہ میں مقدور بھر

جہاد کروں گی، اور اس کے دین کی اقامت اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لئے اپنا مال بھی صرف کروں گی اور جان بھی کھپاؤں گی"۔

اس کے بعد جو "بیعت النساء" کے الفاظ ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن حکیم میں سورۃ الممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں، جبکہ مَردوں کے لئے بیعت کے الفاظ وہ ہیں جو حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی حدیث کے مطابق بیعت عقبہ ثانیہ کے الفاظ ہیں۔

اس ضمن میں "مسلمان خواتین کے دینی فرائض" نامی کتابچے کے نئے ایڈیشن (طبع جون ۹۷ء) میں کچھ لفظی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور کچھ وضاحتی الفاظ شامل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کی تمام رفیقات کو اس کتابچے کا از سرنو مطالعہ کر لینا چاہئے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

امتِ مُسلمہ کی عمر(۳)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبہ دعوت وثقافت' دعوت اسلامی کالج' جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الاسلام وقرب ظہور المھدی" کا

تیسرا باب

مترجم : پروفیسر خورشید عالم' قرآن کالج لاہور

فصل اول

مَہدی :

قیامت کی علاماتِ صغریٰ اور کبریٰ کی درمیانی کڑی

مہدی کے بارے میں اس کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں کہ معنوی اعتبار سے وہ حد تواتر تک پہنچ گئی ہیں [1]۔ شیخ محمد برزنجی (متوفی ۱۱۰۳ھ) اپنی کتاب "الاشاعة لأشراط الساعة" کے تیسرے باب میں کہتے ہیں کہ وہ بڑی بڑی علامتیں جن کے فوراً بعد قیامت آجائے گی کثرت سے ہیں' ان میں سب سے پہلی نشانی ظہورِ مہدی ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث کی مختلف روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مہدی کا وجود' آخر زمانہ میں ان کا ظہور' سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کی وجہ سے آل رسول ﷺ سے ان کی نسبت اس قدر تواتر سے حدیثوں میں ملتی ہے کہ

اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں {۲}۔

محمد السفارینی (المتوفی ۱۱۸۸ھ) اپنی کتاب "لوامع الانوار البہیۃ" میں کہتے ہیں کہ ظہور مہدی کے بارے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ معنوی طور پر تواتر تک پہنچ گئی ہیں۔ اہل سنت کے علماء میں ان کا چرچا ہے حتیٰ کہ اس کا شمار ان کے عقائد میں ہوتا ہے{۳}۔

امام شوکانی (المتوفی ۱۲۵۰ھ) اپنی کتاب "نیل الاوطار" میں لکھتے ہیں کہ مہدی کے سلسلہ میں وارد ہونے والی قابل اعتماد احادیث کی تعداد پچاس ہے۔ ان میں صحیح بھی ہیں' حسن بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ یہ سب احادیث بلاشک وشبہ متواتر ہیں{۴}۔

نواب صدیق حسن قنوجی (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے کہا ہے کہ مہدی کے بارے میں مختلف طریقوں سے اس کثرت سے احادیث آئی ہیں کہ وہ حد تواتر تک پہنچ جاتی ہیں{۵}۔

مہدی کی شان میں وارد ہونے والی احادیث متواتر ہیں اور ماضی وحال کے سب علماء کا سوائے ابن خلدون کے اس بات پر اجماع ہے کہ عقیدۃً اور تصدیقاً اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ امتِ محمدیہ میں اہل بیت کا ایک آدمی تیار کرے گا جو فتنوں اور آخری خونریز معرکوں میں مسلمانوں کی قیادت کرے گا۔ وہی مہدی ہوں گے۔ علماء اسلام نے مہدی کے سلسلہ میں مروی احادیث کی طرف خاص توجہ دے کر ان کی تشریح اور توضیح کا حق ادا کیا ہے اور صرف اسی موضوع پر تیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں{۶}۔ مہدی کا مسئلہ ہماری کتاب کے موضوع کا ایک بنیادی مسئلہ ہے کیونکہ ہر مجدون کے معرکہ کے فوراً بعد ان کا ظہور ہوگا۔ اس پہلو پر ان لوگوں کی نظر نہیں پڑی جنہوں نے اس معرکہ پر گفتگو کی ہے۔ اس لئے ہم اس موضوع پر اس انداز سے بحث کریں گے کہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد پورا ہو جائے۔ یعنی مہدی کا موجودہ حالات کے ساتھ تعلق کیا ہے اور وہ کس طرح قیامت کی چھوٹی بڑی نشانیوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم ان تمام احادیث کو بیان نہیں کریں گے جو مہدی کی شان میں وارد ہیں بلکہ صرف انہی حدیثوں پر اکتفا کریں گے جو مہدی کے اوصاف' ان کے ظہور کی علامات اور ان کے

زمانے میں ہونے والے فتنوں اور جنگوں پر روشنی ڈالتی ہیں اور ان لمبی چوڑی تفاصیل سے صرف نظر کریں گے جو خاص اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں موجود ہیں۔ جو تفاصیل جاننا چاہے وہ ان کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔

دوسری فصل

مہدی کون ہے؟

وہ مہدی جن کا انتظار ہو رہا ہے وہ حسن بن فاطمہ بنتِ رسول اللہ ﷺ کی اولاد سے اہل بیت کا ایک مسلمان نوجوان ہو گا جس کا نام محمد بن عبداللہ ہو گا۔ اس کا نام نبی ﷺ کے نام جیسا اور اس کے والد کا نام آپ کے والد کے نام جیسا ہو گا۔ وہ ایک خلیفۂ راشد اور امامِ مہدی (ہدایت یافتہ) ہو گا۔ اس کا اس امام منتظر سے کوئی تعلق نہیں جس کا انتظار رافضی (شیعہ) کر رہے ہیں اور یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ سامراء کے تہہ خانے سے ظاہر ہوں گے۔ اس کی کوئی حقیقت ہے نہ ہی کوئی دلیل۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مہدی منتظر محمد بن الحسن عسکری ہیں جو پانچ برس کی عمر میں تہہ خانہ میں داخل ہوئے تھے۔ وہ تہہ خانہ سے ان کے خروج کے منتظر ہیں مگر وہ وہاں سے کبھی بھی نہیں نکلیں گے۔ {۷}

مہدی کے اوصاف

محمد بن عبداللہ مہدی کی تعریف نبی ﷺ نے یوں کی ہے: "اس کی ناک درمیان سے بلند ہو گی {۸}، پیشانی کھلی ہو گی، وہ ظلم و جور سے بھرے ہوئے خطہ ارضی کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ سات، آٹھ یا نو برس تک حکومت کرے گا۔ اس کے دورِ حکومت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد لوگ اس طرح ناز و نعمت سے زندگی بسر کریں گے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ رات بھر میں مہدی کو تیار کر کے اس کی اصلاح کرے گا اور اس کی پشت پناہی کرے گا"۔

"اللہ اس کی اصلاح کرے گا" اس تعبیر کے کیا معنی ہیں؟ ــــــ اس کے دو معنی ہو

سکتے ہیں :

۱۔ اس میں کچھ چھوٹے نقص (صغیرہ گناہ) ہوں گے۔ اللہ اس کی توبہ قبول کر کے اس کو توفیق بخشے گا اور رشد و ہدایت اس کے دل میں ڈال دے گا۔ یعنی پہلے سے اس کی یہ کیفیت نہ ہو گی۔ {۹}

۲۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ اسے خلافت اور آخری زمانے کے فتنوں اور جنگوں کے درمیان مسلمانوں کی قیادت کے لئے تیار کرے گا۔

دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں مگر دل دوسرے معنی کو قبول کرتا ہے۔ عرب یہ جملہ "اَصلحہ اللّٰہ" تعریف اور دعا کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ جو کوئی امیر کے ساتھ بات شروع کرتا ہے تو کہتا ہے "اَصلح اللّٰہ الامیر" (اللہ امیر کا بھلا کرے) یعنی اللہ اس کو توفیق بخشے' سیدھے راستہ پر لگائے اور اس کی حالت کو درست کرے۔

ہم بعض ایسی احادیث بیان کریں گے جن میں مجملاً مہدی کی صفات کا ذکر ہے۔ روایت کا متن اتنا ہی بیان کریں گے جس سے مقصد پورا ہو جائے اور سند روایت کی تحقیق بھی اتنی جس سے ہماری غرض و غایت پوری ہو۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے: "مہدی مجھ میں سے ہو گا (یعنی میری اولاد سے ہو گا) اس کی ناک درمیان سے بلند ہو گی' پیشانی کشادہ ہو گی۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی۔ وہ سات برس تک حکمرانی کرے گا"۔ {۱۰}

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "زمین ظلم و جور سے بھر جائے گی۔ اللہ میری اولاد سے ایک آدمی بھیجے گا جس کا نام وہی ہو گا جو میرا ہے۔ اس کے باپ کا نام وہی ہو گا جو میرے باپ کا ہے۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بالکل اسی طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی۔ نہ آسمان اپنی بوندیں ذرہ برابر بھی روکے گا اور نہ زمین اپنی نباتات ذرہ برابر روکے گی۔ وہ تمہارے درمیان سات یا آٹھ برس یا زیادہ سے زیادہ نو برس تک ٹھہرے گا"۔ {۱۱}

۳۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "مہدی ہمارے اہل بیت میں سے ہو گا۔ اللہ

ایک رات میں اس کی اصلاح کردے گا"۔ {۱۲} (یصلحہ اللہ کی ترکیب کے معنی اوپر گزر چکے ہیں)۔

۴۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "مہدی میری اولاد یعنی اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہوگا"۔ {۱۳}

۵۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "میری امت کے آخری وقت میں ایک خلیفہ ہوگا جو مال بکھیرتا پھرے گا مگر اس کو گنے گا نہیں"۔ {۱۴}

مہدی کی آمد اور ان کے ظہور کی علامات کے بارے میں احادیث نقل کرنے سے پہلے ہم دو باتوں کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں :

۱۔ ظہور مہدی کسبی بات نہیں ہے جو مہدی محمد بن عبداللہ کی کاوشوں اور مطالبوں کا نتیجہ ہو۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ مہدی کو تو اس کا علم ہی نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک رات میں اس کی نوک پلک سوار کر ایک ایسی قوم کو اس کے لئے تیار کرے گا جو کسی قطار و شمار میں نہ ہوگی۔ نہ اس قوم کے پاس طاقت ہوگی۔ وہ کعبہ کے نزدیک اس کی بیعت کریں گے اور وہ خود اس بیعت کو پسند نہیں کرے گا۔

۲۔ آخری زمانہ میں مہدی کی آمد تقدیر کا فیصلہ ہے۔ اللہ نے اسے مقرر کیا ہے اور لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ یہ بات تو ہو کر رہے گی بالکل اسی طرح جس طرح مسیح دجال کا ظہور، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، یاجوج ماجوج کا خروج اور قیامت کی باقی نشانیاں ہو کر رہیں گی۔

اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ مہدی پر ایمان شرعاً واجب ہے۔ یہ مومن کے عقیدہ کا لازمی جزو ہے، کیونکہ اس بارے میں مروی احادیث متواتر ہیں، جیسا کہ پہلے باب میں ہم نے اس بات کی وضاحت کردی ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک متواتر احادیث علم قطعی کا ذریعہ ہیں۔ ان کا علم واجب اور ان پر عمل فرض ہے۔ حدیث متواتر کو جھٹلانے والا اور اس کا منکر دائرہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔

تیسری فصل

ظہورِ مہدی کا وقت

یہ فصل اس کتاب کی اہم ترین فصل ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ یہ اس پیغام کا مرکزی نقطہ ہے جسے میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ میری یہ خواہش ہے کہ سب مسلمان بلکہ اہل کتاب بھی اس پیغام کو خود بھی سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھائیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہو کر رہے گی اور یہ تقدیر کے ان حقائق کا یقینی بیان ہے جو مستقبل قریب میں وقوع پذیر ہوں گے اور ان کے ذریعے اللہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرے گا۔

ہم مہدی کی آمد کے انتظار میں یہ دن گزار رہے ہیں اور اس کے ظہور کے منتظر ہیں، جو ہر مجدون کی مشہور و معروف اور جلد ہونے والی حتمی جنگ کے بعد ہو گا۔ پہلے ہم ان حدیثوں کو بیان کریں گے جو مہدی کی آمد کے زمانہ پر دلالت کرتی ہیں پھر ان کا باہمی ربط بتائیں گے جس سے تصویر واضح ہو جائے گی۔

پہلی حدیث : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اہل روم عنقریب امن کی غرض سے تمہارے ساتھ صلح کریں گے، پھر تم مل کر کسی دشمن پر حملہ کرو گے۔ تمہیں کامیابی ہو گی، مالِ غنیمت ملے گا، پھر تم صحیح سلامت لوٹ جاؤ گے۔ پھر تمہارا پڑاؤ اونچے اونچے ٹیلوں والی چراگاہ میں ہو گا۔ اہل صلیب میں سے ایک آدمی صلیب اٹھا کر کہے گا "صلیب غالب آ گئی"۔ ایک مسلمان غصہ میں آ کر کھڑا ہو گا اور اسے دھکا دے گا۔ اس وقت اہل روم صلح توڑ دیں گے اور ایک خونریز معرکہ کے لئے اکٹھے ہو جائیں گے۔ وہ آٹھ جھنڈے لے کر آئیں گے اور ہر جھنڈے کے نیچے ۱۲ ہزار فوج ہو گی۔"{۱۵}

دوسری حدیث : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک رومیوں کی فوج اعماق یا دابق کے مقام پر پڑاؤ نہ ڈال لے۔ ان سے مقابلہ کے لئے روئے زمین کے بہترین افراد پر مشتمل ایک لشکر مدینہ سے روانہ ہو گا۔ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے صف بندی کریں گے تو روم والے کہیں گے کہ ہمیں ان لوگوں سے

لڑنے دو جنہوں نے ہمارے آدمیوں کو قیدی بنالیا ہے۔ مسلمان جواب دیں گے: نہیں اللہ کی قسم! ہم تمہیں اپنے بھائیوں سے نہیں لڑنے دیں گے۔ جب وہ (یعنی مہدی اور اس کے ساتھی) شام میں آئیں گے تو دجال کا خروج ہو گا۔ ابھی وہ صفیں درست کر کے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے کہ نماز کھڑی ہو جائے گی۔ اس وقت حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا"۔ {۱۶}

تیسری حدیث : اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: "ایک خلیفہ کی موت کے وقت قوم اختلاف کا شکار ہو جائے گی۔ ایک آدمی بھاگ کر مدینہ سے مکہ چلا جائے گا۔ اس کے پاس مکہ کے کچھ لوگ آئیں گے، اسے زبردستی باہر نکال کر رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے"۔ {۱۷}

چوتھی حدیث : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بڑے خونریز معرکہ میں مسلمانوں کا کیمپ غوطہ نامی جگہ پر ہو گا۔ وہاں دمشق نامی ایک شہر ہو گا جو ان دنوں مسلمانوں کے لئے بہترین منزل ثابت ہو گا"۔ {۱۸}

ان احادیث میں غور و فکر کرنے سے ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ :

۱۔ یہ ایک عالمی اتحادی جنگ ہو گی جس میں ہم اور اہل روم (امریکہ اور یورپ) حلیف ہوں گے اور مشترکہ دشمن کے خلاف لڑیں گے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ دشمن کمیونسٹ ہوں یا کوئی اور ہوں..... کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

اس اتحادی عالمی جنگ کی تمہیدات کا آغاز ہو چکا ہے۔ آج ہمارے اور اہل روم کے درمیان پرامن صلح ہے۔ کمیونسٹ کیمپ (یعنی چین، روس اور ان کے ماننے والے) آپس میں معاہدے اور عہد و پیمان کر رہا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مدد کا عہد کر لیا ہے، بلکہ اپریل ۱۹۹۶ء میں روس کے وزیر اعظم نے چین کا دورہ کیا۔ صورت حال میں یہ ایک ایسی مبہم تبدیلی ہے جس کی پہلے سے کوئی مثال نہیں ملتی۔ پوری دنیا اور مشرق وسطیٰ کے درمیان معاہدوں کی تیز دوڑ لگی ہوئی ہے۔ آخری چند مہینوں کے درمیان ایسے ایسے عہد و پیمان باندھے گئے ہیں جو کئی صدیوں سے وجود میں نہیں آئے۔ اس آخری مرحلے

میں یہودیوں کا اپنی قیادت کے لئے نتن یاہو جیسے انتہاپسند کا انتخاب اور اس کے نتیجہ میں مسلمان عربوں کی غفلت کی نیند سے بیداری اور شیرازہ بندی کی کاوش' فیصلہ کن جنگ اور قریبی خاتمہ کی طرف بہت سے اشاروں میں سے ایک اشارہ ہے۔ ٹکراؤ کی آواز بلند ہو چکی ہے اور کشیدگی میں مسلسل تیزی آرہی ہے۔

ہم یہ عبارت سنتے رہتے ہیں "چین اور امریکہ کے ٹکراؤ کا خطرہ"۔[۱۹] ہم یہ عبارت سنتے رہتے ہیں کہ "روس اور امریکہ کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ امریکہ کو ایک بہت بڑے خفیہ کمپلکس کا پتہ چل گیا ہے جس کی تعمیر روس کر رہا ہے اور جو ایٹمی قیادت کا مرکز ہو گا"۔[۲۰] ہم یہ بھی سنتے رہتے ہیں کہ ترکی اور اسرائیل نے اتحاد کر لیا ہے جس سے عرب مسلمان خطرہ محسوس کر رہے ہیں اور ترکی کے ساتھ معاملات میں بڑی احتیاط برت رہے ہیں۔ ہم یہ بھی سنتے رہتے ہیں کہ امریکہ اور جاپان کا اتحاد ہو گیا ہے۔ یہ اتحاد ان معاہدوں کے علاوہ ہے جو یہاں وہاں ہو رہے ہیں۔ (موجودہ عالمی نقشہ) خواہ کچھ بھی ہو' ہر کوئی حالت منتظرہ میں ہے' آس لگائے بیٹھا ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کس کی انگلیاں آگے بڑھ کر تباہ کن جنگ کے سوئچ کو دبائیں گی۔ غالباً وہ کامیاب و کامران مسلمانوں اور رومیوں کا ہلاک ہو گا۔

۲ ۔ یہ جنگ ٹھیک کس وقت ہو گی؟ اس کا جواب اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ زیادہ تر اہل کتاب کی رائے یہی ہے کہ یہ جنگ تین سال کے اندر اندر (یعنی ۲۰۰۰ء سے پہلے) ہو گی۔ کیونکہ وہ ایک نجات دہندہ اور مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں جو آسمان سے اتر کر ان کو نجات دلائے گا۔ یہودی بھی اس نجات دہندہ یا الہامی بادشاہ کے منتظر ہیں جس کو وہ مسیحا (Messiah) کا نام دیتے ہیں جو عالمی سطح پر ان کی قیادت کرے گا۔ انہوں نے اس کے وقت کا بھی تعین کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپریل ۱۹۹۸ء یعنی اسرائیل کے قیام کے پچاس برس بعد اس کا ظہور ہو گا۔[۲۱]

عین اس وقت مسیح دجال[۲۲] اپنے پیروکاروں کے ساتھ نئے ہیکل (ہیکل سلیمانی) میں رونما ہو گا اور بڑے پادری کے ساتھ جلنے والی قربانی دے گا۔[۲۳] اس کے پیروکار قربانی کے گرد اکٹھے ہو کر اللہ سے دعا مانگیں گے کہ وہ آسمان سے آگ بھیج کر اس کو جلا

دے۔ یہی قربانی کی قبولیت کی نشانی ہو گی۔ وہاں وہ سات دن ٹھہرے گا مگر کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دے گا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام' یہودیت اور عیسائیت تینوں شریعتوں کی عیدیں جن کا تعلق قربانی سے ہے وہ اپریل ۱۹۹۸ء کے پہلے پندرھواڑے میں ہوں گی۔ مسلمانوں کی عیدالاضحیٰ ۵ سے ۸/ اپریل کے درمیان اور عید فصیح (Easter) ۱۰ سے ۱۷/ اپریل کے درمیان ہو گی۔ یہی وقت یعنی اپریل ۱۹۹۸ء یہودیوں کے نزدیک ان کے مسیحا اور نجات دہندہ کے ظہور کا ہے' جو ان کے خیال کے مطابق ان کو فاسد اقوام سے اور قرآنی تعبیر کے مطابق امیوں (ان پڑھ) سے نجات دلائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "یہ اس سبب سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر (غیر اہل کتاب) امیوں کے بارے میں کسی طرح کا الزام نہیں۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ (دل میں) وہ بھی جانتے ہیں" (آل عمران : ۷۵)

رہے نصاریٰ تو وہ آنے والی تباہ کن ہرمجدون کی جنگ کے آغاز میں آسمان سے عیسیٰؑ کے نزول کے منتظر ہیں۔ ان کے خیال میں ایسا ۲۰۰۱ء کے موسم خزاں ہو گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب عیسیٰؑ نازل ہوں گے وہ اپنے ماننے والوں کو بادلوں سے اوپر اٹھالیں گے' تاکہ وہ اس جنگ کی ہولناکیوں کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ چنانچہ وہ اپنے ماننے والے نیکوکار لوگوں کی پشت پناہی کے لئے نازل ہوں گے۔ {۲۴}

مسلمان کیا کہتے ہیں؟

ہم یہ کہتے ہیں کہ جنگ قریب ہے اور مقابلہ ہونے والا ہے۔ یہ جنگ انتظار کرنے والوں کے تصور اور آس لگانے والوں کی آس سے بھی جلد ہو گی۔ لیکن ہمارے رسول ﷺ نے وقت کا تعین نہیں کیا۔ اس لئے ہم قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔ مگر اجمالا اس کی عام علامتوں کا ذکر اللہ کے رسول ﷺ نے کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سب علامتیں پوری ہو چکی ہوں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور تیار رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے جنگ اس وقت ہو جس کا اہل کتاب ذکر کرتے ہیں یا تھوڑا آگے پیچھے ہو۔ بہرکیف معاملہ تھوڑے

عرصہ سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس عالمی اتحادی اور تباہ کن جنگ کے بعد اہل روم عہد شکنی کریں گے

یہ اس وقت ہو گا جب ہم اس جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد مال غنیمت لے کر صحیح سالم واپس لوٹیں گے۔ اہل روم میں ایک آدمی کھڑا ہو کر صلیب بلند کر کے یہ کہے گا کہ "صلیب غالب آ گئی"۔ دین کی غیرت کھا کر ایک مسلمان اٹھے گا اور اسے دھکا دے گا یا اسے قتل کر دے گا۔ رومی عہد شکنی کی نیت سے اپنے ملک کو لوٹ جائیں گے۔ اہل روم نو (۹) مہینے میں خفیہ طور پر ہمارے خلاف لشکر جمع کریں گے' جیسا کہ احمد نے مسند میں ایک روایت بیان کی ہے: "وہ تمہارے لئے نو ماہ یعنی اتنی مدت میں جتنی مدت عورت کے حمل کو درکار ہوتی ہے' لشکر جمع کر لیں گے"[۱۵]۔ اسی دوران مہدی کا ظہور ہو گا کیونکہ وہ بڑی جنگ (الملحمة الکبرٰی) میں مسلمانوں کی قیادت کرے گا۔ اس کا کیمپ دمشق سے قریب غوطہ نامی مقام پر ہو گا جہاں رومی اکٹھے ہو کر سیریا کی طرف مارچ کریں گے' وہ بھی دمشق سے قریب اعماق یا دابق نامی جگہ پر پڑاؤ ڈالیں گے۔ وہ ایک لشکر جرار ہو گا جس میں اسی (۸۰) ڈویژن فوج پے بہ پے چل رہی ہو گی۔ ہر ڈویژن میں ۱۲ ہزار سپاہی ہوں گے۔

ظہورِ مہدی کا وہی وقت ہو گا جس میں اہل روم عہد شکنی کرتے ہوئے ہمارے خلاف ایک عظیم لشکر جمع کریں گے۔ اس فصل کی تیسری حدیث (اختلاف خلیفہ کی موت کے وقت ہو گا) واضح کرتی ہے کہ مہدی کا ظہور اس وقت ہو گا جب خلیفہ کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس وقت اختلاف پیدا ہو گا اور حکومت کے لئے باہمی جنگ ہو گی۔ اس وقت مہدی کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ ضعف معمولی ہے۔ اس کے شواہد موجود ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں اور اسے تقویت بخشتے ہیں۔ اگر ہم اس حدیث کو سامنے رکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مہدی کا خروج اس عرصہ میں ہو گا جس میں اہل روم عہد شکنی کریں گے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں مسلمانوں کا خلیفہ وفات پا جائے گا۔ حکومت میں اختلاف کے بعد مہدی کا ظہور ہو گا۔

اگر ہم صورت حال پر غور کریں تو معلوم ہو گا آج روئے زمین پر کوئی ایسا حاکم نہیں جو خلیفہ کہلاتا ہو سوائے جزیرۃ العرب (سعودی عرب) کے جس کے رہنے والوں کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ بادشاہ کو خلیفہ کے لقب سے پکاریں۔

ہمارے اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حالات قرب قیامت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ موجودہ خلیفہ یعنی ملک فہد کی صحت پچھلے دنوں سے خاصی بگڑی ہوئی ہے، یہاں تک کہ اس نے حکومتی امور کو اپنے نائب کے حوالے کر دیا ہے اور عربوں کی سربراہی کانفرنس (جون ۱۹۹۶ء) میں بڑے اہم معاملات طے کرنے کے لئے اسے حق نیابت دے دیا ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ کیا تعجب ہے کہ وہ وہی خلیفہ ہو جس کی موت ظہور مہدی کی علامت ہو گی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔ (جاری ہے)

حواشی

{۱} متواتر حدیث اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحیح ہو اور جسے ایسے ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو جن کا کذب پر اتفاق محال ہو۔ سند کی ابتداء سے انتہا تک اسی قسم کے راوی ہوں گے۔ ان کی روایات معنوی طور پر بعینہٖ ملتی ہوں گی، ہاں الفاظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ ایسی حدیث کو متواتر معنوی کہتے ہیں اور جمہور علماء کے نزدیک اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے۔ اس کا علم واجب اور اس پر عمل فرض ہے اور ان کا انکار کفر کے دائرہ میں داخل کر دیتا ہے۔

{۲} الاشاعۃ، ص ۸۷، ص ۱۱۳

{۳} مختصر لوامع الانوار البہیۃ ومواطع الاسرار الاثریۃ، ص ۳۳۴

{۴} اس کا تذکرہ شوکانی نے اپنی کتاب (التوضیح فی تواتر ما جاء فی المستظر والدجال والمسیح) ان سے شیخ صدیق خان نے اپنی کتاب الاذاعۃ (ص ۱۱۳) اور ان سے شیخ عبدالمحسن العباد نے ص ۱۲۱ اور شیخ محمد بن اسماعیل نے المقدم کے صفحہ ۶۷ پر نقل کیا ہے۔

{۵} الاذاعۃ لما کان وما یکون بین یدی الساعۃ ص ۱۱۳۰

{۶} اس کتاب کے آخر میں میں ان کتابوں اور ان کے مصنفین کا بیان بطور ضمیمہ دوں گا۔

{۷} ابن کثیر کی تاریخ النہایۃ میں "الفتن والملاحم" کا باب دیکھئے۔ اس میں ایک فصل میں مہدی کا تذکرہ ہے (ج ۱)

{۸} القنا سے مراد ناک کی لمبائی، بانس کی باریکی اور درمیان میں ابھار ہے۔ مرد کو اقنٰی اور عورت کو قنواء کہا جاتا ہے۔ یہ خوبصورتی کی علامت ہے۔ دیکھئے مختار الصحاح، باب القاف، مادہ قنا۔

{۹} کتاب الفتن والملاحم، ذکر مہدی کی فصل ج ۱

{۱۰} حدیث حسن ہے جسے ابو داؤد اور حاکم نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے۔ ابن قیم "المنار المنیف" میں فرماتے ہیں: اس کی سند جید ہے۔ ناصر الدین البانی نے تخریج المشکاۃ اور صحیح الجامع میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

{۱۱} صحیح حدیث ہے۔ طبرانی، بزار اور ابو نعیم نے اسے روایت کیا ہے۔ سیوطی نے الجامع میں اس کی صحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ البانی نے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (رقم ۱۵۲۹) میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

{۱۲} حدیث صحیح ہے۔ احمد نے مسند میں اور ابن ماجہ نے سنن میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے۔ احمد شاکر نے مسند کے حاشیہ میں اسے صحیح گردانا ہے اور البانی نے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ میں (رقم ۲۳۷۱) اسے صحیح قرار دیا ہے۔

{۱۳} حدیث حسن ہے۔ ابوداؤد، ابن ماجہ اور حاکم نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے۔ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس کی صحت کا اشارہ کیا ہے۔ البانی کا قول ہے کہ اس کی سند جید ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اس حدیث کے شواہد بھی موجود ہیں۔ دیکھئے السلسلۃ الضعیفہ للالبانی (۱ : ۱۰۸) اس حدیث پر لمبی بحث ہے، جو چاہے وہاں دیکھ لے۔

{۱۴} احمد نے مسند میں اور مسلم نے صحیح میں جابر بن عبداللہ اور ابی سعید الخدری کی روایت سے بیان کیا ہے۔

{۱۵} باب اول فصل سوم میں اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے، بعض الفاظ مختلف ہیں۔

{۱۶} مسلم نے صحیح میں ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ میں نے ایک اور حدیث بطور شاہد پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ یہ حدیث فصل پنجم میں بیان ہوگی۔

{۱۷} احمد اور ابو داؤد نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ اور طبرانی (الاوسط) نے بھی روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ ابن قیم نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، مگر اس کے سلسلہ سند میں ایک راوی ایسا ہے جس کو ایک سے زیادہ محدثین نے ضعیف گردانا ہے۔ اس لئے البانی نے السلسلہ الضعیفہ (رقم ۱۹۶۵) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر اس جیسی بعد میں مروی روایات کا ذکر کیا ہے اور ان کو الصحیحہ (رقم ۱۹۲۴) میں بیان کیا ہے۔

{۱۸} احمد ابوداؤد اور حاکم نے اسے روایت کیا ہے اور البانی نے صحیح الجامع میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

{۱۹} قاہرہ کا اخبار الاھرام، ۲۵ مئی ۱۹۹۶ء

{۲۰} قاہرہ کا اخبار الاھرام، اپریل ۱۹۹۶ء

{۲۱} اینا دستورس کی تحقیق جس کا عنوان "سفر دانیال پر ایک نظر" ہے میں لکھا ہے: اسرائیلی حکومت کے ظہور اور مسیح دجال کے ظہور کے متعلق رب نے یہ کہہ کر وقت کا واضح تعین کر دیا ہے کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ایک نسل کے گزرنے سے پہلے یہ سب باتیں ہو جائیں گی (انجیل متی ۲۴، ۳۴، ۳۵) مسیح دجال کا ظہور = حکومت اسرائیل کا قیام + ۵۰ برس (مئی ۱۹۴۸ء + ۵۰ = اپریل ۱۹۹۸ء)

{۲۲} نصاریٰ، مسیح کذاب (Anti Christ) کے الفاظ کا اطلاق اس شخصیت پر کرتے ہیں جسے یہودی نجات دہندہ یا بادشاہ سمجھتے ہیں اور جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ یہ آدمی ربوبیت کا دعویٰ کر کے ساری دنیا میں تباہی مچا دے گا۔ مسلمان بھی اس کے ظہور پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق اسے مسیح دجال کا نام دیتے ہیں۔

{۲۳} حال ہی میں یہودی مسجد اقصیٰ کے گرد گڑھے کھودنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کریں اور جلد ہی اس کے قریب جلنے والی قربانی پیش کریں۔

{۲۴} مسلمانوں کا بھی عیسائیوں کی مانند یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ کا جلد ہی آسمان سے نزول ہو گا، مگر وہ ان کی طرح یہ یقین نہیں رکھتے کہ رب کی حیثیت سے ان کا نزول ہو گا بلکہ وہ ایک نبی اور رسول کی حیثیت سے نازل ہو کر صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو ختم کر دیں گے۔ اس وقت اسلام اور تلوار میں سے ایک چیز کو قبول کرنا پڑے گا۔

{۲۵} اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔

مسئلہ ایمان و کفر

قرآن و حدیث کی روشنی میں

(آخری قسط)

مولانا محمد طاسین

اب میں اس نازک اور افسوسناک مسئلہ کی طرف آتا ہوں اور اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو میری اس تحریر کا اصل محرک اور باعث بنا۔ اس مسئلہ سے میری مراد مسلمانوں کی تکفیر کا مسئلہ ہے۔ تکفیر کا مسئلہ اپنے برے اثرات و نتائج کے لحاظ سے ایک نہایت مضر اور بھیانک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ سے اُمّتِ مسلمہ کو جتنا نقصان پہنچا شاید کسی دوسرے مسئلہ سے اتنا نہیں پہنچا۔ اس مسئلہ کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر جو افتراق و انتشار ظہور میں آیا اور اس نے ان کو جو متحارب فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کیا حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو مباح الدم اور واجب القتل سمجھنے لگے ایسا شاید کسی دوسرے مسئلہ سے ظہور میں نہیں آیا۔ بعض اوقات یہ مسئلہ مسلمانوں کے درمیان خون خرابے اور قتل و غارت کا سبب بھی بنا۔ بہرحال یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تکفیر کا مسئلہ نہایت فتنہ انگیز مسئلہ ہے۔ اس کی فتنہ سامانیوں سے مسلمانوں کو شدید ضرر و نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ جب ایک مسلمان کسی اختلاف کی بنا پر مسلمان کو کافر کہتا اور اس کے ایمان و اسلام کی نفی کرتا ہے، تو اس سے دوسرے مسلمان کو خواہ وہ کتنا ہی بے عمل کیوں نہ ہو، جو ذہنی اذیت پہنچتی اور جو رنجش ہوتی ہے وہ اس کو کسی مغلظ سے مغلظ گالی سے بھی نہیں پہنچتی اور نہیں ہوتی۔ وہ اس کو اپنی توہین و تحقیر محسوس کرتا ہے اور لوگوں میں اپنی بدنامی اور رسوائی کا باعث سمجھتا ہے۔ لہٰذا اس کے دل میں تکفیر کرنے والے کے متعلق نفرت و عداوت پیدا ہونا ایک بالکل فطری امر ہے، جو کسی وقت باقاعدہ نزاع و تصادم کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کا

نتیجہ تباہی اور ہلاکت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔

قرآن و حدیث میں جو ہدایات و تعلیمات ہیں خواہ وہ عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات سے' اخلاق سے متعلق ہوں یا معاملات سے' ان کے بغور مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ ان میں اس چیز کو بطور ایک اعلیٰ مقصد کے سامنے رکھا گیا ہے کہ عام لوگوں کے درمیان بالعموم اور مسلمانوں کے درمیان بالخصوص اتحاد و اتفاق پر مبنی خوشگوار تعلقات رونما ہوں اور وہ پائیدار امن و سکون کے ساتھ خوشگوار زندگی گزاریں' اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک طرح سے انجام دیں اور ایک دوسرے سے عزت و احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں ہر اُس اعتقاد و عمل اور ہر اُس قول و فعل کے اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے جن کے اختیار کرنے سے وحدت و یگانگت کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور باہمی ربط و تعلق خوشگوار بنتا ہے۔ نیز ایسے تمام عقائد و افکار اور اقوال و افعال سے سختی کے ساتھ روکا اور منع کیا گیا ہے جن سے تفرقہ و تشتّت وجود میں آتا اور باہمی نزاع و تصادم کی فضا پیدا ہوتی ہے اور آپس کے تعلقات بگڑ کر رہ جاتے ہیں۔ اور کسی کو بھی پائیدار امن و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے کی بنا پر تکفیر کا معاملہ یعنی ایک دوسرے کو کافر کہنے اور دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا رویّہ اور عمل بھی ایسا ہی رویہ اور عمل ہے جس سے مسلمانوں کے مابین باہمی نفرت و عداوت کا پیدا ہونا اور نزاع اور جھگڑے کی بنا پر آپس کے تعلقات کا بگڑنا' ایک لازمی اور قطعی بات ہے۔ لہٰذا ایک حدیثِ نبوی ﷺ میں واضح طور پر اس سے روکا اور منع فرمایا گیا ہے۔ اس حدیث نبوی سے مراد سنن ابی داؤد کی درج ذیل حدیث ہے :

عن انسٍ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسولُ اللہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم : ثلاثٌ مِن اصلِ الایمانِ' الکفُّ عمّن قال لا الٰہ الا اللّٰہ لا تکفرہُ بذنبٍ ولا تخرجہُ من الاسلامِ

بعملٍ والجهادُ ماضٍ منذُ بعثَنِیَ اللّٰہ الٰی ان یُقاتِلَ آخرُ ھٰذہِ الامۃِ الدّجالَ ولا یُبطِلہُ جَوْرُ جائرٍ ولا عدلُ عادِلٍ والایمانُ بالاَقدار۔ (ص ۳۴۳ ۔ ج اول)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے : "تین چیزیں اصل ایمان سے ہیں اور ان کا ایمان سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہو اس کے متعلق زبان کو روک رکھنا' نہ کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر کی جائے اور نہ کسی برے عمل کی بنا پر اس کو اسلام سے خارج کیا جائے۔ دوسری چیز جہاد میں حصہ لینا ہے جو اس وقت سے شروع ہوا جب اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا اور اس وقت تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا جب میری اس امت کا آخری حصہ دجال سے جنگ و قتال کرے گا۔ اس درمیان اس کو نہ کسی ظالم کا ظلم باطل ٹھہرا سکے گا اور نہ کسی عادل کا عدل ساقط کر سکے گا۔ اور تیسری چیز تقدیر پر ایمان ہے"۔

اس حدیث نبوی میں جن تین باتوں کی خاص اسلوب سے ہدایت و تعلیم فرمائی گئی ہے ان میں سے پہلی بات کا تعلق ہمارے زیر بحث مسئلہ یعنی مسئلہ تکفیر سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی گناہ اور برے عمل کی وجہ سے دوسرے مسلمان کی تکفیر کرے اور اس کو خارج از اسلام قرار دے۔ اور چونکہ یہ ممانعت نہی کے صیغہ سے فرمائی گئی ہے جو تحریم پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے ایسا کرنا حرام ہے جس سے ضرور بچنا اور اجتناب کرنا چاہئے۔

اس حدیث نبوی میں بجائے یہ فرمانے کے کہ کوئی مسلمان کسی گناہ و جرم کی وجہ سے دوسرے مسلمان کی تکفیر نہ کرے اور اس کو خارج از اسلام قرار نہ دے' یہ فرمایا گیا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل اور پڑھنے والا ہو' کسی گناہ اور بد عملی کی وجہ سے نہ اس کے لئے کافر کا لفظ استعمال کیا جائے اور نہ اسے اسلام سے خارج یعنی غیر مسلم گردانا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کو اس بات کی دلیل اور علامت قرار دیا ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے دل میں پانچ ایمانی عقائد بھی موجود ہیں اور وہ پانچ ارکان اسلام کو بھی قول و عمل سے مانتا ہے۔ لہٰذا کلمہ توحید پڑھنے والا شرعاً

مومن اور مسلم کا مصداق قرار پاتا ہے۔

دوسری چیز جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ کسی گناہ اور برے عمل کی وجہ سے مومن و مسلم کے ایمان اور اسلام کی نفی نہیں ہوتی' اس کے باوجود وہ مومن و مسلم ہی رہتا ہے۔ اس چیز کا علم اور ثبوت صرف اس حدیث سے نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی بکثرت نصوص سے فراہم ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ کامل فوز و فلاح کے لئے ضروری ہے کہ مومن و مسلم کی عملی زندگی اعمال صالحہ سے آراستہ اور اعمالِ فاسدہ اور سیّئہ سے پاک صاف ہو۔ اور یہ کہ ایسی عملی زندگی والا مومن و مسلم بلاشبہ مومنِ کامل اور مسلمِ کامل کا مصداق ہوتا اور دنیوی و اخروی اعتبار سے کامل فوز و فلاح کا مستحق قرار پاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی قرآنی آیات سے یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مومن و مسلم سے ایسے اعمالِ بد بھی صادر ہو سکتے ہیں جو ذنوب و آثام یعنی گناہوں اور جرائم کا مصداق ہوتے ہیں اور جن پر انسان سزا اور عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اور یہ کہ ایسا مومن و مسلم جس کی زندگی میں نیک اعمال کے ساتھ بد اعمال بھی موجود ہوں وہ مومن و مسلم ناقص اور فاسق کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مطلب یہ کہ برے اعمال سے مومن و مسلم کے ایمان و اسلام میں نقص تو ضرور واقع ہوتا ہے لیکن اس کے ایمان و اسلام کی مطلقاً اور کلیتاً نفی نہیں ہوتی۔ اور یہ کہنا درست اور جائز نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کی وجہ سے کافر اور خارج از اسلام ہو گیا' سوائے ایک شکل کے کہ وہ دعویٰ ایمان و اسلام کے بعد شرک جلی کا ارتکاب کرے۔ یعنی کھلے طور پر بتوں وغیرہ کی عبادت اور پرستش کرے۔ اس شکل میں وہ چونکہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ کی نفی کرتا ہے لہٰذا ضرور کافر اور غیر مسلم کہلانے کا سزاوار ہوتا ہے' لیکن کسی ایسے قول و فعل کی بنا پر جس کے کفریہ اور شرکیہ ہونے میں اختلاف ہو' بعض علماء کے نزدیک وہ کفریہ اور شرکیہ ہو اور دوسرے بعض کے نزدیک کفریہ و شرکیہ نہ ہو' کسی مومن و مسلم کو کافر اور مشرک نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ کہ میرے علم و فہم کے مطابق فلاں مسلم فرد یا مسلمان جماعت کا فلاں قول و عمل کفریہ اور شرکیہ ہے۔ اس کو ایسے قول و عمل کی وجہ سے کافر اور مشرک کہنا اس لئے درست نہیں

ہوتا کہ اس کی زندگی میں ایمان و اسلام کے ساتھ دوسرے بہت سے ایسے افکار و اعمال اور اقوال و افعال موجود ہوتے ہیں جو اس کے مومن اور موحّد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ مثال سے اس کی وضاحت اور تفہیم کرنی ہو تو ایک شخص کو لیجئے جو بہت سی باتوں کا علم رکھتا لیکن کچھ باتوں کو نہ جانتا اور ان کے متعلق جاہل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے متعلق یہ کہنا کسی عقلمند اور حقیقت پسند کے نزدیک صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ شخص جاہل مطلق ہے، بلکہ اس کے متعلق جو صحیح بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ بہت سی باتوں کے عالم ہونے کے ساتھ وہ بعض باتوں سے جاہل ہے۔ صرف یہی حقیقت حال کی صحیح تعبیر ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس مومن اور مسلم کی عملی زندگی میں ایمان، اسلام اور توحید کی بہت سی وجوہ موجود ہونے کے ساتھ کچھ کفر و شرک کی وجوہ بھی موجود ہوں تو اس کے لئے حقیقتِ واقعہ کے مطابق صحیح تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں کچھ ایسی وجوہ پائی جاتی ہیں جو بعض اہل علم کی رائے کے مطابق کفر و شرک کی وجوہ ہیں، جو صحیح رائے بھی ہو سکتی ہے اور غلط رائے بھی۔ بہر حال ان وجوہ کی بنا پر ایک مومن و مسلم کو جو ایمانی عقائد رکھتا اور ارکان اسلام کو مانتا ہو، کافر و مشرک اور اسلام سے خارج یعنی غیر مسلم کہنا کسی طرح درست اور جائز نہیں ہو سکتا، بلکہ قرآن و حدیث کی رو سے قطعاً غلط اور ناجائز قرار پاتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بدقسمتی سے بعض اہل علم تعبیر کے مذکورہ فرق کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے بڑی بے احتیاطی اور بے باکی سے ہر اس کلمہ گو مسلمان فرد و جماعت کو کافر سے تعبیر کیا جس کا کوئی خیال و نظریہ یا قول و عمل ان کے علم و فہم کے مطابق غیر اسلامی اور کفریہ و شرکیہ تھا، حالانکہ وہ فرد اور فرقہ اپنے اس خیال و نظریئے اور قول و فعل کو اپنے علم و فہم کے مطابق صحیح سمجھتا اور اس کو کفریہ و شرکیہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

قرآن و حدیث میں مسلمانوں کے لئے یہ واضح ہدایت و تعلیم ہے کہ ایک مسلمان جب کسی دوسرے مسلمان بھائی کے اندر کوئی ایسی بات اور چیز دیکھے جسے وہ شریعت کی رو سے غلط سمجھتا ہو تو اس کا دینی فریضہ ٹھہرتا ہے کہ وہ سچی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ اور حکمت اور موعظۂ حسنہ کے طریقہ سے قابل فہم اور آسان دلائل کے ذریعے اس کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ پس اگر سمجھانے سے وہ سمجھ جائے اور غلطی کی اصلاح کر

لے تو بہت ہی اچھا' ورنہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے' زبردستی اور سختی کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس کی وجہ سے وہ ماننے پر مجبور ہو جائے' کیونکہ ایک مسلمان کی انفرادی ذمہ داری صرف اچھے اور خوبصورت طریقہ سے سمجھانے کی حد تک ہے۔ اگر اس میں وہ کوئی غفلت و کوتاہی برتتا ہے تو اس سے ضرور باز پرس ہو گی۔ زبردستی منوانے کا نہ وہ مکلف و ذمہ دار ہے اور نہ اس پر اس سے عند اللہ کوئی جواب طلبی ہو گی۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ آپ کا منصبی فریضہ صرف یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیغامات اللہ کے بندوں تک پہنچائیں اور ان کو سمجھادیں' ماننا یا نہ ماننا ان کی مرضی پر ہے' آپ کی ذمہ داری منوانا اور راہ راست پر لانا نہیں ہے' آپ ان پر مصیطر' وکیل اور داروغہ نہیں بلکہ صرف نذیر و بشیر ہیں' یعنی برے انجام سے خبردار کرنے اور اچھے انجام کی بشارت و خوشخبری دینے والے ہیں' سختی کے ساتھ لوگوں کو دین حق منوانے والے نہیں۔ پھر جب اپنے رسول' اور پیغمبرؐ کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ جائز نہیں بتلایا کہ وہ سختی اور جبر و اکراہ سے دین حق کو منوانے کی کوشش کریں تو پھر دوسرے کسی کے لئے بھی یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

جہاں تک کسی گناہ اور برے عمل کی بنا پر کسی ایسے مسلمان کی تکفیر اور اس کو کافر کہنے کا تعلق ہے جو پانچ ایمانی عقائد رکھتا اور پانچ ارکان اسلام کو مانتا ہو اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پڑھتا ہو تو اس کی نہایت واضح الفاظ میں ممانعت مذکورہ بالا حدیث نبوی میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث کا سرسری اور معمولی علم رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ عہد رسالت مآب میں منافقین کے نام سے لوگوں کا ایسا گروہ موجود تھا جس نے کلمہ پڑھ کر ظاہری طور پر اسلام قبول کیا لیکن باطنی طور پر درپردہ وہ کافر تھا۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ان کی حقیقت کو آشکار و منکشف کیا گیا —— مثال کے طور پر ایک آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ (البقرہ : ۸)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لائے لیکن حقیقت میں وہ ایمان لانے والے نہیں۔"

اور پھر اس آیت کے بعد سورۃ البقرہ کے دوسرے رکوع میں تفصیل کے ساتھ ان کے حالات کا مذمت کے پیرائے میں ذکر ہے' بلکہ قرآن مجید میں سورۃ المنافقون کے نام سے پوری سورت موجود ہے جس کا آغاز بایں طور ہوتا ہے :

﴿ اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾

"(اے پیغمبر) جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی و شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں' اور اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ یقیناً اس کے سچے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں"۔ (یہ جو بات زبان سے کہہ رہے ہیں ان کے دل اس سے انکاری ہیں۔ وہ آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے)۔

غرض متعدد قرآنی آیات کے مطابق ان کا کافر ہونا یقینی تھا' لیکن ان کے ظاہری اسلام کی وجہ سے ان کو کافر قرار دے کر مسلم جماعت سے الگ نہیں کیا گیا' نیز ان خصوصی مراعات سے ان کو محروم نہیں ٹھہرایا گیا جو کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کو حاصل تھیں۔ بحیثیت مسلمان کے جو احکام دوسرے مسلمانوں کے لئے تھے وہی ان کے لئے بھی تھے۔ اسی طرح کتب حدیث میں کسی صحابی کے متعلق بھی کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے کسی کلمہ گو مسلمان کی اس کے کسی ذنب و گناہ کی بنا پر تکفیر کی ہو خواہ وہ گناہ کتنا ہی بڑا اور کبیرہ کیوں نہ ہو۔ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جنگ جمل و صفین کے نام سے مسلمانوں کے درمیان جو جنگیں ہوئیں وہ کفر و اسلام کے نام اور عنوان سے نہ تھیں بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان تسلیم کرتے ہوئے کچھ دوسرے اجتماعی نوعیت کے اہم معاملات کو اسلام کے مطابق طے کرنے میں اجتہادی اختلاف رائے کی وجہ سے تھیں۔ ہر ایک اپنے علم و فہم کے مطابق اپنے موقف کو از روئے اسلام صحیح اور حق سمجھتا اور باور کرتا تھا' جبکہ

مقصد دونوں کا حق کی حمایت کرنا تھا۔ کسی نے ایک دوسرے کو نہ کافر کہا اور نہ ہی خارج از اسلام قرار دیا۔

عقائد و کلام کی بعض کتابوں میں بعض ائمہ سلف کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے اندر ننانوے وجوہ کفر کی ہوں اور صرف ایک وجہ ایمان و اسلام کی ہو تو ایمان و اسلام کی ایک وجہ کی بنا پر کفر کی ننانوے وجوہ میں ایسی تاویل کی جائے کہ وہ دائرہ ایمان و اسلام سے خارج نہ ہونے پائے۔ لیکن بے حد افسوس ہے کہ اپنے زمانے کے کچھ علماء کا رویّہ اور وطیرہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مطلب یہ کہ ایک شخص کے اندر ننانوے وجوہ ایمان و اسلام کی پائی جاتی اور ایک وجہ کفر کی ہوتی ہے تو اس ایک وجہ کی بنا پر ایمان کی ننانوے وجوہ کو نظر انداز کر کے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے اور اس کو کارِ خیر اور موجبِ اجر و ثواب سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر بعض نام نہاد مولوی و مفتی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا نکاح فسخ ہو گیا اور اب وہ بدکاری میں مبتلا ہے اور حرامی اولاد کو جنم دے رہا ہے۔ گویا کہ اس کو وحی کے ذریعے اللہ نے بتلا دیا ہے کہ تیرے کہنے سے فلاں شخص یا فلاں فرقہ واقعتاً اور حقیقتاً کافر ہو گیا ہے' لہٰذا اس کے ساتھ کافروں کا سا سلوک کیا جائے' کیونکہ حقیقی کفر کا تعلق انسان کے جس قلب و دل سے ہے اس کا علم تو سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا' جیسا کہ پہلے بھی قدرے تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا ہے۔

پھر چونکہ کسی شخص یا فرقے کی تکفیر کے معنیٰ ہیں کفر کی طرف اس کا انتساب' لہٰذا اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ کافر ہو گیا' جس طرح کسی کی تجہیل و تحمیق سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جاہل اور احمق بن گیا۔ لہٰذا ایسا سمجھنا کہ اس کے ساتھ جاہلوں اور احمقوں کا سا سلوک کیا جائے نہ دین کی روح سے صحیح ہو سکتا ہے اور نہ ہی عقل و دانش کی رو سے درست ہو سکتا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کے اندر فرقوں اور ان کے درمیان مختلف قسم کے اعتقادی' فکری اور عملی اختلافات کا تعلق ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ اختلاف پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا اور مختلف افکار و نظریات کی بنا پر مختلف ناموں سے فرقے وجود میں آتے چلے

گئے، جیسے خوارج، روافض، مرجیہ، قدریہ، معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ بنیادی ایمانی عقائد اور ارکان اسلام کو کسی نہ کسی صورت سب مانتے تھے لہٰذا کسی نے کسی کی نہ تکفیر کی اور نہ دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ چنانچہ متقدمین علماء سلف نے فرقوں پر جو کتابیں لکھیں ان میں سب فرقوں کو مسلم قرار دیا اور ان کے عقائد و افکار پر بحث و تحقیق کی روشنی ڈالی البتہ بعض کتابوں میں ان کو فرقہ ضالّہ یعنی گمراہ اور بھٹکے ہوئے فرقوں سے تعبیر کیا۔ شیخ ابوالحسن الاشعری نے اس طرح کی جو کتاب لکھی اس کا نام "مقالات الاسلامین" رکھا جو اس کتاب میں درج فرقوں کے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس موضوع پر مختلف ادوار میں مختلف کتابیں لکھی گئیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ عہدِ حاضر کے ایک مصری عالم شیخ ابو زہرہ کی اس موضوع پر عام فہم اور عمدہ کتابیں ہیں جن میں ان سب فرقوں کو مسلم تسلیم کرتے ہوئے ان کے عقائد و افکار کو واضح کیا گیا ہے۔

بہرحال جہاں تک فرقوں اور جماعتوں کی اجتماعی تکفیر کا تعلق ہے تاریخ اسلام میں اس کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ البتہ اِکادُکا اشخاص کی انفرادی تکفیر کی کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں اور جو زیادہ تر ایسے اشخاص سے متعلق ہیں جو علم و عرفان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوئے اور اصلاح کی خاطر اپنے زمانے کے علماء و مشائخ کی غلط فہمیوں اور غلط کاریوں پر کھل کر تنقید کی اور اسلام کے نام پر ان کے اندر جو غیر اسلامی امور رائج تھے ان کو واشگاف اور اجاگر کیا۔ اس کا نتیجہ اور ردِّ عمل علماء و مشائخ کی طرف سے جو سامنے آیا وہ یہ کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی اصلاح کرتے ان مصلحین حضرات کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، بالکل جھوٹی اور من گھڑت باتیں ان کی طرف منسوب کر کے عامۃ الناس میں ان کو بدنام کرنے کی مذموم کوششیں کیں، یہاں تک کہ کچھ نام نہاد علماء و فقہاء نے کفر کے فتوے بھی داغ دیئے۔ اسی طرح کچھ ایسے اشخاص کو بھی کفر کا نشانہ بنایا گیا جنہوں نے اپنی اعلیٰ سوچ اور تفکیر اور گہری تحقیق کی بنا پر دین کے حوالے سے کچھ ایسی نئی باتیں فرمائیں اور ایسے افکار و نظریات پیش کئے جو وقت کے عام علماء کی ذہنی اور علمی سطح سے اونچے اور بلند تھے اور جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ اگر ان کو صحیح تسلیم کر لیا گیا تو اس کے نتیجے میں ان کو اپنے بہت سے خیالات سے دستبردار ہونا پڑے

گا جس سے ان کی حیثیتِ عرفی کو دھچکا لگے اور نقصان پہنچے گا اور عوام ان سے بدظن ہو جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے نئی تحقیقات پیش کرنے والوں کے خلاف جو حربے استعمال کئے ان میں سے ایک حربہ ان کو کافر کہنے کا بھی تھا۔ بعض دفعہ ایسے حضرات کے لئے ملحد و زندیق کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے۔

برِ عظیم پاک و ہند میں مختلف جماعتوں اور فرقوں کے درمیان اجتماعی تکفیر کا فتنہ جس شدت اور کثرت کے ساتھ پھیلا دوسرے کسی ملک کے مسلمانوں کے اندر اس کی مثال نہیں ملتی، اور یہاں بھی خاص طور پر اور زیادہ تر انگریزی دورِ حکومت میں پھیلا اور پھولا پھلا جس کی سیاسی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" عام طور پر مشہور ہے۔ اور پھر یہاں باہمی کفربازی اور کفرسازی ایسی شکل میں فروغ پذیر ہوئی جس میں علم کم اور جہل زیادہ تھا۔ بعض علماء کی کتابوں کی بعض عبارتوں کو اپنے سیاق و سباق سے الگ کرکے اپنے پاس سے ان کو ایسے معنی پہنائے گئے اور ان کا ایسا مطلب تجویز کیا گیا جس کی نفی اور تردید خود اسی کتاب کی متعدد عبارتوں میں موجود تھی تاکہ اس عبارت کی وجہ سے صاحب کتاب پر کفر کا فتویٰ لگایا جاسکے اور پھر جس مطلب کی بنا پر فتویٰ تجویز کیا گیا وہ مطلب قرآن و حدیث کی رو سے ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس کی بنا پر کسی مسلمان کی تکفیر کی جاتی، کیونکہ خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے ایمانی عقائد رکھنے اور ارکان اسلام کو ماننے والے کی تکفیر کرنا جہاں مذکورہ ارشاد نبوی کی صحیح خلاف ورزی ہے وہاں عقل سلیم اور عدل و انصاف کے بھی سراسر خلاف ہے۔ اس لئے کہ اس میں کفر کی ایک وجہ کی بنا پر ایمان و اسلام کی بکثرت وجوہ کو نظرانداز کردیا جاتا ہے جو ظلم کی ایک خاص شکل ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے درمیان باہمی تکفیر کا عمل آپس کے اختلافات و نزاعات کا باعث اور موجب بنتا ہے لہٰذا فساد فی الارض کی تعریف میں آتا ہے جس کو قرآن مجید میں ناحق قتل جیسا جرم بتلایا گیا ہے، اور امن و امان کا قیام اور بدامنی پیدا کرنے والے جرائم کا انسداد ایک صحیح اسلامی حکومت کا منصبی فریضہ ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث کی رو سے اس پر لازم آتا ہے کہ وہ تکفیر کے عمل پر سخت پابندی لگائے اور اس کا

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۲)

ڈاکٹر ابو معاذ

ساسانی عہد اور ایران

خالص آریائی نسل کے بادشاہ اردشیر نے ۲۲۴ء میں اقتدار پر ایک بار آریائی ایرانیوں کا قبضہ مستحکم کرتے ہوئے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور آہستہ آہستہ قوم پرست ایرانیوں کی مدد سے خلیج فارس سے بلخ (شمالی افغانستان) تک قابض ہو گیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے ساحل مکران اور بلوچستان کے دیگر علاقوں کے حکمرانوں نے بھی اس کی اطاعت قبول کرتے ہوئے باج و خراج ادا کرنا شروع کر دیا۔ ایران ایک بار پھر جوبن پہ آگیا' اس کی عظمت رفتہ بحال ہو گئی' فوج منظم ہونے لگی اور قومیت اور مذہب زرتشت کا ہر جگہ غلبہ ہو گیا۔ جلد ہی اردشیر نے رومی سلطنت کے حلیف سرحدی ملک آرمینیا پر حملہ کر دیا اور پھر رومی سلطنت کے ایک صوبے یعنی عراق پر حملہ کر دیا۔ رومیوں کی جانب سے الیگزینڈر نے ۲۳۱ء میں مقابلہ کی ٹھانی مگر ایرانیوں کی یورش کے سامنے رومی نہ ٹھہر سکے۔ اگلے چار سو برس رومیوں اور ایرانیوں کے مابین اکثر جنگیں ہوتی رہیں۔

مرکز میں مستحکم دفتری نظم و نسق قائم ہوا' شہنشاہ رعایا سے الگ تھلگ رہتا تھا اور اس کے حضور باریابی حاصل کرنے والے لوگ خاص پروٹوکول کا خیال رکھتے تھے۔ جاگیرداری اور اشرافیہ کا نظام بحال ہوا' بھاری بھرکم ہتھیاروں سے لیس سوار شاہ کے ذاتی دستہ میں شامل کئے گئے اور ایک مرکزی رائل آرمی (شاہی فوج) قائم ہوئی جس کی اساس شاہ کی ذات اور تاج و تخت سے وفاداری پر تھی۔

شہنشاہ کی زیر سرپرستی ایک مربوط اور منظم مذہبی نظام (جو کلیسائی نظام سے مشابہ

تھا) قائم ہوا' جو ریاست کی حمایت کرتا تھا۔ درحقیقت یہ کلیسائی طرز کا نظام جو سلوکیوں اور اشکانیوں کے عہد میں زیر زمین تھا وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ ہخامنشی دور کا زرتشتی مذہب' نئے جوش و خروش اور ولولہ کے ساتھ سامنے آیا۔ اھورا مزدا (یعنی خدائے برتر) کی پرستش کے ساتھ ساتھ کئی دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ روشنیوں کے مظاہر یعنی مہر (سورج) اور ناہید (زہرہ سیارہ) کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ مزدنیسا کا کلیسائی طرز کا نظام ایک سردار اعلیٰ کی قیادت میں قائم ہوا' جس کے ماتحت مختلف درجات کے مغنے تھے جو زرتشتی مذہب کی تشریح کرتے تھے۔ علاوہ بریں آتش کدوں کے مجاور اور متولی بھی مقرر تھے۔ اس تحریف شدہ دین میں آتش مقدس کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ ہر فرقہ اور ہر شخص گھر میں مقدس آگ کے شعلے روشن رکھتا تھا۔ ریاست کے مختلف حصوں میں تین بڑے آتش کدے خاص اہمیت کے حامل تھے۔

زرتشت کی کتاب مقدس "اوستا" جو امتداد زمانہ کا شکار ہو چکی تھی' اس کی ایک بار پھر سے تدوین کا بیڑا اٹھایا گیا۔ کتاب مقدس کے "حفاظ" کو جمع کیا گیا اور ایک بار پھر اسے حیطۂ تحریر میں لایا جانے لگا۔ اردشیر ساسانی کے عہد میں ہی اس کی تدوین کا کام شروع ہوا اور شاہ پور اول کے دور میں جاری رہا۔ یہ کام شاہ پور دوم کے عہد میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔

ابتداء میں دیگر مذاہب مثلاً یہودیت' عیسائیت اور بدھ مذہب کو سلطنت کے اطراف و اکناف میں پھلنے پھولنے کا موقع بھی عطا کیا گیا۔ ایران کے مغربی مفتوحات اور آرمینیا میں عیسائیت کو غلبہ نصیب ہوا اور خراسان میں بدھ مذہب کی اشاعت ہوئی۔

اسی عہد میں مانی کا ظہور ہوا۔ مانی نے رہبانیت کی تبلیغ کی۔ شادی بیاہ کی مخالفت اور تجرد کامل کی حمایت کی۔ اس نے ترک دنیا کا درس دیا اور مختلف تصاویر و تماثیل کے ذریعے اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا فنکار آرٹسٹ تھا اور اس کی تصاویر کا مجموعہ ارژنگ یا ارتنگ کہلاتا تھا۔ غالب نے اپنی بابت کہا ہے ؎

فارسی بیں تا بہ بینی کاندر اقلیم خیال

مانی و ارژنگم و ایں نسخہ ارتنگِ من است

(میرے فارسی کلام کو پڑھ کر تو معلوم ہو گا کہ تصورات کی سرزمین کا میں ہی مانی ہوں اور میرا کلام مانی کا ارژنگ ہے)

سرزمین ایران سے نکل کر مانی نے کشمیر اور تبت کی غاروں کی راہ لی اور مختلف غاروں میں تصویر کشی کرتا رہا۔ کشمیر اور تبت کی غاروں میں ان کے آثار بھی ملتے ہیں۔ مانی اپنے زمانے میں درویشوں کا ایک گروہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ درویش ملک کے طول و عرض میں جوگیوں کے روپ میں پھرتے رہتے تھے اور لوگوں کو زہد و تجرد کی تلقین کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ زرتشتی کلیسا کے لئے ایک خطرہ بن کر سامنے آ گئے۔ بہرام اول ساسانی کے عہد حکومت میں مانی کو گرفتار کر لیا گیا اور مغوں کے سپرد کر دیا گیا جو اس کے ازلی دشمن تھے۔ انہوں نے بابل میں شہر کے دروازے پر اس کی زندہ حالت میں کھال کھنچوا کر ختم کر دیا۔

اسی طرح جب بازنطینی سلطنت نے عیسائیت اختیار کر لی تو ایرانیوں نے عیسائیوں کو رومیوں کے آلہ کار قرار دے کر شاہ پور دوم کے عہد بادشاہت میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ ممنوع قرار پائی اور عیسائیوں کو قیصر روم کی رعایا سمجھ کر انہیں یا تو بزور زرتشتی بنا لیا گیا یا جلاوطن کیا جانے لگا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ایرانیوں نے ساسانی عہد میں مہر اور ناہید (سورج اور زہرہ) کی پرستش بھی شروع کر دی تھی۔ یہ مذہب ایشیائے کوچک اور آرمینیا میں بھی پھیل گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے رومی افواج وہاں مقیم رہیں اور ایرانی عقائد اپنا کر مہر پرستی اور ناہید پرستی اپنے ساتھ یورپ تک لے گئیں۔ ۳۱۷ء میں دریائے ڈینیوب کے کنارے ممتاز رومی سرداروں گلیرس اور لائی سینس نے مہر (سورج) کا ہیکل تعمیر کیا اور کہا کہ یہ دیوتا ہمارا محافظ ہے۔ علاوہ بریں تحریف شدہ زرتشتی عقائد یورپ میں بھی پہنچ گئے۔ یونانی فکر میں نیکی و بدی یزدان اور اہرمن کی دوئی (ثنویت) اور ان کے مابین ازلی کشمکش کے تذکرے شامل ہو گئے' اسی طرح ناہید مغرب میں افرودیت (Aphrodite) دیوی کی صورت میں قبول کر لی گئی۔

یہاں یہ امر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناہید دیوی اور مہر دیوتا کی بابت عروج عقائد کا

کسی حد تک ذکر کر لیا جائے۔

ناہید کی قدیم صورت "اناہیتہ" ہے، جس کے معنی بے عیب ہیں۔ یہ دیوی زرخیزی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور کاشتکاری کی فراوانی اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ کاشتکاری کے باعث جب دولت اور ثروت جمع ہوتی تھی تو عیش و عشرت اور نشاط و انبساط کی جانب میلان ہوتا تھا۔ اسی لئے بعد میں ناہید دیوی سے عشق و محبت اور حسن و جمال کی خوبیاں وابستہ کر دی گئیں۔ اس کے عربی نام زہرہ سے بھی اسی قسم کے تصورات وابستہ ہیں۔ ہاروت و ماروت کے افسانے بھی اسی سے منسوب ہیں۔ انگریزی میں اس کی صورت وینس (Venus) ہے۔ ہوس پرستی اس سے منسوب ہے۔ انگریزی کلمہ "Venial" ہوس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قدیم ایران میں اس دیوی کی پرستش بڑے زور و شور سے ہوتی تھی۔ بغداد کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر اس دیوی کا مندر تھا۔ بغ سے مراد دیوتا ہے اور داد کے معنی عطیہ کے ہیں۔ اس طرح بغ داد کے معنی ہیں "دیوتا کا عطیہ"۔ بغ اور فغ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں بغ کا کلمہ بھگ کی صورت اختیار کر گیا اور بھگوان اور بھگتی اسی سے مشتق ہیں۔ ایران کا مشہور پہاڑ بے ستون جو فرہاد سے منسوب ہے پہلے بہل مغستان کہلاتا تھا جس کے معنی تھے آستانۂ خدا۔ رقص و سرود اور موسیقی بھی ناہید سے وابستہ تھے۔ مومن نے کہا ہے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

قصص القرآن میں صدر الدین بلاغی نے "عزّیٰ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں اس بت کی ہیکل کو حرم کعبہ کے برابر احترام دیا جاتا تھا۔ اسی بت کو کلدانی لوگ بلتی اور عشتار کہہ کر پوجتے تھے۔ ارامی اسے عتیرا کہتے تھے۔ فرمان روائے بابل کے زمانے میں یہ ستارۂ صبح (ناہید یا زہرہ) سے منسوب تھا۔

ساسانی سلطنت کے بانی اردشیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا دادا ساسان اصطخر میں ناہید کے مندر کا پروہت یا متولی تھا۔ اس مندر کی سرداری اردشیر کو ورثے میں ملی تھی۔

چونکہ ان ایام میں ناہید دیوی کی پرستش عروج پر تھی اس لئے قوم پرستی یعنی ایرانیت کی تحریک کا مرکز یہی مندر تھا' جہاں پر پجاریوں نے تحریف شدہ زرتشتی مذہب کے پجاریوں میں اشکانیوں کے خلاف نفرت کے بیج بو کر ساسانی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔

اب ہم مہر دیوتا کی جانب چلتے ہیں۔ ایران کے علاوہ اس کے مقبوضات عراق اور مصر میں بھی سورج کی چمک کے ساتھ زرخیزی کا تصور وابستہ تھا' اسے میترا' میترہ' متھرہ اور مہر بھی کہا جاتا تھا۔ شروع میں متھرا یا مہر (سورج) اھورامزدا کی ایک خوبیوں میں سے ایک تھا' بعد میں یہ تصور ایک مستقل دیوتا کی صورت اختیار کر گیا۔ آج بھی ایرانی تقویم (کیلنڈر) میں ایک مہینہ مہرماہ کے نام سے منسوب ہے۔ اسی طرح مہرداد ایک ایسا نام ہے جو پاکستان کے دیہات تک میں پایا جاتا تھا اور لوگوں کو کم ہی معلوم ہو گا کہ یہ شرکیہ نام ہے۔ اسلامی انقلاب سے قبل ایران کے قومی نشان کے طور پر شیر کے ساتھ خورشید (مہر) کا نشان موجود تھا اور ایران کے پرچم پر بھی یہ نشان موجود تھا۔

اسی دوران روم میں عیسائیوں کے ایک فرقہ نے عقائدی اختلافات کے باعث اپنے وطن سے نکل کر ایران کی راہ لی۔ اس عقیدہ کا بانی نسطوریس تھا اور اس کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے نہیں ہیں اور نہ ہی حضرت مریمؑ خدا کی بیوی ہیں۔ نسطوریس اپنے ساتھیوں سمیت نوشیروان کے ابتدائی عہد میں ایران میں آ گیا اور اس کے پیروکاروں کو پوری عزت و اکرام کے ساتھ خوزستان میں آباد کیا گیا۔ ان لوگوں نے جندی شاپور کے نام سے ایک یونیورسٹی ٹاؤن کی بنیاد رکھی' جہاں فلسفہ' طب اور تاریخ و ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ وہاں سے فارغ التحصیل لوگ دور دور تک پھیل گئے' حتیٰ کہ مشرکین مکہ میں بھی ایک ایسے شخص کا سراغ ملتا ہے جو اسلام کی تضحیک کیا کرتا تھا' اسے فتح مکہ کے موقع پر قتل کرنے کا حکم صادر کیا گیا تھا۔ وہ قرآنی حکایات کو ایرانی اساطیر سے حقیر قرار دے کر قرآن کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ الغرض جندی شاپور کی یونیورسٹی عباسی دور تک قائم رہی اور اس کے اکثر اساتذہ نے عیسائیت کو ترک نہیں کیا۔ جب عباسی دور میں علوم و فنون کی قدردانی ہوئی تو یہ مقام مشرق و مغرب کے سنگم کی حیثیت اختیار کر گیا اور یہیں کے اساتذہ نے اہم کتب کا عربی ترجمہ کر کے علوم کے فروغ اور مسلمانوں کی علمی کاوشوں

میں اہم رول ادا کیا۔ ان نسطوری عیسائیوں کے کلیسا خراسان و خوارزم تک میں موجود تھے۔

اسی طرح کچھ نہ کچھ یہودی ایران میں ہر دور میں موجود رہے ہیں اور یہودیوں سے ساسانیوں کے تعلقات میں ماسوائے چند مواقع کے گرمجوشی پائی جاتی رہی ہے۔ بازنطینی اور ساسانی جنگوں میں جب بھی یہودیوں کے خطے ایرانیوں کے قبضے میں آئے تو یہودی نسبتاً سکھ کا سانس لیتے رہے۔ جیسا کہ ھخامنشی دور کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ کوروش اعظم کے زمانہ میں یہودی بابلؑ میں موجود تھے اور وہاں سے انہیں بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کے بعد وہاں آباد کیا گیا تھا' لیکن یہودیوں کی ایک بڑی تعداد بابل میں موجود رہی اور یہیں سے یہودی ایران میں داخل ہو کر مختلف مقامات پر پوری آزادی کے ساتھ آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے فارسی زبان اپنائی اور مختلف کاروانوں کے ہمراہ مشرقی نقاط کی جانب اپنے سفر اور قیام کی وجہ سے اپنے ہمراہ فارسی زبان کے اثرات لے گئے۔ فارسی میں یہودی تحریروں کے آثار افغانستان' چینی صوبہ زنجیانگ' ہندوستان کے ساحل ملیبار اور وسطی ایشیاء میں ملتے ہیں (مزید تفصیل کے لئے فرہنگ ایران مبین جلد ۲۰ مطبوعہ تہران ۱۹۷۵ء میں موجود والٹر جے منٹل کے مضمون "فارسی یہودیوں کی ایرانی تہذیب و ادب کے لئے خدمات" کا مطالعہ ضروری ہے) ہرچند کہ علمی اور فکری اعتبار سے یہودی ایران میں الگ تھلگ رہے اور ایک محتاط اقلیت کے طور پر اپنے افکار کی اشاعت میں زیر زمین ہی رہے مگر پھر بھی زمانہ بعد از اسلام میں مختلف ادوار میں ان کے اثرات واضح طور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا ذکر بعد کے صفحات میں قدرے تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

اب ہم ایک خالصتاً ایرانی مذہب مزدکیت کی جانب آتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کا یہ مذہب خالصتاً ایرانی الاصل تھا اور اشتراکیت کے نظام پر مبنی تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ساسانی بادشاہت نے جاگیردارانہ اور طبقہ وارانہ نظام کی حوصلہ افزائی کر کے ملک کے باشندوں کو سماجی اور معاشی اعتبار سے طبقات میں تقسیم کر دیا تھا اور مختلف طبقات آپس میں برسرپیکار تھے اور کمزور و مستضعفین اپنے حقوق کے لئے خود آگاہی کے عمل سے گزر رہے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی میں قباد ساسانی کے دور میں مزدک کو فروغ

حاصل ہوا۔ اس نے شاہی گوداموں کو لوٹ لیا اور دولت میں اشتراک اور غرضیکہ ہر قسم کی اشیائے ضرورت میں اشتراک کے فلسفے کی ترویج کی۔ قباد ساسانی نے اس کا مذہب قبول کر لیا اور کچھ عرصہ کے لئے ایران اشتراکیت کے سائے میں چلا گیا۔ جلد ہی زرتشتی مذہب کے مبلغین نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم کر لیا اور پھر شہزادہ منشر (جو بعد میں نوشیروان کے خطاب سے مشہور ہوا) کی مدد سے مزدک اور اس کے پیروکاروں کا مربوط فوجی ایکشن کے ذریعے صفایا کر دیا۔ اس کے کچھ پیروکار شام اور یونان بھاگ گئے اور کچھ عرصہ کے لئے شام اور یونان میں یہ مذہب زندہ رہا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے مانی کے مذہب کی بھی پہلے پہل سرکاری سطح پر سرپرستی کی گئی اور بعد میں اسے ختم کر دیا گیا تھا۔ مانی کے پیروکار کچھ عرصہ کے لئے ایران سے باہر اپنا مذہبی تشخص قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ ۷۷ء تک مانی کے عقائد بازنطینی رومی سلطنت تک پہنچ گئے تھے، پھر یہ عقائد شمالی افریقہ پہنچے۔ اس مذہب کے ایک راسخ العقیدہ مبلغ سینٹ آگسٹین (Saint Augustine) نے بہت شہرت پائی۔ قسطنطنیہ میں عیسائیت اور مانویت کے مابین مناظروں کا سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ مانویت کی تعلیمات میں موجود رہبانیت بعد میں عیسائیت حتیٰ کہ اسلامی تصوف میں بھی نظر آتی رہی ہے۔ تاہم مزدکیت کو وہ فروغ حاصل نہ ہو سکا جو مانویت کے حصے میں آیا تھا۔ البتہ بعد کے اشتراکی نظریات میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے کارل مارکس کو روحِ مزدک کا بروز قرار دیتے ہوئے اشتراکیت کو مزدکیت کی ایک صورت قرار دیا ہے۔ ارمغان حجاز میں آپ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس کے پانچویں مشیر کی زبانی اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہلوایا ہے ؎

وہ یہودی فتنہ گر، وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

علامہ اقبال کی نگاہ دوربین اس سے بہت آگے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کا جواب ابلیس کی زبان سے یوں دلواتے ہیں ؎

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مُو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

ساسانی عہد میں بازنطینی عیسائیوں سے خوفناک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ بھی جاری رہا۔ قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران اپنی سرحدوں کے قریب ایرانی خطرہ سے لاعلم نہیں تھے۔ ان کے عیسائیت کے سرپرست ہونے کے باعث ایران نے اپنی عیسائی آبادی کو رومیوں کا وفادار سمجھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا اور ان کو ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ ۴۲۱ء میں عیسائی جب ایران سے بھاگ کر بازنطینی سلطنت میں پناہ گزین ہوئے تو ان کے تعاقب میں آنے والی ایرانی افواج کا مقابلہ رومی لشکروں سے ہوا اور یہ جنگ ہار جیت کے بغیر ختم ہو گئی۔ اور پھر ایک صدی تک یہ دونوں بڑی سلطنتیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ ایک صدی کے بعد ایرانیوں نے ۵۲۷ء میں پھر ایک بار رومیوں کو للکارا اور ان کے مشرقی صوبوں پر قابض ہو گئے۔ ۵۴۲ء میں دارا کے مقام پر ایرانیوں کو پہلی

مرتبہ بیلی ساریوس کے لشکر کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس کے نتیجہ میں قیصر روم جسٹینین اور ایرانی شہنشاہ خسرو اول کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوا۔ یہ صلح زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ ۵۴۰ء میں ایرانی انطاکیہ (موجودہ شام کا شہر) پر چڑھ دوڑے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ شام و فلسطین اور بحیرۂ روم کے ایشیائی ساحل تک قبضہ کے بعد ایرانیوں نے اپنی شرائط پر صلح کر کے شمال کی جانب توجہ دی۔ شمال میں کوہ قاف (قفقاز) کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھی۔ یہ پہاڑی ریاستیں ہمیشہ سے آزادی کی متوالی رہی ہیں اور موجودہ چیچنیا اور داغستان کی طرح ان کی وادیوں میں کسی بھی حملہ آور کا نفوذ ایک مشکل امر رہا ہے۔ ایرانیوں نے ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہیں زیر اثر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ امر بازنطینیوں کو گراں گزرا اور ایک بار پھر دونوں سلطنتوں میں ٹھن گئی۔ ۵۷۵ء میں ایرانیوں کے بازنطینیوں کو شکست سے دوچار کیا اور اگلے برس بازنطینی رومی غالب رہے۔ ۵۹۱ء میں صلح کا ایک اور معاہدہ مرتب ہوا۔

ایران پہ طویل عرصہ حکومت کرنے کے بعد نوشیروان (۵۳۱ء-۵۷۹ء) کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور کچھ عرصہ کی اندرونی کشمکش کے بعد خسرو پرویز (دوم) برسراقتدار تھا۔ ۶۰۲ء میں اس نے موقع پاتے ہی رومیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ ۶۱۱ء میں انطاکیہ اور ۶۱۲ء میں دمشق پر اور بعد ازاں بحیرۂ روم کے جزائر اور خاص طور پر قبرص پہ قبضہ کے بعد ۶۱۴ء میں انھوں نے مصر پہ قبضہ کر لیا۔ ادھر یمن پر ایرانی قبضہ کے بعد بحیرۂ احمر عبور کرنے کے بعد ایرانی سپاہ حبشہ تک بھی جا پہنچی۔ حبشہ پر عیسائی سلطنت قائم تھی۔ ایرانی جلد ہی وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ ابرہہ، جس نے خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لئے (اصحاب الفیل کا) ایک لشکر بھجوایا تھا، وہ بھی ایرانی سلطنت کا باجگزار معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں خسرو پرویز کے زمانہ میں یمن پر باذان کو گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب شام و عراق و یمن پہ قبضہ کے بعد جزیرۂ نمائے عرب پہ ایرانی اپنا اقتدار محسوس کرتے تھے مگر وہاں کے قبائل کو قریباً قریباً وہی خود مختاری حاصل تھی جس کا تصور ہمارے قبائلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ خسرو پرویز اور ساسانی حکمرانوں سے ہمدردی کا اظہار ضرور کیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ جو ملک شام اور فلسطین سے قریب تر تھا اور نسبتاً

متمدن علاقے کے اثرات اس شہر پر غالب تھے اس پر ایرانی ساسانی اثرات کے نقوش نسبتاً زیادہ واضح تھے۔ یہودیوں کی مدینہ منورہ میں موجودگی بھی ایرانیوں سے قریبی روابط کی غماز تھی۔ ایرانی عیدیں نوروز اور مہرگان مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے پورے جوش و خروش سے منائی جاتی تھیں۔ اس کا نسبتاً مفصل ذکر بعد میں آئے گا۔

مصر پر ایرانی قبضہ کے بعد اور بحیرۂ روم کے جزائر پر تسلط کے بعد رومی سلطنت کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ مصر سے رسد و رسائل کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد رومی سخت پریشانی سے دوچار تھے۔ علاوہ بریں بیت المقدس پر قبضہ کے دوران خسرو پرویز کی افواج نے عیسائی معبدوں کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور صلیب مقدس بھی اٹھا کر لے گئے تھے اس مذہبی بے حرمتی نے عیسائی دنیا میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ پر اعتماد ایرانی ساسانی افواج اب ایشیائے کوچک کی جانب بڑھیں اور قسطنطنیہ کے بالکل سامنے ایشیائی ساحل پر سقوطری کے مقام پر قابض ہو گئیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ اب ایرانی افواج بازنطینی افواج کو روندتی ہوئی یورپ میں داخل ہو جائیں گی۔ ایرانیوں کی پے در پے فتوحات پر قرآن کی وحی کا نزول سورۃ الروم کی صورت میں ہوا' اس کا ذکر ہم بعد کے صفحات کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

ان جنگوں کے عالمگیر اثرات مرتب ہوئے۔ جزیرہ نمائے عرب دونوں سلطنتوں میں ایک بفرزون کی حیثیت حاصل کر گیا۔ وہاں تجارت بدستور قائم رہی اور شام و یمن کے تجارتی راستوں کی اہمیت بڑھ گئی۔ ہرچند کہ قبائل اپنی عصبیتوں کے باعث باہم برسرپیکار رہتے تھے مگر باہر کے قافلوں سے چنداں تعرض نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ خود بھی تجارتی سفروں میں خود کو زیادہ پر اعتماد محسوس کرتے تھے۔ شمال کی جانب شام کی سرحد پر جو ریاستیں بازنطینی سرحد پر موجود تھیں مثلاً غسانی ریاستیں ایرانی مصلحتاً ان سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ ایران میں موجود نسطوری عیسائیوں کے بھی سرحد پار اپنے بھائی بندوں سے روابط موجود تھے۔ سرزمین ایران میں بھی عیسائیوں کی چند آبادیاں موجود تھیں جنہیں اب ایرانی تنگ نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک ریاست نما آبادی حیرہ کی بھی تھی۔

(جہاں بعد میں کوفہ کا شہر آباد ہوا)۔ یمن پر ایرانی اقتدار کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یمن ۵۷۰ء میں ایرانی سلطنت کا جزو بن چکا تھا' اس کے باوجود بحیرۂ احمر میں رومی جہاز رانی کرتے رہتے اور حبشہ کے عیسائیوں سے اپنے روابط قائم رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح رومی اور ایرانی تجارت میں یمن اور حبشہ کو اہمیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے شام کی تجارتی شاہراہ جو مکہ اور مدینہ کے قریب سے گزرتی تھی وہ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی۔

ساسانی ایرانی افکار کے مرکز میں شہنشاہ کی ذات تھی۔ شہنشاہ کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا ہے اور اس سے وفاداری' شاہی خون کی پاکیزگی' شاہ کی شخصیت کا سحر اور تقدس مسلمہ امر تھا۔ ہرچند کہ عیسائیت نے اس نظریہ کی نفی کی تھی لیکن یہ تصور کسی نہ کسی طرح ایران سے بازنطینی سلطنت میں مروج ہو گیا اور شاہ کو کلیسا کے سربراہ کا درجہ حاصل ہو گیا۔ مشرقی بادشاہت کے تصورات مغرب میں رائج ہو گئے۔ شاہی لباس' تخت و تاج بھی رومی سلطنت میں ایرانی سلطنت سے متعارف ہوئے۔ شہنشاہ اور شاہی خاندان کی عظمت کا تصور جو ایرانیت کے رگ و ریشے میں سمایا تھا اور زمانہ ماقبل اسلام اس کے مذہبی پہلو بھی تھے وہ ایرانی ذہن پر طویل عرصہ تک اثر انداز رہا اور اس کے خاتمے کے لئے صدیاں بیت گئیں۔

اسی زمانہ میں سفارت و تجارت' کاروانوں کے سفر' جہاز رانی اور تہذیب و تمدن نے ترقی کی راہیں طے کیں۔ ایرانی بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔ ان میں اعتماد' ذہنی وسعت' قانون سازی کا فن' فلسفہ' نقش و نگار' فن تعمیر اور حربی فنون متعارف ہو گئے۔

قدیم ایرانی عمارات میں (ماقبل اسلام) محرابیں ہوتی تھیں اور ان پر گنبد تعمیر کئے جاتے تھے۔ ان گنبدوں کے ارد گرد بند کمرے ہوتے تھے۔ دالان اور ڈیوڑھی کا تصور بھی تھا۔ اس طرح کی عمارات طیسفون اور دوسرے کھنڈرات میں ملی ہیں۔ یہی فن تعمیر بعد میں مساجد و مقابر اور خانقاہوں حتیٰ کہ قلعوں اور اسلامی دور کے محلات میں دیکھا جانے لگا۔

اس پرشکوہ ساسانی سلطنت میں فلسفے اور دیگر علوم نے بھی خوب ترقی کی۔ کئی

فلسفیوں نے ایران آکر فلسفہ سیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ نوشیرواں بذات خود فلسفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں حکماء کا اجتماع رہتا تھا۔ اس کا مشہور وزیر بزرگ مہر یا بزرجمہر (جسے برزویہ بھی کہا جاتا ہے) اپنے دور کا مشہور و معروف دانا تھا اور اب بھی سیاسی جغادروں کو اصطلاحاً بزرگ مہر یا بزرجمہر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

جب رومی بادشاہ گاڈین نے ۲۴۲ء میں ایران پر فوج کشی کی تو اس کے مشہور درباری فلسفی فلاطینوس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی ساتھ لے جایا جائے تاکہ وہ ایران میں فلسفے کا مطالعہ کر سکے، لیکن یہ مہم ناکامی سے دوچار ہو گئی۔ اس واقعہ کے قریباً تین سو برس بعد خسرو اول (نوشیرواں) نے حمص کے آرچ بشپ (اسقف) پال سے فلسفہ کا علم حاصل کیا۔ نوشیرواں کی بابت لوگوں کا خیال تھا کہ ایران میں اس فلسفی بادشاہ کا ظہور ہو چکا ہے جس کا تصور افلاطون نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں پیش کیا تھا۔ اسی زمانے میں قسطنطین نے ایتھنز کا فلسفے کا مدرسہ بند کر دیا تھا اور وہاں کے ساتوں عظیم فلسفی جنہیں کافر قرار دے دیا گیا تھا وہاں سے نکل کر اس امید میں ایران آگئے تھے کہ وہاں انہیں اس شاہ موعود سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گا۔ لیکن بادشاہ سے ملاقات کے بعد انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ وہ افلاطونی تصورات کے مطابق ثابت نہ ہو سکا۔ یہ لوگ واپس روم لوٹ گئے۔ ایک بات ضرور ہے کہ نوشیرواں علم و دانش کا شائق تھا اور اس نے ایران میں فلسفہ اور علوم کے فروغ میں بہت حصہ لیا تھا۔ جندی شاہ پور کی یونیورسٹی کا قیام اس کی علم دوستی کا بین ثبوت ہے۔ شیخ سعدی کے فلسفہ اخلاق میں بار بار نوشیرواں اور بزرجمہر کا ذکر ملتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں تک اس دور کے حکیمانہ نقوش فارسی ادب پر موجود تھے۔

۶۲۸ء میں خسرو پرویز کی معزولی اور موت کے بعد ایران اندرونی فتنوں کا شکار ہو کر رہ گیا اور تین چار برس کے پر آشوب دور کے بعد یزدگرد (سوم) بر سرِ اقتدار آگیا (یہی سال رسول اللہ ﷺ کی رحلت کا سال ہے) اس نے ایران کے سنبھالنے کی کوشش کی مگر ساسانی سلطنت کی کمزوریاں اس پر حاوی ہو رہی تھیں۔ اہل مذہب (زرتشتی) عوام الناس کی کمائی کا اسی (۸۰) فیصد ظالمانہ ٹیکسوں کی صورت میں وصول کر کے آتش کدوں

کے شعلوں میں جھونک رہے تھے۔ طبقہ وارانہ نظام میں منافرت جڑ پکڑ چکی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندرونی کمزوریاں صدیوں پرانی عظیم سلطنت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ ۶۲۲ء (سال ہجرت نبویؐ) میں ہرقل کے ہاتھوں ایرانی شکست کے باعث سلطنت کے بحیرۂ روم کے ساحلی مقبوضات اور شام و فلسطین کا علاقہ ایرانیوں سے چھن چکا تھا۔ ۶۲۸ء سے لیکر ۶۳۲ء تک کی تاج و تخت کی کشمکش کے باعث شہنشاہ کی ذات کا طلسم و افسون ماند پڑ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بددعا کے باعث یہ سلطنت شکست و ریخت سے دوچار ہو چکی تھی۔ علاوہ بریں رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کی شکست کی قرآنی پیشین گوئی بھی پوری ہو چکی تھی۔ علامہ اقبال اس موقع پر فرماتے ہیں ؎

پیریٔ ایراں زمانِ یزدجرد
چہرۂ او بے فروغ از خونِ سرد

(یزدگرد کے عہد میں ایران پہ بڑھاپا طاری ہو چکا تھا۔ رگوں میں خون جم جانے کے باعث اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔)

دین و آئین و نظامِ اُو کہن
شید و تار و صبح و شامِ اُو کہن

(اس کا دین، دستور اور نظام حکومت سب فرسودہ ہو چکے تھے۔ اس کے دن، راتیں، تاریکیاں اور روشنیاں سب پرانے ہو چکے تھے)

موج مے در شیشۂ تاکش نبود
یک شرر در تودۂ خاکش نبود

(اس کے جام و مے میں شراب معنوی کی ایک بھی لہر نہ تھی۔ یہ مٹی کا ایک تودہ بن چکا تھا جس کی گہرائیوں میں ایک چنگاری بھی باقی نہیں بچی تھی۔)

تازہ صحرای رسیدش محشری
آں کہ داد او را حیاتِ دیگری

(اچانک صحرائے عرب سے اس پر قیامت نازل ہوئی اور اسی قیامت کے باعث اس کو ایک نئی زندگی مل گئی۔)

این چنیں حشر از عنایاتِ خداست
پارس باقی، رومتہ الکبریٰ کجاست
(اس طرح کی قیامت بھی خداوند تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے۔ آج فارس قائم و دائم ہے مگر رومتہ الکبریٰ کے آثار بھی محو ہو چکے ہیں۔)

مردِ صحرای بہ ایراں جاں دمید
باز سوئے ریگزارِ خود دمید
(صحرا کے باسیوں نے ایران کو نئی زندگی عطا کی اور پھر وہ اپنے صحرا کی جانب واپس لوٹ گئے۔)

کہنہ را از لوحِ ما بسترد و رفت
برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت
(تمام بوسیدہ اور پرانی تحریروں کو ہماری لوح سے مٹا کے چل دیئے اور ہمیں نئے زمانے میں زندگی گزارنے کا سامان مہیا کر گئے۔)

آہ احسان عرب نشناختند
از تشِ افرنگیاں بگداختند
(بعد کے دور میں ایرانی انگریزوں اور امریکا کے فریفتہ ہونے لگے اور عرب کے احسانات کو فراموش کر بیٹھے)

نوٹ : یہ علامہ اقبال کے زمانے کے ایران کی بابت کہا گیا جس پر آپ نے افسوس کا اظہار فرمایا ہے۔
(جاری ہے)

بقیہ : مسئلہ ایمان و کفر

ارتکاب کرنے والوں کے لئے سخت اور عبرتناک تعزیزی سزا تجویز کرے۔ اس کے لئے تعزیری قوانین میں ایک نئے قانون کا اضافہ ہونا چاہئے اور چونکہ کسی مسلمان کی تکفیر کرنا کوئی دینی عمل نہیں بلکہ غیر دینی عمل ہے لہٰذا اس کے انسداد کے لئے قانون وضع کرنا اور نافذ کرنا ہرگز مداخلت فی الدین نہیں بلکہ حمایت دین ہے۔ مسلمان اراکین پارلیمنٹ کو اس قسم کا قانون منظور کرنے میں ہرگز کوئی ہچکچاہٹ اور تذبذب و تامل کی روش نہیں ہونی چاہئے کیونکہ یہ بلاشبہ ایک نیک اور موجب اجر و ثواب عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے!

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ہدف

عدلِ اجتماعی

سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی روشنی میں

_____ محمد رشید عمر، امیر تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب غربی _____

قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر ایک وحدت کی صورت میں دس مقامات پر آیا ہے اور اس کو انبیاء و رسل کا فریضہ، ان کے اصحاب کی شان اور مسلمان اصحاب اقتدار کا کام اور اولین ذمہ داری شمار کیا گیا ہے۔ قوموں کی تباہی اور بربادی کے اسباب میں ایک بڑا سبب اسی فریضہ کی عدم ادائیگی ہے۔ امتِ مسلمہ کا فرض منصبی یہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر امت مل جل کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقاصد حاصل کر بھی لے تو بھی اس میں سے ایک گروہ تو بالکل اس مقصد کے لئے ہو جو معاشرہ میں ہونے والی تبدیلیوں پر باز کی سی نگاہ رکھے اور اس بات کا جائزہ لے کہ آیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تقاضے پورے ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اور اگر کسی لمحے وہ دیکھے کہ معاشرہ میں کسی طرف سے کوئی کمزوری پیدا ہو رہی ہے تو اس کی اصلاح کے لئے اصحاب اقتدار کو مجبور کرے کہ وہ اس خرابی کا تدارک کریں۔

"معروف" کے معانی ہیں جانا پہچانا۔ دینی اصطلاح میں بھلائی کے وہ کام جن کی بھلائی اور خیر سے انسانی نفسیات اچھی طرح واقف ہے "معروف" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح "المنکر" کے معانی غیر معروف کے ہیں۔ اصطلاحاً برائی کے وہ کام جن سے انسانی نفسیات واقف نہیں اور وہ ان سے متوحش ہوتی ہے "منکر" ہیں۔

بنیادی بھلائی کے وہ کون سے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر معاشرہ امن و سکون اور عدل و احترام کا مظہر بن جاتا ہے اور ان کو ترک کرکے معاشرہ تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے؟

کون سی ایسی برائیاں ہیں جن میں پڑ کر تباہی آجاتی ہے اور معاشرہ اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے اور ان سے بچ کر بقا اور استحکام کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے؟ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے تحت معروف کی فہرست میں گنوائے گئے اوامر اور منکر کے تحت گنوائے گئے نواہی کی فہراست پر غور اس عقدے کو حل کر سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ نحل کی آیت مبارکہ :

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝﴾ (آیت : ۹۰)

"یقیناً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا اور قرابت داروں کے حق ادا کرنے کا۔ اور روکتا ہے بے حیائی' برائی اور سرکشی سے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو!"

اس آیہ مبارکہ میں معروف کے ضمن میں تین کاموں کا حکم دیا گیا ہے۔ (۱) عدل کرنے کا (۲) احسان کرنے کا (۳) قریبی عزیزوں کے حقوق کی ادائیگی کا ـــــــ اور منکر کے ضمن میں بھی تین ہی باتوں سے روکا گیا ہے : (۱) بے حیائی سے (۲) برائی سے (۳) بغاوت اور سرکشی سے۔

سورۂ نحل مکی سورۃ ہے۔ مکی زندگی میں معاشرہ کے اندر عدل و انصاف اور انسانی حقوق کی پامالی' خود غرضی' بے حیائی' عریانی' شراب نوشی' بے ہودگی غرضیکہ معاشرہ کی شتر بے مہار کی سی کیفیت کے دوران اللہ کے ان اوامر و نواہی کا اعلان ہی سلیم الفطرت دلوں کو فتح کرنے کا ذریعہ بن رہا تھا' جبکہ بغاوت سے باز نہ آنے والوں کو اس پیغام میں پوشیدہ پروگرام سمجھ آرہا تھا کہ سراسر عدل کی پکار کی زد ان کی چودھراہٹوں پر ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ" کے سادہ سے الفاظ پر مبنی دعوت کے پیچھے انقلابی نظام زندگی ان کو نظر آرہا تھا۔ نبی کریم ﷺ افراد سے آگے بڑھ کر قبائل کے سامنے یہ پروگرام رکھ رہے تھے۔ الرحیق المختوم میں یہ واقعہ درج ہے۔

عامر بن صعصعہ کے لوگوں کو آپ نے دعوت پیش کی تو جواب میں ان کے ایک آدمی بحیرہ بن فراس نے کہا "خدا کی قسم اگر میں قریش کے اس جوان کو لے لوں تو اس کے

ذریعے پورے عرب کو کھا جاؤں گا"۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ "اچھا یہ بتایئے' اگر ہم آپ (ﷺ) سے آپ کے اس دین پر بیعت کرلیں' پھر اللہ آپ کو مخالفین پر غلبہ عطا فرمائے تو کیا آپ کے بعد زمام کار ہمارے ہاتھ میں ہوگی؟" آپ ﷺ نے فرمایا "زمامِ کار تو اللہ کے ہاتھ میں ہے' جہاں چاہے گا رکھے گا۔" اس پر اس شخص نے کہا "خوب! آپ کی حفاظت میں تو ہمارا سینہ اہل عرب کے نشانے پر رہے' لیکن جب اللہ آپ کو غلبہ عطا فرمائے تو زمام کار کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ ہمیں آپ کے دین کی ضرورت نہیں"۔ غرض انہوں نے انکار کردیا۔

معاشرتی بے راہ روی کے اس دور میں یہ قرآن عظیم ہی تھا جس کی آیات میں پورے عرب پر چھا جانے والا پروگرام جھلک رہا تھا۔ آخر نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑی انسانیت کو تباہی سے بچانا ہی تو تھا۔ اس حالت میں بچنے اور بقا کا جو فارمولا دیا جا رہا تھا وہ یہی تو تھا کہ اللہ حکم دے رہا ہے : ۱) عدل کرنے کا' ۲) احسان کرنے کا' ۳) قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا' اور روک رہا ہے: (۱) بے حیائی سے' (۲) برائی سے (۳) اور بغاوت اور سرکشی سے۔ ترتیب وار ان نکات پر غور کیجئے۔ عدل و انصاف کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ہیں۔ لیکن عدل کا لفظ انصاف سے الگ اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ انصاف کا مطلب مساوات ہے' جبکہ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ جو جس کا حق اور مقام ہے وہ اسے دیا جائے۔ عدل سے انسانی نفسیات میں سکون اور اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ عدل کے معاملے کو اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں لے آیئے۔ انتظامی معاملات ہیں۔ عدالتی نظام ہے۔ تعلیم اور تحقیق کے شعبے ہیں۔ ان کے صحیح رخ پر چلنے اور معاشرہ میں امن و سکون کے لئے ممد اور مفید ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ ہر جگہ عدل کی روح کار فرما ہو۔

احسان عدل سے اگلا قدم ہے۔ عدل کا مطلب اگر حقوق کی پوری پوری ادائیگی ہے تو احسان کی حالت اس سے زیادہ کا تقاضا کرتی ہے۔ حقوق کی ادائیگی میں ایثار اور قربانی کی روح شامل ہوگی تو وہ احسان ہوگا۔ معاشرتی زندگی میں اس کا ظہور کیسے ہوتا ہے؟ اگر آپ تاجر ہیں تو نہ صرف پورا ناپنا بلکہ ناپ سے زیادہ دینا' نمونہ سے زیادہ بہتر مال مہیا

کرنا، قرض اور لین دین میں نرمی اور جائز منافع لینا احسان ہوگا۔ جبکہ ملاوٹ، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، اصل کی بجائے نقلی مال دینا، جھوٹ اور بدعہدی ایک برعکس طرز عمل کی تصویر ہیں۔

تیسرا حکم باری تعالیٰ کی طرف سے قریبی رشتہ داروں کو ادائیگی کا حکم ہے۔ یہاں اس ادائیگی سے مراد محض محتاج اور ضرورت مند عزیزوں کی ضرورتیں پوری کرنا یا ان کی مالی امداد کرنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ کئی عزیز یقیناً آپ سے زیادہ آسودہ حال ہوں گے۔ یہاں جو مجرد "ادائیگی" کا حکم ہے، اس کا مطلب حقوق کی ادائیگی ہے، جس میں مالی معاونت بھی بہرحال شامل ہے۔ حقوق کی ادائیگی کا تعلق تو ہر چھوٹے بڑے، امیر و غریب سے ہے اور رشتہ داری میں حقوق کی ادائیگی ہی باہمی انتشار کو روک کر محبت و الفت کے تعلقات کو مضبوط کر سکتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے والوں سے ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ عامتہ الناس کے حقوق کا بھی خیال رکھیں گے۔

نواہی کی فہرست میں پہلی برائی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ "فَحْشَاء" یعنی بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ اس میں ہر وہ برائی شامل ہے جو فحش ہو۔ مثلاً زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، بدنظری، شراب نوشی، بدکلامی، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاری پر ابھارنے والا تصنیف شدہ مواد، ڈرامے اور فلمیں، عورتوں کا بن سنور کر مردوں سے میل جول وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ "فحشاء" میں ان سب باتوں سے منع فرما دیا۔ دوسری چیز "منکر" ہے یعنی ہر وہ برائی جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں اور ہر سلیم الفطرت انسان جس سے گھن کھاتا ہے۔ تیسری چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ "بغی" ہے، جس کے معنی بغاوت و سرکشی، اپنی حدود سے تجاوز، بدنظمی اور ہلڑبازی کے ہیں۔ گویا معاشرے کی شتر بے مہار کی سی کیفیت، قتل و غارت گری، چوری اور ڈکیتیاں اسی روش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ سورۂ نحل کی اس آیہ مبارکہ میں بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر خیر اور ہر شر کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اس آیہ مبارکہ کو "آیۂ عدل" کا نام دے دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ عدل ہی وہ جامع لفظ ہے کہ جس کی عملی کارفرمائی کے ذریعے بیان کردہ تمام اوامر و نواہی کے مقاصد

پورے ہو جاتے ہیں۔

جس طرح رات کے مقابل دن ہے' ایسے ہی ظلم کے مدِ مقابل لفظ عدل ہے۔ ظلم کا مطلب کسی کا جائز حق اور مقام نہ دینا ہے اور دنیا کے اندر سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ جب انسان اللہ کے لائق مقام رفیع پر دوسری ہستیوں کو لا بٹھائے' ان کے حلال و حرام کو اللہ کے حلال و حرام کے برابر جان لے' ان سے ایسے ڈرنے لگے جیسے اللہ سے ڈرنا چاہئے' ان کو اپنا کارساز اور حاجت روا مان لے تو یہ سب سے بڑا ظلم ہے' جو حضرت انسان سے روئے زمین پر سرزد ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں عدل یہ ہے کہ اللہ کے حقوق کی پاسداری کی جائے' کسی ہستی کو اس کا ضِد اور نِد نہ مانا جائے' اس کے حکم کے خلاف کسی کے حکم کو واجب الاتباع نہ مانا جائے' تمام شعبوں میں اسی کے احکامات اور حلال و حرام کی قیود کی پابندی کی جائے' اسی کو کارساز اور حاجت روا تسلیم کیا جائے۔ گویا اللہ کی وحدانیت کا اقرار صرف زبان ہی سے نہ ہو رہا ہو' بلکہ اس کے عملی تقاضے بھی پورے کئے جا رہے ہوں تو یہ عدل ہے۔ اس عدل کے ہوتے ہوئے ہی معاشرتی زندگی کے دوسرے شعبے میں عدل پر قائم رہ سکتے ہیں۔

اس اعتبار سے ایک نظر پہلی امتوں کے انجام پر بھی ڈال لیجئے۔ قوم نوحؑ اور قوم عاد کی تباہی کا سبب اللہ کے حقوق کی عدم ادائیگی اور اس کے خلاف بغاوت' قوم لوطؑ کی تباہی کا سبب جنسی بے حیائی اور قتل و غارت' قوم صالحؑ کی تباہی کا سبب بھی بغاوت و سرکشی' قوم شعیبؑ کی تباہی کا سبب حسن معاملہ کی بجائے ناپ تول میں کمی' فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کا سبب اللہ کے حقوق کے بارے میں زیادتی اور بنی اسرائیل کو بنیادی حقوق سے محروم کر دینا تھا۔ الغرض کسی قوم یا امت کی تباہی کے اسباب پر نظر ڈالیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس آیہ مبارکہ میں دیئے گئے چھ نکاتی پروگرام سے انحراف ہی ان کی تباہی کا سبب بنا۔ مذکورہ بالا آیت مبارکہ مکی دور کی ہے جہاں آپ ﷺ کی ذمہ داری یہ تھی کہ : "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ" (شوریٰ : ۱۵) "مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔" اس دور میں موٹے موٹے بنیادی اصول دیئے جا رہے تھے۔ مدنی دور میں نازل ہونے والی قرآنی سورتوں میں تفصیلی احکام اور قوانین دے کر

خلافتِ الٰہیہ کا دستور مکمل کر دیا گیا جو عدل اجتماعی کا آئینہ دار تھا۔ آج ہم اپنا جائزہ لیں تو معاشرہ کی جو تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ من حیث القوم ہم سب سے بڑے ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہم نے حلال و حرام کی قیود کو توڑ رکھا ہے' اللہ کے احکامات کے مقابلے میں دوسروں کے احکامات کی پیروی کر رہے ہیں' اللہ کے سوا دوسروں کے آگے کشکول گدائی لئے پھرتے ہیں۔ اس بڑے ظلم کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ ہم زندگی کے دوسرے شعبوں میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر سکیں۔ چنانچہ وہاں بھی ہم نے کھلے بندوں ظلم و ستم' بد معاملگی' دوسروں کے حقوق کی پاسداری نہ کرنا' بے حیائی اور برائی کے چلن کو عام کیا ہوا ہے۔ اس حالت میں اگر معاشرہ کو تباہی سے بچانا ہے تو پھر اپنے فرض منصبی کو پہچاننا ہو گا' جو قرآن حکیم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اور اگر پوری امت اس کام کے لئے نہیں اٹھ رہی تو امت میں سے ایک جماعت تو ایسی لازماً ہونی چاہئے جو یہ فریضہ ادا کرتی رہے۔ فرمایا :

﴿ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۰۴)

"تم میں سے ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

ظلم کے اس دور میں کامیابی حاصل کرنے والے صرف وہ لوگ ہیں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوں' یعنی عدل اجتماعی کا جھنڈا سربلند کرنے کے لئے مصروفِ عمل ہوں۔

سورۂ نحل کی مذکورہ بالا آیۂ مبارکہ میں جو چھ نکاتی ایجنڈا دیا گیا ہے اس کی افادیت سے کوئی بھی سلیم الفطرت انسان انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کام فرقہ واریت اور مسلکی تعصب سے بالاتر ہو کر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پروگرام میں مشتہیاتِ نفس کا بھی پورا سامان موجود ہے۔ غلبہ اور امن و سکون نفس انسانی کی مرغوبات ہیں۔ اس پیغام کو مُجَیّرہ بن فراس نے پڑھ لیا تھا۔ آج تو عملی مثال کی شکل میں خلاف راشدہ کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔

قرآن پاک میں جہاں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے 'نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ وغیرھم کو اس میں شامل نہیں کیا گیا' بلکہ ان کا حکم علیحدہ سے دیا گیا ہے۔ اگر ان ارکان اسلام کو ہم بندگیٔ رب کا نام دیتے ہیں تو عدل اجتماعی قائم کئے بغیر بندگی رب کا یہ ہدف کسی صورت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایک ایسے معاشرہ کا تصور کیجئے جس میں بے حیائی' برائی اور بد معاملگی کا چلن عام ہو اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہو' اس میں کوئی انسان ذکر و فکر میں مست اللہ کی رضا کا طالب بنا بیٹھا ہو اور اسے اپنی پرہیزگاری اور تقویٰ کا بھی زعم ہو' تو کیا ایسا انسان اپنے مقصود کو پا سکتا ہے' جبکہ ظلم و زیادتی کے دور میں اس کو رزق حلال بھی میسر نہ آ رہا ہو۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر غور کیجئے :

((الرجل يطيل السفرَ اَشعثَ اَغبرَ' يمدّيديه الى السّماءِ : يا ربّ! يا ربّ! ومَطعمه حرامٌ ومَشربهُ حرامٌ ومَلبسهُ حرامٌ وغُذِيَ بالحرام' فانّىٰ يُستجاب لَه!))

(مسلم اور ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا)

"ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار آلود پراگندہ مو آتا ہے۔ اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگتا ہے : یارب! یارب! مگر حال یہ ہوتا ہے کہ روٹی اس کی حرام کی' کپڑے اس کے حرام کے اور جسم اس کا حرام غذا سے پلا ہوا۔ اب کس طرح ایسے شخص کی دعا قبول ہو؟"

اب ملاحظہ کیجئے یہ حدیث مبارکہ :

عن حذيفة رضى اللّٰه عنه عن النبىّ صلى اللّٰه عليه

وسلم قال : ((وَالّذی نفسی بیدہٖ لتأمرنَّ بالمعروفِ ولتنھونَّ عن المنکرِ اوْ لیوشکنّ اللّٰہُ اَن یبعثَ علیکم عقاباً منہ ثم تدعونہُ فلا یُستجاب لکم))

(ترمذی۔ حدیث حسن)

"حضرت حذیفہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا : اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہو گا اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہو گا' ورنہ اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تم پر اپنی جانب سے ایک بڑا شدید عذاب بھیجے' پھر تم اسے پکارو لیکن تمہاری دعا قبول نہ ہو۔"

اس طرح ظلم کے نظام میں جکڑا ہوا کوئی فرد اللہ کی بندگی کرنا بھی چاہے تو وہ اس کام کے لئے ظلم کے پنجے سے آزادی حاصل نہیں کر پاتا۔ اس لئے بندگی رب اور انسانوں کی غلامی سے نجات صرف اور صرف نظامِ عدل کے ذریعے ممکن ہے' جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل ہدف ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کے ان مقامات اور رسول کریم ﷺ کی ان احادیث کا تعلق ہے جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مخاطب فردِ واحد نظر آتا ہے' تو اس کے لئے جان لینا چاہئے کہ اولاً فردِ واحد یہ ذمہ داری اس وقت ادا کر سکتا ہے جب حکومتی سطح پر تمام معاملات عدل اجتماعی کے مطابق چل رہے ہوں۔ بصورتِ دیگر افراد کے بس میں یہ نہیں ہے کہ برائی کے خلاف بند باندھ سکیں۔ اس لئے کہ ظلم پر مبنی معاملات اور سکیموں کو حکومت کا تحفظ اور لائسنس حاصل ہوتا ہے۔ اس صورت میں ایسے تمام افراد جن میں اس ذمہ داری کے ادا کرنے کا شعور اجاگر ہو جائے وہ ایک امیر کی امارت میں منظم ہوں اور اس عظیم انقلابی مشن کو انتہائی سلیقے اور طریقے سے لے کر آگے بڑھیں' تاکہ حکومت وقت بھی ایسی طاقت کے سامنے خائف نظر آئے اور ان کی اجتماعیت عوام کے سامنے بھی عدل کا نمونہ پیش کر کے ان کو اپنا پیرو کار بنا سکے۔

امام شامل رح (۲)

امام شامل رح کے حالات زندگی پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کرنل محمد حامد کی کتاب کا ترجمہ و تلخیص

ترتیب و ترجمہ : اظہار احمد قریشی

امام شامل رح کی شخصیت پر لیسلے برانچ کی مشہور زمانہ کتاب The Sabres of Paradise کے قریباً ایک تہائی حصے کا ترجمہ ابھی میں نے مکمل کیا تھا کہ کرنل محمد حامد صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا کہ لیسلے برانچ کی کتاب قابل اعتبار نہیں۔ وہ مستشرقین کے سے حربے استعمال کر کے ہمارے ہیروز کی تعریف تو کرتی ہے لیکن پھر ڈنک بھی مارتی ہے۔ اس رائے کا اظہار انہوں نے جناب سعید شامل صاحب جو امام شامل کے پوتے تھے' کے حوالے سے بھی کیا۔ جناب سعید شامل قریباً دس برس قبل وفات پا چکے ہیں۔ ان کی علامہ اقبال مرحوم سے بھی دوستی تھی اور یہ موتمر عالم اسلامی کے اولین ارکان میں سے تھے۔ ملاقات میں کرنل صاحب نے مجھے بتلایا کہ لیسلے برانچ کی کتاب میں ایک واقعہ درج ہے جو کرنل صاحب نے اپنی کتاب میں بھی درج کیا ہے۔ لیکن اب ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ چنانچہ وہ اب اپنی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں سے اسے حذف کر دیں گے۔

واقعہ یوں لکھا ہوا ہے کہ حضرت امام شامل صاحب جن دنوں ایک بڑے علاقے کے حکمران تھے۔ ان کے علاقے کا ایک سرحدی حصہ دشمن کے گھیرے میں آ گیا۔ چنانچہ وہاں کے لوگوں کے لئے جان بچانے کا واحد راستہ یہ تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ اس کے لئے انہیں امام صاحب کی اجازت درکار تھی۔ لیکن انہیں معلوم تھا کہ امام صاحب ہتھیار ڈالنے کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے کسی میں بھی امام صاحب کے پاس جا کر یہ تجویز دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اس پر انہیں یہ سوجھا کہ امام صاحب کی والدہ بہت نرم دل ہیں' ان کی معرفت درخواست کی جائے۔

امام صاحب کی والدہ بیٹے سے بات کرنے پر راضی ہو گئیں اور انہوں نے بات کی۔

بات سنتے ہی امام صاحب مسجد چلے گئے کہ نبی کریم ﷺ سے حکم حاصل کریں اور تین دن بعد نکل کر مجمع سے کہا کہ مجھے حکم مل گیا ہے کہ جس نے سب سے پہلے مجھ سے ہتھیار ڈالنے کی بات کی ہے اس کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ چنانچہ ان کی والدہ کو کوڑے لگائے گئے اور وہ پانچ ہی کوڑوں پر بے ہوش ہو گئیں۔ اس پر امام صاحب نے بقایا کوڑے اپنی والدہ کی طرف سے خود کو لگوائے۔ جو لوگ ہتھیار ڈالنے کی تجویز لے کر آئے تھے وہ یہ تمام کچھ دیکھتے رہے اور انہیں کچھ نہیں کہا گیا۔

کرنل صاحب کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ہی غلط ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نمک مرچ لگانے والے کیا کیا اختراعات کر سکتے ہیں۔

کرنل صاحب کے بیان کے مطابق حضرت امام شامل جناب مجدد الف ثانی کے چوتھے درجے میں سلسلہ نقشبندیہ کے خلیفہ تھے۔ کس قدر وسیع علاقے پر یہ سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور ان کی بدولت کیسی کیسی شخصیات ابھریں۔ کرنل صاحب بھی اس سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مجھے مرحوم خرم مراد صاحب کے بیٹے حسن صہیب مراد صاحب نے بتلایا کہ حضرت امام شامل کی جنگی چالیں اس قدر کامیاب اور اس قدر مدبرانہ تھیں کہ یہ اب یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

حضرت امام صاحب کے جنگی کارنامے نقشہ کی مدد کے بغیر اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کرنل محمد حامد صاحب کی کتاب تو نقشہ سے قطعی خالی ہے۔ لیسلے برانچ کی کتاب میں نقشہ برائے نام ہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے مفصل نقشہ جات حاصل کر کے پیش کروں۔ میں کرنل حامد صاحب سے بھی درخواست کروں گا کہ چونکہ انہوں نے اس میدان میں بہت دشت نوردی کی ہے' وہ مدد اور راہنمائی فرمائیں۔ پاکستان سے کچھ شوقین ٹورسٹ حضرات کو چاہئے کہ وہ خود جا کر حضرت امام شامل رحمتہ اللہ علیہ کے تیس سالہ جہاد کے مشہور مقامات مثلاً ڈارگو' اکھلگو' غمری وغیرہ کی زیارت کریں۔ مشکل ترین پہاڑی اور جنگلاتی سلسلوں کو دیکھیں۔ فوٹو لیں' فلمیں بنائیں اور مسلمانوں کی تاریخ کے اس تابناک باب کو اس کی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں۔

پچھلے دنوں رسالہ "افکار معلم" میں حضرت سید احمد شہید کے سفر برائے جہاد' یوپی سے شروع کر کے راجپوتانہ اور سندھ اور پھر شمال کی جانب پشاور کی سمت سارے سفر کے مقامات قیام گنوائے گئے تھے۔ میں نے ایڈیٹر صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ نقشہ بھی دیں اور یہ بھی بتلائیں کہ حضرت کے ساتھ کتنے آدمی اور کتنا سامان تھا اور بھی کچھ

تفصیلات دیں۔ یہ تو ہمارا اپنا ملک ہے جس میں جہاد کیا گیا تھا اور ابھی اس جہاد کو جمعہ جمعہ آٹھ ہی دن تو ہوئے ہیں۔ ابھی تو بہت کچھ معلومات سینہ بہ سینہ سے بھی مل سکتی ہیں۔
میں نے محترم مسلم سجاد صاحب ایڈیٹر رسالہ ترجمان القرآن سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ مجھے حضرت امام شامل صاحب کے متعلق جہاں سے بھی اچھی اور مستند کتابیں مل سکتی ہوں منگوا دیں۔ میں برخوردار عزیزم عاکف سعید سے بھی یہ درخواست کرتا ہوں۔ میں عزیزم سلمان بن نور محمد صاحب جو امریکہ میں کاروبار کر رہے ہیں، سے بھی یہی درخواست کر رہا ہوں۔
میری تمام تر دلچسپی حضرت امام شامل رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے ہے جو بھی پھول مل سکے گا وہ میں گلدستہ میں سجانے کی کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس عظیم شخصیت کے عزم، حوصلہ اور تدبر میں سے کچھ عنایت فرما دے۔ آمین ثم آمین ـــــــ اظہار احمد قریشی

روسی فوج کی بدلہ لینے کی کارروائی کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد نذران سے ۹۰۰۰ فوجی ۲۸ توپوں کے ساتھ چیچنیا کے زیریں علاقے کو تہ و بالا کرنے کے لئے ۱۸۳۲ء میں روانہ ہوئے۔

روس ایک بہت بڑی طاقت تھی، یہاں تک کہ ہندوستان پر قابض انگریز بھی ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں روس ادھر کا رخ نہ کرلے۔ روس کے ہندوستان آنے کا راستہ یہی تھا جس پر سے گزرنا مجاہدین نے بے حد مشکل بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں روسیوں کی جنگلات میں بنی ہوئی سڑکیں نہیں تھیں۔ اس سے دس بارہ سال قبل انہوں نے کافی چوڑا راستہ جنگلات میں بنایا تھا لیکن اس میں اب تک پھر بہت گھنا جنگل اگ آیا تھا جس میں سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ روسیوں کو جنگلات کی انتہائی مشکل لڑائی لڑنی پڑی۔ چیچن بڑے بہادر تھے، ان کے جنگلات اور ان کے پہاڑوں میں دنیا کی کوئی فوج ان کو نیچا نہیں دکھا سکتی تھی۔ وہ زبردست نشانہ باز، انتہائی نڈر، فوجی معاملات میں بے حد ذہین تھے اور مقامی حالات سے فوراً فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ روسیوں کی ہر غلطی پکڑ لیتے اور انتہائی سرعت سے اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

روسی فوج کا راستہ گھنے جنگل میں سے گزرتا تھا' جس میں بہت اونچے درخت تھے۔ رستہ میں مجاہدین سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ مجاہدین جنگل سے فائر کرتے تھے اور فوج کے آدمیوں کا نقصان ہوتا تھا۔ لیکن مجاہدین نظر نہیں آتے تھے۔ جنگل سے جہاں دھواں اٹھتا نظر آتا' وہاں اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں مجاہدین ہیں۔ روسی سپاہی بس اس دھوئیں کا نشانہ لے کر فائر کرتے تھے۔

روسی فوج جہاں پڑاؤ کرتی تھی وہاں سے وہ چھوٹے چھوٹے دستے اطراف کے گاؤں تباہ کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔ یہ دستے مجاہدین کے سر تو اکٹھے کرلاتے تھے لیکن کوئی قیدی نہیں پکڑ سکتے تھے کیونکہ کوئی مجاہد ہتھیار نہیں ڈالتا تھا' آخر دم تک لڑتا تھا۔

فوج کے پڑاؤ کی جگہ پر رات کو مجاہدین کے اچانک حملہ سے بچنے کے لئے سخت حفاظتی تدابیر کی جاتی تھیں لیکن چیچن لوگ پھر بھی رینگتے ہوئے کیمپ تک پہنچ جاتے تھے۔ فوج کو پانی' چارہ اور ایندھن حاصل کرنے کے لئے بھی مزدوروں کی حفاظت کی خاطر فوجی دستے بھیجنے پڑتے تھے۔ چیچن بڑے بہادر اور انتھک لڑاکے تھے۔ وہ روسیوں کو سبق سکھاتے تھے کہ وہ ان کی آزادی اور مذہب میں مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے۔

فوج کے مارچ کے دوران ان کے اگلے حصے' پچھلے حصے اور دونوں اطراف سے سخت حفاظتی اقدامات کئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی روسی سپاہی فوج سے بچھڑ جاتے تھے تو چیچن (جیسے موقع کی تلاش میں ہی ہوں) فوراً ان بچھڑے سپاہیوں کو پکڑ لیتے اور ان کی مدد پہنچنے سے قبل ان کے ٹکڑے کر دیتے تھے۔ یہ ساری کارروائی گھنے جنگل میں ہوتی تھی۔

۱۸۳۲ء کے کسی مہینے (غالباً جون جولائی) کی ۱۸ تاریخ کو حضرت امام قاضی ملا کو آخری کامیابی نصیب ہوئی۔ روسی فوج پر اچانک حملہ کر کے انہوں نے ۵۰۰ روسی فوجیوں کو اپنا تعاقب کرنے کی ترغیب دلائی اور انہیں جنگلوں میں بیس میل تک اندر لے گئے اور وہاں تمام اطراف سے ان پر حملہ کر کے انہیں مکمل شکست دے دی۔ اس کارروائی میں ۱۴۹ روسی قتل یا زخمی ہوئے۔

روسیوں کی اسی مہم کے دوران چھ روز بعد انہوں نے چیچنیا کی ایک بڑی بستی پر

حملہ کیا جس میں چھ سو مکانات تھے۔ حضرت امام قاضی ملا صاحب نے کمک بھیجی لیکن یہ علاقہ خاصا ہموار تھا اور مجاہدین کے پاس توپ خانہ نہیں تھا چنانچہ مقابلہ نہیں کیا جا سکا لیکن مجاہدین نے زبردست بہادری کی مثالیں قائم کیں۔ اس بستی کے ایک کنارے پر تین مکانوں میں چیچن اور داغستانی مجاہدین تھے جن کی تعداد ۷۸ تھی۔

اگرچہ مجاہدین ان تین مکانوں میں محصور ہو گئے تھے لیکن وہاں سے روسی فوج پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے اور کسی قسم کی صلح سے انکاری تھے۔ ان کی فائرنگ سے ایک روسی لیفٹیننٹ کرنل مر گیا اور کئی سپاہی زخمی ہوئے۔ اس پر فوج کے بڑے افسر موقع پر پہنچے۔ روسیوں نے ہر طرف سے ان تین مکانوں کو گھیرا ہوا تھا اور ان کے سپاہی اوٹ لے کر زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ کسی میں جرات نہیں تھی کہ مجاہدین کا بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر سامنا کرے، کیونکہ مجاہدین نشانے کے پکے تھے۔

روسیوں نے ایک ہلکی توپ کا گولہ داغا، جو تینوں مکانوں کے پار چلا گیا۔ لیکن اس سے دوسری جانب روسی سپاہیوں کو بھی نقصان پہنچا۔ روسی اگر اپنا محاصرہ توڑ کر توپ استعمال کرتے تو مجاہدین کو نکل بھاگنے کا موقع مل جاتا۔ چنانچہ تجویز کیا گیا کہ ان مکانات کو آگ لگا دی جائے۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس کے لئے لوہے کی چادروں کی ڈھال بنائی گئی جس کے پیچھے روسی سپاہیوں نے آگے بڑھ کر آگ لگائی۔ اس کے علاوہ کچھ روسی سپاہی مکانوں پر چڑھ گئے اور انہوں نے چمنی کے راستے ہینڈ گرنیڈ اندر پھینکے۔ جن میں سے دو تو پھٹے باقیوں پر مجاہدین بیٹھ گئے اور ان کو پھٹنے سے روکا۔ آگ پھیلتی گئی اور مجاہدین کے لئے ہتھیار ڈالنے کے علاوہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں رہا۔

اس پر روسیوں نے ایک ترجمان کے ذریعہ بات کرنی چاہی۔ اس پر فائرنگ رک گئی۔ روسیوں نے پیغام دیا کہ آپ لوگ ہتھیار ڈال دیں تو آپ کی جانیں محفوظ رہیں گی اور آپ کے لئے خاص رعایت یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کے تبادلے میں آپ اپنے گھروں کو بھی جا سکیں گے۔

اس کے جواب میں ایک نیم برہنہ چیچن، جس کا جسم دھوئیں سے سیاہ ہو گیا تھا باہر آیا اور اس نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا مطلب یہ تھا کہ "ہم آپ لوگوں سے کوئی رعایت

نہیں مانگتے۔ ہماری آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ آپ ہمارے خاندانوں کو بتلا دیں کہ ہم نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی' جس بہادری سے ہم زندہ رہے اسی بہادری سے مرے اور ہم نے اجنبی لوگوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔"

روسیوں نے چاروں طرف سے فائر کرنے کا حکم دے دیا۔ چیچنیوں نے مرنے کا پکا ارادہ کرلیا اور اپنا موت کا نغمہ شروع کرلیا جو شروع میں بلند آواز میں تھا لیکن جوں جوں ان کی تعداد آگ اور دھوئیں کے اثر سے کم ہوتی گئی' آواز بھی کم ہوتی گئی۔ البتہ آگ سے موت بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے جو ہر ایک برداشت نہیں کر سکتا۔ اچانک ایک جلتے ہوئے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے روسیوں پر ایک فائر کیا اور اپنی تلوار لہراتا ہوا یہ چیچن روسیوں کی جانب دوڑا۔ اس کے ننگے سینہ پر گولی لگی۔ یہ اونچا اچھلا' گرا' پھر اٹھا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ آگے کی جانب جھکا اور گر کر مرگیا ـــــ پانچ منٹ بعد یہی منظر دہرایا گیا۔ اس مرتبہ چیچن سنگینوں پر ختم ہوا۔

جلتے ہوئے مکانات گرنے لگے اور شعلے چاروں طرف بکھرنے لگے۔ دھواں دینے والے کھنڈرات میں سے چھ زخمی داغستانی رینگتے ہوئے نکلے جو کسی معجزہ کے تحت ہی زندہ تھے۔ روسی فوجیوں نے ان کو اٹھالیا اور ایمبولینس تک پہنچایا۔ چیچن ایک بھی زندہ ہاتھ نہیں آیا۔ ۷۲ انسانوں نے اپنے آپ کو شعلوں کی نذر کیا۔

متعدد روسیوں کو بعد میں یہ خیال آیا کہ ایسا ظلم کیوں ہو رہا ہے۔ کیا اس زمین پر آزادی کے متوالوں کے لئے جگہ نہیں ہے کہ وہ آزادی سے رہ سکیں۔ روسیوں نے چیچنیوں کے باغات ان کے خون سے رنگین کردیئے۔ جن گھروں میں لوگ خوش خوش رہتے تھے ان کو ملبہ بنادیا۔ لیکن روسیوں کے خلاف ان کے دل کی نفرت کی ان کے خون سے آبیاری ہوئی اور وہ آج تک ان کے گیتوں میں شامل ہے۔ "شہید مرا نہیں کرتے۔ وہ اب تک لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔" ان کی تعریف میں گانے گائے جاتے ہیں' عورتیں اپنے بچوں کو ان کی کہانیاں سناتی ہیں اور ان میں وہی جذبات پیدا کرتی ہیں جن سے پچھلی صدی میں ان کے پہاڑوں پر روسی حملہ کے مقابلے میں مدافعت کی گئی تھی۔

اس مہم کے نتیجہ میں روسی ۸۰ گاؤں پر عارضی قبضہ کر سکے۔ ۱۶ گاؤں کو انہوں نے

مکمل تباہ کر دیا اور ان کے ۳۶۸ آدمی قتل یا زخمی ہوئے۔

غمری کا معرکہ

اب تاریخ آگے چلتی ہے اور مشہور معرکہ غمری پیش آتا ہے۔ حضرت امام قاضی ملا اور جناب شامل صاحب غمری کی حفاظت کی تیاری کرنے لگے کیونکہ ادھر روسی حملے کا خطرہ تھا۔ امام قاضی ملا صاحب شہادت کی بڑی تمنا رکھتے تھے۔ انہوں نے مورچے بنائے جن میں مجاہدین تھے۔ روسی فوج نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے کوئی رعایت نہیں مانگی اور نہ ان کو رعایت دی گئی۔ یہ ایک ایک دو دو کر کے نکلتے تھے اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے تھے۔ ان میں سے صرف دو آدمی بچے، جن میں سے ایک ہمارے ہیرو شامل صاحب تھے۔ ان کی حیرت انگیز جسمانی طاقت، پھرتی، اور تلوار کے دھنی ہونے کی وجہ سے وہ بچ سکے۔ وہ ایک شیر کی مانند فوج کے عقب پر حملہ آور ہوئے۔ مڑ کر انہوں نے تلوار کے وار سے تین روسی سپاہی قتل کر دیئے لیکن چوتھے سپاہی نے سنگین شامل صاحب کے سینہ کے پار کر دی۔ اسی حالت میں بھی شامل صاحب نے سنگین کو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے سنگین کے مالک کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے سنگین کو سینہ سے کھینچ کر نکالا اور جنگل میں غائب ہو گئے۔ سینہ کے اس زخم کے علاوہ ان کی ایک پسلی اور ایک شانہ پتھر سے زخمی تھے۔

تین دن چھپے رہنے کے بعد شامل صاحب ایک شہر میں پہنچ گئے اور وہاں ۲۵ دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ روسی سنگین ان کے ایک پھیپھڑے میں سے گزر گئی تھی۔ شامل صاحب کے سسر عبدالعزیز بڑے مشہور سرجن تھے۔ ان کے پاس زخم ٹھیک کرنے کے بڑے کامیاب نسخے تھے۔ ان کے بنے ہوئے مرہم روسی ڈاکٹر بھی مانگ کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ شامل صاحب صحت یاب ہو گئے۔

حضرت امام قاضی ملا کی شہادت

مورچہ میں لاشوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ان مردوں میں ایک نماز کی حالت میں پایا گیا۔ ایک ہاتھ داڑھی پر تھا اور دوسرا ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ جب کچھ مقامی لوگ

بلائے گئے کہ وہ لاشوں کو پہچانیں تو وہ بہت ڈر گئے اور انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ کیونکہ یہ عجیب و غریب مردہ جسم امام قاضی ملا صاحب کا تھا۔ انہیں یقین نہ آیا کہ امام قاضی ملا صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایسا ہی حضرت سید احمد شہید کے ساتھ ہوا تھا کہ ان کے بہت سے پیروکاروں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ان کی شہادت واقع ہو چکی ہے۔

امام قاضی ملا صاحب کی لاش روسیوں نے لے جا کر اپنے علاقے میں دفن کر دی۔ بعد میں شامل صاحب نے ۲۰۰ سوار بھیج کر قبر کھود کر لاش غمری لا کر دفن کر دی۔ روسیوں کے ۴۵۱ آدمی قتل یا زخمی ہوئے۔ مجاہدین نے ۱۹۲ آدمی شہید کروائے۔ اس جنگ میں امام شامل سخت زخمی ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید اب زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ تحریک جہاد کے اس نازک وقت جناب ہمزاد بیگ امام بنا لئے گئے۔ ان کے دور میں کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا۔ بدقسمتی سے جناب امام ہمزاد بیگ ایک مسجد میں ایک سازش کے تحت قتل ہو گئے۔ اس وقت شامل صاحب کہیں دور تھے۔ وہ کچھ مجاہد جمع کر کے پہنچے اور یہاں ان کو امام بنا لیا گیا۔

حضرت امام شامل نے اس وقت جب وہ امام نہیں تھے' وقت کے امام کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ وہ امام بننے کے خواہشمند نہیں تھے۔ وہ تو بس خدا کے راستے کے ایک مجاہد تھے۔

(جاری ہے)

"ہم بیس دنوں میں 170 میل پیدل سفر کر کے پاکستان پہنچے"

امیر تنظیم اسلامی کے افکار

انٹرویو کے آئینے میں

پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالے سے 17 جولائی کو روزنامہ "جنگ" میں شائع ہونے والا انٹرویو

☆ آپ نے پاکستان بنتے دیکھا ہے آپ کے نزدیک قیام پاکستان کے مقاصد کیا تھے؟

○ قیام پاکستان کے مقاصد میں دو چیزیں گڈمڈ ہیں۔ پہلا ہندوستان کے مسلمانوں کا معاشی' سماجی اور مذہبی تحفظ' دوم اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے تعین کر کے عالمی انسانیت کے لئے روشنی کا مینار بنا دینا۔ مقدم الذکر یعنی مسلمانوں کا معاشی' سماجی اور مذہبی تحفظ قائداعظم کی سوچ میں غالب تھا اور موخر الذکر مقصد مصور پاکستان علامہ اقبال کا تھا۔ یعنی دونوں مقصد کرنٹ کے نیگیٹیو اور پازیٹو فیز ہیں جیسا کہ بجلی بھی دونوں سے بنتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلا مقصد کچھ حد تک ضرور حاصل ہو گیا یعنی مسلمانوں کی معاشی خوشحالی' سیاسی خود اختیاری اور سماجی تحفظ کسی حد تک حاصل ہو گیا۔

☆ آپ نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے جو فرمایا ہے کیا اس سے دونوں شخصیات میں تضاد سمجھا جا سکتا ہے؟

○ دونوں میں تضاد نہیں لیکن دونوں کے تقاضے فوری طور پر مختلف ہو سکتے ہیں' علامہ اقبال چونکہ مفکر' فلسفی اور حکیم الامت تھے جب کہ ان کے پیش نظر پوری امت کا احیاء اور اسلام کا عملاً قیام تھا اور انہیں باتوں کے تابع ان کی سوچ تھی جب کہ قائداعظم نہ فلسفی تھے اور نہ ہی مفکر بلکہ وہ صرف "سٹیٹس مین" اور سیاستدان تھے۔ ان کے پیش نظر برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو کے سیاسی اور معاشی غلبے سے بچانا تھا۔ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ جو نظریات علامہ اقبال کے تھے کہ وہ سود کا استحصال چاہتے تھے' جاگیرداری کو ختم کرنا چاہتے تھے لیکن ان چیزوں کی طرف ایک سوت برابر بھی پیش رفت نہیں ہوئی وہ چاہتے تھے کہ ایسی پارلیمنٹ ہو جس کے ذریعے اجتہاد کیا جا سکے کیونکہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اجتہاد کر سکے لیکن کس کا اجتہاد قانون کی شکل اختیار کرے گا اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔

☆ پاکستان ایک اسلامی وجمہوری ملک ہے جب کہ آپ نظام خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ان میں کیا فرق ہے؟

○ ہمارے نزدیک خلافت سے مراد صرف خلافت راشدہ ہے کیونکہ بنوامیہ اور ترک خلافت ملوکیت ہے۔ ہم تمام اصول خلافت راشدہ سے لینا چاہتے ہیں جو ادارے قائم ہیں انہیں بھی جوڑا جائے گا کسی بھی ملک کے حقیقی جمہوری نظام اور دستور میں تین چیزیں شامل کرلی جائیں تو خلافت بن جائے گی۔ تین چیزیں یہ ہیں کہ (اول) حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو۔ (دوم) کوئی قانون سازی کتاب وسنت کے منافی نہیں ہو سکتی۔ (سوئم) یہاں غیر مسلموں یعنی اقلیت کو نہ تو قانون سازی میں شریک کیا جائے گا اور نہ ہی اعلیٰ سطحی پالیسی سازی میں شریک کیا جائے گا۔

☆ قیام پاکستان کے وقت حالات کیا تھے اور آپ نے کیا کردار ادا کیا؟

○ قیام پاکستان کے وقت میری عمر 15 برس تھی اور میں ایم ایس ایف ضلع حصار کا جنرل سیکرٹری تھا۔ 1946ء میں حبیبہ ہال اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں اجلاس میں' میں نے اپنے ضلع کی نمائندگی کی۔ پاکستان کے قیام کے دنوں میں ہمارا خاندان تقریباً ڈھائی ماہ شدید ابتلاء میں رہا۔ ہم ڈیڑھ ماہ محصور رہے اور ہم نے وہیں مورچے بنالئے۔ قریب ہی سناروں کی دکانیں تھیں جہاں سے کیمیکل وغیرہ لے کر ہم بارود بنالیتے تھے۔ ڈیڑھ ماہ بعد آرمی نے ہمارے مورچے توڑے اس کے بعد ہم نے سفر شروع کیا۔ ہم نے بیس دنوں میں 170 میل پیدل سفر کیا۔ پہلے ہمارے ساتھ انڈین آرمی تھی جب کہ ایک مقام کلاں والی سے پاکستانی فوج ساتھ ہو گئی۔ کلاں والی میں دراصل قافلے کا کلا گڑھ گیا تھا۔ 95 ہزار آدمیوں پر مشتمل قافلہ دس میل لمبا تھا۔ میں یہاں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جب ہم سلیمانکی ہیڈ سے اوکاڑہ آئے تو وہاں اونچی آواز میں فلمی گانے چل رہے تھے جنہیں سنتے ہی ہماری امیدوں اور امنگوں پر پانی پڑ گیا۔

☆ پاکستان میں اب تک مختلف لوگ حکمران رہے ہیں۔ آپ ان پر کیا تبصرہ کریں گے؟

○ میں قائداعظم اور لیاقت علی خان دونوں کو علیحدہ نہیں کرتا۔ ان کا دور ہنگامی تھا نئے ملک کی تعمیر ہونا تھا جب کہ وسائل بہت کم تھے گھمبیر مسائل تھے' مہاجرین کی آمد' آبادکاری ایسے مسائل ہیں ملک کا قائم رہ جانا بھی قائدین کی جانفشانی کا مرہون منت ہے۔ اس کے بعد ملک وقوم کی بدقسمتی تھی کہ گورنر جنرل غلام محمد مسلط ہو گئے۔ تاہم خواجہ ناظم الدین نیک' مخلص' محب وطن اور محب قوم انسان تھے۔ سکندر مرزا ملک وقوم کے لئے دوسری بڑی بدقسمتی تھے جنہوں نے مارشل لاء لگایا۔ میرے نزدیک ایوب خان محب وطن تھے۔ ان کے دور میں پاکستان نے صنعتی میدان میں ترقی کی جس سے عمومی خوشحالی پیدا ہوئی البتہ یہ گمان موجود ہے کہ غیر

شعوری طور پر امریکہ نے ایوب خان کو پاکستان میں بنیاد پرستی کی روک تھام کے لئے استعمال کیا۔
چونکہ چودھری محمد علی نے دستور بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی جن میں کافی اسلامی دفعات شامل ہو گئی تھیں لیکن عالمی صیہونیت نے امریکہ کے ذریعے ایوب خان کو استعمال کر کے رکوا لیا جب کہ دوسرا منظر یہ بھی ہے کہ ایوب خان نے پاکستان کے نام سے اسلامی نکال کر صرف جمہوریہ پاکستان رکھ دیا۔ ایوب خان کے زوال میں اصل کردار مذہبی جماعتوں نے ادا کیا لیکن چونکہ ان کی تحریک بحالی جمہوریت کی تھی اور اسلامی جمہوریت کی بجائے صرف جمہوریت کو اپنا ہدف رکھا۔ تحریک کے نتیجے میں ایوب خان کا اقتدار تو کمزور ہوتا چلا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ملک میں سیکولر جمہوریت کے تصورات مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد یحییٰ خان کا عبوری دور حکومت آیا جو ہماری ربع صدی کی ناکامیوں' نااہلیوں' اللہ سے وعدہ خلافیوں اور عملی کوتاہیوں کے فطری نتیجے میں عذاب آیا۔ بہ الفاظ دیگر یہ عذاب الٰہی کی پہلی قسط کا دور تھا جس میں ایک شرابی اور زانی ٹولے نے مسلمانوں کی پوری تاریخ کی عظیم ترین ہزیمتوں اور شرمناک شکستوں میں سے ایک ہزیمت اور شکست کے کلنک کا ٹیکہ پاکستان کے ماتھے پر لگا دیا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو منظر عام پر آئے ان کی صورت میں سیکولر جمہوریت بحال ہو گئی لیکن بھٹو نے دو کام انتہائی اہم کئے لیکن وہ تمام اچھے کاموں کی فصل کاٹنے کی صلاحیت سے عاری ثابت ہوئے۔
ان کے اچھے کاموں میں سب سے اہم یہ تھا کہ انہوں نے پاکستانی سیاست جو صرف وڈیروں اور جاگیرداروں کے ڈرائنگ روموں میں ہوتی تھی اسے گلی اور سڑک پر لا کھڑا کیا لیکن وہ عوامی جمہوریت کو کسی مثبت اور تعمیری رخ پر نہ ڈال سکے چنانچہ پاکستانی سیاست جو پہلے امراء کے ڈرائنگ روموں میں "ریپ" ہوتی تھی اب چوکوں اور چوراہوں میں ریپ ہونے لگی ہے۔ بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ غریب آدمی کو بھی عزت نفس کا احساس دلایا اور مزدور و کسان کے اندر بھی اپنے حقوق کا احساس اجاگر کیا لیکن اس کا بھی منفی نتیجہ نکلا کہ ان طبقات نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ جس سے صنعتی اور انتظامی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ بھٹو کے دیگر اچھے کاموں میں سے ایک اچھا کام یہ بھی تھا کہ پاکستان کا متفق علیہ دستور بنوا لیا لیکن جلد ہی اکثریت کے بل بوتے پر اس کا جو حلیہ بگاڑنے سے کارنامے کی نفی ہو گئی۔ دوسرا اچھا کام دستوری' قانونی طور پر تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا تھا لیکن اسلام میں ارتداد کی جو سزا ہے اسے نافذ نہیں کیا گیا جس سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے باوجود بین الاقوامی سطح پر فائدہ پہنچا کیونکہ وہ مظلوم بن گئے جب کہ دوسری طرف اندرون ملک بھی انہیں کوئی نقصان نہیں

پہنچایا۔ میرے نزدیک ذوالفقار علی بھٹو کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ انہیں قدرت نے پاکستان کا ملائشیا بننے کا سنہری موقع عطا کیا لیکن وہ اپنی جاگیردارانہ سوچ سے باہر نہ آسکے اور ناکام رہے۔ جنرل ضیاء الحق کو بھی نظام مصطفیٰ تحریک سے پیدا شدہ مذہبی جوش و خروش کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقام حاصل کرنے کا سنہری موقع دیا تھا لیکن وہ بھی بری طرح ناکام رہے۔ ضیاء الحق کی عظیم ترین ناکامی کے ساتھ مارشل لاء کی طوالت نے پاکستان کے عوام کے سیاسی شعور کو جو پہلے ہی بہت زیادہ نہیں تھا مزید مردہ کرنے اور سیاسی اداروں کو تقریباً ختم کرنے کا عظیم نقصان پہنچایا لیکن ضیاء الحق کی خوش قسمتی سمجھئے کہ افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کی صورت میں انہیں امریکی تعاون و امداد کے حصول کی صورت میں خود کو کیش کرانے کا موقع ملا۔ ضیاء الحق کے کریڈٹ کے کھاتے میں صرف دو کام جاتے ہیں کہ انہوں نے قرارداد مقاصد کو دستور کا جزو لاینفک بنا دیا اور فیڈرل شریعت کورٹ کا ادارہ قائم کیا اگرچہ انہوں نے انہیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر غیر موثر بھی کر دیا۔ ضیاء الحق کے بعد بینظیر بھٹو کی بات کرنا چاہوں گا کیونکہ محمد خان جونیجو کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ بینظیر بھٹو جب اپریل 1986ء میں پاکستان آئیں تو "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" کا سماں بندھ گیا تھا لیکن ان کے دونوں ادوار حکومت میں نہ کوئی خاص کامیابی نظر آئی اور نہ ہی خصوصی ذہانت کا مظہر سامنے آیا۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے شوہر نامدار آصف زرداری کو ملکی سیاست کے میدان میں آنے کی اجازت دے کر عظیم ترین سیاسی غلطی کی۔ جہاں تک نواز شریف کی بات ہے تو نواز شریف کے سیاسی کیریئر کا آغاز جنرل ضیاء الحق کے دور میں ہوا۔ اپنی وزارت اعلیٰ کے دور میں انہوں نے بینظیر بھٹو کو ناکوں چنے چبوانے کی مہارت کا ضرور ثبوت دیا لیکن فوراً وزیراعظم بن کر وہ بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے بلکہ دو بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔ نواز شریف نے نفاذ شریعت ایکٹ میں سود کو جاری رکھنے کا اعلان کیا جب کہ تجارتی سود کے "ربا" اور حرام ہونے کا جو فیصلہ فیڈرل شریعت کورٹ نے دیا اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ دوسرا گناہ عظیم یہ کیا کہ انہوں نے جو وعدہ کیا تھا کہ نفاذ شریعت ایکٹ کے بعد جلد ہی وہ دستوری ترمیم بھی منظور کرائیں گے جس میں کتاب و سنت کی کلی بالادستی طے کر دی جائے گی لیکن یہ وعدہ بھی پورا نہیں کیا گیا۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

○ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)

○ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر
عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا
یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)

○ ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق
الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ملک خداداد پاکستان جو ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نوزائیدہ مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا آج اپنی عمر عزیز کے پچاس سال پورے کر چکا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اسلامیان ہند نے اس پاک سرزمین سے اپنی کیسی کیسی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کی تھیں۔ تحریک پاکستان کے لاکھوں شہداء جن کا خون اس مملکت کی بنیادوں میں جذب ہوا' اسے اسلام کا گہوارہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس پاک سرزمین کو پوری دنیا کے لئے ایک مینارۂ نور (Light House) بننا تھا جس سے نکلنے والی نورانی کرنیں دنیا کو اسلام کے اصول حریت واخوت و مساوات کا ایک نقشہ دکھا سکتیں۔ یہ ملک ان خواہشات کے ساتھ حاصل کیا گیا تھا کہ اس کے قیام سے اسلام کے روئے منور پر عرب دورِ ملوکیت میں پڑنے والے پردے ہٹائے جانے اور اسلام کے نظام عدل اجتماعی کو اس کی اصل روح کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کا ایک نادر موقع مل سکے گا۔ اس خطہ زمین کے بارے میں کیسی کیسی امنگوں اور کیسے کیسے ارمانوں کا اظہار نہ کیا گیا ؎

یہ خطہ ہے زمانے میں نرالی شان کا خطہ
بڑی امید کا خطہ' بڑے ارمان کا خطہ

اور اس کے بارے میں کیسے کیسے جذبات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنایا گیا ؎

جو قلب مسلماں میں انگڑائیاں لیتا تھا
اس راز خلافت کی تفسیر ہے پاکستان!

لیکن واحسرتا کہ آج نصف صدی گزرنے کے بعد بھی قیام پاکستان کے اصل مقصد اور منزل مراد کی طرف کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہو سکی بلکہ رجعت قہقری کا یہ عالم ہے کہ آج بعض لوگ اس بنیاد ہی کا انکار کرنے لگے ہیں جس پر یہ عظیم عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ چنانچہ پہلے تو صرف معمر سیاستدانوں کی طرف سے اس طرح کے شوشے چھوڑے جاتے تھے کہ "پاکستان محض معاشی مسئلے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا" اور یہ کہ "یہ خالص سیاسی مسئلہ تھا' اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا" اور حد یہ کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا

اللہ تو چند چھوکروں کا لگایا ہوا نعرہ تھا" لیکن اب ایک معروف اسلام پسند صحافی کی جانب سے بھی یہ گوہر افشانی ہوئی ہے کہ "قیام پاکستان کی جدوجہد احیاء اسلام یا نفاذ دین کے لئے نہیں کی گئی تھی بلکہ پاکستان بجائے خود مقصود و مطلوب تھا' جو قیام پاکستان کی صورت میں مسلمانان ہند کو حاصل ہو گیا"۔ گویا اس وقت پاکستانی قوم بحیثیت مجموعی ع "کہ رہوار یقین مابسر ائے گماں گم شد!" کی عملی تصویر بنی نظر آتی ہے۔

اس صورتحال میں "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل" کے جذبے کے ساتھ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف "استحکام پاکستان" سے ایک اقتباس ہدیہ قارئین ہے' جو آج سے دس سال قبل پاکستان کی عمر کے چالیس سال مکمل ہونے پر منصہ شہود پہ آئی تھی :

> اس پس منظر میں ہر صاحب فہم و شعور انسان لامحالہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ملک و ملت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لئے حسب ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں :
>
> (۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لئے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔
>
> (۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افراد قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بنیان مرصوص بنا دے جو رنگ' نسل' زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!
>
> (۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیر نو جو صداقت' امانت' دیانت اور ایفاء عہد کی اساسات کو از سر نو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت' خیانت' ملاوٹ' جھوٹ' فریب' ناانصافی' جانبداری' ناجائز اقرباپروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن برائیوں سے پاک کر دے۔
>
> (۴) ایک ایسا نظام عدل اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت' فرد اور ریاست' اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف' اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!
>
> (۵) ایک ایسی مخلص قیادت جس کے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہ آئے اور جس کے خلوص و اخلاص پر عوام اعتماد کر سکیں۔
>
> تحریک پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر' اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

عہدِ حاضر میں اجتہاد

تاریخ کے مختلف ادوار کے تناظر میں

امیر تنظیم اسلامی کا ۱۲/ جنوری ۹۶ء کا خطاب جمعہ

"عہد حاضر میں اجتہاد" کے موضوع پر کچھ گفتگو میں اپنے گزشتہ خطاب جمعہ [۱] میں کر چکا ہوں۔ اس موضوع پر مجھے چھ نکات کے حوالے سے گفتگو کرنا تھی جن میں سے چار نکات پر گفتگو مکمل ہو چکی تھی۔ گویا چھ ابواب پر مشتمل ایک چھوٹی سی "کتاب الاجتہاد" ہمارے پیش نظر ہے جس میں سے چار ابواب ہم پڑھ چکے ہیں۔

گزشتہ مباحث کا خلاصہ

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ مباحث کے خلاصے پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

اجتہاد کا معنی و مفہوم : اجتہاد کا مادہ "ج ہ د" ہے اور "جُہد" کے معنی ہیں کوشش کرنا۔ اسی سے جہاد بنتا ہے۔ یعنی کسی مقصد کے لئے مخالفتوں کے علی الرغم کوشش کرنا۔ جہاد کسی کے خلاف ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی آپ کا راستہ روک رہا ہے اور آپ کی سعی و جہد میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اس کے ساتھ پنجہ آزمائی جہاد ہے۔ "اجتہاد" باب افتعال سے ہے اور اس کے لفظی معنی خود اپنے اوپر شدید مشقت جھیلنا' امکانی حد تک مشقت برداشت کرنا ہیں۔

اجتہاد کے اصطلاحی معنی کی وضاحت کے لئے ہم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا پورے متن اور ترجمے کے ساتھ مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس حدیث کا

{۱} مضمون کے تسلسل کے لئے ملاحظہ فرمایئے : میثاق' جنوری ۱۹۹۷ء

مفہوم یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مجھے یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اس موقع پر الوداعی ملاقات میں آپؐ نے مجھ سے کچھ سوالات کئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ وہاں پر تمہیں جو مسائل درپیش ہوں گے، ان کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا: اگر تمہیں کتاب اللہ میں کسی مسئلے کے بارے میں صراحت کے ساتھ کوئی ہدایت نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ پھر میں سنتِ رسول اللہؐ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ کا کوئی فیصلہ یا نظیر جو میرے علم میں ہوگی تو اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضورؐ نے سوال کیا کہ اگر تمہیں سنتِ رسول اللہؐ میں بھی کوئی بات واضح نہ ملے تو کیا کرو گے؟ اس پر انہوں نے عرض کیا: "ثم اجتھد رأیی" "پھر میں اپنی رائے قائم کرنے میں انتہائی مشقت جھیلوں گا"۔ یعنی کسی ایسے مسئلے میں جہاں کتاب اللہ میں بھی کوئی صریح راہنمائی نہ ہو اور سنتِ رسول اللہ ﷺ سے بھی واضح اور صریح رہنمائی نہ ملے، اس میں شریعت کے منشا کے مطابق، روحِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اور شریعت کے مقاصد کو برقرار رکھتے ہوئے شریعت کے پورے نظام سے ہم آہنگی رکھنے والی رائے تک پہنچنے کی انتہائی کوشش کرنا "اجتہاد" ہے۔

<u>اجتہاد کے ضمن میں پانچ نقطہ ہائے نظر</u>: میں نے عرض کیا تھا کہ اجتہاد کے بارے میں اس وقت ہمارے ہاں پانچ مکاتبِ فکر موجود ہیں، جن میں سے دو صریح گمراہی پر مشتمل ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ قرآن مجید بھی کل کا کل ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت (binding) نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جو راہنما اصول دیئے گئے ہیں وہ تو ابدی اور دائمی ہیں لیکن اس میں دیئے گئے معین احکام (Specifics) صرف اس خاص دور کے لئے تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت جو ایک خاص معاشرہ اور ایک خاص قوم موجود تھی انہیں ان کے حالات سے مناسبت رکھنے والے معین احکام عطا کر دیئے گئے۔ ان کی حیثیت ابدی نہیں ہے۔ گویا ان کے نزدیک قرآن حکیم بھی جزوی طور پر واجب الاطاعت (Partially Binding) ہے جس سے صرف اصول اخذ کئے جائیں گے اور اس میں وارد شدہ صریح احکام کی پابندی ہمیشہ کے لئے لازم نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ

انتہا پسندانہ نقطہ نظر "ضَلُّوْا ضَلَالًا بَعِیْدًا" کا مصداق ہے۔ یہ لوگ حقیقت سے بہت دور چلے گئے ہیں اور ضلالت و گمراہی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔

ایک دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن تو پورے کا پورا دائمی طور پر واجب الاطاعت ہے، اس کے راہنما اصول بھی ابدی ہیں اور اس کے معین احکام بھی دائمی ہیں، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شے دائمی طور پر واجب الاطاعت (Eternally Binding) نہیں ہے۔ اس کی تفسیر و تعبیر کی ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ عقل و منطق اور عربی گرامر کی رو سے جو چاہے نتیجہ نکالے، سنتِ رسول ؐ اس کے لئے دائمی تشریح کی حامل نہیں ہے۔ گویا سنتِ رسول ؐ کی حیثیت دائمی اور مستقل نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں کہیں بھی "اَطِیْعُوا الرَّسُوْل" کے الفاظ آتے ہیں وہاں اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی یہ حیثیت تھی کہ آپ امیر جماعت تھے یا صدر مملکت تھے یا غلام احمد پرویز صاحب کی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق "مرکزِ ملت" تھے۔ یہ نقطہ نظر بھی بہت بڑی گمراہی ہے۔ اس نقطہ نظر اور پہلے مکتب فکر کے نقطہ نظر میں اگرچہ باریک سا فرق موجود ہے لیکن نتیجے کے اعتبار سے یہ دونوں مسلک بلاشبہ ضلالت اور گمراہی ہیں۔ مؤخر الذکر گروہ اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتا ہے اور عام طور پر انہیں "منکرین سنت" کہا جاتا ہے، جبکہ مقدم الذکر گروہ کو اہلِ زیغ اور اہلِ ضلال ہی کہا جا سکتا ہے۔

تیسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ قرآن بھی کل کا کل (اصول اور تفصیلی احکام سمیت) ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت ہے ـــــ سوائے اس کے کہ بعض احکام میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ایک حکم ابتداءً کسی اور شکل میں آتا ہے اور بعد میں اس کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ اور سنتِ رسول ؐ بھی قرآن ہی کی طرح مستقل اور دائمی طور پر واجب التعمیل ہے۔ یعنی امتِ مسلمہ کے لئے قرآن اور سنت دونوں ہمیشہ کے لئے حجت ہیں، دونوں Eternally Binding ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حاملین "اہل سنت" کہلاتے ہیں۔ یہ بات آپ کو عجیب محسوس ہو گی کہ اس اعتبار سے اہل تشیع بھی "اہل سنت" ہیں کہ وہ بھی سنت رسول ؐ کی دائمی حیثیت کے قائل ہیں۔ ائمہ اربعہ کے مقلدین اور اہل حدیث حضرات تو اہل سنت ہیں ہی۔

تاہم اہل تشیع کا معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ وہ سنت اور حدیث کی source کو صرف حضرت علی' حضرت حسن اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہم) تک محدود سمجھتے ہیں۔ وہ صرف انہی روایات کو لائق قبول سمجھتے ہیں جو انہیں اس ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ باقی کسی حدیث کو وہ قابل قبول نہیں سمجھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ خلافت راشدہ میں پہلی تین خلافتوں کو باطل سمجھتے ہیں لہٰذا خلفاء ثلاثہ کے کسی فیصلے کو واجب التعمیل نہیں سمجھتے اور ان کی پابندی کرنا لازم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ یہاں ان کا راستہ ہم سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ بہرحال نظری اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی "اہل سنت" ہیں۔

باقی دو مکاتب فکر میں سے "اہل حدیث" وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ؐ دونوں مستقل اور دائمی طور پر واجب الاطاعت ہیں' لیکن خلفائے راشدین کے فیصلے اور ان کے دور میں ہونے والا اجماع ہمیشہ کے لئے واجب التعمیل (Eternally Binding) نہیں ہے۔ گویا جو رائے "اہل قرآن" کی سنت رسول ؐ کے بارے میں ہے وہی رائے "اہل حدیث" کی خلفائے راشدین کے اجماع کے بارے میں ہے کہ ان کے فیصلے اپنے وقت کے لئے تھے۔ ان کے فیصلوں کی حیثیت انتظامی احکامات (Executive Orders) کی تھی' لیکن وہ کتاب قانون کا مستقل جزو نہیں بن سکتے۔ چنانچہ نماز تراویح کی تعدادِ رکعات اور "طلاقِ ثلاثہ" جیسے مسائل میں یہ حضرات خلیفہ ؓ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلوں کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مسائل میں ان کا موقف ائمہ اربعہ کے موقف کے برعکس سامنے آتا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے زمانے میں چونکہ پوری امت ایک وحدت تھی' اس میں نہ تو ایک سے زائد حکومتیں تھیں اور نہ ہی فقہی مسالک اور فرقے موجود تھے' لہٰذا خلفاء راشدین کے اجتہادات کو "اجماع امت" کا درجہ حاصل تھا۔

اس ضمن میں چوتھا نقطہ نظر "اہل سنت والجماعہ" کا ہے جو کتاب اللہ کو بھی مکمل طور پر اور ہمیشہ کے لئے واجب الاطاعت مانتے ہیں' سنت رسول ؐ کو بھی اور خلافت راشدہ کے دور میں ہونے والے اجماع کو بھی۔ ہمارے ہاں فرقہ وارانہ بحث و تمحیص کے اندر "اہل سنت والجماعہ" کی اصطلاح کو کچھ اور معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے' جبکہ

در حقیقت اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے "الجماعت" کے فیصلے کو یعنی امت کے اجماع کو تسلیم کیا۔ چونکہ پوری امت نے حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو خلیفہ مانا تھا، لہٰذا ان خلفاء کے دور میں ہونے والے اجتہاد کو پوری امت کی تائید حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اہل سنت والجماعہ کے نزدیک قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ کے علاوہ دورِ خلافت راشدہ کے اجتہادات یعنی "اجماع امت" کو قانون اسلامی کے تیسرے ماخذ (source) کی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ نظری طور پر اہل تشیع بھی اہل سنت ہیں، اس لئے کہ وہ بھی سنت رسول کو binding مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ سنت رسولؐ کی صرف ایک شاخ کو مانتے ہیں، لیکن وہ اس بناء پر اہل سنت سے کٹ جاتے ہیں کہ وہ "الجماعت" کے فیصلوں یعنی اجماع امت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اہل حدیث حضرات کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ "طلاق ثلاثہ" جیسے مسائل میں اہل تشیع اور اہل حدیث کا موقف ایک جیسا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں پانچواں مسلک ائمہ مجتہدین کا ہے، جنہوں نے قرآن حکیم، سنت رسولؐ اور اجماع امت کو اسلامی قانون کے مستقل مآخذ (sources) مان کر ان کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے اپنے اجتہادات کئے۔ چنانچہ مختلف ائمہ مجتہدین کے اجتہادات کی بنیاد پر مختلف فقہی مکاتب فکر بن گئے۔ امام ابو حنیفہؒ بہت بڑے مجتہد ہیں۔ انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے جو اجتہادات کئے ان کی بنیاد پر مسلک حنفی وجود میں آگیا۔ اسی طرح امام مالک کے اپنے اجتہادات ہیں، بلکہ ان کی "موطا" اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اس اعتبار سے مرتب ہوئی ہے کہ وہ حدیث اور فقہ دونوں کی مشترک کتاب ہے۔ اس میں امام مالکؒ کے اپنے اجتہادات بھی شامل ہیں۔ امام شافعیؒ بھی بہت بڑے امام تھے۔ انہوں نے باقاعدہ اصول فقہ مرتب کئے اور "کتاب الاُم" جیسی بڑی عظیم اور ضخیم کتاب کی تدوین کی۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کا بھی فقہی میدان میں بہت بڑا حصہ ہے۔ ان چاروں ائمہ سے چار فقہی مسالک حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وجود میں آ گئے۔ قرآن و سنت اور اجماع امت سے قیاس و استنباط کے لئے ان چاروں کے اپنے اپنے اصول ہیں۔

چاروں ائمہ "مجتہد مطلق" کہلاتے ہیں' لیکن ان کے پیروکاروں کے نزدیک اب اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اب جو اجتہاد ہو گا اس کی صورت "اجتہاد فی المذہب" کی ہو گی۔ یعنی احناف کے ہاں اجتہاد مذہب حنفی کے اصولوں کے مطابق' اپنی فقہ کے دائرے کے اندر اندر اور شوافع کے ہاں مسلک شافعی کے اصولوں کے مطابق ان کے اپنے دائرے کے اندر اندر ہو گا۔ جو لوگ ان چاروں فقہی مسالک میں سے کسی ایک کے پابند ہو گئے وہ "مقلّدین" کہلاتے ہیں اور یہ ان لوگوں کو "غیر مقلّد" کہتے ہیں جو کسی فقہ کے پابند نہیں ہیں۔

<u>اجتہاد کے لئے شرائط اہلیت</u> : اس ضمن میں ایک شرائط تو وہ ہیں جو تمام علماء بیان کرتے ہیں اور وہ منطقی طور پر بالکل صحیح اور معقول ہیں۔ یعنی اسے عربی زبان کا گہرا علم ہو' اس نے قرآن مجید کا گہرا فہم حاصل کیا ہو' حدیث نبویؐ کا علم حاصل کیا ہو' اسے ائمہ مجتہدین کے اصولوں سے واقفیت اور ان کے اجتہادات اور مستدلات سے آگاہی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان تمام چیزوں سے واقف ہو اسی کو کسی شے کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں گفتگو کرنے کی جرات کرنی چاہئے۔ چنانچہ اجتہاد واقعتاً بہت بڑی نازک ذمہ داری ہے۔

تحلیل و تحریم کا اختیار اصلاً تو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور اس کے بعد اس کے نمائندے کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔ آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ سے استنباط کرتے ہوئے اجتہادات کئے اور چونکہ وہ حضورؐ سے قریب ترین زمانے کے لوگ تھے اور انہوں نے حضورؐ سے براہ راست تربیت حاصل کی تھی لہٰذا ان کے اجتہادات کی نوعیت بعد میں ہونے والے پوری امت کے اجتہادات سے مختلف تھی۔ خلفاء راشدین کے اجتہادات کے بعد ائمہ اربعہ کے اجتہادات معتبر (authentic) شمار ہوتے ہیں۔ ائمہ فقہاء کے بعد جو شخص بھی اجتہاد کی وادی میں قدم رکھے اس کے لئے علماء نے بہت سی شرائط عائد کی ہیں جن میں سے چند ایک کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ تاہم میرے نزدیک مجتہد کے لئے متذکرہ بالا شرائط کے علاوہ یہ شرط بھی ضروری ہے کہ اسے اپنے دور کے علوم کے مبادی کا پورا فہم بھی حاصل ہو' وہ

اپنے دور کے مسائل کو سمجھتا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ آج کی اقتصادیات اور معاشیات کیا ہیں، آج کے اقتصادی اداروں کی کیا حیثیت ہے اور وہ کن اصولوں پر کام کر رہے ہیں، ان کا صغریٰ اور کبریٰ کیا ہے؟ اگر یہ تمام چیزیں معلوم نہیں ہیں تو آج کے دور کے لئے اجتہاد کیسے کیا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ تمام چیزیں اصولی اور اخلاقی اہمیت کی حامل ہیں کہ جب تک یہ صلاحیت موجود نہ ہو کسی کو اجتہاد کے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے، جبکہ آپ قانوناً کسی بھی مسلمان کی زبان بند نہیں کرسکتے۔ وہ اگر کوئی رائے دینا چاہتا ہے تو آپ اسے اس سے روک نہیں سکتے۔

اجتہاد میں فیصلہ کن عامل : "قوتِ نافذہ"

اجتہاد کے ضمن میں اصل فیصلہ کن اہمیت اس بات کی ہے کہ کس کی رائے حکومتی سطح پر نافذ ہو گی۔ اجتہاد پر میری اس گفتگو کا یہ پانچواں نکتہ ہے۔ ایک ریاست میں اجتہاد کرنے والے تو بہت سے موجود ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس کا اجتہاد قانون کا درجہ اختیار کر کے اس پوری ریاست میں نافذ ہو گا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ریاست میں دس اجتہاد تو نہیں چل سکتے۔ جہاں تک پرسنل لاء کا تعلق ہے وہ دس تو کیا ایک سو بھی چل سکتے ہیں، لیکن قانون ملکی (Public Law) تو مختلف نہیں ہو سکتے۔ پبلک لاء میں حدود و تعزیرات بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک حکومت کے اندر ایک ہی قانون چلے گا۔ لیکن اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ قانون کس کی رائے کی بنیاد پر بنے گا۔ یعنی کس مجتہد کا اجتہاد کتاب قانون کا جزو بن کر نافذ العمل ہو گا۔ چنانچہ قانون سازی (Legislation) میں اصل اہمیت "قوتِ نافذہ" کی ہے۔

اجتہاد کا عمل : تاریخ کے تناظر میں

دورِ رسالت : اجتہاد کے حوالے سے ہم مختلف ادوار کا جائزہ لیں تو سب سے پہلا دور، جو ہمارا عہد زریں ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا زمانہ ہے۔ حضورؐ خود بھی اجتہاد فرماتے تھے اور جو بھی نئی صورت پیش آتی تھی اس میں اپنی رائے قائم فرماتے تھے۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ بعض اوقات آپؐ سے پوچھ بھی لیتے تھے کہ حضورؐ یہ معاملہ جو

آپ نے کیا ہے آیا یہ وحی کا حکم ہے یا آپؐ نے اپنی ذاتی رائے سے کیا ہے؟ اگر تو وحی کا حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے' ہم زبان بھی نہیں کھولیں گے' لیکن اگر وحی کا حکم نہیں ہے تو پھر ہمیں کچھ کہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ پھر جس معاملے میں آپؐ فرماتے تھے کہ یہ وحی کا حکم نہیں ہے اور اس بارے میں تم لوگوں کی رائے کیا ہے؟ تو پھر وہ اپنی رائے دیتے تھے۔ حضورؐ بسا اوقات وہ رائے قبول کر لیتے تھے۔ تو یہ حضور ﷺ کا اجتہاد تھا۔ مثلاً غزوۂ بدر میں حضورؐ نے ایک مقام کو کیمپ لگانے کے لئے منتخب فرمایا۔ حضورؐ کو اس سے پہلے کسی جنگ کا تجربہ نہیں تھا لیکن اس غزوے میں شریک صحابہ کرامؓ میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ جو ہمیشہ جنگوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضورؐ اگر آپ کا یہ فیصلہ وحی کی رو سے ہے تو پھر "سَمِعنا وَاَطعنا" اور "آمنّا وصَدّقنا" لیکن اگر یہ آپؐ کا ذاتی فیصلہ ہے تو ہمیں کچھ عرض کرنے کی اجازت دیں۔ آپؐ نے ان کی رائے دریافت فرمائی تو انہوں نے کہا کہ جنگی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارا کیمپ یہاں کی بجائے وہاں ہو۔ حضورؐ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور کیمپ اس جگہ منتقل کر دیا گیا۔ تو اجتہاد اپنے زمانہ مبارک میں خود حضورؐ نے بھی کیا ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ آپؐ تو اللہ کے رسول تھے لہٰذا معصوم تھے۔ اگر بالفرض آپؐ کے اجتہاد میں کہیں غلطی کا امکان پیدا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی آجاتی۔ چنانچہ آپؐ کا اجتہاد واجب الاطاعت اور واجب التعمیل ہے۔

<u>عہدِ خلافتِ راشدہ</u> : دورِ رسالت کے متصل بعد خلافت راشدہ کا دور ہے۔ خلفاء راشدین رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ آپؐ کے بہترین ساتھی تھے' جو ایک طویل عرصے تک آپؐ کے ساتھ جدوجہد میں شریک رہے اور قربانیاں دیتے رہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دین کا اصل فہم انہیں حاصل تھا لہٰذا ہر خلیفہ راشد مجتہد مطلق تھا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کے اجتہاد سے اختلاف نہیں کیا گیا۔ ان کے دور میں ان کے اجتہاد سے اختلاف بھی ہوا ہے' لیکن انہوں نے اس اختلاف کو افہام و تفہیم سے حل کیا ہے۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب بڑی بڑی فتوحات ہوئیں' ایران' عراق' شام اور مصر کے علاقے فتح ہو گئے تو ان زمینوں کی حیثیت کے بارے میں سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر انہیں

مال غنیمت قرار دیا جاتا تو ان کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے رکھنے کے بعد باقی تمام زمینیں ان چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کرنی ہوتیں جن کے ہاتھوں اللہ نے یہ سارے ملک فتح کرادیئے تھے۔ لہٰذا اگر ان میں یہ سارے ملک تقسیم کردیئے گئے ہوتے تو جاگیرداری کا ایک بہت عظیم نظام قائم ہو جاتا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر غور کیجئے کہ اس طرح ان تمام ملکوں کی ساری آبادی غلام قرار پاتی' چنانچہ عورتوں کو کنیز قرار دیا جاتا اور مرد غلام بن جاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے پر گہرائی میں غور و فکر کیا اور اپنی اجتہادی بصیرت سے کام لیتے ہوئے فیصلہ فرمایا کہ ان زمینوں پر مالِ غنیمت کا نہیں بلکہ مالِ فے کا اطلاق ہو گا۔ مال فے کل کا کل بیت المال کی ملکیت ہوتا ہے اور اس میں سے مجاہد کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ مال غنیمت کا حکم سورۃ الانفال میں ہے' جبکہ مال فے کا حکم سورۃ الحشر میں ہے۔ اس پر بعض صحابہؓ نے آپؓ کے اس اجتہاد سے اختلاف کیا اور آپؓ سے باقاعدہ جھگڑا کیا کہ آپ غلط کر رہے ہیں' آپ کو اس کا حق نہیں ہے' آپ کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے ایک دس رکنی کمیٹی بنائی جس میں پانچ صحابی اوس اور پانچ خزرج میں سے شامل کئے جو زمین کے بندوبست سے واقف تھے اور زمین کے نظام کو جانتے تھے۔ مہاجرین کو اس کمیٹی میں اس لئے شامل نہ کیا گیا کیونکہ وہ تو تجارت پیشہ لوگ تھے اور کاشت کاری وغیرہ کے معاملات سے ناواقف تھے۔ اس کمیٹی کے روبرو حضرت عمرؓ نے بھی اپنے دلائل پیش کئے اور آپؓ کے اجتہاد سے اختلاف کرنے والے صحابہؓ نے بھی دلائل پیش کئے۔ بالآخر اس کمیٹی نے حضرت عمرؓ کے موقف کو تسلیم کرلیا اور اپنا فیصلہ سنادیا۔ چنانچہ اب اجماع ہو گیا کہ یہ ساری مفتوحہ زمینیں خراجی ہیں' یہ کسی کی ملکیت کے زمرے میں نہیں آتیں۔ یہ دور خلافت راشدہ کے اجتہاد کی ایک مثال تھی۔ اس دور میں قوت نافذہ خلیفہ کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو جب اجماع امت کا درجہ حاصل ہو گیا تو آپؓ نے اس کو نافذ فرمادیا۔

بنو امیہ اور بنو عباس کا دور : خلافت راشدہ کے بعد دورِ بنو امیہ اور دورِ بنو عباس ہے۔ ظاہر ہے ان کے خلفاء کی وہ حیثیت نہیں ہے جو خلفائے راشدین کی ہے۔ پہلے اموی

حضرت امیر معاویہؓ تو صحابی ہیں لیکن ان کے بعد کوئی صحابی نہیں، تابعین ہیں۔ دور بنو عباس کے خلفاء تو تابعین سے بھی اگلے درجے میں چلے گئے۔ مزید یہ کہ حدود سلطنت بہت وسیع ہو گئیں۔ اب قانون سازی (Legislation) کا یہ تقاضا سامنے آیا کہ کوئی ایسا Common Law بنا چاہئے کہ تمام بلاد اسلامیہ کے اندر اس کے مطابق فیصلے ہوں۔ اگر مختلف شہروں میں لوگ اپنے اپنے اجتہادات سے فیصلے کرنے لگیں تو ایک ملک میں ہزاروں قانون ہو جائیں گے۔ چنانچہ اجتہاد کا اصل مسئلہ قانون سازی (Legislation) کا ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ دونوں کو قاضی القضاۃ بنانے کی پیشکش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طرح آپ کے اجتہادات پوری مملکت کے اندر قانون کے طور پر نافذ ہو جائیں گے، لیکن دونوں نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ ان دونوں حضرات کے اس اقدام کو حکومت کے ساتھ عدم تعاون پر محمول کر کے دونوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کو بھی شدید سختی جھیلنی پڑی اور امام مالکؒ کو بھی۔ امام مالکؒ کے ساتھ تو ایک اور مسئلہ "طلاق مکرہ" کا بھی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی شدید تذلیل اور توہین بھی کی گئی اور ان کے چہرے پر سیاہی مل کر انہیں اونٹ پر بٹھا کر بازاروں میں پھرایا گیا۔ ان کا یہ فتویٰ تھا کہ اگر کسی سے زبردستی طلاق دلوا دی جائے تو وہ طلاق نہیں ہوتی۔ اس مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ طلاق ہو جائے گی اور میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے کا قائل ہوں، میرے نزدیک امام مالکؒ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ فرض کیجئے کہ ایک شخص کو کسی نے دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو طلاق نہ دی تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ اس دباؤ کے تحت اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اب لوگوں کو تو معلوم نہیں کہ اس نے اس دھمکی کے تحت طلاق دی ہے۔ عدت ختم ہونے کے بعد اس کی بیوی اگر کسی اور شخص سے نکاح کر لیتی ہے تو اگر وہ طلاق صحیح نہیں ہوئی تو اب اس کا یہ دوسرا نکاح باطل اور حرام کاری کے مترادف قرار پائے گا۔ امام ابو حنیفہ کو فقہی شعور (Legal Sense) بہت گہرا عطا ہوا تھا۔ وہ ہر معاملے کے قانونی پہلو کو دیکھتے تھے۔ امام مالک کا فتویٰ اپنی جگہ

نیک نیتی پر مبنی تھا اور وہ اس پر جازم تھے۔ حکومت وقت ان کو اپنا فتویٰ واپس لینے پر اس لئے مجبور کر رہی تھی کہ اس فتوے کی زد بیعت خلافت پر پڑ رہی تھی۔ گویا جن لوگوں سے جبراً بیعت لی گئی ہے وہ بیعت ہی نہیں ہے۔ اگر مجبوری کی طلاق صحیح نہیں ہے تو مجبوری کی بیعت کیسے صحیح ہو جائے گی؟ چنانچہ خلافت بنو عباس کی طرف سے انہیں شدید سزا دی گئی۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ دلچسپی کی بات تھی جو میں نے بیان کر دی۔

اصلاً میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ان دونوں ائمہ کرامؒ نے قاضی القضاۃ بننے سے انکار کیا۔ ان کا انکار اس دلیل کی بنیاد پر تھا کہ ہم بھی مجتہد ہیں اور دوسرے لوگ بھی مجتہد ہیں، ہم صرف اپنے اجتہادات کو پوری امت پر لاگو کر دیں یہ ہمیں گوارا نہیں ہے۔ یہ واقعتاً بہت بڑی بات ہے، بہت بڑا ایثار ہے۔ اس پر انہوں نے کوڑے بھی کھائے، جیل بھی گئے، لیکن یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ تاہم امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد قاضی ابو یوسفؒ نے وہ حیثیت قبول کر لی جو ان کے استاد نے قبول نہیں کی تھی۔ ان کے پاس اپنے دلائل ہوں گے اور انہوں نے امت کی مصلحت میں اسے درست سمجھا ہو گا۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ ہوتے یا قاضی ابو یوسف، یا کوئی اور امام ہوتے، ان کے اجتہاد کو نافذ کرنے کی قوت کس کے پاس تھی؟ قوت نافذہ تو ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھی بلکہ وہ تو بنو عباس کے اس خلیفہ کے پاس تھی جو اس وقت تخت خلافت پر متمکن تھا۔ اب وہ جس کو پسند کر لے اس کے اجتہادات کو قانون کی حیثیت دے دے۔ چنانچہ Legislation میں اصل اہمیت "قوتِ نافذہ" کی ہے۔ صلاحیتِ اجتہاد اور شے ہے، "قوتِ نافذہ" اور شے ہے۔ بہتر سے بہتر اجتہاد کو اگر نافذ نہ کیا جا سکتا ہو تو وہ قانون کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا اور آج کل یہی تو ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر یہ دروازہ بند کر رکھا ہے اور فقہی مسائل پر بات کرتا ہوں نہ ان میں اپنا وقت صرف کرتا ہوں۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ ہمارے اجتہادات کو نافذ ہی نہیں ہونا تو اس Exercise in futility کا کیا فائدہ؟ اس کے بجائے یہی وقت قوم کو اس فیصلے تک پہنچانے میں صرف ہونا چاہئے کہ وہ اجتماعی طور پر یہ شعوری فیصلہ کرے کہ ہمیں مسلمان جینا ہے، مسلمان مرنا ہے اور یہاں اللہ اور اس کے رسول کا قانون ہی چلنے دینا ہے۔ قوم

کی طرف سے یہ پر زور مطالبہ ہو کہ دستور میں کتاب و سنت کی بلا اشتثناء مکمل بالادستی طے کی جائے۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر فقہی مسائل پر بھی گفتگو کی جائے کہ کونسی فقہی رائے صحیح ہے' امام مالک کی رائے درست ہے یا امام ابو حنیفہ کی رائے؟

اورنگ زیب عالمگیرؒ کا دور : خلافتِ بنو امیہ و بنو عباس کے ایک ہزار سال بعد یعنی آج سے تین سو سال قبل ہندوستان میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ کی حکومت تھی' جو صرف زبانی کلامی نہیں بلکہ بڑے پختہ اور عامل مسلمان تھے۔ اب ان کو ضرورت پیش آئی کہ اس مملکت میں ایک پورا اسلامی قانون مرتب کر کے نافذ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کچھ علماء کی کمیٹی بنائی' جو ظاہر ہے کہ ان کے منتخب (Selected) علماء تھے۔ اس کمیٹی نے بیٹھ کر ان سارے مسائل پر غور و فکر کیا جو نئے پیدا ہو چکے تھے اور جن کے بارے میں شریعت کا حکم تلاش کرنا مقصود تھا۔ ان علماء و فقہاء نے جو اجتہادات کئے انہیں عالمگیر نے قانون کا درجہ دے دیا۔ ان اجتہادات کے مجموعے کا نام "فتاویٰ عالمگیری" ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عالمگیر کے فتاویٰ نہیں تھے' عالمگیر تو فقیہ' مفتی اور مجتہد نہیں تھے' وہ تو بادشاہ تھے۔ لیکن یہ "فتاویٰ عالمگیری" اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کو نافذ کرنے کی طاقت عالمگیر کے پاس تھی۔

(جاری ہے)

بقیہ : عرض احوال

اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت' دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناتے سے پورے کئے جا سکتے ہیں' کیونکہ جیسا کہ ہم ناقابل تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں علامہ اقبال مرحوم کے حسب ذیل اشعار خواہ اس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں' ملت اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صدفی صد درست اور کمال صداقت و حقانیت کے مظہر ہیں کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار ۔۔۔ قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟ ۔۔۔ اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

شہادت علی الناس

—— رحمت اللہ بُشر ——

امت کے انفرادی و اجتماعی فرائض

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج کے آخر میں امتِ مسلمہ کو پہلی بار بحیثیتِ امت مخاطب فرمایا ہے۔ اس خطاب میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی وہ ذمہ داریاں بیان کردی ہیں جو انفرادی طور پر ان میں سے ہر فرد پر عائد ہوتی ہیں اور اسی طرح اجتماعی طور پر جو فریضہ بحیثیتِ امت مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اس کو بھی معیّن کردیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید ہر انسان سے انفرادی سطح پر "عبادتِ رب" کا مطالبہ کرتا ہے اور اس فریضے کی پیہم یاددہانی اور نفس کی تربیت کے لئے ارکانِ اسلام یعنی صلوٰۃ' زکوٰۃ' صوم اور حج کی تلقین فرماتا ہے۔ یہی حکیمانہ ترتیب یہاں بھی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا :

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾ (الحج : ۷۷)

"اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو ارکوع کرو' سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

جان لیجئے کہ اس آیۂ مبارکہ کے نزول کے وقت پنج گانہ نماز فرض نہیں ہوئی تھی' اس لئے یہاں رکوع و سجود کی تاکید کردی گئی تاکہ اللہ کی یاد دل میں تازہ رہے۔ نماز کا مقصد یہی ہے کہ اللہ سے تعلق ٹوٹنے نہ پائے اور انسان پر نسیان یا غفلت طاری نہ ہو جائے۔ مسلمان اللہ کا بندہ ہے اور اس کا مالک وہی ہے جو سارے جہان کا مالک ہے' لہٰذا لازم ہے کہ وہ اللہ کی بندگی سے کوتاہی نہ کرے بلکہ واقعی بندہ (یعنی پابند) بن کر زندگی گزارے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "الدُّنیا سِجنُ المؤمنِ وجنّۃ الکافر" یعنی یہ دنیا

مومن کے لئے قید خانہ ہے' وہ پابند ہے' اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے کہ جو جی چاہے کرے۔ اس کے برعکس کافر کا رویّہ ہے کہ وہ اِس دنیا میں من مانی زندگی گزارتا ہے' جبکہ بندۂ مومن کے لئے یہ جنت آخرت میں ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی تمام انبیاء و رسل اسی پیغام کے ساتھ مبعوث ہوتے رہے "یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ"۔ یعنی "اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب کی بندگی اختیار کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے"۔ تمہاری فلاح و کامیابی کے لئے تمہارے مالک کی طرف سے یہی مطالبہ اور تقاضا ہے اور بحیثیت انسان ہر شخص کی فلاح بندگی رب کے ساتھ مشروط ہے۔

امّتِ مسلمہ کو چونکہ ایک خصوصی حیثیت عطا ہونے والی تھی' اس لئے فریضۂ عبادتِ رب کے ساتھ ہی ان پر ایک دوسرا فرض بھی عائد کر دیا گیا تاکہ انہیں اسی موقع پر اس فرض سے بھی آگاہی حاصل ہو جائے' اور وہ اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزاریں۔ یہ فریضہ ہر مسلمان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا :

﴿ وَجَاھِدُوا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ' ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ' مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ' ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ ھٰذَا' لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَھِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ' فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ' ھُوَ مَوۡلٰکُمۡ' فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ ۝ ﴾

"اور تم جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اس کام کے لئے) منتخب کر لیا ہے اور (دیکھو) دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی۔ یہ طریقہ ہے تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا۔ اسی (اللہ) نے تمہارا نام مسلمان رکھا' پہلے سے بھی اور اس (قرآن) میں بھی۔ (تمہارا انتخاب اس لئے کیا جا رہا ہے) تاکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ ہو جائیں اور تم گواہ بن جاؤ تمام

انسانوں پر۔ پس نماز پڑھو' زکوۃ دو اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔"

اس فرمانِ خداوندی میں امت کی ذمہ داری "شہادت علی النّاس" ٹھہرائی گئی ہے۔ اور یہ اصل میں کارِ رسالت کے تسلسل کا وہ مستقل ذریعہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہنا چاہئے' تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حق ادا ہوتا رہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر رسول ہونے کے ناطے عائد کیا اور جو آپؐ سے پہلے تمام رسولوں پر اپنی اپنی قوم اور زمانے کے لئے عائد رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فریضہ شہادت علی الناس پہلی مسلمان امتوں کے ذمے بھی تھا یا صرف موجودہ امتِ مسلمہ ہی کو اس کا مکلّف ٹھہرایا جا رہا ہے؟ جان لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے یہ ذمہ داری فرض کے درجے میں تو صرف انبیاء و رُسل ہی کے ذمے رہی ہے' البتہ ایمان واخلاق کا یہ تقاضا تھا کہ ایک مسلمان جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند کرے اور دینی حمیت و غیرت کا بھی تقاضا تھا کہ اگر وہ کوئی برائی دیکھے تو اس کا تدارک کرنے کی کوشش کرے' لیکن یہ فریضہ بحیثیتِ امّت صرف موجودہ امت مسلمہ پر عائد کیا گیا ہے' جس کی وجہ نبی اکرم ﷺ پر اتمامِ نبوت اور آپؐ کی رسالت کا قیامت تک کے لئے دائمی ہونا ہے۔

فریضہ شہادت علی الناس کیسے ادا کرنا ہے؟ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی ایک مثال بھی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ اور وہ مثال ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی' جو اس اعتبار سے منفرد اور عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باقی تمام رسول کافر و مشرک قوموں کی طرف مبعوث فرمائے' لیکن آپؑ کو ایک مسلمان قوم (بنی اسرائیل) کی طرف مبعوث فرمایا اور آپؑ نے اپنے ماننے والوں کو بھی اس کام میں شرکت کی دعوت دی اور کہا کہ "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ؟" حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے بھی بنی اسرائیل کے پاس کتاب اور شریعت موجود تھی' لہٰذا ان کی طرف حضرت مسیحؑ کی بعثت اور آپؑ کے طرز عمل میں ہمارے لئے مثال اور نمونہ موجود ہے۔ آنجنابؑ نے بھی تجدیدِ دین ہی کا فریضہ ادا کیا اور آپ کے حواریوں نے بھی۔

امتِ مسلمہ کی خصوصی حیثیت : "امتِ مجتبیٰ"

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج کی آخری آیت میں اس امت کو تفویض کردہ ذمہ داری کے ضمن میں وہی لفظ استعمال کیا ہے جو اس نے اپنے نبی آخر الزمان ﷺ کی شانِ رسالت بیان کرنے کے لئے گزشتہ تمام کتابوں میں استعمال کیا تھا۔ یہ جان لیجئے کہ پہلی کتابوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو خصوصی شان بیان ہوئی ہے وہ رسول کی حیثیت سے ہے اور آپ کا نام بھی "احمدؐ" ہی آیا ہے جس کے ساتھ نسبت ہے "مجتبیٰ" کی، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "احمدِ مجتبیٰ" ہیں اور آپ کی خاص شان "محمدؐ رسول اللہ" ہے، جبکہ حضرت آدمؑ "صفیّ اللہ" ہیں، حضرت موسیٰؑ "کلیم اللہ" ہیں اور حضرت عیسیٰؑ "رُوح اللہ" ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دو اسماءِ گرامی کے حوالے سے آپؐ کی شان کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، یعنی محمدِ مصطفیٰؐ اور احمدِ مجتبیٰؐ۔ آپ کی پہلی حیثیت اللہ تعالیٰ سے پیغام وصول کرنے کے اعتبار سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بعض کا اسی کام کے لئے "اِصۡطَفٰی" فرماتا رہا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی : ﴿اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾ (آل عمران : ۳۳) "بیشک اللہ تعالیٰ نے پسند فرمالیا حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو تمام جہان والوں پر"۔ آپؐ کی دوسری شان "اِجۡتَبٰی" ہے جو آپ کے نامِ نامی احمدؐ کے حوالے سے ہے، یعنی آپؐ کو فریضہ رسالت کے لئے اللہ تعالیٰ نے منتخب کرلیا ہے۔ یہی لفظ "اِجۡتَبٰی" ہے جو اس امت کے لئے قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان دونوں الفاظ کے علیحدہ علیحدہ تعین اور ان کی اصل حیثیت واضح کرنے کے لئے انگریزی کے دو الفاظ بہت موزوں ہیں۔ اصطفٰی choice کو کہتے ہیں جبکہ اجتبٰی selection کو۔ پہلا ذاتی کمالات کی بنیاد پر ہوتا ہے اور دوسرا کام کی نوعیت کے لحاظ سے۔

فریضہ شہادت علی الناس کو قیامت تک کے لئے جاری رہنا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے امّتِ مسلمہ کو یہ خصوصی حیثیت دی اور مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا تاکہ رسالت کا

حق تمام زمانوں میں تاقیامِ قیامت ادا ہوتا رہے۔ اب یہ کام صرف ایمان و اخلاق کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اسے فرض کر دیا گیا ہے، اور اسی فرض کی انجام دہی کے لئے اللہ نے مسلمانوں کو منتخب (Select) کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہدایت پہلے کسی قوم کے لئے یا کسی خاص زمانے کے لئے نازل کیا کرتا تھا اب اسے "الہدیٰ" کی صورت میں مکمل کر دیا۔ یہ ہدایت ہے بھی "هُدًى لِلنَّاسِ" یعنی تمام انسانوں کے لئے۔ مزید برآں اس پر مبنی دین کی بھی تکمیل کر دی اور پھر اسے امتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

(البقرہ : ۱۴۳)

"اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط (درمیانی امت) بنا دیا ہے تاکہ تم شہادت دو لوگوں پر اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ بن جائیں تم پر"۔

"وسط" کا مطلب یہ بھی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچتا تھا ایک رسول کے ذریعے ایک قوم کو، کیونکہ اللہ کا رسول ایک خاص قوم کے لئے مبعوث فرمایا جاتا تھا، لیکن اب چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام انسانوں کے لئے ہے لہٰذا امت مسلمہ کو واسطہ بنا دیا گیا تاکہ یہ کام رہتی دنیا تک جاری رہے اور تمام اقوام عالم تک ہدایت پہنچ جائے۔

شہادت کہتے ہیں گواہی کو، اور گواہی اس کی معتبر ہوتی ہے جس میں گواہ کے اوصاف بھی پائے جائیں اور عملی زندگی میں بھی وہ اس گواہی کا حامل ہو، نہ کہ صرف زبانی اقرار کرنے والا۔ چنانچہ یہاں امتِ مسلمہ کو گواہی کے اوصاف سے آگاہ کیا گیا ہے کہ گواہ وہی معتبر ہوتا ہے جو اس گواہی کا قوام بھی ہو، یعنی عملی صورت میں بھی واقعتاً گواہ ہو، نہ کہ صرف زبانی جمع خرچ کرنے والا ہو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا گیا :

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ..﴾ (آیت ۱۳۵)

"اے ایمان والو! عدل پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو خواہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے یا قرابت داروں کے۔"

مراد یہ ہے کہ اگر خود ہی بے انصاف ہو گے' عادل نہ ہو گے تو گواہی کیا دو گے۔

پھر فرمایا سورۃ المائدہ میں :

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ' وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ' اِعْدِلُوْا ' هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی..... ﴾ (آیت ۸)

"اے ایمان والو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو اور کسی خاص قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو' عدل ہی کرو' وہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔"

اصل میں گواہی کا حق تب ہی ادا ہوتا ہے جب انسان جس چیز کی گواہی دے رہا ہو اس کا وہ خود مصداق ہو' وگرنہ تو "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" والا معاملہ بن جاتا ہے' یعنی "کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں"۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ناراضگی کی ہے۔ اور یہی اس وقت معاملہ ہے امّتِ مسلمہ کا کہ وہ لوگوں کو تو قرآن کی تعلیم اور دین اسلام کی دعوت دیتی ہے لیکن چونکہ خود اس کا مصداق نہیں ہے اس لئے لوگ بجائے دعوت قبول کرنے کے اس پر لعنت بھیجتے ہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو دوسروں کو کہتے ہیں لیکن خود اس پر عمل پیرا نہیں ہیں۔

شہادت کس کی؟

ہمیں جاننا چاہئے کہ یہ فریضہ شہادت علی الناس کیا ہے جس کے لئے اس امت کو خیرِ امت قرار دیا گیا ہے اور اتنی فضیلت دی گئی ہے کہ پہلے انبیاء و رُسل بھی یہ خواہش کرتے رہے کہ وہ اس امت میں سے ہوں۔

سورۃ الحدید میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کیا دے کر بھیجتا رہا ہے اور ان کی بعثت کی غرض و غایت کیا رہی ہے :

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ... ﴾ (آیت ۲۵)

"بیشک ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات دے کر اور نازل کی ان کے ساتھ کتاب

اور میزان تاکہ لوگ قائم ہو جائیں عدل پر۔"

یہ دو چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ ہر رسول کو دے کر کر بھیجتے رہے ہیں۔ اور انہی دو چیزوں میں فریضۂ شہادت مطلوب ہے۔ انہی دو چیزوں کو نبی اکرم ﷺ کے لئے قرآن مجید میں تین مقامات پر بیان کیا گیا ہے تاکہ امت کو اچھی طرح یاد رہے۔ یہ الفاظ سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں وارد ہوئے ہیں :

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ....﴾

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ اسے غالب کر دے کُل کے کُل دین پر (یا تمام ادیان پر)۔"

واضح رہے کہ یہاں کتاب کی جگہ الهدیٰ آیا ہے اور میزان کی جگہ دین الحق۔ تینوں مقامات پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ میزان اور دین الحق کے بارے میں وضاحت فرمادی گئی ہے کہ انہیں اس لئے نازل کیا جارہا ہے کہ عدل اجتماعی قائم ہو اور تمام نظام زندگی اس کے مطابق ہو (یا یہ تمام دوسرے ادیان پر غالب رہے) لیکن الہدیٰ کے بارے میں صراحت نہیں ہے کہ اس کو کس لئے نازل کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ یہ تو ایسی چیز ہے جو بھلائے نہ بھولے، لیکن اگر غفلت کا امکان ہے تو اس میں کہ اس کی تعلیم کے مطابق اپنی زندگی کو گزارنے کا معاملہ مشکل ہو گا اور شاید لوگ اس کو بھول جائیں اور صرف کتاب ہی کو پڑھتے پڑھاتے ہوئے سمجھ لیں کہ بس یہی مقصدِ بعثتِ رسول ؑ ہے حالانکہ کتنی صراحت سے بیان کر دیا گیا تھا :

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا.....﴾ (المائدہ : ۳)

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے۔"

لیکن امت نے "عبادت" کو "عبادات" میں منحصر کر دیا اور شہادت علی الناس کو بس تبلیغ تک محدود کر دیا۔ يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ۔ اب الہدیٰ اور دین حق کی شہادت کا

[illegible] سمجھ لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ یہ فریضہ کیا ہے اور ہم کیا ہیں؟

الھدٰی وہ کامل ترین ہدایت ہے جو اس دور سے لے کر رہتی دنیا تک انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا ہے تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میں رہنمائی کہاں سے لوں' وہ ہدایت تو پوری نہیں ہے اور اگر کامل ہے تو مجھ تک پہنچی نہیں ہے۔ یہی اصل میں دلیل ہے ختم نبوت کی کہ اگر اللہ کی عطا کردہ ہدایت اس کتاب قرآن مجید' فرقان حمید کی شکل میں مکمل نہ ہوتی یا وہ محفوظ نہ رہی ہوتی تو اس صورت میں نبوت کے جاری رہنے کا جواز ہو سکتا تھا۔ چونکہ ہدایت مکمل اور محفوظ ہے لہٰذا کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ اصل کام تو اس کتاب کو اپنا امام بنانے اور اس کی ہدایت کو عملاً اختیار کرنے کا ہے۔ الہدیٰ یعنی قرآن حکیم کے حوالے سے ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے تمام انسانوں تک پہنچادیا جائے' یعنی حق تبلیغ ادا کیا جائے' یہ نہیں کہ کتاب ہمارے پاس موجود ہے' جو چاہے آئے اور اس کا علم حاصل کرے' اس کی نعمت اور تذکیر سے فائدہ اٹھالے' بلکہ ہمیں حکم ہوا ہے کہ اسے لے کر پہنچو ہر ہر انسان تک اور اس کے پیغام کو اتنا عام کرو کہ کوئی بھی اس کی ہدایت سے ناواقف نہ رہے۔ یعنی تم کنواں نہ بنو کہ لوگ آئیں اور خود پانی حاصل کرلیں' بلکہ بادل بن کر ہر سو اور ہر جگہ برسو تاکہ جسے فائدہ اٹھانا ہو اور جس میں اس پانی کو جذب کرکے روئیدگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ اس سے فیضیاب ہو جائے اور اپنے دل کو زندہ کرلے۔ جیسے آنحضور ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿ يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ' وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ... ﴾ (المائدہ : ٦٧)

"اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا..."

دوسرا حق اس کتاب کا یہ ہے کہ اس کی تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگ اپنی زندگیاں وقف کردیں تاکہ وہ اس کے علم کو تمام انسانوں تک ان کی ذہنی سطح کے مطابق پہنچائیں تاکہ اس کی حقانیت سب کے سامنے مبرہن ہو جائے۔ جیسے فرمایا:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ.... ﴾ (النحل : ۱۲۵)

"اے پیغمبرؐ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے سے (لوگوں کو) بلاؤ اور (اگر بحث آن پڑے تو) ان کے ساتھ اچھے طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو۔"

لازم ہے کہ کچھ لوگ قرآن کی گہرائی میں اتریں اور اعلیٰ علمی سطح کے مطابق اس کی ہدایت کو عام کرنے کے لئے اپنی زندگیاں کھپائیں اور تعلیم و تعلّمِ قرآن اور دعوت الی القرآن کا حق ادا کریں۔

اس کا تیسرا حق یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں جن چیزوں کو رواج دینا مطلوب ہے اور جن چیزوں کی بیخ کنی کرنا ضروری ہے ان کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا جائے تاکہ یہ باتیں لوگوں کے ذہنوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے جس کے لئے تمام ذرائع ابلاغ استعمال کئے جائیں اور قرآن کی تعلیمات کا چرچا اس طور پر ہو کہ برائی پنپنے نہ پائے' حق کے لئے لوگوں میں چاہت برقرار رہے اور قرآن حکیم کی اقدار ہی معاشرتی زندگی میں لوگوں کی عزت و تکریم کا معیار بنی رہیں۔

شہادتِ عملی

اب آیئے شہادتِ عملی کی طرف' جس سے مراد یہ ہے کہ توحید صرف عقائد و رسومات و عبادات تک محدود نہ رہے بلکہ توحیدِ عملی کا حق بھی ادا ہو تاکہ لوگ دین اللہ کی حقانیت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرلیں اور تاکہ اس کا حق ہونا صرف باتوں میں نہ ہو بلکہ اسے عملاً قائم کرکے بھی دکھایا جائے۔ دوسرے الفاظ میں معاملہ صرف زبان سے اللہ اکبر کہنے تک نہ رہے بلکہ تکبیر کہنے والوں کی ذات خود بھی اللہ کی کبریائی کا ثبوت ہو۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ﴾ (آل عمران : ۱۸)

"اللہ خود گواہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور اسی کی گواہی فرشتے بھی دیتے ہیں اور اہل علم بھی کہ وہ واقعی قَائِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔"

اللہ ہی نے تمام کائنات کو پیدا کیا ہے اور اس میں عدل و قسط کو قائم کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہی عدل و قسط اس کی زمین پر وہ لوگ بھی قائم کریں جن کو اس نے خلافت ارضی دی ہے۔ تمام انبیاء و رسل کو میزان عطا کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ عدل و قسط کو قائم کریں اور خود بھی اس کی گواہی دیں۔ یعنی گواہی اپنی ذات میں بھی اور اپنی اجتماعیت میں بھی۔ اسی عدل و قسط کا ظہور ہوا تھا آنحضور ﷺ کے ذریعے جب یہ دین الحق کی صورت میں غالب ہوا' اور قرار پایا کہ مسلمان معاشرے میں عدل کو قائم کرنے کے ذمہ دار رہیں گے۔

کوئی انسان پیدائشی طور پر' اپنے قبیلے نسل یا ملک کی بنیاد پر بڑھیا اور گھٹیا نہیں ہے بلکہ فضیلت اور بڑائی اس کی ہے جو سب سے زیادہ دین کا تقاضا پورے کرنے والا ہے یعنی ایک زندگی میں اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہو۔ تمام عصبیتیں جو جہالت کی پیداوار تھیں ان کو آنحضور ﷺ نے پاؤں کے نیچے کچل دیا اور فرمایا : لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔ كُلُّكُم بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِن تُرَابٍ۔" یہ ہے اس نظام زندگی میں اللہ کی کبریائی کا ظہور جو صرف زبان سے پڑھ کر نہ سنایا گیا بلکہ جسے معاشرتی سطح پر نافذ بھی کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی ماننا پڑا کہ مساوات کے وعظ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بہت کیے تھے لیکن اگر بالفعل کوئی عادلانہ معاشرہ پیدا کیا ہے تو صرف محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

اس دین کے غلبے اور اس کی تنفید کا معاشی پہلو یہ تھا تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ کوئی انسان وسائل کا مالک حقیقی نہیں ہے بلکہ جن کو جو کچھ عطا ہوا ہے وہ فضل خداوندی ہے اور ان کے پاس امانت ہے۔ اس کائنات کی تمام اشیاء کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ تمام مال و اسباب تمہیں صرف "مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" کے طور پر دیا گیا ہے تاکہ اسے برت سکو اور اسے اللہ کی عطا جان کر

اس میں سے ان لوگوں کا حق نکالو جو کسی وجہ سے معاشی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اصل میں تو وراثت ہیں اللہ کی' اور وہ ہدایت فرماتا ہے کہ ان کو صرف برت لو' ساتھ نہیں لے جاسکتے کیونکہ تم مالک نہیں ہو۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ مبارکہ میں بیان کر دیا ہے تاکہ انسان جان لے کہ اس دنیا اور اس کے وسائل کی اصل حیثیت کیا ہے :

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (العنکبوت : ۶۴)

"نہیں ہے یہ دنیا کی زندگی مگر تماشہ اور کھیل اور آخرت کا گھر ہے زندگی کا گھر' کاش یہ جان لیں۔"

مثلاً کسی ڈرامے میں کسی بادشاہ کو اس کا پارٹ ادا کرنے کے لئے جو تاج اور شاہانہ لباس دیا جاتا ہے اور دربار سجانے کے لئے جو لوازمات مہیا کئے جاتے ہیں وہ ڈرامے کے ڈائریکٹر کی طرف سے ہوتے ہیں اور اس "بادشاہ" کو ان کے استعمال کا اختیار اتنی ہی دیر تک ہوتا ہے جتنی دیر وہ بادشاہ کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ وگرنہ وہ اشیاء اس کی ملکیت نہیں ہوتیں اور اسی لئے وہ اپنا کردار ادا کرنے کے بعد ان چیزوں کو وہیں چھوڑ کر جاتا ہے۔ یہی معاملہ اس دنیا کے وسائل کا بھی ہے کہ یہ سب وسائل اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں اور انسانوں کو صرف برتنے کے لئے دیئے ہیں۔ اس لئے وہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت خالی ہاتھ جاتے ہیں اور سب کچھ یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اور اصل میں وارثِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ یہاں وہی شخص کامیاب ہے کہ جو اس ہدایت کار کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق ان وسائل کو حاصل کرتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق ان کو استعمال کرتا ہے اور یہ ہدایت اللہ کی کتاب میں ہر شخص کے لئے موجود ہے خواہ وہ کسی حیثیت میں زندگی کے کھیل میں شامل ہو۔ دین اللہ کا تقاضا یہ ہے کہ حکمرانی اللہ کی نافذ ہو اور انسان صرف خلیفہ کی حیثیت میں زندگی گزارے اور ہر اس حیثیت میں جس میں اسے خلافت دی گئی ہو حقِ خلافت ادا کرے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھنا ہو گا تاکہ دین اللہ اور بندگی کے تقاضے واضح ہوں۔ یہی

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

((بُنِيَ الاِسلامُ علٰى خمسٍ' شهادةِ اَن لا اله الا اللّٰهُ واَنَّ محمّدًا عبدهٗ ورَسوله' واقامِ الصّلٰوةِ وايتاءِ الزكٰوةِ وصَومِ رمَضان وحَجِّ البَيتِ مَنِ استَطاعَ اِلَيه سَبيلًا))

گویا اسلام کی بنیاد ایمان ہے جو تصدیق بالقلب ہے اور اقرار باللسان پر مشتمل ہے۔ اصل بنیاد زمین کے اندر رہے لیکن اس کا ایک حصہ ظاہر ہے جسے ملتھ (Plinth) یا ڈیمپ کہتے ہیں۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج اس عمارت کے ستون ہیں' جب کہ اس کی چھت سے مراد عدل اجتماعی ہے۔ یعنی زندگی کے اجتماعی معاملات میں مساوات انسانی' امانت و اخوت' حریت انسانی جیسی اقدار جن کا ظہور ہو گا اس نظام عدل و قسط کی صورت میں جسے خلافت کہا گیا ہے اور جو ظہور پذیر ہو گی حاکیت خداوندی کی پوری تنفیذ کی صورت میں۔ گویا اللہ کی کبریائی کا مطلب یہ ہے کہ اس کا قانون تمام نظام زندگی پر غالب ہو اور اس کا کلمہ سربلند ہو اور باقی تمام نظام ہائے زندگی مغلوب ہو کر رہیں۔ اِس وقت مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر مسلمان تو کلمہ شہادت پڑھ کر ہی پورے دین کے دعویدار بنے بیٹھے ہیں' گویا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے' کلمہ سن لیا اور کبھی پڑھ بھی لیا۔ باقی نہ ستون ہیں اور نہ چھت ہے لیکن سمجھتے ہیں کہ بلڈنگ مکمل ہے اور وہ دین اسلام کے حامل ہیں۔ بعض نے بنیاد بھر کر صرف ستون بنالئے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ عمارت مکمل ہو گئی ہے حالانکہ اللہ کی حاکیت کی چھت موجود ہی نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ چھت تو ضروری ہے اور اصل عمارت یہی ہے لیکن کوئی اور بنادے۔ اور بعض کہتے ہیں چھت تو ضروری ہے لیکن اس کے لئے ستونوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ چھت پہلے ڈال دی جائے بعد میں اپنی مرضی کے ستون بنالیں گے۔ یہ ہے وہ تفریق جو اس دین اللہ کی عمارت کے بارے میں امتِ مسلمہ نے کر رکھی ہے اور اپنے اپنے حصہ پر اکتفا کر کے خوش ہیں کہ دین ہمارے پاس ہے' حالانکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ اس کا ایک حصہ بنا کر بیٹھے ہیں یا بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بالفعل کافروں کے دین کے مطابق غیر اللہ یعنی طاغوت کی حکمرانی میں زندگی گزار رہے ہیں اور پھر بھی دین اسلام کے دعویدار ہیں' اور جن کافروں

اور مشرکوں کو دین اسلام کی دعوت دے رہے ہیں ان ہی کے نظام زندگی کو خود اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے معاشرے کے کچھ جدید دانشوروں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ دین اللہ کے غلبے کا معاملہ اول تو تھا نہیں اور اگر تھا تو صرف عربوں کے بارے میں تھا۔ باقی دنیا کے لئے تو یہ دین آیا ہی نہیں' اور اگر آیا بھی ہے تو اسے غالب کرنا ان کی ذمہ داری نہیں ہے جو اس دین کے دعویدار ہیں' بلکہ وہ طاغوت کی حکمرانی میں زندگی گزارتے ہوئے اور اسلام کی حقانیت کے دعوے کرتے ہوئے دین کے حق کی ادائیگی کی سند حاصل کرلیں گے!! ایں چہ بوالعجبی است؟

اگر وہ کبھی سنجیدگی سے اس آیت کریمہ پر غور کرتے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو واضح کرتی ہے' اور اس کے نزول کے مواقع کو سامنے رکھ کر اس کے سیاق و سباق پر غور کرتے تو بات سمجھنے میں کبھی رکاوٹ نہ رہتی۔ دیکھا جائے تو اصل معاملہ تکبرِ نفس کا ہے جو بیّنات کے بعد بھی حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔

پہلی بار یہ آیت سورۃ الصّف میں جنگِ احد کے بعد نازل ہوئی۔ یہ موقع تھا کہ جب مسلمانوں پر بہت مایوسی طاری تھی اور شکست نے ان کے حوصلے پست کردیئے تھے۔ ادھر یہود مدینہ شیر ہو گئے تھے اور اسلام کے خلاف مشرکین مکہ سے مل کر چالیں چلنے کے لئے سرگرم عمل تھے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مسلمانو ہمیں معلوم ہے یہ کافرو مشرک کیا کر رہے ہیں' لیکن جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ دین الحق تمام نظام زندگی پر غالب ہو۔ تمہیں وہ تجارت اختیار کرنا ہے جو تمہیں دنیا کی پسندیدہ فتح بھی دے گی اور اسی کے لئے جان و مال کھپانے پر آخرت میں فوز العظیم بھی ملے گی۔ دیکھو یہی معاملہ مسیح ؑ ابن مریم کے حواریوں کے ساتھ ہوا ہے کہ انہوں نے صبرو ثبات اختیار کیا تو اللہ نے انہیں غلبہ عطا کیا۔ لہٰذا تم بھی ہمارے اور ہمارے نبی ؐ کے انصار بن جاؤ۔

دوسری دفعہ بھی ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی سورۃ الفتح میں اسی آیہ مبارکہ کو نازل کر کے پھر یاددہانی کروادی کہ تم جلد بازی نہ کرو۔ یہ کام تو ہو کر رہتا ہے اور اللہ کا دین غالب ہو گا۔ بس تم ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بنو اور ان کے اوصاف اختیار کرو۔

تیسری بار یہ آیت عرب پر دین اللہ کے غلبہ کے بعد سورۃ التوبہ میں نازل ہوئی کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بس ہمارا کام مکمل ہو گیا بلکہ یہ دین تو پوری دنیا پر غلبہ کے لئے عطا کیا گیا ہے' اور یہود و نصاریٰ اور باقی تمام اقوام اس دین کے تابع ہو کر رہیں گے اور جزیہ دیں گے۔ اور اللہ کے دین کو کل روئے ارضی پر غالب کرنے کی جدوجہد تم پر لازم ہے کیونکہ ہم نے یہ دین تمام انسانیت کے لئے نازل کیا ہے۔ دیگر ادیان کے لئے اسلام کے تابع ہو کر رہنے کی گنجائش کا ذکر کیا گیا ہے' کیونکہ پہلے دو مرحلے تو مشرکین عرب کے لئے تھے جن کو یہ گنجائش حاصل نہ تھی۔ یہ تو اب باقی اقوام عالم کے لئے ہے جو اپنے ادیان پر باقی رہ سکتی ہیں لیکن ان کو مغلوب ہو کر رہنا ہو گا۔

حرفِ آخر

اس سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر اگر آیت پر غور کیا جائے تو یہ امر سامنے آجاتا ہے کہ یہ دین اللہ تعالیٰ نے تمام زمین کے لئے عطا کیا ہے اور اس کے غلبہ کی صورت تب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گی جب یہ تمام زمین پر نافذ ہو خواہ کسی گھر والے کی عزت سے یا ذلت سے۔ اور تہنیت ہے ان کے لئے جو اس میں وہ حق ادا کریں جو سورۃ الحج کی مذکورہ بالا آیت کے شروع میں فرمایا گیا : "وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" —— اب شاید سمجھ میں آجائے یہ حق جہاد جس کے یہ مراحل ہیں کہ پہلے اپنے نفس اور معاشرے میں الہدیٰ (قرآن حکیم) کے ذریعے آبیاری کرو اور مجاہدہ کرو۔ پھر باطل ادیان سے ٹکر لینے کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سمع و طاعت کے خوگر بنو اور جان وہاں کھپا دو تاکہ پوری زندگی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ پھر یہی نظام باقی تمام ادیان پر غالب کر دو تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت پورا ہو سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

پاکستان میں بلاسود معیشت
کے مسائل اور ان کا حل

جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

قرآن مجید میں بڑی صراحت اور شدت کے ساتھ ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس بات پر جملہ مکاتبِ فکر کے علماء کا اتفاق ہے کہ ربا کی اصطلاح موجودہ سود کی تمام شکلوں اور نوعیتوں پر حاوی ہے۔

صرفی قرضوں (Consumption Loans) پر سود کی ممانعت کا بڑا سبب جذبہ خیر خواہی ہے کہ ایسے قرضے زیادہ تر پریشان حال لوگ لیتے ہیں۔ البتہ پیداواری قرضوں پر سود کی حرمت کی عقلی توجیہ کی بنیاد اسلام کے معاشی و معاشرتی فلسفہ پر ہے جس میں معاشرتی انصاف کا قیام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرمایہ و محنت کے درمیان تعاون' جس کا اسلام قائل ہے' یہ ہے کہ دونوں نفع و نقصان میں شریک ہوں' جو نفع و نقصان میں شرکت کے نظام کے تحت ہی ممکن ہے۔

نظام اسلامی کے قیام میں سود کا خاتمہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے' اس لئے اس کے ہر دستور میں سود کے خاتمہ کو مملکت کی رہنما پالیسی کا ایک اہم جزو قرار دیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ ملکی معیشت سے سودی نظام کے خاتمہ کے لئے ۱۹۷۷ء تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا بلکہ ملک پر سودی قرضوں کا بوجھ ہر سال بڑھتا گیا۔ "عیبِ اُو جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کے مصداق ہمیں کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم و مغفور نے اسلامی نظریاتی کونسل کو خاص طور پر خاتمۂ سود کے بارے میں ایک جامع رپورٹ مرتب کرنے کا فریضہ سونپا۔ کونسل نے اپنی تشکیل جدید کے فوری بعد ماہرین معاشیات و بینکاری کا ۱۵ رکنی ایک پینل مقرر کیا، جسے خاتمہ سود کے بعض فنی پہلوؤں کا جائزہ لینے اور ایسے ذرائع اور تدابیر تجویز کرنے کی ذمہ

داری سونپی جن پر عمل کر کے نظام بینکاری کو شرعی تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکے۔ ان ماہرینِ معیشت اور بینکاروں کی مدد سے کونسل نے نومبر ۱۹۷۸ء میں عبوری رپورٹ اور جون ۱۹۸۰ء میں حتمی رپورٹ منظور کی۔ اور ۲۵ جون ۱۹۸۰ء کو یہ رپورٹ بزبانِ انگریزی راقم الحروف نے بحیثیت چیئرمین کونسل صدر جنرل ضیاء الحق کی خدمت میں بہ نفس نفیس پیش کی۔

اس رپورٹ کی صورت میں بنیادی کام ہو چکا ہے۔ حکومت کو اگلے قدم کے طور پر مختلف ورکنگ گروپس قائم کرنا تھے جو بلا سودی معیشت کی تفاصیل و جزئیات مرتب کریں تاکہ نئے نظام کے بنیادی تقاضے کماحقہ' پورے ہو سکیں۔ ۱۹۸۴ء تک صدر ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں بلا سود بینکاری کا تھوڑا بہت ذکر اخباروں میں آتا رہا، لیکن ۱۹۸۵ء سے منتخب جونیجو حکومت کے آنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ تا آنکہ نومبر ۱۹۹۱ء میں فیڈرل شریعت کورٹ کے سود کے خلاف فیصلہ نے لوگوں کو بھولا ہوا سبق پھر یاد دلایا' مگر حکومتِ وقت نے خاموشی سے اس کے خلاف اپیل دائر کر دی اور سارے معاملے کو سپریم کورٹ کے سرد خانے میں ڈال دیا۔

لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ سود کا خاتمہ اسلام کے مجموعی نظامِ معیشت کا صرف ایک حصہ ہے اور محض اس ایک اقدام سے پورے معاشی نظام کو اسلامی نقطہ نظر کے مطابق نہیں ڈھالا جا سکتا' تاوقتیکہ تعمیر اخلاق اور زندگی کی جھوٹی اقدار کے خاتمہ کے لئے اصلاحی اقدامات نہ کئے جائیں۔

چونکہ اب فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلہ کے بعد ملک میں بلا سود بینکاری کے لئے فضا ہموار ہو چکی ہے اس لئے ان اصلاحی اخلاقی اقدامات کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس مقصد کے لئے ذرائع ابلاغ کو حرکت میں لانا ضروری ہے' خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا کو' تاکہ لوگوں کو بلا سودی نظام کی تفصیلات اور تقاضوں سے باخبر کیا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ خوش دلی کے ساتھ نئے چیلنج کو قبول کریں اور اسلامی نظام کی کامیابی کے لئے مشنری جذبہ سے کام لیں۔

اسلامی نظام معیشت میں سود کا مثالی متبادل حل نفع و نقصان میں شراکت یا قرضِ

حسنہ کی صورت میں (اصل زر پر کوئی اضافہ یا زیادتی وصول کئے بغیر) رقم کی فراہمی ہے۔
اگرچہ کونسل کی سفارشات بڑی حد تک نفع ونقصان میں شرکت سے متعلق ہیں تاہم بعض
دوسرے طریقوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

نئے نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ حکومت ملک میں ٹیکس کے مروجہ نظام
خصوصاً انکم ٹیکس کا گہری نظر سے تنقیدی جائزہ لے اور اس کی تشخیص اور وصولی کے
طریق کار کو آسان بنائے تاکہ نفع ونقصان میں شراکت کے عملی اطلاق میں معاشرہ کے
موجودہ اخلاقی معیار کی بدولت پیش آنے والی مشکلات پر قابو پایا جاسکے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان دیگر متبادل طریقوں کی حیثیت اسلام کے
معاشی نقطہ نظر سے دوسرے بہتر حل سے زیادہ نہیں۔ اگرچہ متبادل طریقے اپنی موجودہ
شکل میں سود کے عنصر سے پاک ہیں، تاہم یہ خطرہ موجود ہے کہ مبادا انہیں سودی نظام میں
اس سے وابستہ خرابیوں کے از سرِ نو رواج کے لئے چور دروازہ کے طور پر استعمال کیا
جائے، لہٰذا ان کا استعمال ناگزیر حد تک کم سے کم کیا جانا چاہئے، نیز سرمایہ کاری کے عام
طریقوں کے طور پر ان کے استعمال کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں دیانت داری کے معیار کو بہتر بنانے اور ناخواندگی کو
دور کرنے کے لئے کوششوں کو تیز تر کیا جانا چاہئے، کیونکہ ناخواندگی اور بددیانتی دونوں
بلاسودی معیشت کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

اسلامی بنیادوں پر نظام بینکاری کی تشکیل کے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس
وقت رائج ایسے تمام قوانین میں تبدیلیاں کی جائیں جن کا بینکوں کی کارگزاری پر براہ
راست اثر پڑتا ہے تاکہ وہ قوانین شریعت کے مطابق ہو جائیں۔ مثلاً قانون شراکت
(Partnership Act)، قانون بیع مال (Sale of Goods Act)، قانون
انتقال جائیداد (Transfer of Property Act) وغیرہ۔

بحالاتِ موجودہ نفع ونقصان میں شراکت کے نظام کی کامیابی کے بارے میں عام طور
پر شبہات کا جو اظہار کیا جاتا ہے، اس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اکثر کاروباری فرمیں
اپنے حسابات یا تو بالکل نہیں رکھتیں یا غلط گوشوارے مرتب کرتی ہیں یا مختلف اغراض کے

لئے دوہرے تہرے حسابات تیار کرتی ہیں۔ اس صورتحال کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ملک کے ممتاز ترین ماہرین معیشت اور علماء شریعت نے باہمی مشاورت سے حسب ذیل متبادلات تجویز کئے ہیں جو سودی نظام کا بدل ہو سکیں اور شریعت سے مطابقت بھی رکھتے ہوں۔

متبادل طریقے حسب ذیل ہیں :

الف) حق الخدمت (سروس چارج)

اگر سود کی جگہ حق الخدمت رائج کر دیا جائے تو بینک اور دیگر مالیاتی ادارے اصل زر مع حق الخدمت کی واپسی کی مکمل ضمانت کے ساتھ قرضے فراہم کریں گے۔ یہ حق الخدمت اس قدر ہو گا جس سے مالیاتی اداروں کے انتظامی مصارف پورے ہو سکیں۔

ب) پٹہ داری (Leasing)

طویل المیعاد سرمایہ کاری کے لئے پٹہ داری ایک نیا طریقہ ہے جو صنعتی ممالک میں روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس طریقے میں پٹہ دہندہ اثاثے کی ملکیت اپنے پاس رکھتا ہے اور پٹہ گیرندہ ایک مقررہ مدت کے دوران طے شدہ کرایہ کے عوض اثاثہ پر قبضہ رکھتا اور اسے استعمال کرتا ہے۔ اس طریقے کے استعمال سے بینک اور دیگر مالیاتی ادارے براہ راست اپنے پٹے پر دینے والے ذیلی اداروں کی معرفت اور فرموں کے حسابات کے پڑتال کئے بغیر درمیانی اور طویل المیعاد سرمایہ کاری فراہم کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

ج) سرمایہ کاری بذریعہ نیلام کاری (Investment by Auction)

اس طریق کار کے تحت تجارتی بینک ایک مشترکہ ادارہ قائم کر سکیں گے جو طویل المیعاد سرمایہ کاری کے اداروں کے تعاون سے مکمل تفاصیل کے ساتھ صنعتی منصوبے مرتب کرے گا۔ بعد ازاں اس یقین دہانی کے ساتھ ان منصوبوں کا اعلان کرے گا کہ جو کوئی اس میں دلچسپی رکھتا ہو' اسے ضرورت کے مطابق مخصوص ساخت کا پلانٹ اور مشینری بھی مہیا کی جائے گی اور متوقع سرمایہ کاروں سے مشینری کی خرید کے لئے بولی طلب

کرے گا۔ منصوبہ ایسی پارٹی کو فروخت کر دیا جائے گا جس نے سب سے زیادہ بولی دی ہو، بشرطیکہ اس کی مالی حیثیت مضبوط ہو، ورنہ دوسرے نمبر پر جس کی بولی سب سے زیادہ ہو، اسے دے دیا جائے گا، یہ بات ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ وہ خوش اسلوبی سے منصوبے کو پورا کرنے کا اہل ہو۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے اس نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سرمایہ کار کی ادا کردہ قیمت سے منصوبے کی نفع بخشی باآسانی متعین ہو سکے گی جو وسائل کی کامیاب تعیین کے لئے بہت ضروری ہے۔

د) بیع مؤجّل (Deferred Sale)

یہ بیع کی وہ قسم ہے جس میں فروخت کردہ مال کی قیمت بعد کی کسی تاریخ کو یک مشت یا اقساط میں قابل ادا ہوتی ہے۔ یہ طریق کار صنعت و زراعت کی ضروریات کے لئے سرمایہ بہم پہنچانے نیز گھریلو اور برآمدی تجارت کے لئے سرمایہ کاری کے سلسلہ میں بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس طریق کار کو فقہی اعتبار سے جائز سمجھا جاتا ہے، تاہم اسے وسیع پیمانے پر یا بغیر امتیاز کے استعمال کرنا فائدہ مند نہ ہو گا کیونکہ اس سے سودی لین دین کے لئے چور دروازہ کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اس طریق کار کے استعمال کو محض ناگزیر صورتوں میں محدود کرنے کے لئے تحفظات تلاش کرنے ہوں گے۔

ہ) ملکیتی کرایہ داری (Hire-purchase)

اس طریق کار کے تحت بینک مشینری اور ساز و سامان نیز اشیائے ضرورت کی خرید کے لئے مشترکہ ملکیت کے نظام کے تحت جو ضمانت یا کفالت کی فراہمی کے تابع ہو گا، سرمایہ فراہم کریں گے۔ وہ اصل زر کے علاوہ ان اشیاء کی نقد کرایہ دارانہ قیمت میں سے مجموعی سرمایہ کاری میں اپنے واجب الادا حصہ کی نسبت سے اپنا حصہ وصول کر سکیں گے۔

و) عمومی شرح منافع پر سرمایہ کاری

اس نظام میں ایک خصوصی سرکاری ایجنسی قائم کی جائے گی جو یہ طے کرے گی کہ کسی صنعت یا کاروبار میں عام طور سے کتنا نفع واقع ہوتا ہے۔ بینک کاروباری حضرات کو

سرمایہ فراہم کریں گے اور کاروباری لوگ یہ یقین دہانی کرائیں گے کہ وہ کم از کم اتنی شرح سے بینک کو نفع ادا کریں گے۔ اگر منافع کی اصل شرح مقرر کردہ عمومی شرح منافع سے بڑھ جائے تو کاروباری لوگ رضاکارانہ طور پر نفع کا فرق سرمایہ فراہم کرنے والے ادارہ کو ادا کریں گے۔ لیکن اگر شرح منافع گر جائے یا نقصان واقع ہو جائے تو کاروبار کرنے والے کو مخصوص سرکاری ایجنسی کے اطمینان کے لئے اس کا ثبوت پیش کرنا ہو گا تاکہ وہ ادارہ منافع کی کم شرح قبول کر لے یا نقصان میں شریک ہو جائے۔ تاہم اس غالب امکان کے پیش نظر کہ اس طریق کار کے عام استعمال سے دوبارہ سودی کاروبار شروع ہو جائے گا' اسے انتہائی محدود پیمانے اور ناگزیر ضرورت کے تحت بروئے کار لانا چاہئے۔

ز) قرض بعوض قرض

اس طریقے کے تحت بینک اپنے کسی گاہک کی جمع کروائی ہوئی غیر سودی امانت کی بنیاد پر اس گاہک کو سود سے پاک قرضہ' امانت کی رقم سے زیادہ مقدار میں اتنی مدت کے لئے دے سکیں گے کہ امانت اور قرض دونوں کے تعلق میں رقم کی یافت اور اس مدت کی یافت' جس کے لئے رقم دی گئی' برابر ہو جائے۔ تاہم اس طریقے کو سودی نظام کے مستقل متبادل کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہو گا۔ چھوٹے کاروباری حضرات کو ذاتی قرضے دینے کے لئے بینک مذکورہ بالا شرائط کے بجائے' اس چیز کو بطور اصول اپنا سکتے ہیں کہ وہ ذاتی اور غیر پیداواری قرضے صرف ان اشخاص کو فراہم کریں جو پہلے سے بینک میں کھاتہ دار ہوں۔ واپسی کا گوشوارہ اور قرض کی رقم کا گوشوارہ مرتب کرتے وقت بینک قرض کے لئے درخواست دہندہ کی کھاتہ میں موجود رقم نیز اس مدت کو مد نظر رکھے گا جس کے دوران اس کی رقم بینک میں موجود رہی۔

ح) خصوصی قرضے

اس سہولت کے تحت بینک اور مالیاتی ادارے ایسی صورتوں میں بلا سود قرضے دے سکیں گے جن میں نہ تو نفع و نقصان میں شراکت' نہ ہی کوئی دوسرا متبادل طریقہ قابل عمل ہو' بشرطیکہ یہ قرضے عام معاشرتی فلاح و بہبود کے مقاصد یا منصوبوں کے لئے دیئے گئے

ہوں۔ تاہم مالیاتی اداروں کی نفع آوری پر ایسے قرضوں کے اثرات کو کم سے کم تر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے محدود اور ناگزیر صورتوں میں استعمال کیا جائے۔

قدیم فقہی ذخیرۂ کتب کی روشنی میں شراکت سے متعلق ایک عام شرط یہ ہے کہ حصہ دار نفع میں حصہ داری کا کوئی تناسب طے کرنے کے مجاز ہوتے ہیں لیکن نقصان سرمایہ میں حصہ کی نسبت سے برداشت کرنا پڑتا ہے' جب کہ مضاربت کی صورت میں نفع میں ایک معیّنہ حصہ کے بقدر دونوں شریک ہوتے ہیں لیکن نقصان کی صورت میں سارا بوجھ رب المال یعنی سرمایہ کار کو اٹھانا پڑتا ہے اور مضارب یعنی محنت کار کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔

لیکن بحالاتِ موجودہ نفع و نقصان میں شرکت کے مجوزہ نظام کے تحت مالیاتی اداروں اور کاروباری و صنعتی اداروں کے مابین منافع کی تقسیم کو ملک کے اسٹیٹ بینک کے ذریعے باضابطہ بنایا جا سکتا ہے۔ نیز مالیاتی اداروں کو زیر تکمیل منصوبوں کا معائنہ نیز کاروباری اداروں کے حسابات کے جانچ پڑتال اور فیصلہ کن پالیسی امور میں حصہ لینے کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

سرمایہ کی فراہمی میں کسی رکاوٹ سے بچنے اور اس کے حصول کو مسلسل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ بینکوں کی جو رقوم واجب الادا ہوں ان پر عدم ادائیگی کی صورت میں جرمانہ عائد کیا جا سکے۔ تاہم یہ جرمانہ بینکوں کو نہیں ملنا چاہئے بلکہ سرکاری خزانہ میں جمع کیا جانا چاہئے۔ چونکہ ادائیگی میں معقول وجوہ کے بغیر تاخیر یا ناکامی سے نہ صرف اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی بلکہ یہ بات نئے نظام کی کامیابی کے لئے بھی ضرر رساں ثابت ہو گی' اس لئے نادہندگان کو سخت سزا دی جائے جس میں جائیداد کی ضبطی بھی شامل ہو۔ تاخیر کے مرتکب افراد کو ناپسندیدہ فہرست (Black List) میں شمار کیا جائے اور انہیں آئندہ بینکوں سے کوئی مالی امداد نہ دی جائے۔

بلا سود معیشت کی کامیابی کے لئے یہ لازمی ہو گا کہ بینکوں کو سرمایہ کاری سے متعلق موصول ہونے والی تجاویز کے قبول یا استرداد کی مکمل اور غیر مشروط آزادی ہو۔ ایسے سرکاری اداروں کو جو صحت مند بینک کاری کے معیار پر پورے نہ اتریں یا تو کوئی جداگانہ سرکاری ایجنسی سرمایہ فراہم کرے یا بینکوں کو سرمایہ کی واپس ادائیگی کی ضمانت دی جائے

اور حکومت کی طرف سے انہیں اتنی امداد مہیا کی جائے جو بینک کی اوسط شرح نفع کے مساوی ہو۔ مجوزہ نظام کو کامیاب بنانے کے لئے جانچ پڑتال کے نظام میں اس وقت متعدد خرابیاں موجود ہیں' ان کی بنیادی اصلاح کرنا بھی ضروری ہے۔

خاتمہ سود کے کام کو مرحلہ وار تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں سرکاری لین دین (جو حکومت اور سٹیٹ بینک و تجارتی بینکوں کے مابین ہوتا ہے)' بعض وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے مقامی حکومت کے اداروں اور خود مختار کارپوریشنوں کو بلا نفع لیکن لازمی منصوبوں کے لئے دیئے جانے والے قرضوں' نیز تقاوی قرضوں' سرکاری ملازمین کو دیئے جانے والے قرضوں' سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کے بقایا جات' سرکاری واجبات کی عدم ادائیگی پر ہونے والے جرمانوں' موسمی ضروریات کے لئے تجارتی بینکوں کی طرف سے کسانوں کو دی جانے والی سرمایہ کاری' ذرائع آمد و رفت کے لئے سمال بزنس کارپوریشن کی طرف سے مہیا کی جانے والی رقوم' نیز آئی' سی' پی کی طرف سے سرمایہ کاری کی اسکیم کے تحت دیئے جانے والے قرضوں کو شامل کیا جانا چاہئے۔

دوسرے مرحلہ میں بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کے ان اثاثوں سے' جو اندرونِ ملک لین دین میں استعمال کئے جاتے ہیں' سود کو مکمل طور پر ختم ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ سرکاری کاروبار میں اگر کچھ گوشے ایسے رہ گئے ہوں جن میں سودی لین دین ہوتا ہو تو اس کا بھی استیصال کیا جانا چاہئے۔

اندرون ملک کاروبار سے خاتمہ سود کے اس دوسرے مرحلہ میں بینکوں کو سود کی بنیاد پر لوگوں کی امانتیں جمع نہیں کرنی چاہئیں بلکہ نفع و نقصان میں شرکت کی بنیاد پر رقوم جمع کرنا چاہئے۔ بینکوں کے مابین ہونے والا کاروبار بھی نفع و نقصان میں شرکت کے نظام پر ہونا چاہئے۔ نیز سٹیٹ بینک' دوسرے بینک اور مالیاتی اداروں کو جو سرمایہ فراہم کیا جائے اس پر سود کا لین دین نہیں ہونا چاہئے۔

بین الاقوامی تجارت اور امداد کو سود سے پاک کرنے کا عمل' جس کے ساتھ سب سے زیادہ مشکلات وابستہ ہیں' تیسرے اور آخری مرحلہ میں مکمل ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں اسلامی ممالک کے مابین اقتصادی تعاون کو فروغ دینا ضروری ہے۔ نیز غیر ملکی

اداروں سے نفع و نقصان کی بنیاد پر باہمی اقتصادی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ اِس وقت ہم نے جو غیر ملکی قرضے سود پر لے رکھے ہیں یہ سلسلہ جلد از جلد بند ہونا چاہئے اور دوسری طرف سے قرضوں کو اتارنے کی حقیقی کوشش کرنی چاہئے اور لوگوں کو محنت کی عادت ڈلوانی چاہئے۔ غیر ضروری اخراجات کو ختم کیا جانا چاہئے۔ زکوٰۃ و عشر کے نظام کو از سرنو ترتیب دیا جانا چاہئے۔ حکم قرآنی "وَاٰتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ" کے بموجب کھیتی کٹنے کے دن اللہ کا یعنی معاشرہ اور سوسائٹی کا حق ادا کرو۔ چنانچہ قرآن و سنت کے مطابق سختی کے ساتھ عشر وصول کیا جانا چاہئے اور اس سلسلے میں شیعہ سنی کی تفریق ختم ہونی چاہئے۔ وما علينا الا البلاغ۔

مصر کے مشہور عالم اور الاخوان المسلمون کے مشہور لیڈر سید قطب شہید ؒ نے جنہیں صدر ناصر کی آمریت کو چیلنج کرنے کے جرم میں اس کے حکم سے الاخوان المسلمون کے دیگر زعماء کے ساتھ سزائے موت دی گئی، اپنی تفسیر قرآن "فی ظلال القرآن" کی جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیات متعلقہ سود کے تشریح میں صاف صاف یہ بات لکھی ہے کہ "اسلام اور سود ایک ساتھ نہیں چل سکتے"۔ اب یہ فیصلہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اسلام کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں یا سود کے ساتھ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اجتماعِ ضدین ایک امر محال ہے۔ نائب صدر اسلامی ترقیاتی بینک (جدہ) سعید احمد مینائی صاحب جو قبل ازیں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے اکانومک ایڈوائزر بھی رہ چکے تھے، ازراہ کرم مجھ سے ملاقات کے لئے کونسل کے دفتر میں تشریف لائے (شاید انہیں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بلاسود بینکاری کے سلسلہ میں مشورہ کے لئے بلایا تھا) ان سے دو طویل ملاقاتیں رہیں۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ تھا کہ ہمارے حکمرانوں میں "ایمان" کی کمی ہے ورنہ اسلامی بینکاری کا نفاذ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے کہ حل ہی نہ ہو سکے۔ اور میں نے یہی بات اکتوبر ۱۹۸۳ میں سورۂ جاثیہ کی ابتدائی آیات کے حوالہ سے جنرل ضیاء الحق کی صدارت میں ہونے والے کابینہ کے اجلاس میں عرض کی تھی جس پر جنرل صاحب موصوف نے ذرا تیز لہجہ میں فرمایا تھا: "ہمارے پاس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کے درجہ کا ایمان نہ ہو مگر الحمد للہ ہم سب صاحب ایمان ہیں"۔ بحیثیت چیئرمین کونسل آف

اسلامک آئیڈیالوجی (۸۴-۱۹۸۰) اور چیف جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ (۹۲-۱۹۹۰ء) جنرل ضیاء الحق، غلام اسحاق خان، محمد نواز شریف اور بعض وزراء کے ساتھ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں میرا رابطہ رہا۔ میں اپنے وسیع مطالعہ، طویل تجربہ اور براہ راست مشاہدہ کی بنیاد پر پورے یقین و اذعان کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ پاکستان کے حکمرانوں میں نفاذ شریعت کے معاملہ میں دل و نگاہ کی مسلمانی اور سیاسی عزم (Political Will) کا فقدانِ عظیم نفاذ شریعت کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سلسلے میں چند کلیوں پر قناعت کر جانے والے علماء کو بھی میں ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ انہوں نے غضِ بصر (چشم پوشی)، کتمانِ حق (حق بات کو چھپانا)، ذاتی مفاد اور مصلحت اندیشی اور کم کوشی سے کام لیا جس کے نتیجے میں موجودہ صورت حال پہلے سے بھی ابتر ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے: دل و نگہ جو مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

بقیہ: شہادت علی النّاس

"مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کی صدا کی۔ یہی صدا ہے جو بلند کی ہے امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے۔ آیئے آگے بڑھیں اور اپنے نفس کو سمع و طاعت کا خوگر بنا کر کمرہمت کسیں اور اللہ کے دین کو پہلے پاکستان اور پھر پوری دنیا پر غالب کرنے کی جدّوجُہد کا آغاز کریں اور اس کے لئے قرآن مجید کو ذریعہ بنائیں اپنی دعوت کا اور حق تبلیغ بھی ادا کریں۔ تبلیغ اس کی فرض ہے اور دعوت اس کے ذریعہ ہی دینا ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شہادت الدین اور دین الحق کی فرضیت کا شعور عطا کرے اور پھر اس کام کے لئے لبیک کہنے کی توفیق بھی دے۔

واللّٰہ المستعان علیٰ ما تصفون، والحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

امتِ مسلمہ کی عمر(۴)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبہ دعوت و ثقافت، دعوت اسلامی کالج، جامعہ الازہر

کی معرکہ الاراء کتاب "عمر امّۃ الإسلام وقرب ظہور المہدی" کا

تیسرا باب

مترجم : پروفیسر خورشید عالم، قرآن کالج لاہور

چوتھی فصل

ظہورِ مہدی کی علامت اور اس کی بیعت

پہلے وہ احادیث پیش خدمت ہیں جو ظہور مہدی کے بارے میں ہیں۔

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کا جسم (ڈر کی وجہ سے) حرکت کرنے لگا(۱) تو ہم نے کہا : اے اللہ کے رسول! آیا آپ نے خواب میں ایسی بات کی جو آپ نے پہلے کبھی نہیں کی۔ آپؐ نے فرمایا : "عجیب بات ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ قریش کے ایک آدمی کو پکڑنے کے لئے بیت اللہ کی طرف جا رہے ہیں۔ اس آدمی نے بیت اللہ میں پناہ لی ہوئی ہے۔ جب وہ کھلے میدان ہوں گے تو وہ زمین میں دھنس جائیں گے"۔ ہم نے پوچھا : اے اللہ کے رسول! ہر قسم کے لوگ راستے میں جمع ہوں گے؟ آپ نے فرمایا : "ہاں، کچھ لوگ

تو سوچ سمجھ کر ایک مقصد کے لئے آئیں گے، کچھ مجبوراً آئیں گے اور کچھ مسافر ہوں گے۔ وہ سب ایک ساتھ ہلاک ہو جائیں گے مگر قیامت کے دن مختلف حالتوں میں نکلیں گے۔ اللہ ان کو ان کی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔" {۲}

۲۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک پناہ لینے والا بیت اللہ کی پناہ لے گا۔ اس کی طرف ایک لشکر بھیجا جائے گا۔ ابھی وہ وہیں ہوں گے کہ زمین میں دھنس جائیں گے۔" {۳}

۳۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس گھر کی پناہ میں کچھ لوگ آئیں گے، وہ محفوظ نہیں ہوں گے، نہ ان کے پاس لڑنے کے لئے نفری ہو گی نہ سامان جنگ، ان کی طرف ایک فوج بھیجی جائے گی، جب وہ کھلی جگہ میں ہو گی تو زمین میں دھنس جائے گی۔" {۴}

۴۔ "ایک لشکر اس گھر پر چڑھائی کا قصد کرے گا، یہاں تک کہ جب وہ کھلی جگہ میں پہنچے گا، اس کا درمیانی حصہ زمین میں دھنس جائے گا۔ پہلا حصہ آخری حصے کو بلائے گا، پھر وہ بھی دھنس جائیں گے۔ ان کی خبر بتانے کے لئے سوائے ایک بھگوڑے کے کوئی باقی نہیں رہے گا۔" {۵}

۵۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "رکن اور مقام (ابراہیم) کے درمیان ایک آدمی کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔" {۶}

۶۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "میری امت کا ایک لشکر شام کی جانب سے آئے گا۔ وہ ایک آدمی کو پکڑنے کے لئے بیت اللہ کا قصد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے گا۔" {۷}

اس باب کی دوسری فصل میں ہم نے مہدی کا نام اور اس کی صفات پیش کی ہیں کہ اس کا نام محمد بن عبداللہ ہو گا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی نسل سے کشادہ پیشانی والا اور درمیان سے بلند ناک والا نوجوان ہو گا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ صفات تو بہت سے انسانوں میں پائی جا سکتی ہیں۔ اس صورت میں مہدی کا معاملہ ہمارے لئے مشتبہ ہو سکتا تھا۔ لازمی طور پر کوئی ایسی واضح نشانی ہونی چاہئے جو اس کے علاوہ اور کسی میں نہ پائی جائے تاکہ جب

اس کا ظہور ہو تو واضح علامت کے باعث اس کے بارے میں دو آدمیوں کی رائے مختلف نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے مسیح دجال کی کامل مکمل صفات کا ذکر کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ حضور ﷺ اس کی شکل کو اس سے بھی بڑھ کر جانتے تھے۔ {۸} آپ نے ایک ایسے وصف کا ذکر کیا ہے جو صرف اسی میں ہو گا۔ یعنی دجال کی آنکھوں کے درمیان "کافر" کا کلمہ لکھا ہوا ہو گا' اسے ہر پڑھا لکھا اور ان پڑھ مومن بھی پڑھ سکے گا۔

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی صفات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تفصیل {۹} سے بیان کیا ہے۔ نہ ہمارے لئے ان کا معاملہ مشتبہ ہو گا اور نہ کسی اور پر ڈھکا چھپا رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ آسمان سے اس کیفیت میں اتریں گے کہ کسی دوسرے میں وہ کیفیت نہیں پائی جا سکتی' یعنی وہ اللہ کے فرشتوں میں سے دو قابل احترام فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں گے۔

کیا کوئی ایسی منفرد اور واضح نشانی ہے جس سے ہمیں یقین ہو جائے کہ محمد بن عبداللہ جن کی صفات کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے اور جس کے ہاتھ پر رکن اور مقام ابراہیم پر بیعت ہو گی' یہی وہ مہدی ہیں جن کا انتظار ہو رہا ہے۔

ظہورِ مہدی کی یقینی علامت

کعبہ شریف کے نزدیک مہدی کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔ رکن اور مقام ابراہیم {۱۰} کے درمیان وہ لوگ بیعت کریں گے جن کے پاس نہ کوئی قوت ہو گی' نہ تعداد اور نہ ہی سازو سامان {۱۱} وہ کعبہ شریف کی پناہ لیں گے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر ان سے لڑنے کے لئے بھیجا جائے گا تاکہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ "عجب بات تو یہ ہے کہ میری امت کے لوگ کعبے کا قصد کریں گے تاکہ قریش کے اس آدمی کو پکڑیں جس نے بیت اللہ میں پناہ لی ہو گی۔ یہاں تک کہ مدینہ سے تھوڑی دور ذی الحلیفہ کے مقام پر زمین میں دھنس جائیں گے۔ یعنی زمین پھٹ کر ان کو نگل جائے گی۔ ایک یا دو بگوڑے بچیں گے جو لوگوں کو دھنسنے کے واقعہ کی خبریں دیں گے۔" اس وقت سب کو معلوم ہو جائے گا کہ بیت اللہ کا یہ پناہ

گزین ہی خلیفۃ اللہ مہدی ہے۔ وہ ایسا انسان ہے کہ جس کے احترام اور دفاع کی خاطر اللہ فوج کو زمین دوز کردے گا۔

یہ دیکھ کر لوگ گروہوں اور جماعتوں کی شکل میں ان کی بیعت کریں گے۔ شام کے ابدال (صالحین) اور عراق کے اولیاء اور نیک لوگوں کی جماعتیں اس کے پاس آکر ان کی بیعت کریں گی اور سب پر ان کی بیعت واجب ہوگی۔ پس ظہورِ مہدی کی یقینی علامت یہ ہے کہ جو فوج ان کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجی جائے گی وہ زمین میں دھنس جائے گی۔

اس فصل کے خاتمہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان خاص امور کی طرف اشارہ کردیں جن کا تعلق مہدی کے ظہور اور ان کی بیعت سے ہے۔

۱۔ ہمارے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے جس کی بناء پر ہم اس بات کا تعین کرسکیں کہ کعبہ کے نزدیک ان کی بیعت سے پہلے مہدی کا خروج کس جہت سے ہوگا۔ ایک روایت ہے کہ ان کا خروج مشرق سے ہوگا۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب (الفتن و الملاحم)[۱۲] میں یہی قطعی رائے پیش کی ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ خروج مغرب سے ہوگا۔ اس کا تذکرہ امام قرطبی[۱۳] نے کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مدینہ کا ایک آدمی بھاگ کر مکہ جائے گا' جیسے کہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس کے آغاز میں یہ لکھا ہے کہ اختلاف خلیفہ کی موت کے وقت ظاہر ہوگا۔ اس کی سند میں مشہور قول ہے۔[۱۴]

میری رائے یہ ہے کہ عین ممکن تھا کہ جس طرح مہدی کی صفات اور علامات کے بارے میں واضح نصوص وارد ہوئی ہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی کوئی واضح نص اس کے خروج کی جگہ کا تعین کردیتی مگر اللہ کی ایک خاص حکمت کے تحت یہی بہتر تھا کہ ان کے خروج کی جگہ اور ان کی روانگی کے مقام کو مخفی رکھا جائے تاکہ قیام گاہ محفوظ رہے' خواہ یہ قیام گاہ مشرق میں ہو یا مغرب میں اور دشمن مکر کے تیر ان پر برسا کر اور جام غضب ان پر انڈیل کر انہیں ایذا نہ پہنچا سکیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب نبی معصوم ﷺ کی کوئی حدیث ان تک پہنچ کر مکان کا تعین کر دیتی' غالباً یہی وہ حکمت ہے جس کے تحت مہدی کے خروج کے مقام کو ہم سے مخفی

رکھا گیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں لشکر کے زمین میں دھنسنے کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ جب مہدی کو پکڑنے کے ارادے سے لشکر تیز تیز چل رہا ہوتا ہے جو لشکر کا درمیانی حصہ زمین میں دھنس جاتا ہے۔ زمین میں دھنس کر وہ آخری حصے کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ باقی لشکر کے بھی ہوش اڑ جاتے ہیں اور اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو پکارنے لگتے ہیں۔ فوج کا اگلا حصہ پچھلے حصے کو پکارتا ہے مگر جواب ملنے سے پہلے ان کو بھی عذاب آلیتا ہے۔ دھنسنے سے پہلے زمین کے اندر سے آوازوں کا شور اور گونج سنائی دیتی ہے۔ اس عذاب سے صرف ایک یا دو آدمی بچتے ہیں جو لوگوں کو بتاتے ہیں کہ لشکر پر کون سی بلا نازل ہوئی۔

۳۔ مہدی اور ان کے ساتھیوں کے پاس نہ نفری ہوگی نہ سامانِ جنگ اور نہ کوئی اور طاقت۔ جو لشکرِ جرّار ان کے خاتمے کے لئے نکلے گا وہ پیادہ فوج پر مشتمل ہوگا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مجدون والی اتحادی جنگ جو ظہور مہدی سے تھوڑی دیر پہلے ہوگی ایک تباہ کن جنگ ہوگی جس میں میزائل، لڑاکا ہوائی [۱۵] جہاز اور جنگی اہمیت کا دوسرا اسلحہ فنا ہو جائے گا۔ وگرنہ اس لشکر کو شام سے مکہ تک صحرانوردی کی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ معاملہ کی نزاکت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ جہازوں کے ذریعہ مہدی کی رہائش تک پہنچ جاتے جیسا کہ ۱۴۰۰ھ (۱۹۸۰ء) میں حرم شریف کے حادثہ میں ہوا تھا جہاں طیاروں نے حرم شریف کے اوپر پرواز کی تھی تاکہ ان بنیادوں پر بم پھینکیں جن میں مسلح افراد پناہ لئے ہوئے تھے۔

۴۔ لشکر کے زمین میں دھنسنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان سے انتقام لیا اور عبرتناک سزا دی۔ کیونکہ زمین میں دھنسنا بھی ایک قسم کا عذاب اور انتقام ہے، اگرچہ حدیث میں ان آدمیوں کے درمیان تمیز کی گئی ہے جو جنگ کے ارادے سے نکلے تھے اور جو بامر مجبوری نکلے تھے یا جو مسافر تھے اور اس عذاب کے وقت ذوالحلیفہ کے مقام پر اتفاقاً موجود تھے۔ حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق قیامت

کو اٹھایا جائے گا۔ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم اس بدنصیب اور خستہ حال لشکر میں شامل ہوں جس کو اللہ زمین میں دھنسا دے گا' تاکہ خلیفہ آخرالزماں مہدی منتظر محمد بن عبداللہ بن الحسن بن فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کو تائید غیبی حاصل ہو۔

پانچویں فصل

مہدی کے زمانے میں ہونے والی خونی جنگیں

جونہی لشکر زمین میں دھنسے گا مہدی کا چرچا ہو جائے گا' اس کا نام بلند ہو جائے گا اور مشرق و مغرب سے بیعت کرنے والوں کے وفد اس کے پاس آئیں گے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مدد کا وعدہ کریں گے اور اللہ کے نام کی سربلندی کے لئے اس کی بیعت کریں گے ان کا نعرہ ایک ہی ہو گا "فتح یا شہادت"۔ مہدی کی خاطر موحدین کا ایک لشکر جمع ہو جائے گا۔ انہیں آرام و سکون کی فرصت نہ ہو گی' وہ تو ایسے معرکوں اور جنگوں میں کود پڑیں گے جن میں آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو جائیں گی' تلواریں چمکیں گی' گھوڑے ہنہنائیں گے اور دل اچھل کر حلق میں آجائیں گے۔ مقتولین کی تعداد اتنی زیادہ ہو گی اور خون کی اس قدر فراوانی ہو گی کہ گھوڑے اس خون میں کودتے پھریں گے۔ ارتداد کا فتنہ سخت ہو گا۔ ہم اللہ سے سلامتی اور ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔

اگر ہم مہدی کی جنگوں پر طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ وہ دنیا بھر سے اور سارا عالم ان سے جنگ کرے گا۔ یہ سب واقعات چند مہینوں کے مختصر سے عرصہ میں انجام پذیر ہوں گے۔

مہدی جہاد کریں گے :

- جزیرۃ العرب کے عرب مسلمانوں سے
- فارس کے شیعہ مسلمانوں سے

- امریکہ اور روس (روم) سے
- لادین ترکوں سے (قسطنطنیہ میں)
- یہودیوں سے
- روما سے
- کمیونسٹوں سے (خوزستان و کرمان میں)

ان سب جنگوں میں مہدی علیہ السلام کی فوج کو فتح ہو گی۔ سب تعریفوں کا سزاوار وہ ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔

مہدی کی بڑی بڑی جنگوں کی وقتی (زمانی) ترتیب

مہدی کی پہلی جنگیں بالترتیب جزیرۃ العرب (سعودی عرب) فارس (ایران) روم' قسطنطنیہ' یہودیوں' مغرب کے عیسائیوں (اٹلی) ترکوں اور خوزستان و کرمان (چین' روس' جاپان) کے ساتھ ہوں گی۔ اس کی تفصیل یوں ہے :

پہلے ان احادیث کا ذکر جو اس سلسلہ میں مروی ہیں :

۱۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "پہلے تم جزیرۃ العرب پر چڑھائی کرو گے۔ اللہ تمہیں فتح دے گا۔ پھر فارس پر' پھر روم پر حملہ کرو گے۔ اللہ تمہیں فتح دے گا۔ پھر تم دجال سے جہاد کرو گے۔ اللہ تمہیں فتح دے گا"[۱۶]

۲۔ اللہ کے رسول ﷺ کا قول ہے : "بیت المقدس کی آبادی کے بعد یثرب کی بربادی ہو گی۔ یثرب کی بربادی کے بعد خونریز معرکہ کا آغاز ہو گا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ فتح ہو گا اور اس کے بعد دجال کا ظہور ہو گا"[۱۷]

۳۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک مسلمان یہودیوں سے لڑ نہ لیں۔ مسلمان ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ ایک یہودی کسی درخت یا پتھر کی اوٹ میں چھپ جائے گا تو وہ درخت یا پتھر پکار اٹھے گا : "اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے یہودی ہے' آؤ اسے قتل کرو۔ صرف غرقد (کانٹے دار جھاڑی جو بیت المقدس کے قرب و جوار میں ہوتی ہے' جو

چھونے والے کو تکلیف دیتی ہے) کا درخت یہ بات نہیں کہے گا کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے"۔ {۱۸}

۴۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "اس وقت تک قیامت بپا نہیں ہوگی جب تک تم خوزستان اور کرمان کے عجمیوں سے جنگ نہ کرلو گے جن کے چہرے سرخ، ناک چپٹے اور آنکھیں چھوٹی ہوں گی، یوں معلوم ہوگا جیسے ان کے چہرے ہتھوڑوں سے کوٹی ہوئی ڈھالیں ہیں"۔ {۱۹}

۵۔ اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا گیا : قسطنطنیہ یا روم میں سے کونسا شہر پہلے فتح ہوگا؟ آپ ؐ نے فرمایا : ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا" {۲۰} یعنی قسطنطنیہ روم سے پہلے فتح ہوگا۔

مہدی کی جنگوں کی تفصیل

پہلی جنگ: جزیرۃ العرب کی جنگ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا :

"تم جزیرۃ العرب پر چڑھائی کرو گے۔ اللہ تمہیں فتح دے گا"۔

یہ اس زمانہ میں ہوگا جب اہل روم عہد شکنی کرکے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے فوج جمع کرلیں گے۔ لشکر کے دمشق جانے کے بعد مہدی سے لڑنے والا سب سے پہلا لشکر یہی جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کا لشکر ہوگا۔ {۲۱} سفیانی نامی قریش کا ایک آدمی یہ لشکر تیار کرے گا اور اپنے ننھیال بنو کلب {۲۲} سے مدد لے گا۔ وہ مہدی سے جنگ کے لئے نکلیں گے۔ مہدی ان کو بدترین شکست دے گا۔ بڑا مال غنیمت اس کے ہاتھ لگے گا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ نامراد وہ ہے جو بنو کلب کی غنیمت میں موجود نہ ہوگا۔ اس جنگ کے بعد جزیرۃ العرب مہدی کے لئے اپنے دروازے کھول دے گا۔ وہ اس پر قبضہ جمالے گا اور پورے علاقے کو زیر نگین کرے گا۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کی یہ بات سچی ثابت ہوگی کہ تم جزیرۃ العرب پر یورش کرو گے اور اللہ اسے تمہارے لئے فتح کردے گا۔

دوسری جنگ : فارس (ایران) کی جنگ

نبی ﷺ نے فرمایا :

"اور تم فارس پر حملہ کرو گے اور اللہ اسے تمہارے لئے فتح کر دے گا"۔

فارس (ایران) سے امامی یا اثنا عشری {۲۳} شیعوں کا ایک لشکر نکلے گا۔ وہ اہل سنت کے بد ترین دشمن ہیں۔ وہ ان کے بارے میں نہ قرابت کا پاس کرتے ہیں نہ قول و قرار کا اور نہ اس بات پر ان کو شرم محسوس ہو گی کہ وہ اس مہدی کے خلاف لڑنے کے لئے لشکر روانہ کر رہے ہیں جو وہ بارہواں امام نہیں جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں۔ مہدی ان کو بد ترین شکست سے دوچار کر دے گا۔ مہدی کا جھنڈا کبھی نہیں جھکے گا۔ اس کے جھنڈے سفید اور زرد رنگ کے ہوں گے' جن میں دھاریاں ہوں گی اور ان میں اللہ کا اسم اعظم لکھا ہو گا۔

تیسری جنگ : اہل روم (امریکہ اور یورپ) کی جنگ

یہ جنگ الملحمۃ الکبرٰی ہو گی۔ نبی ﷺ نے فرمایا :

"پھر تم روم پر حملہ کرو گے۔ اللہ اسے فتح کر دے گا"

یہ ملحمۂ کبریٰ (بڑا خونریز معرکہ) ہے۔ یہ جنگ سب جنگوں سے سخت ہو گی۔ یہ وہی جنگ ہے جو رومیوں کے ہر مجدون کی جنگ سے لوٹنے کے نو ماہ بعد ہو گی۔ عہد شکنی کے عرصہ میں رومی بادشاہ چھپ چھپ کر اکٹھے ہوں گے۔ وہ لشکر جرار لے کر ہماری طرف آئیں گے۔ جس میں تقریباً ایک ملین سپاہی ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے : "وہ تمہاری طرف اسی (۸۰) جھنڈوں تلے آئیں گے۔ ہر جھنڈے تلے ۱۲ ہزار سپاہی ہوں گے {۲۴}

<u>معرکہ کی رفتار' اس کے نتائج اور اس کا مقام</u> : امام مسلم نے صحیح میں ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک رومیوں کا لشکر اعماق یا دابق میں فروکش نہ ہو جائے گا۔ ان کے مقابلے کے لئے مدینہ سے ایک لشکر نکلے گا جو اس زمانہ کے بہترین لوگوں پر مشتمل ہو گا۔ جب وہ صف

بندی کرلیں گے تو رومی ان سے کہیں گے کہ تم ہمارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو ہم سے قیدی بنائے گئے ہیں رکاوٹ نہ بنو' ہمیں ان سے لڑنے دو۔ وہ جواب دیں گے نہیں اللہ کی قسم ہم اپنے بھائیوں سے لڑنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چنانچہ لڑائی شروع ہو جائے گی۔ ایک تہائی شکست [۲۶] کھا جائیں گے۔ اللہ کبھی ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا۔ ایک تہائی قتل ہو جائیں گے جو اللہ کے نزدیک بہترین شہید شمار ہوں گے اور ایک تہائی فتح حاصل کریں گے' انہیں کبھی بھی آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔ وہ قسطنطنیہ فتح کریں گے۔ وہ زیتون کے درختوں پر اپنی تلواریں لٹکا کر مال غنیمت کی تقسیم میں لگ گئے ہوں گے کہ شیطان آواز دے گا کہ مسیح (دجال) نے پیچھے سے تمہارے اہل و عیال کو پکڑ لیا ہے۔ وہ نکل کر جائیں گے تو یہ بات جھوٹ ثابت ہو گی۔ جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہو گا۔ ابھی وہ لڑنے کے لئے اپنی صفیں درست کر رہے ہوں گے کہ نماز کھڑی ہو جائے گی اور عیسیٰؑ بن مریم کا نزول ہو گا۔ وہ دجال کی طرف جائیں گے۔ جب اللہ کا دشمن انہیں دیکھے گا تو نمک کی مانند پگھل جائے گا۔ اگر عیسیٰؑ اس کو چھوڑ دیتے تو وہ پگھل پگھل کر مر جاتا مگر وہ اسے اپنے ہاتھ [۲۷] سے قتل کریں گے اور اپنے چھوٹے نیزے [۲۸] پر اس کا خون لوگوں کو دکھائیں گے"۔

معرکہ کے واقعات کی اور بھی تفصیل ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں :

مسلمان موت کا ایک دستہ [۲۹] (Death Squad) تیار کریں گے جو صرف غلبہ کی صورت میں واپس آئے گا۔ وہ باہم لڑیں گے یہاں تک کہ ان کے درمیان رات حائل ہو جائے گی۔ چنانچہ دونوں لشکر بغیر غلبہ کے لوٹ آئیں گے۔ وہ دستہ فنا ہو جائے گا۔ پھر مسلمان ایک اور دستہ موت کے لئے تیار کریں گے جس کا کام یہ ہو گا کہ وہ صرف فتح حاصل کر کے لوٹے۔ ان کی آپس میں لڑائی ہو گی یہاں تک کہ ان کے درمیان رات حائل ہو جائے گی اور وہ بغیر فتح پائے واپس آ جائیں گے۔ وہ دستہ بھی فنا ہو جائے گا۔ پھر مسلمان ایک اور دستہ موت کے لئے تیار کریں گے جس کے ذمے ہر حالت میں فتح حاصل کرنا ہو گا۔ وہ ایک دوسرے سے لڑیں گے یہاں تک کہ رات ہو جائے گی۔ دونوں لشکر بغیر غلبہ پائے لوٹ آئیں گے اور دستہ فنا ہو چکا ہو گا۔ چوتھے دن باقی مسلمان ان سے لڑنے

کے لئے جائیں گے۔ اللہ رومیوں کی قسمت میں شکست لکھ دے گا۔ مسلمان ان کو اس' طرح قتل کریں گے کہ ایسا قتل اس وقت تک کسی نے نہ دیکھا ہو گا۔ یہاں تک کہ جب ایک پرندہ ان کے پاس سے گزرے گا تو آخر تک پہنچنے سے پہلے گر کر مر جائے گا۔ {۳۰} (اس قدر قتل عام ہو گا) کہ جب گنتی کی جائے گی تو ایک ہی باپ کی اولاد کے سو آدمیوں سے صرف ایک آدمی بچے گا۔ ایسے حالات میں مال غنیمت بانٹنے کی کیا خوشی ہو گی اور میراث کہاں رہے گی جو بانٹی جا سکے"۔

مندرجہ بالا دو صحیح حدیثوں سے درج ذیل حقائق پر روشنی پڑتی ہے :

(۱) اہل روم اور ہمارے درمیان ہونے والا زبردست معرکہ جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے الملحمۃ الکبریٰ کا نام دیا ہے' سوریا میں دمشق {۳۱} سے قریب اعماق یا دابق نامی مقامات پر ہو گا۔ مہدی کا صدر مقام دمشق سے قریب غوطہ میں ہو گا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے الملحمۃ الکبریٰ (بڑی خونریز جنگ) میں مسلمانوں کا کیمپ ایک ایسی سرزمین میں ہو گا جسے غوطہ کہا جاتا ہے وہاں دمشق کے نام سے ایک شہر ہے وہ اس زمانے میں مسلمانوں کا بہترین پڑاؤ ہو گا {۳۲}۔

(۲) اہل روم مسلمانوں سے سب سے پہلی بات یہ کہیں گے کہ ہمیں ان لوگوں سے لڑنے دو جو ہم میں سے قیدی بنائے گئے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مجدون کے معرکہ کے بعد بہت سے عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر مہدی کی طرف سے لڑیں گے۔ اہل روم سمجھیں گے کہ وہ ان کے آدمی ہیں جنہیں قید کر لیا گیا اور جنہوں نے غداری کی۔ چنانچہ وہ انہی سے انتقاماً لڑائی کا آغاز کرنا چاہیں گے۔

(۳) چار دن تک مسلسل جاری رہنے والی جنگ میں خوب قتل و غارت ہو گا۔ اس جنگ میں حائل ہونے والی رات کے سوا تلواریں کبھی بھی نیام میں نہیں جائیں گی۔ چوتھے روز جنگ کے مندرجہ ذیل نتائج نکلیں گے :

ـــــ رومیوں کو بدترین شکست ہو گی' ایسی شکست جو انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی

ہو گی۔ ان کی اتنی بڑی تعداد قتل ہو جائے گی جس کا شمار خدا ہی جانتا ہے۔ بیشتر لشکر تباہ و برباد ہو جائے گا اور اللہ ان کو مصائب میں مبتلا کرے گا۔

۳۔ مسلمانوں کو اتنی سختیوں کا سامنا کرنا پڑے گا کہ جان لبوں تک آ جائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے بندے مہدی محمد بن عبداللہ کی مدد فرمائے گا۔ ایک تہائی لشکر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ جائے گا اللہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ دے گا' اور ان کی توبہ کبھی بھی قبول نہیں کرے گا۔ ایک تہائی لشکر جام شہادت نوش کرے گا' وہ اللہ کے نزدیک بہترین شہید ہوں گے۔ باقی ایک تہائی فتح یاب ہو گا۔ ان کو پھر کبھی بھی آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔ وہی جنتی ہوں گے۔

(۴) ان دو حدیثوں سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ یہ جنگ گھوڑوں اور تلواروں سے ہو گی۔

۱۔ نص حدیث میں گھوڑوں اور تلواروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ الفاظ یوں ہیں :
"انھوں نے اپنی تلواریں زیتون کے درختوں پر لٹکا رکھی ہوں گی"۔

۲۔ اگر ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "یہاں تک کہ ان کے درمیان رات حائل ہو جائے گی' پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ایسا ان جنگوں میں ہوتا ہے جو گھوڑوں اور تلواروں سے لڑی جائیں وگرنہ موجودہ جنگیں تو ہوائی جہازوں' میزائلوں' ٹینکوں اور توپوں سے لڑی جاتی ہیں۔ اور ان جنگوں میں رات یا دن سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ رات جنگ کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی۔ ہم ان لوگوں سے سوال کرتے ہیں جن کو ہر بات میں تاویل کی عادت سی ہو گئی ہے اور جو "حدیث رسول میں "گھوڑوں اور تلواروں سے مراد ٹینک اور گولیوں کی بارش کرنے والی توپیں لیتے ہیں کہ وہ "یہاں تک کہ رات ان کے درمیان حائل ہو جائے گی" کی کیا تاویل کریں گے؟ اور "وہ ان کو اس کا خون اپنے نیزے پر دکھائے گا" کا کیا مطلب ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عبارتیں تاویل قبول نہیں کرتیں۔ ہم پھر وہی کہیں گے جو ہم نے پہلے کہا کہ ان جنگوں اور خونریز معرکوں میں گھوڑے اور تلواریں ہی فیصلہ کن ثابت ہوں گی۔ اس میں ایسی تعجب کی بات بھی نہیں' کیونکہ ہر مجنون کی عالمی تباہ کن

جنگ جنگی اہمیت کے ان ہتھیاروں کو یا تو بے کار کردے گی یا تباہ کردے گی جو پٹرول کے ایندھن یا کمپیوٹر کے حساس نظام کے ذریعہ چلتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

چوتھی جنگ : قسطنطنیہ کی جنگ

قسطنطنیہ ہی آستانہ یا استانبول ہے جو ترکی میں واقع ہے۔ وہ خلافت عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا حتیٰ کہ نو آبادیاتی نظام کے ایجنٹ کمال اتاترک نے آکر اس صدی کے آغاز میں خلافت اسلامیہ کو ختم کردیا اور اس کی جگہ لادینی نظام قائم کردیا۔ اس نے بڑھیا چیز کو گھٹیا سے بدل دیا۔ جو کچھ بھی کیا برا کیا۔ وہ دن اور آج کا دن ترکی اسلام اور اس کی تعلیمات سے مسلسل پیچھے ہٹ رہا ہے اور تیزی سے لادینیت کی چکنی اور سپاٹ زمین کی طرف لڑھک رہا ہے حتیٰ کہ اس نے دشمن یہودیوں کے ساتھ عسکری تعاون اور مشترکہ دفاع کا پیمان باندھ کر عرب مسلمانوں کو حیرت زدہ کردیا ہے {۳۳} بلکہ جنگی مشقوں کے لئے یہودی جہازوں کو اپنی فضا استعمال کرنے کی اجازت کا اعلان اس قدر بے حیائی اور سرد مہری سے کیا ہے کہ انسان اپنے لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے شعائرِ اسلام کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ابھی اس ناپسندیدہ گٹھ جوڑ پر ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ترکی حکومت نے ترکوں کی روایتی ڈھٹائی سے کام لے کر دجلہ اور فرات کے پانی کے مسئلہ پر اپنے موقف پر اصرار شروع کردیا ہے اور اعلان کردیا ہے کہ پڑوسی مسلمان ملکوں کو یہ پانی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں، اور ترکی سے اپنے حصے کے پانی کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسا ریڈ انڈین نے امریکہ کی اس سرزمین میں اپنے حقوق کا مطالبہ کیا ہے جو امریکہ نے ظلم و جبر کی بناء پر ان سے چھین رکھی ہے۔

آنے والے دن ترکی کے اصل چہرے سے نقاب اٹھادیں گے اور اس وقت ہم کہیں گے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے۔ پھر وہ قسطنطنیہ فتح کریں گے۔ کیوں نہیں وہ اسے فتح کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔

قسطنطنیہ کی فتح کیونکر مکمل ہوگی؟ : یہ وہ فتح ہے جس کے بعد مسیح دجال کا خروج ہوگا۔ لڑائی تلواروں اور نیزوں سے نہیں ہوگی بلکہ فتح کی تکمیل تہلیل و تکبیر سے ہوگی۔ امام

جنگ جنگی اہمیت کے ان ہتھیاروں کو یا تو بے کار کردے گی یا تباہ کردے گی جو پٹرول کے ایندھن یا کمپیوٹر کے حساس نظام کے ذریعہ چلتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

چوتھی جنگ : قسطنطنیہ کی جنگ

قسطنطنیہ ہی آستانہ یا استانبول ہے جو ترکی میں واقع ہے۔ وہ خلافت عثمانیہ کا دار الخلافہ تھا حتیٰ کہ نو آبادیاتی نظام کے ایجنٹ کمال اتاترک نے آکر اس صدی کے آغاز میں خلافت اسلامیہ کو ختم کردیا اور اس کی جگہ لادینی نظام قائم کردیا۔ اس نے بوھیا چیز کو گھٹیا سے بدل دیا۔ جو کچھ بھی کیا برا کیا۔ وہ دن اور آج کا دن ترکی اسلام اور اس کی تعلیمات سے مسلسل پیچھے ہٹ رہا ہے اور تیزی سے لادینیت کی چکنی اور سپاٹ زمین کی طرف لڑھک رہا ہے حتیٰ کہ اس نے دشمن یہودیوں کے ساتھ عسکری تعاون اور مشترکہ دفاع کا پیمان باندھ کر عرب مسلمانوں کو حیرت زدہ کردیا ہے{۳۳} بلکہ جنگی مشقوں کے لئے یہودی جہازوں کو اپنی فضا استعمال کرنے کی اجازت کا اعلان اس قدر بے حیائی اور سرد مہری سے کیا ہے کہ انسان اپنے لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے شعائر اسلام کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ابھی اس ناپسندیدہ گٹھ جوڑ پر ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ترکی حکومت نے ترکوں کی روایتی ڈھٹائی سے کام لے کر دجلہ اور فرات کے پانی کے مسئلہ پر اپنے موقف پر اصرار شروع کردیا ہے اور اعلان کردیا ہے کہ پڑوسی مسلمان ملکوں کو یہ پانی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں' اور ترکی سے اپنے حصے کے پانی کا مطالبہ ایسا ہی ہے جیسا ریڈ انڈین نے امریکہ کی اس سرزمین میں اپنے حقوق کا مطالبہ کیا ہے جو امریکہ نے ظلم و جبر کی بناء پر ان سے چھین رکھی ہے۔

آنے والے دن ترکی کے اصل چہرے سے نقاب اٹھادیں گے اور اس وقت ہم کہیں گے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے۔ پھر وہ قسطنطنیہ فتح کریں گے۔ کیوں نہیں وہ اسے فتح کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔

قسطنطنیہ کی فتح کیونکر مکمل ہوگی؟ : یہ وہ فتح ہے جس کے بعد مسیح دجال کا خروج ہوگا۔ لڑائی تلواروں اور نیزوں سے نہیں ہوگی بلکہ فتح کی تکمیل تہلیل و تکبیر سے ہوگی۔ امام

مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "تم نے اس شہر کے متعلق کچھ سنا ہے جس کا ایک حصہ خشکی پر اور دوسرا حصہ سمندر میں ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک اسحاق کی اولاد میں سے ۷۰ ہزار سپاہی اس پر چڑھائی نہ کر دیں گے۔ جب وہ اس شہر میں آکر پڑاؤ ڈالیں گے تو وہ نہ تو ہتھیاروں سے لڑیں گے اور نہ ہی تیر اندازی کریں گے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کا ورد کریں گے تو ایک حصے کو شکست ہو جائے گی۔ (حدیث کا راوی ثور کہتا ہے میرے علم کے مطابق آپ ؑ نے فرمایا کہ "سمندر والا حصہ شکست کھا جائے گا") پھر وہ دوسری مرتبہ لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کہیں گے تو دوسرا حصہ مغلوب ہو جائے گا۔ پھر وہ تیسری مرتبہ لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کا ورد کریں گے تو شہر کو ان کے لئے کھول دیا جائے گا اور وہ اس میں داخل ہو جائیں گے۔ اس دوران جبکہ وہ مال غنیمت بانٹ رہے ہوں گے ان کو ایک چیخ سنائی دے گی کہ دجال کا خروج ہو گیا ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ لوٹ جائیں گے" {۳۴}

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "اسحاق کی اولاد میں سے ۷۰ ہزار" غور طلب ہے۔ قاضی کا قول ہے صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں "مِن بنی اسحاق" (اسحاق کی اولاد) کے الفاظ لکھے ہیں۔ یہ شہر بھی قسطنطنیہ ہے {۳۵}۔

بنو اسحاق سے مراد اہل روم ہیں جو عیص بن اسحاق بن ابراہیم الخلیلؑ کی نسل سے ہیں وہ بنی اسرائیل یعنی یعقوب بن اسحاق کے چچا کی اولاد ہیں۔

حدیث میں جس اولاد اسحاق کا ذکر ہے وہ اہل روم ہیں جو ہر مجددن کے معرکہ کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کا قول ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رومی آخری زمانہ میں مسلمان ہو جائیں گے اور غالباً انہی کی ایک جماعت کے ہاتھوں قسطنطنیہ فتح ہو گا، جیسا کہ سابقہ حدیث میں اس کا بیان ہے {۳۶}۔

پانچویں جنگ: یہودیوں سے جنگ

(زیادہ درست بات تو یہ ہے کہ ایک تہائی یہودیوں سے جنگ) کیونکہ دو تہائی یہودی

ہر مجدون {۳۷} کے معرکہ میں اس قدر بری طرح ہلاک ہو جائیں گے کہ باقی ماندہ یہودیوں کو اس معرکہ میں مرنے والے سپاہیوں کے دفن کے لئے سات ماہ درکار ہوں گے۔

سفر حزقیال میں ہے "اسرائیل کے گھرانے کو اپنے مردوں کو دفن کرتے کرتے سات ماہ گزر جائیں گے تب کہیں جاکر زمین صاف ہوگی"{۳۸}

دو تہائی یہودی تو ہر مجدون کے معرکہ میں ہلاک ہو جائیں گے اور باقی ایک تہائی کی ہلاکت کا کام مسلمان مہدی کی قیادت میں سرانجام دیں گے۔ یہ سب اس وقت ہو گا جب مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کرلیں گے اور جب یہودیوں کے ملعون بادشاہ دجال کا ظہور ہو جائے گا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہودی اپنے مخلص مسیحا یا اپنے اس نابغہ روزگار بادشاہ کی آس لگائے بیٹھے ہیں جو ان کو بقول ان کے فاسد اقوام سے نجات دلائے گا (ان اقوام سے مراد یہودیوں کے علاوہ زمین کے باسی ہیں) ان کا اعتقاد ہے کہ اس کا ظہور ۲۰۰۰ء سے پہلے ہو گا۔{۳۹}

اہل کتاب کی بعض تحقیقات نے اس مدت کا تعین اپریل ۱۹۹۸ء میں کیا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ جب دجال کا ظہور اللہ کے مقرر کردہ وقت میں ہو گا اور وہ چالیس روز تک زمین میں گھوم پھر لے گا ـــــ یہ ایک دن ایک سال کے برابر، ایک دن ایک ماہ کے برابر اور ایک دن جمعہ (ایک ہفتہ) کے برابر ہو گا اور اس کے باقی دن ہمارے دنوں کی طرح ہوں گے، جیسا کہ ان شاء اللہ ہم اگلے باب میں اس کی تفصیل بیان کریں گے ـــــ تو اس وقت عیسیٰ کا نزول آسمان سے ہو گا۔ وہ دجال کو قتل کریں گے، اور اس کے پیروکاروں کو، جو سب کے سب یہودی ہوں گے، شکست دیں گے۔ وہ بھاگ کر مسلمانوں کے ڈر سے درختوں اور پتھروں کے پیچھے چھپ جائیں گے۔ شجر و حجر بھی ان کا پتہ بتا دیں گے اور ان کی چغلی کھائیں گے کیونکہ وہ بھی ان کے کفر کی بدبو اور انبیاء کے قتل سے بیزار ہوں گے اور کیونکہ ان کے ہاتھ بے گناہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں

کے خون سے لتھڑے ہوئے ہوں گے۔{۴۰} کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ شجرو حجر آواز دیں گے اور ان کی آواز سنائی دے گی : اے مسلمان! "اے اللہ کے بندے! اے توحید پرست! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے' آؤ اسے قتل کردو"۔ صرف غرقد کا درخت آواز نہیں دے گا{۴۱} کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔ سبحان اللہ!

عیسیٰؑ کے نزول اور دجال کو قتل کرنے کے بعد یہودیوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں قتل عام ہوگا۔ احمد نے جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا :

"... حتیٰ کہ شجرو حجر آواز دیں گے کہ یہ رہا یہودی' اور عیسیٰؑ دجال کے پیروکاروں میں سے ہر ایک کو قتل کردیں گے"۔{۴۲}

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں کی براہ راست جنگ ختم ہو چکی ہے کیونکہ دنیا ان دنوں صلح عام کے مرحلہ سے گزر رہی ہے۔ وہ صلح عام جو ہرمجدون کے معرکہ سے پہلے ہوگی اور جس میں یہودیوں کی اکثریت تباہ ہو جائے گی' پھر عیسیٰ بن مریم کے زمانہ میں باقی یہودی مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے۔ زمین ان کے فتنہ و فساد اور مکرو فریب سے پاک ہو جائے گی۔ عنقریب شجرو حجر بول اٹھیں گے۔ عجوبات کے زمانہ میں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی کیونکہ اس زمانہ میں دجال کا خروج اور عیسیٰؑ کا نزول ہوگا اور یاجوج ماجوج لوگوں کے خلاف نکلیں گے اور پوری روئے زمین آخری لمحے کے لئے تیار ہو جائے گی۔

یہودی جس قدر چاہیں اکٹھے ہو جائیں' جو نو آبادیاں چاہیں تعمیر کرلیں اور جس قدر معاہدے چاہیں توڑلیں اور جس قدر خرمستیاں چاہیں کرلیں' کیونکہ خوفناک انجام کا سایہ قریب ہے۔ اس نے ان کو گھیرے میں لے لیا ہے اور سچ فرمایا ہے اللہ نے "پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو جمع کرکے لے آئیں گے" (الاسراء : ۱۰۴)

مہدی کی دوسری جنگیں

اس کے بعد مسلمان روئے زمین پر باقی بچنے والے کافروں کو قتل کردیں گے' کیونکہ عنقریب عیسیٰؑ کا نزول ہوگا' وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کردیں گے اور جزیہ

قائم کر دیں گے۔ اسلام اور تلوار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یہ جنگیں زیادہ تر آسان ہوں گی اور مسلمان اٹلی کے دارالخلافہ روم کو فتح کر لیں گے۔ مسلمان خوز و کرمان سے لڑیں گے (ان کو ترک بھی کہتے ہیں) وہ یاجوج ماجوج کے چچازاد ہیں اور اس زمانے میں ان سے مراد چین' روس' جاپان اور منگولیا وغیرہ کے رہنے والے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اس قدر صحیح اور کامل اوصاف بیان کئے ہیں کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے انہیں آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تم خوزستان اور کرمان سے جنگ کرو گے۔ ان کے چہرے سرخ' ناک بیٹھی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی ہوں گی' ان کے چہرے چوڑے ہوں گے' یوں معلوم ہو گا کہ وہ ہتھوڑے سے کوٹی ہوئی گول ڈھالیں ہیں۔ وہ بالوں کے جوتے اور بالوں کے کپڑے پہنتے ہیں۔

اُس وقت اس اللہ کا وعدہ پورا ہو جائے گا جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا' یہ کہ اسلام معمورۂ ہستی کے گوشے گوشے میں پھیل جائے گا' تمام ملتوں میں سے ملت اسلام باقی رہے گی اور کافروں کی جڑ کٹ جائے گی۔ وہ حمد و ثنا کا سزاوار سارے جہان کا پالنہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے :

﴿ هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾ (الصف : ۹)

"وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرک ناخوش ہی کیوں نہ ہوں"۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اس اسلام کا معاملہ وہاں پہنچے گا جہاں لیل و نہار پہنچتے ہیں۔ شہر اور گاؤں کا کوئی گھر ایسا نہیں بچے گا جس میں اللہ اس دین کو باعزت طریقے سے یا دشمنوں کو ذلیل کر کے داخل نہ کر دے۔ عزت بھی ایسی عزت جو اللہ صرف دین اسلام کو عطا کرتا ہے اور ذلت بھی ایسی ذلت جو اللہ نے کفر کے لئے خاص کی ہے"{۴۳}

مسند احمد میں مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ "روئے زمین پر کوئی مٹی کا گھر یا بالوں کا خیمہ ایسا نہیں بچے گا جس میں کلمہ اسلام داخل نہ ہو جائے"۔

حواشی

{۱} عبث : "ب" کی زیر کے ساتھ۔ یعنی آپ ؐ کے جسد مبارک میں حرکت ہوئی یا آپ ؐ نے اطراف جسم کو اس طرح حرکت دی جیسے کوئی آدمی کسی چیز کو پکڑنے یا دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے۔

{۲} بخاری نے کتاب البیوع' باب ماذکر فی الاسواق میں روایت کیا ہے۔ مسلم نے کتاب الفتن' باب الخسف بالجیش الذی یوم البیت میں روایت کیا ہے۔ الفاظ اسی کے ہیں۔

{۳} مسلم نے ام سلمہ کی روایت سے کتاب الفتن واشراط الساعۃ میں نقل کیا ہے۔ نعیم نے حماد سے اور اس نے عمروؓ بن عاص سے روایت کیا ہے۔ (اس نے کہا) خروج مہدی کی علامت ہے' جب جنگل میں لشکر دھنس جائے گا۔ قرطبی نے "التذکرۃ" کے باب "آخری زمانہ میں آنے والے خلیفہ یعنی مہدی کے خروج کی علامت" میں کہا ہے کہ یہ دھنسنے والی فوج مکہ سے باہر مہدی سے جنگ کے لئے جمع ہوگی۔

{۴} مسلم نے صحیح میں کتاب الفتن واشراط الساعۃ میں ام المومنین حفصہؓ سے روایت کی ہے۔

{۵} مسلم نے کتاب الفتن میں ام المومنین حفصہؓ سے روایت کی ہے۔ احمد' نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

{۶} صحیح حدیث کا ٹکڑا ہے' جسے احمد نے مسند میں' ابوداؤد الطیالسی نے مسند میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے۔ شیخ احمد شاکر اور البانی نے الصحیحہ نمبر ۵۷۹ میں اسے صحیح گردانا ہے۔

{۷} احمد نے مسند میں ام سلمہؓ سے اور ابویعلیٰ نے روایت کیا ہے۔ ھیثمی نے "مجمع الزوائد" میں کہا ہے کہ سند میں علی بن زید ہے' حدیث میں حسن ہے مگر ضعیف ہے۔ اس نے یہی روایت حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

{۸} دجال پر تفصیلی بات ان شاء اللہ اگلے باب میں ہوگی۔

{۹} اس موضوع پر تفصیل پانچویں باب میں بیان ہوگی : علامات الساعۃ الکبریٰ

{۱۰} الرکن' حجراسود اور مقام ابراہیم

{۱۱} کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد اہل بدر کی طرح ۳۱۳ ہوگی۔ مگر ہم صحیح آثار پر اعتماد کرتے ہوئے

سکتے ہیں کہ ان کی تعداد کم ہوگی۔ واللہ اعلم

{۱۲} پہلی جلد ذکر مہدی کی فصل

{۱۳} التذکرة للقرطبی باب "مہدی کا خروج کہاں سے ہو گا اور خروج کی علامت کیا ہو گی"

{۱۴} تیسری فصل میں حدیث کی تخریج ہو چکی ہے۔

{۱۵} مہدی کی جنگوں کے بارے میں اگلی فصل میں ہم اس بات کے مزید ثبوت پیش کریں گے کہ ہر جدید دون کے معرکہ میں بہت سا تباہ کن اسلحہ یا تو تباہ ہو جائے گا یا بے کار۔ اس کے بعد کی جنگوں میں پھر سے تلواروں' نیزوں اور گھوڑوں کا نام سنا جائے گا۔

{۱۶} مسلم نے نافع بن عتبہ سے روایت کیا ہے۔ احمد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

{۱۷} صحیح ہے۔ اسے احمد اور ابو داؤد نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے اور البانی نے اسے صحیح الجامع میں صحیح گردانا ہے۔

{۱۸} مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔

{۱۹} بخاری نے صحیح میں ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور احمد نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

{۲۰} صحیح ہے۔ احمد اور دارمی نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ حاکم اور اس کے ساتھ ذہبی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ البانی کا قول ہے : جیسا کہ ان دونوں نے کہا وہ صحیح ہے۔

{۲۱} قرطبی نے "التذکرہ" میں ذکر کیا ہے کہ مہدی' سفیانی اور اس کے بنو کلب کے ساتھیوں کو قتل کر دے گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے وہ آدمی قرشی ہو گا۔

{۲۲} مجھے معلوم ہوا ہے کہ کویت کے امیر اپنے آپ کو قبیلہ کلب سے منسوب کرتے ہیں۔ کسی بھائی نے یہ بات بتائی ہے' اللہ بہتر جانتا ہے۔

{۲۳} شیعوں کے ۱۸ فرقوں میں سے ایک فرقہ امامیہ یا اثنا عشریہ امام غائب یا مہدی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بارہویں امام محمد بن الحسن العسکری ہیں جن کے متعلق ان کا گمان ہے کہ وہ بچپن میں سامراء کے ایک تہہ خانے میں روپوش ہو گئے۔ وہ کئی سو سال سے ان کے خروج کے منتظر ہیں۔

{۲۴} اس حدیث کا جزو ہے جو بخاری نے عوف بن مالک سے روایت کی ہے۔ اوپر یہ حدیث گزر چکی ہے۔

{۲۵} مدینہ کے گرد و نواح میں ایک جگہ کا نام اعماق ہے اور دابق مدینہ کے ایک بازار کا نام ہے۔

یاقوت کہتا ہے کہ دابق حلب کے ایک گاؤں کا نام ہے اور اعماق دابق کے نزدیک حلب اور انطاکیہ کے درمیان ایک ضلع ہے۔

{۲۶} یعنی معرکہ سے بھاگ جائیں گے اور اس وقت مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ جائیں گے جب ان کو سخت ضرورت ہوگی۔

{۲۷} بیدہ یعنی عیسیٰؑ کے ہاتھوں ان کے نیزے سے

{۲۸} مسلم کی روایت کتاب الفتن واشراط الساعۃ

{۲۹} الشُرطہ : شین کی پیش کے ساتھ یعنی فوج کا پہلا دستہ جو میدان جنگ میں آئے۔ نووی نے مسلم کی شرح میں یہ لکھا ہے۔

{۳۰} مسلم نے صحیح میں جابرؓ سے روایت کی ہے۔

{۳۱} دمشق نے اس عالمی سربراہ کانفرنس (Peace Makers) میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا جو اپریل ۱۹۹۶ء میں شرم الشیخ میں منعقد ہوئی۔ ان دنوں اخباروں میں "دمشق اور امریکا کا باہمی اختلاف" جیسے عنوان ہمارے مطالعے میں آئے۔ امریکا نے سوریا کو دہشت گرد حکومتوں کی فہرست میں شمار کر لیا تھا۔ ہم تو یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ تو نے سچ کہا کہ جلد ہی اہل روم اعماق اور دابق کے مقام پر پڑاؤ ڈالیں گے۔

{۳۲} یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے احمد، ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ البانی نے صحیح الجامع الصغیر میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی تخریج اوپر گزر چکی ہے۔

{۳۳} یہ ترکی اسرائیل معاہدہ اپریل ۱۹۹۶ء میں ہوا۔

{۳۴} مسلم نے کتاب الفتن واشراط الساعۃ میں اسے روایت کیا ہے۔

{۳۵} حدیث سابق پر امام نووی کی شرح مسلم دیکھئے۔

{۳۶} ابن کثیر کی "الفتن والملاحم" باب "رومیوں کے ساتھ اس معرکہ کا تذکرہ جس کے بعد قسطنطنیہ فتح ہوگا"۔

{۳۷} ان کے اسفار اور تلمود میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ زکریا ۱۴:۸۹۔ حزقیال ۱۲:۳۹ اور دیکھئے کتاب "النبوۃ والسیاسہ" ص ۴۵

{۳۸} دیکھئے النبوۃ والسیاسہ، ص ۴۶

[باقی حواشی اگلی قسط کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے]

فکر عجم

علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۴)

ڈاکٹر ابو معاذ

ساسانی عہد کی اہم خصوصیات اور اسلامی تہذیب پر انکے اثرات

عہد ساسانی میں ایران دنیا کی ایک طاقتور ترین سلطنت کی صورت میں ابھرا۔ سلطنت فارس کی حدود پنجاب' کشمیر' شمالی ہند' بلوچستان' موجودہ افغانستان' مشرق وسطیٰ' مشرقی چین' وسطی ایشیاء' قفقاز' جزیرہ نمائے عرب' ایشیائے کوچک' سواحل بحیرۂ روم' مصر' قبرص اور دیگر جزائر بحیرۂ روم تک پہنچ گئیں۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے عظیم شہر مثلاً طوس' رے' صفاہان (سپاہان)' طیسفون' مدائن' نیشاپور اور شیراز وجود میں آئے۔ مشرق و مغرب کے مابین تجارت کو فروغ ہوا۔ مذہبی اعتبار سے دین زرتشت قدرے تحریف کے ساتھ زندہ رہا۔ رفتہ رفتہ اس میں آتش پرستی' مہرپرستی' ناہید پرستی اور مظاہر پرستی کے عناصر شامل ہوئے۔ مقبوضات فارس میں عیسائیت کی ترویج' یہودیوں کی آباد کاری اور سفر' بدھ مت کے پیروکاروں کا شمال مشرقی خطوں میں فروغ' ہندی مقبوضات میں ہندومت کا احیاء' جین مذہب کی تشکیل' ایران میں مانوی مذہب کی ابتداء اور خاتمہ' مزدکیت کا عروج و زوال اور چینی نظریات کی ایران میں آمد ایسے واقعات ہیں جنہوں نے اہل مشرق پہ اپنے گہرے فکری نقوش چھوڑے ہیں۔ فلسفہ اخلاق اور فلسفہ و افکار کی ایران میں جو بوقلمون صورت ابھری وہ ایشیاء کے وسیع حصہ پر بلکہ مشرقی یورپ پر صدیوں تک حاوی رہی ہے۔ بعض مورخین رقم طراز ہیں کہ ہرچند اسلام نے جنگی اعتبار سے سلطنت فارس کو شکست سے دوچار کر دیا تھا لیکن فکری اور تہذیبی اعتبار سے ایرانیت بہرحال زندہ رہی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اسلام کی آمد نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ اسلام نے ایرانی تہذیب و تمدن' زبان و ادب' قانون و دستور اور فلسفہ کے ان اجزاء کو جو اسلامی افکار اور روح سے متصادم نہیں تھے' یکسر ختم نہیں کیا بلکہ انہیں اپنا

رنگ دے کر ان کی ترویج کا سامان مہیا کیا۔ بقول اقبال ؎

اندریں راہ جز نگاہ مطلوب نیست
ایں کلاہ یا آں کلاہ مطلوب نیست

(علم و ترقی کی راہ میں ماسوائے نظر کی پختگی اور گہرائی کے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ٹوپی یا وہ ٹوپی پہننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔)

اسلام نے حکمت و دانائی کو مومن کی میراث قرار دے کر جہاں سے ملے اسے پالینے کی تلقین کی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں ایک مصرعہ میں قرآنی آیت اور دوسرے میں ایک حدیث کا مفہوم سمو کر کس خوبصورتی سے فرمایا ہے :

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر می بینی بگیر

(خدا نے دانائی کو بے اندازہ خیر و خوبی قرار دیا ہے۔ جہاں سے یہ خیر و خوبی مل سکے اسے لے لیں۔)

بدقسمتی سے عجم کے وہ خیالات جو روح اسلامی کے منافی بھی تھے وہ بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رہ گئے اور کچھ ایسے ہی افکار و رسوم نے اسلام پر منفی اثرات بھی مرتب کئے۔ تصوف میں کچھ مانوی اور زرتشتی عقائد بھی شامل ہو گئے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح حلقہ صوفیاء میں بددلی، سکوت اور جمود کا عنصر شامل کر دیا، بقول اقبال ؎

تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے

اسی طرح ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ؎

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریّتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد!

لیکن عرب و عجم کے امتزاج کے مثبت پہلو بھی سامنے آتے ہیں ؎

بجھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

آپ نے عربی جوش وجذبہ میں عجم کی خیال آفرینی اور تدبر کو جب دین مبین اسلام کے رنگ میں ڈوب کر ایک عظیم وحدت میں جذب ہوتے دیکھا تو آپ نے یورپ کی فکری وجذباتی محرومی پہ دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ؎

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا راز توحیدِ امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

اب ہم عجم کے ساسانی دور کے ان عناصر کا ذکر کریں گے جو بعد میں ہم پر اثر انداز ہوئے اور اس عمل کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

ساسانی عہد کا زرتشتی مذہب

توحید اور ثنویت : ہرچند کہ زرتشتی مذہب کا آغاز اہورا مزدا کی پرستش سے ہوا تھا اور ایک عظیم ہستی برتر کا تصور تھا جو خالق ارض وسماء ہے اور ایرانی ذہن کبھی بھی بت پرستی کی جانب مائل نہیں ہوسکا، مگر بعد میں خدائے نیکی (یزدان) اور اہرمن (شیطان) کا تصور غالب آتا چلا گیا۔ نہ صرف ازل تا ابد نیکی اور بدی کی قوتوں کا مسلسل برسرپیکار رہنا ہمارے افکار میں در کر آیا بلکہ خداوند تعالیٰ کو یزدان اور ابلیس کو اہرمن قرار دے کر اس نظریہ کو مشرف بہ اسلام کر لیا گیا۔ حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ابلیس ایک راندۂ درگاہ خداوندی ہے۔ وہ آگ سے تخلیق کیا گیا ہے اور خدا کی نافرمانی کے بعد مردود قرار پایا ہے۔ اس نے قیامت تک انسان کو گمراہ کرنے کی مہلت مانگی ہے، وہ کسی بھی طرح شر یا تباہی کا خالق نہیں ہے۔ خیر و شر کی صلاحیت انسان کے اپنے اندر ہے اور اسے خیر کا راستہ دکھانے کیلئے خداوند تعالیٰ نے انبیاء کو نازل فرمایا ہے۔ ہمیں بعد از اسلام کے عجمی لٹریچر میں اہرمن کی جاندار اور خوفناک شخصیت نظر آتی ہے جو خالصتاً اسلامی نظریات سے کسی

حد تک مختلف ہے۔ علامہ اقبال اپنی شاہکار کتاب جاوید نامہ میں جہاں ابلیس کو "خواجۂ اہلِ فراق" کہہ کر الگ سے زیر بحث لائے ہیں وہاں "طاسینِ زرتشت" کے عنوان سے اہرمن اور زرتشت کا مکالمہ خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہاں پر اہرمن کو اسی طاقت اور شان و تمکنت سے پیش کیا گیا ہے جو زرتشتی عقائد کے قریب تر ہے لیکن اس مکالمہ سے جو مطلب اخذ فرمایا ہے وہ روح اسلامی کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہاں پر زرتشت کو بھی پیغمبروں کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اہرمن کہتا ہے :

از تو مخلوقاتِ من نالاں چو نے
از تو مارا فرودیں مانندِ دے
در جہاں خوار و زبونم کردہ ای
نقشِ خود رنگیں زخونم کردہ ای
زندہ حق از جلوۂ سینائے تست
مرگِ من اندر یدِ بیضائے تست

(تیری وجہ سے میری مخلوقات بشری کی طرح مسلسل رو رہی ہیں۔ تیری وجہ سے میری بہاریں سخت سردی کے باعث اجڑ چکی ہیں۔ اس جہاں میں تو نے مجھے ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا ہے اور میرے خون سے اپنی زندگی پالی ہے۔ طور سینا پہ تیرے جلوؤں نے حق کو زندہ کر دیا ہے اور میری موت تیرے ید بیضا میں چھپی ہوئی ہے۔)

پھر کہا ہے ؎

تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است
بر مرادش راہ رفتن گمرہی است

(نعوذ باللہ! یزداں کے وعدوں پر تکیہ کر لینا بیوقوفی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے والوں نے کبھی منزل نہیں پائی۔)

پھر پیغمبروں یعنی حضرت شیثؑ، حضرت ایوب اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر آنے والی سختیوں کا ذکر کیا ہے اور حضرت نوحؑ کی صدیوں کی مجبوریوں کی جانب اشارہ کر کے خلوت نشینی اور رہبانیت کا درس دیتے ہوئے کہا ہے ؎

خیز و در کاشانۂ وحدت نشین!
ترکِ جلوت گیر و در خلوت نشین

(اٹھ اور وحدت کے مقام پر بیٹھ جا۔ تنہائی اختیار کرلے اور لوگوں کی مجلس سے اجتناب کرلے۔)

اس کا جواب زرتشت نے کچھ اس انداز سے دیا ہے ؎

نور دریائے است ظلمت ساحلش
ہم چو من سیلے نزاد اندر دلش
اندر و نم موجہای بے قرار
سیل را جُز غارتِ ساحل چہ کار؟
نقش بیرنگے کہ او را کس ندید
جز بخونِ اہرمن نتواں کشید!
خویشتن را آزمودن زندگی است
ضربِ خود را آزمودن زندگی است

(روشنی ایک سمندر ہے اور تاریکی اس کا ساحل۔ اس روشنیوں کے سمندر کے دل سے میرے جیسا کوئی طوفان جنم نہیں لے سکا۔ مجھ میں بے قرار لہریں جوش مار رہی ہیں اور طوفان کا ایک ہی کام ہے اور وہ یہ ہے کہ ساحل کو تباہ کر کے رکھ دے۔ وحدت یعنی رنگوں کے چکر سے باہر آنا اسی وقت ممکن ہے جب اہرمن کے خون سے امن کی شراب کشید کی جائے۔ اسی امتحان کا نام زندگی ہے اور اپنی ضرب کو آزمانے کا نام ہی زندگی ہے۔)

پھر یہ کہتے ہوئے کہ پیغمبروں پر آنے والی آزمائشیں ان کے لئے باعث رحمت ہیں اور خلوت انسان کی تربیت کے لئے ہرچند کہ ضروری ہے مگر اسے ہمیشہ کے لئے اختیار نہ کیا جائے' آخر میں کہا ہے ؎

گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا ست
خلوت آغازست وجلوت انتہاست

گفتہ ای پیغمبری دردِ سر است
عشق چوں کامل شود آدم گر است
راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است

(اگرچہ خلوت اور جلوت دونوں میں خدا ملتا ہے مگر خلوت سفر کی ابتدا ہے اور جلوت اس کی انتہا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ پیغمبری دردِ سر ہے لیکن جب عشق اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے تو وہیں سے انسانیت کی تعمیر کا مشن شروع ہو جاتا ہے۔ حق کی راہ پر قافلے کے ہمراہ چلنے کے اپنے مزے ہیں۔ کائنات میں روح کی طرح سفر کرنے کے اپنے ہی مزے ہیں۔)

یزدان و اہرمن کی کشمکش اور زرتشتی روح کی بے چینی ہمیں بعد از اسلام کے ادب و شعر میں ہر جگہ نظر آئے گی۔ یہ کشمکش اسی جذبہ کو جنم دیتی ہے جو جہد پیہم' سعی و عمل اور جستجو کے لئے انسانی طبیعت کو اکساتا ہے۔ تحرک' جدل اور بے سکونی انسان کو کوشش اور مقصدیت پر مائل کرتی ہے۔ بقول رومیؒ :

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمی فارغ مباش

(اس راستے میں توڑ پھوڑ کرتے رہو اور آخری دم تک ایک لمحے بھر کے لئے بھی فارغ مت بیٹھو۔)

آگ کا تصور

زرتشتی عقائد میں آگ کو خدا تو نہیں مانا گیا مگر اس کے تقدس کو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ یہ عنصر گرمی و روشنی اور تحرک کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ اس کو ساسانی دور میں روشن رکھنا ضروری تصور کر لیا جاتا تھا اور ان کی تمام عبادت گاہیں آتش کدوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ ہر مقام پر آگ کی انگیٹھیاں نصب کی جاتی تھیں اور ان میں صندل کی لکڑیاں' گھی' عود و لوبان اور حسب استطاعت دیگر سوختنی اشیاء ڈالی جاتی تھیں۔ یہ آگ مسلسل روشن رہتی۔ اسی وجہ سے ایرانیوں کو آتش پرست تصور کیا جانے لگا حالانکہ ..

اهورا مزدا (خدائے برتر) کے پرستار تھے۔

قرآن پاک میں آگ کا ذکر اکثر مقامات پہ جہنم کی آگ کے سلسلے میں آیا ہے' یا پھر نارِ نمرود کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے جسے تلمیح کے طور پر علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان فرمایا ہے ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

قرآن حکیم میں ایک مقام پر آگ کو روشنی کے منبع کی مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِى ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ○ ﴾ (البقرہ : ۱۷)

"ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔ پھر جب اس آگ کی روشنی نے اردگرد کو روشن کر دیا تو خدا نے اس کا نور زائل کر دیا اور وہ اندھیروں میں رہ گئے اور کچھ دیکھنے سے قاصر ہو گئے۔"

تاہم روشنی اور نور کا ذکر قرآن پاک میں مختلف معانی میں آیا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بابت سورۂ طٰہٰ میں اس آگ کا ذکر آتا ہے جو آپ نے طور پر دیکھی تھی اور جو آپ کے لئے نشانِ منزل بن گئی تھی۔ فرمایا :

﴿ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا اِنِّىْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّىْ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ○ ﴾

"کیا تمہیں موسیٰ کی داستان پہنچی ہے؟ جب اس نے آگ کو دیکھا تو اپنی بیوی سے کہا کہ یہاں ٹھہرو میں وہاں سے یا تو انگارے لے کے آتا ہوں یا پھر یہ آگ کی روشنی میرے لئے رہنمائی کا سبب بن جائے گی۔"

یہاں پہ موسیٰ نے آگ کی روشنی سے رہنمائی کا تصور کیا اور بقول اقبال :

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

آگ کا تصور ایرانی مفکرین کے ہاں ہمیشہ روشنی، گرمی، زندگی کی تمازت، چمک دمک، توانائی اور عظمت کے معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں :

آتشِ عشق است کاندر نے فتاد
جوششِ عشق است کاندر مے فتاد

(عشق کی آگ بنسری میں آپڑی تو اس کی لے میں ڈھل گئی اور عشق کا جوش تھا جو شراب میں آپڑا!)

آتش است ایں بانگِ نے و نیست باد
ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

(یہ بنسری کی آواز آگ ہے اور ہوا نہیں ہے۔ جس ہوا میں یہ آگ نہیں ہے وہ بھی بیکار ہے)

یہاں پر تو بانسری کی لے کو مولانا نے روح کے مفہوم میں بیان کیا ہے۔ وحدت الوجود کے ضمن میں بھی آگ کی مثال لاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

زانکہ آہن محوِ رنگِ آتش است
ز آتشی می لافد و آتش وش است

(چونکہ لوہا آگ کے شعلے میں پڑ کر آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے اس لئے وہ آگ بن جانے پہ فخر کرتا ہے اور وہ آگ ہی دکھائی دیتا ہے)۔

حضرت موسیٰؑ کے جلوۂ طور کو ایرانی خیال آفرینی شمع اور پروانہ کی مثال میں پیش کرنے لگی اور سلوک کی منازل کے تمام فاصلے سمٹا کر اس کو پروانے کے اضطراب اور شمع کے گرد طواف پہ لے آئے۔ حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ؂

آتش آن نیست کہ از شعلۂ آن خندد شمع
آتش آن است کہ بر خرمنِ پروانہ زدند

(آگ وہ نہیں ہے کہ جس کے شعلے سے شمع مسکراتی ہے بلکہ آگ تو وہ ہے جس سے

پروانے کے کھلیان کو جلادیا گیا ہے۔)

قدیم شعراء تو فی الحقیقت آتش کدے اور زرتشتی تصورات کو آگ کے ضمن میں پیش کرتے رہے ہیں۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔ عسجدی نے کہا ہے

برخیز و بر افروز حلہ قبلۂ زرتشت

(اٹھ اور جلدی سے زرتشت کے قبلہ یعنی آگ کو روشن کردے)

افضل الدین بدیل خاقانی نے کہا ہے :

اگر قیصر بیگالد رازِ زردشت
کنم تازہ رسوم ژند و اوستا
بگویم کانچہ ژند است وچہ آتش
کزان پاژند وژند آمد مسما
چہ اخگر ماند ازان آتش کہ وقتی
خلیل اللہ در آن افتادہ دروا

(اگر قیصر زردشت کے راز سمجھ لے تو میں ژند اور اوستا کی رسوم کو زندہ کردوں۔ پھر میں بتاؤں کہ کتاب ژند کیا ہے اور آگ کیا ہے اور ژند و پاژند کے کیا معانی ہیں۔ اس آگ میں انگارے کیا باقی رہ سکتے ہیں جس کے دامن میں خلیل اللہ کو ڈال دیا جائے۔)

کسی اور نے کہا ہے :

زردشت کہ آتش را بستاید در ژند
زانست کہ باے بہ فروغ است ہمانند

(زردشت نے ژند میں آگ کی اس لئے تعریف کی ہے کہ وہ آب و تاب میں شراب کی طرح دکھائی دیتی ہے)

علامہ اقبال کے ہاں آگ اور زرتشت کا ذکر بھی ملتا ہے اور آپ یہ فرماتے ہوئے کہ میرا پیغام آنے والے وقتوں کے لوگوں کے لئے ہے اور میرے بعد میرے کلام کے رموز و معانی لوگوں پہ منکشف ہونگے اس امر کا برملا اظہار کرتے ہیں :

انتظارِ صبح خیزاں می کشم
اے خوشا زرتشتیانِ آتشم

(میں صبح صبح بیدار ہونے والے لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ آفرین ہے میری آگ کے زرتشتیوں پر)

شہنشاہ کی شخصیت کا طلسم

اس میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے کہ ایران میں بادشاہت کے قیام کے بعد شاہ کی ذات کو انسانی اور ملکوتی اوصاف کا مجموعہ قرار دے کر اسے خداوندِ خلّاق (اھورامزدا) کا مظہر اور پرتو قرار دے دیا گیا۔ چونکہ اس کی ذات کا شاہی خاندان کے موروثی نظام کے باعث تعین ہوتا تھا اس لئے شاہی خون کے تقدس کے نظریات بھی مسلّمہ امر کے طور پر قبول کر لئے گئے۔ شاہ کا جلال اور دبدبہ اسی وجہ سے قائم رہ سکتا تھا کہ وہ عوام سے دور رہ کر دربارِ شاہی کی رونقوں میں جلوہ افروز ہو۔ اس کی ذات سے بادشاہت کا مرکز ہونے کے باعث کچھ ایسے تقاضے کئے جاتے تھے جنہیں بہرصورت پورا کیا جانا ضروری تھا۔ ان میں شاہ کا علم و شعور' اس کی دانش اور تدبر اور جرأت و دلاوری لازمی نکتے تھے۔ جنگ وجدال کے موقع پر شاہ کو عموماً خود میدان میں اترنا ہوتا تھا اور شاہ کی موجودگی ملتِ ایران کے اتحاد کی علامت اور مظہر تھی۔ عوام کی بادشاہ سے وفاداری اور جان نثاری کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ مشہور بادشاہ خسایارشاہ جب یونان و مصر پر قبضہ کے بعد مصر میں کشتی پر سوار ہو کر وطن واپس آ رہا تھا تو وزن کی زیادتی کے باعث ایک موقع پر کشتی ڈگمگانے لگی۔ ملاح نے کہا کہ اگر کچھ لوگ سمندر میں چھلانگ لگا دیں تو شاہ کو بچایا جا سکتا ہے۔ روایات کے مطابق کشتی میں ڈیڑھ سو افراد سوار تھے۔ شاہ نے کہا کہ کون ہے جو اپنے بادشاہ کو بچانے کے لئے سمندر میں کود جائے۔ یہ سنتے ہی بلا حیل و حجت سب نے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔

شروع شروع میں روم کے بادشاہ نے سادگی کا شعار اختیار کیا تھا اور عیسائیت قبول کرنے کے بعد بادشاہوں میں میانہ روی اور منکسرالمزاجی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے'

لیکن ایرانی دربار میں رومی سفراء کی آمدورفت سے ایرانی دربار کے پروٹوکول اور عظمت کی خبریں روم پہنچی تو وہاں پر بھی ایرانی طریق کار اپنایا جانے لگا۔ دراصل یورپ و مشرق کے درباری آداب ایرانی بادشاہت سے متاثر ہوئے ہیں۔

اسلام کے فروغ کے بعد خاندانی تقدس اور خونی اصالت کا ایرانی نظریہ بالآخر اسلام میں بھی در کر آیا۔ امام زین العابدینؒ کی زبان سے ایرانی کتب میں روایت پائی جاتی ہے کہ میں سب سے نجیب انسان ہوں' ایک طرف میں نواسۂ رسولؐ کا فرزند ہوں اور حضرت علیؓ کا پوتا ہوں تو دوسری طرف میں ایران کے ساسانی شہنشاہ یزدگرد سوم کا نواسہ ہوں۔ اس طرح خاندانِ نبوت اور خاندانِ شہنشاہی کا امتزاج ہوں۔ یہ اصالتِ نسب و خون ہمیں مذہبی نظریات میں بعد کے ادوار میں بھی جلوہ فگن ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اسی طرح جب اسلام میں بادشاہت کی طرف میلان ہوا تو خاندان بنی امیہ کے بادشاہوں نے اپنے حساب کتاب کے لئے ایرانی دیوانوں کو مقرر کیا اور ان کی مدد سے کامیابی سے اپنا مالیاتی نظام چلایا۔ عباسی سلطنت کے قیام میں تو ایرانیوں کی گہری دلچسپی اور تعاون شامل رہا ہے اور پھر مامون الرشید تو تھا ہی ایرانی ماں کے بطن سے۔ اس طرح عباسی حکومت کا دارالخلافہ بغداد بھی اسی خطہ میں شامل تھا جو طیسفون کے نام سے ایرانی بادشاہت کا کبھی مرکز رہا تھا۔ ہمیں بنو عباس کے اس شاہی نظام میں ہر لحاظ سے گہرے ایرانی اثرات ملتے ہیں۔ پھر ایک موقع یہ بھی آیا کہ مسلمانوں میں بطور اولوا الامر شاہ وقت کی اطاعت کرنا لازم قرار دے دی گئی اور شاہ کو ظلِّ الٰہی کا درجہ حاصل ہوا۔ آج برصغیر میں بادشاہت کو ختم ہوئے مدت ہو گئی ہے مگر اب بھی علماء کے خطبوں میں سلطانِ وقت کی اطاعت اور اس کے حکم کو خدائی حکم کے ہم پلہ قرار دیئے جانے کی تکرار محراب و منبر میں بدستور جاری و ساری ہے۔

یہودیوں نے بھی ایرانی ھخامنشی بادشاہت کو قریب سے دیکھا اور پھر وہ ایرانی لشکر کے تعاون سے فلسطین میں دوبارہ داخل ہو کر ایک حکومت کے وارث قرار پائے جو ھخامنشی سلطنت کے زیر سایہ پنپتی رہی۔ انہوں نے خدائے ذوالجلال کی ہیبت و عظمت کا موازنہ بھی ایرانی بادشاہ سے کیا اور فرشتوں کو خدا کے درباریوں کی صورت میں پیش

کیا۔ یہ صورت حال ہمیں دبے دبے لفظوں میں کچھ مفسرین کے ہاں بھی ملتی ہے۔

ایرانی میدان جنگ

مسلمانوں نے فن حرب و ضرب میں بھی ایرانی تجربات سے خوب استفادہ کیا ہے۔ جنگ خندق سے قبل آنحضور ﷺ نے بذات خود حضرت سلمان فارسی ؓ سے تزویراتی امور میں مشورہ لیا اور خالصتاً ایرانی طریقہ سے دفاعی جنگ لڑی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے حضرت عمر ؓ کے عہد میں ایرانیوں سے طویل جنگ کے نتیجے میں بہت کچھ سیکھا۔ پھر جب ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے بہت سے فنونِ حرب و ضرب اور دیگر فنون دفاع و جنگ اسلام میں لے آئے۔ پھر وہ اسلام کے بازوئے شمشیرزن بن کر میدان عمل میں اترے۔ ہمیں برصغیر پہ ابتدائی حملہ میں محمد بن قاسم کے ہمراہ ہزارہا ایرانی (صوبہ فارس سے تعلق رکھنے والے) سپاہیوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ محمود غزنوی کے ہمراہ آنے والوں میں ایرانی فوجیوں کے علاوہ عنصری اور فرخی سیستانی جیسے عظیم فارسی شعراء ایران بھی میدان عمل میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے جنہوں نے اپنے جنگی واقعات شعروں میں قلمبند کئے ہیں۔ ظہیرالدین بابر کو اکثر اوقات وسط ایشیاء کے حملوں میں ایرانی سپاہ کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اسی طرح ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان کی دوبارہ تسخیر تو ایرانیوں کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی تھی۔ اسی طرح برصغیر کے تمام مسلمان بادشاہوں اور سلطانوں (خصوصاً عہد مغلیہ) کے ہاں فوجی افسروں کی واضح اکثریت فارسی بولنے والے افراد پہ مشتمل رہی ہے۔

علاوہ بریں ایرانیوں کا معمول رہا ہے کہ وہ طویل عرصہ تک جنگ لڑنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی قوم کے وقار کی بحالی کے لئے سالہا سال تک جنگ لڑ سکتے ہیں۔ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق ؓ نے ایرانیوں سے جنگ کے موقع پر فرمایا تھا کہ اے کاش ہمارے اور ملّتِ ایران کے مابین آگ کے پہاڑ ہوتے، نہ وہ ہماری جانب بڑھتے اور نہ ہی ہمیں ان سے جنگ لڑنا پڑتی۔ یہ چیز ہم ان کی رومیوں سے ہونے والی خونریز جنگوں میں بھی دیکھتے ہیں اور یہی جذبہ اسلامی سپاہ کے حملہ کے موقع پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح زمانہ

جدید میں اس کا مظاہرہ ہم ایران' عراق جنگ کی طوالت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ان جنگوں میں ان کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ اپنے تمام وسائل یکجا کر کے خود کو ذلیل و خوار ہونے سے بچا سکیں' بقول فردوسی ؎

ہمہ سر بہ سر بہرِ کشتن دہیم
ازاں بہ کہ ایران بہ دشمن دہیم

(ہم ایک ایک کر کے اپنے سر کٹا دیں یہ اس سے بہتر ہے کہ ہم ایران دشمن کے سپرد کر دیں)

یہ شعر بھی فردوسی طوسی نے ہزار برس قبل ایران پہ اسلامی سپاہ کی فتح کا بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

جذبۂ حب الوطنی اور قوم پرستی

حبِ وطن ایرانیوں کا شیوہ رہا ہے۔ انہیں اپنی تہذیب' زبان' تمدن' تاریخ اور سر زمین پر فخر رہا ہے۔ وہ غیر ملکی قبضہ سے نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ایران کی مملکت سکندر اعظم' حضرت عمر فاروق ؓ اور چنگیز و ہلاکو خان کے ہاتھوں غیر ملکی قبضے میں گئی ہے۔ حضرت عمر فاروق ؓ سے ان کی ایک گونہ نفرت کی وجہ ایران کی سلطنت کا انقراض اور ایرانی فخر و مباہات کا خاتمہ تھا۔ حضرت عمر فاروق ؓ کی فتح کے بعد یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ایرانی قریب قریب بحیثیت قوم مسلمان ہو گئے تھے۔ ہر چند اسلام کے دین مبین' قرآن کے ابدی اصولوں اور رسول اکرم ﷺ کی نبوت پر وہ ایمان لے آئے تھے لیکن اسلامی فاتحین سے جبلی نفرت ہمیں بعد کے ایرانی افکار میں ہر کہیں پر دبے دبے انداز میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہم علامہ اقبال کے ضمن میں ایرانی پروفیسر پور داؤد کا ایک بار پھر ذکر کریں گے۔ یہ وہی پروفیسر ہے جس کا تمام تر تحقیقی کام اور تخصص قبل از اسلام کے ساسانی ادب اور تاریخ سے ہے۔ اس نے ایک بار ہندوستان کے سفر (قبل از تقسیم ہند) کے موقع پر علامہ اقبال کی ذات کے بارے میں چند ایک قابل اعتراض جملے بھی کہے تھے۔ چونکہ استاد

پورداؤد کی تمام تر تصانیف زرتشتی ایران کی تجلیل و تمجید کے بارے میں رہی ہیں ہم یہاں پر اس کے اشعار کی رو سے ہرمزان (ایرانی جرنیل) اور حضرت عمر فاروقؓ کے مکالمہ کے بارے میں قارئین کو متعارف کرواتے ہیں :

چو شد واژگون تختِ ساسانیان
مداین یغماشد از تازیان

(جب ساسانیوں کا تختہ الٹ گیا اور ایران کا دارالحکومت مدائن عربوں کے ہاتھ مال غنیمت کی صورت میں لگا)

سپاہِ عمر تا بہ جیحوں رسید
بخون خفتہ شہزادگان را بدید

(حضرت عمر کی فوج دریائے جیحوں کے کنارے تک جا پہنچی اور اس فوج کے ہاتھوں شہزادے خون میں لت پت ہو کر دم توڑ گئے)

یلِ نامور ہرمزانِ دلیر
کشیدہ بہ زنجیر برسانِ شیر

(مشہور بہادر پہلوان ہرمزان کو شیر کی طرح زنجیر میں جکڑ کر لے جایا گیا)

ببردندش سوی مدینہ دوان
بہ نزدِ عمر رہبرِ تازیان

(اس حالت میں اسے دوڑاتے ہوئے مدینہ میں عربوں کے سربراہ حضرت عمر کے پاس لے گئے)

نگہ کردش آن تازیٔ کینہ جُوی
پس آنکہ کشود آن لبِ گفتگوی

نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد (اس کینہ جو عرب نے اس پہ غصے سے ایک نظر دوڑائی اور پھر گفتگو شروع کی)

ہر آنکس بہ اسلام ِ جنگ آورد
سرش را خدا زیرِ سنگ آورد

(جو بھی اسلام کے خلاف برسرپیکار ہوتا ہے خدا اس کا سر پتھروں سے ڈھک دیتا ہے)

ہم مزید شعر بیان کئے بغیر حضرت عمرؓ کے خلاف روایتی ایرانی عناد کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ چیز دراصل ادب، شعر اور تاریخ میں جلوہ گر رہی ہے۔ شکست خوردہ حالت میں بھی ایرانی اپنی عزت نفس اور فخر کا جذبہ قائم رکھنے کی کوشش ضرور کرتے نظر آتے ہیں۔ ایرانی ہر اس شخص کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں جو ان کے شعائر اور قومی روایات کی تحقیر کرتا ہو۔ وہ سکندر اعظم سے شکست خوردگی کے بعد بھی اپنے آپ کو تسلی دلانے کے لئے من گھڑت حکایات بیان کرنے سے نہیں چوکتے۔ سکندر اعظم کو وہ ایرانی بادشاہ داریوش کا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ داریوش (یا دارا) نے سکندر کے باپ فیلپ مقدونی سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا اور پھر اسے وہ بیاہ کر ایران لے آیا اور پھر کچھ عرصہ بعد واپس یونان بھیج دیا جہاں اس عورت نے داریوش کے بیٹے کو جنم دیا جسے سکندر کا نام دیا گیا۔ اس کہانی کو فردوسی اس طرح بیان کرتا ہے۔

دلِ بادشاہ سرد گشت از عروس
فرستاد بازش سرِ فیلپوس

(جب بادشاہ یعنی دارا کا دل اس دلہن سے اکتا گیا تو اسے واپس اس کے باپ فیلپ کے پاس بھجوا دیا)

چو نُہ ماہ بگذشت از آن خوب چہر
یکی کودک آمد چو تابندہ مہر

(جب نو ماہ پورے ہوئے تو اس سورج جیسی خوبصورت خاتون نے ایک بچہ جنم دیا)

ز بالا و رنگ و ز بوی و برش
سکندر ہمی خواندی مادرش

(اس کے قد اور جسم میں خوبصورتی اور رنگ و بو کا سماں تھا جس کی وجہ سے ماں نے اسے سکندر کہا)

ہمی گفت قیصر بہر مہتری
کہ پیدا شد از نسلِ من قیصری

(شرم کو چھپانے کے لئے فیلپ نے سرداروں میں مشہور کر دیا کہ میرے ہاں ایک شہزادے نے جنم لیا ہے)

ہمی ننگش آمد کہ گفتی بہ کس
کہ دارا ز فرزندِ من کرد بس

(اسے وہ ماجرا سناتے ہوئے شرم آرہی تھی جو اس کی بیٹی پر دارا کے ہاتھوں بیتا تھا)

اسی طرح کی من گھڑت داستانیں اور احساسات ایران کے ماضی پر فخر کرنے کا جواز مہیا کرتی تھیں اور ایرانی ایک موقع پر تو اس قدر قدیم ساسانی اور ہخامنشی عہد کی تواریخ کے دامن میں پناہ لینے لگے کہ ان کے ہاں اسلام کا جذبہ ماند پڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس قومی جذبے کو اشتعال دلا کر محمد رضا شاہ پہلوی نے ایرانی قومیت کی اساس پر اپنی بادشاہت کو مستحکم کرنا چاہا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب علامہ اقبال کو ایران کے حد سے بڑھے ہوئے جذبہ قومیت اور عربوں سے نفرت پر دلی دکھ ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ہم پھر یہاں پر پور داؤد کے شعر بیان کرتے ہیں۔

فرو فیروزی ملت ما پیداست ہنوز
کیش زرتشت ز آتش کدہ بر جاست ہنوز
تخت جمشید بلند اختر برپاست ہنوز
طاق کسریٰ بلب دجلہ ہویداست ہنوز
ماند آن ملک کزو ماند بجا نام و نشان

(ہماری قوم کی کامیابی کے نشان اور کرو فر اب بھی ظاہر ہیں۔ آتش کدوں کے نشانات کے باعث زرتشت کا دین اب بھی زندہ ہے۔ اپنی تمام تر شان و شوکت کے ہمراہ تخت جمشید اب بھی قائم و دائم ہے اور دجلہ کے کنارے طاق کسریٰ کے اب بھی نشانات موجود ہیں۔ جس ملک کا نام و نشان باقی ہو وہ ملک قائم رہتا ہے)

یہ جذبہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس صدی کے آغاز میں ایک مشہور ایرانی عالمِ دین نے کہا تھا کہ ہم اپنے ملک میں گھس کر آنے والے ہر شخص کو پہلے قتل کریں گے، پھر یہ دیکھیں گے وہ مختون ہے یا غیر مختون۔ پہلے ہم یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ آیا وہ

مسلمان ہے بھی یا نہیں۔ یہی قوم پرستی کا جذبہ تھا جس کے تناظر میں ہمیں ایران کی جدید تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو گا اور اس قوم کے جذبات کو سمجھنا ہو گا۔

تاریخ میں جہاں شکست خوردگی اور ہزیمت کا ذکر آئے گا وہاں پر ایرانی حماسہ سرائی کے ذریعہ دردمندانہ اور آرزومندانہ رزمیہ شعر کہتے ہوئے قوم کو بیداری کے لئے اکسائیں گے۔ یہی بات نہ صرف ہمیں مرثیہ میں نظر آتی ہے بلکہ ایران کی قومی تحریکوں کے احیاء میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جس طرح اساطیری عہد کے ایران میں ایک لوہار کاوہ نے ضحاک جیسے ظالم غیر ملکی حکمران کے استبداد کے خلاف اپنا علم بلند کر کے قوم کو بیدار کیا تھا اسی طرح ساسان نے اپنے معبد ناہید سے نکل کر قوم میں نئی روح بیدار کی تھی۔ کسی شاعر نے انقلاب سے چند برس قبل کیا خوب کہا تھا۔

ایرانیان کہ تختِ کیان آرزو کنند
باید نخست کاوۂ خود جستجو کنند

(اہل ایران جو تخت کیان کی آرزو لے کر آہیں بھر رہے ہیں انہیں چاہئے کہ سب سے پہلے وہ اپنا کاوہ تلاش کریں)

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے مرد آزاد کی قیادت تسلیم کریں جو ان کو جدوجہد کی مشکلات سے گزارتا ہوا منزل مقصود تک پہنچا دے۔

اسی قومی جذبے نے نہ صرف ایران کی زبان اور روایات کو زندہ رکھا بلکہ ہر دور میں ان کا قومی مزاج بھی بحال رہا۔ اسی مزاج کا اثر تھا کہ وقت آنے پر یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ہر چیلنج کے مقابلے میں ڈٹنے کی اعلیٰ صلاحیت کا مظہر بن کے ابھرتی رہی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ قومی جذبات میں اسلام کا مذہبی جذبہ بھی شامل ہو گیا اور پھر قومیت کا اور مذہب کا امتزاج ایک خوبصورت رخ اختیار کر گیا۔

ایرانی طرز فکر

ایران میں عظیم سلطنت کا ایک عرصہ تک وجود رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں پر ایک منظم مالیاتی نظام، فوجی نظم و نسق اور قانون و آئین کا دور دورہ رہا ہے۔ اسلام قبول

کرنے کے بعد قانون سازی، اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترقی میں ان کا یہ جذبہ بروئے کار آیا۔ نہ صرف امام ابو حنیفہؒ جیسے عظیم فقیہ یہاں پر پیدا ہوئے بلکہ رازی اور غزالی جیسے مفکرین، شہاب الدین سہروردی جیسے خود شناس صوفی بزرگ اور مولانا روم اور سنائی و عطار جیسے پر جوش روحانیت کے داعی بھی ایران ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ سعدی و جامی اور حافظ کی شاعری ہو یا سعدی و رومی و عطار کا فلسفہ اخلاق، غزالی کی کردار سازی ہو یا مذہبی مسائل کا استدراک، رازی کا استدلال اور منطق ہو یا امام مسلم کی تحقیق و تفحص، حضرت عبد القادر گیلانی کی خدا شناسی اور درویشی ہو یا سید علی ہمدانی کی تبلیغ، یہ تمام جہتیں انہی جذبات و تفکرات کی آئینہ دار نظر آتی ہیں۔

ابن سینا، نصیر الدین طوسی، عطا ملک جوینی اور ملا صدرا جیسے مفکرین کہاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح معین الدین چشتی اجمیری اور جلال الدین تبریزی (سلہٹی) کے درجہ کے صوفیاء اور مبلغین باعمل صرف اسی خاک سے جنم لے سکتے تھے۔

یہی ذہنی کشمکش ہمیں علامہ اقبال کے تفکرات میں جلوہ فگن نظر آتی ہے جہاں آپ فرماتے ہیں :

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

اور کبھی فرماتے ہیں :

سنائی کے ادب میں مَیں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا!

یہ تفکر، تعمق، استدلال، جذبہ اور جوش ہمیں کسی اور قوم کے ادباء و شعراء اور صوفیاء میں نظر نہیں آتا۔ حضرت علی ہجویریؒ کی تصوف کے موضوع پر لکھی گئی پہلی فارسی کتاب کشف المحجوب سے لے کر علامہ اقبال کی ارمغان حجاز تک کا نو سو برس پہ محیط دور لاہور کے ایرانی اور عجمی فکر کا آئینہ دار ہے۔ کہیں ہمیں قرون اولیٰ کا مسعود سعد سلمان لاہوری نظر آتا ہے کبھی مغلیہ دور کا ملا شاہ بدخشی، کہیں حضرت میاں میر کی ذات گرامی ہے اور کہیں لاہور کے قیام کے دوران صائب تبریزی کی غزلیات ___ راقم الحروف

نے بہت پہلے کہا تھا:

بس معطر می کند ہر گوشۂ لاہور را
آن نسیمی کو بیاید از صفاہانِ شما

(لاہور کے ہر گوشے کو وہ باد نسیم جو تمہارے اصفہان سے چل کر آ رہی ہے پوری طرح معطر کر رہی ہے)

انہی ایرانی الاصل مبلغین کا استدلال ہی تو تھا کہ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے نتیجہ میں ہمارے آباء و اجداد نے کلمہ حق پڑھ کر کفرستان ہند میں طرح حرم رکھ دی۔

ایرانی جشن

ایرانی بہار کی آمد اور شیطانی غلبہ سے آزادی کی یاد میں جشنِ نوروز مناتے چلے آ رہے ہیں اور اسے عید کا درجہ دیتے رہے ہیں۔ اسی طرح موسم سرما میں ان کی عید مہرگان ہے۔ یہ دونوں عیدیں رسول اللہ کی ہجرت تک مدینہ منورہ میں بھی منائی جاتی تھیں۔ آپ نے ان کو منسوخ فرما کر عید الفطر اور عید الاضحیٰ منانا شروع کیا۔ ہمارے ایرانی احباب ایک حدیث بیان فرماتے ہیں جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں عید نوروز کا حلوہ بھی تناول فرمایا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ عید ابھی تک ایران اور فارسی بولنے والے دیگر ممالک میں منائی جاتی ہے۔ محمود غزنوی کے دربار میں پڑھے گئے عید نوروز کے قصائد ابھی تک موجود ہیں اور مغلیہ دور میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک ہمیشہ عید نوروز پورے جوش و جذبہ سے منائی جاتی رہی۔ جہانگیر نے تو اپنی توزک کے ابواب کو جب مختلف سالوں کے احوال پر تقسیم کیا تو ہر باب کو روز نوروز کا نام دیا۔ پہلے سال کو وہ روز اول نوروز اور دوسرے برس کو روز دوم نوروز سے یاد کرتا ہے۔ پاکستان کے دور دراز کے علاقوں میں کہیں کہیں ابھی تک نوروز کا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ سکھوں کی بیساکھی بھی تو نوروز کی صورت ہی ہے۔ آج بھی نوروز کا تہوار ایران میں سرکاری طور پر منایا جاتا ہے اور منایا جاتا رہے گا۔ ہمارے ہاں عید کے پکوان اور اس موقع پر ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا اور کھانے پیش کرنا، یہ کسی حد تک نوروز کے جشن سے مماثلت رکھتے ہیں۔ (جاری ہے)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد : ۴۶
شمارہ : ۱۰
جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ
اکتوبر ۱۹۹۷ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زر تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

○ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)

○ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)

○ ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔اے، گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کا دو روزہ اجلاس ۱۴' ۱۵ ستمبر کو اور مرکزی عاملہ کا اجلاس ۱۷ ستمبر کو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس موقع پر ملکی اور بین الاقوامی حالات کے حوالے سے جو قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں' ان کے ذریعے چونکہ ان امور کے ضمن میں تنظیم اسلامی اور اس کے امیر کے نقطہ نظر اور موقف کا احاطہ نہایت جامعیت کے ساتھ ہوتا ہے لہذا قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر سطور ذیل میں انہیں شائع کیا جا رہا ہے۔

(۱) ایک قرارداد کے ذریعے اس امر پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا گیا کہ چھ ماہ گزرنے کے باوجود مسلم لیگ کی حکومت دستور پاکستان میں موجود تضادات کو رفع کرنے اور غیر اسلامی دفعات کو دستور سے خارج کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہ کر سکی۔ خصوصاً سودی معیشت کے خاتمے کے سلسلے میں بلند بانگ دعووں کے باوجود ہنوز کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

(۲) ایک قرارداد کے ذریعے تنظیم اسلامی نے شمالی افغانستان میں طالبان کی تازہ ترین کامیابیوں پر اطمینان کا اظہار کیا اور طالبان مخالف اتحادی فوجوں کو جنگ کے بجائے مذاکرات کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تاکہ افغانستان میں مکمل طور پر امن و امان قائم ہونے کی راہ ہموار ہو سکے۔

(۳) تنظیم اسلامی نے ایک قرارداد کے ذریعے افغانستان میں ایران کے رول کو اتحاد ملی اور علاقائی مفاد کے اعتبار سے نامناسب قرار دیتے ہوئے حکومت ایران سے مطالبہ کیا کہ وہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم کرے اور اسے غیر مستحکم کرنے کی کوششیں ترک کر دے۔

(۴) ایک قرارداد کے ذریعے تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت نے پاک بھارت مذاکرات کے سلسلے کو جاری رکھنے پر اطمینان کا اظہار کیا' البتہ مذاکرات سے پہلے دونوں اطراف سے سفارت کاروں کے نکالے جانے کو انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل قرار دیتے ہوئے مذاکرات میں سنجیدگی اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ قرارداد میں انتباہ کیا گیا کہ باہمی

مذاکرات کی ناکامی عالمی قوتوں کو بے جا مداخلت کرنے کا موقع فراہم کرے گی جو دونوں ممالک کے لئے انتہائی مہلک اور نقصان دہ ہو گا۔

(۵) تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کی متفقہ طور پر پختہ رائے ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے بغیر چوری' ڈاکے' زنا' قتل و غارت اور دہشت گردی کے خاتمے کا قطعی طور پر کوئی امکان نہیں لہٰذا حکومت سطحی اور سرسری اقدامات کی بجائے اس عادلانہ نظام کو نافذ کرے تاکہ تمام جرائم کی جڑ اور بنیاد کٹ جائے۔

(۶) ایک قرارداد مقاصد میں کراچی کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ قتل و غارت کی وارداتوں میں نمایاں کمی آنے کے باوجود شہر میں خوف کی فضا قائم ہے۔ جس سے تجارتی اور صنعتی سرگرمیاں ماند پڑی ہوئی ہیں۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ کراچی میں امن و امان کے قیام کے لئے گروہی سیاست سے بلند تر ہو کر اقدامات کئے جائیں۔

(۷) ایک قرارداد کے ذریعے بے نظیر کے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان اور امریکی صدر کلنٹن کو پاکستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر خط لکھنے کی شدید مذمت کی گئی۔ اپوزیشن لیڈر سے مطالبہ کیا گیا کہ اسے اپنے خلاف ہونے والی مبینہ زیادتیوں پر پاکستان کی عدالتوں سے رجوع کرنا چاہئے تھا۔

(۸) ایک قرارداد مقاصد کے ذریعے اسرائیل کے رویئے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ یروشلم میں نئی یہودی بستیوں کی تعمیر سے باز رہے اور امن مذاکرات سے فرار کی راہ اختیار نہ کرے۔

ایک قرارداد کے ذریعے شیعہ سنی منافرت کو امت مسلمہ کے لئے تباہ کن قرار دیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا کہ عالمی استعماری قوتیں مسلمانوں میں فرقہ واریت کا زہر گھول کر سیاسی اور اقتصادی مفادات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

ایک قرارداد کے ذریعے ملک کی اقتصادی صورتحال پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا کہ ملکی و غیر ملکی قرضوں سے جلد از جلد نجات حاصل کی جائے اور ملکی پیداوار اور قومی وسائل میں اضافہ کیا جائے تاکہ پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر دنیا میں باوقار مقام حاصل کر سکے۔ OO

نواز حکومت کے چھ ماہ

شریعت کی بالادستی کا معاملہ نواز شریف کے لئے کڑی آزمائش بن گیا ہے

امیر تنظیم اسلامی کے ۵ ستمبر کے خطاب کا پریس ریلیز

لاہور (پ ر) ملک کی معاشی بدحالی کی تمام تر ذمہ داری موجودہ حکومت پر ڈالنا درست نہیں ہے۔ گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں پوری قوم قرضوں کی معیشت کی وجہ سے مصنوعی خوشحالی سے لطف اندوز ہوتی رہی ہے مگر اب بیرونی قرضوں کے ناقابل برداشت بوجھ کی وجہ سے ملکی معیشت دم توڑ رہی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے امریکہ کے دورہ سے واپسی کے بعد مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہا کہ صدارتی اختیارات میں کمی اور فلور کراسنگ پر پابندی کے قانون کی وجہ سے ملک میں بظاہر سیاسی استحکام کی فضا قائم ہے۔ لیکن یہ استحکام حقیقی نہیں مصنوعی ہے۔ کالاباغ ڈیم کی تعمیر دراصل موجودہ حکومت کے حقیقی سیاسی استحکام کا پیمانہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم قومیتوں میں تقسیم ہونے کی بجائے ایک قوم ہوتے تو کالاباغ ڈیم کب کا تعمیر ہو چکا ہوتا۔ قومی ترقی کے لئے ناگزیر حیثیت کے حامل کالاباغ ڈیم کا نہ بننا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ عدالتی نظام سمیت شرعی عدالت کے دائرہ اختیار پر عائد تمام پابندیاں ختم کی جائیں تاکہ ملک کے استحکام کے لئے حقیقی اور ٹھوس بنیاد فراہم ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ دہشت گردی کی روک تھام کے لئے نافذ العمل قانون اور خصوصی عدالتوں کا قیام عدلیہ اور حکومت کے درمیان محاذ آرائی اور ٹکراؤ کا سبب بنا ہے۔ عدالتی نظام کو شریعت کے تابع کرنے اور اسلام کا قانون شہادت نافذ کرنے سے دہشت گردی سمیت بہت سے جرائم کا فوری خاتمہ ہو جائے گا۔ عدلیہ کی آزادی کو روشنی کی کرن قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ 85 تا 90 تک کے دور کو احتساب سے مستثنیٰ قرار دینے کے حکومتی فیصلے سے "احتساب" کے عمل کو پہلے ہی بڑا دھچکا لگ چکا تھا احتساب کا جو انداز اختیار کیا گیا اس کے باعث احتسابی عمل کا مکمل طور پر تیاپانچہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اسلامی نظریئے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا تھا مگر قومی سطح پر اس نظریئے سے انحراف کے باعث ملک ہر سطح پر عدم استحکام سے دوچار ہو چکا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی

نے کہا کہ شریعت کو سپریم لاء نہ بنا کر پوری قوم گزشتہ نصف صدی سے اللہ تعالیٰ سے بدعہدی کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔ ان حالات میں گولڈن جوبلی کے نام سے آخر ہم کس چیز کا جشن منا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ملک کے اسلامی تشخص کو مضبوط کئے بغیر بھارت سے مفاہمت اور تجارتی تعلقات کی بحالی اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔ دین اسلام کی نظریاتی قوت بھارت کے پرتھوی میزائلوں کی طاقت سے کہیں زیادہ موثر ہے، جس کے مقابلے میں بھارت نظریاتی طور پر بالکل تہی دست ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ بھارت کی گجرال حکومت اپنی کمزور سیاسی حیثیت کی وجہ سے نواز شریف کی طرف سے مفاہمت کی پیشکشوں کو مسلسل ٹھکرا رہی ہے، بھارت کے اس رویئے کو نواز شریف حکومت کی بدنصیبی یا اس خطے کی بدقسمتی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے کشمیر کے بارے میں ایئر مارشل نور خان کی گوہر افشانیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر پاکستان کے لئے ہر لحاظ سے اہمیت کا حامل خطہ ہے جو پاکستان اور بھارت کے مابین مفاہمت کے قیام میں اصل رکاوٹ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ یا امریکہ کی طرف دیکھنے کی بجائے دونوں ممالک دو طرفہ مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو برصغیر کی تقسیم کے نامکمل ایجنڈے کی حیثیت سے حل کریں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کی حالیہ غیر معمولی کامیابی سے بے نظیر کی پیپلز پارٹی اپنی موت مر چکی ہے۔ اس پس منظر میں نواز شریف کو حاصل غیر معمولی مینڈیٹ درحقیقت نواز شریف خاندان کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ مذہبی مزاج کے حامل شریف خاندان کے لئے اس امتحان میں ناکامی دنیا و آخرت میں بدترین خسارے کا موجب بن سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر دور حکومت میں بھی ریاستی سطح پر اسلام بے دخل تھا اور افسوس کہ نواز شریف کے دور میں بھی تاحال اسلام بے یار و مددگار ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا نواز شریف نے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محسوس ہوتا ہے کہ شریعت کی بالادستی کے لئے نواز شریف واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر شاید کوئی پس پردہ مضبوط ہاتھ رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ یہ حلیف جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں اور بیرونی طاقتیں بھی۔ انہوں نے کہا کہ دستور میں ترمیم کے ذریعے شریعت کو ملک کا سپریم لاء قرار دے کر ملک میں سافٹ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے نواز شریف کو چاہئے کہ وہ پارلیمانی پارٹی میں دستوری ترامیم کو زیر بحث لائیں۔ انہوں نے تنظیم اسلامی کی طرف سے پارلیمانی پارٹی کے لوگوں کو قائل کرنے کے لئے نواز شریف کو تعاون کی پیشکش کی ہے۔

مساوات مرد و زن کا نظریہ دور حاضر کا ابلیسی فتنہ ہے

خواتین کمیشن رپورٹ کی سفارشات اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہیں

لاہور (پ ر) ۱۲ ستمبر۔ خواتین کمیشن رپورٹ کی پیش کردہ سفارشات اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہیں اور اس میں مسلمہ حقائق سے بھی انحراف کیا گیا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل "خواتین کمیشن رپورٹ کے مغالطے" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ کمیشن میں شامل واحد عالم دین مولانا محمد طاسین کے اختلافی نوٹ کے بغیر مجوزہ سفارشات کی اشاعت دھوکہ دہی اور مغالطہ آمیزی کے مترادف ہے۔ خواتین کمیشن کی جانب سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ گویا یہ کمیشن کے تمام ممبران کی متفقہ سفارشات ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ خواتین کمیشن کی پیش کردہ تمام سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں قائم ہونے والے خواتین کمیشن کا قیام درحقیقت اسلام کے خاندانی نظام کے خاتمے اور شرم و حیا کے اصولوں کو مٹانے کی عالمی سازش کا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی تعزیرات و قوانین کے بارے میں خود بے نظیر صاحبہ کے خیالات ڈھکے چھپے نہیں ہیں اور ان کی طرز معاشرت سے بھی سب ہی آگاہ ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ عالمی صیہونی تحریک اسلام کی معاشرتی و اخلاقی اقدار کے خاتمے اور سودی نظام کے تسلط کے ذریعے مسلمانوں کو دین و مذہب سے بیگانہ کر کے انہیں اپنا تابع اور محکوم بنانا چاہتی ہے چنانچہ ماضی قریب میں قاہرہ اور بیجنگ میں منعقد ہونے والی کانفرنسیں اس سازشی پلان کا حصہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ کے معروف دانشور سموئیل پی ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کر کے مغربی دنیا کو خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی اور چینی تہذیبیں مغربی تہذیب کے لئے حقیقی خطرہ ہیں۔ لہٰذا اس خطرے سے نمٹنے کے لئے عالمی استعمار اسلامی تہذیب کے آخری حصار یعنی خاندانی نظام کی تباہی اور چادر و چار دیواری کے خاتمے کے درپے ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ خواتین کمیشن کی سفارشات میں پاکستان کے اساسی نظریات سے بھی کھلم کھلا انحراف کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنانا اور وفاقی شرعی عدالت کا قیام ضیاء الحق مرحوم کا عظیم کارنامہ تھا۔ لہٰذا مختلف نوع کے کمیشن قائم کر کے ملک و قوم کا قیمتی سرمایہ ضائع کرنے کی بجائے وفاقی شرعی عدالت پر عائد پابندیاں ختم کی جائیں اور اس طرح کے تمام معاملات کو اس عدالت سے طے کرایا

جائے جہاں ہر مکتبہ فکر کے لوگ جا کر اپنے دلائل پیش کریں اور اس طرح آئینی طریقے سے ملک میں اسلامی نظام کو قائم کر کے سالمنٹ انقلاب کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ وفاقی شرعی عدالت کی موجودگی میں اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ مولویوں کو سیاسی رشوت دینے کا ایک ذریعہ بن چکا ہے لہٰذا قومی خزانے کو اس سفید ہاتھی سے نجات دلائی جائے۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے حق اختیار پر تو عائلی قوانین کے حوالے سے بھی پابندی عائد ہے مگر عاصمہ جہانگیر اور ریحانہ سرور جیسی اسلام بیزار مغرب زدہ خواتین کو اسلام کے معاشرتی نظام کا حلیہ بگاڑنے کی کھلی چھوٹ حاصل ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ کی حیران کن کامیابی اور نواز شریف کے اسلام کی طرف کسی قدر میلان کے باعث مغربی دنیا نفاذ اسلام کی جانب پیش رفت کے خدشہ سے لرزہ براندام ہے' ملک میں جاری دہشت گردی یہاں نفاذ اسلام کے امکانات کو معدوم کرنے کی عالمی سازش کا حصہ ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ مرد و زن کی مساوات کا مغربی تصور دور حاضر کا ایک فتنہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ شرف انسانیت اور اخلاقی و روحانی سطح پر مرد اور عورت دونوں بالکل برابر ہیں لہٰذا بحیثیت انسان عورت کو گھٹیا مخلوق سمجھنا جاہلانہ تصور اور غیر اسلامی سوچ کا مظہر ہے۔ تاہم معاشرتی میدان میں مرد پر چونکہ زیادہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے لہٰذا اسے حقوق و اختیارات بھی زیادہ دیئے گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مرد پر قوم و ملت کے "زمانہ حال" کی تعمیر و تشکیل کی ذمہ داری ہے تو قوم کے "مستقبل" کو بنانا اور سنوارنا عورت کا فریضہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مرد خاندان کے ادارے کا سربراہ ہے اور اسے بیوی پر قوام قرار دیا گیا ہے اور صالح خاتون کا بنیادی وصف یہ قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شوہر کی تابع فرمان ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ کمیشن کی جانب سے شوہر کو بیوی کی رضامندی کے بغیر جنسی تعلق قائم کرنے پر سزا دینے کی سفارش احمقانہ مطالبہ ہے جسے "مخصوص ٹولے" کے سوا کسی کی تائید حاصل نہیں ہے۔

مسئلہ افغانستان پر گفتگو کرتے ہوئے امیر تنظیم نے کہا کہ طالبان کو افغانستان کی ایک غالب قوت کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالبان اگر شمالی افغانستان کا کنٹرول حاصل نہ کر سکے تو افغانستان کی تقسیم کو ذہناً قبول کر لینا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ لسانی اور نسلی اعتبار سے شمالی افغانستان بالکل علیحدہ خطہ ہے۔ انہوں نے اس ضمن میں ایران کے کردار پر شدید تنقید کرتے ہوئے ہوئے کہا کہ ایران کو طالبان کی قوت سے خائف ہونے کی بجائے خطے میں امن کے حصول کے لئے طالبان حکومت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔

تذکرہ و تبصرہ

عہدِ حاضر میں اجتہاد کا طریق کار

امیر تنظیم اسلامی کا ۱۲/ جنوری ۹۶ء کا خطاب جمعہ (۲)

ہم نے تاریخ کے مختلف ادوار کے حوالے سے اجتہاد کے عمل کا جائزہ لیا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عہدِ حاضر میں اجتہاد کا طریق کار کیا ہوگا؟ اللہ کرے کہ کہیں خالص اسلامی ریاست قائم ہو جائے' کہیں اسلامی خلافت کا نظام قائم ہو جائے تو پھر وہاں قانون سازی (Legislation) کی صورت کیا ہوگی؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست یا نظام خلافت کا دستوری ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس موضوع پر میں متعدد بار بڑی تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں اور جناح ہال میں ہونے والے میرے خطابات "خطباتِ خلافت" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

جدید اسلامی ریاست کا سیاسی و دستوری ڈھانچہ

اس وقت میں محض خلاصے کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ عہد حاضر میں نظام خلافت کا سیاسی اور دستوری ڈھانچہ تین چیزوں پر مشتمل ہوگا۔ اولاً اس کے لئے راہنما اصول قرآن و سنت سے اخذ کئے جائیں' ثانیاً آئیڈیل نمونہ کے طور پر خلافتِ راشدہ کے نظام کو پیش نظر رکھا جائے' اور ثالثاً انسان نے اپنے عمرانی ارتقاء کے ذریعے سے جو سیاسی ادارے (Political institutions) تشکیل دیئے ہیں ان کو بھی اس نظام میں شامل کیا جائے۔

یہ تیسری بات ہمارے ہاں اکثر و بیشتر لوگوں کے علم میں نہیں ہے' بلکہ اکثر لوگ تو یہ بات سن کر چونک سے جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت سے ہمیں جو اصول ملتے ہیں اور خلافت راشدہ سے جس نظام کا نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے اسے روبہ عمل لانے میں عہد حاضر کے یہ ادارے بہت ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک طے شدہ اصول ہے

کہ اگر آپ کو خلیفہ سے کوئی اختلاف ہے تو آپ اس اختلاف کا اظہار کر سکتے ہیں' آپ اُس پر تنقید کر سکتے ہیں۔ لیکن خلیفہ کی ایک رائے ہے اور آپ کی ایک رائے ہے تو فیصلہ کون کرے گا کہ کس کی رائے درست ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے' اور اگر میں ٹیڑھا ہونے لگوں تو مجھے سیدھا کرنا تمہارا فرض ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے ایک اجتماع سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ اگر میں کتاب و سنت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلوں تو تم کیا کرو گے؟ سب نے کہا : "نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ" کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے' اطاعت کریں گے۔ پھر دریافت فرمایا : اور اگر میں کہیں غلط راستے پہ پڑ جاؤں تو؟ اس پر ایک شخص کھڑا ہوا' اس نے اپنی تلوار نیام میں سے کھینچی اور کہا : ہم تمہیں اس سے سیدھا کر دیں گے! انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میں کوئی اندھے بہرے لوگوں کی قیادت نہیں کر رہا' میرے پیچھے کوئی بھیڑوں بکریوں کا گلہ نہیں ہے۔ یہ جو چل رہے ہیں تو آنکھیں کھول کر میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ لیکن اس دور میں کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں تھا جہاں جا کر یہ ثابت کروایا جا سکے کہ خلیفۂ وقت واقعتاً غلط راستے پر چل پڑا ہے۔ ایران و عراق وغیرہ کی زمینوں کی تقسیم ایک علمی مسئلہ تھا' جس کے حل کے لئے حضرت عمر فاروقؓ نے دس انصاری صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی تھی۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی شخص نے خلیفۂ وقت پر ذاتی تنقید کرنی ہے۔ اسے یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ خلیفہ نے بیت المال میں خیانت کی ہے تو وہ کہاں جا کر دہائی دے؟ اس کے لئے کوئی ادارہ (institution) دورِ خلافتِ راشدہ میں موجود نہیں تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آج امریکہ میں "impeachment" کا ادارہ موجود ہے جو صدر کا احتساب کر سکتا ہے۔ امریکہ کے صدر کے پاس اختیارات بے تحاشا ہیں۔ اس کے پاس ویٹو کا اختیار بھی موجود ہے۔ وہ پارلیمنٹ' کانگریس یا سینیٹ کا غلام نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی غلط حرکت کرے تو impeachment کے لئے ایک انسٹی ٹیوشن موجود ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ صدر نکسن اسی impeachment کے خوف سے راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم سورۃ الحجرات اور سورۃ النساء کی آیات اور حدیث نبویؐ

کی روشنی میں یہ جائزہ لیں کہ اسلامی ریاست کا دستوری ڈھانچہ کیا ہے اور اس میں قانون سازی کا Scope کیا ہے۔ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ﴾

"اے اہل ایمان اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔"

تمہاری کچھ حدود ہیں اور تمہیں ان حدود کے اندر رہنا ہے۔ تم اس طرح آزاد نہیں ہو جیسے کہ کوئی ایسا شخص آزاد ہے جو اللہ کو مانتا ہے نہ رسول ؐ کو۔ وہ تو جہاں جی چاہے منہ مارے' جدھر چاہے چلا جائے۔ لیکن تم نے اللہ کو اور اللہ کے رسول ؐ کو مانا ہے۔ تم نے قرآن کو مانا ہے' تم تو پابند ہو' لہٰذا تمہیں ایک دائرے کے اندر اندر رہنا ہے۔ اس دائرے کی تشریح حضرت ابو سعید خدری ؓ سے مروی اس حدیث میں آئی ہے جو مسند احمد بن حنبل کے اندر موجود ہے۔ فرمایا :

((مَثَلُ المؤمنِ كَمَثَلِ الفَرَسِ فِي اَخِيَتِهٖ' يجول ثم يرجعُ اِلٰى اَخيتهٖ' واِنَّ المُؤمنَ ليَسهُو ثم يرجع اِلَى الايمَان))

"مومن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ (اپنے کھونٹے کے ارد گرد) گھومتا پھرتا ہے' پھر واپس اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (اسی طرح) مومن سے بھی خطا ہو جاتی ہے' لیکن پھر وہ ایمان کی طرف لوٹ آتا ہے۔"

اس حدیث میں انفرادی سطح پر مومن کا طرز عمل بیان ہوا ہے کہ ذاتی اعمال کے ضمن میں اگر وہ کہیں گناہ میں ملوث ہو جائے' اس سے کہیں خطا کا صدور ہو جائے تو وہ توبہ کر کے لوٹ آتا ہے' اس لئے کہ وہ ایمان کے کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ لیکن میں نے اسی حدیث کو اسلامی ریاست کے دستور میں قانون سازی کی "limitations" کو واضح کرنے کے لئے ذریعہ بنایا ہے۔ حدیث میں بیان کی گئی کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی تمثیل کو ذہن میں لایئے۔ فرض کیجئے آپ کے پاس ایک وسیع میدان ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ اس میں گھوڑا بھاگے دوڑے' اس کے ہاتھ پاؤں کھلیں' لیکن وہ ایک

خاص حد سے باہر نہ جائے تو آپ اسے ایک لمبی رسی کے ذریعے کھونٹے کے ساتھ باندھ دیجئے۔ اگر آپ اسے ایک سو گز لمبی رسی سے باندھ دیتے ہیں تو سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آجائے گا جس کے اندر اندر گھوڑا آزاد ہے کہ وہ شمال، جنوب، مشرق یا مغرب جس سمت میں چاہے چلا جائے۔ وہ چاہے تو ایک سو گز تک چلا جائے، چاہے پچاس گز پر جا کر بیٹھ جائے۔ لیکن وہ کسی سمت میں بھی اس ۱۰۰ گز نصف قطر کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اسی طرح ہمارے لئے بھی کچھ حدود معین کر دی گئی ہیں جن سے ہم باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ قرآن حکیم کے الفاظ ہیں : "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا" "یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں، ان کے قریب بھی نہ پھٹکو" (ان سے ذرا فاصلے پر رہو) اور "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا" "یہ اللہ کی متعین کردہ حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔" لیکن ان حدود کے اندر جو کچھ ہے وہ مباح ہے۔ مباح کسے کہتے ہیں؟ کھونٹے سے بندھا ہوا گھوڑا اگر پچاس گز تک جائے تب بھی یہ اس کے لئے مباح ہے، ساٹھ گز تک چلا جائے تب بھی مباح، شمال میں جائے تب بھی مباح اور جنوب میں جائے تب بھی مباح۔ یعنی اس کے لئے حدود متعین ہو گئی ہیں، اس کے اندر اندر اس کی چلت پھرت جائز ہے۔ البتہ ۱۰۱واں گز اس کے لئے حرام ہے۔

اسی طرح اللہ کی متعین کردہ حدود کے اندر اسلامی ریاست میں مسلمان آزاد ہیں۔ ان حدود کے اندر "اَمْرُهُمْ" کا دائرہ ہے جس کے لئے اصول دے دیا گیا : "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کہ یہاں آپ کو باہمی مشورے سے فیصلے کا اختیار دیا گیا ہے، چنانچہ آپ اپنی کثرت رائے سے فیصلہ کیجئے۔ مباح کے معاملے میں فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن حرام کو تمام مسلمان مل کر بھی حلال نہیں کر سکتے۔ آپ کی اکثریت اللہ کی حدود سے تجاوز ہرگز نہیں کر سکتی۔ اسے یہ ابدی ہدایت لازماً پیش نظر رکھنی ہو گی : "لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کہ "اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے مت بڑھو۔" اس آیت کی بالکل صحیح ترجمانی ہمارے دستوروں میں ان الفاظ سے ہوتی رہی ہے :

"No Legislation will be permissible here repugnant to the Quran and the Sunnah."

یعنی "اس ملک میں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہیں کی جا سکتی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ دستوری اور قانونی زبان میں یہ اس آیتِ مبارکہ کا بہترین ترجمہ ہے۔ البتہ یہ الفاظ پہلے تو ایک طویل عرصے تک ہمارے دستور کے دیباچے (Preamble) میں راہنما اصول (Directive principle) کے طور پر پڑے رہے۔ ضیاء الحق صاحب نے ان کو Operative Clause کا درجہ دلوایا تو ایک لمبا چوڑا گورکھ دھندا بنا دیا کہ فیڈرل شریعت کورٹ فیصلہ کرے گی کہ کوئی قانون غیر اسلامی ہے یا نہیں ہے' لیکن شریعت کورٹ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ وہ نہ عائلی قوانین پر بول سکتی ہے نہ مالی قوانین پر بات کر سکتی ہے' نہ دستورِ پاکستان پر گفتگو کر سکتی ہے اور نہ ہی عدالتی قوانین زیر بحث لا سکتی ہے۔ اس طرح یہ سارا عمل "Exercise in futility" ثابت ہوا۔ میں نے بیت اللہ شریف میں مولانا تقی عثمانی صاحب کو بابِ جبرئیل پر پکڑ لیا تھا کہ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اس عدالت کے جج بنے بیٹھے ہیں جو عائلی قوانین کے بارے میں بھی رائے نہیں دے سکتی؟ کہنے لگے : میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے کئی بار استعفاء بھی دیا ہے' لیکن ضیاء صاحب مانتے ہی نہیں۔ میں نے کہا کیسے نہیں مانتے؟ میں نے ان کی شوریٰ سے استعفاء دیا' انہوں نے مانا کہ نہیں مانا؟ آپ سیدھی بات کریں کہ جب تک آپ اس عدالت پر عائد کی گئی پابندیوں کو نہیں ہٹاتے ہم آپ کا ساتھ نہیں دیں گے' ہمیں آپ نے "فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان" کا جج بنا رکھا ہے اور ہم عائلی قوانین کے بارے میں بھی رائے نہیں دے سکتے کہ ان میں کوئی چیز خلافِ اسلام تو نہیں ہے۔ اور یہی بات میں نے ضیاء الحق صاحب سے ۵/ جولائی ۱۹۸۲ء کو لاہور ہی میں گورنر ہاؤس کے اندر کہی تھی کہ آپ نے اپنے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ لگا رکھا ہے کہ آپ نے "شریعت کورٹ" کے نام سے اتنی بڑی عدالت بنائی ہے' اس میں آپ نے خود منتخب کر کے ان علماء کو جج بنایا ہے جن کے علم و فہم اور دیانت پر آپ کو اعتماد ہے لیکن آپ نے انہیں پابند کر دیا ہے کہ وہ عائلی قوانین پر بھی بات نہیں کر سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو میں کہتا ہوں آپ وہ کیجئے۔ اُس وقت غلام احمد پرویز بھی زندہ تھے جن کے بنائے ہوئے عائلی قوانین ایوب خان نے نافذ کئے تھے۔ میں نے ضیاء صاحب سے کہا کہ آپ وفاقی شرعی عدالت میں ان قوانین کو زیر

[illegible] آنے دیجئے۔ غلام احمد پرویز کو بھی موقع دیجئے کہ وہ وہاں اپنے دلائل پیش کریں اور ثابت کریں کہ یہ قوانین کتاب و سُنّت کے منافی نہیں ہیں۔ لیکن آپ نے تو عدالت کے اوپر ہی پابندی لگادی ہے۔ کہنے لگے: تو پھر ان عورتوں کو کون مطمئن کرے گا؟ میں نے کہا کہ اگر آپ کی سوچ کا معیار یہی ہے تو میرا اور آپ کا راستہ علیحدہ ہے' میں آپ کی شوریٰ سے استعفاء دیتا ہوں۔ اس پر انہوں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا ہو گا کہ سر سے یہ بلا ٹلی۔ تو اگر کوئی استعفاء دینا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی حدود ہمارے لئے ایک دائرہ متعین کرتی ہیں' اس دائرے کے اندر اندر جو کچھ ہے مباح ہے۔ اس مباح میں فیصلہ کرنے میں آپ کو اختیار ہے' آپ اکثریت سے فیصلہ کر لیجئے کوئی حرج نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ نے کوئی فروٹ پارٹی کرنی ہے' اس میں آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون کون سے فروٹ لائے جائیں۔ یہ آپ باہمی مشورے سے طے کر لیجئے کہ اس میں کیا کچھ لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں بہت سی آراء ہو سکتی ہیں' لہٰذا آپ کثرتِ رائے سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرام شے تو نہیں لانی' شراب نہیں لانی' خنزیر کا گوشت نہیں لانا' فروٹ لانا ہے جو جائز ہے' اس میں کیا لائیں کیا نہ لائیں یہ کثرت رائے سے فیصلہ کر لیجئے۔ یہ جمہوریت اسلام میں ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ڈیموکریسی ہے' لیکن اس دائرے سے باہر نہیں جاسکتے' ۵۱ فی صد تو کیا سو فی صد کی رائے سے بھی نہیں جاسکتے۔ یہ فرق ہے اسلامی نظام میں اور رائج الوقت ڈیموکریسی میں۔ آج کی ڈیموکریسی میں چونکہ حاکمیت عوام کی ہے' وہ جو چاہیں فیصلہ کریں' جو چاہیں قانون بنائیں' انہیں اختیارِ مطلق حاصل ہے لہٰذا یہ ڈیموکریسی کفر ہے' شرک ہے۔

سورۃ النساء کی ایک آیت سے راہنمائی

عہد حاضر میں نظام خلافت کا جو دستوری خاکہ بنے گا اس کو سمجھنے کے لئے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ بہت اہم ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

"اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی۔ پھر اگر تمہارا جھگڑا ہو جائے کسی معاملے میں تو اس معاملے کو لوٹا دو اللہ اور رسولؐ کی طرف اگر تم واقعتاً ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یومِ آخرت پر۔ یہی بہترین طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔"

اس آیت کے اندر کچھ چیزیں تو معین طور پر آ گئی ہیں اور ایک خلا محسوس ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن ہر اعتبار سے مکمل ہے، صرف بات سمجھانے کے لئے میں یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ یہاں بظاہر ایک خلا نظر آتا ہے، جس کی وضاحت میں ابھی کروں گا۔ اس آیت میں "اللہ" کے ساتھ اور "رسول" کے ساتھ "اَطِيْعُوا" کا لفظ الگ الگ استعمال ہوا ہے۔ اس اسلوب سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت مستقل بالذات ہیں، ہمیشہ ہمیش کے لئے ہیں، جبکہ اولوالامر کے ساتھ دوبارہ تیسری بار "اَطِيْعُوا" کو دہرایا نہیں گیا، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقل بالذات نہیں بلکہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس جملے کی تین ممکنہ شکلیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو "اَطِيْعُوا" سب کے ساتھ آتا یعنی "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِيْعُوا اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" اگر ایسا ہوتا تو یہ تینوں اطاعتیں برابر ہو جاتیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ "اَطِيْعُوا" کو صرف ایک مرتبہ لایا جاتا۔ جیسے کوئی رقم بریکٹ سے باہر ہو تو وہ بریکٹ سے اندر کی ساری رقوم سے ضرب کھاتی ہے۔ یعنی "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ"۔ اس صورت میں بھی تینوں اطاعتیں برابر ہو جاتیں۔ لیکن قرآن حکیم نے یہ دونوں اسلوب اختیار نہیں کئے، بلکہ فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ مراد یہ ہے

کہ مستقل اور دائمی اطاعتیں صرف دو ہیں' اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت۔ جبکہ اولوالامر کی اطاعت مشروط ہے۔ اس کی اطاعت کتاب و سُنّت کے دائرے کے اندر اندر ہو گی۔ اگر کوئی اولوالامر یہ کہہ دے کہ میں اولی الامر ہوں' میں صاحبِ اختیار ہوں' میں فیصلہ کر سکتا ہوں اور وہ کتاب و سُنّت کے منافی کوئی حکم دے دے تو وہ حکم اس کے منہ پر دے مارا جائے گا کہ تم ہوتے کون ہو یہ حکم دینے والے! اس لئے کہ اس کی اطاعت مستقل بالذّات نہیں ہے۔ مستقل بِالذّات اطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہے۔

اس آیت میں وارد شدہ الفاظ "اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اولوالامر مسلمانوں میں سے ہو سکتا ہے' باہر سے نہیں۔ یہ ہے وہ بات جو میں ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں' اور یہ وہ کڑوی گولی ہے جو اِس دور میں نگلنا آسان نہیں ہے' کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی (Legislation) کے عمل میں صرف مسلمانوں کا عمل دخل ہو گا' غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ جو نہ اللہ کو مانے نہ رسول کو مانے' اس کو ہم قانون سازی میں کیسے شامل کر لیں۔ وہ نہ تو خلیفہ بن سکتا ہے' نہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے ووٹ دے سکتا ہے' نہ ہی قانون سازی کے لئے تشکیل پانے والی مجلسِ ملّی' مجلسِ شوریٰ یا پارلیمنٹ کا رکن بن سکتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے ووٹ دے سکتا ہے۔ ہمارے ذہنوں پر جو جدید مغربی تصورات مسلّط ہیں اور جو ہمارے ذہنوں کے اندر گہرے جڑے ہوئے ہیں' ان کے ہوتے ہوئے اِس بات کو ماننا آسان نہیں ہے' لیکن جان لیجئے کہ اگر ہم یہ نہیں مانیں گے تو ہمارا طرزِ عمل اُسلام کے منافی ہو گا۔ "اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" حکمِ قرآنی ہے۔ یعنی اولوالامر تم میں سے ہو گا۔ اور پارلیمانی نظام میں تو پارلیمنٹ ہی اولوالامر ہے۔ وہی وزیر اعظم کا انتخاب کرتی ہے' اور سارا اختیار وزیر اعظم کے پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت عدم اعتماد کا اظہار کر دے تو وزیر اعظم کو اپنا بستر گول کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ میں غیر مسلم کیسے جا سکتا ہے؟ اسلامی ریاست کا ڈھانچہ چاہے صدارتی ہو' چاہے پارلیمانی ہو' کانگریس' پارلیمنٹ' مجلسِ ملّی یا مجلسِ شوریٰ' یعنی مجلسِ قانون ساز میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں کیا جا

سکتا' اور نہ اس ایوان کی تشکیل میں اس کے ووٹوں کو عمل دخل دیا جاسکتا ہے' اس لئے کہ غیر مسلموں کے ووٹ بالواسطہ اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ تو یہ دوسری بات وضاحت سے اس آیت میں سامنے آگئی۔

تیسری بات یہ سامنے آئی کہ اگر اسلامی ریاست کے ایک عام شہری کو اولوالامر کی رائے سے اختلاف ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اگر صدارتی نظام ہے تو صدر اولوالامر ہے اور اگر پارلیمانی نظام ہے تو پوری پارلیمنٹ اولوالامر ہے۔ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون پاس کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب و سُنّت کے منافی ہے تو اب میں کہاں جاکر یہ طے کراؤں کہ یہ منافی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے ہی غلطی لگی ہو اور ہو سکتا ہے میری بات صحیح ہو۔ آخر کوئی جگہ تو ہونی چاہئے جہاں جاکر آدمی یہ جھگڑا طے کرا سکے۔ اس آیت مبارکہ میں یہ تو طے کر دیا گیا کہ "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" یعنی "اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو" لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کی عدالت اس دنیا میں تو کہیں لگے گی نہیں' لہٰذا اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف کیسے لوٹائیں؟ اس کے لئے کوئی ادارہ (Institution) ہونا چاہئے۔ یہ ہے وہ خلا جس کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا۔

درحقیقت انسان نے جو ترقی کی ہے' خواہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہو اور خواہ عمرانی ارتقاء (Social Evolution) ہو یہ انسان کی مشترک میراث ہے' یہ کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ ایک زمانے میں ہم مسلمانوں نے ہندیوں' یونانیوں اور چینیوں کے علوم و فنون سے استفادہ کر کے سائنس اور ٹیکنالوجی کو خوب ترقی دی' نت نئی سائنسی ایجادات کیں' لیکن پھر ہم سو گئے' عیاشیوں میں منہمک ہو گئے۔ اس کے بعد یورپ جاگ اٹھا اور اس نے سائنسی علوم کو آگے بڑھایا۔ اب اگر انہوں نے پنکھا ایجاد کیا ہے اور میں یہ کہوں کہ یہ چونکہ کسی عیسائی کا ایجاد کردہ ہے لہٰذا میں اسے استعمال نہیں کروں گا تو اس روش کو معقول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سائنس و ٹیکنالوجی ان کی میراث نہیں ہے۔ اِس وقت سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن اگر ہم نے ان کو ابتدائی علوم نہ سکھائے ہوتے تو ان کا باپ بھی یہ ایجادات نہیں کر سکتا تھا۔

سائنس کی ابتدائی تعلیم انہیں ہم نے دی تھی جس کی بنیاد پر وہ اس قدر آگے نکل گئے۔ اگر کسی نے پرائمری کی تعلیم حاصل نہ کی ہو تو وہ ہائی سکول میں کیسے جا سکتا ہے؟ اور ہائی سکول میں نہ پڑھا ہو تو یونیورسٹی میں کیسے پہنچ سکتا ہے؟ یہ تو ایک تدریجی عمل ہے' یہ کسی قوم کی ملکیت نہیں ہے۔ لیکن سائنسی ایجادات کی طرح یورپ میں کچھ ادارے (institutions) بھی پروان چڑھے ہیں۔ اور ہمیں دیکھنا ہو گا کہ ان میں سے جو ادارہ ہمارے اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھنے والا ہو' اس کو اختیار کریں۔ اس لئے کہ وہ بھی ہماری مشترک متاع ہے۔

چنانچہ آج کی دنیا میں ریاست کے تین بنیادی ستون شمار ہوتے ہیں۔ (۱) انتظامیہ (Executive) (۲) مقننہ (Legislature) (۳) عدلیہ (Judiciary) ہر ریاست کا ایک دستور ہوتا ہے۔ دستور کی محافظ (Custodian) عدلیہ ہوتی ہے۔ دستور میں یہ طے ہے کہ قانون کون بنا سکتا ہے' وہ کس طریقے سے بنے گا۔ اگر اس راستے کی پیروی نہیں کی گئی ہے تو کوئی شخص عدالت میں جا کر کہہ سکتا ہے کہ پارلیمنٹ میں دستور کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ عدلیہ فیصلہ کرے گی اور اگر واقعتاً دستور کی خلاف ورزی ثابت ہو گئی ہے تو وہ قانون کالعدم (nullified) ہو جائے گا۔ اللہ کرے کہ پاکستان میں یہ طے ہو جائے کہ یہاں کتاب و سُنّت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اب پارلیمنٹ میں قانون سازی ہو رہی ہے' وہاں تو ان پڑھ لوگ بھی بیٹھے ہیں' انہیں کیا پتہ کہ ہم نے دین سے تجاوز کر دیا ہے۔ اب آپ کیا کریں گے؟ اس کے لئے دو ہی راستے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ یا تو پارلیمنٹ میں محض علماء ہی نہیں بلکہ صرف مجتہدین جائیں۔ (اور مجتہد کی ساری شرائط میں اپنے سابقہ خطاب جمعہ میں بیان کر چکا ہوں) تب تو انہیں اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی کثرتِ رائے سے قانون سازی کر لیں۔ یہ قانون سازی شریعت سے متصادم نہیں ہو گی۔ لیکن اگر آپ نے پارلیمنٹ میں وسیع البنیاد نمائندگی رکھی ہے تو پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہے کہ مباحات کے معاملے میں کثرتِ رائے سے فیصلہ کر دے۔ لیکن کوئی شے مباح ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کے لئے آپ کو عدالت کا کنڈا کھٹکھٹانا ہو گا۔ اس سے "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کا تقاضا کسی حد تک پورا ہو جائے گا۔ یعنی

اسلامی ریاست کی عدلیہ یہ طے کرے گی کہ قانون سازی میں کتاب و سُنّت کے اصولوں سے تجاوز ہوا یا نہیں؟ اگر وہ طے کر دیتی ہے کہ تجاوز ہو گیا ہے تو قانون کالعدم ہو جائے گا' لیکن عدالت نیا قانون نہیں بنائے گی۔ قانون پھر اسی پارلیمنٹ کو بنانا ہے جو کتاب و سُنّت کے دائرے کے اندر اندر رہو۔

علامہ اقبال کا موقف اور اس کی غلط ترجمانی

یہ ہے وہ بات جو علامہ اقبال نے کہی اور میرے نزدیک یہ صدفی صد درست ہے کہ آج کے دور میں "اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ" ہو گا۔ لیکن اس کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس کا بالکل غلط مطلب بیان کر رہے ہیں اور اپنے والد کی بالکل غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ پارلیمنٹ کا اختیار آخری ہے۔ گویا ہم نے واجبی طور پر پارلیمنٹ کو یہ ہدایت دے دی کہ کتاب و سُنّت سے تجاوز نہ کرنا' لیکن اب پارلیمنٹ نے اپنی کثرتِ رائے سے جو بات طے کر دی وہی کتاب و سُنّت ہے۔ میرے نزدیک یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب یہ طے کر دیا جائے کہ پارلیمنٹ کے اندر صرف وہ لوگ الیکشن لڑ کے جا سکیں گے جو کتاب و سُنّت سے پوری طرح واقف ہوں' بلکہ ووٹ بھی صرف وہی دیں جو کتاب و سُنّت کے جاننے والے ہوں۔ لیکن یہ بات روحِ عصر کے منافی ہو گی۔ اس طرح تو ایک تھیوکریسی وجود میں آ جائے گی۔

اگر آپ کو روحِ عصر کو بھی پیش نظر رکھنا ہے اور شریعت کی حدود کے اندر اندر ڈیموکریسی کے تقاضے بھی پورے کرنے ہیں تو ہر مسلمان مرد و عورت کو ووٹ کا حق دیجئے۔ ان کے ووٹوں سے مقننہ کا انتخاب ہو گا۔ اب قوتِ نافذہ اس مقننہ (Legislature) کے پاس ہے۔ یعنی مباحات کے دائرے کے اندر کس چیز کو اختیار کیا جائے' یہ فیصلہ کرنے کا اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہے۔ فرض کیجئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نے قوتِ نافذہ کے استعمال میں کتاب و سُنّت سے تجاوز کیا ہے تو میں جاؤں گا اور عدلیہ (Judiciary) یعنی اعلیٰ عدالتوں کا کنڈا کھٹکھٹاؤں گا کہ مجھے موقع دیا جائے' میں ثابت

کرتا ہے کہ قانون سازی میں کتاب وسُنّت سے تجاوز ہو گیا ہے۔ یہ طریقہ ہے جو اِس دور میں قابلِ عمل ہو گا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ نئی قانون سازی کے لئے پھر پارلیمنٹ ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا' اس لئے کہ قوتِ نافذہ تو اس کے پاس ہے۔ ورنہ اگر قانون سازی کا آخری اختیار عدلیہ کو دے دیا جائے تو پھر تو عدلیہ کی حکومت ہو گئی۔ پارلیمنٹ کا کام کیا رہ جائے گا؟ عدلیہ کا کام صرف ایک ماہرانہ رائے (Expert Opinion) دینا ہے کہ آیا کسی معاملے میں کتاب وسُنّت کی حدود سے تجاوز تو نہیں ہو گیا۔ اگر نہیں ہوا تو عدلیہ اس قانون کو برقرار رکھے گی۔ اور اگر عدلیہ اس نتیجے پر پہنچے کہ قانون سازی میں کتاب وسُنّت کی حدود سے تجاوز ہو گیا ہے تو یہ قانون واپس پارلیمنٹ کے سپرد کیا جائے گا کہ وہ اس میں ترمیم کرے یا نیا قانون بنائے۔

اگر ایسا ہو جائے گا تو خود پارلیمنٹ قانون سازی میں خوب سوچ بچار سے کام لے گی اور ماہرین کی رائے لے کر کوئی قانون بنائے گی۔ پارلیمنٹ میں اگر کوئی بل پیش کیا جائے گا تو پہلے علماء سے مشورہ کیا جائے گا۔ خود ارکانِ پارلیمنٹ کو یہ اندیشہ ہو گا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم تو سارے پاپڑ بیل کر اس قانون کو پاس کروائیں اور کوئی جا کر عدلیہ سے یہ فتویٰ حاصل کر لے کہ یہ تو کتاب وسُنّت کے خلاف ہے' اس طرح تو ہماری تمام تر محنت کے اوپر پانی پھر جائے گا۔ اب بھی ہماری اسمبلی میں اگر کوئی بل پیش ہوتا ہے تو اس پر ماہرین کی رائے لی جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسمبلی میں بہت سے لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو کسی قانون سازی میں شریک نہیں ہوتے۔ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارا پارٹی لیڈر ہاتھ اٹھا رہا ہے تو ہم بھی اٹھائے دیتے ہیں۔ بہت سوں کو تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا مسئلہ زیر بحث ہے۔ اسمبلیوں میں پہنچنے والے بہت سے لوگ بالکل اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ لیکن اسمبلی میں ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جن کے ذریعے سے مسودۂ قانون کی دیکھ بھال کر کے پھر اسے پیش کیا جاتا ہے۔ تو جب دستور میں یہ طے ہو جائے گا کہ یہاں کتاب وسُنّت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی تو یہ ساری محنت و مشقت پہلے سے کی جائے گی۔ لیکن ریاست کے تینوں ستون اپنی اپنی جگہ پر کام کریں گے۔ پارلیمنٹ کا کام اجتہاد یعنی قانون سازی ہے۔ اس مقصد کے لئے پارلیمنٹ علماء کے اجتہاد سے فائدہ

اٹھائے گی کہ اس مسئلے میں مفتی تقی صاحب نے کیا رائے دی ہے' مفتی غلام سرور قادری صاحب کیا کہہ رہے ہیں' مفتی محمد خان قادری صاحب کیا رائے ظاہر کر رہے ہیں اور فلاں صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ آخر انہیں قانون بنانا ہے تو انہیں ملک کے اندر جو بھی اصحابِ علم ہوں گے ان کی آراء سامنے رکھنی ہوں گی۔ وہ ان آراء پر خود بھی غور و فکر کریں گے اور اپنے پاس ایسے ماہرین بھی رکھیں گے جو ان آراء کا اچھی طرح جائزہ لیں' ان کو scruitinize کریں۔ پھر اسمبلی وہ قانون پاس کرے گی۔ اس کے بعد انتظامیہ (Executive) اس قانون کو نافذ کرے گی' اور اگر یہ کتاب و سُنّت کے منافی ہے تو عدلیہ (Judiciary) اسے کالعدم قرار دے دی گی۔ چنانچہ ان ریاستی اداروں کا علیحدہ علیحدہ کام کرنا بہت ضروری ہے۔

سماجی ارتقاء کا ایک تقاضا

اس اعتبار سے میں کہا کرتا ہوں کہ مغرب میں سماجی ارتقاء کے نتیجے میں جو ادارے پروان چڑھے ہیں ہمیں انہیں اپنانا چاہئے۔ اس حوالے سے امریکہ کا صدارتی نظام ہمیں چوٹی پر کھڑا نظر آتا ہے جس میں یہ تینوں ریاستی ادارے بالکل علیحدہ علیحدہ کام کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ انتظامیہ اور مقننہ کو علیحدہ کیا جائے' لیکن وہ علیحدہ ہونے میں ہی نہیں آتیں۔ ہم سے یہ ایک ہفت خواں ہی طے نہیں ہو رہا۔ ہمارے پارلیمانی نظام میں انتظامیہ اور مقننہ گڈمڈ ہیں۔ وہی اسمبلی جو وزیراعظم کا انتخاب کرتی ہے اسی کے پاس حکومتی اختیارات ہیں۔ وہی اسمبلی مقننہ (Legislature) کی حیثیت سے قانون پاس کرتی ہے اور وہی درحقیقت Executive authority کا منبع بھی ہے۔ تو یہ دو چیزیں اس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں' جب کہ صدارتی نظام میں انتظامی اختیار صدر کے پاس ہوتا ہے۔ صدر کا انتخاب پورے ملک کے لوگوں کی رائے سے ہونا چاہئے۔ اس کا طریقہ کیا ہو' یہ علیحدہ بات ہے۔ اب صدر کے ہاتھ میں اختیار دے دیجئے کہ وہ اپنے وزیر بھی خود منتخب کرے۔ ضروری نہیں کہ اس کے وزیر کانگرس یا سینیٹ سے ہی ہوں۔ اس لئے کہ کانگرس اور سینیٹ میں تو وہی آئے گا جو ارب پتی اور کھرب پتی

ہو۔ اور جس کے پاس الیکشن میں خرچ کرنے کے لئے پیسہ نہ ہو وہ چاہے کتنا ہی بڑا ماہرِ اقتصادیات ہو وہ پارلیمنٹ میں کیسے آجائے گا؟ جو شخص ریاست کا انتظامی سربراہ ہے اس کو اختیار حاصل ہونا چاہئے کہ وہ مالیات کے کسی ماہر کو سکریٹری مالیات بنا سکے اور خارجہ امور کے کسی ماہر کو وزیر خارجہ بنا سکے۔ کانگریس کی حیثیت مقننہ کی ہو گی جو قانون سازی کرے گی، اور اگر کانگرس ملکی دستور سے تجاوز کرتی ہے یا صدر دستور سے تجاوز کرتا ہے تو جا کر عدلیہ کے دروازے پر دستک دی جائے گی۔ اس طرح یہ تینوں ادارے بڑی حد تک خود مختار رہیں گے اور ان کا ایک دوسرے پر انحصار نہیں ہو گا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ سماجی ارتقاء کا جو عمل مغرب نے طے کیا ہے ہمیں اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔

آپ کو خوب معلوم ہے کہ میں کسی بھی اعتبار سے "مغرب زدہ" آدمی نہیں ہوں۔ میری شکل و صورت، میری وضع قطع، میرے رہن سہن، غرضیکہ کسی اعتبار سے بھی مغرب زدگی کا کوئی احساس نہیں۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں نے علامہ اقبال کے فکر سے استفادہ کیا ہے۔ اور اس پر میں نے ۱۹۸۶ء میں الحمرا ہال میں یومِ اقبال کے موقع پر ایک تحریری خطبہ پیش کیا تھا، جسے بعد میں "علامہ اقبال اور ہم" نامی کتاب کے اندر شامل کر دیا گیا۔ اپنے اس خطبے میں میں نے ثابت کیا تھا کہ علامہ اقبال در حقیقت وہ شخص ہیں جنہوں نے تہذیبِ جدید کا تجزیہ کر کے اس میں سے غلط چیزوں کو چھانٹ کر علیحدہ کر دیا ہے اور جو صحیح چیزیں ہیں ان کو علیحدہ کر دیا ہے۔ اگر آپ ان صحیح چیزوں کو اختیار نہیں کریں گے تو آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے اور اگر آپ غلط چیزوں کو اختیار کرتے ہیں تو پھر آپ ویسے اپنا بیڑا غرق کرتے ہیں اور یہ طرزِ عمل آپ کی تہذیب کے منافی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب، مغربی فکر یا مغربی اقدار کو مکمل طور پر رد کر دینا کوئی معقول روش نہیں ہے۔ یہ رویہ کسی معقول انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اقبال نے تو کہا ہے کہ ان کے پاس جو خیر ہے، حریت و اخوت و مساوات کی جو قدریں ہیں وہ انہوں نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے مستعار لی ہیں ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زانکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین انسانی حریت و آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس دین نے انسان کو توہمات سے آزادی بخشی' بادشاہوں کے جبر و استبداد سے آزادی دلوائی' اسے نام نہاد مذہبی پیشواؤں سے آزادی دلائی جن کی مذہب پر اجارہ داری قائم تھی۔ اب کوئی مولوی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو میں کہتا ہوں وہ تمہیں ماننا پڑے گا۔ آپ کو حق ہے کہ آپ اس سے دلیل پوچھیں۔ آپ کہیں کہ کتاب اللہ یا سُنّتِ رسول اللہ ﷺ سے کوئی دلیل لایئے تو ہم ماننے کو تیار ہیں۔ جو شخص بھی یہ کہتا ہے کہ تم پر میری بات ماننا لازم ہے وہ غلط کہتا ہے۔ وہ یا تو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے یا نبوت کا دعویدار ہے۔ اپنی دلیل سے کوئی شخص بات نہیں منوا سکتا' اسے کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ سے دلیل لانا ہوگی۔ یہی بات یہاں فرمائی گئی : "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" (اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف) تمہارے سارے جھگڑے یہیں طے ہوں گے۔ اس لئے کہ مستقل معاملہ صرف کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ کا ہے۔

ان آزادیوں کا تصور تو اسلام نے دیا ہے۔ اس نے نوعِ انسانی کو ہر طرح کی غلامی سے آزاد کرا دیا ہے۔ لیکن مغرب نے اس آزادی کو مادر پدر آزادی کا درجہ دے دیا۔ چنانچہ وہ ہر شے سے آزاد ہو گئے۔ حتیٰ کہ اخلاقی حدود و قیود سے بھی آزاد ہو گئے۔ بہرحال بنیادی طور پر انہیں آزادی کا تصور اسلام ہی سے ملا تھا۔ یورپ کو بادشاہوں کی غلامی سے آزادی اور پوپ اور پوپ کے نائبین کی حکومت سے آزادی اسلام نے ہی دلوائی تھی۔ سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا :

﴿ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾

"یقیناً عالموں اور راہبوں کی بہت بڑی اکثریت لوگوں کا مال باطل طریقے سے ہڑپ کرتی ہے"

یورپ میں بادشاہت کا استحصالی نظام قائم تھا جس میں ایک طرف بادشاہ اور دوسری طرف

پوپ دونوں مل کر عوام کا خون چوستے تھے۔ عوام بادشاہ کو خراج ادا کرتے اور پوپ کی خدمت میں نذرانہ پیش کرتے۔ اور صرف یورپ ہی نہیں پوری دنیا میں اسی طرح کا استحصالی نظام قائم تھا۔ مذہبی پیشوا کہیں پوپ اور پادری کی شکل میں نذرانے وصول کرتے تھے اور کہیں پنڈت اور پروہت کی صورت میں۔ وہ لوگوں سے کہتے کہ ہم اس بُت کے پروہت ہیں جو اصل میں دیوتا کا مظہر ہے' ہمیں خوش کرو گے تو اس دیوتا کی نظرِ کرم تم پر ہو گی۔ لہٰذا سومنات کے تہہ خانے سونے اور چاندی سے بھرے پڑے تھے۔ اب کچھ ایسا ہی حال ہمارے گدی نشین پیروں کا ہے۔ درباروں اور مزاروں پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں۔ "داتا دربار" پر سوسو دیگیں چڑھ رہی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ یہ چڑھاوے چڑھانے کون آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے وہ اپنے حرام کو حلال کروانے کے لئے آتے ہیں۔ (جس کو آج کل دنیا میں لانڈرنگ کہا جاتا ہے اور جو بی۔ سی۔ سی۔ آئی کا سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا تھا)۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہر طرح کے حرام ذرائع سے کمائی کرو' لیکن یہاں آ کر چڑھاوا چڑھا دو تو سب پاک اور صاف ہو جائے گا۔

اسلامی قانون کی تدوینِ نو کی ضرورت

عہدِ حاضر میں اجتہاد کے ضمن میں عام طور پر ایک مغالطہ یہ پایا جاتا ہے کہ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کا کوئی زیادہ سکوپ نہیں ہو گا' اس لئے کہ قانون تو سارا بنا ہوا ہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ جب اسلامی ریاست وجود میں آئے گی تو اسلامی قوانین کی تقریباً نئے سرے سے تدوین ہو گی۔ اس لئے بھی کہ اسلامی قوانین اس انداز سے مرتب شدہ موجود نہیں ہیں جس شکل میں آجکل دنیا میں رواج ہے کہ تمام قوانین دفعہ وار اور شق وار مرتب انداز میں موجود ہوں جو عدالت کے سامنے بھی ہوں اور وکیلوں کے سامنے بھی۔ جب عدالت میں کوئی مقدمہ زیرِ بحث آتا ہے تو فلاں دفعہ کی فلاں شق کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ چنانچہ اب ہمیں یہ چیزیں اس شکل میں لانی پڑیں گی۔ پاکستان کوئی چھوٹا سا ملک نہیں ہے' بہت بڑا ملک ہے اور اس کے اندر اب سینکڑوں عدالتیں ہیں۔ کئی تو ہائی کورٹس ہیں۔ کم از کم آٹھ دس تو ہائی کورٹ کے بنچ ہوں گے۔ تو

آخر کوئی قانون مدون ہونا چاہئے۔

پھر اس میں یہ بات بھی اہم ہے کہ مباح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دیکھئے 'قانون سازی میں ایک اصول سمجھ لیجئے کہ ہر شے مباح ہے' اِلّا یہ کہ کسی شے کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ وہ حرام ہے۔ اگر اصول یہ ہوتا کہ ہر شے حرام ہے جب تک کہ ثابت نہ ہو جائے کہ حلال ہے تو حلال کا دائرہ بہت سکڑ جاتا۔ لیکن اسلام میں اصول یہ ہے کہ اصلاً ہر شے میں اباحت ہے' یعنی ہر شے جائز ہے' اِلّا یہ کہ ثابت کر دیا جائے جائے کہ وہ حرام ہے۔ چنانچہ مباح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس شے کو حرام ثابت نہ کیا جا سکے وہ مباح ہے' چاہے اس کے حلال ہونے کی کوئی مثبت دلیل نہ لائی جا سکتی ہو۔

اسلامی قانون کی تدوینِ نَو کے لئے دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ اس ملک کے عوام کی عظیم اکثریت اہل سُنّت والجماعت حنفی ہے' لہٰذا قانون سازی یعنی اجتہاد میں مسلکِ حنفی کے اصولوں ہی کو مدِّ نظر رکھا جائے۔ جیسے کہ ایران میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ یہاں کا پبلک لاء فقہ جعفریہ کے مطابق ہو گا اور باقی سب جتنے سُنّی مسلمان وہاں پر ہیں انہیں اپنے پرسنل لاء میں پوری آزادی ہو گی۔ یعنی نماز جیسے چاہیں پڑھیں' روزہ جس وقت چاہیں بند کریں اور جس وقت چاہیں کھولیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک ملک میں پبلک لاء تو دو نہیں ہو سکتے۔ شیعہ اکثریت کے ملک میں وہ فقہ جعفریہ ہی ہو گا۔ اسی طرح پاکستان میں یہ طے کر دیا جائے کہ یہاں پر پارلیمنٹ کے اندر قانون سازی کا جو عمل ہو گا وہ فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق ہو گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بھی ایک درست طریق کار ہو گا۔ لیکن ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ اہلِ سُنّت کی چاروں فقہوں سے استفادہ کیا جائے۔ فقہ حنفی' فقہ مالکی' فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کے ائمہ فقہا کو ہم یہ سمجھیں کہ یہ سب ہمارے بزرگ ہیں' یہ سب اہل سنت کے ائمہ ہیں۔ چنانچہ ان سب کے اجتہادات کو ایک مشترکہ وراثتِ علمی سمجھا جائے' اور بنیادی طور پر یہ بات طے ہو جائے کہ قانون سازی میں کتاب و سُنّت کی حدود سے تجاوز نہیں ہو گا۔

ان دونوں باتوں میں سے میرے نزدیک دوسری بات بہت بہتر ہے۔ اور بعض معاملات میں ہمارے سامنے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے حنفی ہوتے

کسی دوسری فقہ کا موقف اختیار کیا۔ اسے "تلفیق بین المذاہب" کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بہت سخت قسم کے مقلد حنفی ہیں وہ تو تلفیق کا نام سننے کو بھی تیار نہیں ہیں' وہ تو اس بات کو بہت ہی برا سمجھتے ہیں کہ ایک امام کا مقلد کسی دوسرے امام کی رائے کو راجح قرار دے کر قبول کر لے۔ لیکن ایک فقہی مسئلے میں ہمارے ہاں ایک بہت بڑی شخصیت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اجتہاد کیا اور فقہ حنفی کی بجائے فقہ مالکی کے موقف کے مطابق فتویٰ دیا اور اس مسئلے پر انہیں بہت سے ہم عصر حنفی علماء کی تائید بھی حاصل تھی۔ یہ مسئلہ اس عورت کی عِدّت سے متعلق ہے جس کا شوہر مفقود الخبر ہو جائے۔ یعنی جس شخص کے بارے میں پتہ ہی نہ ہو کہ وہ کہاں گیا' زندہ بھی ہے یا نہیں' یا کہیں پر قید ہے تو کہاں ہے۔ اس کے بارے میں کوئی خبر ہی نہیں —— تو وہ عورت کتنے عرصے تک اپنے شوہر کا انتظار کرے؟ کیا ساری عمر اسی طرح معلّق رہتے ہوئے گزار دے کہ نہ وہ شوہر والی ہے نہ بے شوہر کے ہے۔ وہ دوسری شادی اس لئے نہیں کر سکتی کہ نہ تو اس کے شوہر نے اسے طلاق دی ہے نہ اس نے خلع حاصل کیا ہے۔ تو ایسی عورت کیا کرے؟ کتنا عرصہ اپنے شوہر کا انتظار کرے؟ میں نے اس موضوع پر کبھی تحقیق نہیں کی' لیکن یہ جان کر حیرت سی ہوتی ہے کہ فقہ حنفی میں کہیں یہ لکھا ہوا آگیا کہ ایسی عورت نوے برس انتظار کرے گی۔ اب اس کا امکان کم ہی ہے کہ وہ عورت نوے برس مزید زندہ رہے۔ اور اگر وہ زندہ رہ بھی گئی ہو اور ۱۲۰ برس کی بڑھیا ہو چکی ہو تو اس سے نکاح کس نے کرنا ہے؟۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو یہ احساس ہوا کہ اس مسئلے میں ہماری فقہ کا موقف قابل عمل نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے فقہ مالکیؒ کی رو سے فتویٰ دیا کہ اسے چار سال تک انتظار کرنا ہو گا۔ اگر چار سال تک اس کے شوہر کی کوئی خبر نہیں آتی تو وہ عدالت میں جا کر وہاں سے یہ فتویٰ لے سکتی ہے کہ اب یہ بغیر شوہر کے ہے اور اس کی شادی ہو سکتی ہے۔ میں اسی پر قیاس کر کے کہہ رہا ہوں کہ میرے نزدیک اہل سنت کی تمام فقہیں ہمارا مشترک علمی ورثہ ہیں اور ہمیں ان سے استفادہ کرنا چاہئے۔

فقہی مسائل کے ضمن میں میرا ذاتی طرزِ عمل

ذاتی سطح پر فقہی مسائل میں میرا جو طرزِ عمل ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ میں خود فقیہہ ہوں نہ مجتہد۔ میں تو علامہ اقبال کا شاگرد ہوں' جنہوں نے خود یہ کہا تھا کہ ؏ "میں نہ عارف' نہ مجدّد' نہ محدّث' نہ فقیہہ"۔ تو میں بھی کچھ نہیں ہوں' قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم اور دین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔ تو میں نے ذاتی سطح پر یہ طے کیا ہے کہ اگر کسی مسئلے میں اہلِ سُنّت کی چاروں فقہیں' فقہ مالکی' فقہ شافعی' فقہ حنفی' اور فقہ حنبلی متفق ہوں تو میں اس سے کہیں بھی اِدھر اُدھر نہیں جاؤں گا۔ اس لئے کہ میں چار کا مقلّد ہوں' ایک کا نہیں۔ اور اگر کسی مسئلے میں ان کے مابین اختلاف ہے تو پھر فقہ حنفی بھی ہماری فقہ ہے اور فقہ شافعی بھی ہماری فقہ ہے۔ ہم اس مسئلے کے بارے میں چاروں میں سے کسی ایک فقہ کا موقف اختیار کرسکتے ہیں۔ بہرحال یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اگر بالفرض ایسی صورت پیش آجائے کہ کسی مسئلے میں چاروں فقہیں تو متفق ہوں لیکن میرا ذہن اس رائے کو قبول نہ کر رہا ہو تو میں اس بارے میں اپنی کوئی رائے پیش نہیں کروں گا بلکہ ائمہ فقہاء کی متفق علیہ رائے ہی کو قبول کروں گا اور ان چاروں فقہوں سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اس لئے کہ ہماری عقل محدود ہے۔ بہت سی چیزیں قرآن میں ایسی ہوسکتی ہیں جو ہماری عقل میں نہ آئیں تو کیا ہم انہیں رد کردیں گے؟ اسی طرح کوئی صحیح حدیث اگر ہمارے عقلی معیار پر پوری نہ اترتی ہو تو ہمیں اپنی عقل کو رد کر کے اس حدیث کو قبول کرنا ہوگا۔ ایسے ہی اگر چاروں ائمہ کسی چیز پر متفق ہوں تو میں نے اپنے لئے طے کر رکھا ہے کہ خواہ میری عقل اس سے اباء کر رہی ہو' میں اس کی پابندی کروں گا۔ لیکن جہاں کہیں ان میں اختلاف ہو وہاں میں کسی ایک فقہ کا موقف اختیار کرنے کا قائل ہوں۔

البتہ ریاستی سطح پر' جیسا کہ میں نے عرض کیا' مجھے دونوں طریقے پسند ہیں' جن میں سے ایک کا انتخاب کیا جاسکتا ہے' تاکہ یہ سیکولر نظام نہ چلتا رہے۔ اللہ کرے اس کا بیڑا غرق ہو۔ اللہ کرے کہ یہاں کے عوام میں یہ عزم و ارادہ پیدا ہو کہ ہمیں اسلام کے مطابق

پنی زندگیاں گزاری ہیں، ہمیں اسلام پر جینا ہے اور ایمان پر مرنا ہے۔ اللہ کرے کہ یہاں اسلام کا قانون نافذ ہو ــــ اور اس کی دو صورتیں میں نے عرض کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہ طے کر لیں کہ قانون سازی کتاب وسنت کے دائرے کے اندر اندر ہو گی اور تمام فقہوں کو ہم اپنا مشترک علمی ورثہ سمجھتے ہوئے ان میں بیان کردہ مسائل کو نظائر کی حیثیت سے سامنے رکھیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق قانون سازی ہو۔ سیکولر نظام سے تو بہتر ہے کہ چاروں فقہوں میں سے کسی بھی ایک فقہ کو اختیار کر لیا جائے۔ فقہ حنفی کا نام میں اس لئے لے رہا ہوں کہ یہ اکثریت کی فقہ ہے۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○
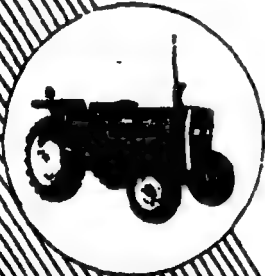
اُمّتِ مسلمہ کی عمر(۵)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبۂ دعوت و ثقافت ' دعوت اسلامی کالج ' جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الإسلام وقرب ظہور المہدی" کا

چوتھا باب

مترجم : پروفیسر خورشید عالم ' قرآن کالج لاہور

فصل اول

مسیحِ دجّال۔ علاماتِ کبریٰ میں سے پہلی علامت

المسیح (میم پر زبر اور سین غیر منقوطہ مخففہ کے نیچے زیر اور حاء غیر منقوطہ کے ساتھ) بخاری اور مسلم کی تمام روایات میں اسی طرح آیا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں کہتے ہیں جو اسے خاء منقوطہ کے ساتھ پڑھتا ہے وہ اس میں تحریف کرتا ہے[1] وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قاضی ابن العربی نے مبالغہ کرتے ہوئے کہا ہے "کچھ لوگوں کو ٹھوکر لگی ہے وہ اسے مسیخ خاء معجمہ کے ساتھ اور بعض اسے سین کی شد کے ساتھ اس لئے روایت کرتے ہیں تاکہ وہ اس میں اور مسیح بن مریم میں تمیز کر سکیں ' حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کو "گمراہ مسیح" اور عیسیٰ کو "ہدایت یافتہ مسیح" کہہ کر دونوں کے درمیان تمیز کر دی ہے۔ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ کی تعظیم کی خاطر حدیث میں تحریف کر

دی (یعنی انہوں نے لفظ مسیح کو خاء معجمہ اور سین شد کے ساتھ پڑھ دیا)۔ {۲}

لفظ مسیح کا اطلاق دجال پر بھی ہوتا ہے اور عیسیٰ بن مریم پر بھی۔ جب یہ دجال کے لئے استعمال ہو تو مسیح دجال استعمال ہوتا ہے اور جب صرف مسیح کہا جائے تو اس سے مراد عیسیٰ بن مریم ہوتا ہے۔

دجال کو مسیح اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی دائیں آنکھ مٹی ہوئی بے نور ہوگی اور اس کی دائیں بھنویں بھی صاف ہوں گی یا اس لئے مسیح کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ساری زمین پر گھومے پھرے گا۔ اسی طرح عیسیٰ بن مریم بھی زمین میں گھومیں پھریں گے' یا اس لئے کہ وہ بیمار انسانوں پر اپنا ہاتھ پھیرتے تھے تو ان کو اللہ شفاء دے دیتا تھا۔{۳} رہا لفظ دجّال' اس کے پہلے حرف پر زبر ہے اور دوسرا حرف مشدّد ہے۔ اس کے معنی ہیں چھپانا' کیونکہ وہ باطل سے حق کو چھپاتا ہے۔ مسیح دجّال پہلا دجال نہیں ہے بلکہ وہ دجالوں کے سلسلہ کا آخری دجال ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "قیامت سے پہلے تیس جھوٹے دجال آئیں گے"۔ {۴}

اس بات کی تحقیق کہ دجّال قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے پہلی نشانی ہے

مسیح دجال کا ظہور قیامت کی دس بڑی علامتوں میں سے پہلی علامت ہے جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نے یکجا سمیٹ دیا ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس حدیث کو اگلے باب میں بیان کریں گے جس کا عنوان "قیامت کی بڑی نشانیاں" ہے۔

کچھ بھلے اہل علم کا خیال ہے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا بڑی علامات میں سے پہلی علامت ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اس صحیح حدیث کی سند پیش کرتے ہیں جسے عبداللہ بن عمروبن العاص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً روایت کیا ہے' آپ ؐ نے فرمایا "نشانیوں میں سے پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور دن چڑھے دابۃ (جانور) کا لوگوں کے سامنے نکلنا ہے۔ ان دونوں نشانیوں میں سے جو نشانی پہلے ظاہر ہوگی دوسری جلد ہی اس کے بعد ظاہر ہو جائے گی"۔ {۵}

ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے تین بڑی

علامتوں کا ظہور ہو گا۔ پہلی خروجِ دجال، دوسری عیسیٰؑ کا نزول اور تیسری یاجوج ماجوج کا خروج ہے۔

اس کی تحقیق میں درج ذیل گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

۱۔ مغرب سے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اُس وقت اس آدمی کو ذرا بھی فائدہ نہ ہو گا جو پہلے ایمان سے محروم رہا یا جس نے اپنے ایمان کی وجہ سے کوئی نیکی نہ کمائی ہو۔ لیکن یہ تو طے شدہ بات ہے کہ عیسیٰ بن مریمؑ نازل ہو کر لوگوں کو ایمان کی دعوت دیں گے اور عیسائی اقوام ان پر ایمان لے آئیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور کوئی شخص اہلِ کتاب میں ایسا نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ عیسیٰؑ پر ان کے مرنے سے پہلے ایمان لائے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے" (۴:۱۵۹)۔ اگر اس واقعہ سے پہلے مغرب سے طلوع آفتاب کی علامت ظاہر ہو چکی ہوتی تو ایمان سے ان کو کچھ فائدہ نہ ہوتا۔

حافظ ابن حجر کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قتل کرنے تک دجال کا قیام، پھر حضرت عیسیٰؑ کا قیام اور یاجوج ماجوج کا خروج یہ سب واقعات مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے ہوں گے۔ سب روایات ترجیحی طور پر یہی بتاتی ہیں کہ دجال کا خروج ان بڑی علامات میں سے پہلی علامت ہے جو روئے زمین کے بیشتر حصوں میں عام حالات کی تبدیلی کا پتہ دیں گی۔ اور یہ سلسلہ حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ مغرب سے طلوع آفتاب ان بڑی علامات میں سے پہلی علامت ہے جو عالمِ بالا کے حالات کی تبدیلی کا پتہ دیں گی اور قیامت کے ساتھ یہ نشانیاں بھی ختم ہو جائیں گی"۔ {۶}

بیہقی نے البعث والنشور میں کہا ہے، حلیمی کا بیان ہے کہ پہلی نشانی دجال کا ظہور ہے، پھر عیسیٰؑ کا نزول۔ کیونکہ اگر عیسیٰؑ کے نزول سے پہلے آفتاب مغرب سے طلوع ہو تا تو ان کے زمانے میں کافروں کے ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ مگر ان کو تو فائدہ ہو گا کیونکہ اگر فائدہ نہ ہوتا تو ان کے اسلام لانے کی وجہ سے دین ایک نہ ہوتا۔ {۷}

ابن حجر اور بیہقی کی اس رائے کو ابن کثیر نے بھی اختیار کیا ہے مگر اس کی توجیہہ دوسرے طریقے سے کی ہے۔ وہ حدیث "بے شک سب سے پہلی نشانی آفتاب کا مغرب

سے طلوع ہونا ہے" کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "غیر معروف نشانیوں میں سے پہلی نشانی"۔ خواہ دجال کا ظہور' آسمان سے عیسیٰؑ کا نزول اور اسی طرح یاجوج ماجوج کا خروج اس سے پہلے ہی کیوں نہ ہو' کیونکہ یہ تو سب معروف علامتیں ہیں کیونکہ وہ بشر ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں اور جو انسانوں میں متعارف ہیں..... یہاں تک کہ وہ فرماتے ہیں کہ مغرب سے طلوع آفتاب خلافِ عادت چیز ہے اور آسمانی نشانی ہے۔{۸}

دوسرے یہ ضروری ہے کہ دجال کے ظہور' عیسیٰؑ کے نزول اور یاجوج ماجوج کے خروج جیسی علامات مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے واقع ہوں کیونکہ دجال کے قتل اور یاجوج ماجوج کی تباہی کے سات سال بعد تک عیسیٰؑ زندہ رہیں گے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ چالیس برس تک زندہ رہیں گے جیسا کہ ابو درداءؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ پھر اس کے بعد پہلی علامت ظاہر ہو گی جس کے بعد علامتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا"۔ بالکل اسی طرح جیسے موتیوں کی لڑی کے ٹوٹ جانے سے موتی پے بہ پے تیزی سے گرتے جاتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے "یہ نشانیاں ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں جس کے ٹوٹ جانے سے وہ یکے بعد دیگرے گرنے لگ جاتے ہیں"۔{۹}

ابو العالیہ کی مرسل روایت میں ہے "یہ سب علامات چھ ماہ میں مکمل ہو جائیں گی اور ابو ہریرہ کی روایت کے مطابق وہ آٹھ ماہ میں مکمل ہو جائیں گی۔{۱۰}

ایسی مختلف روایات ہیں جو یہ تعین کرتی ہیں کہ عیسیٰؑ سات برس یا چالیس برس زمین پر باقی رہیں گے اور ایسی روایات بھی ہیں جن کی رو سے نشانیوں کا تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے ظہور ہو گا۔ دونوں قسم کی روایات میں موافقت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم تسلیم کر لیں کہ عیسیٰؑ کا نزول اور دجال کی ہلاکت اور یاجوج ماجوج کی تباہی کے بعد زمین پر ان کی بقا مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے ہو گی اور سب سے آخر میں ان علامات کا ظہور ہو گا جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں۔ یہ بڑی تیزی کے ساتھ واقع ہوں گی۔ اس رائے کو اپنائے بغیر ان احادیث کے درمیان کوئی موافقت نہیں ہو سکتی۔

ہم نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کیونکہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے وگرنہ لوگ دجال کے معاملہ میں شبہ میں پڑ جاتے کہ آیا اس کا خروج مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے ہو گا' کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دس بڑی علامتوں میں سے یہ پہلی علامت ہے۔ اس بناء پر ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ دجال کا خروج قیامت کی دس بڑی علامتوں میں سے پہلی علامت ہے۔ اللہ کے بندو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اس کے معاملے میں تمہیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

فصل دوم

مسیح الدجّال کی تعریف

دجال آدم زاد ہے' یہودی ہے' پیدائشی طور پر اس کی شکل مسخ شدہ ہے' ساخت و پرداخت اور میلانات کے اعتبار سے شیطان اور ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بھی شیطان ہے۔ اس کے اردگرد شیطانوں کا گھیرا ہو گا۔ ۷۰ ہزار جبہ پوش یہودی اس کے پیروکار ہوں گے۔ اس کے والدین کے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "تیس برس تک دجال کے باپ کے ہاں کوئی بچہ نہ ہو گا' پھر اس کے یہاں ایک کانا بچہ پیدا ہو گا جس کا نفع سب سے کم اور نقصان سب سے زیادہ ہو گا۔ اس کی آنکھ تو سوئے گی مگر اس کا دل نہیں سوئے گا"۔ پھر اس کے والدین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا : "اس کا باپ دراز قد ہو گا جس کا گوشت تھرکتا ہو گا۔ اس کی ناک لمبی ہو گی بالکل چونچ کی طرح۔ اس کی ماں کے پستان بڑے ہوں گے"۔[۱] اس کی شکل وصورت کو تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل و مکمل طور پر ہمارے لئے بیان فرمایا ہے جس کے باعث اسے پہچاننے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا۔ کچھ علامتیں تو دور سے نظر آ جائیں گی اور کچھ قریب سے۔

جب آپ اسے دور سے آتا ہوا دیکھیں گے تو وہ آپ کو کوتاہ قد کا عظیم الجثہ آدمی نظر آئے گا۔ رنگ اس کا گندمی اور سرخ ہو گا' اس کی جلد صاف ہو گی اور اس کے رخسار

لال ہے اس کا سر اژدہے {۱۲} کی مانند بڑا ہو گا' اس کے بال سخت گھنگریالے ہوں گے۔ {۱۳}
یوں لگے گا جیسے ان میں پانی اور ریت ملی ہوئی ہے۔ بہت گھنے ہوں گے' یوں معلوم ہو گا کہ
اس کے بال درخت کی ٹہنیاں ہیں۔ {۱۴} اس کے قدموں کے اگلے حصے قریب قریب ہوں
گے اور پچھلے حصے ہٹے ہوئے۔ اگر آپ اس کو قریب سے دیکھیں گے تو وہ شیطان کی شکل
کا ہو گا۔ اس کے چہرے کی دائیں جانب بالکل سپاٹ ہو گی' نہ اس میں آنکھ ہو گی نہ ابرو۔
اس کی بائیں آنکھ بہت ہی روشن اور سبز رنگ کی ہو گی۔ ایسے لگے گا جیسے ستارہ ہے جو
موتی کی مانند چمک رہا ہے' گویا کہ وہ ابھرا ہوا سبز رنگ کا فانوس ہے جو اس کے رخسار پر
اس طرح لٹک رہا ہے جیسے تیرتا ہوا انگور کا دانہ یا دیوار پر پڑا ریٹھ۔ اس کا مطلب یہ ہوا
کہ وہ کانا ہو گا' دائیں آنکھ مٹی ہوئی ہو گی جس میں کوئی نور نہیں ہو گا' بائیں آنکھ ابھری
ہوئی تیرتی ہوئی اور اس کے رخساروں پر لٹکی ہوئی ہو گی۔ {۱۵}

دجال کی اتنی مکمل تعریف ہی کافی تھی مگر اللہ کو منظور تھا کہ اس کا حلیہ ہمارے لئے
اور بھی واضح ہو جائے اور اس کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہ رہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس کا جامع وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس کی دونوں آنکھوں کے
درمیان لفظ "کافر" لکھا ہو گا"۔ اللہ کے رسول ؐ نے اس کے ہجے کئے (یعنی ک۔ف۔ر)
"اس لفظ کو ہر پڑھا اور ان پڑھ مومن پڑھ سکے گا"۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس وصف کے
بعد بھی وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے گا"۔ {۱۶}

بعض احادیث جو دجال کے وصف میں وارد ہوئی ہیں۔

۱) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "وہ بھاری بھرکم آدمی ہو گا' جس کا رنگ سرخ' بال گھنگریالے اور آنکھ کانی ہو گی"۔ {۱۷}

۲) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "بے شک مسیح دجال کوتاہ قامت ہو گا قدم کے اگلے حصے قریب اور ایڑیاں دور رہوں گے اور آنکھ مٹی ہوئی کانی ہو گی"۔ {۱۸}

۳) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بے شک دجال کے سر کے پیچھے بالوں کے گچھے کی لٹ ہو گی"۔ {۱۹}

۴) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بے شک دجال کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی

ہو گی"۔{۲۰}

۵) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس کی دائیں آنکھ کانی ہو گی گویا کہ تیرتا ہوا انگور کا دانہ"۔{۲۱}

۶) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دیکھو وہ کانا ہو گا اور تمہارا رب تو یک چشم نہیں ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہو گا جسے ہر مومن پڑھ سکے گا"۔{۲۲} اور ایک روایت میں ہے "ک۔ف۔ر دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہو گا"۔{۲۳}

فصل سوم

دجّال کا ٹھکانہ (اِس وقت وہ کہاں ہے)

مسیح دجال اس وقت زندہ ہے' کھاپی رہا ہے مگر وہ معیّنہ مدت کے لئے جزیرہ کے ایک گرجے میں بند ہے۔ یہ گرجا کہاں ہے؟ کس نے دجال کو بند کر رکھا ہے؟ کیا دجال یہودی شکاری کا لڑکا ہے؟

سب سے پہلے ہم جَسّاسَہ (جاسوس) کے قصے والی حدیث بیان کرتے ہیں جسے صحیح مسلم میں فاطمہ بنت قیس کی روایت سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ڈھنڈورچی کو ڈھنڈورا پیٹتے سنا کہ نماز باجماعت ہو گی' چنانچہ میں نے بھی رسولِ خدا کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں عورتوں کی صف میں تھی جو مَردوں کے پیچھے ہوتی ہے۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تو وہ منبر پر ہنستے ہنستے تشریف فرما ہوئے۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا: جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں جمع کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا: اللہ کی قسم میں نے تمہیں نہ تو کسی چیز کا شوق دلانے کے لئے جمع کیا ہے اور نہ کسی چیز سے ڈرانے دھمکانے کی خاطر جمع کیا ہے بلکہ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے جمع کیا ہے کہ تمیم داری عیسائی تھا۔ وہ آیا اس نے بیعت کی اور اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے ایسا قصہ سنایا جو اس قصہ سے لگا کھاتا ہے

تو میں تمہیں مسیح دجال کے بارے میں سنایا کرتا ہوں۔

"اس نے مجھے بتایا کہ وہ لخم اور جذام قبیلہ کے تیس آدمیوں کے ہمراہ ایک سمندری کشتی پر سوار ہوا۔ موجیں مہینہ بھر ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں یہاں تک کہ وہ ایک سمندری جزیرے پر لنگر انداز ہو گئے۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا۔ وہ ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر جزیرے میں داخل ہوئے' جب وہ جزیرے میں داخل ہوئے تو ان کو ایک جانور ملا جس کے جسم پر بہت سے بال تھے' بالوں کی کثرت کی وجہ سے انہیں اس کے آگے پیچھے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ انہوں نے کہا تیرا ناس ہو کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ میں جسّاسہ (جاسوس) ہوں۔ انہوں نے پوچھا یہ جساسہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا اے لوگو اویر میں موجود اس آدمی کی طرف جاؤ' وہ تمہاری خبریں سننے کا بڑے شوق سے انتظار کر رہا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ جب اس نے آدمی کا نام لیا تو ہمیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں یہ جانور شیطان ہی نہ ہو۔ راوی کہتا ہے پھر ہم جلدی سے چلے اور گرجے میں داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بھاری بھر کم شکل و صورت کا ایک آدمی ہے جس کے گھٹنوں سے لے کر ٹخنوں کے درمیان اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ لوہے کی زنجیروں سے مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہم نے پوچھا: تیرا ناس ہو تو کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: میرا پتہ تو تمہیں چل ہی گیا ہے' یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ ہم نے کہا ہم عربی ہیں۔ ایک سمندری کشتی میں سوار ہوئے' سمندر موجزن تھا' مہینہ بھر موجیں ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں' یہاں تک کہ ہم تیرے اس جزیرے کے کنارے لگ گئے۔ جو کشتی دستیاب تھی اس میں بیٹھ کر ہم جزیرے میں داخل ہوئے' وہاں ہمیں ایک جانور ملا جس کے بدن پر بہت سے بال تھے' بالوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے آگے پیچھے کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ ہم نے اس سے پوچھا: تیرا ناس ہو! تو کیا چیز ہے؟ اس نے کہا میں جساسہ (جاسوس) ہوں۔ ہم نے پوچھا یہ جساسہ کیا ہے؟ اس نے کہا اویر میں موجود اس آدمی کی طرف جاؤ وہ تمہاری خبریں سننے کا بہت شوق سے انتظار کر رہا ہے۔ ہم بھاگم بھاگ تمہاری طرف آ گئے۔ ہم تو اس سے خوفزدہ ہو گئے تھے اور خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ شیطان ہی نہ ہو۔ اس نے پوچھا: مجھے بیسان کے نخلستان کا حال بتاؤ۔ ہم نے کہا اس نخلستان کے بارے میں کونسی بات پوچھنا

چاہتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا نخلستان بار آور ہوا ہے؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا کہ جلد ہی وہ بے بار ہو جائے گا۔ پھر اس نے پوچھا: مجھے بحیرہ طبریہ کے بارے میں بتایئے۔ ہم نے پوچھا اس کی کونسی بات معلوم کرنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ کیا اس میں پانی ہے؟ ہم نے کہا: اس میں بہت پانی ہے۔ اس نے کہا: اس کا پانی جلد ختم ہو جائے گا۔ پھر اس نے کہا: مجھے زغر کے چشمہ کے بارے میں بتایئے۔ ہم نے کہا: کونسی بات معلوم کرنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا: کیا چشمے میں پانی ہے اور وہاں رہنے والے اس پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں وہاں پانی بہت ہے اور لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ مجھے اُمیوں کے نبیؐ کے متعلق بتایئے وہ کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا وہ مکہ سے نکل کر یثرب میں قیام پذیر ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا عربوں نے اس کے ساتھ جنگ کی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں۔ اس نے پوچھا: اس نے ان کا کیسے مقابلہ کیا؟ ہم نے اسے بتایا کہ وہ قریب قریب کے عربوں پر غالب آ چکے ہیں' انہوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اس نے پوچھا: کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ ہم نے کہا ہاں۔ اس نے کہا : ان کے حق میں بہتر ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ اپنے بارے میں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں مسیح ہوں' مجھے عنقریب خروج کی اجازت مل جائے گی' میں نکل کر زمین کی سیر کروں گا اور چالیس راتوں میں مکہ اور مدینہ کے سوا ہر بستی کو گرا دوں گا' وہ دونوں میرے لئے ممنوع ہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک بستی کا قصد کروں گا تو ایک فرشتہ ہاتھ میں برہنہ تلوار لئے میرا سامنا کرے گا اور اس کی مدافعت کرے گا' اس بستی کے ہر سوراخ پر فرشتے پہرہ دیں گے۔ فاطمہ کہتی ہے کہ رسول خدا نے منبر پر اپنا عصا مار کر کہا : یہ طیبہ ہے' یہ طیبہ ہے' یہ طیبہ یعنی مدینہ ہے۔ دیکھو کیا میں نے تمہیں یہ قصہ نہیں بتایا؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں' بتایا ہے۔ مجھے تمیم کی حکایت اچھی لگی کیونکہ یہ اس حدیث کے مطابق ہے جو میں نے تمہیں مسیح دجال' مکہ اور مدینہ کے متعلق سنائی ہے۔ دیکھو وہ شام یا یمن کے سمندر میں سے نہیں بلکہ وہ مشرق میں ہے' مشرق میں رہے گا۔ اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔" راویہ کہتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث حفظ کر لی ہے۔ {۴۴}

۱۔ جس دجال کو تمیم داری نے دیکھا کیا وہ یہودی شکاری کا بیٹا تھا؟ اس شکاری کا بیٹا یہودی غلام تھا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ میں رہتا تھا۔ اس میں مسیح دجال کی صفات موجود تھیں، وہ کاہن اور دھوکے باز تھا۔ اس کے بارے میں صحابہؓ بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم شبہ میں پڑ گئے کیونکہ اس کے بارے میں آپ کے پاس وحی نہیں آئی تھی۔

نوویؒ کا قول ہے "علماء کہتے ہیں کہ ابنِ صیاد کا قصہ ایک مشکل مسئلہ ہے اور مشتبہ ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال تھا۔ ظاہر یہی ہے کہ اس کے بارے میں نبی ﷺ کی طرف کوئی وحی نازل نہیں ہوئی بلکہ جب حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا: اسے قتل کرنے میں تجھے فائدہ نہ ہو گا"۔{۲۵}

اسی لئے اس مسئلہ پر ہم بحث نہیں کریں گے بلکہ اتنا ہی کہیں گے کہ اس کا علم اللہ کو ہے اور ایسے علم سے ناواقفیت نقصان دہ نہیں کیونکہ اس پر عمل کا مدار نہیں۔ کس اندازے اور احتمال کی بناء پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دجال ہی شکاری کا یا کسی اور کا بیٹا ہے، کیونکہ اس وقت تو وہ اپنی جگہ پر مقید ہے۔

دوسرے اسے کس نے قید کر رکھا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسے فرشتوں نے قید کر رکھا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اسے زنداں میں ڈالا ہوا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا صحیح ثبوت نہیں جس پر ہم اعتماد کر سکیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک گرجے میں مقید ہے۔ اور وقت مقررہ تک اس کی مشکیں کسی رہیں گی اور اس کی ہتھکڑیاں بندھی رہیں گی۔

تیسرے وہ کنیسہ کہاں ہے جہاں وہ قید ہے؟ وہ یقینی طور پر مشرق میں ہے اور بالتحدید خراسان کے علاقہ کی ایک یہودی بستی اصفہان (یعنی اس زمانے میں روس اور ایران کی سرحد) میں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال مشرق کی سرزمین خراسان سے نکلے گا{۲۶}۔ دوسری حدیث میں ہے "اصفہان کے ۷۰ ہزار جبہ پوش یہودی اس کی پیروی کریں گے"{۲۷}۔

ہم جساسہ کے قصے والی حدیث پر کوئی حاشیہ آرائی نہیں کرنا چاہتے مگر ہم اس سے

مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں :

۱) یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے لے کر دجال اب تک زندہ ہے اور اس کی مشکیں کسی ہوئی ہیں۔

۲) اگرچہ اس کا ٹھکانہ معلوم ہے مگر کوئی شخص نہ تو اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور نہ اسے آزاد کروا سکتا ہے کیونکہ اللہ نے اس کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے' اس سے ایک پل آگے ہو گا نہ پیچھے۔

۳) یہ کہ دجال کے ظہور سے پہلے کچھ علامات کا ظہور ہو گا جنہیں وہ جانتا ہے' مثلاً بحیرہ طبریہ کی خشکی' بیسان کے نخلستان کی ویرانی وغیرہ۔ ہم ان شاء اللہ ان علامات پر روشنی ڈالیں گے۔

۴) مکہ اور مدینہ دجال سے محفوظ ہوں گے کیونکہ ان میں اس کا داخلہ حرام ہے۔ اسی طرح بیت المقدس بھی' جیسا کہ دوسرے آثار سے ثابت ہوتا ہے۔

۵) تمیم الداریؓ دجال کو دیکھ کر اور اس سے گفتگو کر کے اسلام لے آئے۔

فصل چہارم

دجّال کے خروج کا وقت' اس کا سبب اور علامت

اللہ تعالیٰ نے دجال کی زنجیروں کے کھلنے اور قید خانہ سے اس کے خروج کو اس بات کی علامت قرار دیا ہے کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ یہ علامات کبریٰ کی ظاہر ہونے والی علامتوں میں سے سب سے پہلی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے خروج کا سبب' علامت اور وقت مقرر کیا ہے۔

۱۔ دجّال کے خروج کا سبب

ملعون دجال غصہ کھا کر نکلے گا کیونکہ اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ سے مروی صحیح اثر میں ہے کہ دجال تو محض اس غصہ کی وجہ سے نکلے گا جس کی آگ میں وہ جل رہا ہے[۲۸]۔

اور یہ غصہ اس لئے نہیں کہ اس کی بیڑیاں کیوں نہیں کھولی جاتیں یا اسے قید سے رہا کیوں نہیں کیا جاتا۔ وہ تو اُس وقت سے غضبناک ہے جب سے اسے بیڑیاں پہنائی گئیں اور جب سے اسے اس گرجے میں قید کیا گیا۔ جساسہ کی حدیث کی بعض روایات میں ہے کہ اس نے تین بار لمبی آہیں بھریں۔ بلکہ یہ غصہ تو ایک علامت ہے جسے اللہ نے اس کے خروج کا سبب بتایا ہے' بالکل اسی طرح جیسے یاجوج ماجوج کے خروج کی یہ علامت مقرر کی گئی کہ وہ اس بند کے متعلق جس میں ذوالقرنین نے انہیں قید کر دیا تھا کہیں گے "کل ان شاء اللہ ہم اسے کھول دیں گے"۔ ان کو القاء ہوا کہ وہ ان شاء اللہ کہیں گے تو یہ ان کے خروج کا سبب بن جائے گا۔

۲۔ اس کے خروج کا وقت

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے فتح ہونے کے بعد اس کا خروج ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "بیت المقدس کی آبادی یثرب کی بربادی ہے۔ یثرب کی بربادی کے بعد ملحمہ (خون ریز معرکہ) ہو گا۔ ملحمہ کے بعد قسطنطنیہ فتح ہو گا اور فتح قسطنطنیہ کے بعد دجال کا خروج ہو گا"۔[۲۹] چنانچہ دجال کا خروج اس وقت ہو گا جب مہدی ظاہر ہو کر جزیرہ عرب' فارس' روم اور قسطنطنیہ میں کئی جنگیں لڑ چکے ہوں گے۔ ان جنگوں میں کچھ مہینے لگ جائیں گے۔ تیسرے باب میں ہم اسے تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔

۳۔ خروجِ دجّال کی علامت

دجال کے خروج سے پہلے کچھ واقعات رونما ہوں گے جو اس راندۂ درگاہ کے خروج کی علامت ہوں گے۔

۱۔ ہرمجدون کا معرکہ واقع ہو گا اور اس کے بعد دریائے فرات' شام میں بحیرہ طبریہ اور فلسطین اور اردن کی حدود پر بیسان کا نخلستان سوکھ جائے گا۔ اور ہرمجدون کی عالمی جنگ چھڑ جانے کے فوراً بعد دجال کا انتظار کرنا چاہئے۔

۲۔ قحط' خشک سالی' بھوک' مصیبت اور مہنگائی کے سالوں کی آمد... اور لوگوں میں

دینی رجحان کی کمی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : "بلاشبہ دجال کے خروج سے پہلے تین سال سخت ہوں گے۔ ان میں لوگ سخت قسم کی بھوک کا شکار ہو جائیں گے۔ پہلے سال اللہ آسمان کو حکم دے گا کہ اپنی ایک تہائی بارش روک لے اور زمین کو حکم ہو گا کہ اپنی ایک تہائی نباتات روک لے۔ دوسرے سال آسمان کو حکم ہو گا کہ دو تہائی بارش روک لے اور زمین کو دو تہائی نباتات کے روکنے کا حکم ہو گا۔ پھر تیسرے سال آسمان کو حکم ہو گا تو وہ اپنی ساری بارش روک لے گا' ایک قطرہ بھی نہیں برسے گا اور زمین کو حکم ہو گا تو وہ اپنی پوری نباتات روک لے گی چنانچہ کوئی سبزہ نہیں اگے گا۔ پھٹے ہوئے کھروں والے سارے جانور ہلاک ہو جائیں گے شاذ و نادر ہی کوئی بچے گا۔ آپؐ سے پوچھا گیا ان دنوں لوگوں کو کونسی چیز زندہ رکھے گی؟ آپؐ نے فرمایا : تہلیل 'تکبیر اور تحمید لوگوں کو کھانے کا کام دے گی {۴۰}۔

اس کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ ہم ہر روز اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ لاکھوں انسان قحط میں مبتلا ہیں اور غربت کی سطح سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ جو اجلاس عالمی غذائی تنظیمیں منعقد کر رہی ہیں اور جن میں کئی ریاستوں کے صدر شامل ہو کر آنے والی قحط سالی کے موضوع پر بحث کرتے ہیں ان کا تذکرہ تو ختم ہونے کو نہیں آتا اور یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کیونکہ ان دنوں ان جنگوں کا کثرت سے ذکر ہو رہا ہے جو پانی کے حصول کی خاطر ہوں گی۔ اس صورت میں روئے زمین پر فتنہ و فساد' اضطرابات' جنگیں' قحط سالی' دریاؤں اور بحیروں کی خشکی' عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی مشکلات اور بحران یہ سب دجال کے خروج کی علامت ہیں۔ یہی وہ مناسب فضا ہے جس میں اس شیطانی وجود کا ظہور ہو گا جو کھانے پینے کے بارے میں فتنہ بپا کرے گا۔ ہم اللہ سے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

حواشی

بقیہ حواشی باب سوم :

{۳۹} اس بارے میں ان کی کتابوں میں جو دلائل ہیں اس کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔ ایک فلسطینی نے ہمیں بتایا ہے کہ حال ہی میں یہودیوں نے ایک محل تعمیر کیا جس پر لکھا ہے "قصر

...نسبے "۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

{۴۰} ...قتل و غارت انہوں نے بحر البقر، دیر یاسین، صبرا، شاتیلا اور آخر میں لبنانی قصبہ قانا میں کیا ہے وہ ان کے جرم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

{۴۱} یہ بیت المقدس میں اگنے والا مشہور کانٹے دار درخت ہے اور دجال و یہود کا قتل وہیں ہو گا۔ دیکھئے نووی کی شرح مسلم کتاب الفتن۔ یہ جان کر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ یہودی اس درخت کو کثرت سے کاشت کرتے ہیں حالانکہ یہ ان کو کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

{۴۲} احمد نے مسند (۳۶۳: ۳) میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ابو زبیر کا عنعنہ (عن سے روایت) ہے اور وہ مدلس ہے۔ حاکم نے بھی ایسے ہی روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے الفتن والملاحم میں کہا ہے کہ کئی راویوں نے اسے ابراہیم بن طہمان سے روایت کیا ہے اور وہ ثقہ ہے۔

{۴۳} احمد نے تمیم الداری سے روایت کیا ہے۔ البانی اپنے کتابچہ "الحکم الجدیرہ بالازاعہ" کے مقدمہ میں اس حدیث کا ذکر کر کے کہا ہے کہ ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے۔

حواشی باب چہارم :

{۱} فتح الباری، ج ۲ کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام

{۲} فتح الباری، ج ۱۳ کتاب الفتن، باب ذکر الدجال

{۳} فتح الباری، ج ۲ کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام

{۴} حدیث صحیح ہے۔ احمد نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ البانی نے الصحیحہ رقم ۱۶۸۳ میں ذکر کیا ہے۔ بہت سے دجال اور نبوت کے دعویدار ظاہر ہو چکے ہیں، ان میں مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، طلیحہ اسدی، سجاح اور بدبخت غلام احمد قادیانی ہیں۔

{۵} مسلم نے صحیح میں اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

{۶} فتح الباری، ج ۱۱ کتاب الرقاق، باب طلوع الشمس من مغربہا۔ طبری کا بھی یہی مذہب ہے۔

{۷} فتح الباری، ج ۱۱ کتاب الرقاق، باب طلوع الشمس من مغربہا

{۸} الفتن والملاحم من تاریخ ابن کثیر، باب ذکر خروج الدابہ من الارض تکلم

السناس

{۹} حدیث صحیح ہے۔ احمد نے عبد اللہ بن عمرو سے روایت کی ہے۔ حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ البانی نے الصحیحہ میں بیان کیا۔ نمبر ۱۷۴۲ ہے۔

{۱۰} دیکھئے فتح الباری' ج ۱۳' کتاب الفتن' باب تعیر الزمان حتی تعبد الاوثان

{۱۱} احمد نے ابو بکرہ اور ترمذی نے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن ہے۔
العرضاخمه : بڑے بڑے لمبے پستانوں والی۔

{۱۲} اصلة : اژدہا۔ کہا گیا ہے کہ یہ بہت بڑے سانپ کو کہا جاتا ہے۔

{۱۳} جمال حبک : بہت زیادہ گھنا۔

{۱۴} احمد نے مسند میں اور ابو یعلیٰ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسے صحیح مانا ہے۔

{۱۵} ابن حجر نے یہ بات قاضی عیاض سے نقل کی ہے۔ نووی کا قول ہے کہ یہ بہت ہی خوبصورت بات ہے۔ فتح الباری' کتاب الفتن' باب ذکر الدجال' ص ۹۷

{۱۶} ان دنوں ہم اکثر سنتے ہیں کہ مسیح دجال ایک علامت ہے جو ٹیلی ویژن یا برمودا (Bermuda) کی مثلث یا اسی طرح کی کسی اور صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ دجال کے وصف میں بیان ہونے والی مسلسل احادیث اس خیال کی تردید کرتی ہیں جس کی نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی مطلب۔

{۱۷} صحیح بخاری میں کتاب الفتن' باب ذکر الدجال میں ابن عمر کی روایت ہے۔ ابن حجر کا قول ہے کہ طبرانی نے عبداللہ بن مفضل سے روایت کیا ہے "وہ گندمی رنگ کا ہو گا' اس کے بال گھنگریالے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی چمڑی صاف ہو۔ چنانچہ سرخی کا وصف اس سے متعارض نہیں"۔ ص ۹۷

{۱۸} ابوداؤد نے عبادہ بن صامت سے بیان کیا ہے اور احمد نے بھی روایت کیا ہے کہ البانی نے مشکوٰۃ کی تخریج میں کہا ہے اس کی سند جید ہے۔

{۱۹} حدیث صحیح ہے۔ احمد نے ہشام بن عامر سے روایت کیا ہے۔

{۲۰} صحیح ہے' احمد نے انس اور حذیفہ سے روایت کیا ہے۔ الجامع الصغیر للسیوطی

{۲۱} صحیح بخاری میں ابن عمر کی روایت سے وارد ہے۔ کتاب الفتن باب ذکر الدجال۔

{۲۲} انس کی روایت سے متفق علیہ حدیث ہے۔

{۲۳} ترمذی نے اس سے روایت کیا ہے وہ الصحیحہ میں نمبر ۲۴۵۷ پر درج ہے۔

{۲۴} مسلم نے کتاب الفتن میں فاطمہ بنت قیس کی روایت سے بیان کیا۔ احمد نے ابو ہریرہ اور عائشہ کی روایت سے' ابن ماجہ نے فاطمہ کی روایت سے' ابوداؤد نے سند حسن کے ساتھ جابر کی روایت سے بیان کیا ہے۔

{۲۵} حدیث کا کچھ حصہ بخاری نے ابن عمر کی روایت سے کتاب الجنائز اور بکتاب الجهاد میں بیان کیا۔ مسلم نے کتاب الفتن میں روایت کیا۔ اس روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے کہا "اگر تو وہ دجال ہے تو تم اس پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے اور اگر دجال نہیں تو اسے قتل کرنا تمہارے لئے بہتر نہ ہو گا' کیونکہ دجال کو تو عیسیٰ بن مریم نے قتل کرنا ہے۔ دیکھئے فتح الباری' ج ۱۳' کتاب الاعتصام' شرح النووی علی مسلم' کتاب الفتن' باب ذکر ابن صیاد۔

{۲۶} ترمذی اور حاکم نے ابوبکر سے روایت کیا ہے۔ احادیث مشکوۃ (نمبر ۵۴۸۷) میں البانی نے اسے صحیح مانا ہے۔

{۲۷} احمد اور مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ طیلساں اوڑھنے والی چادر اور سر کے لباس کو کہتے ہیں۔

{۲۸} مسلم اور احمد نے حفصہؓ سے روایت کیا ہے۔

{۲۹} مسند احمد۔ حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے' اس کی سند میں کلام ہے۔

{۳۰} صحیح حدیث ہے جسے احمد اور ابوداؤد نے معاذ سے روایت کیا ہے۔ البانی نے مشکوۃ (حدیث نمبر ۴۲۴) میں اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔

تنظیم اسلامی کی دعوت

محمد طاہر خاکوانی، امیر تنظیم اسلامی پنجاب شمالی

تعارف

تنظیم اسلامی نہ تو معروف معنی میں ایک سیاسی جماعت ہے، نہ ہی مسلک کی بنیاد پر کوئی مذہبی فرقہ ہے، بلکہ ایک اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان میں اور بالآخر کل روئے زمین پر اسلام کے عادلانہ و منصفانہ "نظام خلافت" کو قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ گویا تنظیم اسلامی کی دعوت ایک جملے کے اردگرد گھومتی ہے :

"تنظیم اسلامی کا پیغام ــــ نظام خلافت کا قیام"

خلافت کیا ہے؟

خلافت سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں اللہ کا خلیفہ (نمائندہ) بنے۔ وہ نہ صرف اپنے گھر میں اللہ کے احکام کی پابندی کروائے بلکہ اس کے ملک کا سیاسی، معاشی، سماجی و معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی و تمدنی نظام بھی اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھے۔

اگر انفرادی و اجتماعی سطح پر یہ نظام قائم ہے تو خلافت قائم ہے اور اگر جزوی اعتبار سے بعض افراد تو بہت نیک ہیں ــــ نماز، روزہ، حج و عمرہ، نوافل و مستحبات کا بہت چرچا ہے، خدمت خلق اور خدمت عوام کے ادارے اپنے اپنے انداز میں خوب کام بھی کر رہے ہیں اور "نام" بھی کما رہے ہیں ــــ مگر ہمارا معاشرتی ڈھانچہ ہندوانہ رسموں اور رواجوں پر مشتمل ہے، معیشت کا ڈھانچہ سود، جاگیرداری، جوا، سٹہ، رشوت، سٹاک ایکسچینج اور نئی نئی مالیاتی سودی اسکیموں پر مبنی ہے۔ اور سیاسی نظام پر اللہ کی حاکمیت کی بجائے عوام کی حاکمیت یا جبر کا نظام مسلط ہے، تو پھر یہ خلافت نہیں بلکہ "ملوکیت" سے

مشابہ نظام ہے۔ نماز روزہ کی تلقین تو دورِ ملوکیت میں بھی ہوتی تھی لیکن وہاں حکومت ایک فرد کی تھی اور اب حکومت عوام کی ہے۔ وہاں جو گندگی ایک شخص کے سر پر لدی ہوئی تھی اسے اب تھوڑا تھوڑا کر کے عوام کے سروں پر لاد دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

ایسے نظام سے لوگوں کو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے بلکہ نظامِ خلافت کے کامل نفاذ اور اس کے حقیقی مفہوم یعنی "عدل و قسط کے حصول" کے لئے کوشش جاری رکھنی چاہئے۔

نظامِ خلافت کے خدوخال

نظامِ خلافت کے بنیادی خدوخال حسبِ ذیل ہیں :

۱) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا جو اقرار "قراردادِ مقاصد" میں موجود ہے، اس کے عملی نفاذ کے لئے قرآن اور سنتِ رسولؐ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی، جو نظام اور قانون دونوں پر حاوی ہو، قائم کرنا۔

۲) مخلوط قومیت کی نفی —— جس کے نتیجے میں خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے انتخاب اور قانون سازی کے عمل میں صرف مسلمان شریک ہوں گے۔ ووٹ کا حق اگرچہ ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت کو حاصل ہو گا لیکن انتخاب میں حصہ صرف ایسے مسلمان مرد لے سکیں گے جن کا کردار مشتبہ نہ ہو —— جبکہ غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔ انہیں عقیدہ و عبادت کے ساتھ پرسنل لاء میں مکمل آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔

۳) خلیفہ کا انتخاب بلاواسطہ پورے ملک کے مسلمان کریں گے اور اسے مجلس شوریٰ کی اکثریت کا محتاج نہیں بنایا جائے گا۔ اسے ایک متعین مدت کے لئے وسیع انتظامی اختیارات دیئے جائیں گے۔

۴) صوبائی عصبیت کی لعنت کے خاتمے اور عوام کی انتظامی سہولت کے لئے چھوٹے

صوبے بنائے جائیں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ حقوق و اختیارات دیئے جائیں گے۔ اس کے لئے موجودہ کمشنریوں کو بھی صوبہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے یا ایک کروڑ کی آبادی پر ایک صوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

۵) سود اور جوئے کے کامل انسداد کے ذریعے معیشت کی تطہیر —— اور اس کے بجائے شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر نئے تجارتی اور صنعتی ڈھانچے کی تشکیل۔

۶) حضرت عمرؓ کے مفتوحہ زمینوں کے بارے میں اجتہاد کی روشنی میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور نیا بندوبست اراضی۔ کاشت کار حکومت کو براہ راست "خراج" ادا کریں گے۔

۷) نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ کا مکمل نفاذ —— مرکزی جامع مسجد میں ذمہ داران حکومت کی امامت و خطابت اور زکوٰۃ کے ضمن میں کل اموال تجارت بشمول خام مال کے مجموعی مالیت کے اڑھائی فیصد کی وصولی، جس سے کفالت عامہ کا پورا نظام اور ہر شہری کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات اور تعلیم اور علاج کی یکساں سہولتوں کی فراہمی کی ضمانت دی جاسکے۔

۸) مکمل قانونی مساوات —— جس میں خلیفۃ المسلمین اور مجلس شوریٰ کے ارکان سمیت کسی کو بھی نہ قانونی تحفظات حاصل ہوں اور نہ ترجیحی حقوق، تاہم مفاسد کے سدباب کے لئے غلط اور جھوٹے الزامات لگانے والوں کے لئے حد قذف پر قیاس کرتے ہوئے سخت تعزیری قوانین بنائے جاسکیں گے۔

۹) شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے مکمل استیصال کے لئے سخت تعزیراتی قوانین کا نفاذ۔

۱۰) مخلوط معاشرت کا سدباب —— اصولی طور پر مردوں اور عورتوں کے جداگانہ دائرہ ہائے کار کی تعیین اور عملی اعتبار سے تعلیم و تربیت اور علاج معالجے کے لئے کلیتاً جداگانہ ادارے اور ضرورت پڑنے پر گھریلو صنعتوں کی ترویج، حتیٰ کہ ایسے صنعتی اداروں کا قیام جس میں خواتین ہی کام کریں اور خواتین ہی نگرانی کریں اور ان کے

اوقات کار بھی کم ہوں —— مزید برآں عصمت و عفت کی حفاظت اور قلب و نظر کی پاکیزگی کے لئے ستر اور حجاب کے شرعی احکام کی سختی سے تنفیذ۔

عالمی حالات

۱۹۹۰ء میں سوویت یونین (U.S.S.R) کے ٹوٹنے کے بعد امریکہ اپنے آپ کو Sole Supreme Power on Earth سمجھنے لگا ہے' جس کے نشے اور غرور میں وہ اب تک جتلا ہے۔ انہوں نے نیو ورلڈ آرڈر (NWO) کا نعرہ بھی لگایا ہوا ہے۔ لیکن اس کے پس پردہ در حقیقت ایک یہودی عالمی نظام (Jew World Order) ہے' جس کا آغاز آج سے دو ہزار سال قبل کر دیا گیا تھا۔ ۱۷۷۶ء میں یہودیوں نے Order of illuminati کے ذریعے ایک نئے نظام مبنی بر سیکولرازم کا آغاز کیا' جس کا بنیادی مقصد "عظیم ترین اسرائیل" کا قیام تھا اور دنیا کو ایک نئے عالمی مالیاتی نظام میں کسنا تھا' جس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ لہٰذا آج بھی ایک ڈالر کے امریکی نوٹ پر ۱۷۷۶ء کی تاریخ اور Ordo-Novo-Sclorum کے الفاظ درج ہیں' جس کو صحیح طور پر علامہ اقبال نے پہچانا تھا کہ "فرنگ کی رگ جان پنجہ یہود میں ہے"۔ اس نظام کی "برکات" کو حاصل کرنے کے لئے یہودیوں نے media کے ذریعے بڑے ہی planned طریقے سے بے حیائی' عریانی اور فحاشی کو رواج دیا ہے اور اخلاقی قدروں کو پامال کیا ہے اور ہٹلر کے ہاتھوں اپنی مظلومیت کو ابھارا ہے۔ دنیا کو خدا سے بیگانہ کر کے مادہ پرستی کا پجاری بنایا ہے' عالم آخرت سے نظریں ہٹا کر عالم دنیا پر نظریں مرکوز کی ہیں اور روح کے تصور کو بھلا کر بدن اور اس کے سفلی تقاضوں کو نمایاں کیا ہے۔ سود کو حلال ٹھہرا کر پوری دنیا پر ایک عالمی مالیاتی نظام کا جال پھیلا دیا ہے تاکہ عوام محنتیں کریں' خون پسینہ ایک کریں اور یہ ان کی ساری کمائی کو قرضوں کے عوض ہڑپ کر جائیں۔ مزید یہ کہ Science and Technology کی بنیاد پر اعلیٰ کوالٹی کی چیزیں بنا کر Multinational Companies کے ذریعے دنیا کے اکثر ممالک تک ان کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔ مختلف ممالک کو Free Economy اور

Consumer Economy کا پابند کر کے اور Import duty گھٹا کر، خام مال کی قیمت گرا کر اور قرضے دے کر ان ملکوں کی صنعت کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔

اس "عالمی مالیاتی یہودی استعمار" کے سامنے اکثر ممالک سجدہ ریز ہو چکے ہیں مثلاً امریکہ، یورپ، افریقہ، عالم عرب، جاپان، انڈونیشیا، ملائشیا وغیرہ۔ چین ان کے لئے خطرہ بن سکتا ہے لیکن اسے بھی انہوں نے تجارت کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ یہ سارا کام امریکہ، انگلستان، فرانس (WASP) کے ذریعے کروایا جا رہا ہے۔ البتہ ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ایران، افغانستان، پاکستان اور روسی ترکستان کے علاقے ہیں جہاں بقول ان کے مذہبی جنونی Fundamentalist رہتے ہیں جو Terrorist ہیں، جاہل اور راجڈ ہیں، عالمی امن کے لئے خطرہ ہیں اور جن کے پاس اگر نیوکلیئر ہتھیار آ گئے تو دنیا کو تباہ کر دیں گے۔ لہٰذا اس وقت وہ اپنے ایک فلسفی، دانشور سیموئیل ڈی ہنٹنگٹن کی ایک کتاب "Clash of the Civilizations" پر عمل پیرا ہیں کہ :

i) چین کو مشرق بعید کے ساتھ تجارتی معاہدوں میں جکڑ کر مسلمانوں سے کاٹ دو۔

ii) مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کو خوب بھڑکاؤ، خاص طور پر شیعہ سنی مسئلے کو، تاکہ ایران جو خالص شیعہ ملک ہے وہ کبھی بھی افغانستان، جو اب کٹر سنی حنفی قیادت کے زیر کمان ہے، سے مل نہ سکے اور پاکستان میں بھی شیعہ سنی مسئلہ تازہ ہوتا رہے تاکہ یہ تینوں ممالک کبھی مل کر کوئی "بلاک" نہ بنا لیں۔ اور اگر یہ بن گیا تو نو آزاد روسی ریاستیں بھی اس بلاک میں شامل ہو جائیں گی اور یہ ایک بہت بڑی طاقت بن جائیں گے۔

پاکستان کے لئے تو وہ خاص طور پر چاہتے ہیں کہ ان کی معیشت سودی نظام میں جکڑی رہے اور یہ ہمارے قرضوں کے زیر بار احسان رہیں۔ یہ ملک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ اس وقت پاکستان ان کا بیس ارب ڈالر کا مقروض ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ قرضہ اتارنے کے لئے عوام کو "دردمندانہ" اپیلیں بھی کرتے رہیں اور انہیں قرضوں کی چاٹ بھی لگی رہے۔ اس طرح سے یہاں پر بننے والی ہر حکومت ورلڈ بینک اور IMF کی غلام رہے گی۔ مزید یہ کہ ان کی ایٹمی ٹیکنالوجی کولڈ سٹوریج میں پڑی رہے یا

role-back کر دی جائے۔ ان کی فوج UN کی فوج کا حصہ بن کر مختلف اسلامی ممالک میں قیام امن کا کردار ادا کرتی رہے اور یوں وہ ایک Mercenary (کرائے کی فوج) میں تبدیل کر دی جائے۔ مزید یہ کہ فوج کے لئے بجٹ میں حصہ کم کر دیا جائے اور اس کی تعداد بھی گھٹا دی جائے۔

پاکستان میں بننے والی مختلف حکومتوں نے "کرپشن" اور کمزور پالیسیوں کے ذریعے ملک میں غربت' مہنگائی' جہالت' بے روزگاری' بیماری' فاقہ کشی وغیرہ جیسے مسائل میں اضافہ کر دیا ہے۔

ان حالات میں ملک کو زوال سے نکالنے کے لئے' انقلابی اقدامات اٹھانے کے لئے اور اللہ کے دین کو نافذ کرنے کے لئے ایک ایسی انقلابی قوت چاہئے جو اللہ کو راضی رکھنے کے ساتھ ساتھ ملک اور عوام کی فلاح کے لئے دور رس فیصلے کر سکے۔

خلافت کیوں نہ قائم ہو سکی؟

خلافت کے نظام کو قائم کرنے کی اصل ذمہ داری دینی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ انتخابی سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے عوام کو اس کے لئے تیار کرتے' اس کی دعوت کو عام کرتے' اس کی برکات سے انہیں روشناس کرواتے' ان کا ذہن بناتے' انہیں نظم کا پابند کرتے' ان کی تربیت کرتے اور ان کی کردار سازی پر توجہ دیتے۔ اگر اس کے نتیجے میں ایک معتدبہ تعداد بنیان مرصوص بن جاتی تو پھر "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی تحریک بلند کرتے ہوئے پر امن طور پر موجودہ نظام کو مفلوج کرنے کے لئے دھرنے دیتے۔ لیکن اس کی بجائے انہوں نے انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کیا اور سیکولر جماعتوں کی رسہ کشی میں خود بھی فریق بن گئے۔ مزید ستم بالائے ستم یہ کہ اسلام کے نام پر بہت سی دینی جماعتوں نے الیکشن کا راستہ اختیار کیا۔ لہٰذا اسلام بھی ایک Party issue بن گیا۔ ہر دینی جماعت نے اپنے اپنے اسلام کو ابھارا اور اپنی اپنی بھیڑوں کو پکارا' جس کے دو نتیجے نکلے :

i) ایک تو اسلام کے نام پر ووٹ تقسیم ہوئے اور سیکولر جماعتوں نے حکومتیں بنائیں۔

ii) اس سے فرقہ واریت کو شہ ملی۔ بریلوی' دیوبندی' سلفی' شیعہ' جماعت اسلامی اور پاکستان عوامی تحریک ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوئے۔ چھوٹے اختلافات بہت نمایاں انداز میں عوام کے سامنے آئے اور اس طرح عوام "اسلام" سے بھی بدظن ہوئے اور "کتاب" سے بھی بدظن ہوئے۔

دوسری بڑی وجہ' یہاں خلافت کے قائم نہ ہو سکنے کی یہ بنی کہ ایران میں انقلاب آنے کی بنا پر یہاں کے شیعوں کی باسی کڑھی میں بھی ابال آیا۔ وہ منظم ہوئے اور میدان میں کود پڑے۔ ان کے رد عمل کے طور پر دیوبندی مکتب فکر کی ایک جماعت ان کے مقابلے میں صف آراء ہوئی اور ایک عوامی بیداری کی تحریک اٹھانے کے لئے شیعوں کو "کافر" قرار دیا گیا۔ اگرچہ "کفر کا یہ فتویٰ" ایک عوامی لہر تو برپا نہ کر سکا مگر اس نے تصادم کی صورت اختیار کرلی' جس کے نتیجے میں دونوں طرف کے رہنماؤں کو قتل کیا جانے لگا۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے عالمی استعماری قوتوں نے فائدہ اٹھایا۔ ایسی صورتحال تو ان کے اپنے پلان میں تھی لہٰذا اس کو ہوا دی گئی۔ جنونی لوگوں کو رقمیں دے کر مذہبی راہنماؤں کو قتل کروایا گیا اور ہندوستان کی خفیہ تنظیم "را" اور اسرائیل کی خفیہ تنظیم "موساد" کے ذریعے بھی دہشت گردی پھیلائی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک دہشت گردی کی لپیٹ میں آگیا اور اسلام کی منزل مزید دور ہوتی چلی گئی۔

خلافت' قرآن و حدیث کی روشنی میں

i) یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ قیامت لازماً واقع ہو کر رہے گی۔ ہر گزرنے والا لمحہ ہمیں قیامت کے قریب سے قریب تر کر رہا ہے۔ قیامت کی علامات اور نشانیاں بھی ہمیں آنحضور ﷺ کی زبانی بتلا دی گئی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

> "جب مال غنیمت کو ذاتی دولت سمجھا جائے' امانت کو اپنا مال سمجھا جائے' زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے' غیر دین کے علم کا چرچا ہو جائے' آدمی اپنی بیوی کی اطاعت اور اپنی ماں کی نافرمانی کرے' اپنے دوست کو قریب کرے اور اپنے باپ کو دور رکھے' مساجد میں آوازیں ظاہر ہوں (لاؤڈ سپیکر کا بے جا استعمال اور مساجد میں جھگڑے)' فاسق و فاجر شخص اپنے قبیلے کا سردار بن جائے' قوم کا سردار ذلیل کمینہ شخص ہو'

آدمی کے شر کے ڈر سے اس کی عزت کی جائے' گانے بجانے والیوں اور باجوں کا ظہور ہو' شراب عام ہو جائے' امت کے بعد والے لوگ اگلوں (اسلاف) کو لعنت کریں ـــــ اس وقت سرخ ہوا کا' زلزلوں کا' زمین کے دھنس جانے کا' صورتوں کے تبدیل ہو جانے کا' پتھروں کے برسنے کا اور پے در پے نشانیوں کا انتظار کرو' جیسے جواہر کی لڑی کا ڈورا ٹوٹ جائے اور دانے پیہم گرنے لگیں"۔

(عن ابی ہریرہ : رواہ الترمذی)

اور ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ

((اِنَّمَا بُعِثْتُ فِی نَفَسِ السَّاعَۃ))

"میں قیامت ہی میں بھیجا گیا ہوں"۔

اور بھی متعدد روایات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت اب کتنی نزدیک ہے۔

ii) البتہ قیامت کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس پورے کرۂ ارضی پر خلافت کا نظام علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو کر رہے گا۔ یہ بات قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور احادیث میں تو بہت شدومد کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

سورۂ نور (آیت ۵۵) اور سورۂ صف (آیت ۹) میں نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کو واضح کیا گیا کہ آپ کو دنیا میں ہدایت کاملہ اور سچا دین دے کر اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ آپ اسے غالب کر دیں کل نظام زندگی پر۔ اور چونکہ آپؐ پوری نوع انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں' لہٰذا یہ دین بھی صرف جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہونے کے لئے نہیں بلکہ کل روئے ارضی پر غالب ہونے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

حدیث نمبرا : حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

"بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے تمام مشارق و مغارب دیکھ لئے۔ اور یقیناً میری امت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک زمین کو میرے لئے لپیٹا گیا"۔ (مسلم' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

حدیث نمبر۲ : حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا :

"روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر رہ جائے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے' خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر اور خواہ کسی بدبخت کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو اسلام کی بدولت عزت عطا فرمادے گا اور انہیں کلمہ اسلام کا قائل و حامل بنادے گا (یا حالتِ کفر پر برقرار رہنے کی صورت میں) انہیں مغلوب فرمادے گا کہ وہ اس کے محکوم اور تابع بن کر رہیں گے"۔ (مسند احمد)

حدیث نمبر ۳ : حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سمیت پانچ دور دنیا میں بھیجے گا۔ (۱) دورِ نبوّت' (۲) دورِ خلافت' (۳) دورِ ملوکیت' (۴) دور غلامی اور پھر (۵) دورِ خلافت' نبوّت کے طریقے پر۔ پھر آپ نے خاموشی فرمائی۔ گویا کہ پھر قیامت ہے۔

iii) البتہ کل روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قائم ہونے سے پہلے قوم یہود کا مکمل خاتمہ (Final extermination) ہو جائے گا۔ یہ اللہ کی سنت ہے کہ جو قوم اپنے رسول کی دعوت کو ٹھکرا دے اور اس کے قتل کے درپے ہو جائے وہ ہلاک ہو کر رہتی ہے۔ قوم عاد' قوم ثمود' قوم لوطؑ' قوم شعیبؑ' قوم نوحؑ اور آل فرعون اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ بنی اسرائیل واحد قوم ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا لیکن انہیں ہلاک نہیں کیا گیا۔ ان کا فیصلہ محفوظ ہے' انہیں ہلاک ہو کر رہنا ہے۔ نہ صرف انہیں بلکہ ان کے ایک لیڈر (دجال) نے بھی ہلاک ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو گا تو آپؑ دجال کو قتل کریں گے اور پوری قوم یہود ہلاک ہو گی۔ عظیم تر اسرائیل ان کے لئے عظیم تر قبرستان بنے گا۔ مسلمان ان سے جنگ کریں گے اور مسلمانوں کے لیڈر امام مہدیؒ ہوں گے۔ یہ جنگ (تباہ کن) جو احادیث میں الملحمۃ الکبریٰ کے نام سے باور کرائی گئی' عرب میں لڑی جائے گی۔ عربوں کو خراسان کے مسلمانوں سے کمک حاصل ہو گی جو کالے جھنڈوں کے ساتھ برآمد ہوں گے اور یہ جھنڈے بیت المقدس میں گاڑ دیں گے۔ اس جنگ کے لئے دنیا میں سٹیج تیار ہو رہی ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ جنگ چند سالوں میں وقوع پذیر ہونے والی ہے۔

۱۷) یہود کے خاتمے سے قبل مسلمانوں کو بھی ان کی بداعمالیوں کی سزا ملنی ہے۔ اہل عرب کو یہ سزا یہود کے ہاتھوں پہنچے گی اور اگر اہل پاکستان نے اجتماعی توبہ نہ کی اور یہاں نظام خلافت قائم نہ کیا تو انہیں سزا ہنود کے ہاتھوں پہنچے گی۔ ہنود (برہمن) بھی درحقیقت یہود کے ۱۲ قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے۔

خلافت کیسے؟

نظام خلافت نہ تو محض آرزوؤں، خواہشات اور دعاؤں سے قائم ہو گا۔ کسی بزرگ کی دعا سے آج تک گندم کا ایک دانہ بھی نہیں اگا جب تک کہ اس پر محنت نہ کی جائے ـــــ نہ ہی یہ نظام محض میٹھی میٹھی تبلیغ سے ہو گا۔ اگر ایسا ہو سکتا تو حضورؐ کو اپنے ہاتھ میں تلوار لینے کی چنداں ضرورت نہ تھی ـــــ نہ ہی یہ نظام مرصع اور مسجع لیکچروں اور مضامین لکھنے سے قائم ہو گا ـــــ اور نہ ہی یہ نظام بیلٹ کے ذریعہ قائم ہو گا، اس لئے کہ انتخابات کے ذریعے سے ایک بنے بنائے نظام کو بہتر طور پر چلایا تو جا سکتا ہے لیکن ایک نظام کو برپا نہیں کیا جا سکتا ـــــ اور نہ ہی یہ نظام بلٹ کے ذریعے قائم ہو گا کہ کلاشنکوف کے ذریعے اپنے کارکنوں کو تربیت دی جائے اور اس کی نالی مسلمانوں کی طرف پھیر کر لبلبی دبا دی جائے۔ اگرچہ اس کی اجازت امام ابو حنیفہؒ نے دی ہے لیکن ایسی کڑی شرائط کے ساتھ کہ جن کا ان حالات میں پورا کرنا محال ہے۔ یہ نظام صرف طریق محمدی ﷺ ہی کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے، جیسا کہ ایک قول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

> "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر بالکل اس طریق پر جس پر اس کے پہلے حصے کی اصلاح کی گئی"۔

وہ طریقہ حسب ذیل ہے:

i) پہلے اپنی ذات میں خلیفہ بننے کا حق ادا کیا جائے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً...﴾

"داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے"۔

بندگیٔ رب کا تقاضا پورا کیا جائے۔ پوری زندگی میں محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہمہ تن' ہمہ وجوہ اطاعت کی جائے۔ یہ اطاعت بواسطۂ رسول ہو گی۔ از روئے الفاظ قرآنی :

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ....﴾

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔

اگر کوئی خطا ہو جائے تو فوری طور پر توبہ کی جائے۔

اطاعت جزوی نہ ہو کلی ہو' ورنہ جزوی اطاعت بھی اگر مستقل ہوئی تو آگ میں داخلے کا سبب بن سکتی ہے ۔

نہ تم بدلے' نہ دل بدلا' نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں!

انسان اپنی معاش اور معیشت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالے اور اپنی آل واولاد کو اس کی تلقین کرتا رہے اور انہیں بھی حکمت کے ساتھ اس کا خوگر بنائے۔

ii) خلافت کی دعوت — بذریعہ قرآن وحدیث

قرآن وحدیث کو اپنی دعوت کا "مرکز و محور" بنایا جائے۔ اس سے معاشرے میں اتحاد پیدا ہو گا' فرقہ واریت دبے گی' شیعہ سنی مفاہمت کی فضا پیدا ہو گی' نسلی' لسانی' زبانی اور قومیتوں کے اختلافات ختم ہوں گے۔

اس سے "شعوری ایمان" پیدا ہو گا۔ انسان علیٰ وجہ البصیرت اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گا۔

اسی سے جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ کا سدباب ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کو اسی قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا :

﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾

اور یہی قرآن اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھا ہے :

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ﴾

گویا دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تلقین، انذار و تبشیر اور امر و نہی قرآن کے ذریعے سے، تاکہ لوگوں پر دین کی حجت قائم ہو اور وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے لئے کمر کسیں۔

iii) تنظیم

جو لوگ اس دعوت سے قریب آئیں انہیں اپنی ذات میں خلیفہ بننے کی تلقین کی جائے، انہیں ایک نظم میں پرویا جائے اور انہیں نظم کا خوگر بنایا جائے۔ اس لئے کہ اتنا مشکل کام کسی نظم، Discipline کے بغیر ممکن نہیں۔

دنیا میں برائی بھی منظم طریقے سے ہوتی ہے، دہشت گردی بھی آج منظم طریقے سے ہو رہی ہے اور بینکوں پر ڈاکے بھی منظم طریقے سے پڑتے ہیں، تو اللہ کے دین کو قائم کرنا تو بڑے جان جوکھوں کا کام ہے، جس کے لئے بڑے ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انقلاب کی خواہش رکھنے والوں کو اپنی ترجیحات کو بدلنا پڑے گا، اپنے اوقات کو از سرنو re-arrange کرنا پڑے گا، اپنی صلاحیتوں کو اس کام میں کھپانا پڑے گا، اپنا مال بھی اس مشن میں صرف کرنا پڑے گا، اپنی انا کو جھکانا پڑے گا اور اپنے ساتھیوں کے لئے جذبہ محبت، شفقت و ایثار کو بروئے کار لانا پڑے گا ۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اور ۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اور ۔

نغمہ کجا و من کجا، ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

Theirs not to reason Why?
Theirs but to do and die!

اور اپنے ساتھیوں کے لئے ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اس نظم کے لئے ضروری ہے "نظام العمل" کو واضح اور مؤثر بنایا جائے، اسے ذہنوں میں اتارا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

iv) بیعت

جماعت سازی کے لئے جو چیز منصوص ہے، مسنون ہے اور ماثور ہے وہ بیعت کا نظام ہے، اگرچہ باقی طریقے بھی مباح ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور ؐ نے بیعت لی، پھر خلفائے راشدین کی بیعت ہوئی، دور ملوکیت میں بیعت لی گئی، تحریک شہیدین بیعت کی بنیاد پر اٹھی، مہدی سوڈانی نے بیعت لی، سنوسی نے بیعت لی، ابوالکلام آزاد کی "حزب اللہ" بیعت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ "بیعت جہاد" ہے اور "بیعت ارشاد" سے مختلف ہے۔ یعنی اگر دین قائم ہے تو سربراہ حکومت کے ہاتھ پر بیعت، اور اگر نہیں تو دین قائم کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضور ؐ نے جو کچھ فرمایا وہی جماعت سازی کی مسنون بنیاد ہے۔ عبادہ بن صامت ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

"ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر کہ : سنیں گے اور مانیں گے، خواہ تنگی ہو خواہ آسانی ہو، خواہ طبیعت آمادہ ہو یا آمادہ نہ ہو، خواہ دوسروں کو ہم پر فوقیت دی جائے۔ اور اس بات پر کہ ہم نظم کے معاملے میں ذمہ دار افراد سے نہیں جھگڑیں گے۔ البتہ جہاں کہیں ہوں گے حق بات کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔"

اس طرح بیعت کی بنیاد پر ایک تنظیم وجود میں آجائے گی جو "بنیان مرصوص" ہوگی اور یہی کام محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا۔

v) نہی عن المنکر کی پرامن اور منظم تحریک

اگر اوپر والے کام ہو جائیں اور ایک معتدبہ تعداد منظم اور تربیت یافتہ افراد کی

تیار ہو جائے تو پھر منکرات کے خلاف ایک پر امن 'منظم جہاد کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اگر ابھی مطلوبہ تعداد نہیں ہے تو دعوت دیتے رہیں گے اور تنظیم کو اختیار کرتے رہیں گے۔

منکرات کے خلاف تحریک چلانے میں جلد بازی ہو سکتی ہے لیکن یہ امیر کی صوابدید پر ہو گا۔ اس تحریک میں کوئی توڑ پھوڑ' جلاؤ وغیرہ نہیں ہو گا مگر نظام کو مفلوج کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی' چاہے آنسو گیس چلے' لاٹھی چلے' جیل جانا پڑے یا گولی کھانی پڑے یا مقدمے برداشت کرنے پڑیں۔ اسی سے نظام میں تبدیلی آئے گی۔ مثلاً ایرانی انقلاب ایسی ہی تحریک کے ذریعے برپا کیا گیا۔

اس تحریک کا آغاز کسی ایسے منکر سے ہو گا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک مصدقہ اور متفقہ منکر ہو' مثلاً سود' عریانی فحاشی' جوا' سٹہ' شراب خوری وغیرہ۔

حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد ایک مسلح تصادم تھی جبکہ دو وجوہات کی بنا پر آج یہ جدوجہد مسلح تصادم نہیں ہو گی۔

i) آپ ﷺ کا مقابلہ کفار سے تھا جبکہ یہاں فاسق و فاجر سہی لیکن قانوناً مسلمان ہیں۔

ii) افراد اور اسباب و وسائل کا نسبت و تناسب اتنا زیادہ نہ تھا۔ جنگ بدر میں ۱۰۰۰ کے مقابلے میں ۳۱۳ صحابہؓ تھے اور اسلحہ بھی دونوں طرف موجود تھا' اگرچہ مسلمانوں کے پاس بہت کم تھا۔ جبکہ اب حکومت کے پاس فوج' پولیس' اسلحہ ہے جبکہ عوام نہتے ہیں۔ اس کے باوجود امام ابو حنیفہؒ نے فاسق و فاجر حکمران کے مقابلے میں "خروج" کی اجازت دی ہے لیکن شرائط بہت کڑی ہیں۔ مثلاً قوت اتنی ہو' تیاری اتنی ہو کہ کامیابی یقینی ہو — لیکن اب یہ ناممکن ہے۔

نکتۂ آغاز

پوری دنیا پر خلافت کا نظام تو لازمی طور پر قائم ہونا ہے' لیکن نکتۂ آغاز کہاں سے ہو گا؟ اس کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ اس کا آغاز افغانستان اور پاکستان کی سرزمین سے ہو گا۔ حضور ﷺ کے دور میں "خراسان" یہی تھا۔ ۴۰۰ سال سے مجتہدین امت کی تجدیدی مساعی اسی خطے میں رہی ہے۔ پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر

بنا۔ اور صرف اس ایک ملک میں "قرار دادِ مقاصد" کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک چلی تو صرف اسی خطے سے۔ گویا ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

چنانچہ ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

فکرِ عجم

آنحضور ﷺ اور سلطنتِ فارس

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۴)

ڈاکٹر ابو معاذ ☆

ایران کے مذاہب

آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر ایرانی جزیرہ نمائے عرب، شام اور یمن پہ چھا چکے تھے۔ عیسائیوں کی حیرہ و نجران کی ریاستیں ایرانی خطے کی حدود میں ہی قائم تھیں۔ یہ ریاستیں زیادہ تر نسطوری عیسائیوں کی آبادی پر مشتمل تھیں جنہیں رومیوں نے مسلکی اور فکری اختلاف کے باعث اپنی سلطنت سے نکال دیا تھا۔ یہ لوگ نہ تو حضرت مریمؑ کو خدا کی بیوی مانتے تھے نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا۔ اس طرح نہ تو وہ روایتی تثلیث کے قائل تھے اور نہ ہی وہ ذات حضرت مسیحؑ میں الوہی خصوصیات کے وجود پر یقین رکھتے تھے۔ یہ لوگ ایران میں پناہ گزین کی حیثیت سے داخل ہوئے اور پھر انہیں عزت و احترام دیا گیا۔ انہوں نے خوزستان (ایرانی صوبہ) میں جندی شاپور کا شہر آباد کیا اور وہاں پر ایک عظیم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جہاں پر طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ یونیورسٹی عباسی عہد تک قائم رہی۔ سرزمین حجاز سے بھی کچھ لوگ وہاں تعلیم کے حصول کے لئے جاتے رہے۔ انہی نسطوری عیسائیوں کے گروہ در گروہ ایران میں راہبوں کا لباس پہن کر جگہ جگہ رکتے، تبلیغ کرتے اور آگے نکل جاتے۔ اسی طرح کے ایک گروہ کے ہمراہ حضرت سلمان فارسیؓ نے چل کر بیت المقدس کی جانب اپنے طویل سفر کا آغاز کیا تھا۔ آنحضور ﷺ کے معاصر ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کی بیوی شیریں بھی ایک عیسائی خاتون تھی۔ یہ وہی خاتون ہے جس کا ذکر فرہاد و شیریں کی عشقیہ داستان کے ضمن میں آتا ہے۔ اس طرح ایران کے مغربی علاقوں میں عیسائیت کے گہرے اثرات موجود تھے

☆ فاضل السنۂ الشرقیہ، ایم اے، ایم او ایل، پی ایچ ڈی (فارسی زبان و ادب)

اور پورے ملک فارس میں عیسائی راہبوں کے قافلوں کی نقل و حرکت کے باعث عیسائیت کافی حد تک ایران میں متعارف ہو چکی تھی۔

یہودیوں کے اثرات بھی کسی نہ کسی حد تک ایران میں موجود تھے۔ ہخامنشی عہد میں آج سے قریباً ۲۵۵۰ برس قبل ایرانی بادشاہ کوروش اعظم (Cyrus the Great) نے ایک کامیاب یلغار کے بعد یہودیوں کو بابل کے کلدانی حکمران کی ستر سالہ قید سے نجات دلوائی تھی اور انہیں دوبارہ سرزمین فلسطین میں آباد کیا تھا۔ اس نے اپنے خرچ سے بیت المقدس اور ملحقہ بستیاں تعمیر کروائی تھیں۔ یہ واقعہ حضرت عزیرؑ کی طویل نیند کے زمانے کا تھا اور آپؑ نے اپنی بیداری کے بعد فلسطین کو جو شاد و آباد دیکھا تھا اس کا تعلق کوروش اعظم کی اس خطہ کی از سرنو تعمیر سے وابستہ تھا۔ عموماً یہودیوں کے ساتھ اہل فارس کے اچھے روابط رہے اور یہ لوگ تجارتی مقاصد کے لئے نہ صرف سلطنت فارس کا سفر کرتے رہے بلکہ سرزمین ہند اور چین تک کے سفر کرتے رہے۔ چین اور ہند کے جنوبی علاقوں میں یہودی تجارت کے جو آثار ملے ہیں ان کے مطابق یہ لوگ (یہودی تاجر) فارسی زبان میں اپنا حساب کتاب رکھتے تھے۔ یہودیوں کی ایک قلیل تعداد سلطنت فارس کے مرکز میں بھی آباد تھی اور اب تک آباد چلی آ رہی ہے۔

ہندوستان سے جب بدھ مذہب کے پیروکاروں کو جلاوطن کیا گیا تھا تو یہ لوگ مشرقی ایران میں داخل ہو گئے تھے اور یہاں سے وسطی ایشیاء کے راستے چین میں داخل ہوئے تھے۔ سلطنت فارس کے شمال مشرقی (خراسانی) حصوں میں بدھ مذہب کے معابد اور بت خانے موجود تھے۔ بلخ میں نوبہار کا معبد خاص اہمیت کا حامل تھا۔ خاندان برامکہ (جس نے عباسی دور میں عروج و زوال کا امتزاج دیکھا تھا) کے اسلاف اسی معبد کے مدار المہام یا پروہت تھے۔ اس طرح سلطنت فارس کے شمالی اور انتہائی مشرقی خطوں میں بدھ بھکشو اپنے کشکول لئے گیروا لباس پہنے اپنے ریش و ابرو اور سر منڈوائے ناقوس بجا رہے تھے۔

سلطنت فارس کی حدود میں ہندوستان کے شمال مغربی خطے بشمول پنجاب و کشمیر بھی شامل تھے اور اس طرح ہندو مذہب اور جین مذہب کے اثرات بھی اس سلطنت پہ موجود تھے۔ ایرانی کسی نہ کسی حد تک اس مذہب کی رسوم و روایات اور طرز زندگی سے واقف

ضرور تھے۔

سلطنت فارس میں دو مذاہب مانوی اور مزدکیت بھی وجود میں آئے تھے اور آتے ہی ختم ہو گئے تھے، مگر ان کے اثرات عرصہ دراز تک لوگوں کے ذہنوں میں باقی رہ گئے تھے۔ مانوی مذہب کا بانی مانی (۲۱۵ ۔ ۲۷۵ء) تھا۔ وہ یونانی ادب، فلسفہ، موسیقی، مصوری، ہیئت اور طب کا ماہر تھا۔ اس کے ہاں زرتشتی اور عیسائی عقائد کا امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ مادہ اور روح کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتا ہے۔ وہ اس جہان کو نور اور تاریکی کی آمیزش قرار دیتا ہے۔ وہ روشنی کو اعلیٰ وارفع قرار دیتا ہے اور تاریکی کو ادنیٰ۔ اس کا خیال تھا کہ روشنی اور تاریکی کو زبردستی آپس میں ملایا گیا ہے اور بالآخر انہیں الگ ہو کے ہی رہنا ہے۔ مادہ اندھا ہے اور عقل اور ارادے سے محروم بھی۔ اس میں اگر حرکت ہے تو وہ روح کے ملنے کی وجہ سے ہے۔ مادے نے بالآخر تاریکی کی طرف لوٹنا ہے اور روح کو مادے سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ضروری ہے۔ وہ تخلیق کائنات کو شر کی تخلیق قرار دیتا تھا اور ہستی مطلق یعنی خدا کو نورانی کائنات کا باپ قرار دیتا تھا۔ وہ جسم کو روح کا قید خانہ قرار دیتا تھا۔ وہ آواگون یعنی تناسخ کا قائل تھا۔ وہ شادی بیاہ اور بچے پیدا کرنے کو بھی گناہ قرار دیتا تھا اور تجرد کی تلقین کرتا تھا۔ وہ کھانا کھانے سے اجتناب کا درس دیتا تھا۔ اس کے پیروکار گوشت نہیں کھاتے تھے، صرف سبزی خور تھے اور دنیوی مال و متاع سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے۔ وہ ایک دن کی خوراک اور ایک سال کے لئے کپڑوں سے بڑھ کر کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ اس کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ ان کے دلوں پر چار مہریں (محبت، ایمان، خوف اور عقل نیک) کی لگی ہوئی تھیں۔ وہ سال میں پچاس دن کا روزہ رکھتے اور عبادات پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ حضرت مسیحؑ سے بھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ ساسانی بادشاہ شاپور نے ۲۷۵ء میں اس مذہب کے بانی مانی کو بابل میں سولی پہ لٹکا دیا تھا۔ یہ مذہب ایران میں ختم ہو گیا مگر اس کے پیروکار ایران سے باہر شمالی افریقہ اور یورپ تک چلے گئے اور اس مذہب کے مظاہر کشمیر اور تبت تک کی غاروں میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے عقائد کے اثرات بعد میں تصوف پر بھی مرتب ہوئے۔

اسی طرح ایک خالص ایرانی مذہب مزدکیت کا تھا۔ اس کا زمانہ تاریخی اعتبار سے اسلام سے قریب تر تھا اور اس مذہب کا بانی مزدک ۲۹۔۵۲۸ء میں شہزادہ خسرو (خسرو نوشیروان) کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ساسانی بادشاہ قباد نے مزدکی مذہب قبول کر لیا تھا اور یہ مذہب اشتراکیت کی ابتدائی صورت معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسباب دنیوی' مال و متاع اور حتیٰ کہ خواتین کی حد تک اشتراک کا قائل تھا۔ وہ گوشت خوری' شکار' جنگ و جدال اور خونریزی کا مخالف تھا۔ وہ دنیا کی تخلیق کو تین عناصر آگ' پانی اور مٹی کا امتزاج قرار دیتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر ان عناصر میں اعتدال رہے تو خیر وجود میں آتا ہے اور اگر اعتدال ختم ہو جائے تو شر۔ وہ ذہانت' حافظے' عقل اور توکل کو ذات خداوندی کی خصوصیات قرار دیتا تھا۔ اس کے پیروکاروں نے شاہی گودام اور خوراک کے ذخائر لوٹ کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔ وہ ایک ہی جیسا لباس پہنتے تھے۔ مزدکیت کے اثرات زمانہ بعد میں قرامطہ اور اسماعیلی فدائین کے علاوہ کچھ صوفیانہ گروہوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

سلطنت فارس کا سرکاری مذہب زردشتی یا مجوسی مذہب تھا۔ زردشت کے زمانے کے بارے میں اختلافات موجود ہیں۔ کچھ لوگ اسے حضرت ابراہیمؑ کا معاصر قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے پانچ ہزار قبل مسیح کے دور سے وابستہ کرتے ہیں۔ زردشت کا تعلق موجودہ آذربائیجان سے تھا۔ وہ خالصتاً ایرانی النسل تھا اور اس کا ظہور اس زمانے میں ہوا تھا جب آریاؤں نے ایرانی علاقوں میں آبادکاری کے بعد گلہ بانی چھوڑ کر زراعت کا پیشہ اپنایا تھا۔ یہ زمانہ ۱۲۰۰ تا ۱۰۰۰ ق م کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مذہب خالصتاً توحید کے نظریہ پر قائم تھا مگر بعد میں اس میں ثنویت (Dualism) کے عقائد کا غلبہ ہو گیا۔ علاوہ بریں آتش پرستی کا رجحان عبادات میں غالب آ گیا۔ پاکستان میں ٹیکسلا کے مقام پر قبل مسیح دور کے آتش کدے کے آثار ملے ہیں۔

زردشت خدائے برتر کو اہورامزدا کی تخلیق قرار دیتا تھا۔ بعد میں خیر کی قوتوں کے مظہر کو یزدان اور شر کی قوتوں کے مظہر کو اہرمن کا نام دے دیا گیا۔ وہ خیر کے پہلو کو دائمی' تعمیری' روشن' زندہ اور خوبیوں کا شاہکار قرار دیتا تھا اور شر کے پہلو کو عارضی' تخریبی'

موت اور عذاب قرار دیتا تھا۔ وہ اھورا مزدا میں چھ صفات یعنی عقل کل' روح کل' مشیت ازلی' مادہ' لامحدود مکان اور لامحدود زمان کا قائل تھا۔ وہ انسان کو بھی وجود مطلق کی تمثیل قرار دیتا تھا۔ نور و ظلمت کی اصطلاحات بعد میں اسلام میں بھی مروج ہو گئی تھیں۔ اس مذہب میں انسانی طبقہ بندی تھی اور آتش مقدس میں تیل' عود' لوبان' صندل سب کچھ جلا دیا جاتا تھا اور لوگوں کی کمائی جابرانہ طور پر ضبط کر کے آتش کدوں کی نذر کر دی جاتی تھی۔ بادشاہ کو خدا کا مظہر قرار دیا جاتا تھا اور اس کا حکم اٹل تھا۔ بادشاہ کو خدائے خدایگاں یا شہنشاہ کہا جاتا تھا اور اس کی وفاداری مذہبی طور پر لازم تھی۔ بعد کے زمانے میں آگ کو ہمیشہ روشن رکھا جاتا تھا اور اس کی پرستش کی جاتی تھی۔ کچھ لوگ مظاہر فطرت یعنی سورج' سمندر' جھیلوں اور درختوں کا احترام بھی کرتے تھے۔

آنحضور ﷺ کی پیدائش

آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ خسرو نوشیروان (۵۳۱۔۵۷۹ء) کا تھا۔ اس بادشاہ کی بابت مشہور تھا کہ وہ انتہائی عادل حکمران تھا' حالانکہ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے کم از کم اٹھارہ ہزار مزدکیوں کو ان کے مذہب کے بانی سمیت قتل کر دیا تھا۔ اس نے شام کی مشہور ساحلی بستی انطاکیہ کو فتح کر کے وہاں پر مظالم کے پہاڑ توڑے تھے۔ تاہم اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں اصلاحات کا آغاز کیا تھا اور زراعت و تجارت کو ترقی دی تھی۔ ایک روایت عموماً بیان کی جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ آپ نوشیروان جیسے عادل بادشاہ کے دور میں پیدا ہوئے تھے۔ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں اتابک ابوبکر زنگی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ مجھے آپ کی حکومت کے عہد میں زندگی گزارتے ہوئے اسی طرح فخر ہے جیسے آنحضور ﷺ کو عہد نوشیروان پر تھا۔ یہی بات ملا عبدالقادر بدایونیؒ نے شیر شاہ سوری کو کہی تھی۔ لیکن یہ روایت نہ تو حدیث کی کسی مستند کتاب میں ملتی ہے اور نہ ہی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے کسی مجوسی بادشاہ کے عہد حکومت پر فخر کا اظہار کیا

ہو۔

آپ ؐ کی پیدائش کے موقع پر دریائے دجلہ کے کنارے آباد شہر مدائن (جو مختلف بستیوں کا مجموعہ تھا) ایران کا دارالحکومت تھا اور تختِ شاہی پہ نوشیروان متمکن تھا۔ آنحضور ﷺ کی پیدائش کی شب دریائے دجلہ میں سخت طغیانی آئی اور دریا کا پانی مدائن کی تمام بستیوں میں پھیل گیا۔ پھر شدید زلزلہ آیا اور شاہی محل یعنی ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے زمین پر آن گرے اور طاق کسریٰ میں دراڑیں پڑ گئیں۔ آتش کدۂ فارس کی صدیوں سے روشن آگ اچانک بجھ گئی۔ اسی رات فارس کے ایک عظیم مذہبی رہنما کو خواب میں دکھائی دیا کہ وحشی اونٹوں کا ایک بہت بڑا گلہ ہے جو عربی گھوڑوں کو کھینچ رہا ہے اور یہ جانور سلطنت فارس کی بستیوں میں پھیل رہے ہیں۔

ان واقعات کے اچانک ظہور میں آنے پر عمائدین سلطنت میں کھلبلی سی مچ گئی اور ان کی وضاحت پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ اہل فارس مشکل مواقع پہ اپنے باجگزار اہل حیرہ (جو مذہباً عیسائی تھے) سے رجوع کیا کرتے تھے۔ خسرو نوشیروان نے ایک قاصد کے ذریعے حیرہ میں تعینات اپنے گورنر نعمان ابن منذر کو کہلا بھیجا کہ کسی عقل مند عالم کو ان واقعات کی توضیح کے لئے مدائن بھجوانے کا بندوست کیا جائے۔ حسب فرمان ابن عمر انصانی کو دارالحکومت بھجوایا گیا۔ اس نے دربار شاہی میں اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی رائے دینے سے قاصر ہے۔ پھر وہ بادشاہ کی اجازت سے شام میں مقیم اپنے ماموں کے ہاں پہنچا جو اپنے وقت کا مشہور کاہن تھا۔ بزرگ کاہن بستر مرگ پر دراز تھا۔ اس نے بھانجے کی آمد کا مقصد معلوم کیا اور خواب کی تفصیل سنتے ہی کہا کہ اب ساسانی سلطنت کے زوال کا وقت آن پہنچا ہے۔ مختصر عرصہ میں نوشیروان کے خاندان کے چودہ افراد حکومت کر چکیں گے تو ساسانی سلطنت اختتام پذیر ہو جائے گی۔

یہ امر بھی دلچسپی کا حامل ہے آنحضور ؐ کی پیدائش سے قبل اکثر لوگ آپ ؐ کی آمد کی بابت پیشین گوئیاں کرتے رہے تھے۔ مشہور ساسانی بادشاہ شاپور نے عرب علاقوں کو اپنے تصرف میں لاتے ہوئے اہل عرب پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے۔ پھر اہل عرب کے کندھوں میں سوراخ کروا کے ان میں رسیاں ڈال کر عربوں کو تذلیل کا نشانہ بنایا۔ شہنشاہ فارس شاپور ذوالاکتاف پورے طمطراق سے فتح کے نشے میں مست گزر رہا تھا کہ ایک پل

پر ایک بوڑھی عرب عورت نے اسے روک کر کہا کہ عرب پر اس قدر ظلم نہ ڈھاتا کہ تمہاری قوم کو اس کا حساب خوفناک اژدھے کی طرح نگل لے۔ ممکن ہے کہ عرب میں ایک بچہ پیدا ہو جو ایک دن اہل فارس کی سلطنت کو تس نہس کر کے رکھ دے۔ کوئی تین سو برس بعد یہ پیشین گوئی پوری ہونے کا دن آگیا۔

آنحضور ﷺ کا بچپن اور جوانی

آنحضور ﷺ کی پیدائش کے فوراً بعد یمن پر ایرانی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ خسرو نوشیروان بڑھاپے کا شکار ہو چکا تھا اور اس کی سرزمین کو شمال مشرق سے ھن قبائل (ترکوں) کے پے در پے حملوں کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ عرب کی سرزمین پر اس کی حکومت قائم تھی۔ مدینہ منورہ میں اہل فارس کی حکومت کے اثرات کسی حد تک نمایاں تھے۔ مکہ مکرمہ کی مثال آج کل کے پاکستانی قبائلی علاقہ کی تھی جہاں قانوناً تو شہنشاہ فارس کی حکومت تھی مگر عملاً قبائل خود مختار تھے اور اپنے معاملات خود حل کرنے کے دعویدار تھے۔ مکہ کی اہمیت شام و یمن کے مابین اہم تجارتی راستہ کے مرکز کی تھی۔ مشرکین مکہ شاہ فارس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے اور اس کی فتوحات پر خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ رومی عیسائیوں سے ان کا معاندانہ رویہ بھی اپنی جگہ پر تھا۔ پھر روم و فارس کی کشمکش کا دائرہ بھی ان کے تجارتی روابط میں حائل ہوتا تھا۔ سرزمین شام و فلسطین جو روم و فارس کی کشمکش کی آماجگاہ تھی وہ بھی مکہ سے چنداں دور نہیں تھی۔

آنحضور ﷺ کے زمانہ میں حجاز کے دانشمند جندی شاہ پور (ایران) میں تعلیم و تربیت کے حصول کے لئے جایا کرتے تھے اور مکہ کے تجارتی قافلوں کے سفر حیرہ' بصرہ' طیسفون اور دیگر ایرانی شہروں تک اکثر ہوا کرتے تھے۔ اس طرح اہل مکہ اہل فارس کی جنگی' تمدنی اور تہذیبی سرگرمیوں سے باخبر ضرور تھے۔

آنحضور ﷺ کی ابتدائی زندگی میں ایران و روم کی مخاصمت زوروں پر تھی اور ان کے مابین ایک خونریز جنگ ۵۷۲ء سے ۵۷۹ء کے عرصہ تک جاری رہی تھی۔ ابتداء میں رومیوں کو سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا اور رومی شہنشاہ جستن کو اسی شکست کے

نتیجہ میں تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور اس کی جگہ طبریوس نے لی۔ طبریوس نے بھی مصالحت کا راستہ اپنانے میں عافیت سمجھی، مگر اس جنگ کا زمانہ نوشیروان کے بیٹے ہرمز چہارم کے ابتدائی عہد تک پھیلا رہا جو ۵۷۹ء سے لے کر ۵۹۰ء کے عرصہ تک محیط رہا اور یہ زمانہ بھی ترکوں اور رومیوں سے جنگ کی حالت میں گزرا۔

بعض روایات کے مطابق آنحضور ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ بارہ برس کی عمر میں شام کا تجارتی سفر کیا اور آپ شام سے واپسی پر بصرہ پہنچے اور راستے میں حیرہ کے علاقہ میں (جہاں نسطوری عیسائیوں کی آبادی تھی) بحیرہ راہب سے ملاقات ہوئی جس نے آپؐ کی نبوت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے جناب ابو طالب سے کہا کہ آپ اس بچے کو فوراً بحفاظت واپس لے چلیں۔ مورخین اور سیرت نگاروں نے اس واقعہ کی تاریخی صحت پر کئی اعتراضات کئے ہیں اور اسے مشکوک قرار دیا ہے۔ اگر اسے سچ مان لیا جائے تو بھی شام سے مکہ کی جانب واپسی کے راستے بصرہ سے نہیں گزرتے تھے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اگر تجارتی مال شام (رومی علاقہ) سے بصرہ (فارس کا علاقہ) لانا مقصود تھا اور پھر وہاں اس سامان کو فروخت کر کے مزید تجارتی مال مکہ کی جانب لانا تھا تو پھر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح مانا جائے تو یہ سفر ان راستوں پر ہی ممکن تھا جہاں اہل فارس کا بول بالا تھا، بلکہ وہاں پر اہل فارس کے اہم ترین سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور جنگی مراکز واقع تھے۔ اس طرح ممکن ہے کہ آنحضورؐ اپنے بچپن میں سرزمین فارس میں داخل ہوئے ہوں جہاں کی زبان، بود و باش اور ثقافت آپ کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ اس صورت میں آپؐ کے مشاہدات کیا تھے اور آپؐ کے ذاتی تجربات کیا تھے، ان کا ذکر ہمیں کہیں ملتا تو نہیں مگر آنحضورؐ کے اقوال و احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نظر میں فارس کی تہذیب و تمدن کا ایک واضح نقشہ ضرور موجود تھا اور آپ ان کی جنگی فتوحات سے باخبر تھے۔ تجارتی قافلوں کے ذریعے سفر کرنے والوں کی زبانی حالات و واقعات کی تمام تفاصیل بھی مکہ پہنچتی رہتی تھیں۔ مزید برآں جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتے ہی خود آنحضورؐ نے بھی تجارتی سفر شروع کر دیئے تھے اور تمام تاجروں کو سفر کے آغاز سے پہلے ارد گرد کے خطوں کے حالات خصوصاً تجارتی راستوں پہ واقع شہروں کی بابت

معلومات جمع کرنا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ نیز وہاں کے امن و امان' ممکنہ طور پر فراہم ہونے والے اور بکنے والے سامان اور دیگر ضروریات زندگی کا علم ضروری تصور ہوتا تھا۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ آنحضور ﷺ اپنے پیشے کی ضرورت کے مطابق ان حالات و واقعات سے باخبر ہوں۔ پھر وہ فہم و فراست اور نگاہ دور بین جو خدائے بزرگ و برتر نے آپ ؐ کو عطا کی تھی وہ اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ آپ ؐ جہاں سے بھی گزریں وہاں کے مشاہدات سے آپ نتائج اس انداز سے اخذ فرمائیں جو باقی لوگوں کے ذہن سے اوجھل ہوں۔ ہرچند کہ آپ ؐ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی لکھ سکتے تھے مگر آپ کی نگاہ دور رس بین الاقوامی تبدیلیوں کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔

(جاری ہے)

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ۱۵/اپریل تا ۳۱/اگست ۹۷ء تک کی دعوتی سرگرمیوں اور مصروفیات کی اجمالی رپورٹ

۱۹/اپریل کو امیر محترم نے پرل کانٹی نینٹل میں خواتین سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب کا انتظام پاکستان ویمن آرگنائزیشن نے کیا تھا۔

۲۰ تا ۲۳/اپریل مرکزی مجلس مشاورت کی نشستوں میں شرکت رہی۔ ۲ تا ۵/مئی حلقوں کے ناظمین سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں اور توسیعی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں تنظیم کے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی کا اہم فیصلہ کیا گیا۔ اسی دوران ۳/مئی کو علامہ اقبال میڈیکل کالج میں خطاب ہوا۔ ۷/مئی کو خانہ فرہنگ ایران نے امیر محترم کا مفصل انٹرویو ریکارڈ کیا۔

۱۹/مئی کو میاں محمد شریف دوبارہ اپنے تینوں بیٹوں میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف اور میاں عباس شریف کے ہمراہ ملاقات کے لئے آئے۔ امیر محترم نے انہیں دستور میں موجود تضادات کی جانب دوبارہ توجہ دلا کر انہیں ختم کرنے اور قرآن و سنت کو سپریم لاء بنانے کو کہا اور خصوصاً سود کو ختم کرنے کے فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف دائر کردہ اپیل واپس لینے کو کہا اور سودی معیشت ختم کرنے کی جانب توجہ دلائی۔ مزید برآں امیر محترم نے وزیر اعظم ہاؤس میں ایک وفد کی صورت میں ملاقات کا وقت بھی لے لیا۔

۲۱/مئی کو راولاکوٹ کے ضلع کونسل ہال میں خطاب ہوا اور بعد نماز مغرب سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ ۲۲/مئی کو صبح دس بجے راولاکوٹ بار ایسوسی ایشن سے خطاب فرمایا۔ شام کو اسلام آباد میں ڈاکٹر وحید الزمان اور عبد الحفیظ کھوکھر صاحبان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ۲۳/مئی کو امیر محترم نے صدر مملکت جناب فاروق احمد خان لغاری سے ملاقات کی جس میں ان سے دیگر امور کے علاوہ دستوری نفاق دور کرنے کے مطالبے کی تائید کرنے کو کہا۔ دوپہر کو جامع مسجد گلشن داون مری روڈ میں نماز جمعہ سے قبل تکمیل دستور خلافت کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ نماز کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی بھرپور رہی۔ بعد نماز مغرب راولپنڈی اور اسلام آباد کی تنظیموں کے امراء سے پہلے اجتماعی اور پھر ہر ایک سے علیحدگی میں ملاقاتیں کیں اور بعض تنظیمی امور پر مشورہ کیا۔ ۲۴/مئی کو

بجے دن امیر محترم نے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں بزبان انگریزی "خلافت کا مفہوم اور عصر حاضر میں اس کا دستوری خاکہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

اس پروگرام سے فارغ ہو کر امیر محترم اپنے ساتھیوں پر مشتمل وفد کے ہمراہ وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف سے وزیراعظم ہاؤس میں ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ وزیراعظم سے ملاقات میں انہیں یادداشت بھی پیش کی گئی اور زبانی بھی دستوری منافقت اور سودی معیشت کو ختم کرنے کی جانب توجہ دلائی گئی' جس پر نواز شریف صاحب نے دو مرتبہ راجہ ظفرالحق صاحب سے کہا کہ راجہ صاحب آپ ترمیمی بل لانے کی تیاری کیجئے۔

اسی روز بعد نماز مغرب واہ کینٹ کی جامع مسجد لالہ رخ میں "عظمت شہادت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۲۵/مئی کو ۱۱ بجے امیر محترم نے پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا۔ بعد نماز ظہر رفقاء کے اجتماع سے خطاب فرمایا۔ بعد نماز عصر انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام اسلام آباد ہوٹل میں "ملکی معیشت کی تباہی کے اسباب" کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں مفصل خطاب فرمایا۔

۲۶/مئی کو امیر محترم نے تنظیم اسلامی کے وفد کے ہمراہ آزاد کشمیر کے سابق وزیراعظم سردار عبدالقیوم خان سے ان کے مکان پر ملاقات میں باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کی۔ ساڑھے گیارہ بجے تنظیمی وفد کے ہمراہ افغانستان کے سفیر مولوی شہاب الدین دلاور صاحب سے ملاقات کی اور انہیں پاکستان کے طالبان حکومت تسلیم کئے جانے پر مبارکباد پیش کی۔

۳۰/مئی کو امیر محترم کراچی کے چار روزہ دورے پر تشریف لے گئے۔ ۳۱/مئی کو قرآن اکیڈمی کراچی میں رفقاء کراچی کے اجتماع سے خطاب فرمایا۔ یکم جون کو ۸/بجے شب آئی بی اے ہال میں جلسہ عام سے "موجودہ عالمی حالات اور ہماری ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۲/جون کو امیر محترم نے رفقاء کے اعزہ و احباب کے خصوصی اجتماع میں "تنظیم اسلامی کی دعوت اور اسلامی انقلاب کا طریقہ کار" مفصل بیان فرمایا۔

۱۱/جون کو امیر محترم نے جمعیت العلماء اسلام کے سرپرست اعلیٰ مولانا محمد اجمل خان سے لاہور میں ان کے مدرسے میں جا کر ملاقات فرمائی۔ ۱۲/جون کو افغانستان کے سفیر مولوی شہاب الدین دلاور امیر محترم سے ملاقات کے لئے قرآن اکیڈمی تشریف لائے۔ ان سے مفصل ملاقات اور افغانستان کے حالات پر گفتگو ہوئی۔

۱۳'۱۴/جون کو برادرم ہاسط بلال کے لیکچرز میں شرکت فرمائی۔ ۱۵/جون کو سیالکوٹ میں انوار

کلب ہال میں "حالیہ عالمی و علاقائی تبدیلیاں اور مسلمانان پاکستان کی ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۱۷/جون کو امیر محترم نے شیعہ سنی مفاہمت کے ضمن میں تحریک جعفریہ پنجاب کے صدر سید واجد علی شاہ، سپاہ محمد کے جنرل سیکرٹری سید شاکر حسین نقوی اور مولانا ہادی نقوی کو کھانے پر ملاقات کی دعوت دی۔ شیعہ سنی مفاہمت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ۱۹/جون کو امیر محترم نے جامعہ حزب الاحناف کے مہتمم مولانا محمود احمد رضوی صاحب سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات فرمائی۔

۲۱/جون کو امیر محترم کوئٹہ تشریف لے گئے۔ اسی روز بعد نماز مغرب روزنامہ "باخبر" کو مفصل انٹرویو دیا۔ ۲۲/جون کو تکمیل دستور خلافت کے ضمن میں منعقدہ ریلی کی قیادت کی اور خطاب فرمایا۔ ۲۳/جون کو امیر محترم نے کوئٹہ بار کونسل سے خطاب فرمایا۔ اسی دن روزنامہ مشرق نے امیر محترم کا انٹرویو لیا۔ شام کو بعد نماز مغرب روزنامہ کوہستان نے انٹرویو لیا۔ ۲۴/جون کو امیر محترم نے انجمن خدام القرآن کوئٹہ کے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ بعد نماز عصر تنظیم کے رفقاء سے ملاقات فرمائی۔ ۲۵/جون کو ایرانی قونصلیٹ اور مقامی شیعہ علماء سے الگ الگ ملاقاتیں فرمائیں۔

۲۸/جون کو امیر محترم دورۂ سرحد کے لئے پشاور تشریف لے گئے۔ اسی روز پشاور کے کثیر الاشاعت روزنامہ مشرق نے امیر محترم سے پینل انٹرویو کیا۔ پینل کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے آپ نے ملکی و بین الاقوامی حالات کے حوالے سے تنظیم کے موقف کی وضاحت فرمائی۔ ۲۹/جون کو امیر محترم نے سواڑی ضلع بونیر میں "احیائے خلافت کے ضمن میں ملاکنڈ کی خصوصی اہمیت" کے موضوع پر خطاب فرمایا اور سوال و جواب کی نشست ہوئی۔

۴/جولائی کو امیر محترم نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں شیعہ سنی مفاہمت کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کی صدارت فرمائی اور خطاب بھی فرمایا۔ ۶/جولائی کو الحمراء ہال نمبر ۱ میں تکمیل دستور خلافت کے موضوع پر منعقدہ جلسہ کی صدارت فرمائی اور صدارتی خطاب بھی فرمایا۔ ۶، ۷/جولائی کو توسیعی مجلس عاملہ کے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

۸/جولائی کو آپ ملتان تشریف لے گئے۔ وہاں قبل دوپہر ۳۰ روزہ تربیت گاہ کی اختتامی تقریب میں شرکت کی اور خطاب فرمایا اور شام کو بعد نماز مغرب رضا ہال میں "نیا عالمی استعمار اور موجودہ فرقہ وارانہ چپقلش" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۱۱/جولائی کو امیر محترم رفیق تنظیم ڈاکٹر احمد افضال کا نکاح پڑھانے گوجرانوالہ تشریف لے گئے

جہاں آپ نے خطبہ نکاح کی تشریح کرتے ہوئے اصلاح رسوم کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔

۱۲/ جولائی کو آپ کراچی تشریف لے گئے۔ ۱۲/ جولائی ہی کو آپ نے انجمن کے ایک ہمدرد جناب خلیل احمد صاحب اللہ والے کے ہاں "تنظیم اسلامی کی دعوت' اہداف اور طریقہ کار" کے موضوع پر خطاب فرمایا اور بعد ازاں شرکاء کے سوالات کے جواب بھی دیئے۔ ۱۳/ جولائی کو امیر محترم نے آئی بی اے آڈیٹوریم میں "محمد ﷺ بحیثیت داعی انقلاب" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۱۸/ جولائی کو امیر محترم شمالی امریکہ کے دعوتی دورہ پر تشریف لے گئے۔ وہاں سے ۱۳/ ستمبر کی شب واپسی ہوئی۔ امریکہ میں امیر تنظیم کی دعوتی سرگرمیوں کی رپورٹ جسے برادرم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب معاون امیر تنظیم اسلامی برائے بیرون پاکستان نے مرتب کیا ہے' حسب ذیل ہے:

محترم امیر تنظیم اسلامی کا سفر امریکہ

امیر محترم نے اپنے گزشتہ summer کے سفر کے دوران یہ شرط عائد کی تھی کہ جب تک امریکہ کے رفقاء میں سے کوئی سینئر اور ان کا معتمد علیہ رفیق تنظیم کے لئے ہمہ وقت فراغت اختیار نہیں کرتا وہ امریکہ نہیں جائیں گے۔ موصوف کی اس دھمکی پر رفیق محترم عطاء الرحمٰن صاحب نے اپنی Job سے استعفاء دیا اور نصف تنخواہ پر تنظیم کے لئے کام کرنے کی حامی بھری تو امیر محترم نے موصوف کو دو سال کے لئے TINA کا امیر نامزد کر دیا۔ امیر محترم نے اپنے وعدے کی پاسداری کی خاطر اس سال ویزے کی درخواست دی تو پانچ سال کا Multiple Visit ویزا بھی مل گیا اور امیر ٹینا نے بھی وعدے کے پابند اپنے بوڑھے امیر کو خوب استعمال کیا' جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

امیر محترم ۱۸ جولائی کو لاہور سے نیویارک پہنچے۔

— ۱۹ اور ۲۰ جولائی کو آپ نے ملتزم رفقاء کے تربیتی اجتماع سے خطاب کیا۔

— ۱۹ جولائی ہی کو آپ نے نیویارک میں ہونے والی سیرۃ النبی ﷺ کانفرنس میں شرکت کی اور شیعہ سنی منافرت کو پیش آمدہ حالات میں امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔

— ۲۱/ جولائی کو امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسجد دار القرآن بے شور لانگ آئی لینڈ میں "نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

— ۲۲/ جولائی کو مکی مسجد Brooklyn میں اسی موضوع پر اردو میں خطاب ہوا۔ امیر محترم

نے واضح فرمایا کہ اطاعت بغیر محبت نفاق کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور محبت بغیر اطاعت کے فسق بن جاتی ہے۔

— ۲۳/ جولائی کو امیر محترم نے ٹرینٹن (Trenton) نیو جرسی میں مسجد الصفات میں "اتحاد امت مسلمہ کیوں اور کیسے؟" کے موضوع پر خطاب فرمایا جس میں آپ نے واضح کیا کہ اتحاد صرف مشترک مقصد (غلبہ دین) اور مشترک خوف (تقویٰ) کی بنیاد پر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور کوئی ایک قائد ہی امت کو مجتمع کر سکتا ہے۔

— ۲۴/ جولائی کو محترم ڈاکٹر صاحب نے واشنگٹن ڈی سی اور بالٹی مور کے رفقاء سے تنظیمی ملاقات کی۔

— ۲۵/ جولائی کو آپ نے مسلم کمیونٹی سینٹر سلور سپرنگ میری لینڈ میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا' موضوع تھا "اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم"۔

— ۲۶/ جولائی کو مسجد الرحمٰن اسلامک سوسائٹی آف بالٹی مور میری لینڈ میں "اقامت دین" کے موضوع پر خطاب ہوا۔

— ۲۷/ جولائی کو دو خطاب ہوئے' پہلا "فلسفہ سیرۃ اور اقامت دین کے طریق کار" کے موضوع پر اسلامک کمیونٹی سینٹر لارل میں اور دوسرا "اقامت دین کی اہمیت" کے موضوع پر دار الہجرہ فالز چرچ ورجینیا میں۔

— ۲۹ اور ۳۰ جولائی کو امیر محترم نے نارتھ جرسی تنظیم کے رفقاء سے ملاقات کی اور TINA کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس کی صدارت کی۔

— ۳۰/ جولائی کو امیر محترم نے اسلامک سینٹر آف لانگ آئی لینڈ ویسٹ بری میں خطاب فرمایا۔

— یکم اگست کو آپ نے ڈین بری میں اسلامک سوسائٹی آف کونیکٹیکٹ میں خطاب فرمایا۔

— ۲/ اگست کو امیر محترم نے سینٹرل اور ساؤتھ جرسی کی تنظیموں کے رفقاء سے ملاقات کی۔

— ۳/ اگست کو امیر محترم نے ڈیٹرائٹ میں "PLIGHT OF UMMAH" کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔

— ۳/ اگست ہی کو موصوف نے ڈیٹرائٹ کے رفقاء سے بھی ملاقات کی۔

— ۵ اور ۶/ اگست کو امیر محترم نے مسلم مسجد سیکرمنٹو کیلی فورنیا میں لیکچرز دیئے۔ ۵/ اگست کے لیکچر کا موضوع تھا "برعظیم پاک و ہند میں امت مسلمہ کی موجودہ کیفیت" اور ۶/ اگست کے لیکچر کا موضوع تھا "اقامت دین"۔

— ۶/اگست کو محترم ڈاکٹر صاحب نے سیکرمنٹو کے رفقاء سے ملاقات بھی کی۔
— ۷/اگست کو ڈیوس کیلی فورنیا کے مسلمانوں سے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے موضوع پر خطاب ہوا۔
— ۸/اگست کا خطبہ جمعہ مسلم کیمونٹی ایسوسی ایشن سینٹر سینٹاکلارا میں ہوا۔
— ۹/اگست کو ڈاکٹر صاحب نے سینٹا کلارا کی تنظیم اور سیکرمنٹو اسرہ کے رفقاء سے ملاقات کی۔
— ۱۰/اگست کو امیر محترم نے "قرآن' وحدت امت کا ذریعہ" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔
— ۱۱/اگست کو محترم ڈاکٹر صاحب نے سیکرمنٹو میں "فکر اقبال" کے موضوع پر اردو میں خطاب فرمایا۔
— ۱۲/اگست کو انٹرنیشنل انگلش انسٹی ٹیوٹ فرسنو کیلی فورنیا میں "امت مسلمہ کی موجودہ حالت اور اس کا مستقبل" کے موضوع پر دو نشستوں میں خطاب ہوا۔
— ۱۵/اگست کو امیر محترم نے "اقامت دین کے عملی پہلو" کے موضوع پر اسلامک سوسائٹی آف اورنج کاؤنٹی میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا اور ۱۷/اگست کو پھر اسی جگہ خطاب فرما کر اپنے موضوع کو مکمل کیا۔
— ۱۵/اگست کی شام ہی کو امیر محترم نے اسلامک سوسائٹی آف ساؤتھرن کیلی فورنیا میں "قرآن آلہ دعوت و اقامت دین" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔
— ۱۶/اگست کو اسلامک سینٹر آف کلیئر مونٹ (CLEAR MONT) کیلی فورنیا میں "اسلام انسانی حریت کا ذریعہ" کے موضوع پر خطاب ہوا۔
— ۱۷/اگست کو امیر محترم یونیورسٹی آف ساؤدرن کیلی فورنیا میں ایک سمپوزیم میں مدعو تھے۔ دوسرے مقرر معروف افرو امریکن لیڈر ابو علیم موسیٰ تھے۔ امیر محترم نے "تحریک اسلامی کا مدعا : قیام عدل" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔
— لاس اینجلس کے قریب ساؤتھرن کیلی فورنیا میں اپنے قیام کے دوران امیر محترم نے "Pakistan Today" نامی کثیرالاشاعت اخبار کو ایک انٹرویو دیا اور مشہور رسالے "مینارٹ" کے ایڈیٹر اور مسلم پبلک افیئرز کونسل کے جناب حسن ہیتاؤٹ سے بھی ملاقات کی۔
— ۱۸/اگست کو جناب امیر نے لاس انجلس کے رفقاء سے ملاقات کی جن میں نئے شامل

ہونے والے دو رفیق بھی شامل تھے۔ ایک اسرہ بھی تشکیل پایا۔

— ۱۹/اگست اور ۲۰/اگست کو ڈیٹرائیٹ کے رفقاء و احباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔

— ۲۲/اگست کو امیر محترم نے اٹلانٹا میں "مسلمان کی دینی ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب کیا۔

— ۲۳/اگست کی صبح آپ نے بزبان اردو "اللہ اور اس کے رسول ؐ کی پکار پر لبیک" کے موضوع پر مدینہ مسجد اٹلانٹا میں خطاب فرمایا ——— اسی شام جورجیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں "سیرة کی بنیاد پر طریق عمل" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

— ۲۳/اگست ہی کو ایک پرانے رفیق اور تین نئے رفقاء کے ساتھ ملاقات ہوئی اور ایک نیا اسرہ تشکیل دیا گیا۔

— ۲۴/اگست کو تنظیم کے بورڈ آف ڈائریکٹرز (توسیعی مجلس عاملہ) کے طویل اجلاس کی صدارت امیر محترم نے فرمائی اور اہم امور کا فیصلہ فرمایا۔

— ۲۵/اگست کو امیر محترم دوبارہ مکی مسجد بروکلین تشریف لے گئے اور "تنظیم کی دعوت" کے موضوع پر راقم کے ۳۵ منٹ کے خطاب کے بعد حاضرین کے سوالات کے جواب دیئے۔

— ۲۶/اگست کو امیر محترم نے مسلم سینٹر آف نیویارک کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔

— ۲۹/اگست سے یکم ستمبر تک امیر محترم نے اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA) کے سالانہ کنونشن میں شرکت فرمائی۔ شمالی امریکہ کے مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا میلہ امسال شکاگو میں منعقد ہوا۔ شکاگو میں اپنے قیام کے دوران امیر محترم نے کامیشین امریکن ہردل عزیز مسلمان لیڈر جناب حمزہ یوسف سے ملاقات کی۔ موصوف نے امیر محترم کے ۲۰ گھنٹے کے خطابات کی ساعت کا وعدہ فرمایا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر احمد فاروق مودودی بھی بطور خاص محترم امیر تنظیم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب پروفیسر زید شاکر سے بھی ملے۔ علاوہ ازیں ISNA کنونشن میں شریک تمام رفقاء تنظیم اسلامی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور آپ نے ایک علیحدہ ملاقات تنظیم اسلامی شکاگو کے رفقاء سے بھی کی۔

— ۲۹/اگست کا خطبہ جمعہ شکاگو کے ڈاؤن ٹاؤن اسلامک سینٹر میں ہوا۔

اس پورے سفر کے دوران امیر ٹینا جناب عطاء الرحمٰن جناب امیر محترم کے ساتھ رہے۔ اس

سفر کے ایک حصے میں نوجوان رفیق المان چوہدری نے بھی امیر محترم کی خدمت کی سعادت حاصل کی۔ اس سفر کی خاص بات جناب عزیز الرحمٰن خان صاحب کی معیت تھی جو امیر محترم کے تمام خطابات کو پروفیشنل انداز میں ویڈیوز میں ریکارڈ کرتے رہے۔

خطوط و نکات

ایک وضاحت ــــ ایک گزارش

مکرمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد ' مدیر گرامی "میثاق" لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

عرض خدمت یہ ہے آپ نے گزشتہ برس راولپنڈی میں منعقدہ خلافت کانفرنس میں اور پھر "میثاق" کی ایک اشاعت میں "اخوت اکادمی" کے بارے میں اور اس کے اراکین کے اسلامی جذبے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا' ان سے آپ کی بزرگواری اور عظیم آفاقی اسلامی مقاصد کے لئے آپ کے خلوص و وسعت صدر کی عکاسی ہوتی ہے۔ ہم ادب کے ساتھ آپ کے شکر گزار ہیں۔

تاہم ایک گزارش یہ ہے کہ اس اکادمی کے بانی پس منظر کے اعتبار سے ضرور شیعہ مکتب سے تعلق رکھتے ہیں تاہم اکادمی کی بنیاد کسی فرقے کے امتیازات کی ترویج پر نہیں بلکہ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ' تعلیم اور اشاعت پر ہے۔ یہ اکادمی کسی فرقے کی نمائندگی نہیں کرتی۔ ہم اسلامی اصولوں پر قائم اسلامی ریاست کے لئے ہر طرح کی علمی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ شیعہ سنی اتحاد کے لئے بھی آپ کے جذبے کا ہم احترام کرتے ہیں۔ اس کے حصول کے طریق کار پر البتہ ہماری بعض آراء آپ کی آراء سے مختلف ہو سکتی ہیں لیکن آراء کا یہ فرق بھی مسلکی فرق نہیں بلکہ حکمت عملی سے متعلق ہے۔ اس پر آپ سے آئندہ ملاقاتوں میں یا کسی ضرورت کے موقع پر بات ہو سکتی ہے۔

لہٰذا آپ سے ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ اپنی تحریر و تقاریر میں اس ادارے کو کسی مسلک کے نمائندہ ادارے کے طور پر متعارف نہ کروایئے۔ آپ کی نوازش ہو گی۔

والسلام

نعیم الحسن

ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ اخوت اکادمی

یہ "قدر" اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!

بھارت میں "میثاق" کی قدر شناسی کی ایک انتہائی مثال

محترم المقام، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

میرے برادر نسبتی جناب نواب عزیز الٰہی خان آخون منزل، حسن پور ضلع مراد آباد (انڈیا) آپ کے موقر جریدے (میثاق) کے بڑے رسیا بلکہ عاشق زار واقع ہوئے ہیں، جو گزشتہ سال تک (غالباً دسمبر۹۶ء تک) ان کے نام جاری تھا ـــــ نہ معلوم کس وجہ سے موصوف نے میرے دوران قیام حسن پور (اکتوبر۔ دسمبر۹۶ء) میں ہی مجھ سے منع فرمادیا کہ آپ سالانہ چندہ روانہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں بلکہ ماہ بہ ماہ پرچہ خرید کر مجھے بھجوا دیا کریں۔

اب جناب ہوا یہ کہ میں جنوری میں کراچی واپس آیا اور اپنے کاموں میں کچھ ایسا الجھا کہ میثاق کی ماہانہ خریداری ذہن سے نکل گئی۔ اب موصوف کا پچھلے دنوں خط آیا۔ اس کا ایک جملہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں۔

> "میثاق کا روزانہ مطالعہ نماز تہجد اور فجر کی اذان کی درمیانی ساعتوں میں بلاغانہ چائے کے درمیان ہوا کرتا تھا جس سے آج کل محرومی نہایت شاق گزر رہی ہے.....
> اشارہ کافی ست"

نہایت ہی مہذب الفاظ میں سمند ناز پر تازیانہ کھینچ مارا ہے ـــــ والا نامہ نازل ہوتے ہی تگ و دو شروع کی۔ چنانچہ جنوری تا ستمبر۹۷ء کے پرچوں کی تلاش میں پتہ نہیں کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر یہ مشکل آپ کے گلشن اقبال والے دفتر میں مکرمی جناب عبدالسمیع صاحب نے تمام شمارے (سوائے فروری کے) مہیا فرما کر حل فرمادی۔ اب منتظر ہوں کسی اللہ کے بندے کا جو دلی جارہا ہو تاکہ ان کی "چاشت صبح گاہی" بعجلت ممکنہ ان تک پہنچ کر شرف قبولیت حاصل کرسکے اور مجھے بھی ثواب دارین کی سعادت سے سرفرازی۔

اب اس سلسلہ میں آپ سے رجوع کرنے کا اصل سبب بیان کروں۔ جیسا کہ پہلے

عرض کیا ہے فروری کا شمارہ نہیں مل سکا ہے۔ اس کے بغیر "چارٹ" مکمل نہیں ہو گی۔ کچھ اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیے کہ یہ مطلوبہ شمارہ کہاں سے دستیاب ہو گا۔ اگر آپ کے پاس (یقین واثق ہے کہ) موجود ہے تو اس خاکسار تک پہنچنے کی کیا ترکیب ہو گی ——
اور یہ کہ اس کا ہدیہ کیا ہو گا۔ اس کی ترسیل کی کیا صورت ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

امید قوی ہے کہ جواب باصواب سے بعجلت ممکنہ مطلع فرما کر اس حقیر پر تحقیر عاصی پر معاصی کو ممنون و مشکور فرمائیں گے۔ سمع خراشی کیلئے معافی کا خواستگار ہوں۔

منتظر جواب احقر العباد

عبدالقسیم خان

فیڈرل بی ایریا' کراچی

ضرورت رشتہ

سرگودھا سے تعلق رکھنے والی دینی مزاج کی حامل' مغل فیملی کی دو بہنوں' تعلیم بی اے عمر 23 سال اور ایف ایس سی عمر 21 سال' کے لئے موزوں رشتے درکار ہیں۔

برائے رابطہ : غازی وقاص معرفت پوسٹ بکس 66 51' ماڈل ٹاؤن لاہور

اہل سنت والجماعت سید خاندان کی بی اے (کمپارٹمنٹ) لڑکی کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ سید خاندان کو ترجیح دی جائے گی۔ برائے رابطہ : سید افتخار احمد

شعبہ خط و کتابت کورس' قرآن اکیڈمی' K-36 ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700

تنظیم اسلامی کے رفیق' اعلیٰ عہدہ پر فائز سرکاری ملازم کی ایم اے اسلامیات' 24 سالہ بیٹی کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔

رابطہ : نعیم اختر عدنان' K/36 ماڈل ٹاؤن لاہور' فون : 5869501

دبئی میں مقیم تنظیم اسلامی کے ایک رفیق عمر 32 سال کے لئے دینی گھرانے کی 30 سال کی عمر تک کی' شرعی پردے پر عامل تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ مطلوب ہے۔ بیوہ اور مطلقہ بھی قبول ہے۔

رابطہ : سردار اعوان' K/36 ماڈل ٹاؤن لاہور' فون : 5869501

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد : ۴۶
شمارہ : ۱۲
شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ
دسمبر ۱۹۹۷ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرِ تعاون ۱۰۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ — 22 ڈالر (800 روپے)
- سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، ایشیا، یورپ، جاپان — 17 ڈالر (600 روپے)
- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر — 10 ڈالر (400 روپے)

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت : 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700-فون : 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی : 67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون : 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع : رشید احمد چودھری، مطبع : مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

ملک کا سفینہ ایک بار پھر مہیب سیلاب کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہے۔ قوم کے ناخدا باہم دست و گریبان ہیں۔ ہر کوئی اپنے داؤ پر ہے' ملک و قوم کا درد صرف زبان کی نوک تک محدود ہے۔ حکومت عدلیہ تنازعے نے طول ہی نہیں پکڑا نہایت سنگین صورت بھی اختیار کرلی ہے۔ عدلیہ اگر حکومت کو زچ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے تو حکومت بھی عدلیہ کو زیر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس مقابلے کے کئی راؤنڈ گزر چکے ہیں۔ پچھلا ہفتہ نسبتاً پر سکون گزرا کہ دونوں فریق اگلے راؤنڈ کی تیاری کے لئے اپنا سانس درست کرنے اور اوسان بحال کرنے کے لئے شاید وقفہ کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن اب ع "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے مصداق ایک بار پھر خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے بالمقابل آچکے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ حکومت نے اپنے اصل حریف سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو ایل بی ڈبلیو کرنے کے لئے ایک نیا داؤ کھیلا ہے۔ سپریم کورٹ کوئٹہ بینچ نے ایک رٹ کے جواب میں چیف جسٹس کی تقرری کو چیلنج کرتے ہوئے ان کی معطلی کا فیصلہ صادر کیا ہے' جبکہ چیف جسٹس نے اس کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ چونکہ مذکورہ آئینی درخواست کی سماعت قواعد و ضوابط کے مطابق نہیں کی گئی اس لئے کوئٹہ بینچ کا یہ فیصلہ غیر موثر ہے ـــــ گویا اب یہ تنازعہ محض حکومت اور عدلیہ کے مابین نہیں رہا' عدلیہ بھی اب منقسم ہو کر دو حصوں میں بٹ چکی ہے' جس سے ڈیڈ لاک بڑھے گا اور بحران کی شدت میں مزید اضافہ ہو گا۔ جبکہ نواز شریف صاحب اس سے قبل اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل کرامت سے استغاثہ کر چکے ہیں۔

بھاری مینڈیٹ رکھنے والی بظاہر انتہائی مستحکم حکومت کا یہ حشر تو عبرتناک ہے ہی' اس سے زیادہ عبرتناک معاملہ یہ ہے کہ عوام کی نمائندہ ایک نہایت مستحکم حکومت بھی ملک کے استحکام کے لئے دھیلے کا کام بھی نہ کر سکی اور ملکی معیشت کے ڈوبے سفینہ کو بچانے کی اس کی ہر کوشش نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اور وہ "انتہائی مستحکم" حکومت عوام کی بے پناہ حمایت رکھنے کے باوجود نو مہینے کے اندر اندر پے بہ پے ایسے شدید بحرانوں کی لپیٹ میں آئی کہ اس کا برسر اقتدار رہنا نہایت مشکوک ہو گیا ـــــ یہ سب کچھ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس ملک کا استحکام ہی نہیں اس کی بقا کا دارومدار بھی صرف اور صرف اسلام پر ہے۔ اسی امر کی نشاندہی امیر تنظیم اسلامی نے ۷ نومبر کے خطاب جمعہ میں کی تھی جس کے پریس ریلیز کا متعلقہ حصہ ذیل میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے:

> "لاہور (پ ر) بھاری مینڈیٹ کے نشے میں عدلیہ سے پنجہ آزمائی کے نتیجے میں نہ صرف اندرون ملک بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کی "حیثیت عرفی" کو شدید دھچکا لگ چکا

ہے۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ نواز شریف کا اقتدار کسی بھی لمحے ختم ہو سکتا ہے لہٰذا وہ موجودہ مہلت کو غنیمت سمجھتے ہوئے قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے لئے دستوری ترامیم منظور کرائیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ خود ان کے ساتھ قوم و ملک بھی عذاب الٰہی کی گرفت میں آ جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ نواز شریف قوم کی طرف سے عطا کردہ بھاری مینڈیٹ کو دستور پاکستان میں قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرانے کی بجائے اپنے ذاتی اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر دستوری ترامیم منظور کرانے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کی پاداش میں وہ پچھلے دنوں شدید ترین آزمائش سے دوچار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وزیراعظم کا اپنے سابقہ طرز عمل کی تلافی کرتے ہوئے دستوری سطح پر شریعت کی بالادستی کا نفاذ ملک و قوم کے ساتھ ساتھ خود ان کے اپنے اقتدار کے تحفظ کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اسمبلی میں فیصلہ کن اکثریت رکھنے کے باوجود ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ سے گریز بہت بڑا جرم ہے، جس کی حکمرانوں کے ساتھ قوم کو بھی کڑی سزا ملے گی۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ شریعت کو سپریم بنا کر ملک کو حقیقی اسلامی ریاست کے قالب میں ڈھالنا مسلمانان پاکستان کا متفقہ مطالبہ ہے جسے پورا کرنا نواز شریف کی آئینی اور دینی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہبی اور سیاسی جماعتوں میں سے کوئی بھی قابل ذکر جماعت نفاذ اسلام کی مخالف نہیں ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ قرارداد مقاصد اگرچہ دستور پاکستان کا حصہ ہے لیکن اس کے منافی اور مخالف دفعات بھی دستور کا حصہ ہیں چنانچہ ملکی دستور دھوکہ دہی، فراڈ اور منافقت کا شاہکار بن چکا ہے۔ نواز شریف نے اپنے سابقہ دور حکومت میں سود کی حرمت کے بارے میں شریعت کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر کے اسے عملاً غیر موثر بنا کر عظیم ترین گناہ کا ارتکاب کیا تھا جبکہ اب اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل دائر کرنا اللہ رسولؐ کے علاوہ مسلمانوں سے دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی کا مظہر ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اب بھی اس امکان کو رد نہیں کرتا کہ نواز شریف نفاذ اسلام کے سلسلے میں مخلص ہوں مگر کوئی بڑی طاقت اس سلسلے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہو۔ تاہم نفاذ اسلام کے وعدوں کی تکمیل نہ کرنا در حقیقت امریکہ بہادر اور عالمی مالیاتی اداروں پر مشتمل "چھوٹے خداؤں" کی فرمانبرداری کے مترادف ہے۔ وزیراعظم میاں نواز شریف کے لئے نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ موجودہ مہلت سے فائدہ اٹھا کر نفاذ شریعت کا وعدہ پورا کر کے اللہ اور قوم کے سامنے سرخرو ہوں"۔

☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کا مشاورتی و تربیتی اجتماع بحمد اللہ حسب پروگرام منعقد ہوا۔ اس کی مفصل رپورٹ چونکہ "ندائے خلافت" کے ۱۹ اور ۲۶ نومبر کے دو شماروں میں شائع ہو چکی ہے لہٰذا "میثاق" میں اس کی اشاعت ہمارے نزدیک غیر ضروری ہے ___ منہج انقلاب نبوی ﷺ کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی کے خطابات کو از سر نو ایڈیٹنگ کے بعد میثاق میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اس ضمن میں پہلا خطاب زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔

انقلابی جدّوجُہد کے لوازم و مراحل — اور انقلابِ نبویؐ کے پہلے دُو مرحلے : دعوت اور تنظیم

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(مرتّب : شیخ جمیل الرحمٰن)

دنیا کے دوسرے انقلابات سے انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) اس اعتبار سے بنیادی طور پر مختلف ہے کہ دوسرے دنیوی انقلابات کے نظریات انسانوں کے ذہن کی پیداوار تھے ——— بالشویک یعنی اشتراکی انقلاب کا فلسفہ کارل مارکس کے ذہن کی اختراع تھا۔ اسی طرح انقلاب فرانس کا فلسفہ والٹیئر' روسو اور بہت سے مفکرین کے ذہنوں کی پیداوار تھا۔ مگر اسلامی انقلاب کا فلسفہ اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ ہے جو وحی کے ذریعہ سے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا۔ لہٰذا اس نظریہ کی نشرواشاعت کے معنی ہیں قرآن حکیم کی نشرواشاعت' اس کی تبلیغ' اس کے ذریعہ سے دعوت' اس کے ذریعہ سے تبشیر و انذار اور اس کے ذریعہ سے تذکیر و نصیحت۔ علاوہ ازیں قرآن انسان کے لئے جو ہدایت لے کر آیا ہے اس میں یقیناً انفرادی زندگی کے لئے بھی راہنمائی ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے بھی۔ قرآن کے موضوعات انفرادی اعمال و افعال کو بھی محیط ہیں اور اجتماعی اقدار کو بھی۔ لیکن انقلابی عمل کے لئے قرآن کے اس حصہ کو نمایاں کرنا ہو گا جس کا تعلق اجتماعی نظام کے ساتھ ہے۔

پاکستان میں اسلامی انقلاب کی ضرورت و اہمیت اور طریق کار

پاکستان میں اسلامی انقلاب کے ذکر سے پہلے چند تمہیدی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ پہلی

بات یہ کہ پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔ ہمارے پاس اسلام کے سوا اس ملک کی بقا اور استحکام کے لئے کوئی اور بنیاد سرے سے موجود نہیں ہے ـــــ اب یہ بات خود ایک مستقل موضوع ہے کہ تحریک پاکستان کا پس منظر کیا تھا! یہ ملک بنا کیوں تھا! اس کے محرکات اور عوامل کیا تھے! اس کی اساسات کیا ہیں! ـــــ پھر یہ کہ مختلف ممالک کے استحکام اور بقا کے لئے کون کون سے عوامل سہارا دیتے ہیں اور اس کی تقویت کا باعث بنتے ہیں! ان میں سے ایک ایک عامل کا جائزہ لے کر یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے عام ممالک کو اپنے استحکام اور بقا کے لئے جو سہارے دستیاب ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو واحد سہارا ہے وہ ہمارا دین ہے۔ ہمارے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ؏ کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو۔ ہم کافر ہو ہی نہیں سکتے، ہمیں تو لامحالہ مسلمان ہونا پڑے گا۔ [1]

دوسری بات بھی، جو اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے، یہ کہ پاکستان میں اسلام نہ انتخابی طریق سے آ سکتا ہے اور نہ اس "ضیائی طریق" سے آ سکتا ہے جو سوا سات سال سے ہمارے ملک میں چل رہا ہے۔ [2] اس کے لئے واحد راستہ انقلاب کا راستہ ہے۔ اب اس کے لئے بھی دلائل و شواہد چاہئیں۔ انتخابات میں بھی اسلامی نظام کے قیام کے لئے لوگوں نے حصہ لیا ہے اور آئندہ جب کبھی بھی انتخابات ہوں گے لوگ حصہ لیں گے اور نیک نیتی سے لیں گے کہ اس طریق سے اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں۔ انتخابات میں حصہ لینے والوں میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی اصل غرض حصولِ اقتدار ہو گی، لیکن یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو نہایت خلوص کے ساتھ اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی انتخابی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن مجھے قوی اور مستحکم دلائل کی بنیاد پر اس سے شدید اختلاف ہے۔ میرے نزدیک پاکستان میں اسلام اگر آ سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف انقلابی عمل کے ذریعے سے ہی آ سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر بات ہے کہ جب پاکستان کی غالب آبادی سُنّی ہے تو یہاں جو بھی

{۱} الحمد للہ کہ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی مفصل تصنیف "استحکام پاکستان" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

{۲} واضح رہے کہ یہ تقریر ۵/ اکتوبر ۸۴ء کو کی گئی تھی۔

انقلاب آئے گا اور اس کے نتیجہ میں یہاں جو بھی نظام قائم ہو گا وہ سُنّی تصورِ خلافتِ عامّہ پر مبنی ہو گا نہ کہ شیعی تصورِ امامتِ معصومہ پر ـــــ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان کو باہم دگر کسی طور پر بھی ملایا نہیں جا سکتا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ انقلاب اگر آئے گا تو خالصتاً اس نہج پر آئے گا کہ جس نہج پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے انقلاب بپا کیا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابو بکر صدیق ؓ کا یہ قول منقول ہے کہ : "لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی "اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اس طریق پر کہ جس پر اس کے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی تھی" ـــــ اس قول کے متعلق میرا تأثر اتنا یقینی ہے جتنا اس پر کہ کل سورج طلوع ہو گا۔ پھر یہ کہ اس کارگاہِ عالم کی زندگی کا آخری دور شروع ہو چکا ہے۔ حالات اس رخ پر جا رہے ہیں جن کی خبر نبی اکرم ﷺ نے دی تھی۔

پانچویں بات یہ کہ آخری دور میں اسلام کے عالمی غلبہ کی جو خبر الصّادق و المصدوق ﷺ نے دی تھی، اس کا بھی عمل یقیناً شروع ہو گا۔ البتہ یہ کہاں سے شروع ہو گا اور کس خطۂ ارضی کو یہ سعادت نصیب ہو گی! یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکّہ سے مایوس ہو کر نبی اکرم ﷺ نے اپنے طور پر طائف کا انتخاب فرمایا تھا لیکن طائف میں جو کچھ حضور ﷺ کے ساتھ ہوا، وہ سب کو معلوم ہے۔ یومِ طائف کو نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبّہ کا سخت ترین دن قرار دیا تھا۔ وہاں سے آپ کو ناکام واپس آنا پڑا ـــــ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا مدینہ منوّرہ کا۔ حضور ﷺ کے قدم مبارک وہاں پہنچے بھی نہیں کہ وہاں انقلاب آ گیا۔ تمہیداً چھ افراد حج کے موقع پر ایمان لائے۔ اگلے سال ان میں سے پانچ اور سات دوسرے افراد یعنی کل بارہ افراد حاضر خدمت ہو گئے۔ انہوںؓ نے نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ـــــ اسے کتبِ سیرتِ مطہّرہ میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے ـــــ اور درخواست کی کہ ہمیں اپنا کوئی جاں نثار شاگرد دیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائے اور یثرب میں (جو مدینہ منوّرہ کا پہلا نام ہے) دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ جاؤ۔ حضرت مصعبؓ کی ایک سال کی تعلیمِ قرآن اور دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں اگلے سال بہتّر (۷۲) مرد اور تین خواتین کُل پچھتّر (۷۵) افراد آ گئے اور نبی اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت ہو

گئی اور یہ بیعت ہجرت کی تمہید بن گئی۔ اسے بیعت عقبہ ثانیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان پچھتر انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔ اگر قریش یثرب پر حملہ آور ہوں گے تو ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل [illegible] کرتے ہیں۔ بعدہٗ جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں استقبال کی تیاریاں تھیں۔ کئی دن سے روزانہ لوگ شہر سے باہر آ کر آپ کی تشریف آوری کے منتظر رہتے تھے۔ یہاں مکّہ میں قریش خون کے پیاسے ہیں جہاں تیرہ برس حضور ﷺ نے بنفسِ نفیس دعوت دی۔ یہاں تو نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تین دن رات غارِ ثور میں روپوش رہنا پڑا ہے۔ پھر یہ کہ تعاقب ہو رہا ہے۔ سراقہ بن مالک جو بعد میں دولت ایمان سے بہرہ مند ہو گئے دو مرتبہ قریب پہنچ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر حفاظت فرمائی ہے۔ مکہ کا حال تو یہ ہے اور اہل مدینہ سراپا انتظار آپ کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں اور حضور ﷺ کا وہاں ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے داخلہ ہو رہا ہے۔

تو یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت میں ہوتا ہے کہ وہ کس جگہ کو سعادت عطا فرمائے، کون سے مقام کو چن لے۔ یہ اسی کا انتخاب ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور عالمی سطح پر دین حق کے غلبہ کا آغاز کس ملک سے ہو گا! لیکن یہ بات پورے یقین و وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آخری دور کے بارے میں جن واقعات و حالات کی خبریں احادیثِ صحیحہ میں دی گئی ہیں، وہ دور آ چکا ہے، اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ کسی نہ کسی خطۂ ارضی کو یہ سعادت حاصل ہو کر رہے گی کہ اسے اللہ تعالیٰ صحیح اسلامی انقلاب کے لئے منتخب فرمالے ـــــ اور یہ انقلاب بالکل اسی نہج پر آئے گا جس نہج پر برپا فرمایا تھا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے، بقول حضرت ابوبکر صدیقؓ : "لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" ـــــ تو یہ "آخر" والی بات شروع ہو چکی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں اسی نہج پر انقلاب آئے گا جو عالمی سطح پر غلبۂ دین کی تمہید بنے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پاکستان کا یہ خطّۂ ارضی، جو حقیقت کے اعتبار سے مملکتِ خداداد ہے، یہ ہمارے قوت بازو اور ہماری جدّوجہد کا نتیجہ نہیں ہے، اسے اللہ تعالیٰ اس سعادت کے لئے قبول فرمالے۔ بظاہر احوال تو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سامنے آتے ہیں، پھر امید بندھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی

قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ اس کی شانِ والا تبار یہ ہے: ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ اسے ہر شے پر قدرت حاصل ہے، وہ شر سے خیر بر آمد کرتا ہے جس کا کہیں سان گمان تک نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل اور قدرت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم معروضی طور پر (objectively) غور کریں اور سمجھیں کہ انقلاب کا "محمدی طریق" ہے کیا؟

بحث و تمحیص کے تین حصے

ایک بات تو بالکل آغاز ہی میں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے واقعات و حالات کے حوالوں اور references کے بغیر اصولی طور پر جان لینی چاہئے کہ انقلاب کسی بھی نوع کا ہو اس کے لئے چھ مراحل طے کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ بات سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعے سے حددرجہ واضح ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے دوران جو حالات و واقعات پیش آئے انہیں خاص سے عام کر کے یعنی generalize کر کے جو اصول و مبادی مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں انقلابی عمل کے مراحل و مدارج اور لوازم طے کئے جائیں گے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ اس مستنبط خاکے میں رنگ بھرنے کے لئے ہمیں سیرتِ مبارکہؐ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ کیا ہے؟

اور تیسری بات جو عملی اعتبار سے بہت ضروری ہے، یہ ہوگی کہ ہمارے حالات اور نبی اکرم ﷺ کے دورِ سعید کے حالات میں بہرحال چودہ سو برس سے کچھ زیادہ ہی مدّت کا فصل ہے۔ اس دوران حالات میں بہت کچھ تغیّر و تبدّل ہوا ہے اور انسان کے تمدنی و عمرانی تصورات میں بہت کچھ ارتقاء ہوا ہے۔ پھر ایک نمایاں ترین فرق یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا پورا انقلابی عمل ایک خالص مشرکانہ و کافرانہ ماحول میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا جبکہ ہمیں اسلامی انقلاب کے لئے جو کام کرنا ہے وہ مسلمانوں میں کرنا ہے، کافروں میں نہیں کرنا۔ لہٰذا ان حالات کی بنا پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ جو طریق کار ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملتا ہے آیا بعینہٖ وہی اختیار کرنا لازم ہے یا اس طریق کار میں ہمیں درپیش حالات کے فرق و تفاوت کی وجہ سے کہیں کہیں کچھ اجتہاد کرنا ہوگا!

یہ تیسری بات اہم ترین ہے، اس لئے کہ کوئی سلیم العقل شخص بھی بہرحال اس کی نفی

نہیں کر سکتا کہ ایک معاملہ ہے خالص مشرکوں اور کافروں میں کام شروع کرنے کا اور ایک معاملہ ہو گا ان لوگوں میں کام کرنے کا جو بہرحال اعتقاداً اور قانوناً مسلمان ہیں۔ وہ مدعی ہیں کہ ہم توحید کو بھی مانتے ہیں' رسالت کو بھی ختمِ نبوت و تکمیلِ رسالت کے عقیدہ کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ الغرض خود کو نبی اکرم ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں' چاہے ان کی عظیم اکثریت بے عمل ہو' سیرت و کردار کے اعتبار سے ان کی عظیم اکثریت اور غیر مسلموں کے مابین کوئی فرق نہ رہ جائے۔ لیکن یہ بڑا عظیم فرق ہے کہ بہرحال وہ مسلمان ہیں [۳] ـــــ لہٰذا ان حالات میں منہجِ انقلاب میں فرق و تفاوت ہو گا۔

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

موجودہ دور میں انسانی زندگی کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی ـــــ مذہب کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے اور اجتماعیت کے لئے بنیاد ہے سیکولرازم (Secularism) یعنی لادینیت ـــــ لامذہبیت نہیں۔ اس لئے کہ سیکولرازم مذہب کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسے صرف انفرادی زندگی میں محدود قرار دیتا ہے۔ اس انفرادی مذہبی زندگی کے بھی تین حصے ہیں۔ عقیدہ (Dogma)' عبادات (Rituals)' اور چند سماجی رسوم (Social Customs) ـــــ ادھر اجتماعی زندگی کے بھی تین حصے ہیں۔ معاشرتی نظام' معاشی نظام اور سیاسی نظام۔ گویا تین گوشے انفرادی زندگی کے اور تین گوشے اجتماعی زندگی کے ملا کر کل "چھ" گوشے ہو گئے۔ اسی طرح انقلابی عمل کو بھی چھ مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔

---

[۳] راقم کو اس موقع پر رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مغفور کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مولانا کانگریس میں شامل تھے اور لکھنؤ میں اس کے ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے تحریری سوال بھیجا "مولانا اسلام کے نقطۂ نظر سے آپ کی گاندھی جی کے متعلق کیا رائے ہے؟" مولانا نے کسی مداہنت و مصلحت کے بغیر دو ٹوک جواب دیا کہ "میں گاندھی جی کو سیاسی اعتبار سے ملک کا عظیم ترین لیڈر تسلیم کرتا ہوں لیکن اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کے مقابلہ میں ایک فاسق و فاجر کلمہ گو کو بھی افضل سمجھتا ہوں"۔ مولانا مرحوم کی یہ حق گوئی بہرحال رنگ لائی اور انہیں طرح طرح سے تنگ کیا گیا اور وہ کانگریس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ (مرتب)

۱) انقلابی نظریہ اور اس کی اشاعت

انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی انقلابی نظریہ' کوئی انقلابی فکر' کوئی انقلابی فلسفہ موجود ہو جس کی خوب نشر و اشاعت کی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ انقلاب کسی انقلابی نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز (Starting Point) یہ ہے کہ اس نظریہ کی نشر و اشاعت کی جائے' اسے پھیلایا جائے' اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اس نظریہ کی افادیت کا دلائل سے قائل بنایا جائے۔ اس میں اہم بات یہ ہے کہ انقلاب تب ہی آئے گا جب انقلابی نظریہ اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں میں سے کسی ایک سے لازماً متعلق ہو جن کا اوپر ذکر ہوا ـــــ اگر مذہبی اصلاح کا کام ہو رہا ہو' عقائد کی تصحیح ہو رہی ہو' عبادات کی ادائیگی کی ترغیب و تشویق ہو رہی ہو اور اس کے نتیجہ میں ان کی ترویج ہو رہی ہو تو یہ مذہبی کام ہیں یا بالفاظِ دیگر روحانیت اور اخلاقی اصلاح کے کام ہیں' لیکن انقلابی عمل کا آغاز تو کسی ایسے نظریہ کی بنیاد پر ہو گا جس کا تعلق انسان کی معاشرتی' معاشی اور سیاسی زندگی سے ہو۔ اس لئے کہ درحقیقت انقلاب کا محل' مقام اور میدان اجتماعی زندگی کا دائرہ ہے۔ للذا یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسا نظریہ' کوئی ایسا فلسفہ' کوئی ایسا فکر ہو جو انسان کی اجتماعی زندگی کے کسی گوشے کے بارے میں انقلابی تبدیلی کا علمبردار ہو اور وہاں جو نظام قائم ہے وہ اس کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ اسی سے انقلابی عمل کا آغاز ہو گا۔

۲) انقلابی جماعت کی تشکیل و تنظیم

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ یہ ہو گا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریہ کو ذہناً قبول کر لیں ان کو منظم کیا جائے۔ اس طرح ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لئے دو چیزیں لازمی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ اس کے Cadres' اس کی درجہ بندی بالکل نئی ہونی چاہئے۔ پرانے نظام کے تحت لوگوں کی جو درجہ بندی ہے اگر وہی درجہ بندی اس جماعت کے اندر بھی رہے تو پھر وہ انقلابی جماعت نہیں ہو گی۔ یہاں تو بالکل نئی درجہ بندی ہو گی کہ کون کس قدر گہری وابستگی (Commitment) اس انقلابی نظریہ سے رکھتا ہے! کس نے اس انقلابی نظریہ کے تقاضوں کو خود اپنے آپ پر لازم کیا ہے! اور کون اس انقلابی نظریہ کے لئے کتنی قربانی دے چکا ہے اور کتنی مزید دینے کو تیار ہے! جس نے جتنی پیش قدمی کی ہے اتنا ہی

آگے چلا جائے گا چاہے سابقہ نظام میں وہ شودروں اور اچھوتوں میں شمار ہوتا ہو اور سب سے گھٹیا اور پنچ سمجھا جاتا ہو، اس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ لیکن اگر اس نے اس انقلابی نظریہ کو خلوص و اخلاص اور گہرائی کے ساتھ قبول کیا ہے، اس کے ساتھ اس کی مکمل ذہنی اور عملی (Commitment) ہے، اس کے لئے وہ قربانیاں دے رہا ہے تو وہ توقیر و تکریم اور ذمہ داریوں کے اعتبار سے پیدائشی برہمنوں سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اگر یہ بات نہیں ہوگی تو وہ جماعت انقلابی جماعت نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ کہ اس پارٹی کا نظم (Discipline) اگر آرمی ڈسپلن نہ ہو تو یہ پارٹی انقلاب نہیں لا سکتی۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی ایسوسی ایشن، کوئی انجمن ٹائپ کی شے، کوئی چار آنے کی ممبری والی جماعت یا کوئی ایسی ہیئتِ اجتماعیہ انقلاب نہیں لا سکتی۔ ہر اجتماعی کام کی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اسی نوع کی انجمن یا ادارہ یا جماعت کی ضرورت ہے۔ کوئی اصلاحی کام کرنا ہے تو کوئی انجمن بنا لیجئے۔ کوئی تعلیمی کام کرنا ہے تو کوئی ادارہ قائم کر دیجئے۔ مذہبی دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے تو کوئی جمعیت بنا لیجئے۔ انتخابی سیاست کا کام کرنا ہے تو ممبری کی کوئی فیس مقرر کر کے بڑے پیمانے پر اپنے ہم خیال افراد کی ممبر سازی کر لیجئے ـــــ ایک سیاسی جماعت بنا لیجئے۔ لیکن اگر انقلاب لانا ہے تو اس کے لئے ایسی "پارٹی" درکار ہوگی جس کے ایک تو Cadres بالکل نئے ہوں اور دوسرے اس کا ڈسپلن مضبوط ہو کہ جو حکم ملے مانا جائے۔ یہ نہیں ہوگا تو انقلاب نہیں آ سکتا۔ اس لئے کہ ایک جمے ہوئے نظام کو اکھاڑ پھینکنا ہے۔ ایک مضبوط طاقت کے ساتھ ٹکراؤ کا مرحلہ آنا ہے۔ اس میں ڈھیلی ڈھالی انجمن ٹائپ ایسوسی ایشن کام نہیں دے سکتی۔

۳) ٹریننگ اور تربیت

انقلابی عمل میں تیسرا مرحلہ ٹریننگ یعنی تربیت کا ہے ـــــ جو ہر انقلابی عمل کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر انقلابی کارکنوں کی تربیت نہ ہو تو وہ خام ہیں، کچے ہیں۔ تربیت ہوگی تو وہ پختہ ہوں گے، بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

کچے اور خام لوگوں کو جمع کرلیں گے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگلے مرحلہ میں جا کر جواب دے جائیں گے۔ وہ خالی کارتوس ثابت ہوں گے اور ٹھس ہو کر رہ جائیں گے۔ یہاں ضرورت ہے کہ ہر کارکن پختہ ہو۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے انداز میں خوب بیان کیا ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

یہی وجہ ہے کہ ہر انقلابی پارٹی کے Training Camps ہوتے ہیں۔

تاہم یہ بات اہم ہے کہ یہ تربیت انقلاب کے نظریہ اور فکر کی مناسبت سے ہوگی۔ اگر انقلاب خالص مادی اقدار والا ہے تو ان کارکنوں کی روحانی تربیت کرنا بیکار ہے۔ لیکن اگر پیش نظر وہ انقلاب ہے اور اس نظام کا قیام ہے جس کے اہم ترین اَبعاد (Dimensions) اخلاقی اور روحانی ہیں تو تربیت میں ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ چیزیں انقلابی کارکنوں میں نہیں ہوں گی تو انقلاب کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں کہاں سے آجائیں گی؟

—— لہٰذا ایسے انقلاب کے کارکنوں کے لئے اخلاقی و روحانی تربیت بھی لازمی ہوگی بلکہ اس کو اقدمیت و اولیت کا درجہ حاصل ہوگا۔

پس یہ ابتدائی تین مرحلے ہیں۔ ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ تربیت یافتہ کارکنوں پر مشتمل ایک انقلابی جماعت وجود میں آجائے جو ایک طاقت اور ایک قوت بن جائے!!

انقلابی عمل کا جزوِ لاینفک : تصادم

انقلابی عمل کے اگلے تین مرحلوں کا جامع عنوان ہے "تصادم" —— لفظ تصادم اگرچہ ناپسندیدہ ہے، اچھا نہیں لگتا اور امن پسند لوگ اس سے ناگواری محسوس کریں گے لیکن یہ بات طے ہے کہ انقلاب تصادم کے بغیر نہیں آتا۔ ع "جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟" مذہبی اصلاح کا کام کرنا ہو تو کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف عام نوعیت کی روحانی تربیت گاہیں کھولنی ہوں اور خانقاہی نظام بنانا ہو تب بھی کسی تصادم کی ضرورت نہیں ہے، خانقاہ میں کوئی مربّی، کوئی شیخ بیٹھے ہیں، جو وہاں خود چل کر آئے گا اسے وہ اپنے تربیتی پروگرام میں شامل کرلیں گے، کوئی تصادم نہیں ہوگا۔ لیکن اگر نظام بدلنا مقصود و مطلوب ہو اور پھر تصادم سے بھی گریز ہو تو یہ ممکن نہیں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہے

جیسے دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی خواہش ہو ـــــ یہ خواہش اپنی جگہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن یہ محالِ مطلق ہے۔ تصادم تو انقلاب کے لوازم میں سے ہے۔

پھر یہ ایک بدیہی امر ہے کہ تصادم کا آغاز اصل میں انقلابی جماعت کرتی ہے۔ اس لئے کہ ایک جگہ ایک نظام قائم ہے۔ جیسا بھی ہے، وہ چل رہا ہے۔ اگر ظالمانہ، استبدادی اور [illegible] ہے تو مظلوم طبقات اس نظام کو برداشت اور تسلیم (Reconcile) کئے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ایک جماعت ابھرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ نظام غلط ہے، ہم اس کو بدل کر رہیں گے، تو در حقیقت تصادم کا آغاز اس جماعت نے کیا۔ اس نے اس نظام کو غلط قرار دے کر اس کو بدلنے کے عزم کا اظہار کیا جو وہاں ایک طویل عرصہ سے چلا آ رہا ہے، جس کے ساتھ لوگوں کی اقدار اور مفادات وابستہ ہیں، جو ان کے یہاں قابلِ احترام روایات کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ انقلابی جماعت کہتی ہے کہ یہ غلط نظام ہے۔ گویا کہ تصادم کا آغاز اصلاً انقلابی جماعت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے اس کے تین مدارج (Phases) ہیں۔

۴) تشدد و تعذیب کے جواب میں صبرِ محض

تصادم کے عمل میں پہلا درجہ Passive Resistance یعنی صبرِ محض کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انقلابی جماعت اس نظام کو غلط و فاسد قرار دیتی ہے تو لوگ اس جماعت کو آزاد تو نہیں چھوڑ دیں گے! پہلے وہ اس کے انقلابی فکر اور نظریہ کو چٹکیوں میں اڑائیں گے۔ استہزاء و تمسخر کریں گے، فقرے چست کریں گے، مذاق اڑائیں گے، کہیں گے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے، دیوانے اور مجنون ہیں۔ لیکن اگر اس انقلابی جماعت کا قائد اور اس کے معدودے چند ساتھی اس وار کو جھیل جاتے ہیں اور نظریہ کی نشر و اشاعت کا عمل جاری رہتا ہے اور لوگ اس کو قبول کر کے جماعت میں شامل ہو رہے ہیں تو مخالفین کو محسوس ہو گا کہ یہ ہوا کا کوئی معمولی جھونکا نہیں ہے، اس میں تو ایک زبردست آندھی اور طوفان کے آثار پوشیدہ ہیں، جو ہمارے تمام مفادات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائیں گے۔ لہٰذا اب وہ تشدد (Persecution) پر اتر آئیں گے اور عقوبت اور ایذا رسانی کی کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ یہ معاملہ پیش آنا لازمی ہے۔ لیکن اس دور کے لئے اس انقلابی جماعت کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ ماریں کھاؤ، لیکن نہ اپنے موقف سے ہٹو اور نہ ہی ہاتھ اٹھاؤ۔ اس لئے کہ اگر اس جماعت نے بھی retaliate کیا یعنی بدلہ میں اس نے بھی ہاتھ اٹھالیا اور وہ جماعت

بھی violent ہو گئی، تو جو جما جمایا نظام ہے اسے اس جماعت کو کچلنے اور نیست و نابود کرنے کا قانونی و اخلاقی جواز مل جائے گا۔ چنانچہ ان کو یہ جواز نہ دیا جائے۔ بے جواز ماریں اور پیٹیں، ایذا رسانی کرتے رہیں۔ لیکن ان کو یہ الزام لگانے کا موقع ہرگز نہیں ملنا چاہئے کہ یہ جماعت خود بھی متشدد ہے اور عوام الناس کو بھی تشدد اور بدامنی کے لئے ابھار رہی ہے۔

اس عدم تشدد کی پالیسی پر کاربند رہنے سے وہ لوگ ایذا رسانی اور مار پیٹ سے تو باز نہیں آئیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ اس معاشرہ کی خاموش اکثریت (Silent Majority) اس جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ قدرتی طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ہیجان پیدا کردے گا کہ آخر یہ لوگ کیوں پیٹے جارہے ہیں! ان کو ایذائیں کیوں دی جارہی ہیں! آخر ان کا جرم کیا ہے! کیا انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے یا کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے؟ ـــــ یہ اکثریت ہمیشہ خاموش (Silent) ہوتی ہے لیکن اندھی اور بہری تو نہیں ہوتی! وہ دیکھتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! اور اس کے قلوب و اذہان میں اس انقلابی جماعت کے لئے ہمدردی کے جذبات اور احساسات غیر محسوس طریق پر پروان چڑھتے رہتے ہیں ـــــ اور یہ چیز بھی درحقیقت اس انقلابی نظریہ اور فکر کے پھیلنے میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے لئے بڑا پیارا مصرع ہے کہ ؏ "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ" ـــــ اندر اندر دل تو مفتوح ہو رہے ہیں، چاہے زبانیں خاموش ہیں، لوگوں میں جرأت نہیں کہ وہ سامنے آجائیں۔ لیکن وہ انقلابی نظریہ اور فکر لوگوں کے ذہن و قلب میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کے علمبرداروں کے لئے دلوں میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۵) اقدام اور چیلنج

اس کے بعد جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم کھلم کھلا اور برملا اس غلط نظام کو چیلنج کر سکتے ہیں اور اس نظام کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو اس مرحلہ پر یہ صبرِ محض (Passive Resistance) اپنے اگلے مرحلے یعنی اقدام (Active Resistance) میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب حکمت عملی تبدیل ہو گی۔ یعنی یہ کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ ان کے تشدد کا جواب بھرپور طریقہ پر دو یا اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو ـــــ آگے چل کر ان تمام باتوں کی تشریح ہو جائے گی۔

۶) مسلح تصادم

اس چیلنج کے نتیجہ میں چھٹا اور آخری مرحلہ شروع ہوگا اور وہ ہے مسلح تصادم۔ جب تک وہ انقلابی جماعت اقدام نہیں کر رہی تھی یعنی ماریں کھا رہی تھی اور ہاتھ نہیں اٹھا رہی تھی تب تک اور بات تھی۔ اب اگر اس جماعت نے بھی ہاتھ اٹھالیا تو وہ نظام اس پر پوری طاقت اور قوت کے ساتھ حملہ آور ہوگا۔ اور یہ ہے وہ آخری مرحلہ (F.nal Phase) جس کے اندر جسمانی ٹکراؤ (Physical Collision) ہو کر رہتا ہے۔ اسی کے لئے اصطلاح ہے مسلح تصادم یعنی Armed Conflict۔

ظاہر بات ہے کہ جب یہ چھٹا مرحلہ شروع ہو جائے تو اب فریقین کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ اب تو تاریخ بتائے گی' حالات فیصلہ کریں گے اور دو میں سے ایک نتیجہ بہرحال نکلنا ہے اور وہ ہے تخت یا تختہ۔ تیسرا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر پہلے پانچ مراحل صحیح طور پر طے ہوئے ہیں' انقلابی عمل مستحکم ہوتے ہوئے اور consolidate کرتے ہوئے آگے بڑھا ہے' صحیح تربیت ہوئی ہے' صحیح تنظیم ہوئی ہے اور خاص طور پر یہ کہ پہلے پانچوں مراحل کو طے کرنے کا صحیح حق ادا کیا گیا ہے تو انقلابی جماعت کامیاب ہو جائے گی' انقلاب وقوع پذیر ہو جائے گا اور اس انقلابی نظریہ کے مطابق نظام یکسر تبدیل ہو جائے گا۔ ورنہ اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا۔

انقلابی عمل کے یہ چھ مراحل (Phases) ہیں' یعنی تین تین کے دو گروپ۔ پہلے تین مراحل کا حاصل ہے:

کسی انقلابی نظریہ' فکر' فلسفہ کو قبول کرنے والوں کا ایک تربیت یافتہ اور منظم جماعت کی شکل میں وجود میں آجانا۔

دوسرے حصہ کے بھی تین مراحل ہیں اور وہ ہیں:

صبرِ محض (Passive Resistance)' اقدام (Active Resistace) اور مسلح تصادم (Armed Conflict) —— اور اس کا نتیجہ تخت یا تختہ۔

انقلاب کی توسیع و تصدیر

اب اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایک ساتواں مرحلہ (Seventh Phase) مزید

شروع ہو گا۔ ان چھ مراحل سے تو کسی ایک ملک میں انقلاب کی تکمیل ہوتی ہے' جبکہ ساتواں مرحلہ اس انقلاب کی توسیع کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ایک نظریاتی انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جغرافیائی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ ایک فکر' ایک فلسفہ' ایک نظریہ کی بنیاد پر آتا ہے اور نظریہ وہ شے ہے جس کے لئے نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہے' نہ ویزا کی حاجت ہے۔ نظریہ کے لئے سرحدیں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ نظریہ تو امریکہ جیسے دور دراز ملک سے چلتا ہے اور پاکستان پہنچتا ہے۔ نظریہ کے بڑے مضبوط پر ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ اڑتا ہوا سرحدوں کے تمام موانعات (Barriers) کو عبور کرتا ہے۔ اگر اس نظریہ میں جان ہے تو وہ دوسرے ممالک میں اپنی جڑیں قائم کرے گا' جس کے نتیجہ میں انقلاب کی توسیع ہوگی اور وہ پھیلے گا۔ جیسے انقلاب فرانس' فرانس تک محدود نہیں رہا اور بالشویک یعنی اشتراکی انقلاب صرف روس تک محدود نہیں رہا۔ انقلاب کا یہ خاصہ ہے کہ پہلے کسی ایک ملک' کسی ایک علاقے (Territory) میں آتا ہے' وہاں اس کے ثمرات کا ظہور ہوتا ہے' پھر اس کی بین الاقوامی سطح پر توسیع کا عمل شروع ہوتا ہے۔

کامل انقلاب کی واحد مثال : انقلابِ محمدیؐ

انقلاب کے یہ سات مراحل (۳ + ۳ + ۱) میں نے سیرت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے اخذ کئے ہیں' اس کے سوا میرے نزدیک ان کا کوئی اور ماخذ نہیں ہے' کیونکہ کامل اور ہمہ گیر انقلاب کا منہاج اور نقشہ صرف سیرتِ محمدیؐ سے ہی مل سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کامل انقلاب (Total Revolution) صرف اور صرف حضرت محمدؐ عربی ﷺ نے برپا کیا ہے۔ باقی دنیا کے جو انقلابات مشہور ہیں وہ جزوی انقلاب تھے۔ فرانس کے انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا' معاشی نہیں بدلا' معاشرتی نہیں بدلا' روحانی و اخلاقی نہیں بدلا' عقائد نہیں بدلے۔ روسی انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ بدلا' سیاسی ڈھانچہ میں ایک جزوی تبدیلی یہ آئی کہ صرف ایک پارٹی ہی کے نمائندوں پر مشتمل حکومت کا نظام قائم ہوگیا ــــــ البتہ انسانی زندگی کے چھ کے چھ گوشوں یعنی عقائد' عبادات اور سماجی رسوم کے علاوہ معاشرتی نظام' معاشی و اقتصادی نظام اور سیاسی نظام کو تاریخ انسانی میں صرف ایک مرتبہ بدلا گیا ہے اور یہ بدلا ہے حضرت محمد ﷺ نے۔ پس تنے کامل' ہمہ گیر' ہمہ تن اور

Total Revolution کہا جائے تو وہ ہے ہی صرف ایک، اور وہ ہے صرف رسول آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب ـــــ حضور ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب میں ڈھونڈے سے بھی کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی جو یکسر تبدیل ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ کی جدّوجہد، سعی و کوشش، محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے نتیجہ میں لکھوکھا مربع میل زمین کے ایک ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں ایک ایسا انقلاب عظیم برپا ہو گیا کہ ان کی سوچ بدل گئی، ان کا فکر بدل گیا، ان کے عقائد بدل گئے، ان کی اقدار بدل گئیں، ان کے عزائم بدل گئے، ان کے مقاصد بدل گئے، ان کی آرزوئیں بدل گئیں، ان کی تمنّائیں بدل گئیں، ان کے دن بدل گئے، ان کی راتیں بدل گئیں، ان کی صبحیں بدل گئیں، ان کی شامیں بدل گئیں، ان کی زمین بدل گئی، ان کا آسمان بدل گیا۔ یہاں تک کہ اگر پہلے انہیں زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی۔ جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے۔ جو اُمّیِ محض تھے وہ متعدّد علوم و فنون کے موجد بن گئے۔ جو بے شمار ذمائم اخلاق میں مبتلا تھے وہ مکارمِ اخلاق کے معلّم و داعی بن گئے۔ جو زانی اور نفس پرست تھے، وہ عصمت و عفّت کے محافظ بن گئے۔ جو بے قید حصولِ معاش کے عادی اور اسراف و تبذیر کے خوگر تھے وہ مال و دولت کے امین بن گئے ـــــ یہ تھی گمبھیرتا، ہمہ گیری اور برکت اس انقلاب کی جو محمدِ عربی ﷺ نے برپا فرمایا۔

۔ پھر صرف یہی بات قابلِ ذکر نہیں ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی میں انقلابی عمل کی تکمیل دنیا میں صرف ایک بار ہی ہوئی ہے، بلکہ سب سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انقلابی عمل کے تمام کے تمام سات مراحل آپ کو ایک فردِ واحد کی زندگی میں نظر آ جائیں، یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی کوئی نظیر ہی نہیں سوائے خاتم النبیّین سیّد المرسلین جناب محمد ﷺ کے۔ ایک فردِ واحد ۶۱۰ء عیسوی میں ایک انقلابی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور ۶۳۰ء میں یعنی کل بیس برس میں عرب میں انقلاب تکمیل پا جاتا ہے۔ باقی دو سال اس انقلاب کی توسیع کے عمل میں گزرے ہیں ـــــ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد مختلف سربراہانِ مملکت کو دعوتی خطوط ارسال کئے گئے تھے اور سفارتیں بھیجی گئی تھیں۔ ۸ھ میں مکّہ فتح ہو گیا۔ اس کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں جنگِ مُوتہ ہوئی جس میں سلطنتِ روما جیسی وقت کی سپر طاقت کے ساتھ مسلح تصادم ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں خود نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں سفر

تبوک ہوا۔ اس موقع پر تیس ہزار جان نثار حضور ﷺ کے جلو میں تھے۔ قیصرِ روم ایک لاکھ سے بھی متجاوز کیل کانٹے سے لیس افواج کے ساتھ فلسطین اور شام کے سرحدی علاقوں میں موجود تھا۔ لیکن یہ بھی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے کہ اس کو نبی اکرم ﷺ کے مقابلہ میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی صرف یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ہرقل قیصرروم دل میں حضور ﷺ کو نبوت و رسالت کا قائل ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ کسی رسول سے ٹکراؤ کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لئے وہ دُوبدُو مقابلہ سے پہلو تہی کر گیا۔ ایمان اس لئے نہیں لایا کہ اس طرح اسے اپنی گدّی سے محروم ہونا پڑتا ـــــ پھر یہ کہ حضورؐ نے وفات سے چند دن قبل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی سربراہی میں شام کی ایک مہم کے لئے لشکر ترتیب فرمایا۔ وہ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ مرض نے شدت اختیار کی اور ربیع الاول ۱۱ھ میں نبی اکرم ﷺ نے "الرفیق الاَعلٰی" کی طرف مراجعت فرمائی۔

اندازہ کیجئے کہ اکیس بائیس برس کے لگ بھگ مختصر ترین عرصہ میں نبی اکرم ﷺ نے ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی انقلاب کی ازابتداء تا انتہاء بنفسِ نفیس تکمیل فرمادی، جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہ پہلے موجود تھی نہ تاقیامِ قیامت ملے گی۔ دنیا کے دوسرے دو انقلابات مشہور ہیں یعنی انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس۔ ایک طرف تو یہ انقلابات جزوی تھے اور دوسری طرف قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان انقلابات کا فکر دینے والے کوئی اور تھے اور انقلاب برپا کرنے والے اور ـــــ پھر انقلابی فکر پیش ہونے اور اس کے نتیجہ میں عملاً انقلاب بپا ہونے میں اچھا خاصا زمانی فصل ہے۔ انقلاب فرانس اس فکر کے نتیجہ میں رونما ہوا جو والٹیر اور روسو جیسے بے شمار مصنفوں کی کتابوں کے ذریعے کافی عرصہ تک پھیلتا رہا ـــــ اسی طرح انقلاب روس کی اساس کارل مارکس کی کتاب "داس کیپیٹل" پر قائم ہوئی لیکن خود مارکس کی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان تک پیدا نہ ہو سکا۔ مارکس جرمنی کا رہنے والا تھا لیکن انقلاب روس میں آیا اور اس کی موت کے قریباً پچاس سال بعد لینن جیسی فعال شخصیت کے ہاتھوں آیا۔ اور وہ بھی اس لئے کہ روس کے داخلی معاملات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ وہ بالشویک انقلاب کے لئے سازگار ہو گئے تھے۔ مگر اکیس بائیس برس کے لگ بھگ ایک مختصر سے عرصہ میں ایک عالم گیر انقلاب کی تکمیل جس

میں انقلاب کے جملہ مراحل کی تکمیل دنیا کی تاریخ میں صرف ایک بار ہوئی وہ حضرت محمد ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔ بعد میں رونما ہونے والے انقلابات میں اصل ... لی گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؂

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست!!
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یعنی نبی اکرم ﷺ کے سعید و مبارک دور کے بعد دنیا نے جو کچھ سیکھا ہے وہ حضورؐ سے ہی سیکھا ہے۔ یا پھر انسان ٹھوکریں کھا کھا کر چارو ناچار اسی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے کہ جس منزل پر پہنچایا تھا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ـــــ لہٰذا یاد رہے کہ انقلابی عمل کے مراحل کے استنباط کے لئے میرا ماخذ صرف اور صرف سیرت النبیؐ ہے۔

انقلابِ نبویؐ کا اساسی نظریہ : توحید

اب ہم سیرت النبیؐ کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہاں یہ چھ قدم کس ترتیب سے اٹھائے گئے۔ پہلا قدم ہوتا ہے ایک انقلابی نظریہ، فکر اور فلسفہ سے متعلق۔ انقلابِ محمدیؐ اور دوسرے انقلابات کے مابین اس اعتبار سے فرق کیا ہے؟ یہ کہ دنیا کے دونوں مشہور و معروف انقلابات کے لئے نظریہ، فکر اور فلسفہ انسانی ذہنوں کی پیداوار تھا، جبکہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو وہ نظریہ، فکر اور فلسفہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ پہلا عظیم ترین فرق تو یہ ہے کہ یہ نظریہ ہے "توحید"۔ کامل ترین اور خالص ترین توحید، جس کی بنیاد ہے قرآن حکیم۔ اس قرآن کے ذریعہ سے یہ انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے آنا شروع ہوا۔ اس حقیقت کو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں مولانا حالی نے بیان کیا ہے ؂

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اور نہایت پر شکوہ الفاظ میں بیان کیا علامہ اقبال نے ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

اور

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں وہم پیداست ایں زندہ و پائندہ و گویاست ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

انقلابی نظریۂ توحید کی بنیاد قرآن ہے ــــــ دعوت قرآن کی' تبلیغ قرآن کی' انذار قرآن سے' تبشیر قرآن سے' تذکیر قرآن سے' حتیٰ کہ تزکیہ یعنی تربیت بھی قرآن سے ــــــ حاصل کلام یہ کہ : نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا مرکز و محور اور منبع و سرچشمہ ہے قرآن مجید' فرقانِ حمید!!

دوسری بات ایک بہت اہم نکتہ ہے جسے لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ وہ یہ کہ حضور ﷺ کی دعوت کو جہاں تک "نظریہ" کہا جائے گا تو اس انقلابی نظریہ کے تین حصے شمار کئے جائیں گے : ۱۔ توحید ۲۔ رسالت ۳۔ معاد یا آخرت۔ ان میں سے جہاں تک "نظام" کا تعلق ہے وہ در حقیقت نظریۂ توحید پر ایمان لانے سے ہے۔ آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تربیت اور صحیح تعمیر کی بنیاد بنتا ہے۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ اصل میں اسی تربیتی مراحل کی چیزیں ہیں۔ اشخاص کی سیرت و کردار کو اس خاص سانچہ میں ڈھالنا کہ جس سانچہ کے ڈھلے ہوئے کارکنوں کے ذریعہ سے اسلامی انقلاب آ سکے' اس تربیت کا پروگرام ان چیزوں پر مشتمل ہے۔ دل میں چھپے ہوئے امراض اور روگوں کا مداوا اور علاج بھی قرآن اور اس تربیتی پروگرام ہی سے ہوتا ہے' جس کے لئے دینی اصطلاح تزکیہ ہے۔ الغرض ایمان بالآخرت انسان کے جذبۂ عمل کو متحرک (motivate) کرنے کا نہایت مؤثر عامل ہے ــــــ جبکہ رسالت پر ایمان کا تعلق قانون سے ہے۔ حضور ﷺ کو دل و جان سے رسول تسلیم کرنے اور آپ

کی دی ہوئی تمام خبروں کی تصدیق کا نام ہی دراصل ایمان ہے۔ اس کے بغیر ہم نہ توحید کو صحیح معنوں میں جان سکتے ہیں، نہ آخرت کو مان سکتے ہیں، اور نہ ہی اعمالِ صالحہ اور افعالِ سیئہ کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ یہی مطلب و مفہوم اور مقصود ہے نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ))

"تم میں سے کوئی شخص مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

نظریۂ توحید کے متضمنات

جناب محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انقلابی نظریہ یا دعوت لے کر تشریف لائے وہ درحقیقت توحید ہے۔ لہٰذا اس انقلابی فکر اور فلسفہ کے متضمنات (corollaries) اس کے مضمرات، اس کے مقتضیات، اس کے بدیہی نتائج و عواقب کو سمجھنا ضروری ہے جس کے بغیر توحیدِ کامل اور توحیدِ خالص کے انقلابی پہلو کا صحیح ادراک و شعور مشکل ہے۔ اس پہلو سے تین چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت

توحید کے متضمنات میں سب سے پہلی چیز حاکمیت انسانی کی کُلّی نفی ہے۔ یہ سب سے بڑا، سب سے عظیم انقلابی نظریہ ہے جس تک انسان کا اپنا ذہن رسائی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا علم صرف وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی سے حاصل ہونا ممکن ہے۔ اس بات کو پہلے بھی مشرکین نے مانا ہے اور آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کی تکوینی حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔ لیکن توحید کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں تشریعی حاکمیتِ مطلقہ بھی صرف اللہ کے لئے ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ــــ اور اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ــــ اور تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ ــــ اور لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ــــ گویا ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اس نظریہ کو نہایت شدّ و مد اور محکم دلائل و براہین کے ساتھ قرآن مجید ہی نے پیش کیا ہے۔
یہ موضوع اگرچہ تفصیل کا متقاضی ہے، لیکن یہاں چند اشارات ہی پر اکتفا کریں گے۔
غور کیجئے کہ فرانس کے انقلاب نے کیا کیا تھا۔ صرف ایک ہی چیز میں تبدیلی کی تھی کہ حاکمیت کسی خاندان یا فرد کی نہیں ہے بلکہ عوام کی ہے ـــــ گویا حاکمیت ایک خاندان یا فرد کے ہاتھ سے لے کر جمہور کو دے دی گئی۔ صرف یہی تبدیلی رونما ہوئی، اور تو کوئی نہیں۔ اس انقلاب کا لبِ لباب یہی ہے کہ : "حاکمیت (Sovereignty) کسی مخصوص فرد یا کسی شاہی خاندان کے ساتھ متعلق نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت حاکمیت کا تعلق عوام کے ساتھ ہے"
یہی نظریہ ہے جمہوریت کا۔ سارا جھگڑا اور سارا فساد اسی کا ہے کہ حاکمیت کس کی! اختیار کس کا!! قانون بنانے اور دینے کا مجاز کون!!! یہ ہے اصل میں سارے پھڈے کی گانٹھ۔ اور یہ انقلاب کہ حاکمیت کو افراد اور خاندانوں سے نکال کر عوام میں لے آنا تو اس کے لئے کتنا خون دینا پڑا ہے۔ فرانس کا انقلاب بڑا ہی خونیں انقلاب تھا۔ شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا کوئی آسان کام ہے؟ جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں Divine Rights of the King کا سکہ جاری تھا۔ یعنی بادشاہوں کو تو خدائی اختیار حاصل ہیں، انہیں کون چیلنج کر سکتا ہے! دنیا میں عام طور پر بادشاہوں کے لئے یہی تصور دیا گیا، جیسے ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان تھے اور مصر میں فرعون تھا۔ راع یعنی سورج کو مصری بھی اپنا سب سے بڑا دیوتا مانتے تھے۔ تو ان خاندانوں کا تعلق نام نہاد دیوتاؤں اور دیویوں سے جوڑا گیا اور ان کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ ان کو چھیڑا نہیں جا سکتا، حکومت کرنا ان کا حق ہے اور ان کی بے چون و چرا اطاعت کرنا اور ان کو خراج ادا کرتے چلے جانا عوام کا فرض ہے۔ یہ فلسفے مذہبی سطح پر چلائے گئے۔ نام نہاد مذہب نے ہمیشہ اس تصور کو تحفظ دیا ہے، اس لئے کہ پنڈتوں، پوپ، پجاریوں، پروہتوں، پادریوں اور Priests کے مفادات اسی مشرکانہ تصور سے وابستہ رہے۔ دیوی و دیوتا کے نام سے جو بڑے مندر اور ہیکل تعمیر کئے جاتے رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم صدیقہ کے نام پر جو بڑے بڑے کلیسا، گرجے اور چرچ بنائے جاتے رہے ان پر عوام الناس جو چڑھاوے چڑھاتے رہے ہیں وہ کہاں جاتے رہے! کیا ان بتوں اور مجسموں کے پیٹوں میں؟ نہیں، وہ سب ان لوگوں کے پیٹ میں جاتے رہے ہیں جن کے القاب "پ" سے شروع ہوتے ہیں اور جو میں نے ابھی آپ کو گنوائے

ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک پ (پیر) کا اور اضافہ کرلیں جو ہمارے یہاں رائج ہے جن کی اکثریت نے اسے پیشہ بنا رکھا ہے اور اس نے حاکمیتِ مطلقہ کے بجائے شفاعتِ باطلہ کا تصور جہلاء کے ذہنوں میں بٹھا کر اولیاء اللہ کے مقابر کو استھانوں کا درجہ دے رکھا ہے اور اس طرح آمدنی کا ذریعہ پیدا کر رکھا ہے۔ بقولِ شاعر ع "مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج!"

بہرحال سارا جھگڑا حاکمیت کا ہے کہ حاکم و مختارِ مطلق کون ہے؟ اب آپ سوچئے کہ انسانی سطح پر حاکمیت کی تبدیلی یعنی ایک فرد یا ایک خاندان کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت لانے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے' تو یہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو برپا فرمایا جنابِ محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے' جسے یوں تعبیر کیا علامہ اقبال نے کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

یہ عظیم ترین انقلابی نظریہ ہے : اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ۔ اس کے سوا کوئی حاکمِ مطلق نہیں ہے۔ نہ کوئی فرد' نہ کوئی خاندان' نہ کوئی قوم' نہ پوری نوعِ انسانی۔ انسان کے لئے حاکمیت کی نفیٔ مطلق ہے۔ انسان کے لئے تو خلافت ہے۔ اور وہ بھی عوامی خلافت —— یعنی خلیفہ بھی آسمان سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ عوام میں سے منتخب ہوتا ہے۔ اہلِ سُنّت اور اہلِ تشیّع کے تصورِ خلافت و امامت میں اساسی و بنیادی فرق و اختلاف یہی ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک امامت صرف ایک خاندان کا حق ہے اور ان کے نزدیک امام مامور من اللہ ہوتا ہے' لہٰذا مطاعِ مطلق بھی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطاء بھی۔ ہمارا تصور و عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مامور من اللہ ہونا اور معصومیت خاصّۂ نبوت و رسالت ہیں۔ جناب محمد ﷺ پر نبوت ختم ہوئی اور رسالت کی تکمیل ہو گئی۔ لہٰذا معصومیت بھی ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو گئی۔ کوئی خلیفہ یا امام مامور من اللہ نہیں ہے۔ کوئی معصوم نہیں ہے اور نہ تاقیامِ قیامت ہو سکتا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق مسلمانوں کے لئے خلافت ہے' خلافتِ عامّہ —— یعنی عوام الناس اپنی رائے سے جس کو چاہیں خلیفہ چن لیں۔ گویا کہ وہ اپنے حقِ خلافت کو تفویض (delegate) کر رہے ہیں ایک شخص کو کہ وہ ان کا سربراہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے لئے اصطلاح استعمال کی تھی "خلیفۂ رسولِ اللہ" اور عام طور پر زباں زد ہوئی اصطلاح خلیفۃ المسلمین —— خلافتِ راشدہ درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ تھی دورِ

نبوت کا ـــــ وہ مشن جو حضور ﷺ کو دیا گیا تھا: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ' اس کی توسیع اور عالمی سطح پر اس کی تکمیل کے لئے دراصل یہ خلافت کا نظام قائم کیا گیا تھا کہ ایک ملک میں اللہ کے دین کو بنفسِ نفیس نبی اکرم ﷺ نے غالب اور قائم فرمادیا اور پھر پورے کرۂ ارض پر اسے غالب کرنے کا کام امت کے حوالے فرمادیا ـــــ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ مشن دے کر حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔ لہٰذا یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ اسی لئے صدیق اکبر ؓ پہلے خلیفہ راشد نے اپنے لئے "خلیفۃُ رسولِ اللہ" کا لفظ اختیار کیا۔ لیکن آئندہ مستقل طور پر اسلامی خلافت کا سربراہ خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کہلائے گا۔ یعنی اصل میں تو تمام مسلمان خلافت کے اہل اور حامل ہیں' لیکن وہ جب اپنی رائے سے کسی کو خلافت کی ذمہ داری تفویض کریں گے تو وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہوگا۔ یہ ہے نظریۂ توحید کا سب سے پہلا انقلابی تصور' جس کا تعلق سیاسی ڈھانچے سے ہے۔

ملکیت کی بجائے امانت

اسی نظریۂ توحید کا بدیہی نتیجہ' جسے اس دور میں پوری طرح کھول کر بیان کرنے اور واضح کرنے کی ضرورت ہے' وہ انسان کی ملکیتِ مطلقہ کی نفی کامل ہے۔ جیسے کوئی حاکمِ مطلق نہیں ویسے ہی کوئی مالکِ مطلق نہیں۔ حاکمِ حقیقی بھی اللہ ہے اور مالکِ حقیقی بھی اللہ ہے ـــــ قرآن مجید میں جس طور پر مختلف اسالیب سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا اثبات فرمایا گیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ملکیتِ مطلقہ کا بھی مختلف اسالیب سے اثبات کیا گیا ہے۔ "لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" اور "لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ" کے الفاظ اللہ کی اسی ملکیتِ مطلقہ کے اظہار کے لئے قرآن مجید میں متعدد بار آئے ہیں۔ یہاں "لِلَّهِ" اور "لَهُ" میں حرفِ جار لام کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ لامِ تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی ـــــ پھر سورۂ آل عمران میں: "وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" اور سورۂ منافقون میں: "وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" فرما کر مسئلہ کو بالکل واضح اور منقح کر دیا گیا کہ جس طرح حاکمِ حقیقی صرف اللہ ہے اسی طرح کائنات کی ہر شے کا مالکِ حقیقی بھی صرف اللہ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کو بڑے دل نشین اسلوب سے ادا کیا ہے

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خداست

اسی مفہوم کو علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں ؂

بندۂ مومن امیں' حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

حاصل کلام یہ ہوا کہ جیسے حاکمیت کے باب میں حاکمیت کے بجائے خلافت ہے' ویسے ہی ملکیت کے ضمن میں ملکیت کے بجائے امانت ہے۔ جو کچھ انسان کے پاس ہے اس کے حصول پر بھی قدغنیں ہوں گی۔ ناجائز طریقہ سے حاصل کرے گا تو ضبط کر لیا جائے گا اور تادیب کا سزاوار ٹھہرے گا لیکن انسان جائز طریقہ سے جو کچھ حاصل کرے گا تو وہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اس میں تصرف بھی صرف جائز طریقہ سے کیا جا سکے گا' ناجائز طریقہ سے تصرف ہو گا تو تصرف کا اختیار بھی ساقط ہو جائے گا ـــــــ یہ بھی بہت بڑا انقلابی نظریہ ہے۔ ایک وہ تصور ہے کہ ذاتی ملکیت کا حق بڑا مقدس ہے۔ میری شے ہے' میں جس طرح چاہوں استعمال کروں' میرا اختیار مطلق ہے' میں جو چاہوں کروں۔ ملکیت کا مطلب تو یہی ہے کہ میری بکری ہے' میں جب چاہوں ذبح کر دوں' تم کون ہو پوچھنے والے؟ میرا پیسہ ہے' میں جس طرح چاہوں اسے invest کروں' میں نے شراب خانہ کھولا ہے' میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا' جو آ کر پینا چاہے پئے' نہ پینا چاہے نہ پئے۔ میں نے کسی پر جبر نہیں کیا' میں بھی آزاد ہوں' وہ بھی آزاد ہے۔ میں نے قمار خانہ' قحبہ خانہ' نائٹ کلب اور انہی قبیل کے کاموں میں اپنا سرمایہ لگایا ہے' کوئی ان میں دلچسپی لے یا نہ لے' میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ لیکن یہ تصور اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں امانت کا تصور ہے۔ امانت کے مالک نے جس حد تک اور جن پابندیوں کے ساتھ تصرف کا حق دیا ہے' اس حد تک تصرف کر سکتے ہو۔ اس سے تجاوز کرو گے تو مجرم شمار ہو گے۔ غور کیجئے کہ معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔ بقول علامہ اقبال ؂

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اس عقیدۂ توحید کا جو تیسرا انقلابی پہلو ہے اس کو بیان کرنے سے قبل چند اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ اس توحید کا ایک اعتقادی پہلو ہے۔ یعنی کسی کی عبادت اور پرستش نہ ہو سوائے اللہ کے : لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ۔ کسی کو رکوع و سجدہ نہ کیا جائے سوائے اللہ کے۔ کسی سے دعا نہ کی جائے سوائے اللہ کے : لَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝ اس کا کوئی نِد، اس کی کوئی ضد، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کا کوئی کفو، اس کا کوئی ہم سر نہیں : فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا ـــــ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝ اس کے سوا کوئی حاجت روا، دستگیر اور پشت پناہ نہیں ہے : اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا۝ نذر و نیاز، قربانی الغرض کوئی بھی تعبّدی عمل اس کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے : اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ تمام امور یقیناً عقیدۂ توحید کے مظاہر اور اس کے لوازم ہیں ـــــ ان میں ذرا سی اونچ نیچ اور کمی بیشی ہوئی تو توحید ختم ہوئی اور شرک لازم ہو گیا۔ پھر تو معاملہ وہ ہو جائے گا جس کی طرف سورۂ یوسف کی اس آیت مبارکہ میں توجہ دلائی گئی ہے : وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۝ ـــــ الغرض توحید کا پوری انسانی زندگی پر محیط ہونا ایمان کا لازمی تقاضا ہے ـــــ توحید کی چھاپ تو پوری زندگی پر ہونی لابدّ منہ ہے ـــــ لیکن اِس وقت کی اور اس دور کی شدید ضرورت ہے کہ عقیدۂ توحید نے اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں یعنی معاشرتی، معاشی اور سیاسی گوشوں میں جو عظیم انقلاب برپا کیا ہے اسے نہایت وسیع پیمانے پر محکم دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ سے موجودہ باطل اور مادّہ پرستانہ تمام نظریات اور نظام ہائے زندگی کا ابطال اور اسلام کی حقانیت کا احقاق ہو سکے گا۔

کامل معاشرتی مساوات

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیارات (Divine Rights) کا مدّعی رہا ہے اور جہاں انسان ملکیتِ مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم ہے۔ جبکہ توحید کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں، کوئی اعلیٰ نہیں، کوئی ادنیٰ نہیں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم، یہ رنگ و نسل کی بنیاد پر افتخار انسان کے اپنے

ذہن کے تراشے ہوئے فلسفے ہیں ـــــ یہ انسان کے تنگ ذہن اور قلب کے تراشیدہ اصنام ہیں۔ معاشرتی سطح پر توحید کا انقلابی تصور یہ ہے :

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ﴾

"اے نوعِ انسانی! تقویٰ اختیار کرو اپنے اس مالک اور پروردگار کا جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا' پھر اس (ایک جان) سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے (دنیا میں) کثیر تعداد میں مرد و عورت کو پھیلا دیا"۔

یعنی پوری نوعِ انسانی ایک ہی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد ہے ـــــ بدقسمتی سے توحید کے ماننے والوں میں بھی مرورِ زمانہ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اونچ نیچ کی تقسیم آ گئی ہے۔ چنانچہ سید زادہ' وہ چاہے واقعی سید زادہ ہو یا بنا ہوا سید ہو' وہ چاہے زانی اور شرابی ہو' اس کے گھٹنے کو احترام کے ساتھ ہاتھ لگایا جائے گا۔ یہی صورت حال' یہی تقسیم وڈیروں' زمینداروں اور ان کے مزارعین اور پیروں اور ان کے مریدوں کے مابین دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ سب کہاں سے آیا؟ ایک طرف نسلی امتیاز کی نفی اور دوسری طرف نسل پرستی کا یہ عالم! ـــــ اگر کامل سماجی مساوات نہیں ہے تو کسی درجہ میں وہ معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سب ہی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟؟

یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں موجبِ فساد بھی ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ اس لئے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ تو کون اونچا اور کون نیچا! کون اعلیٰ اور کون ادنیٰ! نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلانِ عام فرما دیا :

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ ' اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ ' وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى اَعْجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى))

(مسند احمد)

"اے لوگو! آگاہ رہو کہ تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ آگاہ رہو کہ نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر ـــــ نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پر۔ بنائے فضیلت کوئی ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے"۔

فضیلت اگر کوئی ہے تو وہ خدا ترسی اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور وہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ تمام انسان اس دنیا میں کامل سماجی مساوات رکھتے ہیں۔

غور کیجئے کہ اس سماجی و معاشرتی مساوات کا تعلق بھی توحید ہی سے ہے۔ چونکہ تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لہٰذا سب برابر ہو گئے۔ کوئی چھوٹا خدا کسی ایک کا پیدا کرنے والا ہوتا اور کوئی بڑا خدا کسی دوسرے کا پیدا کرنے والا ہوتا تو اونچ نیچ ہو جاتی۔ یا جیسے ہندوؤں میں اونچ نیچ کا یہ تصور ہے کہ برہمن تو ایشور کے سر سے پیدا ہوا ہے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک ایشور ہی میں یہ تقسیم کر دی۔ توحید یہ ہے کہ ایک ہی اللہ سب کا پیدا کرنے والا ہے اور سب انسان ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں :

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝﴾ (سورۃ الحجرات : ۱۳)

"لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے (جدا جدا) خاندان، قبیلے (اور قومیں) بنائیں تو باہم شناخت اور تعارف کے لئے (نہ کہ فخر و تکبر کے لئے) بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت دار تو اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور باخبر ہے۔"

الغرض اسلام کا انقلابی نظریہ ہے توحید ـــــ اس کی دعوت پر مشتمل ہے قرآن مجید۔ لہٰذا دعوت، تبلیغ، تذکیر، انذار اور تربیت و تزکیہ، یہ سب کام ہوں گے بذریعہ قرآن ـــــ ان تمام کاموں کے لئے "انذارِ آخرت" نہایت اہم ہے۔ لیکن یہ انذارِ آخرت در اصل انسان کی انفرادی اعلیٰ سیرت کی تعمیر کے لئے بنیادی پتھر ہے، جس پر ایک بندۂ مومن کا کردار اور سیرت پروان چڑھے گی۔ آخرت پر یقین، محاسبہ پر یقین، جزا و سزا پر یقین کے بغیر اس سیرت

کی تعمیر محال ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے ـــــ اس تعمیرِ سیرت کے پروگرام کی تقویت کے لئے ذرائع کے طور پر نماز ہے' روزہ ہے' حج اور زکوٰۃ ہے' دوامِ ذکرِ الٰہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ یہ تمام چیزیں در حقیقت انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے ہیں ـــــ البتہ انقلابی نظریۂ عقیدۂ توحید کی یہ تین Corollaries یعنی تین لوازم اور نتائج ہیں۔ (۱) معاشرتی و سماجی سطح پر کامل مساوات۔ (۲) معاشی سطح پر ملکیتِ مطلقہ کے تصور کا خاتمہ اور اس کے بجائے امانت کا تصور اور (۳) سیاسی سطح پر' جو اہم ترین ہے' حاکمیتِ مطلقہ نہ کسی ایک فرد کی ہے' نہ کسی مخصوص خاندان کی ہے' نہ قوم کی ہے' نہ عوام کی ہے اور نہ پوری نوعِ انسانی کی ہے' بلکہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ؂

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

پس اسلامی انقلاب کے لئے اصل میں ان چیزوں کو emphasize کرنا ہو گا۔ ان کی اہمیت کو واضح' نمایاں اور اجاگر کرنا ہو گا۔ اگر ان کو نظر انداز کر کے زور ہو جائے محض نماز اور روزے وغیرہ پر تو در حقیقت انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہو گا۔ کچھ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا کام ہو جائے گا' کچھ لوگ اچھے مسلمان بن جائیں گے' اور ایسے دوسرے کچھ اچھے کام ہو جائیں گے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن انقلابی عمل کا آغاز ہی نہیں ہو سکے گا۔

(جاری ہے)

مولانا منظور احمد نعمانیؒ

قربِ الٰہی کے دو راستے

قربِ الٰہی کے دو مراتب کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا وہ جامع خطاب جو کتابی صورت میں بھی دستیاب ہے' قارئین کی نظر سے گزرا ہو گا۔ اسی موضوع پر مولانا منظور نعمانیؒ کا زیرِ نظر مضمون ہمارے نزدیک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے نہایت عالمانہ انداز میں "تقرب بالفرائض" یعنی نفلی عبادات میں انہماک کی بجائے فرائض پر کاربند رہتے ہوئے غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد میں اشتغال و انہماک کی فضیلت کو جس طرح نقلی اور عقلی دلائل سے واضح کیا ہے' وہ انہی کا حصہ ہے۔ مولانا کی یہ تحریر جہاں ان کے علم و فضل کا ایک روشن ثبوت ہے وہاں ہمارے ان قدامت پسندوں کو بھی لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے جنکی تمام تر سرگرمیاں خانقاہوں یا مدارس تک محدود ہیں اور وہ غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد سے یکسر لاتعلق ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے' آمین۔ (ادارہ)

اہل ایمان کے لئے تقرب الی اللہ اور دینی و روحانی ترقی کے دو طریقے اور دو راستے ہیں جو ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں اور بندگانِ خدا ہر زمانہ میں کم و بیش ان ہی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچتے رہے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی ہی اصلاح و ترقی اور اپنے ہی نفس کے تزکیہ و تحلیہ میں زیادہ سے زیادہ ساعی رہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے اپنے نفس کی حفاظت کا بیش از بیش اہتمام کرتے ہوئے جس قدر بھی ممکن ہو نفلی عبادات و قربات روزہ و نماز اور ذکر و فکر وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ مشغول رہے۔ بعض ائمہ محققین کی اصطلاح کے مطابق اس طریقہ کو "قرب بالنوافل" کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی اور معصیات و مکروہات سے پرہیزگاری کا اہتمام کرتے ہوئے اور اوقات میں گنجائش کے مطابق نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں بھی خاص اشتغال رکھتے ہوئے اپنا زیادہ وقت اخلاص نیت کے ساتھ (یعنی محض رضاء الٰہی اور اجر اخروی کو مطمح نظر بنا کر) دوسرے بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت' تعلیم و تربیت اور تبلیغ و نصیحت جیسے کاموں میں اور اعلاء کلمۃ الحق و احیاء شریعت کی کوششوں میں

صرف کیا جائے۔

اس طریقہ کو "قرب بالفرائض" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اگرچہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سالکینِ راہ رضا اور طالبینِ قربِ مولیٰ کیلئے یہی عام شاہراہ تھی۔ لیکن بعد کے زمانوں میں کچھ خاص اسباب کی وجہ سے اس راہ پر چلنے والوں کی کثرت نہیں رہی بلکہ معاملہ معکوس ہو گیا۔ یعنی اہل سلوک کے مختلف حلقوں میں زیادہ تر پہلے ہی طریقہ کو اختیار کیا گیا اور اس سے بھی بڑا اور افسوسناک ذہنی تغیر یہ ہوا کہ بہت سے خانقاہی دائروں میں سلوک الی اللہ اور تقربِ خداوندی کو صرف اسی پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) ہی میں منحصر بھی سمجھا جانے لگا۔ اور ان لوگوں کے خیال میں روحانی و دینی کمال صرف قرب بالنوافل ہی کا نام رہ گیا۔

مختلف زمانوں میں مصلحین و مجددین نے اس غلط خیالی کو محسوس کر کے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں لیکن پھر بھی بہت سے خاص و عام حلقوں میں یہ غلط فہمی اب تک چلی آ رہی ہے...... [1] جس کا افسوسناک اور نہایت مضرت رساں نتیجہ یہ ہے کہ امت کی عمومی تعلیم و تربیت، اصلاح و دعوت اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کا وہ اہم بنیادی کام جو دینی نظام کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی ہے اور دین کی سرسبزی و شادابی جس پر موقوف ہے اور بلاشبہ جس کا اجر اور درجہ بھی اللہ کے نزدیک صرف نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔ آج ان عام و خاص حلقوں میں وہ ایک ثانوی قسم کا اور معمولی درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور دینی و روحانی ترقی کے طالب اور قربِ خداوندی کے جویا اپنے اس سفر میں اور اس مقصد کے لئے اس راہ سے چلنے اور اپنے اوقات اور اپنی ہمتوں کو اس رخ پر لگانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے جس کی وجہ سے یہ میدان اصحابِ ہمت و عزیمت سے خالی اور یہ بازار سرد پڑا ہوا ہے حالانکہ "شہسواروں" کی تگ و تاز کیلئے اصل جولانگاہ اور "شاہبازوں" کی پرواز کے لئے اصل فضا یہی تھی۔

یہ کیوں ہے؟ اور یہ عام و خاص حلقے اس غلط فہمی اور غلط عملی میں کیوں مبتلا ہوئے اور کیوں اب تک مبتلا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال اور اس کا جواب آج کے ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم اصل

---

[1] گزشتہ صدیوں میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اور ان کے بعد ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امیر المومنین سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے اس غلطی کی اصلاح کی طرف خاص اور مستقل توجہ فرمائی، جیسا کہ "مکتوبات امام ربانی" اور "صراط مستقیم" کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔

مدعا کو سلجھانے کی خاطر اس بارہ میں اتنا عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک عوام الناس کی غلط فہمی کا تعلق ہے سو اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ پہلے طریقہ (قرب بالنوافل) میں چونکہ سالک عوام کی دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہمہ تن عبادات اور ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے اور مشاغل دنیوی میں پھنسے ہوئے عوام اس طرز زندگی کو بے حد مشکل اور انتہائی درجہ کا غیر معمولی کام سمجھتے ہیں اور اس طرح کی مشکل اور غیر معمولی باتوں ہی سے متاثر ہونا اور ان کی خاص اہمیت و وقعت سمجھنا چونکہ عام انسانوں کا مزاج ہے اس لئے یہ بے چارے اسی طریق کو قربِ الٰہی اور خدارسی کا خاص الخاص راستہ سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس طریق پر چلنے والوں سے خوارق و کشوف وغیرہ کا ظہور بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے بھی خیال عام اسی طریق کو خدارسی کا خاص راستہ اور اسی طرزِ زندگی کو سب سے بڑا دینی و روحانی کمال سمجھتا ہے۔

رہے اس خیال کے خواص یعنی خود اہلِ سلوک کے وہ حلقے جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور سلوک الی اللہ کو اسی طریق میں منحصر سمجھتے ہیں۔ سو اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ جن میں سے ایک عمومی اور اس جگہ قابلِ ذکر وجہ یہ بھی ہے کہ اس طریق (قرب بالنوافل) میں یکسوئی کے ساتھ کثرتِ ذکر و فکر سے سالک کے باطن میں ایک گونہ لطافت و نورانیت اور ملاءِ اعلیٰ سے ایک طرح کی خاص مناسبت و موانست پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے اندر کچھ آثار و انوار محسوس کرنے لگتا ہے اور بسا اوقات خاص "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے۔ اور دوسرے طریقہ (قرب بالفرائض) میں چونکہ عوام کے ساتھ بھی اختلاط رہتا ہے اور احوال و کیفیات کا ورود اس میں اس طرح سے عموماً نہیں ہوتا۔ یا بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال پہلے ہی طریقہ کے ساتھ بہت سے اہلِ سلوک کی خصوصی دلچسپی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے۔

حالانکہ یہ "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" اس فن کے اکابر و ائمہ کے نزدیک کوئی خاص مقصدی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان کا درجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مبتدیانِ راہِ سلوک کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ شوق و طلب برابر ترقی پذیر رہے اور سعی وجہد کا قدم آگے بڑھتا رہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مشہور خلیفہ ملا یار محمد بدخشی کو ایک مکتوب میں انہی "مشاہدات و تجلیات" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

شیخ اجل امام ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی فرمودہ اند تلک خیالات
تربی بہا اطفال الطریقہ

"شیخ اجل امام ربانی حضرت خواجہ یوسف ہمدانی نے فرمایا ہے کہ یہ خیالی چیزیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔"

اور ایک دوسرے مکتوب میں جو ملا حاجی محمد لاہوری کے نام ہے ارقام فرماتے ہیں:
احوال و مواجید و علوم و معارف کہ صوفیہ را در اثنائے راہ دست میدہند نہ از مقاصد اند بل اوہام و خیالات تربی بہا اطفال الطریقۃ[1]

(مکتوب نمبر ۳۶)

"جو احوال و مواجید اور علوم و معارف صوفیہ پر اثناء سلوک میں وارد ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ اوہام و خیالات کے قبیل کی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ مکتب طریقت کے بچوں کو تربیت دی جاتی ہے۔"

بہر حال یہ انوار و تجلیات اور یہ احوال و کیفیات جن کا ورود "قرب بالنوافل" کے راستہ سے چلنے والے بہت سے سالکوں پر ہوتا ہے اگرچہ وسیلۂ تربیت اور ذریعۂ ترقی ہونے کی حیثیت سے قابلِ شکر انعاماتِ الٰہیہ ہیں، تاہم نہ یہ خود مقصود و مطلوب ہیں اور نہ ایسی دولت ہیں جس کے لئے "قرب بالفرائض" کا راستہ چھوڑ کر "قرب بالنوافل" ہی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

حضرت امام ربانیؒ ایک مکتوب میں خاص اپنے متعلق ارقام فرماتے ہیں۔
"ایں فقیر از نقد وقت خود می نو یسد کہ مدتہا از علوم و معارف و از احوال و مقامات در رنگ ابر نیساں ریختند و کارے کہ باید کرد بعنایت اللہ سبحانہ، کردند۔

---

[1] حضرت مجددؒ کی ان عبارات کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ "احوال و کیفیات" اور "مشاہدات و تجلیات" شیطانی قسم کے وساوس و اوہام ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے (جیسا کہ خود حضرت مجدد ہی نے اسی مکتوب میں آگے چل کر وضاحت فرمائی ہے یہ بھی ایک درجہ میں انعامات الٰہیہ ہیں اور سالک کو ان سے بہت کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان سے ہمت افزائی ہی کا کام لیا جائے۔ اور سالک انہی کو مقصود و منتہا سمجھ کر ان میں پھنس کر نہ رہ جائے۔

والحال آرزوئے نہ ماندہ است الا آں کہ احیائے سنت از سننِ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوات و التسلیمات نمودہ آید واحوال و مواجید ارباب ذوق را مسلم باشد“

(مکتوب ۳۷ جلد ۱)

” یہ فقیر خود اپنی حالت لکھتا ہے کہ مدتوں علوم و معارف اور احوال و مقامات ابرِ نیساں کی طرح برسے اور ان کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا اللہ تعالیٰ کی عنایت سے وہ پورا ہوا اور اب اس کے سوا کوئی ارمان اور آرزو نہیں رہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کا احیاء کیا جائے اور اس کو رواج دیا جائے اور احوال و مواجید اربابِ ذوق کو مبارک ہوں“

قرب بالفرائض کی ترجیح و فضیلت کے وجوہ........ ”قرب بالفرائض“ کے طریقہ اور اس سلسلہ کے مشاغل (مثلاً خدافراموش انسانوں میں تبلیغ و دعوت' جاہلوں ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور اقامتِ دین و احیاء شریعت کے لئے جدوجہد وغیرہ) کو ”قرب بالنوافل“ کے طریقہ کے مقابلہ میں ترجیح و فضیلت کی یہ وجہ تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے خاص مشاغل و وظائف ہیں۔ اور حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) خاص انہی کاموں کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ پس اپنی قوتوں اور اپنی ہمتوں کو انہی کے طریقے پر اخلاص و احتساب کے ساتھ ان کاموں میں لگانا' اور اسی جدوجہد کو اپنا خاص وظیفۂ حیات بنالینا ان مقدّس و برگزیدہ ہستیوں کی خاص نیابت بلکہ ایک طرح سے ان کی رفاقت اور ان کے مقصد' ان کی فکر اور ان کے درد میں شرکت ہے اور ایک غیر نبی کے لئے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہوسکتی۔

علاوہ ازیں اس طریقہ کا فیض متعدّی ہے کہ اس راہ کا چلنے والا اپنی اصلاح و تکمیل کے ساتھ ساتھ اور سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت کا بھی ذریعہ بنتا ہے اور اس واسطے صحیح حدیث.....

من دلّ علی خیر فلہ مثل اجر فاعلہ۔ (مسلم)

”جو شخص کسی آدمی کو کسی نیکی کی طرف راہ نمائی کرے تو اس شخص کو اس نیکی کے کرنے والے ہی کے برابر الگ ثواب ملے گا“

کے مطابق سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے بے حساب و بے شمار اعمالِ خیر کے بھی اجر کا

ہوتا ہے۔

نیز یہاں یہ بھی نکتہ خاص طور سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریق میں زیادہ سے زیادہ محنت و مجاہدہ کرنے والے اپنے گنے چنے فرائض کے علاوہ صرف اپنی نفلی عبادات و قربات ہی کا سرمایہ جمع کر سکتے ہیں۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی راہ پر چلنے والے چونکہ سینکڑوں انسانوں کو ان کے بنیادی فرائض کی تبلیغ و تلقین کرتے اور تعلیم دیتے ہیں اس لئے ان کے حساب میں اپنے ذاتی فرائض و نوافل کے علاوہ ان سینکڑوں آدمیوں کے فرائض (اور نوافل) کا بھی اجر لکھا جاتا ہے۔ اور یہ معلوم و مسلّم حقیقت ہے کہ فرائض کا اجر نوافل سے بدرجہا زیادہ ہے اور نفسِ ایمان واسلام کا درجہ تو یقیناً فرائض و نوافل سب سے زیادہ ہے۔ پس اللہ کا جو بندہ "قرب بالفرائض" کی راہ اختیار کر کے خدا اور رسولؐ سے بیگانہ اور حقیقتِ ایمان واسلام سے نا آشنا قسم کے جاہلوں اور غافلوں میں تبلیغ کر کے اور ان کو تعلیم و تربیت دے کے دین سے آشنا کرتا ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں ان لوگوں کے نفس ایمان واسلام کا اجر بھی لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ کے سوا کوئی نہیں' جو اس اجر بے حساب کا حساب بھی لگا سکے۔

نیز "قرب بالنوافل" کے طریق میں صرف اپنی زندگی تک ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے' جہاں موت نے روح کو جسم سے الگ کیا اور سلسلۂ عمل ختم ہوا۔ ترقی بھی ختم ہو جاتی ہے مگر "قرب بالفرائض" کی راہ میں جب تک اس کے دینی و علمی فیض کا سلسلہ جاری رہے (خواہ وہ واسطہ در واسطہ کی شکل میں قیامت تک ہی جاری رہے) برابر اعمال نامہ میں اندراج ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے درجات میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہوئی ہے۔

اور قطع نظر ان تفصیلات سے' سب سے اہم بات وہی ہے جو پہلے عرض کی گئی ہے کہ "قرب بالفرائض" کا یہ راستہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خواص اصحاب دعوا اور بیّن کا راستہ ہے۔ اور اس کے مشاغل (تعلیم و تعلم' دعوت و تبلیغ' اصلاح و ارشاد' اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کی کوشش وغیرہ) ان حضرات کے خاص مشاغل ہیں۔ پس اس طریق کو اختیار کرنے والے اور ان کاموں کو سنبھالنے والے بلاشبہ تمام حضرات انبیاء علیہم السلام کے اور خصوصاً حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی خلفاء ہیں۔ اگرچہ سیاسی نظام اور سیاسی سیاست والی خلافت ظاہر ان کے پاس نہیں ہے۔ لیکن اصل امانتِ نبوی کی حفاظت اور تبلیغ و

دعوت اور ماننے والوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کا کام بھی بلاشبہ ایک طرح کی جانشینیٔ نبوت ہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ مقصدی اہمیت اس کو زیادہ حاصل ہے۔ اور بروجہ احسن اور وسیع پیمانہ پر انہی مقاصد کی تکمیل کے لئے "خلافت ظاہرہ" مقصود ہوتی ہے۔

> نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی غیر سیاسی خلافت (حضرت شاہ ولی اللہ کی اصطلاح کے مطابق 'خلافتِ باطنہ') اگر ایک مرکز اور نظام کے ساتھ ہو تو "خلافتِ ظاہرہ" تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ "استخلاف فی الارض" اور "تمکینِ دینی" کا انعام انہی فرائض اور انہی خدمات کی انجام دہی پر مرتب ہوتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور یہی اس کی سنّتِ ازلیہ ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ "خلافتِ نبوت" کے قیام کا صحیح راستہ صرف یہی ہے اور اس طریقہ اور اس ترتیب کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں پر جدّوجہد کرنے سے اگرچہ "اپنی حکومت" قائم کی جا سکتی ہے لیکن خلافتِ نبوت قائم نہیں ہو سکتی۔ والتفصیل لا یسعہ المقام

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ عرض کرنا یہی تھا کہ "قرب بالفرائض" کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور اس کے مشاغل 'تبلیغ و دعوت'، 'تعلیم و تربیت'، 'اصلاح و ارشاد اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدّوجہد وغیرہ کا درجہ اور اجر نفلی عبادات و قربات اور ذکر و فکر ہی میں مشغول و منہمک رہنے سے یقیناً بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً اس دور میں تو اس طریقہ اور ان مشاغل کی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ یہ زمانہ ہی عوامی تحریکات اور عمومی و جمہوری دعوتوں کا ہے اور مختلف مادی اور لادینی تحریکیں بے حد تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی عوام کو اپنی طرف جذب کرتی جا رہی ہیں۔ ایسے وقت میں بھی اگر دین کی دعوت، دینی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کی جدوجہد وسیع پیمانے پر اور عوامی تحریک کے رنگ میں نہیں کی گئی اور اللہ کے وفادار اور اس کی رضا کے طلب گار بندے خدمتِ دین کے اس عمومی میدان میں نہ اترے تو دین کی امانت کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

امام ابو اسحاق اسفرائینی کا پرجوش اور ولولہ انگیز پیغام رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ ان کے زمانے میں جب عام مسلمانوں کا دین و ایمان بعض خاص گمراہانہ فتنوں کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گیا تو آپ اپنے عہد کے بعض ان اکابر و مشائخ کے پاس پہنچے جو دنیا و مافیہا سے یکسو ہو کر پہاڑوں کے

غاروں میں عبادت و مجاہدہ میں مصروف تھے اور کہا (اللہ اکبر کیسے درد سے کہا)......

ا کلۃ الحشیش انتم ھھنا و امۃ محمد صلیّ اللّٰہ علیہ وسلّم فی الفتن۔

"جنگل کی سوکھی گھاس پر گزارہ کرنے والو! تم یہاں ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی امت گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہے۔"

الغرض یہ کام یعنی مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور جاہلوں ناواقفوں کی دینی تعلیم و تربیت اور غافلوں، نا آشناؤں کو تبلیغ و دعوت کا کام اگرچہ ہر وقت اور ہر حال میں بہت بڑا اور بہت اہم کام ہے اور جیسا کہ تفصیل سے اوپر عرض کیا گیا۔ عنداللہ اس کا درجہ بہت اعلیٰ و ارفع ہے اور امتیوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی کمال اور ترقی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بقول حضرت مجددؒ۔

"ہیچ کمالے بر تبہ دعوت و تبلیغ نہ رسد۔

فان احب عباد اللّٰہ الی اللّٰہ من حبب اللّٰہ الی عبادہ و حبب عباد اللّٰہ الی اللّٰہ و ھو الداعی و المبلغ •

(مکتوبات امام ربانی مکتوب ۷۵، ج ۲)

"کوئی کمال دعوت و تبلیغ کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اللہ کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کو اس کے بندوں کا محبوب بنادے اور بندوں کو اللہ کا محبوب بنادے۔ اور وہ داعی اور مبلغ ہوتا ہے۔"

لیکن بالخصوص ایسے زمانے میں کہ چاروں طرف سے مادیت اور لادینیت کے بادل امنڈ رہے ہوں اور دین سے غفلت و جہالت اور خدا فراموشی کی گھٹائیں نہایت تیزی سے دنیا پر چھائے چلی جارہی ہیں۔ سو ایسے وقت میں تو ان کاموں کی قدر و قیمت اللہ کے یہاں بے حساب بڑھ جاتی ہے۔ حضرت مجددؒ ہی نے کیسی اچھی تمثیل میں فرمایا ہے۔

"مثلاً سپاہیان در وقت غلبہ دشمناں واستیلاء مخالفاں اگر اندک تردد می کنند آں قدر نمایاں میشود و اعتبارے گردد کہ در وقت امن اضعاف آں در خیز اعتبار نمی آید۔"

(مکتوب نمبر ۴۴)

"مثلاً جو سپاہی دشمن کے غلبہ اور مخالفین کے چڑھ آنے کے نازک وقت میں تھوڑی سی بھی وفادارانہ جدوجہد کرتے ہیں وہ ایسا اعتماد اور امتیاز حاصل کر لیتے ہیں کہ عام امن و سکون کے

وقت کئی گنا جانفشانی بھی کریں تو وہ اعتماد و اعتبار پیدا نہیں ہوتا۔"

الحاصل ہر زمانہ میں خاص کر ہمارے اس دور میں دینی و روحانی ترقی اور قرب الٰہی و رضائے خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ اور شاہراہ "قرب بالفرائض" ہی کا طریقہ ہے اور اس کے مشاغل مثلاً دعوت و تبلیغ، اصلاح و تعلیم اور اقامتِ دین و احیاءِ شریعت کے لئے جدوجہد کا درجہ اور اجر یکسوئی کے ساتھ نفلی عبادات اور ذکر و مراقبہ ہی میں منہمک و مشغول رہنے سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن "قرب بالفرائض" کی ان مشاغل کی یہ امتیازی حیثیت اور "قرب بالنوافل" کے مقابلہ میں ان کی یہ عظمت اور فوقیت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کاموں میں اشتغال اخلاص و احتساب اور خشیت و انابت کی صفت کے ساتھ ہو اگر یہ نہیں ہے تو پھر ساری دوڑ دھوپ اور جدوجہد ایک بے روح عامیانہ تحریک یا ایک پیشہ اور حرفہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (اعاذنا اللہ من ذٰلک) اور ان اوصاف (اخلاص و احتساب) کے حاصل ہونے کا عام آزمودہ اور عادتی ذریعہ ان اوصاف والوں کی صحبت و رفاقت اور تنہائیوں کے اوقات میں ذکر و فکر کی کثرت ہے۔ ان دونوں چیزوں کے اہتمام کے بغیر اخلاص و احسان جیسی کیفیات کا پیدا ہونا اگرچہ عقلاً ناممکن نہیں لیکن عادتاً دشوار اور اہلِ تجربہ کی شہادت کے مطابق شاذ ضرور ہے۔

ضروری استدراک...... اوپر کی سطروں سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ رہے کہ "قرب بالنوافل" کے طریقہ کو ہم غلط یا غیر شرعی یا غیر فرضی سمجھتے ہیں، ہرگز نہیں! حاشا، ہزار بار حاشا۔ ہماری گزارش کا مدّعا تو صرف یہ ہے کہ "قرب بالفرائض" کا راستہ قابلِ ترجیح اور افضل ہے اور خصوصاً ہمارے اس زمانہ کے حالات اور دینی ضروریات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے بندے اس طریق کو اختیار کریں اور اپنی ہمتوں کو اسی رخ پر لگائیں۔

نیز ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ فی زمانناماحول کے عمومی فساد کی وجہ سے اکثر طبیعتوں کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ کچھ مدّت یکسوئی کے ساتھ ذکر و فکر کے بغیر ان پر اخلاص و احسان کا رنگ بھی نہیں چڑھتا سو ایسے حضرات کے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ تیاری کے طور پر کچھ دنوں اسی طریق پر چلیں لیکن مطمحِ نظر دین کی خدمت و نصرت ہی کے مشاغل کو بنائیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوامی دعوت و تبلیغ اور عوامی تعلیم و تربیت کا یہ کام جس کی طرف اس مضمون میں میں نے خصوصیت کے ساتھ دعوت دی ہے۔

اس سے ہماری مراد خاص متعارف و مالوف ”تبلیغ“ نہیں ہے جس کے لئے علم دین کی ایک خاص مقدار ضروری ہے۔ بلکہ حقیقت دین سے نا آشنا طبقوں میں دین کا صحیح شعور پیدا کرنا اور کم از کم دین کی بنیادی باتوں کی ان کو تعلیم و تلقین کرنا اور اس درجہ کی عملی اصلاح کی کوشش کرنا اس سلسلہ کا ابتدائی کام ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ نہ کچھ حصہ لے سکتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ خود بھی تعلیم و تربیت حاصل کر سکتا ہے۔

اب ہم اس مضمون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔

عن الحسن مرسلا سئل رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم عن رجلین کانا فی بنی اسرائیل احدهما کان عالما یصلّی المکتوبة ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر والآخر یصوم النهار و یقوم اللّیل ایّهما افضل؟

قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فضل هذا العالم الذی یصلّی المکتوبة ثم یجلس فیعلّم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النهار و یقوم اللّیل کفضلی علی ادنا کم

رواہ الدارمی (مشکوۃ)

”حضرت حسن بصریؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت سوال کیا جن میں سے ایک دین کا جاننے والا تھا اس کا طریقہ یہ تھا کہ فرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا اور دوسرا ہمیشہ دن کو روزے رکھتا اور رات بھر نوافل پڑھتا (حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص جو فرائض ادا کرتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو اچھی باتیں بتاتا اور سکھاتا تھا۔ اس قائم اللیل صائم النہار عابد کے مقابلہ میں ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسی کہ تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔“

ملحوظ رہے کہ حضورؐ کے جواب میں جو تمثیل ہے یہ مقدارِ فضیلت میں نہیں ہے بلکہ فضیلت کی نوعیت میں تمثیل و تشبیہ ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کی عمر (۷)

اور

مستقبل قریب میں مہدی کے ظہور کا امکان

امین محمد جمال الدین

شعبۂ دعوت و ثقافت' دعوت اسلامی کالج' جامعہ الازہر

کی معرکۃ الآراء کتاب "عمر امۃ الاسلام وقرب ظہور المہدی" کا

پانچواں باب

قیامت کی بڑی نشانیاں

مترجم : پروفیسر خورشید عالم' قرآن کالج لاہور

پہلی فصل : وہ نشانیاں جو مومنوں کو نظر آئیں گی۔

دوسری فصل : وہ نشانیاں جو مومنوں کو نظر نہیں آئیں گی۔

تیسری فصل : کائنات کا حقیقی ہولناک انقلاب۔

ہم اس باب میں قیامت کی دس بڑی علامتوں کے متعلق اختصار سے گفتگو کریں گے اور ساتھ ساتھ ان پہلی چھ نشانیوں کو قدرے تفصیل سے بیان کریں گے جو عنقریب مومنوں کو نظر آجائیں گی۔

غرض صرف یہ ہے کہ علامات کے ظہور کی ترتیب اور حقیقت کا لوگوں کو پتہ چل جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ان علامات کے مقابلے میں ان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے۔

سب سے پہلے ہم اس حدیث نبوی ﷺ کو بیان کریں گے جن میں ان دس نشانیوں کا تذکرہ ہے۔ امام مسلم نے صحیح میں حذیفہؓ بن اسید الغفاری کی سند سے روایت کیا ہے کہ ہم باہم گفتگو کر رہے تھے کہ نبی پاک ﷺ ہمارے پاس آئے اور پوچھا۔ کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ انہوں نے کہا: ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک ہرگز نہ آئے گی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ پھر آپؐ نے ذکر کیا دھوئیں کا' دجّال کا' جانور کا' مغرب سے طلوع آفتاب کا' عیسیٰؑ بن مریمؑ کے نزول کا' یاجوج ماجوج کے خروج کا' مشرق' مغرب اور جزیرۃ العرب کے تین خسوف (یعنی زمین کے دھنس جانے) کا اور آخر میں اس آگ کا جو یمن سے نکل کر لوگوں کو ہانک کر محشر کے میدان میں لے جائے گی۔ [1]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علامات زمانے کے اعتبار سے غیر مرتب ہیں۔ مسلم نے اسی حدیث کو ایک اور سند سے دوسری ترتیب سے روایت کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان علامات کا زمنی ترتیب سے ذکر نہیں ہوا۔ اسی بنا پر ہم نے زمانے کی ترتیب دے کر انہیں دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔

۱۔ وہ علامات جو مومنوں کو نظر آئیں گی۔

۲۔ وہ علامات جو مومنوں کو نظر نہیں آئیں گی۔

اس باب کے آخر میں ہم نے اس ہولناک کائناتی انقلاب اور اس دنیا کی تباہی کا اختصار سے ذکر کیا ہے جو قیامت کی بڑی نشانیوں کے ظہور کے بعد آئے گی' کیونکہ ان کی پہچان اور ان پر ایمان ہمارے عقیدے کا لازمی جزو ہے۔

<u>پہلی فصل</u>

وہ علامتیں جو مومنوں کو نظر آئیں گی

مومن مذکورہ بالا دس نشانیوں میں سے صرف چھ کو دیکھ سکیں گے' باقی چار صرف کافروں کو نظر آئیں گی۔

مومن دجّال، عیسیٰؑ بن مریمؑ، یاجوج ماجوج، مغرب سے طلوع آفتاب، جانور اور دھوئیں کو دیکھ سکیں گے اور یہی ان کی زمنی ترتیب ہے۔

پہلی علامت : ظہورِ دجّال

گزشتہ باب میں ہم نے خاص طور پر اس پر بحث کی ہے کیونکہ ظاہر ہونے والی علامتوں میں یہ سب سے بڑی علامت ہے جسے مومن دیکھ پائیں گے۔ اس لئے اس کی وضاحت اور تفصیل ضروری تھی تاکہ لوگوں کو اس بارے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ اس لئے بھی کہ یہ فتنہ ایک عظیم فتنہ ہوگا اور دجّال کی آمد کے وقت کے بارے میں بہت سے لوگوں کو شبہ ہے۔ ہم نے وہاں ثابت کر دیا ہے کہ یہ ظاہر ہونے والی سب سے پہلی علامت ہوگی۔ ہمارے لئے اب یہ معاملہ ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

دوسری علامت : عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نہ قتل ہوئے، نہ پھانسی چڑھے، بلکہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا اور وہ آخری زمانہ میں لوٹ کر آئیں گے، دجال کو قتل کریں گے اور اسلام کو غالب کر کے لوگوں کو اس کی دعوت دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : "اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو شبہ ہوگیا۔ اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں، ان کے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں سوائے اس کے کہ وہ تخمینی باتوں پر عمل کرتے ہیں، اور یقینی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست اور حکمت والے ہیں۔ اور اہل کتاب میں سے ہر شخص اپنے مرنے سے پہلے ضرور ان کی تصدیق کر لیتا ہے، اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے"۔ (النساء : ۱۵۷۔۱۵۹)

عیسیٰ علیہ السلام کب نازل ہوں گے؟ کہاں نازل ہوں گے؟ ہمیں ان کی پہچان کیسے

ہو گی؟ نزول کے بعد وہ کیا کریں گے؟

۱ ۔ حضرت عیسیٰؑ کب نازل ہوں گے؟ عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا نزول مہدی کے ظہور اور دجال کے خروج کے بعد ہو گا۔ دجال خارج ہو کر زمین میں چالیس روز قیام کرے گا۔ "ایک دن ایک سال کے برابر' دوسرا دن ایک ماہ کے برابر' تیسرا دن ایک جمعہ کے برابر اور باقی دن تمہارے عام دنوں کی مانند ہوں گے"۔ {۲}

دجّال کے قیام کی مدت ختم ہونے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو گا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ سب سے پہلے دجال کو قتل کریں گے اور قتل کرتے وقت کہیں گے "تجھے ضرب لگانا میرے مقدر میں ہے"۔

۲ ۔ عیسیٰ علیہ السلام کہاں نازل ہوں گے؟ سیریا (شام) کے شہر دمشق کے مشرق میں سفید مینار کے پاس اس جگہ اتریں گے جہاں مہدی اور ان کے مسلمان ساتھیوں کا ٹھکانہ ہو گا۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں : "عیسیٰ علیہ السلام دمشق کے مشرق میں سفید مینار کے پاس نازل ہوں گے۔" {۳}

۳ ۔ ہم ان کو کیسے پہچانیں گے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کا حلیہ اور ان کے نزول کی کیفیت نیچے لکھی ہوئی حدیث میں بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : "میرے اور عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں' وہ اترنے والے ہیں' جب تم انہیں دیکھو تو انہیں پہچان لینا۔ وہ میانہ قد کے آدمی ہوں گے۔ رنگ سرخی اور سفیدی مائل ہو گا گیرو سے رنگے ہوئے دو کپڑے پہنے ہوئے نازل ہوں گے۔ پانی نہ پڑنے کے باوجود ان کے سر سے قطرے ٹپک رہے ہوں گے۔" {۴}

اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں "..... جبکہ وہ (دجال) یہ کام کر رہا ہو گا کہ اللہ مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ کو مبعوث فرمائے گا' وہ دمشق کے مشرق میں سفید مینار سے گیرو سے رنگے ہوئے دو زرد کپڑے پہنے ہوئے نازل ہوں گے۔ انہوں نے اپنی ہتھیلیاں دو فرشتوں کے پروں پر رکھی ہوں گی' جب سر نیچا کریں گے تو قطرے ٹپکیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے موتیوں کی مانند دانے گریں گے۔" {۵}

عیسیٰ علیہ السلام تینتیس برس (اسی عمر میں ان کو آسمان پر اٹھایا گیا تھا) کے جوان ہوں گے۔ قد میانہ، رنگ سرخی سفیدی مائل، بال سیدھے (نرم اور کھلے ہوئے) ایک زلف (لٹ) دو کاندھوں کے درمیان حرکت کر رہی ہو گی، یوں معلوم ہو گا کہ وہ ابھی ابھی حمام سے نکل کر آرہے ہیں، جب سر نیچا کریں گے تو پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو موتیوں کی مانند دانے نیچے گریں گے۔ انہوں نے گیرو (یا زرد رنگ) میں رنگے ہوئے دو کپڑے (چادر اور تہ بند) پہنے ہوں گے، ہتھیلیاں دو فرشتوں کے پروں پر رکھی ہوں گی۔

۴۔ <u>نازل ہونے کے بعد کیا کریں گے؟</u> سب سے پہلے نماز پڑھیں گے، جب وہ اتریں گے تو صبح کی نماز کی اقامت ہو چکی ہو گی اور مہدی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ کر کہیں گے "آیئے اے روح اللہ! نماز پڑھایئے"۔ حضرت عیسیٰؑ انکار کریں گے اور فرمائیں گے "نہیں تم میں سے ایک دوسرے پر امیر ہے"۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں "میری امت کا ایک گروہ حق کی خاطر قیامت تک لڑتا رہے گا اور غالب ہو گا۔ پھر عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا آیئے ہمیں نماز پڑھایئے۔ وہ کہیں گے کہ نہیں، امیر تم میں سے ہو گا۔ یہ وہ اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو بخشا ہے۔"[۶]

امام احمد کی ایک روایت میں ہے "......وہ اچانک عیسیٰ بن مریمؑ کو دیکھ لیں گے، پھر نماز کے لئے اقامت کہی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا: آگے بڑھیئے اے اللہ کی روح! آپ فرمائیں گے: تمہارا امام آگے بڑھ کر تمہیں نماز پڑھائے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تمہاری کیا کیفیت ہو گی جب ابن مریمؑ نازل ہوں گے اور امام تم میں سے ہو گا۔[۷] یعنی اس نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام سے مل کر تم کس قدر شاداں و فرحاں ہو گے۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ سب نبیوں میں سے صرف عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے نزول میں کونسی حکمت پوشیدہ ہے۔ جواب وہ ہے جو ابن حجرؒ نے فتح الباری میں دیا ہے۔ ان کا

کہتا ہے کہ سب نبیوں کو چھوڑ کر عیسیٰؑ کے نزول میں یہ حکمت ہے کہ اس سے یہودیوں کی تردید مقصود ہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے انہیں قتل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سے قتل ہوں گے۔ {۸}

میری رائے میں ان کے نزول سے نصاریٰ کے اس عقیدے کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ الٰہ (معبود) ہیں۔ ان کے نزول سے اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے عقیدے کی تکذیب کی ہے اور ان کی بشریت کا اعلان کیا ہے، بلکہ صلیب کو توڑ کر، خنزیر کو قتل کر کے اور جزیہ کو ختم کرنے سے ان کے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نماز کی امامت کیوں نہیں کرائیں گے؟

ابن جوزی نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ اگر عیسیٰؑ آگے بڑھ کر امامت کرا دیں تو دل میں شبہ پیدا ہو کہ آیا وہ نائب کی حیثیت سے آگے بڑھے ہیں یا وہ نئی شریعت لائے ہیں؟ مقتدی کے طور پر نماز پڑھیں گے تاکہ نبی ﷺ کا قول کہ "میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا" {۹} شک و شبہ سے غبار آلود نہ ہو جائے۔ یہ بڑی ہی خوبصورت اور پختہ توجیہ ہے۔ پھر نماز کے ختم ہونے کے فوراً بعد وہ ملعون دجال کے قتل اور باقی ماندہ یہودیوں کے خاتمے کا کام اپنے ذمے لیں گے۔

اس کے بعد وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ معاف کریں گے۔ اسلام اور تلوار میں سے صرف ایک کو قبول کریں گے (یعنی لوگ اسلام قبول کرلیں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جلد ہی تمہارے درمیان ابن مریمؑ ایک عادل منصف کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ پھر وہ صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ معاف کریں گے۔ مال کی اتنی فراوانی ہوگی کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہ ہوگا۔ اسلام کا اس قدر دور دورہ ہوگا کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر شمار ہوگا"۔ {۱۰}

پھر جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے گی۔ لوگ اتنے ناز و نعمت سے زندگی گزاریں گے

جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بغض اور کینہ جاتا رہے گا۔ زہریلے جانوروں کا زہر کھینچ لیا جائے گا حتیٰ کہ بچہ سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالے گا اور سانپ اسے نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ بچے شیروں اور درندوں کے ساتھ کھیلیں گے اور وہ انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے۔ بھیڑیا کُتوں کی طرح بھیڑوں کی حفاظت کرے گا۔ زمین سے برکتوں کا خروج ہو گا اور آسمان اپنی خیرات نازل کرے گا۔ عیسیٰؑ بن مریمؑ شادی کریں گے، پھر عیسیٰؑ کعبہ کا حج کریں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ابن مریمؑ حج یا عمرہ کی غرض سے تلبیہ کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں گے، یا ان دونوں کو دوبار سرانجام دیں گے۔"[11]

پھر عیسیٰؑ زمین میں ساٹھ برس تک ٹھہریں گے اور ایک صحیح روایت کے مطابق چالیس برس قیام کریں گے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو گا۔ جب اللہ ان کے زمانہ میں یاجوج اور ماجوج کو ہلاک کر دے گا تو وہ وفات پا جائیں گے۔

تیسری علامت : یاجوج ماجوج

مومنوں کو دکھائی دینے والی تیسری علامت یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا۔

یاجوج ماجوج کون ہیں؟ اِس وقت وہ کہاں ہیں؟ ان کا خروج کب ہو گا؟ ان کا فتنہ کیسا ہو گا؟

۱۔ وہ کون ہیں؟ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یاجوج ماجوج آدم کی اولاد سے دو ترک جماعتیں ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم! وہ کہیں گے کہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ ساری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ فرمائے گا: آگ والی جماعت کو نکالو۔ وہ کہیں گے کہ آگ والی جماعت میں کتنے لوگ ہیں؟ اللہ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ (نبی ﷺ نے فرمایا) یہی وہ وقت ہے جب بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ یوں معلوم ہو گا جیسے لوگ نشے میں ہیں حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے مگر اللہ کا عذاب سخت ہو گا۔ (صحابہ کرامؓ نے) دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے کون ہو گا

جو باقی بچنے والا ہو گا؟ آپ ؐ نے فرمایا: خوشیاں مناؤ' وہ ایک تم میں سے ہو گا اور ایک ہزار یاجوج ماجوج میں سے ہوں گے"۔ {۱۲}

وہ یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت نوح ؑ کے تین بیٹے تھے: حام جو حبشیوں کے جدِّ امجد ہیں۔ سام جو عربوں' فارسیوں اور رومیوں کے جدّ امجد ہیں اور یافث جو ترکوں کے جدّ امجد ہیں۔ پس یاجوج ماجوج ترکوں یعنی چینیوں' روسیوں' جاپانیوں اور منگولیوں اور ان کی نسل کے دوسرے لوگوں کے چچا کے بیٹے ہیں۔

<u>ان کے اوصاف</u> : ان کے اوصاف وہی ہیں جو ترک مغلوں کے ہیں۔ چوڑے چہرے' چھوٹی آنکھیں' کالے سفیدی یا خاکستری مائل بال' ان کے چہرے ایسے ہیں جیسے کوٹی ہوئی گول ڈھالیں۔ ان اوصاف کا بیان اس حدیث میں ہے جسے احمد نے مسند میں ابو حرملہ سے اور انہوں نے اپنی خالہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند نبی ﷺ تک پہنچتی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے کہا ہے "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں بعض کا قد کھجور کی مانند دراز ہوتا ہے اور بعض کو تاہ قامت ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض لوگ اپنے ایک کان کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں اور دوسرے کان سے کام لیتے ہیں وہ بہ تکلف ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا ان کو نہ تو علم ہے اور نہ ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے"۔ {۱۳}

۲۔ <u>وہ اب کہاں ہیں؟</u> اللہ تعالیٰ نے فرمایا : "یہاں تک کہ وہ جب دو پہاڑوں کے درمیان میں پہنچا تو ان پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو لگتا نہیں تھا کہ کوئی بات سمجھتے ہوں۔ انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین یہ یاجوج ماجوج اس سرزمین میں بڑا فساد مچاتے ہیں۔ کیا ہم لوگ آپ کے لئے کچھ محصول مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک آڑ بنا دیں۔ ذوالقرنین نے جواب دیا کہ "جس مال میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا وہ بہت کچھ ہے' پس میری مدد کرو محنت سے تاکہ میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں"۔ (الکہف : ۹۲۔۹۵)

پس یاجوج ماجوج اس دیوار کے پیچھے بند ہیں جو ذوالقرنین نے ان کو روکنے کے لئے پرانے زمانے میں بنائی تھی' کیونکہ وہ فساد مچاتے تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔ وہ دیوار

بڑی پکی، مضبوط، موٹی اور اونچی ہے۔ اسے لوہے کے ٹکڑوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنایا گیا ہے۔ یاجوج ماجوج اس کی موٹائی کی وجہ سے نہ تو اس میں سوراخ کر سکتے ہیں اور نہ اُس کی بلندی اور چکناہٹ کی وجہ سے اس پر چڑھ سکتے ہیں۔ یہ دیوار دو بڑے پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔

یہ پہاڑ کہاں ہے؟ حبرِ اُمت اور ترجمانِ قرآن حضرت ابن عباسؓ کا کہنا ہے کہ ترکی کے آخری سرے پر آرمینیا اور آذربائیجان کے قریب ہے [۱۴] یعنی کوہ قاف کے پاس ترکی اور روس کی حدود پر واقع ہے۔ [۱۵] خدا لگتی بات یہ ہے کہ کوئی آدمی نہ ان تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ان کو نکال سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کوئی آدمی اِس وقت پس زندان محبوس دجال تک نہ پہنچ سکتا ہے اور نہ اس کو چھڑا سکتا ہے کیونکہ ان سب کا خروج ایک امر مقدر ہے جس کا وقت لوح محفوظ میں مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ "پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا ہر وعدہ برحق ہے"۔ (کہف : ۹۸)

۳۔ ان کا خروج کب ہو گا؟ ان کا خروج اس وقت ہو گا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال ملعون کو قتل کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو خروج کی اجازت دے گا اور اس مضبوط دیوار کو ڈھا دے گا۔ جب سے یاجوج ماجوج بند ہیں وہ خروج کی کاوشوں سے مایوس نہیں ہوئے۔ وہ ہر روز اس بڑی دیوار میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جب ان کو سورج کی تھوڑی سی شعاع نظر آ جائے گی تو ان کا سردار ان سے کہے گا: واپس لوٹ جاؤ کل ہم اسے کھول دیں گے۔ جب وہ لوٹ کر آئیں گے تو دیکھیں گے کہ وہ دیوار پہلے کی مانند ہو گئی ہے۔ جب اللہ کا مقرر وقت آ جائے گا تو ان کے امیر کو القا ہو گا اور وہ ان سے کہے گا لوٹ جاؤ ان شاء اللہ کل ہم اسے کھول دیں گے۔ وہ دوسرے دن لوٹ کر آئیں گے تو دیکھیں گے کہ دیوار کی حالت وہی ہے جس میں وہ اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ اسے کھول کر لوگوں کے خلاف خروج کریں گے ـــــ ایک دن نیند سے گھبرا کر بیدار ہونے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ عرب اس فتنہ کی وجہ سے تباہ ہو جائیں گے جو قریب ہے۔ آج کے دن یاجوج اور

ماجوج کی دیوار کو اس طرح کھول دیا گیا ہے اور آپ ؐ نے اپنے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے ساتھ حلقہ بنا کر دکھایا۔ زینب ؓ بنت جحش کہتی ہیں کہ میں نے پوچھا : اے اللہ کے رسول ؐ ! اس بات کے باوصف کہ ہم میں نیکوکار موجود ہوں گے کیا ہم پھر بھی ہلاک ہو جائیں گے ؟ آپ ؐ نے فرمایا : "ہاں جب برائی عام ہو جائے گی"۔ [16]

۴۔ ان کے فتنے کا طول و عرض کیا ہے ؟

نیچے دی ہوئی حدیث اس فتنے کے طول و عرض کو واضح کرتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا : "یاجوج ماجوج کو کھول دیا جائے گا اور وہ لوگوں کے خلاف خروج کریں گے جیسا کہ اللہ عزّوجلّ کا فرمان ہے "اور وہ ہر بلندی سے نکلتے معلوم ہوں گے"۔ وہ لوگوں پر چھا جائیں گے۔ مسلمان ان سے بھاگ کر اپنے شہروں اور قلعوں کی راہ لیں گے اور اپنے ساتھ اپنے مویشیوں کو بھی لے جائیں گے۔ وہ زمین کا پانی پی ڈالیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ کا گزر ایک دریا کے پاس ہو گا' وہ اس کا سارا پانی پی کر اسے خشک کر دیں گے۔ ان کے بعد جو آدمی بھی اس دریا کے پاس سے گزرے گا کہے گا کسی زمانہ میں یہاں بھی پانی ہوتا تھا۔ جب روئے زمین پر سوائے شہروں اور قلعوں میں کوئی انسان باقی نہ رہے گا تو ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: زمین والوں سے تو ہم فارغ ہو چکے' اب آسمان والے باقی رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنے نیزے کو حرکت دے کر آسمان کی طرف پھینکے گا تو آزمائش کے طور پر خون آلود نیزہ اس کی طرف واپس آئے گا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ ایک کیڑا بھیجے گا جو ان کی گردنوں پر حملہ کرے گا۔ یہ کیڑا اس کیڑے کی طرح ہو گا جو ٹڈی کی گردن پر حملہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ سب مر جائیں گے اور ان کی کوئی آہٹ سنائی نہ دے گی۔ اُس وقت مسلمان کہیں گے : دیکھئے ! کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دیکھ آئے کہ اس دشمن نے کیا کیا ہے ؟ ان میں سے ایک آدمی ثواب کی غرض سے اپنے آپ کو وقف کرے گا۔ وہ اپنے جی میں یہ بات بٹھا لے گا کہ اسے قتل ہو جانا ہے۔ وہ اتر کر آئے گا اور انہیں مردہ پائے گا وہ ایک دوسرے پر گرے ہوئے ہوں گے۔ وہ آواز دے گا: اے مسلمانوں کے گروہ ! تمہیں بشارت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے دشمن سے بچا لیا ہے۔ پھر وہ اپنے شہروں اور قلعوں سے باہر

نکل آئیں گے۔ وہ اپنے مویشیوں کو کھلا چھوڑ دیں گے' جن کے لئے یاجوج ماجوج کے گوشت کے علاوہ کوئی چراگاہ نہ بچی ہوگی۔ وہ اس کا بھی اسی احسن طریقے سے شکریہ ادا کریں گے جس طرح کبھی نباتات کے ملنے پر شکریہ ادا کیا کرتے تھے"۔ {۱۷}

ان کی تعداد چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح گنی نہیں جاسکے گی۔ یہاں تک کہ مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں' تیروں اور ڈھالوں کو سات برس تک بطور ایندھن استعمال کرتے رہیں گے۔ {۱۸}

ان کا فتنہ عام ہوگا اور ان کی برائی ہر طرف پھیلی ہوگی۔ ان کو روکنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ جب ان کا خروج ہوگا تو اللہ عزوجل عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کرے گا کہ میں نے ایسے بندوں کو نکالا ہے جن کے ساتھ لڑنا کسی کے بس میں نہیں۔ بس میرے بندوں کو طور پر جمع کرو۔ اللہ کے نبی عیسیٰؑ اور ان کے ساتھی محصور ہو جائیں گے۔ وہ اس قدر تنگ ہوں گے کہ وہ ایک بیل کے سر کو تمہارے آج کل کے ایک ہزار دینار سے بہتر سمجھیں گے۔ اللہ کے نبی عیسیٰؑ اور ان کے ساتھی نیچے اترنا چاہیں گے۔ وہ اتنے تنگ ہوں گے کہ زمین میں بالشت بھر جگہ نہ پائیں گے' کیونکہ پوری زمین ان کے سڑے ہوئے گوشت کی بو سے بھری ہوگی۔ اللہ کے نبی عیسیٰؑ اور ان کے ساتھی اللہ کے طرف رجوع کریں گے تو اللہ اپنے پرندے بھیجے گا جن کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح ہوں گی۔ وہ پرندے ان مردوں کو اٹھا کر وہاں پھینک دیں گے جہاں اللہ کی مرضی ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش بھیجے گا جو دیہات اور شہر کے ہر گھر پر برسے گی۔ یہ بارش زمین کو دھو کر ایسا کردے گی گویا اس پر جھاڑو دیا گیا ہے۔ {۱۹}

یاجوج ماجوج کے فتنہ سے حفاظت کا کام عیسیٰ بن مریمؑ کے سپرد ہوگا۔ وہ مسلمانوں کو اس کے بارے میں ہدایات دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو وحی کرے گا کہ میرے بندوں کو طور پر جمع کرو۔ اس سے مراد طور سیناء ہے جو سرزمین مصر میں ہے۔

چوتھی علامت : مغرب سے طلوع آفتاب

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں وقتی ترتیب کے لحاظ سے یہ چوتھی علامت ہے۔ اس

سے پہلے زمین کی تین بڑی علامتیں رونما ہوں گی۔ عالمِ سماوی میں تغیر کی یہ پہلی بڑی علامت ہوگی۔ [۲۰] یہ علامت بھی مومنوں کو دکھائی دے گی۔ اس بڑی علامت کا قصہ کچھ یوں ہے۔

۱۔ جب سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے سورج ہر روز مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ اس بات کی اجازت وہ اپنے رب عزّوجلّ سے لیتا ہے' چنانچہ وہ اسے اپنا عمل دہرانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وقت مقررہ آ جائے گا تو وہ معمول کے مطابق اپنے رب سے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرے گا مگر اسے اجازت نہیں ملے گی۔ پھر اجازت مانگے گا پھر نہیں ملے گی۔ پھر اجازت مانگے گا پھر نہیں ملے گی۔ تین دن سورج طلوع نہیں ہوگا۔ پھر اسے کہا جائے گا جہاں سے آئے ہو وہاں لوٹ جاؤ۔ لوگ یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو رہا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: "کیا تم جانتے ہو یہ سورج کہاں جاتا ہے۔ یہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر سجدہ میں گر جاتا ہے اور اسی حالت میں رہتا ہے حتیٰ کہ اسے کہا جاتا ہے اوپر اٹھو! جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ بس وہ لوٹ کر اپنے مطلع سے طلوع ہوتا ہے۔ پھر چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ کر سجدہ ریز ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں رہتا ہے' حتیٰ کہ اسے کہا جاتا ہے جہاں سے آئے ہو وہاں لوٹ جاؤ۔ بس وہ پھر اپنے مطلع سے طلوع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چلتا رہتا ہے۔ لوگوں کو اس کی کوئی حرکت ناپسندیدہ نہیں لگتی' یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے اپنے پہلے والے ٹھکانہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اسے کہا جائے گا اٹھو مغرب سے طلوع ہو جاؤ تو وہ مغرب سے طلوع ہوگا۔ کیا جانتے ہو یہ سب کب ہوگا؟ جب کسی ایسے شخص کو ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے ایمان سے کوئی نیکی نہ کمائی ہو۔" [۲۱]

۲۔ اس کی تفصیل اس روایت میں ہے جسے حافظ ابو بکر بن مردویہ نے اپنی تفسیر میں عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا کہ "لوگوں پر ایک رات ایسی آئے گی جو ان کی عام تین

راتوں کے برابر ہوگی، نفل عبادت کرنے والے اس کو پہچان لیں گے۔ ان میں سے کوئی کھڑے ہو کر اپنے حصے کی نماز یا قرآن پڑھے گا پھر سو جائے گا' پھر کھڑے ہو کر اپنے حصے کی نماز یا قرآن پڑھے گا پھر سو جائے گا۔ اس دوران لوگ ایک دوسرے پر چیخیں گے۔ وہ پوچھیں گے کیا ہوا؟ اور گھبرا کر مسجدوں کی طرف جائیں گے۔ اچانک وہ دیکھیں گے کہ سورج مغرب سے نکلا ہوا ہے۔ جب وہ آسمان کے درمیان پہنچے گا تو لوٹ جائے گا۔

حافظ بیہقی نے "البعث والنشور" میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں : "..... اس رات آدمی اپنے پڑوسی کو آواز دے گا اے فلاں! آج رات کیا بات ہے کہ میں جی بھر کر سویا اور اتنی نماز پڑھی کہ میں تھک گیا؟ پھر سورج سے کہا جائے گا وہاں سے نکلو جہاں تم غروب ہوتے ہو۔ اور اس دن ایسے شخص کو ایمان کا کوئی فائدہ نہ ہو گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان سے کوئی نیکی نہ کمائی ہو"۔ {۲۲}

۳۔ سورج کا یہ الٹا طلوع صرف ایک دن ہو گا اور اس کے ساتھ ہی توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر سورج اپنے معمول کی طرف لوٹ جائے گا اور قیامت تک مشرق سے نکلتا رہے گا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے اور جب وہ مغرب سے طلوع ہو گا تو لوگ اسے دیکھ کر سب کے سب ایمان لے آئیں گے مگر اس وقت کسی ایسے شخص کو ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو۔" {۲۳}

ابن مردویہ نے ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے "....ابی بن کعب ؓ سے پوچھا گیا: اس کے بعد سورج اور لوگ کس حالت میں ہوں گے؟ انہوں نے فرمایا : روشنی سورج کو ڈھانپ لے گی اور وہ ایسے ہی طلوع ہوا کرے گا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا اور لوگ دنیا کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اگر آدمی کی گھوڑی بچھیرے کو جنم دے تو اسے اس پر سوار ہونے کی مہلت نہیں ملے گی یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔ {۲۴}

پانچویں علامت : جانور کا خروج

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اور جب (قیامت کا) وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا تو ہم ان کے لئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کیونکہ (کافر) لوگ ہماری باتوں پر یقین نہ لاتے تھے۔ (النمل : ۸۲)

یہ علامت بھی مومنوں کو نظر آئے گی۔ مغرب سے طلوع آفتاب والی علامت اور یہ علامت جڑواں علامتیں ہیں۔ یا تو یہ مغرب سے طلوع آفتاب سے پہلے رونما ہو گی یا وہ اس سے پہلے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے : "سب سے پہلے ظاہر ہونے والی علامتوں میں سے دو علامتیں ہیں۔ مغرب سے طلوع آفتاب اور دن کی روشنی میں جانور کا لوگوں پر ظاہر ہونا۔ ان دونوں میں سے جو علامت پہلے ظاہر ہو گی دوسری اس کے فوراً بعد رونما ہو جائے گی"۔ {۲۵}

ہو سکتا ہے کہ ان کے ملاپ کی وجہ یہ ہو کہ ایک علامت ظاہر ہو کر توبہ کا دروازہ بند کر دے گی تو دوسری اس کے بند ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دے گی۔ چنانچہ سورج صبح دم مغرب سے طلوع ہو کر درِ توبہ بند کر دے گا اور اس کے طلوع کے وقت لوگوں کی جو حالت ہو گی وہی قائم رہے گی۔ پھر اس روز دن چڑھے جانور ظاہر ہو کر درِ توبہ کے بند ہونے کی تصدیق کر دے گا۔ مومنوں پر ایمان کا اور کافروں پر کفر کا نشان لگ جائے گا۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں "غالباً جانور کا خروج اسی روز ہو گا جس روز سورج مغرب سے نکلے گا....." آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ابو عبداللہ حاکم کا قول ہے "یوں دکھائی دیتا ہے کہ جانور کے خروج سے پہلے، اسی روز یا ساتھ والے کسی روز سورج کا (مغرب سے) طلوع ہو گا"۔ ابن حجر فرماتے ہیں "میرا خیال ہے کہ اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ مغرب سے طلوع آفتاب کے وقت درِ توبہ بند ہو جائے گا۔ پھر جانور نکل کر درِ توبہ کے بند ہونے کا جو مقصد ہے اس کی تکمیل کے طور پر مومن کو کافر سے الگ کر دے گا"۔ {۲۶}

اس جانور کے اوصاف اور سیرت کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے :

یہ بھاری بھرکم جانور ہو گا جس کے پر، روئیں اور ٹانگیں ہوں گی۔ وہ ضخیم شکل و

صورت کا ہو گا۔ ہمارے پاس صحیح آثار نہیں ہیں جن پر ہم اس کی تعریف کے سلسلہ میں اعتماد کر سکیں اگرچہ کئی ایک روایات ہیں جن میں بڑی باریکی سے اس کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو اس کے عظیم الخلقت ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ "وہ صفا پہاڑ کے شگاف سے نکلے گا۔ اگر گھوڑا تین دن تک دوڑتا رہے تو اسے جتنا عرصہ درکار ہوتا ہے اتنے عرصہ میں اس جانور کا صرف ایک تہائی حصہ نکلے گا۔ اس جیسے اور بھی بہت سے ہولناک اوصاف ہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا نہیں۔

ان اوصاف کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ ہم کھڑے ہو کر اس کو دیکھنے اور پہچاننے سے رہے۔ اللہ تعالیٰ تو اس جانور کو ایک خاص مقصد کے لئے نکالے گا۔ "تُكَلِّمُهُمْ" سے مراد ہے وہ لوگوں سے باتیں کرے گا اور کہے گا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا یقین نہیں کرتے تھے۔

کلم الناس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے چہروں پر نشان لگائے گا جس سے مومن کا چہرہ روشن اور کافر کا چہرہ تاریک ہو جائے گا۔

جبکہ لوگ حرمت کے لحاظ سے اللہ کی سب سے بڑی مسجد مسجدِ حرام (کعبہ شریف) میں ہوں گے تو وہ رکن (حجر اسود) اور مقام ابراہیم کے درمیان غصے سے چیخ کر لوگوں کو خوفزدہ کر دے گا۔ اپنے سر سے مٹی جھاڑ کر مشرق کی طرف منہ کر کے چیخے گا تو اس کی چنگھاڑ مشرق کے آرپار ہو جائے گی، پھر وہ مغرب کی طرف منہ کر کے چیخے گا تو اس کی چنگھاڑ مغرب کے آرپار ہو جائے گی۔ لوگ ڈر کر ایک ساتھ اور الگ الگ منتشر ہو جائیں گے۔ صرف مومنوں کی ایک جماعت اپنی جگہ پر کھڑی رہے گی، ان کو پتہ چل جائے گا کہ وہ اللہ کا جانور ہے اور اب وہ ڈر کر اللہ سے بھاگ نہیں سکتے۔ وہ انہی سے آغاز کرے گا اور ان کے چہروں کو جلا بخش کر ایسا کر دے گا جیسا کہ چمکتا ہوا موتی۔ پھر وہ روئے زمین پر بھاگ جائے گا۔ نہ کوئی چاہنے والا اسے پکڑ سکے گا اور نہ کوئی بھاگنے والا اس سے بچ سکے گا۔ یہاں تک کہ آدمی اس سے بھاگ کر نماز کی پناہ لے گا۔ وہ پیچھے سے آکر کہے گا اے فلاں تو اب نماز پڑھ رہا ہے۔ پھر وہ اس کے سامنے آکر اس کے چہرے کو داغ کر چلا جائے گا۔ ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "زمین کا جانور

نکلے گا تو اس کے پاس موسیٰؑ کا عصا اور سلیمانؑ کی انگوٹھی ہو گی۔ وہ عصا سے کافر کی ناک میں نکیل ڈالے گا اور مومن کے چہرے کو انگوٹھی سے جلا بخشے گا یہاں تک کہ ایک دستر خوان پر کھانا کھانے والے اکٹھے ہو کر کہیں گے کہ یہ مومن ہے اور یہ کافر"۔ [۲۷]

یہ ہے اللہ کا جانور' بڑی علامتوں میں سے پانچویں علامت۔ عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کا قول ہے یہ جانور ہی وہ جاسوس (جَسَّاسَۃ) ہے جس کا تذکرہ تمیم الداری کی حدیث میں ہوا ہے۔ [۲۸] خدا بہتر جانتا ہے۔

چھٹی علامت : دھواں

اللہ تعالیٰ کا قول ہے "سو آپ اس روز کا انتظار کیجئے جب آسمان میں ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو' جو ان سب لوگوں پر عام ہو جائے۔ یہ ایک دردناک سزا ہے"۔ (الدخان : ۱۰'۱۱)

یہ آخری علامت ہے جو مسلمانوں کو نظر آئے گی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "بے شک تمہارے رب نے تین چیزوں سے ڈرایا ہے۔ پہلی چیز دھواں ہے جو مومن کو اتنی تکلیف دے گا جتنی زکام دیتا ہے اور کافر کا مواخذہ کرے گا تو وہ پھول جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگے گا۔ دوسری چیز جانور ہے اور تیسری دجال"۔ [۲۹]

ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "دھوئیں والی نشانی ابھی آئی نہیں۔ مومن کو تو زکام کی شکل میں آئے گی اور کافر اتنا پھول جائے گا کہ اس کے جسم کے سوراخوں سے دھواں نکلنے لگے گا۔ [۳۰]

ابن جریر نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت کی ہے "ایک دن میں ابن عباسؓ کے پاس گیا' وہ فرمانے لگے آج رات مجھے صبح تک نیند نہیں آئی۔ میں نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے کہا کیونکہ لوگوں نے بتایا کہ دمدار ستارہ نکل آیا ہے' مجھے ڈر ہوا کہ کہیں رات کو دھواں ہی نہ آلے۔ چنانچہ صبح تک مجھے نیند نہ آئی۔ [۳۱]

چنانچہ دھواں مومنوں کو دکھائی دینے والی چھٹی علامت ہے۔ ان کو تو کوئی نقصان

نہیں پہنچے گا' یہ تو کافروں کے لئے اس بات کی تنبیہ ہو گی کہ عذاب اور انتقام کے نزول کا آغاز ہو چکا ہے۔ دھواں چالیس روز تک چھایا رہے گا۔

چنانچہ اس نشانی کے ظہور کے بعد یمن کی جانب سے ایک نرم ہوا چلے گی اور سب مومنوں کی روحیں قبض کر لے گی۔ اس کی گرفت سے صرف کافر بچیں گے تاکہ ان پر عذاب ڈالا جا سکے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "بے شک قیامت سے پہلے یمن کی طرف سے ہوا آئے گی جس میں ہر مومن کی روح قبض کر لی جائے گی اور وہ مرجائے گا"۔ {۳۲} اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ یمن کی جانب سے ریشم سے بھی نرم ہوا بھیجے گا۔ جس کے دل میں دانے (رائی) کے برابر بھی ایمان ہوا یہ ہوا اس کی روح قبض کئے بغیر نہ چھوڑے گی"۔ {۳۳}

(جاری ہے)

حواشی

{۱} مسلم نے کتاب الفتن واشراط الساعۃ میں اور احمد نے مسند میں روایت کیا ہے۔

{۲} اس حساب سے دجال کے زمین پر قیام کی مدت تقریباً ایک سال' دو ماہ اور دس دن بنتی ہے۔

{۳} صحیح حدیث ہے۔ اسے طبرانی نے اوس ؓ بن اوس سے روایت کیا ہے۔

{۴} صحیح حدیث ہے۔ ابوداؤد نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کی ہے۔ ناصر الدین الالبانی کی "الصحیحہ" میں حدیث نمبر ۲۱۸۲ ہے۔

{۵} حدیث کا کچھ حصہ مسلم نے کتاب الفتن میں نواس بن سمعان ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۶} مسلم نے کتاب الفتن میں اور احمد نے جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۷} بخاری' مسلم اور احمد نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۸} فتح الباری۔ کتاب احادیث الانبیاء' ص ۴۹۳۔

{۹} مصدر سابق' ص ۴۹۴

{۱۰} بخاری' مسلم' احمد' نسائی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۱۱} احمد اور مسلم نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے اور وہ البانی کی الصحیحہ میں نمبر ۲۴۵۷

کے تحت موجود ہے۔

{۱۲} بخاری نے ابو سعید خدری ؓ کی روایت سے کتاب الانبیاء میں یاجوج ماجوج کے قصہ کے ضمن میں روایت کیا ہے۔

{۱۳} الفتن والملاحم ' یاجوج ماجوج کا تذکرہ ' ص ۳۰

{۱۴} ابن عباس ؓ کے اس قول کو اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے ' دیکھئے تفسیر طبری ' قرطبی ' بیضاوی ' اور آلوسی کی روح المعانی۔

{۱۵} کوہ قاف کے بلند وبالا پہاڑوں کی بلندی ایک ہزار سے تین ہزار میٹر کے درمیان ہے۔

{۱۶} بخاری اور مسلم نے زینب ؓ بنت جحش کی روایت سے بیان کیا ہے۔

{۱۷} صحیح حدیث ہے۔ احمد ' ابن ماجہ ' ابن حبان اور حاکم نے ابو سعید ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۱۸} صحیح ہے۔ ابن ماجہ نے نواس ؓ سے روایت کی ہے۔ الصحیحہ میں نمبر ۱۹۴۰ پر ہے۔

{۱۹} احمد ' مسلم اور ترمذی نے نواس ؓ بن سمعان سے روایت کیا ہے۔

{۲۰} چوتھے باب کی پہلی فصل (الدجال) میں ہم نے اس موضوع کی تحقیق کی ہے۔

{۲۱} مسلم نے ابوذر ؓ سے روایت کی ہے۔

{۲۲} دیکھئے فتح الباری ' ج ۱۱ ۔ کتاب الرقاق ' مغرب سے طلوع آفتاب اور دیکھئے الفتن والملاحم ' مغرب سے طلوع آفتاب کا تذکرہ۔

{۲۳} بخاری اور مسلم نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے۔ احمد ' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

{۲۴} دیکھئے فتح الباری ' کتاب الرقاق ' ج ۱۱ (مغرب سے طلوع آفتاب)

{۲۵} احمد ' مسلم ' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۲۶} فتح الباری ' کتاب الرقاق ' مغرب سے طلوع آفتاب ' ص ۳۵۳

{۲۷} ابوداؤد طیالسی ' احمد ' ابن ماجہ سب نے حماد بن سلمہ اور انہوں نے ابوہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے۔

{۲۸} دیکھئے صحیح مسلم کی شرح نووی

(باقی حواشی اگلی قسط کے ہمراہ ملاحظہ فرمایئے)

فکرِ عجم

آنحضور ﷺ اور سلطنتِ فارس

بسلسلہ علامہ اقبال اور مسلمانانِ عجم (۶)

ڈاکٹر ابو معاذ

آنحضور ؐ کا خط خسرو پرویز کے نام

آنحضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد جب فراغت اور امن کا زمانہ دیکھا تو آپ ؐ نے دعوتِ اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کی حدود سے پرے پھیلانے کا عزم فرمایا۔ آپ ؐ نے اُس وقت کے اہم حکمرانوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کا پیغام دیا۔ آپ ؐ نے فرمانروائے فارس خسرو پرویز' قیصر روم ہرقل' شاہ حبشہ حضرت نجاشی" اور قبطِ اعظم مصر مقوقس کو خطوط تحریر فرمائے۔ ہر خط میں اسلام قبول کر کے امن و سلامتی کی راہ اپنانے کی تلقین فرمائی گئی تھی' مگر ہر حکمران کو اس کے دینی' سیاسی اور سماجی پس منظر میں مختلف انداز سے خطاب کیا گیا تھا۔ خسرو پرویز کے نام یہ خط لے کر مدینہ منورہ سے حضرت عبداللہ بن حزافہ رضؓ روانہ ہوئے۔

یہ وہی ایام تھے جب مصر' بحیرۂ روم کے جزائر' ایشیائے کوچک' شام و فلسطین بشمول بیت المقدس رومیوں کے ہاتھ لگنے کے بعد شکست خوردگی کے عالم میں خسرو پرویز ایک زخمی پرندے کی طرح تلملا رہا تھا۔ اس کا کنٹرول عمائدین سلطنت پر بھی ڈھیلا پڑ رہا تھا اور اس کے اہل خاندان بھی اس سے نالاں اور بدظن نظر آ رہے تھے۔ وہ اب حجاز و یمن اور جزیرہ نمائے عرب پر اپنا نظم و نسق مستحکم کر کے اپنا دفاعی نظام مضبوط بنانے کا سوچ رہا تھا' مگر اس کے دل میں یہ کھٹکا ضرور تھا کہ کہیں اس کی سلطنت کے دور افتادہ خطوں میں بغاوت کی لہر نہ ابھرنے لگ جائے۔ ان تمام واقعات نے اسے جلد باز' سفاک' مضطرب اور زود رنج بنا دیا تھا' وہ ہر لمحے پیچ و تاب کھاتا رہتا' اور عظمتِ دیرینہ کی بحالی کی سوچ میں مگر

رہتا۔

اسی دوران دربار میں اعلان ہوا کہ مدینہ سے ایک سفیر آیا ہے۔ مدینہ منورہ کو تو ابھی تک اس نے اپنی بادشاہت کی حدود میں سمجھ رکھا تھا اور سفیر تو غیر ممالک سے آیا کرتے تھے' اپنے ملک سے تو فریادی آسکتے تھے' سفیر نہیں۔ بادشاہ کو تعجب سا ہوا۔ پھر خط کو داخل دفتر کیا گیا' اس کا پہلوی (قدیم فارسی) زبان میں ترجمہ کیا گیا اور سفیر کی موجودگی میں دربارِ فارس کے ایک کارندے نے اس خط کا ترجمہ پڑھ کر بادشاہ کو سنایا۔ خط کچھ یوں تھا :

"بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم' من محمّدٍ رسولِ اللّٰہ الی کسریٰ عظیم فارس' سلامٌ علیٰ مَنِ اتّبعَ الھدیٰ وآمن باللّٰہ ورسولہٖ وشھِدَ اَن لا الٰہ الا اللّٰہ وانّی رسولُ اللّٰہ الی النّاسِ کافۃً لینذر من کان حیًّا' اَسْلِمْ تَسْلَمْ' فان اَبیتَ فعَلیکَ اِثمُ المَجُوس"

"اللہ کے نام سے جو نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے۔ (یہ خط) اللہ کے پیغمبر محمدؐ (کی جانب) سے فارس کے فرمانروا خسرو (پرویز) کی جانب (لکھا گیا) ہے۔ امن و سلامتی ہو اس کے لئے جس نے ہدایت کی راہ اپناتے ہوئے اللہ اور اس کے پیغمبر پہ ایمان لانے کی سعادت پائی (مزید برآں) جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں اور یہ کہ میں تمام لوگوں کی جانب خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا گیا ہوں۔ یہ اس لئے ہے کہ ہر ذی روح انسان کو (مشیتِ الٰہی سے باخبر کرتے ہوئے) خوف دلاؤں۔ (تیرے لئے بہتر ہے) کہ اسلام قبول کر لے' تو سلامتی پا جائے گا۔ اس کے بعد اگر تم نے (اس دعوت کو قبول کرنے سے) انکار کیا تو تمام زردشتوں (آتش پرستوں) کے گناہوں کی ذمہ داری تمہی پر آن پڑے گی۔"

یہ سنتے ہی دربارِ مدائن پر سناٹا چھا گیا اور غصے کے باعث شاہ کا پارہ چڑھنا شروع ہو گیا۔ اس نے اس خط کی یہ توجیہہ کی کہ سرزمین حجاز میں اس کی بادشاہت کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا گیا ہے۔ چند برس قبل اس نے خدائے برتر کے نام لیوا عیسائیوں کے ہاتھوں شکست فاش کا سامنا کیا تھا۔ اب وہ اس نئے سچے اور ابدی پیغام کو سنتے ہی آگ بگولا

ہو گیا اور وفورِ جذبات سے کانپنا شروع ہو گیا۔ پھر اس نے جھپٹ کر مترجم سے خط کی تحریر چھین کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اصل تحریر بہرحال محفوظ رہی اور ابھی تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ پھر سفیر سے کہا کہ اگر سفارتی آداب مانع نہ ہوتے تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا۔

یہ چیز انتہائی اہم ہے کہ آپ ؐ نے قیصر روم کے خط میں اسے اہل کتاب ہونے کے ناطے سے ایک خدا کی پرستش کے عقیدہ پر اشتراک کا حوالہ دیتے ہوئے نسبتاً نرم انداز سے مخاطب کیا تھا اور قیصر روم نے بھی ایمان نہ لانے کے باوجود اس خط کا بے حد احترام کیا تھا اور ممکن ہے کہ یہی وجہ ہو کہ کسی نہ کسی صورت میں قیصر روم کی سلطنت اگلے چھ سات سو برس تک قائم رہ گئی۔

خسرو پرویز نے کہا کہ میرے غلام کی یہ مجال کہ مجھے اس طرح مخاطب کرے کہ اپنا نام پہلے تحریر کرے اور میرا نام بعد میں۔ حضرت عبداللہ بن حزافہ ؓ جب مدینہ لوٹے تو آنحضور ﷺ کی خدمت میں تمام واقعات بیان فرمائے۔ آپ ؐ نے پورے تجسس سے دربار فارس کی کیفیت اور اہل فارس کے واقعات پوری توجہ اور انہماک سے سنے، پھر آپ ؐ نے فرمایا کہ اس کی بادشاہت بھی اسی طرح پرزے پرزے ہو کر بکھر جائے گی جس طرح اس نے میرے خط کے ساتھ کیا ہے۔ چند ہی برس کے بعد یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ مشہور شاعر نظامی گنجوی ؒ نے کیا خوب فرمایا ؎

نسب نامۂ دولتِ کیقباد
ورق بر ورق ہر سُو برد باد

(کیقباد کی بادشاہت کے حکمران خاندان کا شجرۂ نسب بکھر گیا اور اس کے ورق جدا جدا ہو کر ہوا میں اڑ گئے)

خسرو پرویز نے سفیر کے جانے کے بعد اپنے یمن میں تعینات گورنر کے نام شاہی فرمان تحریر کیا کہ فلاں فلاں شخص کو گرفتار کیا جائے اور پابجولاں دربار مدائن میں بھجوایا جائے تاکہ قرار واقعی سزا دی جاسکے۔ شاہ ایران کی اعصاب شکستگی اور بے چینی کا حال بھی شاید حضرت نظامی گنجوی ؒ کے پر اثر فارسی اشعار سے بہتر آج تک کوئی بھی شخص بیان نہ کر پایا

ہو۔ قارئین کی دلچسپی کے مدِ نظر انہیں یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

دراں دوراں کہ گیتی رامِ اُو بود
زمشرق تا بہ مغرب نامِ اُو بود

(جس زمانے میں دنیا خسرو پرویز کی مطیع و فرمانبردار تھی اور مشرق و مغرب میں اس کے نام کا سکہ جاری تھا)

رسولِؐ ما بہ حجت ہائے قاہر
نبوّت در جہاں می کرد ظاہر

(ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ روشن دلیلوں کے ساتھ اس دنیا میں اپنی نبوت کا اعلان فرما رہے تھے)

گہی با سنگِ خارا راز می گفت
گہی ریگش حکایت باز می گفت

(کبھی آپؐ کی مٹھی میں پتھر کی کنکریاں آپؐ کا کلمہ پڑھ رہیں تھی اور کبھی صحرا کی ریت آپؐ سے مخاطب تھی)

خلائق رازِ دعوت جام در داد
بہ ہر کشور صلائے عام در داد

(آپؐ نے مختلف اقوام کے افراد کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے اطمینان عطا کیا اور ہر ملک کے لئے اپنا پیغام پہنچایا)

بہ قرطاس از عطا عطرے سرشتند
بہ نامِ ہر یکی سطرے نوشتند

(آپؐ نے جو کچھ اپنی مہربانیوں اور نوازشات کی رو سے فرمایا اسے آپؐ کے کاتبوں نے ان کی خوشبوؤں کو سمیٹا اور عطر میں تبدیل کرتے ہوئے مختلف لوگوں کے نام سطریں تحریر کیں)

چو از نامِ نجاشی باز پرداخت
زبہرِ نامِ خسرو نامہ ای ساخت

(نجاشیؓ کے نام خط تحریر کرنے کے بعد آپ نے خسرو پرویز کے نام خط تحریر کروایا)

چو قاصد عرضہ کرد آں نامۂ نو
بجوشید از غضب اندامِ خسرو

(جب نامہ رساں نے وہ منفرد مراسلہ پیش کیا تو غصے سے خسرو پرویز کے تمام اعضاء کانپنے لگ گئے)

ز تیزی گشت ہر موئے سنانی
ز گرمی ہر رگش آتش فشانی

(جوش جذبات کے غلبے نے اس کے ہر بال کو بھالے کی صورت میں تبدیل کر دیا اور غصے کے باعث اس کی ہر رگ آتش فشاں ہو گئی)

سوادے دید روشن ہیبت انگیز
نوشتہ از محمدؐ سوئے پرویز

(جو تحریر حضرت محمد ﷺ کی جانب سے خسرو پرویز کے نام لکھی گئی تھی وہ واضح بھی تھی اور ہیبت انگیز بھی)

چو عنواں گاہ عالم تاب را دید
تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

(جب اس نے خط کا عنوان پڑھا تو آنحضورؐ کے خطاب کے انداز سے اس کی وہی کیفیت ہوئی جو کتے کے کاٹنے کے باعث باولے ہونے والے شخص کی پانی پہ نظر پڑتے ہوتی ہے۔)

غرورِ پادشاہی بردش از راہ
کہ گستاخی کہ یارد؟ با چو من شاہ

(بادشاہت کے غرور نے اسے بھٹکا دیا اور اس نے کہا کہ اے درباریو! دیکھو کہ میرے جیسے شہنشاہ کی شان میں یہ گستاخی کرنے کی جرأت کسے ہوئی ہے)

کرا زہرہ کہ با ایں احترام
نویسد نامِ خود بالائے نامم

(یہ کس کی مجال ہے کہ میرے احترام اور رتبے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کوئی میرے نام کے اوپر اپنا نام تحریر کرے)

رخ از گرمی چو آتش گاہ خود کرد
بخود اندیشہ بد کرد، بد کرد

(غصے کے باعث اس کا چہرہ اپنے آتش کدے کے شعلوں کی صورت سرخ ہو گیا۔ اس نے برا سوچا تو برا کیا)

درید آں نامۂ گردن شکن را
نہ نامہ بلکہ نامِ خویشتن را

(اس نے غرور کو خاک میں ملانے والے خط کو چاک کر ڈالا۔ اس نے خط کے ٹکڑے نہیں کئے بلکہ اپنے نام کے ٹکڑے کر دیئے)

فرستادہ چو دید آں خشم ناکی
بہ رجعت پائے خود را کرد خاکی

(نامہ رساں نے جب شاہ کو غصے کی حالت میں پایا تو چپکے سے واپسی کی راہ لی)

ازاں آتش کہ آں دودِ تہی داشت
چراغِ آگہاں را آگہی داشت

(اس خالی دھوئیں سے اٹھنے والی آگ کو علم و آگہی کے چراغ یعنی آنحضورؐ محسوس کر رہے تھے)

زگرمی آں چراغِ گردن افراز
دعا را داد چوں پروانہ پرواز

(غصے میں آکر بلند و روشن چراغ یعنی آنحضورؐ نے اپنی دعا کو پروانے کی طرح ہوا میں اڑایا)

عجم را زاں دعا کسریٰ در افتاد
کلاہ از تارکِ کسریٰ در افتاد

(فارس میں جب دعا کے اثرات پہنچے تو خسرو پرویز کا تختہ الٹ گیا اور خسرو کے سر کا تاج نیچے آ گرا)

زہی شاہنشہی کز بیم و امید
قلم رانده بر افریدون و جمشید

(مبارک ہوں وہ شہنشاہ یعنی آنحضور ﷺ جن کی حالت امید و بیم میں ان کا حکم افریدون اور جمشید جیسے بادشاہوں پہ چلتا ہو۔)

قصہ مختصر یہ کہ یمن کے گورنر باذان نے خسرو پرویز کے ان احکام کی تعمیل کرتے ہوئے بابویہ اور خور خسرو نامی دو پولیس آفیسر مدینہ منورہ روانہ کئے۔ دونوں مدینہ منورہ پہنچے اور آپ ؐ کو ساتھ چلنے کو کہا۔ بصورت دیگر مدینہ منورہ پر فوج کشی کی دھمکی دی۔ آنحضور ؐ نے فرمایا کہ تم لوگ پہلے یہ تو پتہ کروا لو کہ تمہارا بادشاہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ یہ لوگ خود تو مدینہ منورہ میں ٹھہرے اور حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے کچھ افراد کو روانہ کیا۔ بالآخر انہیں یہ خبر ملی کہ خسرو پرویز قتل ہو گیا ہے اور اس کے جانشین نے اس کے جاری کردہ تمام فرامین منسوخ کر دیئے ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں ایرانی آفیسر بے نیل و مرام مجبوراً واپس یمن لوٹ گئے۔ مدینہ میں قیام کے دوران انہوں نے اہل اسلام کی بود و باش اور جذبے کا جو مشاہدہ کیا، ممکن ہے کہ آئندہ ایام میں ان پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہوں۔

خسرو پرویز کی گستاخی کی سزا ساسانی دربار کو مل کر رہی اور چند ہی برس میں اہل فارس کی بادشاہت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ایک نشان عبرت اور ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔

مجوس اور اہل ایران سے آنحضور ؐ کا مزید واسطہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ روایات کے مطابق آنحضور ﷺ نے دس برس کی عمر میں بصرہ کا سفر فرمایا۔ یہ شہر اُس وقت ایران کی سلطنت کا اہم ساحلی شہر تھا۔ مزید برآں شام سے آتے ہوئے بصرہ تک کے راستے میں اُس وقت کی سلطنت فارس کے تمام اہم سیاسی مراکز بشمول پایۂ تخت مدائن واقع تھے۔ علاوہ بریں اپنے جوانی کے زمانہ میں بھی آپ ؐ نے یمن اور بصرہ کے متعدد سفر کئے تھے۔ بحرین بھی ان دنوں ایران کا صوبہ تھا، آپ ؐ نے وہاں کا سفر بھی کیا تھا۔ ایک موقع پر بحرین کے لوگ جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ ؐ نے ان سے بحرین کے مختلف مقامات کے بارے میں بالتفصیل بحث کی تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ میں کئی مرتبہ آپ کا ملک دیکھ چکا ہوں۔ ان

[illegible] سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے مرکز فارس اور مقبوضات کا متعدد بار سفر فرمایا تھا۔ آپؐ کو وہاں کے لوگوں کی تہذیب و تمدن، رفتار و معاشرت اور بود و باش کے [illegible] شخصی اہم معلومات حاصل تھیں۔ آپؐ جب بھی وہاں کا ذکر فرماتے تو اس کے پس منظر میں یہ [illegible]ہدات، تجربات اور معلومات ہوتی تھیں۔ آپؐ نے فتح فارس کی پیشین گوئی بھی فرمائی تھی جس کا ذکر بعد میں یزدگرد سوم کے دربار میں اسلامی سفراء نے کیا تھا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا تھا ؎

ماند شبہا چشم او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم

(آنحضور ﷺ کی آنکھیں نیند سے ایک مدت تک محروم رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی امت کو خسرو کے تخت پر سکون نصیب ہو گیا)

اس شعر میں شاعر مشرق کی مراد یہی ہے کہ آپؐ کی شدت سے خواہش رہی تھی کہ ملک فارس مسلمانوں کے زیر نگین ہو جائے اور یہ خطہ اسلام کا مرکز بن جائے اور اس میں بسنے والی اقوام (بشمول خراسان و بلوچستان و سرحد و پنجاب و سنکیانگ کے باسی) ایک نہ ایک دن اسلام کے بازوانِ شمشیرزن بن جائیں۔

عرب میں بھی کہیں کہیں ایرانی اثرات بہت گہرے تھے۔ ایک اہم قبیلہ بنو تمیم بھی زردشتی دین پر قائم تھا۔ یہ لوگ اہل مجوس تھے، ان کے گہرے روابط ایرانی حکمرانوں سے بھی رہے ہیں۔ مجوسیوں میں بیٹیوں اور بہنوں سے بھی شادی کو معیوب تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ بنو تمیم کے رئیس زرارہ تمیمی نے اپنی بیٹی کو اپنے عقد میں لے رکھا تھا جسے باقی عرب لوگ بہت بری نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح اقرع بن حابس تمیمی بھی مجوسی تھا۔ اس امر کا مفصل ذکر معارف ابن قتیبہ میں ملتا ہے۔ یہ لوگ فارس و عرب کے مابین ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ کافی پڑھے لکھے اور سمجھ دار تھے۔ ان کے وفود کی دربارِ رسالت میں آمد شروع ہوئی تو یہ لوگ شروع شروع میں مروّجہ زردشتی آداب کو ملحوظِ خاطر لاتے ہوئے پوری شان و شوکت سے مدینہ منورہ آئے۔ بنو تمیم کے تمام بڑے رؤساء مثلاً اقرع بن حابس، زبرقان، عمرو بن الاہتم اور نعیم بن یزید پر مشتمل ایک وفد

آنحضورؐ کے پاس آیا۔ یہ لوگ خود مباہات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہنچے۔ آپ کے گھر کے باہر کھڑے ہو کر آپؐ سے یوں مخاطب ہوئے : اے محمدؐ باہر آؤ۔ آپؐ گھر سے نکلے تو کہا کہ ہم مفاخرہ کرنے آئے ہیں۔ جس سے مراد یہ تھی کہ وہ اپنے مذہب' تمدن اور قبیلے کی خصوصیات کے بارے میں تقریر کریں گے اور پھر اسلام کا پیغام جواب میں پیش کیا جائے گا۔ پھر تقریری اور مناظرانہ انداز میں بحث ہو گی۔ آنحضورؐ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے۔ ان کی جانب سے معروف زردشتی خطیب عطارد ابن حاجب آگے بڑھا۔ اس شخص نے دربار خسرو نوشیروان سے بھی اپنی تقریری خوبیوں کی بدولت کم خواب کی خلعت حاصل کی ہوئی تھی۔ اس نے کہا "یزدان کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں گراں بہا تاج و تخت اور خزانوں کا مالک بنایا ہے۔ ہم تمام اقوام مشرق میں سب سے معزز ہیں۔ ہمارے برابر کون ہو گا۔ ہمارے مقابلہ کا جسے دعویٰ ہو وہ اپنے اوصاف و خصائص گنائے"۔

آنحضورؐ کے حکم کے مطابق ثابت بن قیسؓ اٹھے اور یوں گویا ہوئے : "تعریف کے لائق اللہ کی ذات ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے۔ اس نے ہمیں اقتدار بخشا اور تمام انسانوں میں سے اس ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے شریف النفس' عالی نسب' حق گو اور بلند اخلاق کے مالک ہیں۔ تمام جہانوں سے آپؐ کو منتخب فرما کر آپؐ پر کتاب نازل کی۔ آپؐ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ سب سے پہلے مہاجرین اور پھر ہم (انصار) نے اسلام قبول کیا۔ ہم لوگ انصارِ الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں۔"

پھر شعری مقابلہ ہوا۔ بنو تمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا تو جواب میں حضرت حسانؓ بن ثابت نے نعت پڑھی۔ اقرع بن حابس نے پھر تقریر کی اور زردشتی عقائد اور تعلیمات پر اظہار فخر کیا۔

اس عالمانہ اور شاعرانہ معرکہ آرائی اور استدلال کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار مجوسی عمائدین زچ ہو گئے اور انہوں نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے اثرات مجوسی معاشرے پر بھی مرتب ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی ان لوگوں کے عقائد و افکار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ان نظریات و عقائد کا فائدہ چند سال بعد صحابہ کرامؓ کو

اُس وقت ہوا جب ایران فتح ہوا اور وہاں کے لوگوں سے معاملات طے کرنے کے لئے تبلیغ و اشاعتِ اسلام اور اسلامی حکومت کی وہاں تک وسعت کے مسائل پیش آئے۔ اپنی کتاب انوار القرآن میں جناب ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ رقمطراز ہیں کہ جب ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے لئے نماز کا ترجمہ فارسی میں کر دو۔ یہ اس لئے کہا گیا کہ وہ لوگ نماز کو پورے فہم کے ساتھ ادا کریں۔ اس دوران انہیں اتنی عربی آگئی کہ وہ نماز کو سمجھ کر ادا کرنے لگے۔

سرزمین عرب سے کئی لوگ جندی شاپور کے مقام پر واقع ایران کی میڈیکل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ لوگ واپس اپنے وطن مالوف لوٹتے تو ان پر عجمیت کا رنگ غالب ہوتا اور اعلیٰ غیر ملکی ڈگری کے حصول کے باعث معاشرے میں انتہائی عزت و آبرو کے مستحق گردانے جاتے۔ یہ لوگ مجوسی نظریات اور عقائد سے باخبر ہوتے اور انہوں نے ایرانی اساطیری ادب کا مطالعہ بھی کیا ہوتا تھا۔ ان لوگوں میں رکھ رکھاؤ اور پروٹوکول کا مخصوص عجمی احساس بھی موجود ہوتا۔ ایک ایسے ہی طبیب حارث بن کلدہ بھی تھے۔ انہوں نے جندی شاپور میں تعلیم حاصل کی تھی اور کم از کم ایک مرتبہ دربارِ خسرو نوشیروان میں باریابی حاصل کی تھی اور شاہ سے خطاب بھی کیا تھا۔ انہوں نے خسرو نوشیروان کو طبی مشوروں سے نوازا تھا۔ یہ بنو ثقیف قبیلہ سے وابستہ تھے اور طائف میں قیام پذیر تھے۔ آنحضور ﷺ نے ان کو حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کے معالجے کے لئے مدعو بھی کیا تھا اور انہوں نے آنحضور ؐ سے ملاقات کی تھی۔ یہ اسلام کے ابتدائی دور میں وفات پا گئے تھے اور ان کے اسلام قبول کرنے کی بابت ثابت نہیں ہو پایا۔

ایک اور شخص نضر بن حارث بن کلدہ تھا۔ وہ بھی جندی شاپور سے فارغ التحصیل تھا اور معروف طبیب اور دانشمند تصور کیا جاتا تھا۔ وہ قرآن پاک کی آیات کا تمسخر اڑاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ ایرانیوں کی اساطیر خصوصاً رستم اور اسفندیار کی داستانیں مطالب و معانی اور تفریحی اعتبار سے قرآنی حکایات سے بہتر ہیں۔ مستشرقین خصوصاً آر جی آربری نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ کبھی کبھار وہ آنحضور ؐ کی مجلس میں آکر (مکی زندگی میں) ایرانی

قصے چھیڑ دیتا تو لوگ آنحضورؐ کو چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو جایا کرتے۔ بقول ڈاکٹر براؤن آنحضورؐ کو اس کے اس نازیبا رویئے پہ سخت غصہ تھا۔ وہ بالآخر اسیرانِ بدر کے گروہ میں بارگاہ نبوّت میں مدینہ منوّرہ لایا گیا تو آنحضورؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمادیا اور اسے آیات و حکایات قرآن کے استہزاء کی سزا مل گئی۔ بقول علامہ محمد قزوینی وہ حارث بن علقمہ بن کلدہ کا بیٹا تھا۔

علاوہ بریں حجاز و نجد و یمن میں قبیلہ بنو تمیم کے علاوہ بھی مجوسیوں کا وجود ملتا تھا اور جب وہ آنحضورؐ کے عہد میں اسلامی نظم و ضبط کے تحفظ میں آئے تو مولانا سلیمان ندوی کے بقول ان پر جزیہ عائد کیا گیا۔ ان لوگوں سے بھی آنحضورؐ کو معاملات پیش آئے۔

مدنی زندگی میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی مدینہ منورہ میں بطورِ غلام تشریف لائے۔ اس سے قبل اسلام کی حقانیت کی بشارت کے باعث ان کے تجسّس نے انہیں مدینہ کی راہوں پہ عازمِ سفر کر دیا تھا مگر اپنے ساتھ شریکِ سفر کرنے والے یہودیوں نے مدینہ پہنچتے ہی انہیں فروخت کر دیا۔ آپؓ کی نجابت، بصیرت، تقویٰ اور اسلام سے جذباتی وابستگی کی ایک الگ داستان ہے۔ آپ اگر اصحابِ صُفّہ کے سرخیل تھے تو جنگی حکمتِ عملی میں حضورؐ کے خصوصی مشیر۔ آپ بزرگ صحابہ میں قابل احترام تھے تو دوسری جانب آنحضورؐ نے آپ کو اپنے اہل بیت کا فرد قرار دیا تھا۔ آپ کی قدر و منزلت کا تقاضا ہے کہ کسی اور مرحلے پر ایک مستقل تحریر کی صورت میں آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ تاہم مختصراً یہ کہ جنگِ خندق کی حکمت عملی وضع کرتے وقت اور دیگر مواقع پر دیئے گئے مشوروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچنے کے بعد آپؓ آنحضورؐ کے انتہائی قریبی دوست اور صحابی تھے۔ آپ کی شخصیت عجمی مسلمانوں کی نجابت، شرافت اور طاعت کا ایک حسین ترین نمونہ تھی۔ آپ کی عظیم شخصیت کے اثرات بعد میں ایران میں تبلیغ اسلام اور انتظام و انصرام پر مرتّب ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایران کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی بابت حضرت سلمانؓ بھی آنحضورؐ کو معلومات مہیا فرماتے رہے ہیں۔ ابتداء میں حضرت سلمان فارسیؓ کو عربی زبان سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ آپؐ نے انہیں فرمایا کہ تلاوت کثرت سے کرتے رہو۔ جب عربی زبان سیکھ جاؤ گے تو قرآن پاک کو سمجھ کے پڑھ لینا۔

(جاری ہے)

داستانِ عزیمت

امام شامل رح (۴)

امام شامل ؒ کے حالاتِ زندگی پر انگریزی زبان میں شائع ہونے والی کرنل محمد حامد کی کتاب کا ترجمہ و تلخیص

ترتیب و ترجمہ : اظہار احمد قریشی

گزشتہ قسط کے خاتمہ تک جناب شامل حضرت امام شامل ؒ بن چکے تھے اور کرنل حامد صاحب کی کتاب کے تین ابواب ختم ہو چکے تھے۔ زمانہ ۱۸۳۴ء تک پہنچ چکا تھا۔ کرنل صاحب کی کتاب کا چوتھا باب مئی ۱۸۳۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس تین سال کے دوران حضرت امام صاحب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ کیا تیاریاں کرتے رہے، کہاں کہاں دورے کرتے رہے، کیا تقریریں کرتے رہے۔ کرنل صاحب کی کتاب کچھ بہت ہی جلدی جلدی میں لکھی ہوئی ہے۔ پروف کی بھی غلطیاں ہیں۔ میں کچھ غلطیاں اس سے قبل بھی بیان کر چکا ہوں۔ اب چوتھے باب میں صفحہ ۴۳ پر اشلدہ پر روسی قبضہ اور مجاہدین کی پسپائی کا بیان ہے، لیکن صفحہ ۷۴ پر لکھا ہے کہ اشلدہ کے مقام پر شکست نے روسیوں کی عزت خاک میں ملادی تھی ع

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

میرے ساتھ ایک لطیفہ بھی ہو گیا۔ میں ہر جگہ کوشش کر رہا تھا اور کر رہا ہوں کہ مجھے حضرت امام شامل کے متعلق اچھی کتابیں ملیں تو میں پھول چن کر گلدستہ بنا کر آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کروں لیکن اب تک مجھے جو کامیابی حاصل ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ عزیزم سلمان نے امریکہ سے اسی کتاب کا ایک نسخہ مجھے اور بھیج دیا ہے۔ برخوردار عزیزم عاکف سے درخواست ہے کہ وہ مجھے کوئی اچھی مستند کتابیں منگوا کر دیں۔ ان کا حلقہ احباب تو ماشاء اللہ خاصا وسیع ہے۔

کرنل صاحب کی کتاب کے مطابق مئی ۱۸۴۳ء میں روسیوں نے اشلد پر حملہ کیا۔ مجاہدین نے زبردست مقابلہ کیا۔ دست بدست جنگ میں بہادری کے کارنامے دکھائے لیکن پسپا ہونا پڑا۔

اس کے بعد روسیوں کا ارادہ غرغابیل پر حملہ کا ہوا لیکن ان کے کارروائی شروع کرنے سے قبل ہی بارہ ہزار مجاہدین ان پر ٹوٹ پڑے اور روسی فوج کو نرغہ میں لینے کی کوشش کی۔ ۲۴ گھنٹے مسلسل لڑائی رہی۔ روسیوں کو اس دوران مزید کمک پہنچ گئی۔ مجاہدین وہاں سے ہٹ کر غائب ہو گئے۔ روسی جنرل فیس بھی پیچھے کی جانب چلا گیا اور جب اس کو مزید کمک پہنچ گئی تو وہ ٹلٹی پہنچ گیا جہاں حضرت امام شامل ؒ کی فوجیں مدافعت کر رہی تھیں۔ ٹلٹی اشلد سے بڑا گاؤں تھا۔ اس میں ۷۰۰ مکانات تھے اور زیادہ مضبوط جگہ تھی۔ دفاع کے لحاظ سے یہ بہت عمدہ جگہ تھی۔ اس کے نوبلند اور محفوظ ٹاور تھے۔ اس کے پاس ہلکا توپ خانہ بھی تھا۔ چند دنوں میں سارے ٹاور اور بیشتر مکانات روسیوں کے بڑے توپ خانہ نے گرا دیئے۔ روسی فتح یقینی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت امام شامل نے صلح کے لئے سفیر بھیجے۔ جنرل فیس نے اپنے آدمی پیچھے ہٹا کر ایک اونچی پوزیشن پر جمع کئے۔ دو دن تک گفت و شنید جاری رہی اور آخر میں امام صاحب نے جنرل فیس کو ایک خط لکھا جس کے الفاظ روسیوں کو پسند نہیں آئے۔ تاہم روسیوں نے واپسی شروع کرنے کے بعد درخواست بھیجی کہ امام صاحب کے خط کو مناسب الفاظ میں تبدیل کر دیا جائے۔ امام صاحب دوسرا خط لکھنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن چونکہ اس وقت تک صورتحال مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں تھی۔ لہٰذا دوسرے خط کے الفاظ اور اس کا مواد پہلے خط سے ذرا سا ہی مختلف تھا۔

جنرل فیس کی ان خطوط کی منظوری صلح کی ہم معنی تھی۔ یہ امام صاحب کی سیاسی فتح تھی اس سے علاقہ کے لوگوں میں حضرت امام شامل ؒ کی سیاسی اور دینی سربراہ کی حیثیت قائم ہو گئی۔ روسیوں کی جنگی پوزیشن کمزور ہو گئی تھی۔ ان کی فوج میں بدنظمی تھی، ان کے بہت آدمیوں کا نقصان ہوا تھا گولہ بارود کی کمی تھی، سپاہ تھکی ہوئی تھی۔

حضرت امام شامل کا روسی جنرل فیس کے نام پہلا خط

"امام شامل اور ان کے چار ساتھیوں (جن کے نام درج تھے) اور داغستان کے دیگر معززین اور دانشوروں کی جانب سے ــــ ہم نے محمد مرزا خان کو یرغمال کے طور پر شہنشاہ کے ساتھ صلح کی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس صلح کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ کوئی بھی فریق دوسرے کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کوئی فریق اگر وعدہ خلافی کرے گا تو یہ دھوکہ دہی سمجھی جائے گی۔ ایسے غداروں پر خدا اور خلق کی لعنت ہوتی ہے۔ ہمارا یہ خط ہمارے خلوص کی مکمل وضاحت کرے گا"۔

روسی جنرل فیس تحریر کا بادشاہ تھا۔ اس نے ایسی پر زور رپورٹیں اپنے بادشاہ کو لکھیں جن سے اس کی جنگی مہارت اور قابلیت ثابت ہوتی تھی۔ اس کی رپورٹوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب تحریک مجاہدین مردہ ہو چکی ہے اور روسی طاقت داغستان میں حاوی ہو چکی ہے۔ جنرل فیس کے بعد آنے والے جرنیل کلوگنو کو جب حقیقت کا علم ہوا ہو گا تو وہ جنرل فیس کی رپورٹوں پر ہنسا ہو گا۔ جنرل کلوگنو کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ امام شامل کو راضی کرے کہ وہ ٹفلس میں جا کر شہنشاہ روس کی اطاعت قبول کریں۔

روسی شہنشاہ کی آمد : اس سال روسی شہنشاہ نکولس چیچنیا اور داغستان کے علاقے کا موسم خزاں میں دورہ کرنے والا تھا۔ روسیوں کو یقین تھا کہ اس موقع پر اس علاقے میں مستقل اور پائیدار امن قائم ہو جائے گا لیکن اس کیلئے حضرت امام شامل کا اطاعت قبول کرنا ضروری تھا۔ جنرل کلوگنو ذاتی بہادری اور فوجی مہارت میں بڑا نامور تھا۔ اسے اس علاقہ کے حالات سے بھی بڑی واقفیت تھی۔ چنانچہ ان کو حضرت امام شامل سے ملاقات کا کام سونپا گیا۔

جنرل کلوگنو کی امام صاحب سے ملاقات : غالباً جنرل کلوگنو کو کامیابی کی امید کم ہی تھی لیکن شہنشاہ کا حکم ماننا ضروری تھا۔ بہر حال ملاقات طے ہو گئی اور ۱۸ ستمبر کی صبح ایک چشمہ کے پاس ملاقات ہوئی۔ عظیم شہنشاہ روس کا نمائندہ اور امام صاحب گھوڑوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں اترے۔ روسی نمائندے نے پورا زور لگا کر

ترغیب دلانے کی کوشش کی، لیکن امام صاحب نے فرمایا کہ وہ حتمی جواب دینے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے مشورہ لازمی سمجھتے ہیں۔ امام صاحب نے واضح کر دیا کہ ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس موقع پر ایک بڑا ناخوشگوار واقعہ ہوا۔ دوپہر کے تین بجے تک جب امام صاحب مان کر نہ دیئے تو دونوں اٹھے۔ جنرل کلوگنو نے الوداعی ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن امام صاحب کے ہاتھ ملانے سے قبل امام صاحب کے ساتھی مرید نے جنرل کلوگنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور زوردار الفاظ میں کہا کہ مجاہدین کے لیڈر کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ ایک غیر مسلم سے ہاتھ ملائے۔ کلوگنو تو پہلے ہی غصہ سے بھرا ہوا تھا کہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا اور اب وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ ایک ڈنڈے سے مرید کی پگڑی پر وار کرے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کلوگنو کے زندہ بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ امام صاحب نے موقع کی نزاکت کے مطابق فوری کارروائی کی۔ انہوں نے کلوگنو کا ڈنڈا ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مرید کو روکا جس کی تلوار نیام سے نصف باہر نکل چکی تھی۔ امام صاحب نے اپنے بقایا ساتھیوں کو جو نزدیک آ رہے تھے کہا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں اور کلوگنو سے کہا کہ وہ بلا تاخیر چلے جائیں۔ کلوگنو سخت غصے میں تھا اور گالیاں دیتا رہا لیکن امام صاحب نے نہ صرف خود کو روکا بلکہ اپنے آدمیوں پر بھی کنٹرول کیا۔ کلوگنو کے نائب نے اس کا کوٹ پکڑ کر پیچھے کھینچا اور اسے پیچھے ہٹنے پر راضی کر لیا۔

کلوگنو نے ایک لمبا خط امام صاحب کو لکھا کہ وہ شہنشاہ کی خواہش کی تکمیل کریں، لیکن اس کے جواب میں امام صاحب نے مختصر اور فیصلہ کن خط تحریر کیا:

> "اس عاجز شامل کی جانب سے یہ خط ہے۔ میں تو کل معاملہ خدا کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ آج ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء ہے۔ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ میں نے آخری فیصلہ یہ کیا ہے کہ میں ٹفلس نہیں جاؤں گا چاہے مجھے اس انکار کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے، کیونکہ مجھے آپ لوگوں کی جانب سے متعدد مرتبہ دھوکہ دہی کا تجربہ ہوا ہے اور یہ حقیقت سب لوگوں کو معلوم ہے"۔

پچھلے دنوں میں بالاکوٹ سے گزرا تو حضرت امام شامل" اور حضرت سید احمد شہید" کے حوالہ سے بے اختیار یہ شعر زبان پر آیا اور میں کئی دن اس کو گنگناتا رہا ۔

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

حضرت امام شامل" پھول تھے اور حضرت سید احمد شہید" غنچہ تھے، لیکن حسرت ان غنچوں پہ نہیں ہے کیونکہ وہ تو اپنی مراد پا گئے اور جام شہادت نوش کر گئے۔ حسرت مسلمانان برصغیر پر ہے کہ وہ جلد کی بہار جانفزا کی بس ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر امام شامل" کی طرح ہمارے سید احمد شہید" کو بھی پندرہ بیس برس کی کارگزاری کا موقع مل جاتا تو ہماری حالت یکسر مختلف ہوتی۔ بہرحال یہی خدا کو منظور تھا۔

میں نے آج کے پاکستان کے حالات پر جتنا غور کیا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہماری بنیادی کمزوری دنیا سے یعنی مال سے اور معیار زندگی سے محبت ہے۔ چنانچہ میں نے "اہل پاکستان کے لئے راہ عمل" کے عنوان سے اور اس پر کچھ لٹریچر بھی تیار کیا ہے۔ طلب کرنے پر میں حاضر کر دوں گا۔ خط یا فیکس لکھیں یا فون پر طے کر کے تشریف لائیں۔ میرا دفتر ۳۔ ریواز گارڈن لاہور ہے۔ فون 9-7320108 ہے۔ فیکس 7359378

اظہار احمد قریشی عفی عنہ

نگاہِ واپسیں

اشاریہ ماہنامہ "میثاق"

جنوری ۱۹۹۷ء تا دسمبر ۱۹۹۷ء (جلد ۴۶)

مرتب : امتیاز احمد نگیال

قرآنیات

حقیقت و حکمت دین

دعوت و تحریک

فقہ و اجتہاد

سیرت و سوانح

معاشیات اسلام

ملکی و ملی اور سیاسی امور

از طرف امیر تنظیم اسلامی و مرکزی مجلس عاملہ

توضیحات و تنقیحات

امت مسلمہ کی عمر

فکر عجم

گوشہ خواتین

افکار و آراء / خطوط و نکات

وقار عظیم ندوی

رفتار کار

عرض احوال

میثاق کے ادارتی صفحات میں "عرض احوال" کے عنوان سے حافظ عاکف سعید صاحب کی تحریر شامل اشاعت ہوتی ہے، جب کہ ستمبر ۹۷ء کے شمارے کا "عرض احوال" حافظ خالد محمود خضر صاحب نے تحریر کیا۔

ONTHLY
Meesaq
AHORE

Reg. No. CPL 125
Vol. 46 No. 12
Dec. 1997